

مجلہ

فنون

مدیر

احمد ندیم قاسمی

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۵۷۹
ٹیلیفون نمبر ۶۹۵۸۰

خاص نمبر

مجلّہ فنون لاہور

مدیر:
احمد ندیم قاسمی
تزئین: موجد

شمارہ: ۱۹
اگست ستمبر ۱۹۸۳ء

سالانہ چندہ
بذریعہ رجسٹری: ۱۰۰ روپے
غیر ممالک سے: ۱۵۰ روپے

قیمت موجودہ شمارہ: ۴۸ روپے

مقامِ اشاعت: ۴ - میکلوڈ روڈ، لاہور

مُندرجات

غزلیں

گوشۂ اقبال

گوشۂ غالب

مقالات

فن اور فن کار

نظمیں

افسانے

غزلیں

طنز و مزاح

یادیں

اختلافات

تبصرے

حرفِ اوّل

ندیم

"فنون" کا گذشتہ شمارہ پریس جا رہا تھا تو لندن سے اردو کی بے بدل افسانہ نویس اور ناول نگار خدیجہ مستور کے انتقال کی اطلاع آئی اور پھر فوراً بعد راولپنڈی میں اردو کے ایک بے مثال شاعر احمد شمیم کی رحلت کی خبر ملی۔ تب ہم نے "فنون" میں اعلان کیا کہ آئندہ شمارہ خدیجہ اور شمیم کے لیے وقف کر دیا جائے گا مگر بعض مجبوریوں نے ہمیں کچھ نہ کرنے دیا۔ احمد شمیم مرحوم کے سلسلے میں ہمیں ان کی بیوہ اور دوستوں کی طرف سے جو مواد موصول ہوا، وہ اتنا مفصل نہیں تھا کہ اسے ایک خاص شمارے کی صورت دی جاتی۔ اور خدیجہ کے فن اور شخصیت پر اتنے بہت سے کرم فرماؤں نے لکھنے کے لیے وقت مانگا کہ ہم نے خدیجہ نمبر سے پہلے ایک ضخیم خصوصی شمارہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا جس میں احمد شمیم کے بارے میں آئے ہوئے مضامینِ نظم و نثر کو شامل کرنا طے پایا۔ موجودہ خاص اشاعت میں "گوشۂ احمد شمیم" شامل ہے اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ دو تین ماہ میں ایک شایانِ شان خدیجہ نمبر پیش کر دیا جائے گا، مگر اسی دوران میں پاکستان کی دنیائے ادب و فن پر چند اور سانحے گزر گئے اور اردو نثر و نظم چند اور محرومیوں کی زد میں آ گئی۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری، ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم، نامور افسانہ نگار غلام عباس، سندھی کے ایک معروف ادیب ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل، سندھی الغوزہ کو ایک طلسم انگیز ساز میں بدل دینے والا خمیسو خان، معروف محقق کرنل خواجہ عبدالرشید، دکن کے مشہور اردو شاعر سکندر علی وجد، اور پاکستان کی فلمی صنعت کی دو محبوب و معروف شخصیتیں ـــــ علاؤالدین اور احمد رشدی انہی دنوں انتقال کر گئے۔ اس کے ساتھ ہی شاعروں، افسانہ نویسوں، ناقدوں اور محققوں کی ایک پوری قطار ہے جن کی رخصت سے ہمارا افقِ شعر و فن ویران دکھائی دینے لگا ہے۔ ان رحلت کرنے والوں میں رئیس فروغ، راز مراد آبادی، محمد حیات سیال، ڈاکٹر حمیدالدین، نشور واحدی، ایس صفدر، عظیم مرتضیٰ، رابعہ فاروق گل خاں، پرکاش پنڈت، حرمت الاکرام، ہرچرن کرشن اشک، احمد یار مجبور، ضیاء اللہ ضیا، تابش رضوی، شباب کیرانوی، خلیق ملتانی، محی الدین خلوت، میر نسیم محمود، ریاض فرشوری، نادم سیتاپوری اور حکیم سید ظفر عسکری شامل ہیں۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری

حفیظ اس دور کے ایک سربرآوردہ اور جامع الحیثیات شاعر تھے۔ وہ غزل، نظم، گیت اور مثنوی سبھی میدانوں کے شہسوار تھے اور ہر صنفِ سخن میں ان کا اپنا ایک منفرد اسلوب تھا چنانچہ ان کا کلام ہزاروں کے ہجوم میں آسانی سے پہچانا جاتا تھا۔ شاہنامۂ اسلام لکھ کر انھوں نے "فردوسیِ اسلام" کا لقب اپنے قارئین سے پایا۔ اردو میں نہایت ہی خوبصورت اور بھرپور گیت لکھ کر انھوں نے ثابت کر دیا کہ گیت کسی خاص زبان کا اجارہ نہیں ہیں، بلکہ زبان کوئی بھی ہو گیت کہنے والے کو گیت کہنے کا سلیقہ آنا چاہیے، اور جذبہ و خیال کی نزاکتوں اور الفاظ کے دروبست کے آہنگ پر حاوی ہونا چاہیے۔ غزل میں بھی حفیظ نے کلاسیکیت کے احترام کے باوجود اپنی سادہ بیانی اور سلاست و شوخی اور موسیقی کی وجہ سے بہت شہرت پائی۔ وہ نثر پر بھی نظم کی طرح حاوی تھے بلکہ اپنی ابتدائی ادبی زندگی میں افسانے بھی لکھتے رہے جن کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ "ترانۂ پاکستان" کے خالق حفیظ جالندھری کی زندگی بہت بھرپور گزری اور انھوں نے تاریخِ شعر و فن میں اپنا ایک منفرد اور ممتاز مقام اپنی زندگی ہی میں حاصل کر لیا تھا۔

ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم

روشن آرا بیگم کی صورت میں پاکستان کو فنِ موسیقی کی ایک بے بدل نعمت میسر آئی تھی اور اس نعمت سے محرومی تہذیبی سطح پر اس مملکت کی بہت بڑی محرومی ہے۔ قدرت نے روشن آرا بیگم کو کلاسیکی موسیقی کی بھرپور اور ہمہ جہت مہارت کے علاوہ جو رسیلی آواز دی تھی اس کی مثال لانا دشوار ہے۔ پاکستان میں کلاسیکی موسیقی کا سارا بھرم انہی کے دم قدم سے قائم تھا۔ پھر بحیثیت انسان وہ اتنی مہذب اور حلیم الطبع تھیں کہ اتنی بڑی فنی شخصیت کا اتنا عاجزانہ طرزِ گفتگو ان کے عقیدت مندوں کو حیرت میں ڈال دیتا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک عظیم فن کار اور ایک بڑی انسان تھیں۔

غلام عباس

۱۹۳۶ء کے بعد اردو افسانہ نگاروں کا جو ایک گروہ افقِ ادب پر ابھرا اور پھر چھا گیا۔ اس میں غلام عباس کا مرتبہ و مقام بہت اونچا ہے۔ وہ کسی ادبی تحریک سے وابستہ نہیں تھے مگر جبلی طور پر کٹر قسم کے حقیقت پسند اور انسان دوست، اور انصاف پرست فنکار

تھے۔ مختصر افسانے کے فن کو جس مہارت اور توازن کے ساتھ غلام عباس نے استعمال کیا، اس کی صرف ایک مثال راجندر سنگھ بیدی ہیں، باقی سبھی بڑے بڑے افسانہ نگاروں نے مختصر افسانے کو من مانے انداز میں برتا اور پھیلایا سکیڑا۔ غلام عباس نے چیخوف اور موپساں کے انداز میں افسانے کی ابتدا کی، اور آخر تک اسی شاہراہ پر گامزن رہے۔ آخر آخر کے ایک آدھ افسانے میں ـــــ شاید پابندیوں کے باعث ـــــ وہ علامت استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے مگر یہ علامت اتنی واضح تھی کہ اس کی تفہیم میں ان کے بے شمار قارئین کو کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ ان کا انداز بے حد سادہ، سلیس مگر دلوں میں اترتا ہوا اور ذہنوں میں نفوذ کرتا ہوا انداز تھا۔

ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل

ڈاکٹر خلیل سندھی کے ایک اعلیٰ پائے کے تخلیق کار تھے۔ ان کے جو افسانے اردو میں منتقل ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسانے پر ان کی گرفت کتنی مضبوط تھی، اور وہ سندھ کی عوامی زندگی میں کتنے ڈوب کر لکھتے تھے۔ افسانے کے علاوہ بھی ان کی متعدد ادبی سرگرمیاں تھیں۔ اس دور میں ڈاکٹر حسام الدین راشدی کے بعد سندھ میں ادب کے وہی مرد بزرگ تھے۔

کرنل خواجہ عبدالرشید

وہ لوگ جو علم و ادب کو، ورعلمی و ادبی کتابوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں، ان میں کرنل خواجہ عبدالرشید کا مرتبہ مسلّم ہے تاریخ و علم و ادب پر ان کی نگاہ بہت گہری تھی اور وہ کتنے ہی علمی ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کو اپنی زندگی کا مشن سمجھتے تھے۔ ان کا کتب خانہ اس ملک کے گنتی کے چند اعلیٰ پائے کے نجی کتب خانوں میں ممتاز مقام رکھتا تھا اور تشنگانِ ادب اس سے شادکام ہوتے رہتے تھے۔

خمیسو خاں

سندھ کے الغوزہ نوازوں میں خمیسو خاں کی حیثیت اس لحاظ سے مسلّمہ ہے کہ انہوں نے الغوزوں میں نئی جہتیں پیدا کیں اور آواز کی ایسی ایسی پرتوں کا اظہار کیا کہ غیر ملکی سننے والوں کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ سارا "آرکسٹرا" خمیسو خاں کی سانس اور ایک "نے" سے برآمد ہو رہا ہے۔ روشن آرا بیگم کی طرح خمیسو خاں بھی عظمت اور عاجزی کا دلآویز مرقع تھا۔

علاء الدین

پاکستان کی فلمی صنعت سے متعلق لوگوں میں سے بہت کم اصحاب علاؤالدین کی ہر دل عزیزی کے معیاروں کو چھو سکتے ہیں مگر علاءالدین کے حوالے سے کوئی بھی صنعت اپنے کارکنوں کے متعلق مکمل بے حسی کے معاملے میں ہماری فلمی صنعت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ علاءالدین ہر بڑے فنکار کی طرح بلا کا حساس تھا چنانچہ اس کی علالت میں اس فلمی صنعت کی بے حسی کو بھی بڑا دخل ہے جس کی ترقی اور وسعت میں علاءالدین کا حصہ بہت بھرپور تھا۔ علاءالدین نے اداکاری کے جو صاف ستھرے مگر انتہائی دشوار معیار قائم کئے وہ اس کے ساتھ ہی ختم ہو گئے۔

سکندر علی وجد

اس دور کے ان اردو شعرا میں دکن کے سکندر علی وجد کو ایک محترم مقام حاصل تھا جو کلاسیکی انداز میں شاعری کرنے کے باوجود روحِ عصر سے بیگانہ نہیں رہتے۔ انہوں نے غزل سے زیادہ نظم لکھی اور دکن میں اعلیٰ شاعری کی سند مانے جاتے رہے۔

احمد رشدی

احمد رشدی کو اپنے دور میں ہر لہجے اور ہر موضوع کے فلمی گیت گانے میں جو مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ بہت کم گلوکاروں کے حصے میں آئی ہے۔ ابھی چند برس پہلے تک احمد رشدی کی آواز گونجتی تھی اور وہ خواص و عوام میں یکساں ریادلی سے موسیقی کی طلسمی سرخوشی بانٹتا تھا۔

عظیم مرتضیٰ

ایک خوبصورت غزل گو جو امرتسر سے لاہور تک اپنی غزل کا جادو جگاتا رہا مگر پھر یکایک لاہور سے اسلام آباد کے ایک گوشے میں جا کر روپوش سا ہو گیا، چپ چاپ اس دنیا سے بھی رخصت ہو گیا اور جن لوگوں نے اسے پڑھا یا سنا تھا، ان کی یادوں میں گنگناہٹوں کی پھلجھڑیاں سی روشن کر کے سدھار گیا۔ رئیس فروغ، رازمراد آبادی، احمد یار مجبور، ضیاء اللہ ضیا، تائب رضوی، شباب کیرانوی، خلیق ملتانی، میر نسیم محمود، محی الدین خلوت اور حکیم سید ظفر عسکری اپنے اپنے رنگ کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ڈاکٹر حمیدالدین نے تاریخ و فلسفہ کے میدان میں بڑی خدمات انجام دیں۔ محمد حیات سیال کی تحقیق و تنقید نے بڑے بڑے اہل الرائے سے داد وصول کی تھی۔ ایس صفدر ایک بہت عمدہ مصور تھے۔ راجہ فاروق علی خاں نے "ادبی دنیا" کے دورِ عروج میں بہت خوبصورت ڈرامے لکھے تھے۔ ذاکر حسین اور ریاض ذشوری فکشن کی دنیا کی اہم شخصیتیں تھیں۔ اُدھر ہندوستان میں سکندر علی وجد کے علاوہ نشور واحدی، حرمت الاکرام اور بل کرشن اشک کے سے شعرا بھی رخصت ہو گئے اور پرکاش پنڈت جیسے متنوع قلمکار بھی چل بسے۔ دنیائے ادب ان سب کے بغیر ویران اور اداس ہے۔

حسن اختر جلیل

حمد

رات کی کالی گدڑی میں
جب صبح کا لعل دمک اُٹھتا ہے
جی کہتا ہے، آؤ حمد کریں

حمد اس کی
جو دل کے "بھورے" کے بجنوں میں
کوندا سا لپکا دیتا ہے

حمد اس کی
جو کھن کھن بولتی مٹی کے کوزے کی تہ میں
آبِ حیات چھپا دیتا ہے

حمد اُس کی
جو سجدہ گزار کی خاک آلودہ پیشانی
چمکا دیتا ہے

وہ دم اور ایٹم کا خالق
چوبخ کا اور چوگے کا مالک
عالم عالم اس کا آنگن
جیون ہار سب اس کے بالک
آؤ حمد کریں

حمد، جو سارے لفظوں
ساری آوازوں
ساری دانائی سے
برتر ہو

حمد، جو دل کو
اس کی مہکاروں سے بھر دے
رُوح کا میل کچیل جلا کر
خود اُس جیسا کر دے

محسن بھوپالی

حمد

وہ سب کا مولا
وہ سب کا داتا
ہر ابتدا کی وہ ابتدا ہے
ہر انتہا کی وہ انتہا ہے
وہی تھا صبحِ ازل سے پہلے
وہی ہے شامِ ابد سے آگے
وہ سب کا مولا
وہ سب کا داتا
کوئی زمانہ ہو
ہر زمانے کی وسعتوں پر محیط ہے وہ
علیم ہے وہ، خبیر ہے وہ، بسیط ہے وہ
وہ سب کا مولا
وہ سب کا داتا
وہی ہے مشکل کشا ہمارا
وہی ہے حاجت روا ہمارا
کبھی جو چاہا، اُسی سے چاہا
کبھی جو مانگا، اُسی سے مانگا
وہ سب کا مولا
وہ سب کا داتا

سجاد بابر

حمد

کبھی صحرا میں
خوش کُن بات کی بوندیں برستی ہیں
تو کوسوں دُور
روشن صحن کا منظر
نظر میں رقص کرتا ہے
گلُوں میں روشنی انگڑائیاں لیتی ہوئی
محسوس ہوتی ہے
سُریلے شور سے تخیّل کے در
باز ہوتے ہیں
ہوائیں گدگداتی ہیں
یہ دھڑکن بول اُٹھتی ہے
خوشا اے ساعتِ پیہم!
تشکّر ربِ دو عالم!!

(دوبئی)

لیث قریشی

بروئے کعبہ

زہے مقدر! کہ آج میری جبیں ہے اور کعبۂ یقیں ہے
میں ملتزم پر خدائے برتر سے گڑگڑا کر یہ کہہ رہا ہوں
معاف کر دے، معاف کر دے، معاف کر دے، معاف کر دے

میں تیرا ہوں اک حقیر بندہ، تو میرا مالک تو میرا مولا
میں تجھ سے ہوں عافیت کا خواہاں، ہوں نرغۂ دشمناں میں تنہا
نہ جانے کتنی امیدیں لے کر ہوا ہوں حاضر میں تیرے در پر
مرے گناہوں کو بخش دے تو، مری خطاؤں سے درگزر کر

بچشمِ تر تجھ سے کہہ رہا ہوں کہ تو سمیع و بصیر بھی ہے
تو جانتا ہے میں کرب میں ہوں کہ تو علیم و خبیر بھی ہے
نگاہِ لطف و کرم تو کر دے کہ تو غفور الرحیم بھی ہے
تو اپنی ذاتِ صفاتِ کل میں عظیم بھی ہے کریم بھی ہے

میں تا دمِ زیست تجھ سے مولا یہی کہوں گا، یہی کہوں گا
معاف کر دے، معاف کر دے، معاف کر دے، معاف کر دے

میں ہوں تری بارگہ میں حاضر کہ تو ہی حامی ہے تو ہی ناصر
تجھی سے ہوں حوصلے کا طالب کہ تو ہے ہر مرحلے پہ قادر
کسی مجازی خدا کے آگے نہ اپنے دامن کو میں پساروں
جو چاہنا ہے تجھی سے چاہوں جو مانگنا ہے تجھی سے مانگوں

جہانِ حرص و ہوس سے مولا مجھے تو اب بے نیاز کر دے
تو میرے دامانِ آرزو کو متاعِ فقر و غنا سے بھر دے
مجھے یقیں ہے مری دعا کو قبولیت کا شرف ملے گا
مرا یقیں ہے یقینِ کامل، معاف کر دے، معاف کر دے
معاف کر دے، معاف کر دے، معاف کر دے، معاف کر دے

اسد محمّد خاں

نعت

سُندر نام تِہار نبیؐ جی
سُندر نام تِہارو

نبی کریمؐ آپ کا نام خُوبصورت ہے
آپؐ کا نام خُوبصورت ہے

آپؐ مُرلیا ، آپؐ بجَیّا
آپؐ چندریکا ، آپؐ بدَریا
ساگر نام تِہار نبیؐ جی
سُندر نام تِہارو

آپؐ ہی نغمۂ سرمدی ہیں، آپؐ ہی نغمۂ سرمدی کو پھیلانے والے ہیں
آپؐ ہی چاند کی کرن ہیں، آپؐ ہی سایہ دار بادل ہیں
آپؐ کا مبارک نام سمندرٌ ہے
آپؐ کا نام خوبصورت ہے

سدا رنگ توری سرسوں پھُولے
دُوار بسنت ہِنڈولا جھُولے
جنم جنم توری باجے رے بنسی
ساگر نام تِہار نبیؐ جی
سُندر نام تِہارو

آپؐ کی کھیتی سرسبز ہے کہ ابدی رنگ میں رچی ہُوں لازوال سرسوں ہے
آپؐ کی چوکھٹ پر ابدی بہار جھُولا جھُولتی ہے
آپؐ کا سرمدی نغمہ، حیات در حیات جاری وساری ہے
آپؐ کا مبارک نام سمندر ہے
آپؐ کا نام خوبصورت ہے

نام کریمؐ ، دوجگ کے دِیالوؐ
نام چندن سا پایوَ
نام جپیں رے تورا سب نرناری
داس اسؔد گُن گایوَ
اسؔد بھی خوب نصیبا لایوَ
نام جپیں رے تورا انتریامی جل جلالہٗ
نام محمدؐ پایوَ نبی جیؐ
نام محمدؐ پایوَ

آپؐ کا نام کریم بھی ہے کہ دو جہاں میں آپ کی شفاعت اور کرم جاری ہے
آپؐ کو صندل سا مہکتا نام ملا ہے
سب مرد عورت آپؐ کے مبارک نام کا ورد کرتے ہیں
یہ غلام اسؔد آپؐ کے گُن گاتا ہے
یہ اسؔد بھی کیسا مقدّر لایا ہے (کہ اس قابل ہوا ہے)
عالم الغیب نے بھی آپؐ کی مدح فرمائی ہے
کہ نبئ محترمؐ آپ کو محمدؐ نام عطا ہُوا ہے
آپ کو محمدؐ نام عطا ہوا ہے

سُندر نام تِہار نبیؐ جی
ساگر نام تِہارو

نبئ کریمؐ آپ کا نام خوبصورت ہے
آپ کا نام سمندر ہے

عبدالعزیز خالد

حاط حاطؐ

(زبور میں نامِ دلنوازِ حضورؐ ہے "حاط حاط"۔ خالد)

ہیں جوانانِ چمن جس سرو قد کے مقتدی
کس سخنور سے بیاں ہو اس کی شانِ سروری؟

حُسنِ اعجازِ بیاں جس کے تکلّم سے عیاں
اس کے وصفِ حُسن سے عاجز ہے گویائی مری

جس نے یہ کہہ کر بڑھایا رتبۂ شعر و بیاں
شعر میں حکمت بھی ہوتی ہے، بیاں میں سحر بھی

جس کے دم سے سیکڑوں تازہ جہانوں کی نمود
جس کا ہر قول و عمل وجہِ فروغِ زندگی

ذوقِ ادراک و تدبّر جس نے ذہنوں کو دیا
خضرِ راہِ فکر، ہیبرِ کاروانِ آگہی

سب خصائل جس میں اپنے باپ ابراہیمؑ کے
توڑے جس کی ضربِ حق نے سب بتانِ آذری

جس کے آنے سے اُٹھی تحریکِ احیائے علوم
ہوگئی اوہام پر حاصل خرد کو برتری

زَرْتُکَ اِنْ شِئْتَ اَعْطَشْتَ وَاِنْ شِئْتَ سَقَیْتَ

ذمہ داری جس نے ڈالی مرد پر اولاد کی
خاک میں جس نے ملایا کج کُلاہوں کا غرور

بے اثر جس نے بنایا ہر طلسمِ سامری

جس کی خاص و عام پر یکساں نگاہِ التفات
کی نہ جس نے اپنے بیگانے میں حد بندی کبھی

جوہرِ تطہیر ہے رنگ و نسب سے بے نیاز
"کون ہے آلِ محمدؐ؟" "یا انسؓ! ہر متقی!"
جس سے کہتی ہے خدیجہؓ: کر نہ غم اے ابنِ عمؑ!
یہ فرشتہ ہے خدا کا، تُو اس اُمّت کا نبی

یہ وہی ناموسِ اکبر ہے، وہی رُوحُ الامیں
جو رسولوں کی طرف ہے کبریا کا ایلچی

تجھ سے پہلے موسئِ عمراں پہ جو آتا رہا
جس کے ذمّے ہے ازل سے خدمتِ نامہ بری

وحی تجھ پر اس نے کی القا خدا کے حکم سے
آخری بارِ نبوّت ہے تری پیغمبری

تو جہانوں کے لیے رحمت ہے اے جانِ عزیز!
ابنِ نوفل پر ہو رحمت! وہ بھی کہتا ہے یہی

ہیں کہ میں نے ہر طرح دیکھا ہے، پرکھا ہے تجھے
میں کہ ہوں محرم تری، تیری شریکِ زندگی
میں صمیمِ قلب سے اقرار کرتی ہوں ترا
سب سے پہلی مُسلمہ میں، سب سے پہلی اُمّتی

ایک عورت قائدِ اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْن

اب بھی کیا مشکوک ہے اس کی سلیم الفطرتی؟
اپنی ماں بنتِ خُوَیلِد کی طرح خالدؓ مرے
لب پہ بھی : اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ واٰمَنْتُ بِہٖ!

لیث قریشی

نعت

مجھ کو لایا ہے مرا طالعِ بیدار کہاں
میں گنہ گار کہاں، اور یہ دربار کہاں

میرے آقا نے مجھے اذنِ حضوری بخشا
ایک ناچیز کہاں، رُتبہ سرکار کہاں

مجھ پہ کس طرح کھلے نکتۂ قرب و دوری
کم نظر مجھ سا کہاں، پردۂ اسرار کہاں

حرفِ مطلب کو میں کس طرح زباں پر لاؤں
میں مجسّم ہوں دعا، قوتِ گفتار کہاں

جلوے ہی جلوے نگاہوں میں ہیں رقصاں لیکن
تابِ نظارہ کہاں، طاقتِ دیدار کہاں

میں مدینے کی زیارت کو تو آیا ہوں مگر
دیدہ و دل مرے شائستۂ معیار کہاں

روضۂ پاک پہ ہوں ناصیہ فرسا لیکن
سجدۂ شوق کہاں، قلبِ ریاکار کہاں

چاہتا ہوں کہ گناہوں کی معافی چاہوں
مجھ میں اے لیثؔ! مگر جرأتِ اظہار کہاں

حسن اختر جلیل

نعت

تجھے دلوں میں یقینِ سحر سلامت ہے
کہ اسمِ پاک ترا صبح کی علامت ہے

کجی سے دُور رہی تیرے گلستاں کی بہار
کہ تیرے باغ کا ہر نخل سروِ قامت ہے

وہ اب ہوں کوچۂ طائف کہ شام کے بازار
ترے لہو کا تقاضا ہی استقامت ہے

تو وہ چراغ جو نورِ ازل سے روشن ہے
تو وہ حدوث کہ جس کی بنا قدامت ہے

خلیلِ حق کی دعا کا اثر تری بعثت
تری دعا کا ثمر منصبِ امامت ہے

حساب مجھ سے نہ لے پیشِ مصطفیٰ، یا رب!
کہ میری فردِ عمل دفترِ ملامت ہے

وہ اور ہیں جو متاعِ عمل پہ نازاں ہیں
ہمارے پاس تو آنسو ہیں اور ندامت ہے

سجاد بابر

نعت

مری پہچان کو اب اتنا تابندہ لکھا جائے
مری پیشانی پر بطحا کا باشندہ لکھا جائے

وہ جس کا تذکرہ شرحِ نصابِ زندگی ٹھہرا
اسی کا اتباع اب کارِ آئندہ لکھا جائے

اُسی کے نُور سے روشن ہیں شہرِ فکر کی گلیاں
مکینوں کو اُسی کے نام پر زندہ لکھا جائے

مری ہستی ہی کیا ہے مدح میں اسکی۔ زباں کھولوں
مجھے اُس کے ثناخوانوں کا کارندہ لکھا جائے

ابھی اظہار میں وارفتگی کے سُر نہیں ڈھلتے
مجھے اس عجز پر جذبوں سے شرمندہ لکھا جائے

(دوبئی)

حسن رضوی

نعت

میں آفتاب کہوں یا اُسے ستارا لکھوں
اُسے لکھوں میں سمندر اُسے کنارا لکھوں

زمانے بھر کی کڑی دھوپ کی تمازت میں
میں دو جہاں کا اُسے آخری سہارا لکھوں

میں اُس کے سوچ چراغوں کی روشنی میں لکھی
عبارتوں کے ہر اک لفظ کو ستارا لکھوں

دلوں میں اسمِ محمدؐ کی جگمگاہٹ کو
جہاں میں بہتا ہُوا روشنی کا دھارا لکھوں

میں کائنات کے ہر حُسن کو حسن رضوی
جمالِ احمدِ مرسلؐ کا استعارا لکھوں

آفتاب اقبال شمیم

اعلان نامۂ بیروت

دیکھ! یہ وسطِ بیروت کا
آخری مورچہ ہے جہاں میں کھڑا ہوں، مگر
ان فضاؤں میں بارود کی آتشیں آندھیوں کا ہدف
میں اکیلا نہیں
میرے پیچھے نظر تا نظر پُرسکوں، لہلہاتی ہوئی بستیاں
(جن میں میرے لیے ایک بھی گھر نہیں)
جبر کی زد میں ہیں
دن کی شاخوں سے ٹوٹے ہوئے برگ
بکھرے پڑے ہیں مرے سامنے
جن کا تازہ لہو
میری خندق کے حلقوم تک آگیا ہے
کہ یہ آخری معرکہ — اسفلِ ارض سے آسماں کا
دفاعِ ضمیرِ جہاں کا
مرے ڈوبنے تک لڑا جائے گا
کوئی اپنی رگیں کھول کر میری تائید کرنے اُٹھے
اور کوئی سخی مرد اپنا زرِ خوں لٹانے کو تیار ہو
جو مرے بعد، میری جگہ
میری بندوق تھامے ہوئے ایستادہ رہے

اور کل کے کٹہرے میں جب آج کے
یہ سلاطین، یہ دیوتا
بے ضمیروں کی صف میں کھڑے فیصلہ سُن رہے ہوں
تو وہ خلقتوں کو
زمیں سے زمیں تک
نئی، ایک ہی مملکت کے اُبھرنے کا پیغام دے
جس کے سورج نما بُرج پر
وُہ لہو میں نہائی ہُوئی نسل کے
خوابِ فردا کی پرچم کُشائی کرے
جس میں بے خانماں، ہجرتوں کے سفر میں
بھٹکتے ہوئے قافلوں کو
ارادے کی آزادیاں پیش کرنے کی تقریب پر
ہر کفِ شاخ کو
دستِ موسم
گُلوں سے حنائی کرے

خاطر غزنوی

انخلا

نو موسموں کا یہ فیصلہ ہے
کہ طائرانِ شمال
برفاب کے ستم سے گھروں کو تج کر
کٹھن سفر کی اذیتوں کو قبول کر لیں
وہ دشت و صحرا، سراب دریا، نئی زمینوں نئے فلک میں
شعورِ پرواز میں صعوبت کا رنگ بھر لیں
رُتوں کی ناپائیدار خصلت کا سارا الزام
اپنی مظلومیت پہ دھر لیں
نئے ٹھکانوں کی جستجو کی تڑپ لیے وہ سوادِ مشرق میں آزمائیں بلند اُڑانیں
مغربوں کا عذاب جھیلیں، جنوب چھانیں
پروں تلے سبز سبز دُنیاؤں، نیلی جھیلوں کے پانیوں کا جمال دیکھیں
سمیٹ کر پر جو نیچے اُتریں تو منتظر پائیں قافلے کی
اُگلتی آتش، سیہ تفنگیں
چمک اُڑاتے ہوئے پھلوں کے فلک نشاں زرد زرد تیزی کا منبع خاکستری کمانیں
بہانہ جو موت کی مچانیں

کہاں ہے منزل — کہاں ہیں رستے؟
شمال اپنا، نہ شرق اپنا
جنوب اپنا، نہ غرب اپنا
ہماری دُنیا کہاں ہے —؟ لاؤ
ہماری دُنیا — ہمیں دکھاؤ
خدائے مشرق! خدائے مغرب!

حمید یورش

○

(نذرِ بینؤت)

یہ ثبوتِ عزم و استقلال کوئی کم نہ تھا
سر بھی کٹ کر گر گیا، گردن میں لیکن خم نہ تھا

میرے لشکر میں عجب تقریب کا سا تھا سماں
جھنڈیاں تھیں سب کے ہاتھوں میں کہیں پرچم نہ تھا

بے اثر، ہیبت سے عاری تھا، رجز بے جان تھا
اس میں بھی تکرار "میں" کی، اس کا نعرہ "ہم" نہ تھا

پھر وہی عدمِ توازن لشکروں کے درمیاں
اور کربِ تشنگی بھی کربلا سے کم نہ تھا

دونو جانب خون میرا تھا، عدو محفوظ تھا
ننگ کی صورت تو تھی، یہ جنگ کا عالم نہ تھا

دُکھ تو یہ ہے، کیوں تماشائی کھڑے خاموش تھے
اپنا گھر لُٹنے کا ورنہ مجھ کو اتنا غم نہ تھا

یہ مقدر ہے، کہیں پانی کہیں برسا لہو
کون کہہ سکتا ہے یہ برسات کا موسم نہ تھا

ہم اکائی کی دُہائی دے کے یورش چپ رہے
سوچ کے دھاروں میں کوئی ربط ہی باہم نہ تھا

خاطر غزنوی

پیمبروں کی سرزمیں

یہی وہ زمیں ہے — جہاں لحنِ داؤدؑ گونجا
فضاؤں میں مہکا، نگاہوں میں لہکا
وہ جادو کہ سرشاریوں کی حسیں خوشبوؤں سے عبارت رہا ہے
وہ جھونکا کہ آواز کے زیر و بم سے
لطافت کے رنگوں کی شبنم میں ڈھل کر سماعت کا حسنِ تماشا ہوا ہے
وہ منظر کہ آنکھوں کی جنت بنا ہے
وہ منظر کہ آنکھوں کی وسعت میں سمٹے ہوئے فیضِ فردوس سے
عکسِ بہزاد و مانی کی روحِ نگار آفریں میں بسا ہے
یہی وہ جگہ ہے جہاں انس و جن
طائرانِ حسیں — وحشیوں کے پرے
تاجِ کج پوش سلطاں — پیمبر
سلیماںؑ کے احکام پر
سرنگوں، منتظر، دست بستہ رہے ہیں
اس جگہ آئینے ہر سکندر کی نخوت کی گردِ کدورت سے دھندلے
ہوئے اور شکستہ رہے ہیں
یہاں بے زباں، سرنگوں گوسفندوں کا مسلک بنا زندگی کا قرینہ
یہی سرزمیں آسمانوں کا زینہ

یہاں دار کو عظمتوں کی علامت بنایا گیا ہے
یہاں جسمِ انساں کو بخشی گئی حرمتِ لمسِ عکسِ صلیبِ مقدس
یہی وہ زمیں ہے جہاں ہر زماں، آسماں بہرِ تعظیم
جھکتا رہا ہے
یہی وہ مقدس زمیں ہے پیمبر جہاں صف بہ صف
آخری آنے والے کے حسنِ امامت کی لذت سے سرشار
سجدوں میں کھوئے
یہی سرزمیں بارِ دیگر بنی آسمانوں کا زینہ
یہی سرزمیں ہے جسے حق نے وہ شب عطا کی
جسے سب شبوں میں ہے معراج حاصل
وہی سرزمیں ہے، وہی روز و شب ہیں مگر
اتنے تاریک اتنے بھیانک
کہ اب انس و جن بھی پناہ مانگتے ہیں
میں بے ساختہ چیخ اٹھتا ہوں
خلّاقِ اعظم سے یہ پوچھتا ہوں!
کہ بے روح و ذی روح ہر شے کے معبود!
مولائے داؤدؑ!

ربِّ سلیمانؑ و یزدانِ موسیٰؑ !
خدائے براہیمؑ و آقائے عیسیٰؑ !
محمدؐ کے اللہ !
پروردگارِ زمین و زماں، کائناتِ جواں، آشکار و نہاں
آج — اس سرزمیں — اس رسولوں کے مسکن میں تیرے ہی بندے
خدا ہو گئے ہیں
یہ انسان وحشت نما ہو گئے ہیں
اے یزدانِ موسیٰؑ !
یہ بندے تو اب اہرمن ہو گئے ہیں
یہ سب راہزن ہو گئے ہیں
یہاں آئینے آج گردِ کدورت سے دھندلا چکے ہیں
نہ اب لحنِ داؤدؑ کا زیر و بم اس جگہ ہے
نہ شبنم لطافت کے رنگوں کی باقی
کہ اب تو سماعت سے بیزار ہیں یہ فضائیں
وہ سرشاریوں کی حسیں خوشبوئیں مٹ گئی ہیں
کہ اب آسماں سے برستے ہیں شعلے
یہاں اب دھواں آہِ سوزاں کی مانند اُٹھتا ہے ہر سو
لہو ہی لہو ہے
نہ میں ہوں — نہ تو ہے
یہاں ہر طرف بکھرے ملتے ہیں معصوم بچوں کے، بوڑھوں کے،
جوانوں کے جسموں کے ٹکڑے

یہاں اب فضاؤں میں ماؤں کی آہ و بکا ہے
زمیں بوس و برباد ہے شہرِ بیروت
تابوت
مجبور و مقہور انسانیت کا
خدایا ہر اک ظُلم جب حد سے بڑھنے لگا تھا
تو — تُو معجزوں سے سبھی جابروں، ظالموں کو ٹھکانے
لگاتا رہا تھا
مگر آج یکسر ہی چپ ہے
تماشہ کناں ہے
ترے نام لیوا بھی تیری طرح آج چپ ہیں
فقط کچھ جیالے — سروں سے کفن باندھ کر
اس مقدس زمیں کے لیے
سینہ تانے ڈٹے ہیں
یہ بارود کی بارشوں میں کھڑے ہیں
ترے نام کی عظمتوں کے لیے آگ سے کھیلتے ہیں
موت سے لڑ رہے ہیں
یہ پیاسے ہیں لیکن لبوں پر تبسم — ارادوں میں پختہ یقیں
کی چمک ہے
نگاہوں میں روشن دلوں کی دھنک ہے

حلیم قریشی

فلسطینی طالب علم کے لیے ایک نظم

اک ہاتھ میں اُس کے بستہ ہے
اک ہاتھ میں کل کا رستہ ہے
وہ کل جو ابھی پوشاک میں ہے
سُرخی میں نہائے موسم کی
وہ کل جو ابھی افلاک میں ہے
تاروں کی حدوں سے بھی آگے
تاروں کی حدوں سے دُور جہاں
اقرار کا نُور برستا ہے
اک ہاتھ میں میرے بستہ ہے
اک ہاتھ میں کل کا رستہ ہے!
میں بھی کسی ماں کا بیٹا ہوں
میرے بھی کھلونے ٹوٹ گئے
بھائی تو عدو کی قید میں ہیں
بہنوں کو درندے لُوٹ گئے
میں باپ کی لاش پہ روتا ہوں
اور ظالم مجھ پر ہنستا ہے
اک ہاتھ میں میرے بستہ ہے
اِک ہاتھ میں کل کا رستہ ہے
لبنان! تیرے بازاروں میں
کم سن ہوں مگر جی دار ہوں میں
شبنم کی طرح معصوم مگر
لٹکی ہوئی اک تلوار ہوں میں
آبا نے جو ہمت بخشی ہے
اُس ہمت کی دیوار ہوں میں
پتوار مرے ہاتھوں میں نہیں
اور ناؤ بھی میری شکستہ ہے
اِک ہاتھ میں میرے بستہ ہے
اِک ہاتھ میں کل کا رستہ ہے
اِک جسم ہے جو اپنا ہے مرا
گھر ہے نہ کوئی دیوار مری
تحریک کے اس دوراہے پر
قائم ہے ابھی رفتار مری
جو عمر مری باقی ہے ابھی
تیرے ہی لیے "سرکار مری!"
دشمن کا لہُو جولانی پر
یاروں کا لہُو یخ بستہ ہے
اک ہاتھ میں میرے بستہ ہے
اک ہاتھ میں کل کا رستہ ہے
وہ کل جو ابھی پوشاک میں ہے
سُرخی میں نہائے موسم کی

حسن ناصر

دم توڑتی سچائیاں

آؤ پھر سے پڑھیں
نوح کا نسل نامہ
سلیمانؑ کی بادشاہی کے قصّے
وہ تحریر جو دستِ موسیٰؑ نے لکھی
(کہ یہ سب زمانے کے لوگوں میں بے عیب تھے)
اور ڈھونڈیں
کہاں خامیاں رہ گئی ہیں
کہاں پر نئی موت کے رقص کا باب
مفقود ہے

اور کبھی بے وفاؤں کے اُن بے حقیقت نبیوں
کی جانب لگی ہیں
کہ جو اپنے اپنے ضمیروں کے قاتل ہیں

بے حسی کے سمندر میں دم توڑتی سسکیاں لیتی سچائیاں
رزقِ بارود ہیں
ماؤں کی ڈھارسیں
دُودھ پیتے فرشتوں کے ماتھوں کے بوسے
سروں پر رکھی چادروں کی دعائیں
لہو اور مٹی کی دلدل میں اتری ہُوئی
قاتلوں کو کبھی

لکھیں یہ سب کچھ
نئے باب میں
اور لکھیں
کہ جب مشترک موت کی قبر بن جائے گی
تو ضمیروں کے قاتل
دیے نور کی لوح پر
فاتحہ پڑھنے آیا کریں گے

رحمان فراز

وہ رُخصت ہُوئے

(لبنان میں فلسطینیوں کے قتلِ عام اور عربوں کی بے حسی کے پس منظر میں)

وہ رخصت ہوئے
اُن کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اُڑتی ہوئی گرد بھی
اپنی حیران آنکھوں سے اوجھل ہُوئی

وہ رخصت ہوئے
وہ کہسارِ عزم
وہ مردانِ رزم
وہ اُن کی شفق تاب آنکھیں
شعاعِ سحر کی امیں
وہ انسان — تقدیر تھی جن کے زیرِ نگیں
وہ سب ذی شرف — ذی وقار
وہ سب افتخار
وہ چہرے جلالت مآب
اپنے جذبوں کی سچی تمازت میں دہکے ہوئے
وہ انسان — آہن میں ڈھالے ہُوئے
وہ رخصت ہوئے

وہ رخصت ہوتے
وہ جن کی نیاموں میں شعلہ زبانیں تھیں
اُن کا وجود
جہانِ فنا میں فقط ہست و بود
وہ شمشیر زن، وہ مشکل کشا
عمل ہی عمل، وغا ہی وغا
وہ ہنگامِ شب میں سحر کی ندا

وہ انساں، جو حرمت تھے اپنی زمیں کے لیے
وہ رُخصت ہوئے

وہ رخصت ہوئے
اور ہم رہ گئے ہیں اب اُن کے نشاں
ہم فغاں ہی فغاں
اپنی تاریخ کی ہچکیاں

ہم فقط لفظ ہیں
گُنگ الفاظ،
جن کی نہیں اپنی کوئی زباں
ہم فقط کانچ ہیں
ہم زیاں ہی زیاں
سطحِ عالم پہ بکھری ہوئی کرچیاں
وُہ زرہ پوش تھے
ہم فقط دھجیاں
ہم قفط بے عمل
اپنے اسلاف کے مقبروں کے مجاور ہیں
ہم اپنے ماضی کی کرمک زدہ داستاں
ہم زیاں ہی زیاں
ہم فغاں ہی فغاں

دحمان فنران

فلسطینی فدائی

میں بچہ تھا
تم نے پہلے میرے ابا اور امی کو قتل کیا
میری کمسن بہن کے ننھے ہاتھوں سے
اُجلی گڑیا چھین کے اُس کو نوچ دیا
میں رویا تو میری جانب تم سنگینیں تان کے بولے
"بھاگو
پیچھے مُڑ کر دیکھا
تو جلتا سیسہ سینے میں اُتر جائے گا"

وہ لمحہ — وہ خونیں لمحہ
میری سُلگتی آنکھوں میں اب بھی جلتا ہے
تم جب میرے گھر کے اُجڑے آنگن میں
موت کے تال پہ رقصاں تھے
اور تمہارے چاروں جانب
گلیاں، کوچے ویراں تھے
ہر سُو خون میں لتھڑے لاشے
اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے
وحشت کے اس ننگے رقص کو دیکھ رہے تھے
حیراں تھے
ہر سُو کٹے ہوئے جسموں کے بکھرے اعضاء
جلتے گھر اور چیخیں، آہیں
زخمی انسانوں کی کراہیں
میری جاگتی آنکھوں میں
خوف کے اس منظر کا کرب ابھی زندہ ہے

مَیں جو موت کے پھیلے خوف کے سائے میں
پھٹے ہوئے خیموں میں پل کے جوان ہوا
مجھ کو اس جنت سے نکلے برسوں بیت گئے
لیکن اب یہ خوف جھٹک کر
میں اپنے فولادی ہاتھوں میں اپنی بندوق سنبھالے
قریہ قریہ اُس قاتل کو ڈھونڈ رہا ہوں
جو میری دھرتی کا،
ہنستے بستے گھر کا، قاتل ہے —

جاوید انور

فلسطینی سپاہی کا گیت

میں جانتا ہوں
کہ بھیک میں اسلحہ کے ہمراہ
گالیوں اور ٹھوکروں کی کڑی شرائط ہیں
دیکھتا ہوں
میں اُن کو جن کے گلے پٹوں میں ہیں
اور بندوق نرم بستر پہ سو رہی ہے!
اُداس مت ہو مرے فلسطیں!
ابھی تو میری رگوں میں بہتی تمازتیں تیری حرمتوں کا غلاف ہیں
میری ساری سمتیں ترے بدن پر لکھی ہوتی ہیں
—— تجھی سے ہوں میں!
میں تیری عُریانیوں کو اپنے لہو کی چادر سے ڈھانپ لُوں گا
اُداس مت ہو!
دُعا کا تعویذ میں نے صحرا میں گُم کیا ہے

خدا اگر ہے
تو آ کے دیکھے، زمیں خداؤں سے بھر گئی ہے
زمیں خداؤں میں بٹ رہی ہے!
ہماری آنکھوں پہ اپنے حصّے کے پھُول تکنا بھی جُرم ہے

اُن گھروں میں رکھی صراحیاں ہم کو رو رہی ہیں
کہ جن کے دروازے ہم پہ کھُلتے ہیں تو دھماکے
چھتوں کو فرشِ اُداس تر کے سپرد کرتے ہیں
آنسوؤں کا ہجوم ہے اور ہم ——
کہ رونا بُھلا چکے ہیں

اُداس مت ہو!
میں اپنے پاؤں سے منزلوں کا سراغ پاؤں گا
میرے ہاتھوں پہ
راستوں کا ظہوُر ہوگا
غلیظ ہاتھوں نے تیرے فرشوں پہ جو لکھی ہے
ہر اُس عبارت کا قتل واجب ہوا ہے مجھ پر
میں تیری سڑکوں پہ پھرتے کتوں کی گندی آنکھیں نکال دوں گا
میں اپنی بینائی دے کے تجھ کو اُجال دوں گا
اُداس مت ہو —!
میں لوٹ آؤں گا — اے فلسطیں
تو میرے اُجڑے گھروں میں لیٹی اُداس بیلوں میں اپنی
آنکھیں سجائے رکھنا

احمد ندیم قاسمی

چاند گھبرا گیا

چاند نے
ابر کی ایک کھڑکی سے جھانکا
تو گھبرا گیا
اور کھڑکی کے پٹ بند کر کے
گھنے بادلوں کو، عبا کی طرح اوڑھ کر
چھپ گیا
بادلوں میں مگر
اس کے چہرے کا سونا پگھلتا رہا
اس کے اشکوں کی چاندی چمکتی رہی
اور فلسطین کی خیمہ گاہوں میں
تہذیب کے پاسبانوں کے دلال
منظر کے دھبّے مٹانے میں
انسانیت کو ٹھکانے لگانے میں
مصروف تھے!

اعتراف

تمھارے اوجِ تہذیب و ثقافت کا

زمانہ معترف ہے

اور میں بھی معترف ہوں

صرف یہ چھوٹا سا شکوہ ہے

کہ تم، بے خانمانوں کے کلیجوں میں اُترتی برچھیوں کو تو، عجائب گھر
میں فن کارانہ اسلوبِ تناسب سے سجاتے ہو

مگر چھلنی کلیجے بھول جاتے ہو!

عبد العزیز خالد

مرثیۂ حفیظ

حفیظ جالندھری کا مرنا ہے ایک اندازِ زندگی
اک روایتِ شاعری کا مرنا
وہ پیرِ مردِ جوان و برنا
کہ جس کے نزدیک کھیل تھا جان سے گزرنا
نہ اس نے جانا کسی سے ڈرنا
نہ اس نے مانا کسی سے ہرنا
سرشت اس کی خدا کے بندوں سے پیار کرنا
رہِ وفا میں متاعِ جاں کو نثار کرنا
حریف پہ بڑھ کے وار کرنا
نوشت اس کی خرامِ خامہ سے گل کترنا
مثالِ صبحِ چمن نکھرنا!
شمیمِ زلفِ سمن براں کی طرح بکھرنا
رواں ہے آنکھوں سے خوں کا جھرنا
ہے سخت مشکل دہانِ زخمِ جگر کا بھرنا
یہ سانحہ جو ہوا ہے پرسوں
وہ سانحہ ہے کہ جس کا اُردو ادب منائے گا سوگ برسوں

حفیظ جالندھری — مختصر خود نوشت

ابوالاثر حفیظ جالندھری

حضرت نیاز فتح پوری کے ماہنامہ "نگار" نے جنوری فروری ۱۹۴۱ء میں "جدید غزل گو شعراء نمبر" شائع کیا تھا۔ حفیظ مرحوم کی یہ خود نوشت اسی خاص شمارے سے ماخوذ ہے

میرا خاندان تقریباً ۲۰۰ (دو سو) برس پیشتر چوہان راجپوت کہلاتا تھا۔ میرے بزرگ ہندو سے مسلمان ہو گئے اور پاداش میں اپنی املاک وغیرہ کھو بیٹھے۔ البتہ سورج بنسی ہونے کا غرور مسلمان ہونے کے باوجود ساتھ رہا۔ میری ذات تک پہنچا اور ختم ہو گیا۔

میں ننھا سا تھا۔ جب مجھے محلے کی قدیم مسجد میں داخل کیا گیا۔ میں یقیناً اُس زمانے میں ذہین لڑکوں میں شمار ہوتا تھا۔ کیونکہ میں نے چھ برس ہی میں ناظرہ قرآن شریف پڑھ لیا۔ بہت سے سورے زبانی یاد کر لیے اور کریما و مقیماں رٹ لیں۔

اس سے آگے میں مسجد میں نہ چل سکا جس کے وجوہ کثیر ہیں۔ اخلاقی بھی، مادی بھی۔ اب مجھے مشن اسکول میں داخل کیا گیا۔ وہاں سے میں دوسرے درجے سے بھاگ نکلا۔ سرکاری مدرسے میں داخل ہوا۔ چوتھی جماعت میں وہاں سے بھاگا۔ آریہ اسکول میں داخل ہوا۔ پھر مشن ہائی سکول میں لے جایا گیا۔ لیکن حساب سے میری جان جاتی تھی۔ ہر روز حساب کے وقت بھاگ جاتا تھا۔ دوسرے دن پٹتا تھا۔ یہ بھاگنے اور پٹنے کی جنگ چار سال تک جاری رہی۔ آخر پٹنے پہ بھاگنا غالب آیا اور میں ہمیشہ کے لئے بھاگ نکلا۔

شعر گوئی یوں تو میری عمر کے ساتویں برس ہی شروع ہو گئی تھی لیکن اس مرض کا باقاعدہ حملہ گیارہ سال کی عمر میں ہوا جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا اور اس بیماری کا سبب عشق کی گرمی تھی۔ لڑکپن کا یہ عشق بھی عجیب چیز تھا۔ اے کاش! اس کو میں بیان کر سکتا۔ اس زمانے میں ناول، افسانے، ڈرامے، شعراء کے دواوین، تھیٹر، مشاعرے سب سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میرے گھرانے پہ فرشتۂ موت سایہ ڈال رہا تھا۔ پانچ بھائی یکے بعد دیگرے نذرِ اجل ہو گئے۔ ایک طرف تو یہ آفت تھی۔ دوسری طرف میں گھر کے لئے ایک مصیبت بن گیا تھا، کیونکہ گھر سے بھاگتے وقت جو کچھ ہاتھ لگتا اُڑا لے جاتا۔

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شاعری منحوس ہے اس قول میں صداقت ضرور ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ شعر گوئی آوارگی ساتھ لاتی ہے، تو نحوست کا سبب بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ کم از کم میرے ساتھ تو یہی گزری۔ آوارگی اور شعر گوئی۔ آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ آنکھ اُس وقت کھلی جب والدین نے میری شادی کر دی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ میرے گھرانے کی دولت پیدا کرنے والے افراد اجل کے ہاتھوں اور جمع جتھا میرے ہاتھوں غائب ہو چکی تھی اور یہ سب کچھ چند ہی برس میں ہو گیا تھا۔

اب مجھے ذمہ داریوں کا احساس ہو گیا۔ میرے والد بوڑھے، والدہ علیل، ایک سوتیلا بھائی جس کا خاندان بہت وسیع، آمدنی بہت قلیل باقی بیوہ بہنیں، بیوہ بھاوجیں، یتیم بچے بچیاں، یہ سب کچھ تھا۔ لیکن مجھے کام کاج کوئی نہ آتا تھا۔ صرف فارسی کی چند کتابیں، اردو شعراء کے چند دواوین، میرا مبلغ علم اور مبتدیانہ غزل گوئی میرا مبلغ فن تھا۔ پنجاب میں اُردو شاعری کا رواج تازہ تازہ ہوا تھا اور عوام کو اس سے

کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ البتہ میرے وطن جالندھر کو فارسی زبان کے مسلم الثبوت اُستاد مولانا گرامی کا جنم بھوم ہونے کی وجہ سے یہ شرف حاصل تھا کہ وہاں باقاعدہ مشاعرے ہوتے تھے اور ان مشاعروں میں شہر اور مضافات کی بستیوں کے شعراء حصّہ لیتے تھے۔ اُن میں ایک دو اچھا خاصہ کہتے تھے۔ لیکن ایک بہت بڑی تعداد متشاعروں کی تھی۔ حضرت مولانا گرامی اگرچہ دربارِ دکن سے منسلک اور حیدر آباد ہی میں رہتے تھے، لیکن وہ جالندھر کے مشاعروں کے لئے فارسی غزل بھجوا دیا کرتے تے اور جب کبھی وطن میں تشریف لاتے تو ایک بڑا مشاعرہ ہوتا جس میں وہ اپنا فارسی کلام سناتے تھے۔ ان دنوں جالندھر میں فارسی جاننے والے بہت سے بزرگ موجود تھے۔

میں نے سات آٹھ سال کی عمر میں گرامی کو ایک مشاعرے میں شعر پڑھتے سنا تھا۔ اس وقت تو مجھے یہ مجلس مضحکہ خیز سی نظر آئی۔ واہ وا، سبحان اللہ مکرر ارشاد ہو، واللہ اعجاز ہے، واللہ سحر ہے، واللہ جادو ہے یا داد دینے والوں کا اچھلنا، ہاتھوں کا ہلنا، سب کا مل کر شور مچانا، عجیب مسخرہ پن معلوم ہوتا تھا۔ کیا خبر تھی کہ آخر یہی "مسخرہ پن" مجھے بھی کرنا پڑے گا اور عمر کا ایک حصّہ اسی تماشاگاہ میں گزرے گا۔ جب میں نے باقاعدہ غزل گوئی شروع کی تو حسبِ دستورِ قدیمی اُستاد کی ضرورت لاحق ہوئی۔ قریبی بستی میں سرفراز خان صاحب سرفراز مدرس تھے۔ جیسا اس وقت کہتے تھے ویسا ہی آج بڑھاپے میں بھی کہتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ اگر ان کا کہا ہوا سب شائع ہو جائے تو اس کا حجم بیس تیس ہزار صفحات سے کم نہ ہوگا۔ خیر میں نے ان کو آغاز کی دو تین غزلیں دکھائیں۔ انہوں نے کوئی خاص اصلاح نہ دی۔ لیکن میں اب تک ان کا شکر گزار ہوں۔ مجھے کسی نے مشورہ دیا کہ اپنا کلام حضرتِ گرامی کی خدمت میں دکن ارسال کروں اور اصلاح چاہوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور چند غزلیں ان کی خدمت میں ارسال کیں۔ جواب ملا "گرامی فارسی کا شاعر ہے، اُردو سے بہت دور۔ حفیظ جوہر قابل معلوم ہوتا ہے۔ حفیظ کو چاہیئے کہ اپنا کلام بار بار خود ہی ناقدانہ نظر سے دیکھا کرے" وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اس مشورہ پہ عمل شروع کر دیا۔ ایمان کی بات ہے کہ میری غور و فکر کی عادت اسی مشورہ کی بدولت ہے۔ پھر جب حضرتِ گرامی وظیفہ لے کر ہمیشہ کے لئے وطن میں مقیم ہو گئے تو شاعری کے اس آفتابِ لبِ بام کے سامنے میں نے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اب فارسی کے مطالعہ کا شوق تو بڑھ گیا، لیکن اپنے لئے میں نے اُردو ہی میں شعر کہنے کو بہتر سمجھا اور گرامی صاحب کا مشورہ بھی یہی تھا۔

متاہل ہو جانے کے بعد میں نے کسبِ معاش کے لئے تھوڑے ہی عرصہ میں بیسیوں پاپڑ بیل ڈالے۔ ریلوے لائن پہ مٹی، عطر فروشی، کلاہ سازی، خیاطی، فوج کی ٹھیکیداری، خطوط نویسی، ریلوے اسٹیشنوں پہ مزدوری، آٹے کی مشین، متشاعروں کو غزلیں لکھ لکھ کر دینا، سنگر سیونگ مشین کمپنی کی مینجری، سب کچھ کر ڈالا۔ لیکن پوری نہ پڑی۔ فراغت نصیب نہ ہوئی۔ اتنے بڑے کنبے کا پیٹ پالنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ مکانات کو بیچ بیچ کر کھاتا کھلاتا رہا اور سچ یہ ہے کہ نوکری ہو یا کاروبار، میں کسی کام کا نہ تھا۔ رات دن فکرِ شعر، طبیعت کمزور اور حسّاس، خلافت اور کانگرس دونوں میں شامل۔ لیکن لیڈروں سے متنفر۔ نتیجہ یہ کہ نہ اِدھر نہ اُدھر۔

۱۹۲۱ء میں سنگر کمپنی کی ملازمت چھوڑ دی۔ وطن میں آ گیا اور وہاں سے اُردو زبان میں ایک ماہنامہ رسالہ "اعجاز" جاری کیا۔ جس کے سرپرست مولانا گرامی تھے۔ یہ رسالہ پانچ ماہ بعد آخری مالی چرکا دے کر مر گیا۔ اس وقت مایوسی سے میری حالت دیوانگی تک پہنچ گئی تھی کیونکہ میں نے ایک بہت بڑا مکان فروخت کر دیا تھا۔ والد صاحب کو اطلاع بھی نہیں کی تھی۔ ان کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے پیٹا یا اور گھر سے نکال دیا۔ اس وقت میں ایک بچی کا باپ تھا۔

اب میں نے کشمیر کا پیدل سفر کیا۔ ارادہ تو کچھ اور تھا لیکن عقیدہ والدہ کا خیال، ننھی بچی کا تصور اور زوجہ کے متعلق ذمہ داریوں کا احساس سدِّ راہ تھا۔ پلٹ آیا۔ رسالہ "شباب اُردو" لاہور میں ملازمت کر لی۔ اس کے بعد "نونہال" اور "ہزار داستان" کی ادارت میرے سپرد ہوئی۔ پھر "پھول" اور "تہذیبِ نسواں" میں کام کیا۔ یہاں سے خیر سے ریاست خیر پور سندھ کا شاعر دربار مقرر ہوا۔ لیکن زندگی

میرے مزاج کے خلاف تھی، پلٹ آیا۔ نظم "رقاصہ" اسی دوران میں لکھی گئی۔ اب مجھے ادبی اور صحافتی زندگی کا تجربہ ہو چکا تھا اور یہ معلوم ہو گیا تھا کہ پانی کس رُخ بہتا ہے۔ اس میدان میں جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، آپ بیتی اور جگ بیتی، دونوں اس قدر تلخ ہیں کہ اگر بیان کر دوں تو ایک آفت برپا ہو جائے۔

۱۹۲۲ء میں لاہور آیا تھا۔ اس وقت سے اب تک برابر ادب و شعر میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ مشاعرے کی واہ وا، اسلامی انجمنوں کی سبحان اللہ، داد کی وصولی اور چندوں کی فراہمی، یہ میرے مشاغل رہے ہیں۔ بڑے سے بڑے مشاعرے دیکھ ڈالے ہیں۔ دھڑا دھڑ داد وصول کی ہے۔ ہزارہا انسانوں کو ہمہ تن گوش اور "ہمہ جان" پرجوش کر دیا ہے۔ لاکھوں روپے چندہ دوسروں کی جیبوں سے نکلوا کر انجمنوں کے خزانے میں داخل کرا دیا ہے۔ بڑی بڑی ریاستوں کے رؤسا سے شرفِ ملازمت، حاصل کیا ہے۔ بڑے بڑے لیڈروں، نامی گرامی ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات رہی ہے۔ درباروں میں حاضری کی عزت اور درگاہوں میں زمین بوسی کی سعادت مل چکی ہے۔

بزعم خود اُردو نظم میں نئی نئی اختراعیں کی ہیں۔ گیت لکھے ہیں۔ مناظرِ قدرت کی مصوری کی ہے۔ بحور و اوزان میں تصرفات کئے ہیں۔ بچوں کے لئے شاعری کی ہے۔

میں پنجابی ہوں، لیکن اُردو زبان سے مجھے ایک خاص لگاؤ ہے۔ غلط کہتا ہوں یا صحیح، اُردو ہی میں کہنا پسند کرتا ہوں۔ ابھی زندہ ہوں اور معلوم نہیں کب تک زندہ رہوں۔

حفیظؔ جالندھری

حفیظ کی غزل

احمد ندیم قاسمی

یہ مضمون ابوالاثر حفیظ جالندھری مرحوم و مغفور کے آخری مجموعۂ کلام "چراغِ سحر" کی تقریبِ رونمائی میں، جو پاکستان نیشنل سنٹر لاہور میں منعقد ہوئی تھی، حفیظ مرحوم کی موجودگی میں پڑھا گیا تھا۔ انھوں نے اس مضمون پر پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ ان سے اور ان کے فن سے اظہارِ عقیدت کے طور پر یہ مضمون مکرر شائع کیا جا رہا ہے۔

"حفیظ جالندھری نے لاجواب گیت لکھے ہیں" ــــ "اقبال کے دور میں بھی حفیظ نے اپنی نظموں میں اپنے اسلوبِ خاص کا لوہا منوایا ہے" ــــ "حفیظ نے تاریخِ اسلام کو زبان کی صحت و سلاست اور بیان کی بے پناہ روانی کے ساتھ نظم کر کے اپنی حیرت انگیز قادر الکلامی کا غیر فانی ثبوت مہیا کیا ہے" ــــ لوگ اس طرح کی باتیں تو کھل کر کہہ لیتے ہیں اور برسوں سے کہتے چلے آ رہے ہیں، مگر تعجب ہوتا ہے کہ جس صنفِ سخن میں حفیظ کی شاعری نے ساحری کا کردار ادا کیا ہے اس کی طرف ناقدینِ فن کی توجہ ذرا کم ہی منعطف ہوئی ہے، یہ حفیظ کی غزل ہے۔ کہیں یہ بات تو نہیں کہ ان کی طرف سے حفیظ کی سادگی و پرکاری کے اعتراف سے بعض نامور غزل گو شعراء کے مقامات و مراتب کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہے، یا کہیں یہ بات تو نہیں ہے کہ خیال کے ارتعاش اور جذبے کی موسیقی کا انھیں ادراک ہی حاصل نہیں ہے۔ "چراغِ سحر" کی غزلیں پڑھ کر میرے ذہن میں یہ بہت بڑا استفہامیہ ابھرا ہے کہ حفیظ کی غزل کے ساتھ کماحقہ انصاف کیوں نہیں کیا گیا جبکہ یہ غزلیں اپنے مفاہیم کی بلاغت، اور اپنے الفاظ کے ترنم اور اپنی بحروں کی لطافت کے معاملے میں قطعی طور پر منفرد غزلیں ہیں جن کے حسن اور نوکیلے پن اور جوشیلے پن کا اعتراف نہ کرنا انتہا درجے کی جانبداری یا پھر انتہا درجے کی کور ذوقی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری ایک ہمہ پہلو اور ہمہ رنگ شاعر ہیں۔ ان کے شاہنامے اور قومی و ملی نظموں اور گیتوں سے کوئی بھی دیانتدار نقاد صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان کی غزل کی تحسین کے معاملے میں ان کے ساتھ شعوری طور پر زیادتی ہوئی ہے۔ اس لئے کہ غزل میں حفیظ صاحبِ اسلوب شاعر ہیں اور ان کا لہجہ سراسر ان کا اپنا ہے۔ اس زمانے جب اردو غزل پر فانی، جگر، حسرت، اصغر اور یگانہ حکمراں تھے، حفیظ کی آواز سب سے الگ، سب سے منفرد پہچانی جا سکتی ہے۔ اس آواز میں الفاظ کھنکتے ہیں۔ ان میں نہ شکست خوردگی ہے، نہ اضمحلال ہے، نہ انفعال ہے، نہ حفیظ نے تصوف میں پناہ ڈھونڈی ہے، نہ انھوں نے محض سرخوشی و سرشاری کو غزل قرار دیا ہے، نہ انھوں نے معاملہ بندی کا سہارا لیا ہے، نہ ایک ڈھنگ لفظ پر دوسرا ڈھنگ لفظ دے مارنے سے اپنے غزل کے قاری کو مرعوب کیا ہے۔ انھوں نے تو جب قدیم رنگِ تغزل میں شعر کہا ہے تو بھی اس طرح کا شعر کہا ہے،

آئینہ دیکھیے، مری صورت نہ دیکھیے　　میں آئینہ نہیں، مجھے حیران نہ کیجیے

مگر میں اپنے اس مختصر سے تاثر میں صرف "چراغِ سحر" کی غزلوں تک اپنے آپ کو محدود رکھوں گا۔ ان غزلوں کے پس منظر میں جو حفیظ ابھرتا

ہے اس نے سالہا سال کے تجربات کو ـــــ اور بیشتر نہایت تلخ تجربات کو اپنے اندر کچھ اس طرح سمیٹ رکھا ہے کہ وہ شعر یوں بے ساختگی سے کہتا ہے جیسے باتیں کر رہا ہے:

جو مرے دل میں ہے کہنے دیجئے یا مجھے خاموش رہنے دیجئے

اظہار کی یہ سادگی بڑے بڑوں کو دھوکا دے جاتی ہے مگر سلاستِ اظہار کی اس معراج تک پہنچنے کے لئے بڑی محنت اور ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرزا غالب نے بھی ایک دور میں اس طرح کی سلیس اور بے پناہ غزلیں کہنا شروع کی تھیں:

کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

حفیظ کے اسلوب غزل کی تو نمایاں ترین خصوصیت ہی اظہار کی یہ سادگی ہے، مگر بظاہر ان سادہ الفاظ میں معنی و مفہوم کی جو ایک دنیا آباد ہوتی ہے، اس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے سخن شناسی اور دیانتداری شرط ہے۔ جب حفیظ یہ کہتے ہیں:

نظر آتی ہی نہیں صورتِ حالات کوئی اب یہی صورتِ حالات نظر آتی ہے

یا جب وہ یہ کہتے ہیں:

غم موجود ہے، آنسو بھی ہیں، کھا تو رہا ہوں، پی تو رہا ہوں جینا اور کسے کہتے ہیں، اچھا خاصا جی تو رہا ہوں

تو سیاست اور معاشرت کا ایک پورا "پینورا ما" ہمارے سامنے پھیل جاتا ہے۔ ایک ایک لفظ ایک ایک علامت بن جاتا ہے اور شعر قاری کے ذہنی آفاق میں گونجتا رہ جاتا ہے۔

حفیظ کی اِس عمر میں، ان سے غزل میں سرمستیِ شباب کا تقاضا کرنا شاید بعید از انصاف ہوگا، اگرچہ وہ باز اب بھی نہیں آتے اور اس انداز کے اشعار کہنے پر اب بھی قدرت رکھتے ہیں کہ:

اگر یہ میرے بس کی بات ہوتی ہمیشہ وصل ہی کی رات ہوتی

مگر سالہا سال کے تجربوں اور دانائیوں کو سمیٹ لینے کے بعد ان کے ہاں طنز کی جو کاٹ پیدا ہوئی ہے اسے میں معاصر اردو غزل کا سرمایہ قرار دیتا ہوں۔ حفیظ نے بھی ایک غزل میں خود کو طنز گفتار اور شگفتہ کار کہا ہے اور یہ تعلّی نہیں ہے، حقیقت ہے۔ طنز نگار تو وہ ہمیشہ سے تھے مگر طنز کی چوٹ اس وقت تک زیادہ موثر نہیں ہوتی، جب تک طنز کرنے والا زندگی کے تمام شعبوں میں پس پردہ کارروائیوں پر اور مروجہ نظامِ حیات کے عملی تضادوں اور بوالعجبیوں پر تجزیاتی حد تک حاوی نہ ہو۔ "چراغِ سحر" کی غزلیں بتاتی ہیں کہ حفیظ حاوی ہیں چنانچہ ان کے طنز میں کوئی تصنع، کوئی نہیں ہے۔ اُنھوں نے زندگی کی تلخیوں کو اپنے خون میں کھپا لیا ہے اور انھیں اپنی شخصیت کا ایک ناگزیر حصہ بنا لیا ہے، چنانچہ ان کے طنز کی دھار اس قدر تیز ہو چکی ہے کہ پڑھنے والا ایک بار تو لرز کر رہ جاتا ہے اور فوراً بعد اس کے ذہن کے پردے کے کتنے ہی پہلوؤں کی پرتوں کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

رہزنوں سے تو بھاگ نکلا تھا اب مجھے رہبروں نے گھیرا ہے

بت کدے سے چلے ہو کعبے کو کیا ملے گا تمہیں خدا کے سوا

اللہ عطا پاش و خطا پوش سہی دوست اللہ کے بندوں سے تو ڈرنا ہی پڑے گا

خبر نہ تھی کہ غبارے گرا بھی کرتے ہیں زمیں پہ دیکھ رہے تھے تم آسماں سے مجھے

فقر نے بوریا دیا مجھ کو تن کے میں بادشاہ بن بیٹھا

ہم جس مقام پر ہیں وہاں سب مزے میں ہیں سب کر رہے آہ و فغاں سب مزے میں ہیں

جا رہے ہو، جاؤ، لیکن لوٹ آؤ — لوٹ آؤ جب ہو مطلب دوستو

طنز سے بیشتر انتہا درجے کی تلخی کے ساتھ انتہا درجے کی مایوسی کا تاثر بھی مل سکتا ہے مگر یہ منفی طنز ہوتا ہے۔ حفیظ کا طنز مثبت ہے یہ معاصر صورتِ حالات سے بے اطمینانی اور اصلاحِ احوال کی تمنّا سے توانائی حاصل کرتا ہے اسی لئے حفیظ جب یہ کہتے ہیں کہ:

اب تو کچھ اور بھی اندھیرا ہے — یہ مری رات کا سویرا ہے

تو وہ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ:

آگے آگے چلو تبر والو — ابھی جنگل بہت گھنیرا ہے

مانا کہ حفیظ یوں بھی کہتے ہیں کہ:

جو تن پر رہ گئے تھے چند پرزے — وہ کانٹوں کے سروں پر ہیں کلاہیں

مگر وہ معاشرے کی طرف سے اس نوچا کھسوٹی پر اُداس ہو جانے کے باوجود یہ کہنے کا بھی حوصلہ رکھتے ہیں:

آبروئے حیات کی خاطر — آرزوئے حیات باقی ہے

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے "چراغِ سحر" کے انتساب میں احباب کو "آخری سلام" پہنچانے کے باوجود اور اپنے اس تازہ مجموعۂ کلام کا نام "چراغِ سحر" رکھنے کے باوصف، ایک اور مجموعۂ کلام "طلوعِ سحر" کی اشاعت کی بھی نوید سنائی ہے اور ابھی کہاں۔ ابھی تو حفیظ کی طرف سے ہمیں "چراغِ سحر" اور "طلوعِ سحر" کے بعد "آفتابِ سحر" اور "نصف النہار" نام کے مجموعوں کا بھی انتظار رہے گا کیونکہ حفیظ کو تو ان شاء اللہ ابھی برسوں تک پاکستان کے ایوانِ تہذیب و فن میں گنگنانا اور گونجنا ہے[۱] اور "چراغِ سحر" کی اس انداز کی نامکمل نظموں کی تکمیل کرنا ہے:

اک دن ہم بھی جیتیں گے
ہم ہیں بازی ہارنے والے
جان وطن پر وارنے والے
آج تو بے شک جیت گئے ہیں، ہم کو بھوکا مارنے والے
لیکن اک دن
اک دن ہم بھی جیتیں گے

جیت کی دنیا رنگ برنگی
ہار کی دنیا بھوکی ننگی
جیت کی توندیں موٹی موٹی، ہار نہ پائے سوکھی روٹی
لیکن اک دن
اک دن ہم بھی جیتیں گے

---

[۱] اکبر الٰہ آبادی کا ایک مصرع ہے: دعائیں عرش پر جاتی تو ہیں، کچھ کر نہیں آتیں!

احسان دانش ــ مختصر خود نوشت

احسان دانش

حضرت نیاز فتح پوری کے ماہنامہ "نگار" نے جنوری فروری ۱۹۴۱ء میں "جدید غزل گو شعراء نمبر" شائع کیا تھا۔ احسان مرحوم کی یہ خود نوشت اسی خاص شمارے سے ماخوذ ہے۔

میرا نام احسان الحق ہے اور والد کا نام قاضی دانش علی۔ سنہ پیدائش ۱۹۱۴ء ہے۔ آبائی وطن قصبہ باغپت ضلع میرٹھ ہے۔ والد صاحب وہاں سے سکونت ترک کر کے کاندھلہ چلے آئے تھے۔ کاندھلہ (ضلع مظفر نگر۔ یو۔پی) میرے نانا ابو علی شاہ صاحب کا وطن ہے جو ایک معمولی سپاہی تھے۔

میرے والد قاضی دانش علی اچھی خاصی جائداد کے مالک تھے لیکن کم علمی اور شرافت نے تمام جائیداد سرمایہ دار اقربا کے قبضہ میں پہونچادی اور جب میں نے ہوش سنبھالا تو میرے والد صاحب ایک ٹھیکہ دار کے پاس مزدوروں کے جماعت دار تھے اور جب ٹھیکہ ختم ہوجاتا تھا تو خود بھی بیلچہ اور پھاوڑے سے مزدوری کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ اسکول میں مجھے تیسری جماعت تک تو کوئی احساس نہ ہوا لیکن جب تیسری جماعت پاس کر چکا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ والد نے والدہ سے کہا کہ احسان نے تیسری جماعت تو پاس کر لی ہے۔ اب چوتھی جماعت کی کتابوں کے لئے رقم کہاں سے آئے۔ والدہ یہ سُن کر کچھ دیر تک تو خاموش رہیں اور پھر جس قدر تابنے کے برتن تھے لاکر ڈھیر لگا دیا اور کہا کہ ہم مٹی کے برتنوں میں بھی کھانا کھا سکتے ہیں لیکن احسان کو یہ علم کہاں نصیب ہوگی۔

یہ دیکھ کر مجھے پہلی دفعہ والدہ کی محبت اور اپنی مفلسی کا احساس ہوا۔ میرے غریب والدین چوتھی جماعت کے بعد مجھے تعلیم نہ دلا سکے اور میں بھی اپنے والد صاحب کے ہمراہ مزدوری پر جانے لگا۔ میرے والد صاحب کو اوّل سے کتابیں سننے کا شوق ہے چنانچہ میں تمام دن مزدوری کرتا اور شام کو اپنے والد صاحب اور اُن کے چند دوستوں کو جو شام کو بیٹھک میں آجایا کرتے تھے کتابیں پڑھ کر سناتا۔ فسانۂ عجائب، آرائش محفل، قصہ ممتاز، الف لیلہ اور فسانۂ آزاد اور منظوم کتب میں سے مثنوی میر حسن، نل دمن، دیوان میر تقی، دیوان نظیر اکبر آبادی اور کلام انیس کا مطالعہ انہیں دنوں کا ہے اور یہ تمام کتابیں قبلہ قاضی محمد ذکی صاحب ذکی مرحوم کے کتب خانہ سے آتی تھیں جو میرے اُستاد تھے۔

قاضی محمد ذکی کاندھلہ کے رؤسا میں سے تھے اور پرانی وضع کے بہترین شاعر اور شاعر سے زیادہ انسان، مہمان نوازی، دوست پروری اور شاعرانہ والہانہ پن اُن میں بدرجہ اُتم موجود تھا۔ عمر کے آخری تیس پینتیس سال تک وہ گوشہ نشین رہے۔ اور ۱۹۳۹ء میں انتقال ہوا۔ لاولد ہونے کے باعث اُن کی تمام تر جائیداد پر ہنوز حکومت کا قبضہ ہے۔

مجھے مزدوری کی کمیابی نے میونسپلٹی کی چپراس باندھنے پر مجبور کر دیا لیکن افسران کے برتاؤ اور اعزہ کی سفاکی نے وطن ترک کرا کے لاہور لا پھینکا۔ اس وقت میرے والد ضعیفی کے باعث مزدوری کے قابل نہ رہے تھے۔

لاہور آکر بھی مجھے اُسی آبائی کام یعنی معماروں کے پاس اینٹیں اٹھانے کی مزدوری کے سوا کوئی ذریعۂ معاش نہ ملا۔ دیال سنگھ کالج کی لائبریری، پنجاب یونیورسٹی کے دفتر اور لیبارٹری کے علاوہ اور بہت سی عمارات پر مجھے مزدوری کرنے کا فخر حاصل ہے۔ کتابیں پڑھنے کا مجھے اوّل سے ایسا چسکا تھا کہ مزدور دوپہر کو آرام کیا کرتے تو میں کتابیں پڑھنے میں مصروف رہتا۔ کبھی کبھی اس عالم میں دیکھ کر ٹھیکہ دار کہا کرتا کیوں بے احسان منشی بنے گا؟ اور میں یہ سن کر خاموش ہو جاتا۔

مزدوری سے ترقی کرتا رفتہ رفتہ معماری تک پہنچ گیا لیکن اس وقت مجھے پستی اور بلندی میں اچھا خاصا امتیاز ہو گیا تھا۔ چنانچہ علم کو مقصدِ زندگی قرار دے کر معماری تو ترک کی اور لاہور کی مشہور سیرگاہ شملہ ہل پر چوکیداروں میں نوکر ہو گیا۔ وہاں شام کے سات بجے سے ڈیوٹی پر جاتا اور صبح سات بجے تمام رات پاسبانی کر کے اپنے مکان پر لوٹ آتا۔ مکان میں کئی جے پور کے دیہات کے مزدور رہتے تھے اور میرے حصے میں اُس مکان کا ایک غسلخانہ تھا جس کا کرایہ میں چھ آنہ مہینہ ادا کرتا تھا۔ جگہ کی قلت کے باعث اُس میں چارپائی کی گنجائش نہ تھی۔ اس لئے ایک بوریا ہی میرا بستر تھا۔ اُن دنوں سے آج تک زمین پر سوتا ہوں۔

چوکیداری کی راتوں کا سناٹا، مفت کی سرکاری روشنی اور مصروف تنہائی مجھے ابھی تک نہیں بھولتی۔ اُن دنوں چار سو ساڑھے چار سو صفحات کا یومیہ مطالعہ میری زندگی کا معمول تھا۔ چوکیداری کی جگہ تخفیف میں آجانے کے بعد مجھے ریلوے دفتر میں چپراسی کی جگہ ملی۔ اس وقت چند لکھے پڑھے آدمیوں سے میرے تعلقات ہو گئے تھے۔ شعر و شاعری کا شوق یوں تو مجھ میں اوّل سے قبلہ قاضی محمد ذکی صاحب ذکی کے فیض و صحبت سے بیدار تھا اور جب کوئی اچھا شعر سنتا تو بے تاب ہو جاتا۔ مصرعے تو اکثر اور کبھی کبھی پورا شعر اور بعض اوقات دو دو تین تین شعر بلا تکلف ہو جایا کرتے تھے لیکن چونکہ اپنے شاعر ہونے کا یقین نہیں تھا اس لئے نہ تو وہ شعر محفوظ ہیں اور نہ یہ اندازہ کہ شعر کب سے کہتا ہوں۔ گھر اور دوستوں میں بھی کوئی ایسا شخص نہ تھا جسے یہ خیال ہوتا۔ لاہور کے دورانِ تعلیم میں بھی میرے دوست توقیر طاہر گنگوہی کے سوا کوئی ایسا نہیں جس نے میری حوصلہ افزائی کی ہو اور وہی شخص مجھے پہلی بار کھینچ تان کر لاہور کے ایس۔ پی۔ ایس کے ہال کے مشاعرہ میں لے کر گیا اور مجھ سے میری ایک غزل پڑھ کر پبلک سے روشناس کرایا اور اُسی دن سے مجھے یہ بھی احساس ہونے لگا کہ میں شاعر ہو سکتا ہوں اور اُسی بنا پر مطالعہ میں اس قدر منہمک ہو گیا کہ آج تک چوبیس گھنٹے میں سے صرف چار گھنٹے آرام کرتا ہوں۔ اگرچہ مشق کے طور پر اشعار تو نہ جانے کتنے کہے ہوں گے لیکن جو کہتا تھا اُن میں توقیر طاہر صاحب جو اچھا شعر سمجھتے تھے وہ رکھ لیتے تھے اور جو بے معنی ہوتا ضائع کر دیتے۔ وہ شاعر ہوں یا نہ ہوں لیکن شعر فہم ایسے اچھے ہیں کہ اُن کے انتخاب کو ہر بیدار دماغ پسند کرتا ہے۔ میرا آج تک کا جس قدر کلام ہے وہ تمام تر جناب توقیر طاہر کی توجہ اور احتیاط کا نتیجہ ہے۔

تفریح پسند دوستوں اور دفتر میں کلرکوں کے رویہ نے مجھے چپراسی سے دستبردار کر کے باغبانی پر مجبور کیا اور میں گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں ایک باغبان کی معاونت میں کام کرنے لگا لیکن عہدہ داران کی نجی خدمات اور جمعداروں کی بے جا چاپلوسی کی خواہش نے بہت جلد یہ کام بھی چھڑا دیا اور پھر میں بیس روپیہ ماہانہ پر گیلانی بکڈپو میں ایک عرصہ تک ملازمت کرتا رہا۔ لیکن پھر تنخواہ میں تاخیر شروع ہوئی اور ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہونچی جب چار ماہ تک تنخواہ سے محروم رہا تو وہاں سے بھی دامن کش ہوا اور مکتبۂ دانش کے نام سے اپنا ذاتی کتب خانہ قائم کیا۔ اب اُسی کی تعمیر میں اپنی تمام تر قوتوں سے منہمک ہوں۔

میرا سرمایۂ شعری زیادہ تر نظموں پر مشتمل ہے۔ لیکن چونکہ فرمائش صرف غزلوں کے انتخاب کی ہے اس لئے جو کچھ کہی ہیں ان میں سے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

احسان دانش ۱۹ اگست [illegible]

احسان دانش | چند یادیں

ڈاکٹر غلام حسین اظہر

انسان کی پہچان بہت چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتی ہے۔ معمولی معمولی واقعات انسانی ذہن پر انمٹ نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ یہی نقوش ہمیں کسی کے قریب اور کسی سے دور لے جاتے ہیں۔

احسان صاحب سے میرے نیازمندانہ تعلق کا آغاز ایک بہت ہی معمولی واقعے سے ہوا۔ میں زمیندارہ کالج میں بی۔ اے کا طالب علم تھا اور کالج کی بزمِ اقبال سے وابستہ تھا۔ احسان صاحب ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے تشریف لائے۔ مشاعرے کے بعد کھانے کی دعوت چوہدری ظہور الٰہی مرحوم نے دی۔ وہاں شعراء کے ساتھ بزمِ اقبال سے تعلق کی وجہ سے میں اور ریاض الماسی جواب ریاض جہمی لکھتے ہیں آ گئے۔ مقامی شعراء میں سے اس محفل میں مسرور کپور تھلوی بھی شریک تھے۔ مسرور کپور تھلوی زمیندارہ کالج کی ڈسپنسری کے انچارج تھے اور پرانے انداز میں بہت اچھا شعر کہتے تھے۔ ان کا ایک شعر سب طلبا کو ازبر تھا۔

ملاقاتِ حسیناں چھوڑ دوں، توبہ، معاذ اللہ — یہی اک شے ہے جس نے آج تک رکھا جواں مجھ کو

مسرور صاحب کا ایک مقامی شاعر نے احسان صاحب سے تعارف کروانا چاہا۔ احسان صاحب نے کہا "صاحب میں ان سے مدت سے واقف ہوں۔ ان کا شمار اس وقت اساتذہ میں ہوتا تھا جب میں نے قلم پکڑنا سیکھا تھا"۔ ایک گمنام اور گوشہ نشین شاعر کا اس قدر احترام ــــ! اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ احسان صاحب میں انکسار اور احترامِ آدمیت کا جذبہ بلا کا ہے۔

یہی تاثر بعد میں اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ اس نوعیت کا ایک اور واقعہ میرے دل و دماغ پر نقش ہے۔ جسے میں کبھی نہیں بھلا سکا۔ شامِ ہمدرد کی تقریب لاہور کے ایک بڑے ہوٹل میں تھی۔ چائے نوشی کے دوران ایک بیرے نے احسان صاحب کو آ کر سلام کیا۔ احسان صاحب بڑے تپاک اور گرم جوشی سے ملے۔ چند منٹ تک گفتگو کرتے رہے۔ محفل کے اختتام پر میں نے پوچھا "احسان صاحب، یہ کون تھے؟"

احسان صاحب نے کہا "ہمارا چوکیدارے کے زمانے کا ساتھی ہے"۔

اپنے چوکیدارے، چپراس اور مزدوری کے دور کے ساتھیوں سے ان کا ہمیشہ یہی سلوک رہا۔ انہوں نے کبھی ماضی کے اس زمانے پر خفت محسوس نہ کی۔ وہ ہمیشہ اس دور پر فخر کرتے۔ جب بھی ان کا کوئی پرانا ساتھی مل جاتا تو بے حد خوش ہوتے۔ موڈ میں ہوتے تو بہت سی باتیں سناتے۔ ان ماضی کی یادوں میں امرتسر کے مشاعرے میں پہلی بار ان کی شرکت کا ذکر ہوتا جو وہ اکثر بلا کم و کاست سناتے۔ "اس وقت ان کی شہرت کا آغاز نہیں ہوا تھا"۔ میں کالے کھدر کی معمولی شیروانی پہنے تھا۔ راستے میں یہ گرد آلود ہو کر بھوری ہو گئی۔ میں جب پہنچا تو مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ میری ہیئت کذائی کو دیکھ کر مجھے اندر کوئی داخل نہیں ہونے دیتا تھا۔ مشکل سے اندر گھسا اور آہستہ آہستہ اسٹیج کے پاس پہنچا۔ فرخ امرتسری سٹیج سیکرٹری تھے اور شیخ عبدالقادر صدارت فرما رہے تھے۔ میں نے فرخ صاحب سے غزل پڑھنے کی اجازت چاہی۔ میں اٹھتا تو وہ میرے

سر پہ ہاتھ رکھ کر یوں دباتے کہ مجھے بیٹھتے ہی بن پڑتی۔ آخر انہوں نے تنگ آکر کہا "غزل دکھاؤ"۔ میں نے سوچا، شاید غزل دیکھ کر پڑھنے کی اجازت نہ دیں۔ چنانچہ میں نے کہا "غزل کیوں دکھاؤں؟ آپ سے اچھی کہہ سکتا ہوں"۔ انہوں نے میری ہنسی اُڑانے کو میرا نام پکارا۔ مجھ سے پہلے اختر شیرانی پڑھ رہے تھے۔

اختر شیرانی صاحب کے بعد جب میں پڑھنے لگا تو لوگوں نے "ملائی کا برف"، "ملائی کا برف" کی صدائیں لگانی شروع کیں۔ آدمی اُن دنوں بھی ایسا ہی حسین تھا۔ چند منٹ شور و غوغا رہا۔ پھر عبدالقادر صاحب اٹھے۔ انہوں نے کہا "آپ کی تالیاں انہوں نے سنیں۔ اب ان کی غزل آپ سن لیجئے"۔

جب میں نے غزل پڑھی تو عبدالقادر صاحب نے کہا "میڈل آپ کا ہو گیا"۔ اس کے بعد دوبارہ غزل پڑھی تو ہندوؤں کا میڈل بھی جیت گیا۔ تیسری بار غزل پڑھی تو ایک سکھ نے مجھے بیس روپے انعام دیئے۔ مجھے بیس روپے کی بہت خوشی ہوئی۔ میری تنخواہ چودہ روپے تھی۔ میں خوش ہوا کہ ڈیڑھ ماہ کی تنخواہ مل گئی۔ مشاعرے کے بعد فرخ امرتسری جو مجھے دبا کے بٹھا دیتے تھے، میرے گہرے دوست بن گئے۔ وہ کار میں مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے آئے"۔

احسان صاحب ایک بات خاص طور پہ بتاتے کہ مشاعروں سے انہیں جو رقم ملتی، وہ ریزگاری کی صورت میں لے جا کر، والدہ محترمہ اور والد صاحب کے قدموں پر رکھ دیتے تاکہ وہ خوش ہوں۔ مشاعرے میں تقدیم و تاخیر کے بارے میں مجھے احسان صاحب کے رویے کا علم نہیں، لیکن چھپنے کے سلسلے میں وہ اس چکر سے بالکل بے نیاز تھے۔ ماہنامہ سیارہ سے تعلق کے دور میں ان کے پاس ان کے کلام کے لئے اکثر حاضر ہوتا۔ وہ بیاض دے دیتے اور فرماتے "یہ غزل نقل کر لو"۔ ایک بار میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا "احسان صاحب، آپ کی غزل، افسوس ہے صحیح مقام پہ نہیں چھپی"۔ کہنے لگے "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمیں جہاں جی چاہے، ٹھونک دو"۔

ان کی یہ بے نیازی، خود شناسی کی عطا تھی۔

انکساری، بے نیازی اور خود شناسی کے ساتھ ساتھ احسان صاحب میں خودداری کا جوہر بھی بلا کا تھا۔ اختر حسین صاحب ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ گورنری کے دور میں ایک بار انہوں نے احسان صاحب کو ملاقات کے لئے بلایا۔ احسان صاحب ٹوپی پہن کر کھدر کے لباس میں حسبِ معمول اختر صاحب سے ملاقات کے لئے گئے۔ گورنر کے ایک ملازم نے انہیں دیکھ کر کہا "آپ کو گورنر سے ملنا ہے؟"

احسان صاحب نے بڑے تیکھے انداز میں کہا "مجھے نہیں، گورنر کو مجھ سے ملنا ہے"۔

یہ سُن کر ملازم دنگ رہ گیا۔ اس نے ملاقاتیوں کی فہرست دیکھی تو احسان صاحب کا نام سرِ فہرست تھا۔ شرمندہ ہو کر بہت معذرت چاہی۔

ایک بار پھر کسی تقریب میں اختر حسین صاحب نے انہیں شرکت کی دعوت دی۔ تقریب ایسے ہوٹل میں تھی، جہاں شرکت کے لئے پتلون کوٹ یا شیروانی میں ملبوس ہونا ضروری تھا۔ احسان صاحب نہ گئے۔ ایک روز بعد اختر حسین صاحب نے پوچھا، "احسان صاحب، آپ اس تقریب میں تشریف نہیں لائے"۔

احسان صاحب نے کہا "شیروانی مل جائے تو آؤں گا"۔

احسان صاحب سے ملنے بڑے سے بڑے آدمی آتے، لیکن احسان صاحب کے رویہ میں کسی کے لئے کوئی فرق نہ پڑتا۔ کبھی کسی کے لئے تعظیماً نہ اٹھتے۔ اس میں استثنا صرف اہلِ علم کے لئے ملحوظ رکھتے۔ اہلِ علم کے لئے وہ سراپا نیاز ہوتے۔ علم الدین

سالک، برہان احمد فاروقی وغیرہم کے لئے جس احترام کا مظاہرہ کرتے تھے، وہ انہوں نے اور کسی کے لئے کبھی نہ کیا۔ حبیب اللہ سعدی شورش کاشمیری اکثر آتے، بڑی عقیدت و احترام سے احسان صاحب سے ملتے، لیکن ان حضرات کے لئے وہ تعظیم کہاں جو وہ مقتدر اہلِ علم کے لئے روا رکھتے۔ کسی صاحب شدت سے رسم و راہِ ادب کے حوالے سے پیدا ہوئی تو ذاتی کام کے لئے کہتے انہیں کم ہی دیکھا گیا، البتہ ورحاجت مند طلباء کی مدد کے لئے انہیں ضرور کہہ دیتے۔ ایک دو طالب علم ان کے ہاں اکثر رہتے۔ جن کی وہ حتی المقدور کفالت کرتے تھے۔ وہ فرماتے "یہ کاندھلے کی روایت ہے۔ وہاں وہی آدمی قابلِ احترام سمجھا جاتا تھا جو طالب علموں کی مدد کرے"۔ ان کے اندر کسی قسم کی محرومی کا احساس نہیں تھا۔ صرف حسبِ خواہش تعلیم نہ پا سکنے کا انہیں قلق تھا۔ کہتے "اگر یونیورسٹی میں جیراس بر وقت مل جاتی تو میں تعلیم کو جاری رکھ سکتا"۔ اسی محرومی کی تلافی کے لئے وہ زندگی بھر کتابیں اکٹھی کرتے رہے۔ بڑی بڑی نایاب کتابیں جمع کیں۔ تحقیقی کام کرنے والے حضرات ان کے یہاں پورے برصغیر سے حاضر ہوتے اور وہ ان کی پوری پوری مدد کرتے۔ بڑے افسوس سے کہتے "میں نے اپنے مطالعے کے لئے کتابیں جمع کیں اور انہیں بچوں کے لئے فروخت کر رہا ہوں"۔

بچوں کی تعلیم کے لئے گھر پر چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا، لیکن رجسٹریشن کے لئے دوڑ دھوپ ان کے بس کا کام نہیں تھا اس لئے مجبوراً یہ مدرسہ بند کرنا پڑا۔ اکثر کہتے "اگر استطاعت ہو تو جی چاہتا ہے، موزوں جگہ پر یونیورسٹی قائم کروں"۔ کئی طالب علموں کی ان کی مدد اور رہنمائی سے زندگی سنور گئی۔ جہاں تک ممکن ہوتا اپنے عزیزوں اور دوستوں کی عملی زندگی میں معاونت کرتے، دلجوئی فرماتے۔ بے روزگاری کے ایک دو سالوں میں جن حضرات نے میری مدد کی، ان میں احسان صاحب بھی تھے۔ شورش صاحب کو مجھے "چٹان" میں رکھنے کو کہا۔ چند روز میں نے کام کیا لیکن مجھے نباہ مشکل نظر آیا تو میں خود ہی اس ملازمت سے بھاگ گیا۔

زندگی میں انہوں نے جو دکھ جھیلے ان دکھوں نے انہیں بہت کچھ سکھایا۔ ان مشاہدات کی وجہ سے انہیں سرمایہ دار طبقے سے کسی بھلائی کی توقع کبھی نہ رہی۔ بڑی بھاری بھرکم گالی دے کر اس طبقے کو یاد کرتے۔ ایک واقعہ جس نے انہیں اس طبقہ سے ہمیشہ کے لئے بدظن کر دیا، اس کا ذکر اکثر صحبتوں میں کرتے۔ سرمایہ دار طبقے کی رذالتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے "میں نے دیکھا، ایک زمیندار کے ہاں ایک کمین بیگار کرتا تھا۔ اس کی بیوی اس کے ساتھ کام کرتی تھی۔ اس کی بیوی کے ہاں بچہ پیدا ہوا، اور وہ ایک دن نہ آ سکی۔ زمیندار نے اس سے پوچھا کہ آج کیوں بیوی کو ساتھ نہیں لائے۔ اس نے وجہ بتائی، لیکن زمیندار نے کہا کہ میں کچھ نہیں جانتا، کل اسے لے کر آنا۔ چنانچہ دوسرے دن وہ اپنی بیوی کو اسی تکلیف کی حالت میں لے کر آیا"۔ یہ واقعہ سناتے ہوئے وہ آبدیدہ ہو جاتے اور کہتے "اس واقعہ نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ مجھے سرمایہ داروں اور زمینداروں سے نفرت ہو گئی۔ اور میں نے ارادہ کر لیا کہ زندگی بھر زمینداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف جہاد کروں گا اور خدا نے اگر توفیق دی تو مزدور اور کسان کی سہولت کے لئے بھی جد و جہد کروں گا"۔ اسی واقعے کے حوالے سے کہتے کہ "اس واقعے نے میرے فن کا رُخ بھی بدل ڈالا۔ اس سے قبل میں غزل ہی کہتا تھا، لیکن اس کے بعد میں نے نظم کہنی شروع کی، اور اس دن سے تو میری یہ حالت ہو گئی ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے ہر پامال منظر مجھے آواز دے رہا ہے کہ مجھے نظم کر دو۔ میری نظم میں کہیں بھی صرف تخیل کی پرواز نہیں، یہ سب میرے مشاہدات ہیں"۔ کبھی کسی نظم کا پس منظر بھی خود ہی بیان کر دیتے۔ "جشنِ بیچارگی" جو ان کی شہرۂ آفاق نظم ہے۔ اس کے بارے میں بتلاتے "وہ شادی جس کا اس میں ذکر ہے، اس میں، میں خود شریک تھا، یہ ہمارے ایک مزدور دوست کی بچی کی شادی تھی۔ برات کو گڑ کا شربت پلایا گیا، اور اس کے بعد وہ اندوہگیں منظر سامنے آیا جس کی ترجمانی میں نے کی ہے"۔ مظلوم و مجبور طبقے کی ترجمانی میں ہی ان کے فن کی عظمت مضمر ہے۔ مشاہدے کو قلم کی زبان سے پیش کرنے میں وہ نظم ہو

غزل یا قطعہ، وہ بے حد کامیاب رہے۔ لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ احسان صاحب کی شاعری اور شخصیت کو اُجاگر کرنے کے لئے جو توجہ ترقی پسند تحریک کو دینی چاہیئے تھی وہ نہ دی گئی، حالانکہ جدید ادب ترقی پسند تحریک، دونوں کے ساتھ وہ ہم قدم رہے اور یہ ہم قدمی زندگی سے ان کے گہرے تعلقات کی عطا ہے۔ ان کے ساتھ ابھرنے والے بہت سے شعرا اپنی زندگی میں ہی سکۂ متروک ٹھہرے۔ لیکن وہ تنہا ایسے شاعر تھے جن کا فن بتدریج ارتقا پذیر اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ نئی نسل سے انہوں نے رابطہ برقرار رکھا۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ نئی اور پرانی نسل کا بُعد اسی صورت میں ختم ہو سکتا ہے کہ نوجوان بوڑھوں سے نہ بدکیں اور بزرگ نوجوانوں کو گمراہ قرار نہ دیں۔ نئی نسل کی شاعری کے متعلق ہمیشہ یہ کہتے "ہماری جو انتہا تھی وہ فیضؔ اور ندیمؔ کی ابتدا ہے۔ اس لئے ان کا فن میں آگے ہونا فطری امر ہے"

احسان صاحب نے اپنی بزرگی اور مذہبیت کو کبھی تنگ نظری کا شکار نہیں ہونے دیا۔ وہ کٹر مذہبی آدمی ہونے کے باوجود اختلاف کو برداشت کرلینے کے قائل تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں اولیاء اللہ سے والہانہ شیفتگی ہوتی ہے۔ ہر جمعرات کو وہ باقاعدگی سے صبح سویرے داتا دربار حاضری دیتے۔ پھر اپنے احباب کی قبروں پہ فاتحہ پڑھتے۔ یوں جمعرات کا سارا دن وہ فاتحہ خوانی میں صرف کر ڈالتے۔ کبھی کوئی پوچھتا " احسان صاحب، اتنا اہتمام کیوں"؟ تو فرماتے" میرے احباب کی تعداد اُدھر بڑھ گئی ہے۔ ان کا حق ادا کرنے کو ہفتے میں ایک دن رکھا ہے" جمعرات کی شام کو فاتحہ خوانی ضرور کرتے۔ ایک بار سجاد حارث بھی بیٹھے تھے۔ کہنے لگے "کیا منگواؤں" سجاد حیدر نے برجستہ کہا " احسان صاحب! آج اللہ میاں کے حضور ورائٹی شو ہی ہو جائے"۔ اس فقرے پہ احسان صاحب ہنس دیئے۔ نماز کے وقت بیٹھے بیٹھے قبلہ کی طرف رُخ کرتے اور کہتے۔ " بیٹھو میں ذرا دو ٹکریں لگالوں"

اس کشادہ دلی اور وسیع النظری کی وجہ سے ان کے یہاں ہر مکتبِ فکر کے لوگ آتے اور اپنی بات کھل کر کہتے۔ ایک بار میں نے سجاد حارث صاحب کے بارے میں پوچھا "ان کا کیا حال ہے"؟

فرمایا "اس کا کیا پوچھتے ہو۔ اللہ تعالےٰ کے بارے میں چون و چرا کرتا ہے لیکن ایک نجومی کی بات مان گیا ہے۔ بیرونِ ملک جارہا تھا۔ نجومی نے کہا ہے یہ سفر خطرناک ہے۔ اس نے اپنا پروگرام منسوخ کر دیا ہے"

ایک بار کہنے لگے "سجاد حارث ہر سال نوکری یوں تبدیل کرتا ہے جیسے لوگ جوتا بدلتے ہیں"

وہ فقرہ کہتے، فقرہ سنتے، تفنن طبع کے لئے بہت سی باتیں کہہ جاتے۔ ایک بار احسان صاحب کو خوش گپیوں کے دوران ایک نوجوان نے پوچھا "احسان صاحب کیا آپ نے عشق بھی کیا ہے"؟

کہنے لگے " ہاں کیا ہے، جتنا پندرہ روپے ماہوار میں ہو سکتا ہے"

کبھی کبھار موڈ میں ہوتے تو بہت سی گفتنی و ناگفتنی باتیں بھی کہہ جاتے۔ ایک بار مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا ذکر آیا۔ ان کے سوانح کی بات چل نکلی۔ اور عشقیہ قصوں کی بھی، جنہیں مولانا نے قلم بند کیا ہے، کہنے لگے "سب سے بڑی زیادتی تو یہ ہے کہ تم لوگ چاہتے ہو کہ بڑا آدمی نامرد بھی ہو"

لیکن وہ وسیع المشربی میں خوش ذوقی کی حد سے آگے نہ بڑھتے۔ اسی وجہ سے ان کے سوانح ان خرافات سے خالی ہیں جو ان کے معاصرین کے سوانح میں ہیں۔ سوانح کے اس فرق کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر بالکل واضح تھا۔ ایک بار میں نے پوچھا، "احسان صاحب آپ کے یہاں اعترافات نہیں۔ جوش صاحب نے بہت سی باتیں کہہ دی ہیں" کہنے لگے "جوش صاحب بہت

کچھ کہنے کے باوجود بہت سی باتیں چھپا گئے ہیں، جن کا ہمیں علم ہے۔ سب کچھ کہنا ممکن نہیں۔ آدمی کہیں نہ کہیں صداقت کے دعووں کے باوجود ڈنڈی ضرور مار جاتا ہے۔ سوانح لکھتے ہوئے میرے پیش نظر ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ پستیوں کو مقام دینا کوئی اچھی بات نہیں اور محاسن کو بلند کرنا انسانیت کے حق میں مفید پڑتا ہے۔ اعتراف میرے مشرب میں اقرارِ گناہ ہے۔ مجھ جیسے درویش کا مسلک یہ ہے کہ گناہوں کا گواہ خدا کے سوا کسی کو نہیں بنانا چاہیئے کیونکہ بعض لوگ جو پستی سے اٹھ کر بلندی کے زینے پہ پہنچتے ہیں۔ عوام ان کے اعترافِ جرم و گناہ کو بلندی کی بنیاد سمجھ لیتے ہیں۔ اور میرے خیال میں اس اعتراف کے تنے سے ہزاروں گناہِ جاریہ کی شاخیں نکل نکل کر طول ہوتی جاتی ہیں، اور شفاف راستوں کو گھیر لیتی ہیں۔ ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ اعترافِ گناہ کی پشت پناہی میں عیسائیت کا پشتارہ ہے۔ میرے سامنے قرآنی تصور تو یہ رہا ہے، عیسائی دوسروں کے سامنے اعترافِ گناہ کر کے یہ خیال کرتے ہیں کہ بارِ گناہ سے نجات پائی۔ ہم مسلمان تنہائی میں توبہ سے اپنے گناہ دھوتے ہیں، ان کا چرچا نہیں کرتے۔ اسی حقیقت کو میں نے جہانِ دانش میں ہمیشہ سامنے رکھا۔"

ایک بار باتوں باتوں میں شورش کاشمیری کہنے لگے "استاد! خدا ہمارا حساب کیا لے گا۔ انسانیت کے اتنے بڑے قاتل ہیں، مسولینی، ہٹلر، ہنی بال . . . . کہ ہمارے گناہ ان کے سامنے عشرِ عشیر بھی نہیں۔"

اس پر احسان صاحب کہنے لگے "تم تو فرشتوں اور اللہ تعالےٰ کو مخمصے میں ڈال دو گے۔ بار بار ورق پلٹنے پڑیں گے یہ دیکھنے کو کہ تم نے پہلے کیا کہا تھا، ہر دس پندرہ صفحے کے بعد تمہارا بیان مختلف ہوگا۔"

شورش صاحب نے قہقہہ لگایا اور خاموش ہو گئے۔

ایک بار باتوں باتوں میں اس بات کا ذکر آیا کہ پنجاب یونیورسٹی میں زندہ شاعروں اور ادیبوں پر تھیسس لکھنے کی اجازت نہیں ملتی۔ کہنے لگے "ہمیں، جو کچھ لکھنا تھا، لکھ دیا۔ اب تو مرنا ہی باقی ہے۔" پھر کہا "بس ایک شرط لگا رکھی ہے حفیظ سے کہ میں تمہاری فاتحہ پڑھوں گا۔ وہ کہتا ہے میں تمہاری فاتحہ پڑھوں گا اور حلوہ مانڈہ کھاؤں گا، اسی شرط کی وجہ سے ہم جیئے جا رہے ہیں۔"

لیکن موت ہماری شرطوں اور آرزوؤں کا انتظار کہاں کرتی ہے!

ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم

ایوب رومانی

خدا لالہ موسیٰ والوں کو سلامت رکھے مگر آج یوں لگتا ہے جیسے اس شہر سے میرا واسطہ یا ناتا ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا ہے۔ سارے شہر میں صرف ایک ہی تو "کاشانۂ روشن" تھا وہ بھی اندھیروں میں ڈوب گیا۔ آج یوں لگ رہا ہے جیسے ہم غریب ہوگئے ہیں ا بہت غریب۔ سارے ملک میں ایک بھی ایسا فنکار نہیں رہا جو اتنا پُر وقار سریلا یمن کلیان، گا ناہمیں سُنا سکے۔ میں ابھی ابھی اس فنکارہ کو مٹی میں دبا کر لوٹا ہوں۔ جب میں نے آخری دیدار کیا تو یوں لگتا تھا جیسے ملکۂ موسیقی آنکھیں موندے بڑی میٹھی نیند سو رہی ہوں، جی چاہا ان سے پوچھوں کہ اے کیرانہ گھرانے کی امین! آپ تو بلمپت کی ملکہ تھیں، یہ آج جانے میں آپ نے اتنی دُرت کیوں دکھائی؟ مگر چُپ رہا شاید اس خیال سے کہ جواب نہیں ملے گا یا یہ کہ روتے روتے میری آواز نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اور پھر میرا ذہن کلکتہ کی رپن سٹریٹ کی طرف لوٹ گیا۔

یہ ذکر ہے رپن سٹریٹ کلکتہ کا جہاں ایک بچی بڑی خوش الحانی سے قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھی۔ اس لڑکی کا نام وحیدہ خانم تھا۔ گلی سے کسی بزرگ کا گذر ہوا تلاوت قرآن شریف کی آواز کانوں میں پڑی تو بچی کے پاس چلے آئے اور خاموشی سے بیٹھے تلاوت سنتے رہے۔ جوں ہی اس نے تلاوت ختم کی تو گھر والوں سے پوچھا،

"کیا نام ہے اس بچی کا؟"

جواب ملا "وحیدہ خانم"

حکم ہوا "اس کا نام روشن آرا رکھو۔ اس کا نام دنیا میں روشن ہوگا۔"

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ روشن آرا نے جلد ہی بامِ شہرت کی بلندیوں کو چھو لیا۔ وہ فنِ موسیقی کے آسمان کا ایسا درخشندہ اور تابندہ ستارہ بن گئیں جس کی دمک کے سامنے دوسرے ستارے ماند پڑ گئے۔ دینی تعلیم کے ساتھ خاں صاحب لڈن خاں اس بچی کو موسیقی کی تعلیم دینے لگے اور کچھ عرصہ کے بعد روشن آرا استھائی انترہ کچھ اس سلیقے سے اکٹھا کرنے لگیں کہ سننے والے حیران رہ جاتے۔ خدا کی دین اچھی آواز اور ذہانت تو موجود ہی تھی، چند برسوں میں استاد لڈن خاں صاحب کا سارا علم روشن آرا کے سینے میں سما گیا۔ ان دنوں رحمت سنگیت خاں صاحب عبدالکریم خاں کے گانے کا بہت شہرہ تھا۔ عقیدت مند انہیں سُر کا دیوتا مانتے اور ان کے قدموں پر عزت و احترام کے ایسے پھول نچھاور کرتے جو بعد میں شاید ہی کسی دوسرے فنکار کو نصیب ہوئے ہوں۔ روشن آرا بیگم کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح خانصاحب انہیں اپنا شاگرد بنا لیں مگر . . . . . مگر خاں صاحب کی شاگردی بھی جوئے شیر لانے سے کم نہ تھی۔ آخر قدرت نے یہ موقع فراہم کر دیا۔ خاں صاحب ایک دعوت میں تشریف رکھتے تھے۔ ان کی خدمت میں درخواست کی گئی کہ ذرا اس بچی کو بھی سُن لیں۔ روشن آرا بیگم تان پورہ لے کر بیٹھ گئیں اور راگ ملتانی کی استھائی اور انترہ گانے لگیں۔ ایک اپنا شوق اور دوسرے خاں صاحب کی موجودگی بزعمِ خود جم کر گایا مگر جب گانا

ختم ہوا تو خاں صاحب نے پوچھا "بیٹی کیا گا رہی تھیں"۔ عرض کیا کہ "جی راگ ملتانی تھا"۔ ہنس کر جواب دیا "یہ تو ملتانی مٹی تھی۔ راگ ملتانی ایسا ہوتا ہے"۔

اور تان پورہ لے کر خود ملتانی گانے لگے۔ اس روز پہلی مرتبہ روشن آرا بیگم کو پتہ چلا کہ اس کی گائی ہوئی ملتانی تو اس کے مقابلے میں واقعی ملتانی مٹی ہی تھی۔ مگر وہ دن روشن آرا کی زندگی کا سب سے زیادہ روشن دن تھا کہ خاں صاحب نے اسے اپنا شاگرد بنانا منظور فرما لیا۔ اسی دن باقاعدہ گنڈا باندھا اور تعلیم شروع کر دی۔

خاں صاحب اپنی اس ہونہار شاگرد کو "مانو بلّی" کے نام سے پکارنے لگے اور سُر سنگیت کے زیر و بم سے آشنا کرنے لگے۔ محبت کا یہ عالم تھا کہ اس "مانو بلّی" کے لئے بادام جیب میں بھر کر لے آتے اور کھلاتے جاتے مبادا اس کے گلے میں خشکی آ جائے۔ اور جب دیکھتے کہ اس نے اپنا سبق جلد یاد کر لیا ہے تو پیار سے کہتے "ارے تُو تو سیانی چوہی ہے سیانی چوہی"! اور خاں صاحب کی یہ "مانو بلّی" استاد کے یہ الفاظ سُن کر دل ہی دل میں پھولی نہ سماتی اور استاد کے پاؤں داب نے لگتی۔ دوسرے شاگردوں کو خاں صاحب ایک دو مرتبہ گانا گا کر بتا دیتے اور وہ ریاض میں مصروف ہو جاتے۔ مگر "مانو بلّی" کو حکم ہوتا کہ جب تک میں گاتا ہوں تم بھی میرے ساتھ ساتھ گاتی رہو۔ اور پھر یوں بھی ہوتا کہ اپنا گانا ختم کر دیتے اور ہاتھ کے اشارے سے حکم ہوتا کہ تم گاتی رہو۔ خود آنکھیں بند کر لیتے اور جہاں ذرا سی کمی محسوس ہوتی پھر ساتھ شروع ہو جاتے۔ اب کیا تھا دن رات تعلیم تھی اور ہر لحہ ریاض۔ کھانے پر بیٹھتے تو کسی چمچے سے ایک پلیٹ کو بجاتے اور پھر باقی پلیٹوں کو ضرب لگا کر پوچھتے "اگر پہلی آواز کو کھرج مان لیا جائے تو بتاؤ یہ آوازیں کیا ہیں"۔ اور اس طرح روشن آرا بیگم سُر گیان میں ماہر ہوتی چلی گئیں۔ اب کونسی محفل، کون سا میدان اور کون سی ریاست تھی جہاں خاں صاحب نے روشن آرا بیگم کو اپنے سامنے نہ گوایا ہو۔ جب انہیں داد ملتی تو خاں صاحب کے چہرے پر ایک عجیب سی رونق آ جاتی۔ ایسی رونق جو زبانِ حال سے یہ کہتی ہوئی محسوس ہوتی کہ دیکھو میری محنت اکارت نہیں گئی۔ میرے بعد میری یہ یادگار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے نام کو روشن رکھے گی اور ہوا بھی یہی۔ خاں صاحب کی یاد کو روشن کرنے والی یہی روشن آرا بیگم تھیں جو کیرانہ گھرانے کی گائکی اس طرح پیش کرتی تھیں کہ خاں صاحب کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگتی۔ راگ کی صحیح خوانی، سُروں کا لگاؤ اور راگ کی باقاعدہ بڑھت، استھائی انترہ کو لے اور تال میں سمونا ان کے فن کا کمال ہے۔ ایسے راگ جنہیں دوسرے گویے پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں گا سکتے، ان کی انٹی کے راگ تھے اور وہ انہیں بآسانی گھنٹوں گا سکتی تھیں۔ آپ ہی جنوبی ایشیا کی وہ واحد فنکارہ تھیں جنہیں مدراس والوں نے "وانم باڑی"[1] اور بمبئی والوں نے ملکۂ موسیقی کا خطاب عطا فرمایا۔ اور پھر پاکستان میں حکومت نے ان کے فن کو سراہتے ہوئے سب سے پہلے ان ہی کو PRIDE OF PERFORMANCE کا تمغہ دیا۔

ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم کی طبیعت میں انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ہر اچھے گانے والے کا ذکر بڑے احترام سے کرتی تھیں۔ میں نے آج تک ان کے منہ سے کسی فنکار کی برائی نہیں سُنی۔ اپنے محترم استاد کا ذکر کرتیں تو یوں لگتا جیسے وہ خلاؤں میں دیکھ رہی ہوں۔ اس وقت ان پر ایک بے نام سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ان کے سینے میں ایک محبت بھرا دل تھا۔ گھر کو اچھا خاصا چڑیا گھر بنا رکھا تھا۔ کون سا پرندہ ہے جو انہوں نے پال نہ رکھا ہو اور جسے خود اپنے ہاتھ سے دانہ دُنکا نہ دیتی ہوں۔ ان کے پاس نہایت خوبصورت مانو بلّی تھی مگر یہ مانو بلّی، استاد کی مانو کی طرح نہ بادام کھاتی تھی اور نہ ہی گاتی تھی۔ ہاں سر پیلے ہاتھوں سے

---

[1] مدراس میں "وانم باڑی" سکائی لارک کو کہتے ہیں۔

دودھ ضرور پیتی تھی۔ ملکہ موسیقی روایت پسند فنکاروں میں سے تھیں۔ راگ گاتے وقت اس کے قوانین کی سختی سے پابندی کرتی تھیں زمزمہ اور مرکی فقط اتنی کہ خیال خیال رہے ٹھمری نہ بن جائے۔ تانیں ایسی کہ سننے والوں کو ٹپہ کا شائبہ تک نہ ہونے پائے۔ ٹپہ، سپاٹ اور تانیں سریلی ایسی کہ بڑے بڑے گویے سن کر کان پکڑیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ گاتے وقت نہ منہ بگڑتا تھا اور نہ ہاتھوں کو غیر ضروری جنبش ہوتی تھی۔

مجھے ۱۹۵۶ء کا واقعہ یاد ہے لاہور کی سالانہ محفلِ موسیقی کی آخری نشست تھی۔ ملکۂ موسیقی نے پہلے شدھ کلیان گایا اور پھر جھنجھوٹی کی ٹھمری "پیا بن ناہیں آوت چین" محفل کو رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک نشر ہونا تھا۔ ملکۂ موسیقی گا رہی تھیں۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور ساری محفل پر ایک بے خودی طاری تھی۔ ان کی آواز کا جادو چل چکا تھا۔ میں بھاگا بھاگا محمود نظامی صاحب کے پاس گیا جو اُن دنوں ریڈیو پاکستان لاہور کے ڈائریکٹر تھے اور عرض کیا کہ وقت ختم ہو چکا ہے۔ میری آواز پر پہلے تو وہ چونکے اور ہاتھ سے چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔ بیگم صاحبہ گاتی رہیں اور وقت گزرتا گیا۔ جب گانا ختم ہوا تو پتہ چلا کہ محفل سوا بارہ بجے تک نشر ہوتی رہی۔ بعد میں اس "جرم" پر جواب طلبی ہوئی۔ نظامی صاحب نے صرف دو فقرے لکھ کر بھیج دیئے کہ اس محفل میں گانا اتنا مدہوش کن تھا کہ کسی کو بھی ریڈیو پروگرام ختم کرنے کا ہوش ہی نہ رہا اور بات ختم ہو گئی۔

ملکۂ موسیقی کو گانے سے کس قدر محبت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ علیل تھیں۔ میں عیادت کے لئے لاہور میں حاضر ہوا۔ خاصی پریشان تھیں، یہ وہم یقین کی حد تک پہنچ گیا تھا کہ ان کے دشمنوں کو دل کا عارضہ ہو گیا ہے۔ حالانکہ تبخیرِ معدہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ پوچھا تو جی بھر آیا اور کہنے لگیں "بیٹے، میں سوچتی ہوں، کیا میں اب گا بھی سکوں گی۔ تم جانتے ہو گانا ہی تو میری زندگی ہے، خدا نہ کرے اگر میں نہ گا سکی تو زندہ کیسے رہوں گی" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ میں نے جواب دیا آپ ایسا وہم دل میں آنے ہی کیوں دیتی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو بہت جلد اچھی ہو جائیں گی۔ آپ کو معلوم نہیں کتنے لوگ آپ کی صحت کے لئے دست بہ دُعا ہیں!!

میری بات سُن کر وہ اور بھی رونے لگیں اور میں سوچنے لگا میں نے تو کوئی بھی ایسی بات نہیں کی جس سے چچی زیادہ پریشان ہوتیں، مگر فوراً ہی احساس ہوا کہ یہ کہتے ہوئے میری اپنی آنکھیں بھر آئی تھیں اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا تھا۔ بہرحال کچھ عرصے بعد آپ کی طبیعت سنبھل گئی اور آپ اپنے ریڈیو پروگرام کے لئے لاہور سٹیشن تشریف لائیں۔ میں نے چائے کے لئے عرض کیا اور انہوں نے کمالِ محبت سے میری یہ حقیر پیش کش قبول فرمائی۔ باتوں باتوں میں ناشتے کا ذکر چل پڑا۔ کہنے لگیں "دیکھو بیٹے، تمہارے چچا مجھے ہر وقت ٹوکتے رہتے ہیں کہ زیادہ مکھن نہ کھاؤ، اب میں انہیں کیسے بتاؤں کہ جب میں مکھن نہ کھاؤں گی، تو گاؤں گی کیسے" اور چودھری صاحب ہنس کر میری طرف دیکھنے لگے۔ جیسے کہہ رہے ہوں تم ہی اپنی چچی سے کہو زیادہ مکھن ان کے لئے اچھا نہیں۔ انہیں تبخیرِ معدہ کی شکایت ہے اور میں جو ٹوکتا ہوں تو صرف ان کے معالج کے کہنے پر، ورنہ مجھ سے زیادہ بھلا کون جانتا ہے کہ مکھن اور بادام ہی تو ان کا من بھاتا کھاجا ہیں۔

تھوڑے ہی عرصے بعد "ایسٹ پاکستان ویک" کے سلسلے میں بیگم صاحبہ کو ڈھاکہ سے دعوت نامہ موصول ہوا۔ آپ وہاں جانے اور خاص کر ہوائی جہاز کے سفر سے کچھ کترا رہی تھیں۔ مجھ سے پوچھا، تو میں نے عرض کیا کہ ضرور چلیئے۔ میں بھی جا رہا ہوں، ساتھ رہے گا۔ اس پر راضی ہو گئیں مگر پوری طرح نہیں۔ کچھ ایسا عالم تھا کہ ارادے باندھتی تھیں، سوچتی تھیں، توڑ دیتی تھیں، مگر آخر میرا اصرار رنگ لایا اور چودھری صاحب نے فیصلہ صادر فرمایا "ہم انشاء اللہ ضرور جائیں گے"! اور ایک ہفتہ بعد ہم سب ہوائی جہاز

سے ڈھاکہ جا رہے تھے۔ نہ جانے کیوں بیگم صاحبہ کو ہوائی جہاز کے سفر سے وحشت سی ہوتی تھی، مگر یہ وحشت کچھ عرصہ کے بعد ختم ہو گئی۔ اس جہاز سے اور بھی بہت سے فنکار جا رہے تھے۔ راستے میں لطیفوں کا سلسلہ ٹوٹنے میں نہ آتا تھا۔ ایک آدمی لطیفہ ختم کرتا تو دوسرا شروع کر دیتا۔ ہر لطیفے کے بعد ایک بھرپور قہقہہ سارے جہاز میں گونج اٹھتا اور اس میں ملکۂ موسیقی کا تبسم بھی شامل ہوتا جو یوں کہتا محسوس ہوتا کہ شیطان کے چیلو، اب ختم بھی کرو یہ ہلڑ بازی۔ اب میں انہیں کیسے بتاتا کہ یہ سب ڈھونگ صرف انہیں کی خاطر رچایا جا رہا تھا اور پھر یہ ڈھونگ کامیاب بھی رہا۔ ہوائی جہاز کے سپیکر سے آواز سنائی دی۔ ہم ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر پہنچا چاہتے ہیں۔ اپنی اپنی پیٹیاں کس لیجئے۔ چند ہی لمحوں میں ہم اپنے بنگالی بھائیوں کے مہمان تھے۔

ڈھاکہ میں کلاسیکی موسیقی کافی مقبول ہے۔ وہاں بڑی زوردار محفل رہی۔ ملک کے تقریباً سبھی بڑے بڑے فن کاروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور ایک سماں بندھ گیا۔ ملکۂ موسیقی کو سب سے آخر میں گانا تھا۔ زندگی میں وہ پہلا موقع تھا کہ میں کچھ ہراساں ہو گیا۔ سوچنے لگا بہت اچھا گانا ہو چکا ہے کیا اس کے بعد ملکۂ موسیقی اپنا رنگ جما سکیں گی اور پھر دل ہی دل میں ان کی کامیابی کے لئے دعائیں کرنے لگا۔ اس محفل میں پروگرام کا اعلان اور فنکاروں کا تعارف میرے ذمہ تھا۔ اتنے میں مجھے حکم ہوا کہ اب ملکۂ موسیقی کو بلایا جائے۔ میں نے بھاری سے دل کے ساتھ اعلان کیا اور خود سامعین کے ساتھ ہال میں آ بیٹھا۔ اس سے پیشتر راگ درباری کا جادو چل چکا تھا۔ سامعین پر ایک بے خودی سی طاری تھی، ملکۂ موسیقی نے "اڈانا" گانا شروع کیا۔ میں نے دل ہی دل میں راگ کے انتخاب کی داد دی اور چند لمحوں میں میں نے دیکھا کہ سارے ہال کے در و دیوار "اڈانے" کے تیز سُریلے سُروں سے منور ہو گئے ہیں۔ یوں لگتا تھا کہ سُر ولے کا ایک سیلاب ہے جو سب کو بہائے لئے جا رہا تھا۔ اس دن ملکۂ موسیقی کا گانا ہمیشہ کے گانے سے بہت مختلف تھا۔ وہ اپنی گائیکی میں ان چیزوں کو اجاگر کر رہی تھیں جو دوسرے فنکاروں کے پاس نہ تھیں اور اگر تھیں بھی تو وہ ان پر اتنے قادر نہ تھے۔ شفاف، صاف ستھری تانیں اور دلکش بول دل میں اترتے چلے گئے اور میں سوچنے لگا آج بجی کی خود ساختہ بیماری کہاں گئی! آج کا گانا اگر کوئی تندرست گویا بھی گاتے تو خون تھوکنے لگے۔

اس کے بعد دو محفلیں جیسور اور کُھلنا میں تھیں۔ جیسور کی محفل میں کچھ سامعین گانے کے بعد بیگم صاحبہ کے پاس آئے اور کہنے لگے "آپ تو سرسوتی کا روپ ہیں، ہم آپ کے تابعدار ہیں"۔ بیگم صاحبہ نے جواب دیا "ہاں بھیا جو اس فن کو سمجھتے ہیں وہ ہمارے تابعدار ہیں اور جو اس فن کو نہیں سمجھتے ہم ان کے تابعدار ہیں"۔ ان کے اس "تابعدار" والے فقرے میں چھپا ہوا طنز میرے ذہن میں ابھر آیا۔ جب ان کا گانا سننے کے بعد ایک صاحب نے انہیں یوں داد دی تھی "بیگم صاحبہ آپ بہت اچھا گاتی ہیں"! اس کے جواب میں صرف اتنا ہی کہا "اچھا تو یہ آپ کو آج معلوم ہوا ہے"!

اور آج مجھے وہ بے شمار محفلیں یاد آ رہی ہیں جن میں میں نے اچھے اچھے فنکاروں کو داد لینے کے لئے مداری پن کرتے دیکھا اور سنا ہے۔ ایسی محفلوں میں مجھ پر ایک انجانا سا خوف طاری ہو جاتا تھا کہ وہ ایسے بگڑے مجمع کو کیسے سنبھال سکیں گی، مگر جیسے ہی ان کا گانا شروع ہوتا یوں لگتا جیسے ساری محفل پر ایک سحر طاری ہو گیا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی گائیگی کے صاف ستھرے اور سجیلے روپ سے ماحول پر ایک وجد آور کیفیت طاری کر دیتی تھیں۔ راگ کے وادی، سموادی کا خیال رکھتے ہوئے، سُروں کی باقاعدہ بڑھت، استائی اور انترے کو اسی تال میں سمیٹنا اور خوبصورت زمزموں اور سُریلی مرکیوں اور جان لیوا بہلاووں سے اسے سجانا انہی کا کام تھا۔ سپاٹ، مری، سُر، گمک سبھی کچھ ان کے گانے میں ملتا تھا۔ زندگی سے بھرپور مکمل گانا گاتی تھیں۔ تانیں ایسی کہ ایک ایک سُر علیحدہ نظر آئے اور یوں لگے جیسے تمام سُر موتیوں کی طرح ایک ہار میں پرو دیئے گئے ہوں۔ ان کا فن پچھلی نصف صدی پر پھیلا ہوا ایک ایسا بدر تھا جو آنے والے ہر عہد کو اپنی روشنی دکھاتا رہے گا۔

(ریڈیو پاکستان لاہور اور پندرہ روزہ "آہنگ" کے شکریے کے ساتھ)

غلام عباس کا افسانہ

شہزاد منظر

غلام عباس اُردو کے بلاشبہ عظیم المرتبت افسانہ نگار تھے۔ وہ اردو کے واحد افسانہ نگار تھے جنہوں نے افسانہ نگاری کو اپنا واحد مقصد بنالیا تھا اور اس کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اردو میں مسلسل اور متواتر لکھتے رہنے کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ ہمارے ہاں تھوڑی سی شہرت حاصل کرنے یا ایک دو کتابوں کی اشاعت کے بعد ادب سے رخصت ہو جانے کا رواج عام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب سے زندگی میں مادی طور پر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جبکہ بسر اوقات کے لئے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے زیادہ تر مصنف زندگی کی تگ و دو میں اس قدر مصروف ہو جاتے ہیں کہ انہیں لکھنے کی مہلت نہیں ملتی اور وہ ادب کو خیر باد کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ غلام عباس نے ادب کو کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ پھر بھی وہ زندگی بھر افسانے لکھتے رہے اور کبھی افسانہ نگاری ترک کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ بہت کم لکھتے تھے اور بہت وقفے وقفے سے لکھتے تھے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے سال میں دو ایک افسانے نہ لکھے ہوں۔ انتقال سے قبل تک وہ لکھنے میں مصروف تھے اور "نوجوان افسانہ نگاروں کے نام ایک خط" کے عنوان سے اپنے مقالہ کو آخری شکل دے رہے تھے۔ ان کا افسانے سے عشق کبھی ختم نہیں ہوا۔ جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں ان کے مسلسل لکھتے رہنے کا راز یہ ہے کہ وہ طبعاً قناعت پسند تھے اور سادہ زندگی گزارنا پسند کرتے تھے۔ حالانکہ ان کی دو بیویاں اور آٹھ بچے تھے۔ پھر بھی انہوں نے سماجی مرتبہ بلند کرنے کے لئے حصولِ زر کی دوڑ میں کبھی شریک ہونے کی کوشش نہیں کی جبکہ ہمارے ہاں بڑے ادیبوں میں سماجی مرتبہ بنانے کا رجحان عام ہے اور وہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی تگ و دو کی نذر کر دیتے ہیں۔ تخلیقِ ادب کے لئے ادیب کا قناعت پسند ہونا کتنا ضروری ہے اس کی واضح مثال غلام عباس کی زندگی سے دی جاسکتی ہے۔

انہوں نے صحیح معنوں میں افسانہ نگاری اس وقت شروع کی جب اردو افسانہ روسی، انگریزی، فرانسیسی افسانوں کے تراجم اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر کافی ترقی کر چکا تھا۔ پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم جیسے افسانہ نگار پیدا ہو چکے تھے اور ان دو بڑے افسانہ نگاروں کی پیروی میں اصلاح پسند اور رومانی افسانہ نگاروں کی کھیپ کی کھیپ تیار ہو چکی تھی۔ لیکن ۳۶ء اور ۳۷ء کے دوران رومانیت کا ردِ عمل شروع ہو چکا تھا اور اس کی جگہ حقیقت نگاری نے لینی شروع کر دی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ عالمی ادب میں حقیقت نگاری اس دور کا مقبول عام رجحان تھا اور پریم چند کے آخری دور کے افسانوں خصوصاً "کفن" نے اردو افسانے پر حقیقت نگاری کی گہری چھاپ مرتب کی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم سے قبل کی عالمی کساد بازاری اور صنعتی ملکوں کے اقتصادی بحران نے بھی محکوم ہندوستان پر سیاسی اور اقتصادی اثرات مرتب کرنے شروع کر دیئے تھے۔ اس دور کے معروضی حالات ایسے تھے کہ ادیب و شاعر حقیقت نگاری اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ غلام عباس نے بہت چھوٹی عمر سے مغربی ادب خصوصاً روسی اور

اور فرانسیسی ادب کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ ان کے زیادہ تر پسندیدہ ادیب مزاجاً حقیقت نگار تھے۔ اس لئے غلام عباس کے ذہن پر ان مقتدر ادیبوں کا اثر مرتب ہونا فطری امر تھا۔ غلام عباس نے جب طبعزاد افسانہ لکھنا شروع کیا تو انہوں نے محسوس کیا کہ انہیں رومانی اثرات سے محفوظ رہنا چاہیئے اور حقیقت نگاری اختیار کرنی چاہیئے۔

غلام عباس خود ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور غریبوں کے درمیان زندگی بسر کی تھی۔ انہوں نے بہت چھوٹی عمر سے مزدوری شروع کر دی تھی اور پندرہ سال کی عمر میں مارکنگ یعنی بوریوں پر نشان لگانے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ انہوں نے زندگی کا گہرا مشاہدہ کیا تھا اور گوناگوں تجربات حاصل کئے تھے۔ انہوں نے اپنے گرد و پیش جو کچھ دیکھا اسے اپنے افسانوں میں نہایت خلوص اور چابکدستی کے ساتھ پیش کیا۔ ان کے تمام افسانے زندگی کے حقائق اور گہرے مشاہدے پر مبنی ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کے کسی بھی افسانے میں پروپیگنڈے کا معمولی سا عنصر بھی شامل نہیں ہے۔ حالانکہ انہوں نے جب لکھنا شروع کیا تو وہ پریم چند کی اصلاح پسندی اور ترقی پسند تحریک کا نہایت ہیجان خیز دور تھا۔ "انگارے" کی اشاعت نے تہلکہ مچا رکھا تھا اور ہر جانب بغاوت اور سرکشی کا نعرہ گونج رہا تھا۔

حقیقت نگاری سے والہانہ لگاؤ کے باوجود عصری زندگی اور ادب کی انقلابی تحریکوں سے متاثر نہ ہونے کی وجہ ان کی کلاسیکیت پسندی تھی۔ اردو اور مغربی زبانوں کے کلاسیکی ادب کے اثرات نے انہیں روایت پسند بنا دیا تھا اور وہ ادب کی پائیدار روایتوں کو توڑ کر نئے تجربات کی رو میں بہنے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پسندیدہ ادیبوں کی فہرست میں جیمز جوئس، ورجینا وولف اور مارشل پروست کبھی شامل نہیں رہے۔ انہوں نے ان تجربہ پسند ادیبوں کا مطالعہ ضرور کیا ان کا احترام بھی کیا لیکن ان کے طرز بیان اور اسلوب کو کبھی پسند نہیں کیا انہوں نے نجی گفتگو میں کئی بار ان مصنفوں کو نہایت TOUGH (مشکل) اور "غیر مقبول ادیب" قرار دیا۔ اس ایک حقیقت سے ان کے ادبی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ وہ افسانے میں ابلاغ کے شدت سے قائل تھے اور افسانے کا READABLE ہونا افسانے کی ضروری صفت قرار دیتے تھے۔

غلام عباس بنیادی طور پر حقیقت نگار تھے۔ اسی لئے انہوں نے زندگی بھر حقیقت نگاری کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھا اور معاشرے میں جو برائیاں اور اچھائیاں دیکھیں انہیں ہو بہو پیش کرنے پر اکتفا کیا۔ ان کی ادبی شہرت کا آغاز "آنندی" سے ہوتا ہے جو ۱۹۴۵ء کے لگ بھگ شائع ہوا۔ یہ افسانہ حقیقت نگاری کا شاہکار ہے۔ اس ایک افسانے نے انہیں یکایک صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں لا کھڑا کیا۔ یہ واقعی عجیب و غریب افسانہ ہے اور موضوع اور ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے اردو کے تمام افسانوں سے مختلف ہے۔ اردو میں اس سے قبل طوائف کے موضوع پر لاتعداد افسانے اور ناول لکھے جا چکے ہیں لیکن اس افسانے میں طوائف کے موضوع کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس افسانہ میں طوائفوں کا براہِ راست کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ بس صرف اتنا ذکر ہے کہ بلدیہ نے شہر کے درمیان سے چکلہ ہٹانے کا فیصلہ کیا ہے اور طوائفوں کو شہر سے کافی دور ایک ویران مقام پر آباد کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس کے بعد افسانے میں طوائفوں کے نئے محلے میں منتقل ہیں۔ اس کے بیان میں غلام عباس نے جزئیات نگاری کا ایسا کمال دکھایا ہے جس سے مصنف کے قدرتِ بیان کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس افسانے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ پورا ماحول نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ افسانے کا ٹیمپو نہایت سست ہے اور مصنف نے خوانچہ فروش اور پھولوں کے ہار فروخت کرنے والے سے لے کر تانگہ والے اور پان سگریٹ والے تک کی "نئے محلے" میں آمد کو اور آنے کے واقعات کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ لیکن یہ واقعات افسانے سے الگ نہیں بلکہ اس کا ہی لازمی حصہ محسوس ہوتے ہیں۔ آخر میں شہر بڑھتے بڑھتے

طوائفوں کے محلے کو اپنے اندر ضم کر لیتا ہے اور ایک بار پھر بلدیہ طوائفوں کو شہر کے بیچ سے نکال کر آبادی سے دور نئی جگہ آباد کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔

مصنف نے افسانے میں اپنی جانب سے کچھ نہیں کہا ہے۔ بس واقعات کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ مصنف کا مافی الضمیر اور معاشرے پر اس کا طنز خود بخود ظاہر ہو گیا ہے اور یہی غلام عباس کے فن کا کمال ہے۔ مصنف نے اس افسانے میں خیر و شر کے فلسفے کو بالکل نئے انداز سے پیش کیا ہے اور واضح کر دیا ہے کہ دنیا کے سب سے قدیم پیشے کو ان اقدامات کے ذریعے سے ختم کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ غلام عباس "آنندی" کو اپنا معمولی افسانہ تصور کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ افسانہ انہوں نے بغیر کسی محنت کے لکھا ہے اور اسے غیر متوقع طور پر شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ان کے خیال میں ان کا سب سے اچھا افسانہ "سرخ گلاب" ہے جسے لکھنے میں انہوں نے سب سے زیادہ محنت کی ہے۔

غلام عباس اردو کے اگرچہ سینئر افسانہ نگار تھے اور ۱۹۲۷ء سے افسانے لکھ رہے تھے لیکن بطور افسانہ نگار انہیں شہرت اس صدی کے چوتھے عشرے میں حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ ان کا مخصوص طرزِ نگارش تھا۔ اس دور کے دوسرے مقبول افسانہ نگاروں کے مقابلے میں غلام عباس عام لوگوں کی ذہنی سطح سے بلند تھے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کے فن میں حصولِ آزادی کے بعد زیادہ نکھار آیا ہے اور انہوں نے ادب کو پہلے سے زیادہ اچھے اور ناقابلِ فراموش افسانے دیئے ہیں۔ غلام عباس نے جب بھی لکھا بہت ہی سوچ سمجھ کر لکھا اور لکھتے وقت دوسری تمام باتوں کے مقابلے میں فنی قدر اور جمالیاتی اظہار کو ملحوظ رکھا۔ انہوں نے زندگی کے تاریک اور تلخ حقائق کو پیش کرتے ہوئے بھی فن کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اسی لئے اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کے مقابلے میں بیدی اور غلام عباس کے افسانے سدا بہار لگتے ہیں۔ اور ان کے افسانوں میں دائمی قدریں پائی جاتی ہیں۔ یہ دائمی قدریں سوائے فنی قدروں کے اور کچھ نہیں ہیں۔

غلام عباس کے افسانوں کے موضوعات بڑے ہی سیدھے سادے اور عام سے ہوتے ہیں۔ ان کے کردار حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور بہت سے افسانوں کا تعلق خود مصنف کے ذاتی تجربات سے رہا ہے مثلاً "اوور کوٹ" کو ہی لیجیئے۔ کوٹ کے موضوع پر دنیا کے تین مشہور مصنفوں کے افسانے ہیں۔ اوّل گوگول کا شہرہ آفاق افسانہ "کلوک"۔ دوسرا راجندر سنگھ بیدی کا "گرم کوٹ" اور تیسرا غلام عباس کا "اوور کوٹ"۔ تینوں فنی اعتبار سے لاجواب افسانے ہیں اور ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ غلام عباس کا "اوور کوٹ" اس اعتبار سے منفرد ہے کہ یہ ان کے ذاتی احساسات و تجربات پر مبنی ہے۔ غلام عباس کے ذہن میں یہ افسانہ لکھنے کا خیال اس وقت آیا جب ایک دن احمد شاہ بخاری ان سے ملنے کے لئے آئے اور انہیں فوراً باہر نکل آنے کو کہا۔ غلام عباس اس وقت شلوار اور بنیان میں ملبوس تھے۔ چنانچہ انہوں نے اوور کوٹ پہن لیا اور باہر نکل آئے۔ معاً ان کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر ایسی حالت میں ان کو حادثہ پیش آئے اور وہ ہلاک ہو جائیں تو لوگ جب ان کے جسم سے اوور کوٹ اتاریں گے تو کیا محسوس کریں گے۔ بس! اس ایک خیال نے ان کے ذہن میں افسانے کی صورت اختیار کر لی اور اردو کا لاجواب افسانہ "اوور کوٹ" معرضِ وجود میں آیا۔

ان کے زیادہ تر افسانے اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے اور نہایت معمولی واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ مثلاً "سایہ" یہ ایک غریب خوانچہ فروش کی کہانی ہے۔ "کتبہ" ایک ملازمت پیشہ شخص کا المیہ ہے۔ ان معمولی باتوں سے اتنے بڑے افسانے تخلیق کرنا افسانہ نگاری کی بہت ہی غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت ہے۔

غلام عباس کی روایت پسندی کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ افسانے کی روایت کے سلسلے میں ہمیشہ کلاسیکی اصولوں کے قائل رہے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کا کوئی بھی افسانہ افسانے کی اس روایتی تعریف پر پورا نہیں اترتا،

جو افسانے کے نقادوں نے مقرر کی ہے اور جس کے تحت افسانے میں دلچسپ ابتداء، نقطۂ عروج اور چونکا دینے والے اختتام کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ان کا کوئی افسانہ سعادت حسن منٹو کی طرح چونکا دینے والا نہیں ہے۔ یہ فن منٹو کے ساتھ ہی ختم ہو چکا ہے۔ منٹو بنیادی طور پر فارمولہ پسند افسانہ نگار تھے جبکہ غلام عباس افسانے میں فارمولہ کے قائل نہیں تھے۔ غلام عباس نے افسانے کے کرافٹ کا خیال رکھنے کے باوجود افسانے کو کبھی فارمولے کے تحت نہیں لکھا۔

غلام عباس کے افسانے کو پڑھتے ہوئے بار بار چیخوف کے افسانے کا گمان ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ انہوں نے چیخوف کی پیروی کی ہے بلکہ اس کی وجہ دونوں مصنفوں کے لہجے اور اسلوب کی یکسانیت ہے۔ غلام عباس کی طرح چیخوف بھی نرم لہجے کا افسانہ نگار تھا اور ان کی طرح چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں پر افسانے کی عمارت تعمیر کرتا تھا۔ جن لوگوں نے چیخوف کا افسانہ پڑھا ہے وہ میرے خیال سے اتفاق کریں گے کہ غلام عباس نے چیخوف کا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ میں نے ایک بار جب ان سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا "میں اگر کسی روسی ادیب سے متاثر ہوں تو وہ ترگنیف ہے۔ میں اسے چیخوف سے زیادہ پسند کرتا ہوں"۔

غلام عباس صحیح معنوں میں مختصر افسانہ نویس تھے اور انہیں مختصر افسانہ نویسی کا فن آتا تھا۔ وہ کفایت لفظی کے سختی سے قائل تھے۔ ان کے افسانے میں ہر لفظ نگینے کی طرح جڑا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کرتے تھے جو غیر متعلق ہو یا جس کا افسانے کی ہیئت سے تعلق نہ ہو۔ اس لئے ان کے افسانے میں گہرا تاثر پایا جاتا تھا۔ مختصر افسانہ نویسی کا فن منٹو کو بھی آتا تھا۔ اس نے اردو کو کئی بہت اچھے اور یادگار افسانے دیئے ہیں لیکن منٹو افسانے کے ساتھ بہیمانہ سلوک کرتا تھا اور افسانے کی فنی تکمیل کی قطعی پروا نہیں کرتا تھا۔ منٹو کے بعض افسانے بہت اچھے اور بعض بہت برے بلکہ غیر معیاری ہوتے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس نے آخری دور میں افسانہ نگاری کو ذریعۂ معاش بنا لیا تھا۔ منٹو کے برعکس غلام عباس نے کبھی پیسے کی خاطر نہیں لکھا اس وقت بھی نہیں جب تنگ دست تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غلام عباس نے ہمیشہ اپنے افسانے کا معیار برقرار رکھا۔ ان کے افسانوں میں شاید ہی کوئی ایسا افسانہ ہو جو معمولی درجے کا ہو۔

غلام عباس کو ان کے معاصر نقادوں نے "عام آدمی کا داستان گو" قرار دیا ہے۔ یہ غلط نہیں ہے۔ انہوں نے عام انسانوں کے بارے میں افسانے لکھے ہیں اور عام انسانوں کے لئے ہیں۔ ان افسانوں کو معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی پڑھ کر محظوظ ہو سکتا ہے۔ آج کے دور میں جبکہ علامتی اور استعاراتی افسانے لکھنا فیشن بن چکا ہے اور سادہ افسانے سے کلاسیکی خصوصیات کے ساتھ افسانویت بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ غلام عباس کے افسانے بڑی اہمیت اختیار کر چکے ہیں۔ غلام عباس کے افسانوں میں نہ فلسفہ ہوتا ہے اور نہ نفسیاتی مطالعہ۔ اس کے باوجود وہ گہرے تاثر کی وجہ سے عام لوگوں کے لئے بڑی کشش رکھتے تھے۔

غلام عباس کو زندگی میں ہی بڑی شہرت اور عظمت حاصل ہوئی۔ انہیں ہر حلقے سے احترام ملا لیکن وہ بھی اردو کے ان بد نصیب افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن پر ناقدین نے سب سے کم لکھا۔ افسانے سے متعلق ایک آدھ مضمون میں ان کے افسانوں کا تذکرہ مل جاتا ہے۔ لیکن ان کی شخصیت اور فن پر نصف درجن مقالات بھی مشکل سے ملتے ہیں اس لئے کہ ہمارے ناقدین نے ان پر لکھنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس ایک واقعے سے افسانہ نگاروں اور افسانے کی صنف سے ہمارے ناقدین کی بے اعتنائی اور عدم توجہی ظاہر ہوتی ہے۔ پچپن سال تک مسلسل افسانے لکھنے والے صفِ اوّل کے افسانہ نگار غلام عباس کے ساتھ جب ہمارے ناقدین کا یہ سلوک ہے تو عام افسانہ نگاروں کے بارے میں ان سے کیا شکایت ہو سکتی ہے! ستائش کی تمنا اور صلے کی خواہش

کئے بغیر نصف صدی سے زیادہ عرصے تک نہایت انہماک اور تسلسل کے ساتھ افسانے لکھتے رہنا اس امر کا ثبوت ہے کہ غلام عباس صحیح معنوں میں ایک (DEVOTED ' افسانہ نگار تھے۔

غلام عباس وہ افسانہ نگار تھے جنہیں کبھی یہ پروا نہیں رہی کہ ناقدین ان کے بارے میں لکھتے ہیں یا نہیں۔ انہیں اپنے فن پر اعتماد تھا۔ اسی لئے انہوں نے کبھی کسی سے اپنے فن یا شخصیت پر لکھوانے کی کوشش نہیں کی۔

آج جب کہ وہ ہم میں نہیں رہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے افسانوں کا بالاستیعاب مطالعہ کریں اور اردو افسانے کے وسیع تر تناظر میں ان کا صحیح مقام متعین کریں۔ یہ غلام عباس کیلئے نہیں بلکہ اردو افسانہ نگاری کی تاریخ کے لئے ضروری ہے مگر سوال یہ ہے کہ یہ فرض کون انجام دے گا؟

(پندرہ روزہ "آہنگ" کے شکریے کے ساتھ)

ظہور نظر ــ ایک مطالعہ

صلاح الدین حیدر

تاریخ کی جبریت کا پیدا کردہ کرب اور اس کے ردِ عمل میں مسلسل بڑھتی عصبیت اور لامحدود تجریدیت، لغویت اور انسان کی مروج شکل کے مسخ ہو جانے کا المیہ ایسے موضوعات ہیں جو آج کی عظیم شاعری ـــ مزاحمت کی شاعری میں نمایاں نظر آتے ہیں لیکن اردو شاعری اور بالخصوص غزل کے محدود ڈکشن میں لکھی جانے والی شاعری میں عموماً عہدِ حاضر کے نفسانی کرب کا مستقل ہونا بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ ہے کہ غزل کے ڈکشن میں انفعالیت بھی جدلی آہنگ کے بغیر اظہار نہیں پاتی۔ دوئم لغویت، تجریدیت اور احتجاجیت کا رویہ رکھنے والے کئی ایک شعرا نے روایتی شاعری یعنی اوزان اور قافیہ ردیف کی شاعری کو مسترد کر دیا تھا لیکن اس عمل میں شاعری سے زیادہ تراجم کی اہمیت بڑھ گئی اور ان تراجم سے یہ بات سامنے آئی کہ شاعری محض اسلوب سے بغاوت کا نام نہیں بلکہ تجربات، تصادمات کی شدت سے اسلوب خود بخود ابھرتے ہیں۔ اس صدی کی ابتدائی تین چار دہائیوں میں جو اسلوب ابھر کر پروان چڑھے۔ اُن کے پس منظر میں تاریخ کی رزم گاہ تھی اور اُمیدِ مبہم کی کیفیت میں مستقبل پر اعتماد اور انقلاب، رومان کے رویے بھی پروان چڑھ آتے تھے۔ نو آبادیاتی استحصال سے آزادی کی لہر اور انسان کے بڑھتے شعور کے پیشِ نظر اقبال نے میلادِ آدم میں للکار کر کہا تھا کہ عشق اے پردگیاں پردہ در پیدا شد۔ اسی لے کو جوش نے اپنے انداز سے آگے بڑھایا کہ انسان کو بیدار تو ہو لینے دو اور ندیم نے کہا ''انسان عظیم ہے خدایا''

لیکن یہ صدی اپنی آخری دہائیوں میں بگڑتے ہوئے جو سوال سا گننے لا رہی ہے۔ ان میں اعتماد، شکست کی کشمکش شدید تر ہے۔ غصے اور ہزیمت کا احساس بھی ہے۔ اعصابی تشنج اور مفاہمت کی لہر بھی ہے اور ظہور نظر کی شاعری اس تمام کشمکش کی قافلہ سالار ہے۔ جو اس صدی کی آخری دہائیوں میں ابھی اور پروان چڑھ رہی ہے۔ ظہور نظر ترقی پسند ادب کی تحریک میں رواں دواں رہا تھا لیکن "ریزہ ریزہ" سے ہی اس نے نئے حالات کی سفاکی کو ایک وجودی لہر کے ساتھ سمیٹنا شروع کر دیا تھا اور یوں ترقی پسند تحریک کے زمانے کا "ماورائی انقلابی" لہجے میں بات کرنے والا ظہور نظر اب حقیقت نگاری اور حالات کی پیدا کردہ تجرید کے رتوں میں انسان کی جانکنی کے منظر کو دیکھ رہا تھا۔

غالب کی طرح ظہور نظر نے بھی اردو شاعری کی روایت کے سارے پس منظر سے علامتوں اور نادر استعاروں تشبیہوں کا ایک لازوال ذخیرہ جمع کر دیا ہے لیکن غالب کے زمانے میں شمع کی طرح سوز، گداز سے چلنے کا رویہ زندہ و توانا تھا اور زندگی کے تلاطم میں زندہ رہنے کی اُمنگ شاعری کی بنیادی قدر تھی۔ ظہور نظر تک پہنچتے پہنچتے تاریخ کے سفاک تھپیڑے بہت تیز رفتار اور ہولناک ہو چکے ہیں۔ اقوام متحدہ کے ایک سادہ سے سروے کے مطابق پسماندہ قوموں کے دس لاکھ بچے سالانہ محض بھوک سے جانکنی کے بعد موت کے گھاٹ اُترتے ہیں۔ دوسری سمت اسلحہ کی دوڑ، جنگ پرستی کے نئے ہتھکنڈے اور اس سے ہٹ کر انسانیت کے متعلق کھوکھلی اور دفتری لفاظی ایک شاعر کے تجربے کو فریب نہیں دے سکتی۔ اس کے اس بڑھتے پھیلتے آشوب سے ظہور نظر جو کچھ

سچائی کی تلخی کا زہر پینے سے نہیں ہچکچایا تھا، بھلا کس طرح غافل رہ سکتا تھا؛ وہ تاریخ کو متعین کرنے والے مادی عوامل سے کنارہ کش ہو کر محض رگِ گُل سے بُلبل کے پَر باندھنے کی شاعری میں مُبتا رہتا تو پھر بھی وہ شاعر تو ضرور کہلاتا جس طرح اَنگنت بے شمار لوگ کہلاتے ہیں لیکن وہ جانتا تھا کہ انسان کی سماجی سرگرمی اور پیداواری عمل کا ایک خاص دور تھا اور دنیا کے بعض معاشروں میں اب بھی ہے کہ رگِ گُل سے بُلبل کے پَر باندھنے والے لوگ ہی معاشرے کی اصل قوت نظر آتے تھے۔ تاہم تاریخ کے گزشتہ ادوار اور اُن ادوار کے تصادمات میں بننے والی ادبی روایت اور اس ادبی انا کو ٹھیس لگانا کسی طور مقصود نہیں جس نے میرؔ، غالبؔ اور مومنؔ جیسے لوگوں کو ظہور پذیر کیا تھا۔ یہ اس عہد کے کلچر، معاشرے اور وجودی اُمنگوں کے تصادمات کے نتیجے میں طلوع ہونے والے امتزاج تھے۔ سردست ہماری شاعری میں کچھ شاعر تو ایسے ہیں جو آزادی کے بعد رگِ گُل سے بُلبل کے پَر باندھنے کی روایت تو ساتھ لائے لیکن گزشتہ چونتیس سال کے پاکستانی معاشرے سے محض واجبی سا ہی اثر قبول کیا۔ دوئم ترقی پسند شاعری کا گونج دار لہجہ ہماری شعری روایت میں رس گھولتا رہا لیکن دنیا کے معاشرتی بحران میں وہ بذاتِ خود ایک روایت بن کر علیحدہ ہوتا گیا۔ سوئم نوجوانوں کا گروہ جو علامت، دیومالا اور لسانی توڑ پھوڑ کے حوالے سے محض لغویت اور بے معنویت کی بات کرتا رہا اور غیر ارادی طور پر استعماری نظریۂ تعلیم کی ایک پیوندکاری بن کر رہا۔ چہارم پسماندہ دنیا میں جدوجہد کے دوران اُبھرنے والی نئی شاعری کے ترجمے اور پھر اس ترجمے کی شاعری کے چربے یا اس سے کوئی ملتی جُلتی چیز۔ اس مختصر سی گزارش سے یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اردو شاعری اور بہ خصوصیت سے غزل کی شاعری تو کھرے کھوٹے کی واضح پہچان بن جاتی ہے اور یہ انتہائی سخت جان آدمی کو قبول کرتی ہے۔ ایسے آدمی کو جو اپنے تجربوں کو ہر قسم کی تجرید اور امتزاج کے کٹھن مراحل سے گزار کر بھی قافیہ، ردیف کے آہنگ میں لاسکتا ہو، اور جو اس حد تک خلاقانہ صلاحیتوں سے مالا مال ہو کہ حالات کی میکانکیت اور بعض مخصوص الفاظ کے قرینے اور تکرار کے باوجود اس کے موضوعات پامال نہ ہوتے ہوں۔ اگر اس حوالے سے ہم کسی شاعر کا نام آج کی تاریخی جبریت کے پس منظر میں لے سکتے ہیں تو وہ ظہور نظر ہے۔ وہ اپنے عہد کی سفاکی کو اپنی خلاقانہ انا کے تصادم، تجربے، مشاہدے، مطالعے سے سمجھا ہے۔ اپنے اس سفر میں اس نے ترقی پسند تحریک کی توانا شخصیتوں کو جو کہ اس دور کی سفاکی میں بھی انسان کے مستقبل پر اعتماد رکھتی ہیں، حوالہ بنایا ہے۔ عرصہ ہوا کہ اُس نے ریڈیو پاکستان مُلتان کے ایک انٹرویو کے دوران ایک سوال کے جواب میں انکساری سے کہا تھا کہ ادبی رجحانات میں اس نے فیضؔ اور ندیمؔ کی روایت سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن اس انکساری کے باوصف اور ریزہ ریزہ ہونے کے دوٹوک اعلان کے باوجود اس کے ریزہ ریزہ ہونے کی وہ شکل نہیں ہے۔ جو مجید امجدؔ کی شاعری میں ملتی ہے۔ مجید امجدؔ "شبِ رفتہ کے بعد" کی شاعری میں حالات کی سفاکی کے مقابل خود بھی ریزہ ریزہ ہے۔ وہ اپنی بے مائگی میں گُم ہے۔ اس کے برعکس ظہور نظر سفاکی کے بالمقابل ہتھیار پھینکنے کو تیار نہیں ہے۔ اپنی نظم "مجھے اُسی راہ پہ چلنا ہے" (مطبوعہ "افکار") میں وہ برملا کہتا ہے کہ گو آج میں وہ نہیں ہوں جو کل تھا لیکن میرا راستہ وہی ہے جو نیرو حِک کا تھا، ویت نامی عوام کا تھا اور جو قوموں کے جمہوری عمل کا راستہ ہے۔

عہدِ حاضر کی سفاکی سے قطع نظر اگر ظہور نظر کو کلاسیکل معیاروں سے بھی پرکھا جائے تو اس میں نیاز فتح پوری کے مشاعروں والے مثالی شاعر کے بھی بھرپور امکانات تھے اور مشاعروں میں اس کے اُسلوب کی گونج سامعین کو خاموش اور گُم سُم کر دیتی تھی۔ اس کی شاعری کے موضوعات عموماً مشاعروں کی واہ واہ کے موضوعات سے مختلف ہوتے تھے۔ اس کے باوجود اُس کے کلام کی اثر آفرینی کی حدود عوام تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اس عہد کی سفاکی کو بے نقاب کرنے میں کلاسیکل ذخیرۂ الفاظ کو اپنے تخلیقی سانچوں سے درہم برہم کر کے پھر اپنے انداز سے جوڑ کر چلاتا تھا۔ بے مائگی اس کے سامنے معروضی حقیقت تھی، اس کا شعری مقصود نہ تھی۔

اس تصادم میں وہ نئی تصویریں بناتا تھا۔ اوّلین طور پر وہ رومانوی رویوں سے اُبھرا تھا اور اس کی نظموں میں بھی ایک تغزل کی لہر ملتی تھی۔ لیکن "ریزہ ریزہ" کے بعد رومانوی رویہ اور عظمتِ آدم کا خواب ایک بازگشت بنتا گیا۔ گزشتہ پندرہ بیس سال کے عرصہ میں اس کا کلام پاکستان کے مختلف ادبی رسائل اور خصوصاً "فنون" میں چھپتا رہا ہے۔ اس کی غزلیں جو کہ نادر تمثالوں اور تشبیہوں سے مالا مال ہیں، ہر لمحہ ایک نئی صورتِ حال کو منکشف کرتی ہیں۔ ہر شعر ایک نئے تجربے کو سامنے لاتا ہے اور ہر تجربے میں ایک تجرید بولتی ہے اور ہر تجرید میں ایک حقیقت مستور ہوتی ہے۔ اس نے غزل کو غم والم، صوفیانہ واردات، جمالیات پرستی، رومان، انقلاب، تفکر سے آگے بڑھا کر بے تجنت کی ڈرامائیت اور کافکا کی کافکائیت کے بھی قریب کر دیا ہے کہ اس کے اکثر شعر اس کی رزمیہ زندگی کے اپنے افسانے کی بازگشت ہوتے ہیں اور لمحۂ موجود کی چُپ کے مفسر بھی۔ جس طرح غالب کی تصویروں کے مطالعے سے کچھ ایسے زاویوں کی تصویریں بنتی ہیں۔ جن کے لئے چغتائی کے مُوقلم سے ہی ممکن تھا کہ پُوری مغلیہ روایت کو سمیٹ کر رکھ دے۔ اگر آج کوئی مصوّر ظہور نظر کے شعروں کی تصویریں بنانا چاہے تو اس کے کینوس پر دنیا بھر کے کرب آمیز رنگ اور تجریدی حلقے جھلکیں گے۔ چند غزلوں کے مطالعہ سے تصویروں کے چند موضوعات یہ ہو سکتے ہیں۔ فصیلِ زنداں سے دیکھنا، ہر موڑ پر نہنگ کا کھڑا ہونا اور ہر چوک میں صلیب، بحرِ خود پرستی سے نکلنے کے بعد گلی سڑی لاش کا ملنا، سوچ کے گنبدِ بے دَر میں پڑا رہنا۔ اپنی ہی کھوج میں گمراہ ہونا۔ رات دن قبر نما گھر میں پڑا رہنا۔ ان ڈرامائی حالات کے ساتھ ساتھ یادوں کا گھِر گھِر کر آنا، عشق سے ناتا نہ توڑنے کا عزم جیسے موضوعات بھی اس کی غزلوں میں محض روایت کی پاسداری میں نہیں آتے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اس کے مزاج کی تشکیل میں محبت اور رومان کے رویوں کا اوّلیں نقش بڑا گہرا تھا۔ لیکن "ریزہ ریزہ" کے بعد کی شاعری میں یہ تصویریں اکادُکا ابھرتی ہیں، اور جب ابھرتی ہیں تو شدت سے اُبھرتی ہیں اور وہ پھر اپنے اندر کے انسان کو کچل کر نفی انسان کی اسیر ہوا در موجود حقیقت میں قریب سے اُلجھ کر اور پھر نبرد آزما ہو کر رنگ بھرتا ہے۔ وحشتِ زنداں میں امید کی گونج، جبر کے جنگل میں پتھر، رگِ خوف کا سُلگنا، قزاق اور شب کا جزیرہ، پیاسی اور ویران کشتِ حیات، جمود اور خوف کی خندق کو تیر کر پار کرنے کا عزم اور رزم گاہ کا دروازہ وا کرنا، جابروں کے سامنے سر اٹھانا، بھیک پر بھوک کو ترجیح دینا اور پھر اس کا انعام شکست کے بعد دوستوں کی چُپ، سائے پر دیوار کا ٹوٹ کر گرنا، حریف کی دستار کا اس کے پاؤں پر جا پڑنا، فصیلِ شب کے شگافوں سے طلوع کا منظر، کٹے ہوئے سلاسل، اُجاڑ مقتل، خوابوں کے شہر کا کھنڈر بننا، زمین کے خون سے افق تہ دکھائی دینا۔ وحشی ہوا کا دل میں کچھ چھوڑ کر نہ جانا، گنجان جنگل کا اُجڑنا، رات بھر چاپ کا ابھرنا، جانا ہوا خوف لیکن کچھ نہ ہونا۔ غرض یوں لگتا ہے کہ تجریدی شکل میں بے شمار کہانیاں اور ڈرامائی تصویریں اور کیفیتیں ظہور نظر کے اسلوب میں پروان چڑھتی ہیں جو کہ اپنی جگہ مکمل بھی ہوتی ہیں اور ایک تواتر و تسلسل سے منسلک بھی۔ اپنی اس ڈکشن سے اس نے غزل کی روایت کو بھی آگے بڑھایا ہے اور دوسری طرف اس امکان کی بھی تصدیق کر دی ہے کہ غزل کے ڈکشن میں بھی دنیا بھر کی تجرید اور تحیّر اور ان سے ابھرنے والی مزاحمت کو سمو کر ہم عصر شاعری کے تقاضوں کو نبھایا جا سکتا ہے، بلکہ ان تقاضوں کو نبھانا زیادہ مشکل کام ہے۔ یُوں ایک مرگِ مسلسل سے دوچار انسانی زندگی کے مختلف خواب اور امکان اپنی توڑ پھوڑ سے ڈھونڈتا ہے۔ آخری عمر میں شدید احساسِ تنہائی، جان لیوا روگ، تاریخ کی طوطا چشمی، دل کے پے در پے حملے اور ایسے ہی حوادث و عناصر اس کی شاعری میں ناگزیر بن کر اُبھر آتے تھے۔ موت ایک حقیقت اور سنگین حقیقت کے طور پر سامنے تھی۔ اس کے باوجود وہ ڈوب کر زندگی سے پیار کرتا ہے اور ہنستے کھیلتے زندگی کو الوداع کہتا ہے۔

- - - -

جمیل ملک

سات نمبر کی بس

منظور عارف کی یاد میں

یہ مری ہم نفس
سات نمبر کی بس
لے کے جاتی تھی جو
گھر سے دفتر تجھے
جس میں آتا تھا تو
روز دفتر سے گھر
کف اُڑاتی ہوئی
ڈگمگاتی ہوئی
شاہراہوں پہ وہ چیختی پھر رہی ہے، مگر
تو کسی گھر میں ہے
اور نہ دفتر میں ہے
تو تو آفاق کی وسعتوں میں کہیں کھو گیا
تو بہت تھک گیا تھا
زمیں کی ہری گود میں سو گیا

تیری پگلی تجھے
آج بھی ڈھونڈتی پھر رہی ہے وہاں
تیرے قدموں کے روشن ہیں جن راستوں پر نشاں
اور کیا اُس کی ہے دسترس
یہ مری ہم نفس
سات نمبر کی بس —!

عرفانِ عارف

احسن علی خان

منظور عارف میری نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور تقریباً میرے ہم عمر شاعر ہیں۔ میں نے حال کا صیغہ دانستہ استعمال کیا ہے۔ جی نہیں چاہتا کہ منظور کا "نہ ہونا" تسلیم کروں اور اس کی تصویر ماضی کے طاق میں سجادوں۔ وہ "ہے" کیونکہ وہ ایک جیتا جاگتا شاعر ہے۔

منظور سے میری پہلی ملاقات چند سال پہلے ہی ہوئی تھی، وہ بھی سرسری سی۔ بعد میں بھی ملاقاتیں سرسری ہی رہیں۔ جب کبھی وہ ریڈیو پاکستان کے مشاعرے میں بلا لیا جاتا اور ملاقات ہو جاتی۔ ہر بار مل کر یہ احساس ہوتا تھا کہ جیسے ہم ایک دوسرے کو بہت عرصے سے جانتے ہوں۔ شاید ہم ایک ہی ویولینتھ (WAVE LENGTH) پر تھے۔ شاید ہم دونوں کی سوچوں اور احساسات کے سفینے ایک ہی لہر پر سفر کر رہے تھے۔ منظور سے مل کر عجیب سی قربت اور باہمی تفہیم کا احساس ہوتا تھا۔ ہر مختصر ملاقات کے بعد ارادہ کرتا تھا کہ اس شخص کے گھر جاؤں گا، وہاں چند گھنٹے گزاروں گا۔ کچھ اس سے سنوں گا کچھ اپنی سناؤں گا۔ مگر بے رحم حالات نے یہ آرزو پوری نہ ہونے دی۔

جب ایک محفل میں مجھے یہ خبر سنائی گئی کہ منظور عارف کا شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے تو میری نظریں ادھر اُدھر منظور کو تلاش کرنے لگیں۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ بعد میں خیال آیا کہ وہ تو اپنے گھر پر بھی نہیں ہے، کہیں دور چلا گیا ہے۔ بغیر ملے ہی چلا گیا ہے۔ اس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ وہ خاموش خاموش، سادہ لباس، قلندر منش، خوبصورت انسان، سالہا سال ریڈیو پاکستان سے منسلک رہنے کے باوجود اپنا "سیلف پروجیکشن" نہیں کیا۔ وہ تو جیسے شہرت سے بھاگتا تھا۔ ریڈیو کے مشاعرے کراتا تھا اور خود غزل نہیں پڑھتا تھا۔ اس نے مجھ سے کبھی یہ نہیں کہا کہ احسن بھائی کچھ نئے شعر ہوئے ہیں آپ بھی سن لیں۔ وہ چھپتا بھی کم تھا۔ میں نے اس کی چند ہی چیزیں پڑھی تھیں اور ان کی بنیاد پر اپنے ذہن میں اس کا ایک اونچا مقام متعین کر لیا تھا۔ میں شاعری میں اچھے اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ لیکن جب بھی ریڈیو کے مشاعرے میں جاتا منظور عارف کو اپنی دو تین غزلیں نظمیں دے دیتا اور اس سے کہتا کہ ان میں سے جو تم کہو گے وہی پڑھ دوں گا۔ منظور سارے کام چھوڑ کر میری چیزیں پڑھتا اور مجھے اپنے انتخاب سے آگاہ کر دیتا۔

میں اس محفل میں منظور عارف کی یادوں میں کھو گیا۔ یادوں کے اس سلسلے نے اس سے ملاقات کی خواہش میں شدت پیدا کر دی۔ پھر خیال آیا کہ شعری مجموعے کی شکل میں وہ اپنا داخلی وجود چھوڑ گیا ہے اور اس وجود سے میری ملاقات ہو سکتی ہے۔ میں سیدھا عزیزم احمد جاوید کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے یہ شعری مجموعہ دو۔ میں اپنے تاثرات لکھنا چاہتا ہوں۔

میں نے "لہر لہر دریا"* پڑھ کر منظور عارف کے داخلی وجود سے ملاقات کر لی ہے اور اب اس ملاقات کے تاثرات لکھ کر وہ

---

* لہر لہر دریا (مجموعۂ کلام) مصنف: منظور عارف ناشر: "مطبوعات" نسبت روڈ لاہور

لیث قریشی

خوابِ مرگ

(رئیس خواب میں ملکِ عدم کا راہی ہوا
فروغ زندہ ہے، زندہ رہے گا تا بہ ابد)

میں سو رہا تھا
یکایک جو میری آنکھ کھلی
تو میں نے پوچھا کسی سے
ہے میرا دوست کہاں ؟ — وہ مرا رئیس فروغ
مجھے جواب ملا، وہ تو سو رہا ہے ہنوز
اور ایک تم ہو کہ اب تک ہو رتجگوں میں مست
اُسے تو جتنا بھی سونا تھا، سو چکا
اب تک —
اکیلا جاگ رہا تھا وہ اک زمانے سے
کہ کوئی جاگنے والا نہیں تھا اُس کے ساتھ
زیادہ لوگ یہاں محوِ خواب رہتے ہیں
کہ روز و شب کے وہ پابند ہی نہیں ہوتے
وہ مجھ سے کہتا تھا اکثر، "کہاں کہاں دیکھیں
جو گرد و پیش کو دیکھیں تو زندہ کیسے رہیں
جبھی تو رکھتے ہیں عرصے سے اپنی آنکھیں بند
ارادتاً کبھی اِک بار ان کو کھولا بھی
تو کیا بتائیں کہ کیا کچھ ہمیں نظر آیا
ہماری آنکھیں کھلیں تو سدا کھلی ہی رہیں
اور اس طرح سے کھلیں پھر کہ بند ہو نہ سکیں
کیسے بتائیں کہ ہم لوگ اس خرابے میں
جو رہنا چاہتے آخر تو کس طرح رہتے
سو ہم بغیر بتائے ہی سہہ گئے اک روز
رہیں یہ آنکھیں تو ان کو کھلا ہی چھوڑ دیا
کہ اِن دریچوں میں کچھ لوگ آ کے جھانکیں تو
کسی کو آئے نظر شاید اس میں وہ دُنیا
مزید جس کو ہمیں دیکھنے کی تاب نہ تھی
یہ اجتناب نہ تھا، ایک جبرِ پیہم تھا
کہ جبر سہنا ہماری پرانی عادت تھی
ہماری فطرت تھی —
یہ اور بات کہ مٹی پڑی جب آنکھوں میں
تو بند ایسی ہوئیں بس کہ آج تک ہیں بند
اور اس کے بعد یہاں اپنی بند آنکھوں سے
جو دیکھتے ہیں کسی کو دکھا نہیں سکتے
یہ کائنات ہے کیسی بتا نہیں سکتے
یہاں کے منظر و ماحول کو کسی بھی طرح
ہم اپنے شعر کے قالب میں ڈھالنے کے لیے
دوبارہ بزمِ سخنداں میں آ نہیں سکتے

شبیہہ رضوی

○

والدِ محترم

خاور رضوی

کی یاد میں

اک چہرے کو آنکھوں میں بسا رکھا ہے ہم نے
اک یاد کو سینے سے لگا رکھا ہے ہم نے

صاحب، یہ ہُنر دیکھو کہ ویرانۂ جاں میں
اک پھول سے گلزار کھلا رکھا ہے ہم نے

اب وہ جو نہیں، اس کے تصوّر سے بہرطور
خلوت کدۂ دل کو سجا رکھا ہے ہم نے

اب کون جو ہم چاک گریبانوں سے پوچھے
کس بجہ سے ہیں یہ حال بنا رکھا ہے ہم نے

آباد نظر آتی ہیں پلکوں کی منڈیریں
اشکوں کے چراغوں کو جلا رکھا ہے ہم نے

شاید کہ کبھی لوٹ کے آجائے مُسافر
اس آس پہ دروازہ کھُلا رکھا ہے ہم نے

اِک وقت تھا جب حشر اُٹھاتے تھے مگر اب
لگتا ہے کوئی بوجھ اُٹھا رکھا ہے ہم نے

سیاہ کاروں نے اہلِ یقیں کو لوٹ لیا　　خدا کے نام پہ اہلِ زمیں کو لوٹ لیا

" شاعرِ ارضِ وطن " میں منظور عارف نے اقبال کو مخاطب کر کے اپنے ذاتی کا بھرپور
اظہار ہی نہیں کیا بلکہ اہل وطن کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا۔ وہ کہتا ہے:۔

تو نے جو ملک تصور میں کیا تھا آباد
آج وہ ملک تو اک زندہ حقیقت ہے مگر
دستِ بے رحم سیاست کی وہی ہے بیداد
وہی فاقہ کشی، ناداری و عریاں بدنی
وہی نالہ، وہی زاری، وہی آہ و فریاد
چند کو چھوڑ کے جو شخص ہے فریادی ہے
شاعرِ قوم بتا، کیا یہی آزادی ہے

منظور عارف کو فن پہ پورا عبور حاصل تھا۔ وہ نظم و غزل کہنے کی یکساں استعداد رکھتا تھا لیکن اس کے ہاں ہئیت کو مواد پہ فوقیت حاصل نہیں ہے۔ خیال، جذبہ اور احساس کی نوعیت از خود ہیئت کا تعین کرتی ہے، چنانچہ عارف کے شعری مجموعے میں غزلیں بھی ہیں، پابند نظمیں بھی اور آزاد نظمیں بھی۔ نظم کی پابند شکلیں مثلاً مسدس، مخمس، رباعی وغیرہ اس مجموعے میں نہیں ملتیں۔ کیونکہ منظور عارف کا فن جو عصری تقاضوں کے ساتھ چلتا ہے، ان پابندیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

منظور عارف کی شاعری میں جلال و جمال بھی ہے اور حرکت و ارتقا بھی۔ اس کی ایک جلالی غزل کے دو شعر سنیئے۔

تھک گیا ہوں کوئی سایا بولے　　تشنہ لب ہوں کوئی دریا بولے
کیوں سرِ دار ہوں سچ کہہ کر میں　　بتکدہ، کعبہ، کلیسا بولے

اور جمال کے نمونے دیکھئے:۔

منظر جھلکتے چاند کا کتنا حسین تھا　　اس کی قبا کی طرح وہ بادل مہین تھا
تیری آواز سے ابھرتا ہے　　تیرے رخ کا سماں اندھیرے میں
حسین رخ پہ وہ معصومیت برستی ہے　　کہ دیکھ لیں تو گناہوں کے ہوش اڑ جائیں

احمد ندیم قاسمی نے " لہر لہر دریا " کے دیباچہ میں کہا ہے کہ منظور عارف کا مزاج حرکت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے حرکت ان ہی شاعروں کی تخلیقات میں اُجاگر ہوتی ہے جو فطری طور پر تغیر اور ارتقا کو پسند کرتے ہیں۔ عارف کا یہ شعر سنئے:۔

لاکھ روکا اسے پستیوں نے مگر زندگی ارتقا پر ہی مائل رہی
دم بدم یہ سنورتی نکھرتی رہی، دن بدن طور اس کے بدلتے رہے

اور دیکھئے حرکی رویہ نے غزل کے اس شعر کو کیسا حسن بخشا ہے:۔

میں ہواؤں کے گنگناتا رہتا　　تم جو بہتے ہوئے دریا ہوتے

کسی شاعر پر لکھتے ہوئے عموماً نقاد یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کن شاعروں اور مصنفوں سے متاثر ہے۔ منظور عارف کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کس خاص شاعر سے متاثر ہے۔ اس نے غالب کی زمینوں میں تین غزلیں ضرور لکھی ہیں۔

لیکن یہ غالب کے رنگ میں نہیں، منظور کے اپنے رنگ میں ہیں۔ اس نے کسی ترقی پسند شاعر کا اسلوب اور رنگ بھی نہیں اپنایا ہے۔ کہیں کہیں اس کے ہاں صوفیانہ رویہ بھی جھلکتا ہے جو شاید اس وجہ سے ہے کہ اس کی سوچ کے ڈانڈے صوفیوں کی انسان دوستی سے مل جاتے ہیں۔ آخری دور کی نظموں اور غزلوں میں جدید اسلوب اور طرزِ ابلاغ بھی نمایاں ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ ہم اسے جدیدیت کا نام دے سکیں۔ منظور عارف اگر کسی سے متاثر ہے تو وہ اس کا اپنا زمانہ ہے۔ اس نے اپنے پیش رو اور ہم عصر نمائندہ شاعروں کے رجحانات، افکار و خیالات کے اثرات ضرور قبول کئے ہیں لیکن لہجہ اور رنگ اس کا اپنا ہے۔ وہ دراصل اپنے عہد کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری زندگی سے بہت قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا فن عہد بہ عہد ترقی کرتا رہا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو اس کا فن اور بھی ترقی کرتا:

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

(حلقہ اربابِ غالب راولپنڈی میں پڑھا گیا)

قرض ادا کرنا چاہتا ہوں جو منظور عارف اور نئی نسل کی طرف سے مجھ پر واجب ہے۔

منظور عارف ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جو نسل پیدا ہوئی وہ تمام عمر سیاسی اور معاشی بحرانوں سے دوچار رہی۔ بین الاقوامی سطح پر ابھی پہلی جنگ عظیم کے اثرات ختم نہیں ہوئے تھے کہ دوسری جنگ عظیم کے بادل منڈلانے لگے۔ منظور عارف اور اس کے ہم عمروں نے چوتھی دہائی میں جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو برصغیر ہی نہیں تمام دنیا کو معاشی بحران میں پایا۔ برصغیر میں ایک طرف آزادی کی تحریک زور پکڑ رہی تھی تو دوسری طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سیاسی اختلافات کی خلیج وسیع تر ہوتی جا رہی تھی اور فرقہ وارانہ فسادات شدت اختیار کر رہے تھے۔ ۲۹ء، ۳۰ء، ۳۱ء کی گول میز کانفرنسیں، ۳۰ء، ۳۱ء کی تحریک سول نافرمانی، ۳۵ء کی دستوری اصلاحات، ۳۷ء کے انتخابات اور صوبوں میں کانگریس کی وزارت سازی، ۳۹ء سے ۴۵ء تک دوسری جنگ عظیم، ۴۰ء میں لاہور کی قرارداد پاکستان کی بنیاد پر تحریک پاکستان کا آغاز، کرپس مشن کی ناکامی اور ۴۲ء میں گاندھی کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک ۴۲ء۔۴۳ء کا قحط بنگال، برطانوی حکومت، مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان شملہ میں سہ فریقی مذاکرات، کیبنٹ مشن پلان، ۳ جون ۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن کا حتمی اعلان تقسیم و آزادی اور اس کے تحت آزادی کا حصول اور پاکستان کی پیدائش، اس کے ساتھ ہی خونریز فرقہ وارانہ فسادات اور انتقال آبادی۔ یہ سب کچھ منظور عارف اور اس کی نسل کے لوگوں نے دیکھا اور ان تاریخ ساز واقعات کے اثرات قبول کئے۔ اور پھر پاکستان بننے کے بعد سے آج تک ہم ایک مسلسل ہمہ گیر اور ہمہ جہت بحران میں مبتلا ہیں۔ یہ بحران خارجی بھی ہے داخلی بھی، سیاسی بھی ہے معاشی بھی، سماجی بھی اور ثقافتی بھی۔ منظور عارف اور اس کے ہم عصر شاعر و ادیب اس بحران کے کرب سے بھی گزر رہے ہیں اور گزر رہے ہیں جو شاعر و ادیب بحرانی دور کے اس کرب سے ناآشنا ہیں۔ وہ شاعر و ادیب تو کیا پاکستان کے باشعور شہری بھی نہیں ہیں اور جو اس کرب کا علاج "ادب برائے ادب" یا وجودیت اور تجریدیت میں ڈھونڈتے ہیں وہ زندگی کے تلخ حقائق سے منہ موڑ کر راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ منظور عارف ان لوگوں میں نہیں ہیں۔ وہ حالی، شبلی، اقبال اور جوش کی روایت کا شاعر ہے۔ وہ فیض اور ندیم کے قبیلے کا ایک فرد ہے۔

بحرانی دور میں حق و باطل کے درمیان کشمکش شدت اختیار کر لیتی ہے۔ ایسے دور میں باضمیر شاعر، ادیب، صحافی اور فن کار گوناگوں مصائب اور آزمائشوں سے دوچار رہتے ہیں کیونکہ وہ باطل کی حمایت کر کے اپنے قلم کی عصمت کا سودا نہیں کر سکتے۔ منظور عارف بھی ایسے شاعروں میں سے ایک ہے جس نے روزی کمانے کے لئے ایمانداری سے نوکری تو کی لیکن اپنے قلم کی عصمت کا سودا نہیں کیا۔

منظور عارف ایک خاموش طبع، نرم مزاج اور کھرا انسان تھا۔ زبان سے زیادہ اس کی آنکھیں بولتی تھیں۔ اس کے جذبات، احساسات اور تاثرات شعر کا روپ دھار لیتے تھے۔ اس کے سینے میں ایک دردمند دل تھا اور اس کے ذہن کی تہذیب سیاسی اور سماجی شعور سے ہوئی تھی۔ اس کی شاعری دردمند دل اور باشعور ذہن کی مشترکہ کاوش کا ثمر ہے۔ وہ ذات کی بھول بھلیوں میں گم نہیں ہوا کیونکہ اس کی ذات میں نفسیاتی الجھنیں اور بھول بھلیاں نہیں تھیں۔ ذات کا دکھ اسے بھی تھا لیکن اس نے اپنے تمام دکھوں کو غم کائنات میں ضم کر دیا تھا۔

ہے انہیں صرف اپنی ذات کا غم　　　　اور ہمیں ساری کائنات کا غم

وہ حسن جاناں کا منکر نہیں اور عہد شباب میں غم جاناں سے بھی دوچار ہوا لیکن نہ تو حسن جاناں کو اس نے اپنی زندگی کی واحد منزل قرار دیا اور نہ ہی غم جاناں کو اپنے اعصاب پر مسلط ہونے دیا۔ وہ تو غم دوراں اور دکھی انسانیت کا شاعر تھا۔

ہم نے غم دوراں سے اگر پیار کیا ہے　　　　حسن رخ جاناں سے کب انکار کیا ہے

رخصت غمِ یار کو تو کہہ لوں آیا! غمِ روزگار، آیا!

منظور عارف نے اپنے نظریات اور رویوں کا اظہار ان چند اشعار میں کیا ہے۔

بے نیازِ سکونِ منزل ہے زندگی ارتقا پہ مائل ہے
گم ہے یوں فکر کائنات میں دل یادِ محبوب سے بھی غافل ہے
فن فقط حسن کو نہیں کہتے اس میں خونِ جگر بھی شامل ہے
تجھ پہ قربان اے غمِ دوراں تو مری زندگی کا حاصل ہے
آپ کیا جانیں شورشِ طوفاں آپ کا دل رہینِ ساحل ہے
آؤ، کرنوں کی کھوج میں نکلیں تیرگی سے نباہ مشکل ہے

منظور عارف نے اپنے عہد کی نمائندگی میں حتی المقدور کوتاہی نہیں کی۔ قومی اور بین الاقوامی واقعات اور سانحات کا کرب محسوس کر کے اس نے دکھی انسانیت کی ترجمانی کی۔ "یادگارِ شہیداں"، "مجانہ کلب"، "ویت نام"، "یکم مئی"، "سرنڈر" اور "دیٹو پاور" ایسی نظمیں ہیں جو اس کے سیاسی اور سماجی شعور اور حب الوطنی کی گواہی دیتی ہیں۔ یہ شعور اور اس سے پیدا ہونے والی بے اطمینانی اور خواہشِ انقلاب اس کی "حمد"، "نعت" اور "شاعر ارضِ وطن" میں بھی نمایاں ہے۔ حمد کا عنوان ہے "احتجاج" اس نظم میں شاعر اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور اپنی عبدیت کا اقرار کرنے کے بعد پوچھتا ہے:۔

لیکن اے ربِ کون و مکاں

یہ جہاں

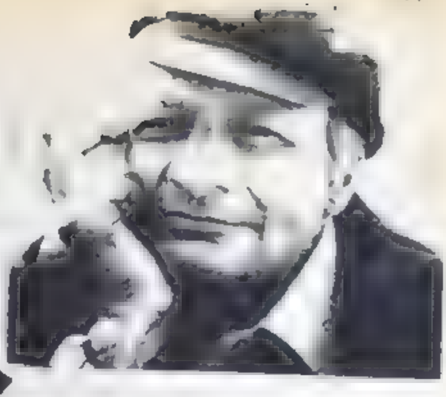
یہ جہاں تیری جاگیر ہے، ملکیت ہے تری تو بتا اس میں انسان دن رات فاقوں سے مرتے ہیں کیوں؟
دن میں سو بار جو بھیجتے ہیں تجھے، تیری جاگیر میں وہ ہمیشہ سنورتے ہیں کیوں؟
بات کیا ہے کہ منعم کی گردن ترے آستانے پہ جھکتی نہیں
تیغِ مظلوم کی شاہ رگ پر بھی رکتی نہیں۔

اور

میں نے محنت بھی کی، میں نے کوشش بھی کی، پھر بھی بھوکا رہا، کیا یہی تیرا انصاف ہے اے مرے دادگر
یا مجھے رزق دے یا مرے پیٹ میں نور بھر، ورنہ اپنی غلامی سے آزاد کر۔

اللہ تعالیٰ کے حضور منظور عارف کا شکوہ کوئی نئی چیز نہیں۔ اس سے پہلے اقبال بھی شکوہ کر چکے ہیں، مگر منظور عارف کا شکوہ ایک مفلس اور غریب انسان کا شکوہ ہے۔ جس طرح منظور عارف کی حمد احتجاج کا روپ دھار لیتی ہے اسی طرح اس کی نعت ایک فریاد بن جاتی ہے، وہ کہتا ہے:۔

حضورؐ اٹھے تو اک انقلاب لے کے اٹھے شبِ سیاہ میں اک آفتاب لے کے اٹھے
مگر حضورؐ کے بعد اس جہاں پہ کیا گزری غریب و بیکس و آشفتہ جاں پہ کیا گزری
ہوا کچھ ایسا جہاں پر ملوکیت کا نزول کہ دب کے رہ گئے انساں کی زندگی کے اصول
کچھ ایسا رشتۂ عمامہ و کلاہ ملا اگر فرشتہ ملا شیخ کو تو شاہ ملا



احمد شمیم

پانچ نظمیں

منزل

مسرت کے اُڑتے ہوئے ایک پل کو
کہاں تک تمنّا کی زنجیرِ بے مایہ سے باندھ کر رکھ سکو گی
دریچے سے باہر ذرا اُس پراسرار سائے کو دیکھو
جو کب سے گھنی جھاڑیوں میں ہمیں ڈھونڈتا پھر رہا ہے

مسرت کا یہ پل
ہمکتی ہوئی زندگانی کا حاصل نہیں ہے — سزا ہے
ہمکتی ہوئی زندگی ایک دھوکا ہے
مرگِ مسلسل کی اس ساحری کا
جو یخ بستہ، تاریک منزل کا اک آئینہ ہے

چمکتے ہوئے دن کے چہرے سے
کرنوں کی صد رنگ جھالر اٹھا کر تو دیکھو
کہ تاریک شب کا — حقیقت کا — خاموش قلزم
ازل اور ابد کو خود اپنے کناروں کی زنجیر میں لے کے کیسے چھپا ہے

سُلگتے ہوئے دن کے پہلو میں خواہش کے دوزخ کا ایندھن
تمھاری یہ سیماب پا زندگی ہے
جسے تم نے اُمیدِ فردا کے کھونٹے سے باندھا ہُوا ہے
مری زندگی ہے جو میرے لیے
اس حصارِ تمنّا میں زنجیرِ پا ہے

دبے پاؤں آکر
مرے دل کی دہلیز پر اپنا سر رکھ کے تم کہہ رہی ہو
"مرے دل کے ہر زخم میں تیری اُلفت کی خوشبو بسی ہے!"
— چلو اس سے پہلے کہ کوئی ہوس کار، یخ بستہ جھونکا ہوا کا
تمھارے ہر اک زخم سے میری الفت کی خوشبو چرا لے
ازل اور ابد کی مسرّت کو دل میں چھپا کر
حقیقت کے خاموش قلزم میں ہم ڈوب جائیں !

ریت پر سفر کا لمحہ!

کبھی ہم خوبصورت تھے
کتابوں میں بسی خوشبو کی صورت
سانس ساکن تھی!
بہت سے اَن کہے لفظوں سے تصویریں بناتے تھے
پرندوں کے پَروں پر نظم لکھ کر
دُور کی جھیلوں میں بسنے والے لوگوں کو سناتے تھے
جو ہم سے دُور تھے
لیکن ہمارے پاس رہتے تھے
نئے دن کی مسافت
جب کرن کے ساتھ آنگن میں اُترتی تھی
تو ہم کہتے تھے —— "امّی
تتلیوں کے پر بہت ہی خوبصورت ہیں
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو تتلیوں کے، جگنوؤں کے دیس جانا ہے
ہمیں رنگوں کے جگنو، روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں
نئے دن کی مسافت رنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ
کھڑکی سے بلاتی ہے،
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو!"

(جون ۱۹۷۲ء)

سفر سے واپسی کی خواہش

یہی نگر تھا ہماری آنکھوں ہمارے دل میں
اسی نگر کے سہانے خوابوں کی داستاں
موسموں کی آنکھوں میں جاگتی تھی
اسی نگر کی شگفتہ خوشبو
ہوا کی چادر میں رچ گئی تھی!

ہری رُتوں کی صدا پہ ہم اپنے گھر سے نکلے
تو ساری یادوں کا سر برہنہ جلوس
میلے لباس کی طرح تن سے اُترا!
سفر کے پہلے قدم میں دیکھا
تو رنج و راحت کے زاویے سب بدل گئے تھے!
ابرِ صفت ماتما کے آنگن کی سر برہنہ پکار
گزرے دنوں کی ساری حکایتیں
سب بچھڑنے والوں کو سونپ دی تھیں
— بچھڑنے والے امانتوں کے عذاب میں تھے
بچھڑنے والوں کی واپسی کے سراب میں تھے

بچھڑنے والو!
مری صدا شہرِ سبز پرچم سے جب بھی سُننا
ابرِ صفت ماتما سے کہنا
کہ میرے کمرے میں میرے کپڑوں سے دھول جھاڑے
مری کتابوں میں میرے ہاتھوں کے نقش دیکھے
خموش آنگن میں اُگتے پیڑوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر پکارے
کہ آؤ ——— اب شام ہو گئی ہے!

ہری رُتوں کی صدا پہ
سرسوں کا گیت کھیتوں میں بجھ چکا ہے
ہوا کا دوشیزہ دھوپ کا جسم
نیم بیدار خوشبوؤں میں نہا چکا ہے
میں سوچتا ہوں کہ واپسی کے سفر سے پہلے
یہی سماں میرے گاؤں میں ہو
ہر اک صدا شہرِ سبز پرچم کی چھاؤں میں ہو!

میری امّی سے کہہ دینا

ہر دن ، دریا
میرے گھر کا عکس اُٹھائے
میرے دروازے پر آکر رُک جاتا ہے

ہر شب چندا
مجھ کو گھر کی بات سنانے
میری چھت پر جھک جاتا ہے

میں کہتا ہوں
دریا ! ــــــ اے برسوں کے دریا !
میرے گھر کے دروازے پر کون کھڑا ہے ؟
وہ کہتا ہے ! تیری امّی
اپنے بالوں میں پربت کی برف سجائے
تیرا رستہ دیکھ رہی ہے

میں کہتا ہوں
چندا ! ــــــ جگمگ کرتے چندا !
میرے گھر میں کیا دیکھا ہے ؟
وہ کہتا ہے
تیرے گھر کے آئینوں میں
اب کوئی تصویر نہیں ہے

میں کہتا ہوں ، اچھے دریا !
پیارے چندا !
کہو تو میرا گھر کیسا ہے
وہ کہتے ہیں
تم ہو گے تو گلشن سا ہے
ورنہ تو وہ اِک صحرا ہے

میں کہتا ہوں
اچھے دریا !
اچھے چندا !
میری امّی سے کہہ دینا
صحرا کو گلزار بنائے
مجھ کو اِک دن لوٹ آنا ہے !

آئندہ

میری عمر کا سرکش گھوڑا
چلتے چلتے تھک جائے گا
اپنے لہو میں، سوچ، تارے، دھرتی بہہ جائیں گے
میں صدیوں کی نیندیں اوڑھ کے سو جاؤں گا
رُت کا فسوں
بارش کا نوحہ، بین ہَوا کا
دن اور رات کے سب ہنگامے
مجھ سے جُدا فریاد کریں گے
جانے والے، آنے والے — مجھ کو بھولنے کی خواہش میں
مجھ کو اکثر یاد کریں گے!
پھر صدیوں کے صحراؤں میں
میری صورت
آنے والے، جانے والے کھو جائیں گے
پھر آواز کی آہٹ سُن کر
صدیوں کے در کُھل جائیں گے
میں اعمال کا میلا کُرتا، اوڑھ کے
زندہ ہو جاؤں گا

تیز ہَوا میں
تپتی دُھوپ میں
جلتی بارش کے طوفاں میں
میں سوچوں گا — کیا سوچوں گا؟
سوچوں گا
سوچ کے دریا سے اُبھرے گا ایک سفینہ
شہرِ مدینہ!

احمد شمیم

○

شمع جلتی ہے تا سحر لوگو
دل سُلگتا ہے عمر بھر لوگو

ہم سہی گردِ کارواں، پھر بھی
ساتھ دیتے ہیں ہم سفر لوگو!

زندگی زخم بنتی جاتی ہے
کوئی تدبیر، چارہ گر لوگو

چاند اُبھرے تو دل سُلگتا ہے
آگ ہے یا گلِ قمر لوگو!

جانے کیا ہو گیا ہے رنگِ چمن
زخم ہیں شاخ شاخ پر لوگو!

بوئے گُل ہے صبا صفت آزاد
قفسِ غنچہ توڑ کر، لوگو!

یاد زنجیر بن گئی جن کی
وہ کہاں جائیں بھاگ کر لوگو!

خامشی بن گئی صدا اپنی
گنگ ہیں کب سے بام و در لوگو

ساتھ دو جلتے بجھتے تاروں کا
دُور ہے منزلِ سحر لوگو!

○

شام یادوں کے حوالے سے سنورنا چاہے
دھوپ جاتے ہوئے پربت پہ ٹھہرنا چاہے

آنکھ اسی منظرِ گُم گشتہ کی حیرت میں رہے
وہی گاؤں، وہی گوری، وہی جھرنا چاہے

ہم پہ جس شہر میں اُتری تھی رفاقت کی خزاں
دل اسی شہرِ ستمبر میں بکھرنا چاہے

میں ہوا ہوں، مری مُٹھی میں ہے وحشت کا غبار
مجھ سے صحرا کی طرح شہر بھی ڈرنا چاہے

سانس کے دھاگے میں دن رات کہاں تک باندھیں
اب تو لگتا ہے کہ یہ ہار بکھرنا چاہے

دھوپ کو اپنے گھروندوں میں سمیٹے رکھو
جانے کب برف پہاڑوں سے اُترنا چاہے

احمد شمیم

○

تمیزِ لالہ و ریحان و یاسمن ہے ابھی!
خزاں کی زد میں بہاروں کا بانکپن ہے ابھی

جلا کے راکھ کیا جس نے لالہ زاروں کو
قدم قدم پہ وہی آگ شعلہ زن ہے ابھی

سکوتِ مرگ ہے طاری اُفق سے تا بہ اُفق
غمِ حیات کا، اے دل، وہی چلن ہے ابھی

قرارِ زیست! بہارِ نظر! نگارِ چمن
چلے بھی آؤ کہ افسردہ انجمن ہے ابھی

کہیں سے لاؤ بھی وہ عہدِ نو کا مہرِ مُنیر
کہ صبح اوڑھے ہوئے رات کا کفن ہے ابھی

○

غبارِ لفظ میں معنی تلاش کرنا ہے
کہ ریگِ زرد کے دریا سے پار اُترنا ہے

ہر ایک اپنی سزا کاٹنے کو زندہ ہے
ہر ایک پھول کی تقدیر میں بکھرنا ہے

کتاب میں جو لکھا تھا، وہی غلط نکلا
کتاب ہی پہ مگر اعتبار کرنا ہے

ہتھیلیوں پہ جو لکھا گیا، وہ سچ ہی نہ ہو
اب اپنے ہاتھوں کی اس دشمنی سے ڈرنا ہے

سُریلی دُھن پہ نہ جا، ساز بھی صلیب نہ ہو
جو کہہ رہی ہے کہ مرنا ہے — سائیں مرنا ہے

اثاثے

احمد شمیم

میری زندگی میں کوئی تسلسل نہیں۔ ساری زندگی ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ لمحہ بہ لمحہ زندگی کرنے کے اس عمل میں اثاثے بنتے ہی نہیں کیونکہ اثاثے بننے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ڈھلتی دھوپ کی طرح ایک لمحہ واضح شکل اختیار کرنے سے پہلے ہی، دوسرے لمحے کی اندھی کھوہ میں گر جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں صرف یادیں رہ جاتی ہیں اور یہی اثاثے بن جاتے ہیں۔

میری ہمیشہ تازہ رہنے والی یاد اس ساگ کی خوشبو ہے جو میری والدہ پکاتی تھی۔ اس ساگ کی خوشبو میرے پورے وجود پہ محیط ہے اور یہ پُل کی طرح مجھے اپنے کٹے ہوئے ماضی سے ملاتی ہے۔ بیچ میں تیس سال کی جدائی کا ایک گونجتا گرجتا دریا ہے لیکن میں اس خوشبو کے لچکتے ہوئے پل پر سے گذر کر سری نگر پہنچ جاتا ہوں اور پہلے کی طرح ٹھنڈے چاولوں کے ساتھ یہ ساگ کھا لیتا ہوں۔ مجھے یاد ہے جب میں آج سے تیس سال پہلے اپنے گھر سے چلا تو یہ خوشبو میرے پیچھے پیچھے میرے ساتھ روانہ ہوئی اور آج تک میری ہمسفر ہے۔ یہ خوشبو دنیا کے لذیذ ترین کھانے اور میرے درمیان حائل رہتی ہے۔ دس سال پہلے سری نگر میں میری والدہ کا انتقال ہوا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ اب تک زندہ ہیں کہ وہ خوشبو، جو ہجرت کے لئے میرے ساتھ چلی تھی، اب تک میرے ساتھ ہے۔

یادوں کے اس میلے اور اثاثوں کے اس جھنجھٹ میں ایک ستارہ بھی ہے، سب ستاروں سے روشن! میں اب بھی اس ستارے کو تلاش کرنے کے لئے تاروں بھرے آسمان میں ڈھونڈتا ہوں لیکن یہ ستارہ کہیں نہیں ملتا۔ اس ستارے سے میری ملاقات سری نگر سنٹرل جیل میں ہوئی۔ مجھے تیرہ (۱۳) نمبر کوٹھری میں بند کر دیا گیا تھا۔ قید تنہائی تھی۔ یہ قید جسم اور ذہن کو دیمک کی طرح چاٹتی ہے۔ ایک شام کو جب سلاخوں والا آہنی دروازہ بند کر دیا گیا تو میں تھک کر کوٹھری کے فرش پر دراز ہو گیا۔ رات دھوئیں کی طرح پھیل گئی۔ میں نے بے چینی میں نظر اٹھائی سامنے نظر آنے والے آسمان کے اس ٹکڑے پر ایک ستارہ نظر آیا۔ دیر تک میں اس ستارے کو دیکھتا رہا۔ اس سے باتیں کرتا رہا اور پھر مجھے کچھ پتہ نہیں میں کب سو یا۔ پھر میں سارا دن اس ستارے کا انتظار کرتا رہا۔ یہ میرا معمول بن گیا۔ اس ستارے کی رفاقت میں میں نے جیل کی طویل راتیں کاٹیں۔ یہ ستارہ مجھ سے باتیں کرتا، مجھے تھپکیاں دے کر سلاتا۔ میں تیس سال سے اس ستارے کی تلاش میں ہوں لیکن مجھے آج تک یہ ستارہ نظر نہیں آیا۔ شاید جس آسمان کے نیچے میں رہ رہا ہوں، اس میں ایسے ستارے نہیں ہوتے۔

جس طرح یہ ستارہ میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ اسی طرح جیمز جوائس کا ناول ULYSESS میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا ہے اور یہ آنکھ مچولی گذشتہ تیس برس سے جاری ہے۔ یہ ناول میرے لئے ساتویں در کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں یہ دروازہ گذشتہ تیس سال سے کھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ دروازہ نہیں کھلتا۔ شاید یہ ناول میری ناتمامی کی ایک علامت ہے۔ شاید یہ ناول..... لیکن بات بڑھانے کا کیا فائدہ۔ ضروری نہیں کہ جو چیز عزیز ہو اس کا تجزیہ بھی ہو سکے اور شاید اس کی محبوبیت اس کے اسرار میں ہی پوشیدہ ہو۔ ہاں البتہ HAMLET کی اور بات ہے۔ میں اس کتاب کے ساتھ گذشتہ تیس سال سے سفر میں تنہا، بالکل تنہا اپنے ہونے کی اداس

گمبھیر چپ میں!

اثاثوں میں وہ تصویریں بھی ہیں جہاں میں نے ابتدا میں شاعری شروع کی۔ شالا باغ کی بارہ دری میں بیٹھ کر اپنی نظم لکھی "حسنِ فطرت" اس بارہ دری سے جھیل ڈل میلوں تک پھیلی نظر آتی ہے۔ اسی باغ میں علامہ اقبال نے فارسی نظم "ساقی نامہ" لکھی تھی "خوشا روزگارے خوشا نوبہارے"۔

جھیل ڈل میں پہلی بار تیرتے ہوئے ڈوبا تھا۔ گو اس وقت بچا لیا گیا لیکن محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک غوطے کھا رہا ہوں۔ سری نگر میں فوٹوگرافر کی دکان —— جو میری یادوں سے لپٹی رہتی ہے۔

محبتوں کے اثاثوں میں وہ خط ہیں جو منیرہ نے شادی سے پہلے مجھے لکھے ہیں۔ ان خطوط سے اس ذہنی کرب کے دوران مجھے زندہ رہنے کا جواز ملا۔ جب بے معنویت کی اذیت نے مجھے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا، جانے یہ اذیت ناک نظم لکھتے ہوئے آپ پر کیا گزرتی ہوگی —— یہ خط میں نے گم کر دیا ہے۔ لیکن میں نے اسے اپنی یاد میں بدل دیا ہے کیونکہ میں اثاثوں کو یادوں میں بدل کر انھیں محفوظ کرتا ہوں۔ محبتوں کے ہی اثاثوں میں میرے وہ دوست ہیں جن کے بغیر مجھے یہ زندگی ایسی محسوس ہے جیسے دھنک کے بغیر آسمان —— جمیل ملک، آفتاب اقبال شمیم، ذکی ورانی، یونس منصور اور شفقت تنویر مرزا تمام خوبصورت رنگوں کی تجسیم ہیں۔

ان تمام اثاثوں میں میرا سب سے بڑا اثاثہ :—— ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کا کمیشن سری نگر آیا تو ہم نے طلبہ کا سب سے بڑا مظاہرہ منظم کیا۔ ایس۔ پی کالج کے سامنے ہزاروں طلبہ نے بھارتی جارحیت کے خلاف مظاہرہ کیا۔ کمیشن چلا گیا تو بھارتی فوج، ڈوگرہ پولیس اور نیشنل کانفرنس کے غنڈوں نے کالج کو گھیرے میں لے لیا۔ پھر ہمیں بے دردی سے پیٹنا شروع کیا۔ ہمارے ساتھ کچھ مسلمان پروفیسر بھی اس عذاب کا شکار ہوئے۔ میرے کپڑے پھاڑ دیئے گئے اور میرا پورا جسم لہولہان تھا۔ مجھے بھارتی فوج کی ایک جیپ میں ڈال دیا گیا اور تھانہ کوٹھی باغ پہنچا دیا گیا جہاں پہلے ہی کئی طالب علم زخموں سے چور فوج کے نرغے میں تھے۔ جیپ سے گھسیٹ کر مجھے ایک بند کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ میرا سارا جسم لہولہان تھا۔ میں کمرے کے فرش پر بے جان جانور کی طرح گر گیا۔ پروفیسر حاجنی میری طرف لپکے۔ میرا سر گود میں رکھ کر مجھ سے کہنے لگے :

"MY SON, OUR PROPHET HAS SUFFERED MORE THAN THIS"

وہ خود زخموں سے چور تھے لیکن ان کی آواز میں ایسا ٹھہراؤ تھا کہ میرے زخم خود بخود بھرنے لگے۔ یہ فقرہ میرا عظیم ترین اثاثہ ہے۔ آج بھی جب میں زندگی کی چومکھی جنگ لڑتے لڑتے تھک جاتا ہوں تو بے پاؤں کہیں سے حاجنی صاحب آکر مجھ سے کہتے ہیں :

"MY SON, OUR PROPHET HAS SUFFERED MORE THAN THIS"

تو پھر میں نئی قوت کے ساتھ اس جنگ میں شامل ہو جاتا ہوں۔!

احمد شمیم کے خطوط — اپنی بیوی منیرہ اور دوست جمیل ملک کے نام

احمد شمیم

منیرہ کے نام

(۱۹۶۴ء کا ایک خط)

منو جی!

اداس بھی ہوں اور پریشان بھی۔ صبح تم آؤ گی اور میں تم سے لپٹ لپٹ کے پیار کروں گا کیونکہ .... نہیں منو خدا! ایسا نہ کرے۔ آج میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں مرجاؤں تو تم کیا کرو گی۔ میں سارا وقت یہی سوچتا رہا۔ آج کل میں اپنے اندر، اپنے باہر، تمہارا پیار محسوس کرتا ہوں۔ منو! خدا نہ کرے کہ خواب سچے ہوں۔ لیکن اگر ایسا ہوتا ہو تو میں موت سے پہلے ہر ریشے اور ہر رگ میں تمہارا پیار بھرنا چاہتا ہوں تاکہ میں پیاسا نہ مرجاؤں میں نے تمہیں چاہا ہے نا۔ میں نے تمہیں بہت چاہا ہے۔ میں تمہیں بہت چاہت ہوں۔ تمہیں معلوم ہے نا — کہ میں تمہیں کس قدر چاہتا ہوں۔ اس لئے منو میں آج کل اپنے دل اور اپنی روح کی پیاسی دھرتی کے ذرے ذرے کو تمہارے پیار سے سیراب کرنا چاہتا ہوں۔ منو! میں تم سے پیاری پیاری باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن میں اندر سے اس قدر بے چین اور پریشان ہوں کہ مجھے پتہ نہیں چل رہا۔ ایسا لگتا ہے جیسے میری مرضی اور میری خوشی کے خلاف ایک سفر ختم ہونے والا ہے گارڈن کالج میں شام کی عبادت کی گھنٹی بج رہی ہے۔ مجھے انجیل مقدس کی وہ عبارت یاد آرہی ہے — "یہ گجر جو بج رہا ہے کس کیلئے بج رہا ہے۔ اسے غور سے سن لے، کیا معلوم یہ تمہارے ہی لئے بج رہا ہو!"

عیسائی کسی کے مرنے پر گرجے کا گھڑیال یا گجر بجاتے ہیں۔ خدا جانے اسی وقت یہ گجر کیوں بجا اور مجھے وہ عبارت کیوں یاد آئی۔ منو! مجھے لگ رہا ہے جیسے سارے ماحول میں موت کی بو رچ گئی ہے۔ خود وہ خوشی جو میں آج محسوس کر رہا تھا، مجھے بجھنے سے پہلے چراغ کی بھڑک لگتی ہے۔

منو! — گذرا ہوا ہر لمحہ یاد آرہا ہے۔ میں اکتوبر کی شام وہ اولین ملاقات دیکھ رہا ہوں۔ اور پھر طویل سلسلہ۔ کیسے منو مجھے شروع ہی سے محسوس ہوتا تھا کہ میں ایک دن — جلد ہی مرجاؤں گا۔ تمہیں یاد ہے ایک دن ہم ان دو درختوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ کھلا کھلا روشن دن تھا۔ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے۔ پھر پہروں گم ہو جاتے اپنی اپنی ذات میں — نہیں، ایک دوسرے کی ذات میں گم ہو جاتے، میں گہرے نیلے آسمان کی طرف دیکھ کے کہتا — منو! دیکھو ارد گرد کتنا حسن اور کتنی خوبصورتی ہے، لیکن آہ! جلد ہی آنکھوں کی یہ کھڑکیاں بند ہو جائیں گی۔ اور میرے دل تک اس خوبصورتی کا کوئی پیغام نہیں پہنچے گا۔ تم گھبرا جاتیں اور مجھ سے کہتیں "بھئی یہ موت کا فلسفہ ہمیں نہیں اچھا لگتا۔"

منو! آج کل ویسے ہی دن ہیں۔ ایک سال سے اوپر گذر گیا ہے۔ کیا آنکھوں کی یہ کھڑکیاں بند ہو جائیں گی؟ آج جب میں تمہارے

ہاں سے نکلا تو میں دروازے پر ہی اباجی سے علیحدہ ہوا۔ میں نے انھیں کہا کہ میں کھیتوں میں سے جاؤں گا حالانکہ مجھے معلوم تھا، میں کھیتوں سے نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ تم نے کہا تھا "شمی آپ کھیتوں میں سے نہیں جائیں گے"۔ میں چاہتا تھا کہ میں تنہا اور خاموش چلتا رہوں۔ اباجی گگو کے ساتھ چلے گئے اور میں سر جھکائے دوسری طرف چل پڑا۔ ٹینکی کے قریب سے میں واپس آیا اور تھوڑی دیر اس درخت کے پاس کھڑا رہا جس کے نیچے میں نے پہلے دن تانگہ روکا تھا۔ پھر میں اداس اور کھوئی کھوئی نظروں سے ہسپتال کو دیکھتا رہا۔ اور پھر سر جھکائے ٹیکسلا کی طرف چل پڑا۔ تانگہ ملا اور میں بالآخر تانگے میں بیٹھ گیا۔ راستے میں سوچتا رہا کہ واقعی ایسے ہوگا کہ میں واہ نہیں دیکھنے نہ آسکوں گا۔ کیا واقعی سب خوبصورتی بجھ جائے گی؟

——مجھے وہ شام یاد آئی جب میں شدید بارش میں تمہارے گھر آیا۔ میں نے تمہیں دیکھا تمہارے چہرے کا سارا خون مجھے دیکھتے ہی نچڑ گیا کیونکہ تمہیں دکھ تھا کہ مجھے اسی بارش میں واپس جانا پڑے گا۔ میں خوش تھا کہ ہر چند مجھے بارش میں بھیگنا پڑے گا لیکن تھوڑی دیر کے لیے تمہیں دیکھ تو لوں گا۔ اُس دن خوش قسمتی سے مجھے فوراً تانگہ مل گیا اور تم بارش میں اس لئے بھیگتی رہیں کہ میں بھیگ رہا تھا۔ اس دن ایک آدھ گھنٹے میں ٹیکسلا میں بارش میں بھیگتا رہا۔ جانے آج یہ باتیں مجھے عجیب طرح سے کیوں یاد آرہی ہیں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے کہ اب یہ باتیں دوبارہ نہیں ہوں گی۔ جیسے مجھے اب بس ان باتوں کو یاد کرلے کی فرصت مل گئی ہے اور یہ فرصت تھوڑی دیر کی ہے۔ آج تمہارے گھر میں، میں تمہیں عجیب حسرت سے دیکھتا رہا۔ زاہدہ نے کوئی بات کی۔ میں نے نہ معلوم کیا کہا۔ تم نے پوچھا یا میں نے پوچھا تم کون ہو۔ تم نے جواب دیا۔ اپنے آپ سے پوچھیں۔ میں نے کہا "ماں"—— اور میرا دل ایک دم پیار سے بھر گیا۔ آج بھی یہی ہوا جب میں پرانے گانوں کی بات کر رہا تھا تو مجھے وہ گانا یاد آیا—— چار کہار تیری ڈولیا اُٹھا دیں......

جس میں شادی اور موت یکجا ہے۔ مجھے اپنا خواب یاد آیا مجھے یوں لگا جیسے میری شادی، شادی سے پہلے موت میں بدلنے والی ہے۔ میں اداس ہو گیا، چپ ہو گیا۔ تم نے پوچھا، میں نے کچھ اور کہہ دیا—— لیکن منو! زندگی میں انسان کس کو کیا بتلائے اور کتنا بتائے اس وقت سوچ رہا ہوں کہ آخر کیا مجھے تم سے بس اتنی ہی دیر ملنے کے لئے زندہ رہنا تھا؟

منو! میں بڑا اداس ہوں
بڑا پریشان اور دکھی !

تمہارا شمی

جانِ من!

ابھی ابھی ٹیکسی سے اترا ہوں۔ یہ چھوٹی سی کاپی خریدی ہے۔ اب بیٹھا تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے اپنی داستان کا آغاز کروں لیکن یہ بات تو بہر طور طے ہے کہ داستان کہیں سے بھی آغاز ہو اس کا عنوان تو ہی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری زندگی کی کتاب کا سرورق تمہارا نام ہے اور اندر اپنے ہی دکھ کی داستان رقم ہے۔ اس دکھ کو میں نے کیسے کیسے لبادے اڑھا دیئے ہیں، کیسے کیسے نام دیئے ہیں لیکن اس کی اساس اور بنیاد تو ہی ہے اے جانِ تمنا!

آؤ وقت کے پیروں میں زنجیریں ڈال کے اسے روک دیں اور پھر کھلے گہرے نیلے آسمان کے شامیانے کے نیچے بیٹھ کے ایک دوسرے میں یوں کھو جائیں کہ زمانے کو ہمیں جدا کرنے کا حوصلہ نہ ہو۔ عمر خیام نے بھی اسی طرح کی آرزو کی تھی۔ اُس نے زمانے کو، اس سارے ماحول اور ساری فطرت کو شکست و ریخت کے نئے عمل سے گزار کر اپنے پیار اور اپنی محبت کے مطابق ایک نئی دنیا کی تعمیر کی آرزو کی تھی جو اس کے بے انتہا شدید جذبے کا آئینہ ہو لیکن میری جان! ایسی آرزوئیں کبھی تکمیل پاتی ہیں؟ ہاں البتہ میں نے جو اپنے دل کو تمہارے

پیار کا شبستان بنایا ہے۔ اس میں تو ہے میرے خلوص کی مہکار ہے اور کبھی نہ تھمنے والا وہ نغمہ ہے جو میری روح کی گہرائیوں سے بلند ہوتا ہے۔ اس شبستان میں کبھی جھانک کر دیکھا ہے؟ ـــــ آؤ منو! میں تمہیں اس میں لے جاؤں ـــــ بیاکا نہ چلی آؤ، اے بادِ صبا کی طرح نازک اور سبک گام محبوبہ! دیکھو منو! یوں دزدیدہ نگاہوں سے مجھے نہ دیکھا کرو میرا دل ڈانواڈول ہوتا ہے اور میں اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتا۔ اچھا جانِ جہاں! یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے بتاؤں کہ تو میرے لئے کیا ہے؟ میں نے اپنے ذہن کو کھنگال کے یہی محسوس کیا ہے کہ تو میری زندگی کا وہ مرکزی نقطہ ہے کہ جس پر جمے رہنے کے بغیر دائرہ مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ دیکھو تم مرکز ہو اور میری حرکت تمہارے ہی وجود سے وابستہ ہے

مجھے تمہاری وجہ سے شاعری ملی، آوارگی ملی، ایک بے نیازی ملی ـــــ یہ ساری چیزیں میری شخصیت کی تکمیل کے لئے ضروری تھیں۔ یہ مجھے تم سے ملیں! منو! مجھے اس بات کی بھی پروا نہیں کہ تمہیں میری محبت کا یقین ہے یا نہیں۔ میں سچا ہوں اور سچا ہوں اور سچائی اعلان کے لئے بہانے تلاش نہیں کرتی۔ میں نے کبھی یہ ضرورت محسوس نہیں کی ہے کہ تم سے سنوں، "میں تم سے محبت کرتی ہوں کیونکہ میرے اندر تمہاری محبت کے بارے میں ایک نہ ٹوٹنے والا یقین ہے ـــــ تمہاری محبت کے بارے میں میں نے ہمیشہ یہی سوچا ہے کہ وہ سورج کی طرح ہے اور اسے اپنے ہونے کے لئے اعلان کی، نقارے اور ڈھول پیٹنے کی ضرورت نہیں! میں نے تمہیں دل کا کبھی نہ بھرنے والا زخم بنایا ہے اور اس زخم کی ابدی کسک اور لازوال درد ہی میری زندگی کا حاصل ہے۔ تم ہی بتاؤ اگر میں تمہیں ایک خوش کن، مسکرانے والی اور محض مسرت بخشنے والی لڑکی سمجھوں تو میرے پیار میں وہ دیوانہ پن، گہرائی اور وہ تیسری سمت کہاں سے آئے گی؟ میں تجھے ـــــ زندہ کرنے والی منو اور مارنے والی منو! ـــــ دونوں صورتوں میں چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ہے نا کہ تو میری صلیب ہے! صلیب انسان کا مقدر ہے۔ تم میرا مقدر ہو اور میں تمہارے ہی ذریعے اپنی تکمیل پاتا ہوں۔ دیکھو میری شاعری کا ایک ایک لفظ تمہاری محبت، نفرت، جسم، روح سے عبارت ہے۔ آج میں تمہیں اپنی شاعری کی ایک بات بتاؤں جب میں کائنات، موت، زندگی، روح اور دنیا کے بارے میں سوچتا ہوں، تو تمہارے ہی اندر سے، تمہارے ہی ذریعے اور تمہارے ہی توسط سے سوچتا ہوں ـــــ اس لحاظ سے تم میری شاعری کا مرکزی کردار ہو۔ دیکھو منو! میں نے تمہارے ہی پیار کو کیسے تاریخ پر پھیلا دیا ہے اور اسے وقت کے اندر سے باہر نکال کے دیکھ لیا ہے ـــــ ہابیل، قابیل، آدم، اولین خون، تم اور میں ـــــ اور پھر یہ ساری چیزیں اور میں اور تم ـــــ اور خدا اور قوتِ حیات اور تم اور میں!! ـــــ منو! یہ ایک زبردست آنکھ مچولی ہے جو فنکار اپنے ساتھ، کائنات کے ساتھ، خدا کے ساتھ، قوتِ حیات کے ساتھ، زندگی اور موت کے کھیلتا ہے۔ جس طرح آنکھ مچولی میں تمام لوگ ایک مقررہ جگہ پر بار بار لوٹ آتے ہیں، اسی طرح فنکار اپنے مرکزی مقام کی طرف لوٹ آتا ہے اور یہ مرکزی مقام میرے لئے تم ہو۔ اگر شاعر کے لئے مرکزی مقام نہ ہو تو وہ بھٹک جاتا ہے اور اور اس کے فن میں نظم، ضبط اور ترتیب نہیں رہتی۔ وہ الجھاوا بن جاتا ہے۔

دن آہستہ آہستہ ڈھل رہا ہے پھٹے ہوئے گریبان والے دن میں ہمارے پیار کا ایک لمحہ بھی پنہاں ہے۔ ہماری مختصر ملاقات! جانے مجھے تم سے ملتے وقت یہ کیوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک سائے کو متحرک دیکھ رہا ہوں۔ ابھی غم کا سورج نکلے گا اور یہ سایہ تحلیل ہو جائے گا اور میں خالی خالی نظروں سے افق کو گھورنے لگوں گا جہاں دکھ کے پہاڑ دھندمیں لپٹے مجھے اپنی طرف بلائیں گے اور میرے دل میں تہی، ناآسودگی اور بے بسی کا زہر بھر جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ تو ایک زندہ حقیقت بن کے میرے سامنے ہوتی ہے لیکن ایک طویل مدت تک یہ زندہ حقیقت میرے لئے ایک چھلاوا رہا ہے اور ابھی تو میرے ذہن کے کسی گوشے میں وہ متحرک سایہ پھر رہا ہے جس کے پیچھے میں بوئے

آوارہ کی صورت گھومتا رہا ہوں۔ دراصل میں نے تمہیں اپنی تنہائی اور فراق کی شدت میں اپنا آئیڈیل بنایا ہے۔ اور پھر تم جانو کہ اگر آئیڈیل ایک دم وقت کی کوکھ سے نکل کے کسی کے سامنے آجائے تو وہ ششدر رہ جاتا ہے۔ اسے اپنی نظر پر شک ہونے لگتا ہے اور وہ آنکھیں ملنے لگتا ہے۔ اسے ساری زندگی ایک شفق زار نظر آنے لگتی ہے ——— مہکتے رنگوں کی ایک بہتی ندی لیکن یہ ندی، یہ مہک اور یہ بہاؤ اتنا مختصر ہوتا ہے۔ شام اپنا سرمئی آنچل سنبھالے اسی ندی میں اداسی اور محرومی کی راکھ گھول دیتی ہے اور رات ان مہکتے ہوئے رنگوں کو ظلمات میں بدل دیتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں اپنے سامنے ایک اٹل حقیقت، ایک ناقابلِ تردید وجود کی صورت میں بیٹھے دیکھنے کے باوجود اپنے حواس پر یقین نہیں کرنا چاہتا۔ آئیڈیل میری جان، انسان کو جستجو کی زنجیر میں باندھ دیتا ہے اور اُسے محرومی جاوداں کے غم کا اسیر بنا تا ہے۔ میری یہی کیفیت رہی ہے۔ تم سے آج سے چھ سال پہلے بچھڑ گئے اور جدائی ——— یک طرفہ جدائی ——— کے یہ چھ سال طلب اور تلاش اور جستجو کی ایسی داستان ہے جس میں دکھ اور آگ اور زخم ہی زخم ہیں۔ یہ زخم بھرتے بھرتے بھی دیر لگے گی اور جب تک یہی کیفیت رہے گی کہ تمہیں دیکھیں گے تو محسوس ہوگا کہ ایک سایہ دیوار پر لپک کے غائب ہو گیا ہے۔

آج تم سے مل کے یوں محسوس ہوا جیسے تمام زخموں کے ٹانکے ادھڑ گئے ہیں۔ دھند میں لپٹی وسعتوں کو دیکھ کے محسوس ہوتا تھا کہ دکھ کا ایسا ہی وسیع اور بیکراں سمندر میرے اندر پوشیدہ ہے جسے میں کہیں بھی نہیں لے جا سکتا۔ یہ دکھ کا سمندر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے سینے میں رہے گا۔ تم نے شاید دیکھا نہیں کہ میری آنکھیں ان وسعتوں کو دیکھ کے جلنے لگیں اور سلگتے ہوئے آنسو امڈ آئے۔ تمہیں میں یہ کیسے بتاؤں کہ وہ لمحہ کتنا المناک اور تکلیف دہ تھا۔ ایسے ہی لمحوں میں میں یہ سوچتا ہوں کہ زندگی کی میت کاندھے پر اٹھائے پھرنے سے یہی بہتر ہے کہ کسی سنگلاخ دیوار سے سر پھوڑ کے اپنا افسانہ اختتام تک پہنچاؤں۔ یہ خوابناک اداسی میں لپٹی ہوئی وسعتیں، یہ سرمئی دھند اور یہ گہرا نیلا آسمان، یہ مضمحل کرنے والی دھوپ میرے دل میں زہر بن کے اترتے ہیں اور تم دھند میں لپٹے ہوئے برف پوش پہاڑوں کی نقرئی چوٹیوں پر اشارے کرتی ہوئی ایک ایسی آرزو نظر آتی ہو جو چھلاوہ بھی ہو اور حقیقت بھی۔ تم نے اس کربناک لمحے میں مجھے دیکھا ہے ——— خاموش اور پتھر کی طرح منجمد، تو نے میرے دل کو نہیں دیکھا جو دکھ کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا زہر کا سمندر تھا۔ میں تو صرف ایک آہ بھر کے کہا "منو! مجھے مر ہی جانا چاہیئے!" اور تو ناراض ہو گئی۔ لیکن خدا کے لئے کبھی میرے اندر جھانکنے کی کوشش کرو۔ میں ان خطوط میں تمہارے سامنے اپنی روح عریاں کرکے لا رہا ہوں۔ اسے دیکھو، اسے سمجھو اور میرے پیار کی قدر متعین کرو!

تمہارا خط (جو مجھے پہلی دفعہ ملا تھا) ابھی ابھی پھر پڑھ لیا ہے۔ مجھے اس میں تمہارا یہ فقرہ ایک عظیم صداقت نظر آیا۔ تم نے لکھا ہے "تمہاری اصلیت کتنی تلخ ہے" تمہارا یہ ایک فقرہ میری پوری زندگی کا ترجمان ہے۔ تم نے یہ فقرہ لکھ کے مجھ پر یہ ثابت کیا ہے کہ تمہاری بصیرت کی آنکھ روشن ہے اور تم سطح کے نیچے بھی دیکھ سکتی ہو۔ چند ملاقاتوں میں تم نے جس خوبی سے مجھے سمجھنے کی کوشش اور کامیاب کوشش کی ہے اس نے تمہارا مرتبہ میری نظر میں اتنا اونچا کیا ہے۔ دراصل یہ تلخی میری زندگی کا احساس ہے اور میری شخصیت کو سمجھنے کے لئے ایک کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے دکھ اور تلخی سے اپنی زندگی اور اپنے احساس اور اپنے جذبے کو اتنا معمور کیا ہے کہ اب حلاوت، مٹھاس اور شیرینی کی کوئی گنجائش نہیں۔ تمہارے خط میں یہ درد موجود ہے لیکن خدا کرے کہ یہ انتہا کی اس حد تک نہ پہنچے جہاں میں کھڑا ہوں۔ لیکن تمہارے خط نے مجھ پر یہ واضح کر دیا ہے کہ جس لڑکی کو میں نے منتخب کیا ہے اور جسے میں نے اپنی صلیب بنائے رکھا ہے، اس میں وہ گہرائی موجود ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ منو! مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اندھیرے زندان میں ایک روزن اُبھر آیا ہے اور یہ تو ہے اور میں باہر کی روشنی کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھنے لگتا ہوں۔ لیکن یہ میری کتنی بدنصیبی ہے کہ کبھی کبھی اس روزن میں سے مسکراتا ہوا چہرہ

—— موت —— اپنی آغوش وا کئے مجھے اپنی طرف بلاتی ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کی زنجیر توڑ کے میں بلا ارادہ ایک دن موت سے ملنے جاؤں گا۔ تم ہی بتاؤ میری جان! جب زندگی ہی موت نظر آنے لگے تو پھر راہ فرار کیسے مل سکتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم نے اپنے خط میں میرے بارے میں غم کی جس تلخ حقیقت کے ادراک کا اظہار کیا ہے وہ شعوری ہے یا غیر شعوری —— اگر وہ شعوری ہے تو تمہاری بصیرت اور نظر کا عمق ناقابل بیان حد تک قابلِ تحسین ہے اور اگر وہ غیر شعوری ہے تو پھر تم میں حقایق کو دیکھنے، پرکھنے اور سمجھنے کی وہ قوت ہے جسے ہم چھٹی حس کہتے ہیں۔ شعوری حیثیت میں تم اسے اس تیسری آنکھ سے موسوم کر سکتی ہو جس کا میں نے اپنے پچھلے خط میں ذکر کیا ہے۔ لیکن تمہارے خط میں فقروں کی ساخت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شعوری سے زیادہ غیر شعوری ہے۔ اے جانِ من! تو نے میرے دکھ کو میری شخصیت کے آئینے میں بے نقاب دیکھ کے جیسے مجھے ساری دنیا کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔ پرسوں جب تمہارا خط ملا تو میں چونک پڑا۔ پڑھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا تمہارے سامنے اپنی روح کو بے نقاب کر کے پیش کرنا سعیِ رایگاں نہیں!

رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ کھانا میرے سامنے پڑا پڑا ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ جی چاہتا ہے گہری نیند سو جاؤں لیکن آنکھوں میں جلتی ریت بھر رہی ہے۔ کل رات اس وقت میں دل میں امید لئے بیٹھا تھا کہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ روشن صبح طلوع ہوگی جس کا سارا نور میں اپنے دل میں بھر لوں گا۔ تجھ سے ملنا ہوتا ہے تو ہر چیز اپنی صورت بدلتی ہے —— لیکن آج رات کے خاتمے پر پھر رات طلوع ہوگی —— کالا تاریک دن جس کے سینے پر سورج کا داغ ہوگا اور میں تنہائی اور محرومی کی آگ میں جلتا رہوں گا۔ اس وقت رات خاموش ہے اور پُراسرار بھیانک کالی آنکھوں سے مجھے گھور رہی ہے۔ گہری اداس خاموشی کو کبھی کبھی ابھرنے والی ریل کی کوک چیر کے میرے دل میں اتر جاتی ہے۔ وقت جیسے دم سادھے بیٹھ گیا ہے اور زندگی ایک عذاب ہے —— اور تو اس وقت کہاں ہے؟ مجھے دکھ کے اس تاریک سمندر میں چھوڑ کے تو کہاں ہے منّوجی! آج دل میں "زخم بے نشان" والی نظم کی سی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ پھر دل چاہتا ہے کہ ابھی باہر جا کر اداس راہوں میں تجھے ڈھونڈنے چلوں کہیں کسی راستے میں کسی موڑ پر تو کھڑی میری منتظر ہوگی اور تمہیں اپنا خون شدہ دل دکھا دوں۔ یہ لمحہ میرے لئے کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ تمہاری تلاش ایوب پارک جا رہا ہوں۔ بارش ہو رہی ہے اور تمہیں ہوٹل کی بالائی منزل پر ایک سمٹے ہوئے سہانے خواب کی صورت میں دیکھ رہا ہوں وہ دن ابر آلود ہونے کے باوجود کتنا سہانا لگتا ہے۔ جیسے بہار کا رُخ کو بیدار کرنے والا سورج چمک رہا ہو۔

زندگی کی یہ خوشی کا مختصر لمحہ —— اتنا مختصر کیوں تھا؟ سلور گریل کی شام کتنی سہانی تھی لیکن اب وہ شام بھی ایک دن کبھی نہ مندمل ہونے والے زخم میں بدل جائے گی اور میں دردِ لا دوا اور زخم بے مرہم کا اسیر پھر تمہیں اداس راتوں کو سونی راہوں میں ڈھونڈنے چلوں گا وہ شام یاد آ رہی ہے۔ اس وقت جب تم نے چڑھتے چاند کی طرح میرے دل کی تاریکی دور کی تھی —— تمہارے ساتھ جو لمحے گذارے ہیں میرے لئے زندگی اتنی ہی ہے۔ باقی حصہ تو زندگی کا الزام ہے۔ باقی حصہ تو بس وقت ہے جس سے میری زندگی کا کوئی تار ملا ہوا نہیں ہے۔ تم خالی وقت اور جاندار وقت کا فرق سمجھتی ہو نا؟ وہ لمحہ جب زندگی میں ایک نیا پن، ایک تازگی، رعنائی اور رُلانے والا حسن نظر آئے، جب کوئی بات کاٹتی ہوئی تلوار کی مانند دل میں اُتر جائے، جب کوئی بات دھنک کی طرح دل کے آسمان پر رنگوں کی پھوار بکھیر دے —— وہ جاندار لمحہ وقت ہوتا ہے۔ باقی تو بس ایک بے نام سلسلہ ہے ساعتوں کا! منّو! تم یہ باتیں کب سمجھو گی، کیسے سمجھو گی!

منّو! میں جہنم کے اس دہانے پر کھڑا ہوں، اور سمجھتا ہوں، خواہش مرگ دکھوں سے نجات پانے کا واحد ذریعہ ہے لیکن میرے جہنم

اور موت اور میرے درمیان تم ہی ایک دیوار ہو۔ دیکھو منو! وہ جو میں کہتا ہوں ناکہ تمہیں معلوم نہیں تم میرے لئے کیا ہو، سو اب اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرو کیونکہ اسی صورت میں تم میرے اور اپنے رشتے اور پیار کی نوعیت صحیح طور پر سمجھ سکو گی۔ منو! میری آئیڈیل کی یا اندرونی جنت کی بنیاد تم پر ہے۔ اس لحاظ سے تو میرا آئیڈیل ہے۔ میں نے چھ سال تمہیں باہر کی دنیا میں ڈھونڈا، تمہاری طلب میں آوارہ پھرا لیکن تو نہیں ملی۔ بھلا آئیڈیل بھی کسی کو ملتا ہے۔ تمہاری طلب نے آہستہ آہستہ ایک ایسے دکھ کی صورت اختیار کی جو میرے لئے عذاب کا جہنم بن گیا اور یہ عذاب میرا مقدر بن گیا۔ میں اس جہنم میں جلتا رہا۔ اور بالآخر مجھے اس جہنم سے بھاگنے کا ایک دروازہ نظر آیا یعنی موت! یوں تمہاری وجہ سے میرے اندر خواہشِ مرگ نے جنم لیا۔ اور نجات کی واحد صورت کی حیثیت سے ہر لمحے اور ہر قدم پر موت مجھے اپنی طرف بلاتی رہی ___ لیکن منو! میرے ساتھ زندگی نے عجیب احسان کیا ___ یعنی جب خواہشِ مرگ اپنی تکمیل کی منزل طے کرنے کے لئے آمادہ ہونے لگی تو مجھے اپنا آئیڈیل مل گیا یعنی ایک دن میرے خوابوں کی جنت میرے ذہن سے نکل کر میرے سامنے آ گئی مجھے منو مل گئی، تو مجھے مل گئی۔ میں نے تمہیں اپنے آئیڈیل کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کیا۔ بالآخر تو وہی نکلی جو میرے ذہن میں تھی اور جس کی جدائی میرے لئے عذاب کے اس جہنم کا باعث تھی جو خواہشِ مرگ کو جنم دیتی تھی۔

میں کتنی دیر کی کشمکش کے بعد اپنے اندر سے باہر نکلا ہوں۔ اس کا اندازہ تم میرے خطوط سے کر سکتی ہو۔ ابتدائی خطوط میں تم اور میرے اندر پوشیدہ دو الگ الگ شخصیتیں ہیں لیکن آہستہ آہستہ یہ دو شخصیتیں ایک دوسرے میں مدغم ہو کے تمہاری صورت اختیار کر گئی ہیں۔ اب تو میرے سامنے ایک زندہ آئیڈیل ہے جو میرے اور خواہشِ مرگ کے درمیان ایک دیوار بن کے حائل ہے۔ تم اس سے اندازہ لگا لو کہ میری جان! تمہاری حیثیت کیا ہے میرے لئے اور تم میرے لئے کتنی اہم اور عظیم ہو۔ بہت بہت پیار کے ساتھ تم سے اجازت چاہتا ہے۔

تمہارا قاسمی!

منو! تم نے میرے دو روپ دیکھے ہیں۔ محسوس کئے ہیں، اس کی مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے سمجھ لیا ہے۔ ایک دفعہ میں نے لکھا تھا "تم ایک سمندر کی طرح ہو۔ سطح پر خاموش لیکن زیرِ سطح ہزاروں طوفان ہیں" ___ اس فقرے سے تمہیں خوشی ہوئی، نہیں اطمینان ہوا تھا کہ قاسمی مجھے جانتا ہے۔ تمہارے آج کے خط سے مجھے یہ خوشی ہوئی ہے کہ تم بھی مجھے جانتی ہو لیکن اس کے باوجود تمہارا یہ سوال اپنی جگہ پر قائم ہے کہ سچا کونسا قاسمی ہے؟ میرا خیال ہے اس کا تم نے خود ہی جواب بھی دیا ہے لیکن میں اس کی وضاحت کروں گا۔ تم نے لکھا ہے کہ شاعر اپنے اندر دکھ جمع کرتا ہے اور لکھتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے لیکن تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ شاعر آئیڈیل سے نفرت اور محبت ایک ساتھ کرتا ہے۔ یہ بات تمہیں عجیب لگتی ہے۔ آؤ تمہیں سمجھاؤں۔ شاعر آئیڈیل سے محبت اس لئے کرتا ہے کہ وہ اس کا خواب ہوتا ہے لیکن اس خواب کے پیچھے اُسے جلنا پڑتا ہے، اُسے مرنا پڑتا ہے اس لئے وہ اس خواب کو اپنا دشمن بھی سمجھتا ہے جو اُسے جلاتا رہتا ہے۔ اس جلن سے اُسے شاعری ملتی ہے جو اس کی زندگی کی پونجی ہوتی ہے اس لئے وہ اس جلنے کو ضروری سمجھتا ہے۔ وہ آئیڈیل کی محبت اور نفرت دونوں قائم رکھتا ہے۔ اس طرح سے شاعر، محبت اور نفرت میں رسہ کشی، ایک کشمکش رہتی ہے۔ یہی کشمکش اس کا فن ہے۔

یہ بات تم ایک اور طرح بھی سمجھ سکتی ہو۔ ہم سب موت سے نفرت کرتے ہیں۔ زندگی سے پیار کرتے ہیں۔ نفرت اور محبت کی یہ جنگ ہماری زندگی بن جاتی ہے۔ آخر زندگی کیا ہے؟ موت سے محبت اور نفرت کی جنگ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم سب زندگی سے محبت کرتے ہیں لیکن کیا ہم موت سے نفرت کرتے ہیں؟ نہیں ___ کیونکہ اندرونی طور پر ہم زندہ رہتے ہوئے، زندگی سے محبت کرتے ہوئے بھی موت کی طرف بڑھتے رہتے ہیں۔ اور یہ ہمیں اُس دن پتہ چلتا ہے جب ہم مر جاتے ہیں۔ اسی طرح فنکار کی زندگی ہے۔

دو آئیڈیل سے محبت اور نفرت ساتھ ساتھ کرتا ہے لیکن وہ بہرطور آئیڈیل سے وابستہ رہتا ہے. یہ محبت اور نفرت مختلف ہوتی ہے عام محبت اور نفرت سے ــــ یہ بھی میں بتاؤں گا.

فنکار کا آئیڈیل کے ساتھ نفرت کا یہ سلسلہ نفرت نہیں ہوتی بلکہ کشمکش ہوتی ہے اور یہ کشمکش آئیڈیل سے وابستگی کا زندہ ثبوت ہوتا ہے. تمہیں معلوم ہے کہ میری تمام نظمیں تمہارے اردگرد گھومتی ہیں لیکن جب میں نظم لکھتا ہوں، کیا میں اس وقت تمہاری صورت اپنے سامنے لاتا ہوں. مجھے اس وقت کچھ بھی نہیں پتہ ہوتا تم ہو بھی یا نہیں ــــ میں آئیڈیل کے ایک زبردست دُکھ، نفرت اور محبت کے شدید دھارے اور سیلاب میں گرفتار ہوتا ہوں. اور اس سیلاب میں ڈوبنے اور ڈوبنے سے بچنے کی جدوجہد میں جو میرے دل پر گزرتی ہے وہ شاعری ہوتی ہے. آج میں مین گیٹ پر کھڑا تھا بس کے انتظار میں. ہوا تیز چل رہی تھی. ایک درخت جھوم رہا تھا میں نے نظر اٹھا کے دیکھا تو مجھے محسوس ہوا، تم ہو اور تمہارے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں. ایک دم میرے ذہن میں وہ تصویر اُبھری جس میں تمہارے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں ایک دم مجھے محسوس ہوا کہ ہوا کی طرح تم میرا پیچھا کر رہی ہو اور اب تم درخت بن کے ایستادہ ہو ــــ اور کہیں سے تمہارے جسم کی خوشبو کا سیلاب آیا ہے. میں گھبرا گیا ــــ یہ گھبراہٹ شاعری ہے. اب مجھے معلوم ہے یہ میرے لاشعور میں سب باتیں جذب ہو جائیں گی اور کسی دن نظم بن کے نکلیں گی. میرے ذہن میں کچھ یوں بنی ہے نظم۔

تم کہاں ہو؟
اس سمے تم کون سے صحرا کی جلتی ریت پر
اپنے زخموں کی دُکھن سے چور ہو!
آؤ، مجھ کو دیکھ لو،
میں تو خوشبو کے سمندر میں
ہزاروں آئینے لے کر کھڑا ہوں
اور یہ پھیلا سمندر
وقت کے ساحل کی ہر زنجیر سے آزاد ہے!

اب بتاؤ اس میں تم کہاں ہو؟ میں کہاں ہوں؟ ــــ اس میں وہ شمی کہاں ہے. جو بس کے لئے کھڑا تھا؟ لوگوں کے لئے میں بس کیلئے کھڑا تھا نا، لیکن میں کہاں تھا؟ میں تو وقت کی زنجیریں توڑ کے خوشبو کے سمندر میں گم تھا اور ازل سے ابد تک ــــ نہیں اس سے بھی پرے تھا. لیکن میں وہ شمی نہ تھا. وہ تو شاعر تھا جس نے محسوس کیا اور ایک دم وقت کی زنجیر توڑ کر بھاگ نکلا ــــ یہی شمی سچا ہے لیکن وہ شمی کس کے سہارے وقت کی زنجیر توڑ کے بھاگ نکلتا ہے. وہ آئیڈیل ہے جس کا ایک روپ پھول ہے اور ایک روپ زخم ہے. وہ تم سے ملتی جلتی ہے. مجھے ایک دم وہ تم میں نظر آتی ہے. منو! یہ ایک لمبی کہانی ہے. میں تمہیں کیسے سمجھاؤں. یہ بڑا کھیل ہے اور یہ روح کے بڑے ہی پوشیدہ کونوں میں کھیلا جاتا ہے. کبھی خود انسان اس سے بے خبر رہتا ہے. بس اندر ہی اندر یہ کھیل ہوتا رہتا ہے۔

منو جی!

کچھ عرصے بعد تمہاری تنہائی ختم ہو جائے گی اور خدا تمہیں ایک چاند سا بچہ دے گا اس میں تمہیں اپنا آپ نظر آئے گا اور میں بھی نظر آؤں گا اور تم ساری خوشیوں کو سمیٹ لو گی. آج تم اپنی زندگی کے سفر پر غور تو کرو، منو! ــــ یعنی کہ ایک بچی ــــ یہ بچی بیس سال کا طویل سفر کاٹ کے خود اس منزل پر آ گئی ہے جہاں خود اس کی گود میں ایک بچہ ہوگا. منو مجھے عجیب سا لگ رہا ہے کیونکہ میں تمہیں آج بھی ماں جی کے ہاں دیکھ رہا ہوں. تم دروازے کے پیچھے چھپی بیٹھی ہو. سب لڑکیاں مجھے چھیڑ رہی ہیں. لیکن تم دروازے کے پیچھے بیٹھی ہو. سب لڑکیاں مٹھائیاں لے کر خوش ہیں. تم اداس ہو کہ تمہیں مٹھائی نہیں ملی لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ میں نے تمہارے لئے اپنا پیار رکھ لیا ہے. لڑکیاں مٹھائی چاہتی ہیں. تمہیں مٹھائی کا غم نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ تمہارے لئے میں نے جو اپنے سینے میں جذبہ چھپا رکھا ہے وہ کسی اور کے لئے

نہیں: تم تو پگلی ہو نا، یونہی ناراض ہو رہی ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں تمہارے لئے کٹھن سنکٹ کاٹنے کے لئے بھی تیار ہوں۔

منو بے ــــ تم اب میرے پاس ہو۔ تم باہر اپنے اور میرے لیئے کھانا پکا رہی ہو۔ آج سے ایک سال بعد بھی تم اسی طرح میرے لئے کھانا پکا رہی ہو گی۔ لیکن میرے پاس، میری گود میں تمہارے پیار کا پھل ہو گا اور میں اُسے بہلا رہا ہوں گا۔ پھر تم کھانا پکا کے آؤ گی اور میں تمہاری امانت تمہیں سونپ دوں گا۔ پھر ہم کھانا کھانے بیٹھ جایا کریں گے۔ منو! ایک بات بتاؤں ــــ آج کل تم میرے اور اپنے مستقبل کو اپنے اندر چھپائے ہوئے پھر رہی ہو۔ ایک پوری زندگی، ایک پوری کائنات۔ ایک پوری دنیا تمہارے اندر چھپی ہوئی ہے آج کل تم مجھے قطعاً منیرہ یا منو نظر نہیں آتی ہو، آج کل تم مجھے کچھ اور ہی نظر آتی ہو۔ دو دن سے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم جانے کیسے اس زمین سے ایک دم اوپر اٹھ گئی ہو اور میں تمہاری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ ۲۲ راکتوبر سے تمہارے خیالوں کی تنہائیاں مستقل طور پر بھر گئی ہیں کیونکہ جب تمہارے پاس کوئی بھی نہیں ہو گا تو تم اپنے بچے سے باتیں کرتی رہو گی ــــ اس آنے والے لمحے سے جو پھیل کر ایک زندگی بن جائے گا۔ آج کل تم نہ جانے اندر سے کیا سوچتی ہو گی۔

منو! زندگی میں میری پہلی جیت تمہارے پیار میں ہوئی۔ اس جیت کی انتہا ہو گی جب تم چاند سا بچہ میرے حوالے کرو گی۔ تم سے وعدہ ہے میں ہسپتال میں سب کے سامنے تمہارے پیر چھو لوں گا۔ اس لئے کہ ماں بن جانے کے بعد عورت کا مقام خدا کی طرح عظیم اور بلند بن جاتا ہے۔

تم نے کھانا پکا لیا ہے۔ اب تم نسیم کے ہاں جاؤ گی۔ میں یہاں بیٹھے تمہارے بارے میں سوچتا رہوں گا اور ایک دم اداس ہو جاؤں گا۔ ابھی سے اداس ہونے لگا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ میری جان نکل رہی ہے۔ آؤ منو! پھر سے اپنے اندر ایک الاؤ بھڑکائیں۔ اور جلیں ــــ تم صحن میں پھر رہی ہو میں تمہارے قدموں کی آواز سنتا ہوں اور پھر خط چھپا لیتا ہوں حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ تم جانتی ہو کہ میں ڈرامہ نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ پھر بھی تم سے خط چھپا رہا ہوں۔ پاگل ہوں نا میں اب تمہیں خط دینے والا ہوں۔ میں ہمیشہ تم سے پیار کروں گا اور اور اس کے بدلے میں تم سے یہ بھی نہیں مانگوں گا کہ تم مجھ سے پیار کرو کیونکہ تم اب ماں ہو، اور ماں سے محبت کی طلب نہیں کرتے، ماں، سراپا محبت ہوتی ہے۔

تمہارا شمی

جمیل ملک کے نام

مظفر آباد ــــ ۲۹ مارچ ۱۹۵۷ء

پیارے جمیل ملک (ایم اے)

دفتر میں بیٹھا ہوں اور تمہیں خط لکھ رہا ہوں ــــ تمہیں خط نہ لکھوں تو اور کسے لکھوں؟! جب سوچتا ہوں کہ اب عید سے پہلے تمہاری دید ناممکن ہے تو خیال آتا ہے کہ تم عید کے چاند ہو لیکن میری جان! جانے تم کس کے افق پر تمناؤں کا حسین ماہتاب بن کے چمکتے ہو۔ کبھی کبھار ایک آدھ کرن ہمارے نہاں خانۂ تصور کو بھی روشن کر جاتی ہے لیکن ایک آدھ کرن سے کیا ہوتا ہے! جانے وہ کیا لوگ ہوں گے جن کے آئینۂ دل میں تمہارا چاند سا چہرہ چمکتا ہو گا پیارے ہم نے بھی تمہیں جاناں سمجھ کے تمہاری صورت تصویر جاناں کی طرح دل کی دیوار پر سجا دی ہے لیکن تم ــــ خیر رہنے دو!

موسم ابر آلود ہے اور دل ایک بے نام سی اداسی کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہے۔ بے ہنگم اور ننگے پہاڑوں سے گھری ہوئی اس

مختصر سی جگہ ہمیشہ آپ یاد آتے ہیں۔ وہ ہنگامے یاد آتے ہیں جن سے ہماری زندگی مشترکہ طور پر متاثر بھی رہی ہے اور عبارت بھی: تمہیں حالات نے ناموزوں جگہ پر قید کیا ہے اور مجھے دور پہاڑوں کے دامن میں! کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے یہ جگہ ایک بہت بڑا بدنما پیالہ ہے جس کی تہہ میں بیٹھا میں کبھی چاند کو اور کبھی محض چاندنی کو دیکھ کے جی رہا ہوں — کتنا بڑا المیہ ہے یہ جمیل! — جمیل تم مجھے جانتے ہو۔ اندازہ لگاؤ کہ زندگی کی بماہمی، دوستوں کے پیار اور تمہارے نہایت سودمند مشوروں سے جب مجھے ایک دم علیحدہ کیا جائے تو میری کیا حالت ہوگی! — یہ خط میں نے اپنی طرف سے نہایت ہی LIGHT MOOD میں شروع کیا تھا لیکن آہستہ آہستہ جب اپنے واضح سماجی پس منظر میں تم یاد آئے — تمہارے دکھ، تمہاری مجبوریاں، تمہاری محرومیاں اور پھر اپنی کس مپرسی، گھر سے دوری، بہن بھائی اور ماں کی بے پناہ شفقت سے محرومی کا خیال آیا تو وہ LIGHT MOOD اداسی میں بدل گیا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ تمام تر علم کے باوجود ہم کیا ہیں؟ ہماری حیثیت اُن تنکوں سے کسی طرح مختلف نہیں جو کف اُڑاتے ہوئے دریا میں قہر آلود موجوں کے رحم و کرم ہوتے ہیں! — ہمیں دریا کے بہاؤ کا علم ہے، لیکن کیا ہم دریا کے بہاؤ کو روک سکتے ہیں؟ جمیل! میں قنوطی نہیں، یہ جبر و اختیار؟ بے معنی فلسفہ بھی نہیں، لیکن یہ ایک زندہ حقیقت ہے! تم نے کیا نہیں کیا — کون سی اچھائی نہیں کی، کس کس کا بھلا نہیں کیا لیکن ان تمام چیزوں کا کیا یہی صلہ ہے؟ خیر چھوڑو ان باتوں کو، ان تیز ناخنوں سے اپنے زخم کیوں چھیلنا شروع کریں۔

ہاں — تو پنڈی کا کیا حال ہے — ؟ کلیم کا معاملہ سلجھ گیا ہے؟ والدہ کا کیا حال ہے، انھیں میری طرف سے بہت پوچھنا کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اُن کے لئے یا جمیل ہوں یا بتول، ان کی بے پناہ شفقت کا ہمیشہ احساس رہتا ہے، قیوم صاحب کو میرا اسلام کہنا اور کلثوم کو بہت بہت پیار

تم خود کس حال میں ہو — نہیں تمہارا حال کیا پوچھوں، اپنے حالات کے آئینے میں تمہاری صورت دیکھتا ہوں خط ضرور لکھنا اور ہاں ظفر صاحب کو میرا اسلام کہنا،

تمہارا اپنا
احمد شمیم

میرپور — ۹ راگست ۱۹۵۷ء

عمر گریز پا سے پیارے جمیل!

آج ہی تمہارا خط ملا ہے، اور اب جواب لکھ رہا ہوں، اگر غالب نے یہ شعر نہ کہا ہوتا تو شاید آج میں ضرور کہتا:

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

جمیل! یہ تعلّی نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جس طرح میں، تم سے پیار کرتا ہوں شاید ہی اس طرح تم سے کوئی پیار کر سکے۔ اس "میں" سے مراد وہ "میں" ہے جو میرے دل کی گہرائیوں میں چھپا رہتا ہے جسے میں صرف اُس وقت جانتا ہوں یا پہچانتا ہوں جب تنہائی کے نہایت تلخ، کربناک اور زہر آلود لمحوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں تو اس حد تک اپنے آپ کو تم سمجھتا ہوں کہ جب تمہاری چیز، تمہارا نام چھپا ہوا دیکھتا ہوں تو وہی مسرت اور تسکین حاصل کرتا ہوں جو مجھے اپنا نام دیکھ کے ہوتی ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہ زمانہ حد سے زیادہ ستم کوش اور — زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسدؔ' والا معاملہ ہے ورنہ ہمارے دل میں بھی کیا کیا نہ کریں گے؟ والی خلش ہے۔ بہرطور، ہو رہے گا کچھ نہ کچھ —!

M.Ed. کرنے کا خیال نہایت عمدہ اور ایک دم فسٹ کلاس ہے۔ لاہور میں تم رہو گے تو ویسے بھی ادبی طور پر بہت ہی آگے

بڑھنے کا موقع ملے گا۔ اس زندگی میں ہمیں بہر طور STRUGGLE FOR EXISTENCE اور فراموش کردہ NATURAL SELECTION کے اصول کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، آخر ڈارون جاہل مطلق تو نہیں تھا۔ اتنی نوے سال کی بے اندازہ ریاضت کو محض ذہنی خرافات پیدا نہیں کر سکتی۔ پیارے آگے بڑھنے کے لئے (ادبی طور پر) ہر دور میں لٹھ لے کے اپنی شخصیت کو منوانا پڑتا ہے۔ تم چونکہ ادب کو خلوص اور ایمانداری اور SERIOUSNESS کے ساتھ اپنا چکے ہو اس لئے اس تجویۂ جاں سوز کے غمزے بھی سہہ لو ——! میں تو منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے چیزیں رگیدتا ہوں، کھانے کا انتظام ہو ہی جاتا ہے۔ تم لاہور تو جاؤ!

پٹکوریل کا معاملہ تم نے غلط سمجھا ہے۔ وہ میری زندگی سے متعلق کہانی ہے جب میں تحریک آزاد کشمیر کے سلسلے میں کام کرتا تھا چنانچہ LAZY-BONES — (ایک کردار ہے) میں اور مجھ میں کچھ نہ کچھ ضرور مشترک پاؤ گے! تمہارے متعلق میں بڑی خوبصورت انگریزی کہانی لکھ رہا ہوں جس کا عنوان ہے "SONG OF THE SOUL" یہ کہانی تلخ بھی ہے، ترش بھی ہے اور شیریں بھی۔ پیارے جس طرح میں تمہیں دیکھتا ہوں —— بس وہی ہو تم میری نظر میں!!

منگلا کا تو میں نے پچھلی چٹھی میں لکھ دیا تھا۔ عزیز حسن صاحب نے کسی کے کہے میں آ کر اس POST کے لئے دوسرے کسی شخص کی سفارش کی اور اس طرح سے تین سو کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا!

سنو، یہ VALUE & DEMAND والا کیا قصہ ہے؟ جانِ من! میرا اگر اس سلسلے میں کوئی خلوص سے چاہنے والا ہوتا تو وہ کرب، وہ تضاد، وہ یاس جو ویسے تمہیں نظر آتی ہے، کہاں ہوتی؟ ہائے کیوں ہوتی؟! پیارے تم نے خود ہی تو اس تلخ حقیقت کو شعر میں ڈھال دیا ہے:

جو ملا صورتِ زیبا کا خریدار ملا

صورتِ زیبا کی صورت تو مختلف ہوتی رہتی ہے ورنہ نوعیت اور اصلیت کے اعتبار سے وہی بات ہے۔ زندگی کو، خلوص کو، ہمدردی کو ہر زمانے میں سرمائے کے پیمانے سے ناپا گیا ہے —— پھر پیار کیوں نہ اس پیمانے سے ناپا جائے؟ —— تمہارے پاس ہے کوئی جواب؟ جواب دینے سے پیشتر اس حقیقت کو رد کرنے سے پہلے اپنے آپ کو دیکھو، —— تم کیا نہیں ہو، ہاں چونکہ تم مل کے مالک، کار والے صاحبِ دولت نہیں اس لئے فی الحال کچھ بھی نہیں ہو —— بعد میں دنیا تمہیں ہومر، ورجل ہی کیوں نہ سمجھے لیکن وہ تو اس وقت ہوگا جب تمہاری قبر پہ چراغ جلے گا۔ لیکن میری جان: در حیاتِ ما غریباں نے چراغے نے گلے!

—— گولی مارو اس قصے کو!

ہاں تو تمہارا CHAMBER ٹس ہو رہا ہے یا ٹھپ ہو رہا ہے۔ میری جان "پائے گدا لنگ نیست"! اور اب تو تم M.A بھی ہو، ایک دفعہ ریڈیو اسٹیشن بھی میرے لئے ٹھپ ہوا تھا، زندگی میری جان! یوں ایک دم ہی غچہ نہیں دے جاتی۔ ہم اس سے پیار کرتے ہیں، اور وہ بھی یہ سمجھ لیتی ہے۔ ہائے یہ عشوہ گرجانہ!

میں نے ایک نظم (ادب لطیف) کو بھیجی ہے۔ چھپ جائے گی تو تم بھی دیکھ لو گے لیکن اس سے پہلے ہی میں تمہیں وہ آئندہ خط میں لکھ کے بھیج دوں گا۔ آج کل کچھ نہ کچھ لکھنے کو جی چاہ رہا ہے —— اور لکھنے کی کوشش کرتا ہوں! تم کیا کیا کر رہے ہو؟ شفقت تنویر مرزا ملے تو میرا اسلام کہنا اور احمد ظفر کو بھی۔ ڈگی کا کیا حال ہے۔ تمہاری شامیں کیسی گزر رہی ہیں، اپنا حال نہ پوچھو،

چاند ڈوبا غمِ تنہائی کی آتش بھڑکی　　چاند ابھرا تو سلگنے لگا دل کا دامن!

والدہ کا کیا حال ہے؟ —— انہیں میری طرف سے بہت بہت پوچھنا۔ وہ اکثر یاد آتی ہیں۔ قیوم صاحب سے بھی میرا اسلام کہنا، جیمو کو پیار!

تمہارا اپنا
احمد شمیم

میرپور (آزاد کشمیر)
۷ بجے شام ــ ۱۳/اپریل ۱۹۵۸ء

جمیل میری جان!

بہت اداس شام ہے۔ دل پر ایک بے نام بوجھ محسوس ہو رہا ہے جو لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا ہے۔ اگر تمہیں خط نہ لکھوں تو ساری رات بے قرار رہوں گا۔ خدا جانے غم ایک سیال مادے کی طرح ریشے ریشے میں کیوں دوڑ رہا ہے۔ رونے کو جی کرتا ہے ــــ جمیل! بہت رونے کو جی کرتا ہے۔ اب تمہیں پاس بٹھایا ہے تو تم سے باتیں کرنے لگا ہوں۔ تمہارے بغیر اپنی زخم زخم زندگی کی کہانی سنا ہی کیسے سکتا ہوں ــــ اب سارے افق پر تم ہی ایک تنہا ستارے کی طرح ہو ــــ باقی اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اور اگر تمہیں بھی اندھیرا نگل جائے پھر میری زندگی میں کیا رہے گا؟! یوں بھی میری زندگی ہے دکھوں، حسرتوں، مایوسیوں اور ناکامیوں کے سوا کیا ہے!

ابھی ابھی پنڈی سے لوٹا ہوں ــــ سوچتا ہوں کل دفتر میں مجھے شاید تمہارا کوئی خط مل جائے لیکن کل تک کون انتظار کرے جمیل! میری زندگی میں جب بھی کوئی گھاؤ پیدا ہوتا ہے، کوئی خلا پیدا ہوتا ہے میں ہمیشہ اُسے تمہاری یاد سے بھرتا ہوں ــــ یہ خود غرضی ہے لیکن کیا کیا کیجئے ــــ تم ہی بتاؤ۔ یا تو تم بھی مجھے اُن بے شمار دوستوں کی طرح چھوڑ جاؤ جو کل تک میرے ساتھ تھے اور اب کہیں بھی نہیں۔ اُن کے نظریات، عقیدے، فلسفہ ــــ جمیل! یہ کتنا ناقابلِ یقین المیہ ہے کہ انسان ہزار خوشنما پردوں میں محض اپنی غلاظت اور کمینگی کو چھپانے کے لئے بہروپ بھرتا ہے! ــــ پر میری جان! تم یہ باتیں مجھ سے زیادہ جانتے ہو! (اور میری طرح تمہارے لئے بھی یہی المیہ ہے۔)

ہاں ــــ ابھی ابھی پنڈی سے لوٹا ہوں۔ وہ چند مسکراہٹیں، چند غمزے، چند اشارے جو وہاں سے اپنی محفل سجانے کے لئے اُٹھا لایا تھا اب اس تنہائی میں ناسور سے بن گئے ہیں۔ میں تو ان سے اپنی تنہائی میں رنگ بھرنا چاہتا تھا لیکن جمیل محض اشارے محض کنائے تو بھالے لگتے ہیں جو چھید ڈالتے ہیں!

پنڈی سے چند لمحے دامن میں بچا کے لایا تھا لیکن وہ لمحے اب کرچیاں بن کر ذہن کو کرید رہے ہیں اور سوچتا ہوں کہ جب بھی اور جسے بھی خلوص اور شدید خلوص سے چاہا وہ اپنے لئے زخم بن گیا ــــ جمیل تم خدا کے واسطے کبھی یہ صورت اختیار نہ کرنا کیونکہ اب تم ہی ہو جس کے ساتھ مل کر آنسو بہا سکتا ہوں۔

تمہارا خط ملنے سے پہلے ہی میں والدہ سے مل چکا تھا۔ خط ملنے کے بعد دوسری بار ملا، اور پھر جب تک پنڈی میں رہا روز ہی ملتا رہا۔ جمیل والدہ نے مجھے اس طرح سے پیار کیا ہے جیسے میں جمیل تھا۔ دراصل مجھ میں اُسے اب تمہارا ہی عکس نظر آتا ہے۔ مجھے اس نے اپنی پُرخلوص دعاؤں کی دولت عطا کی۔ مجھے جمیل والدہ سے مل کے یوں محسوس ہوا ہے جیسے سوکھی پیاسی زمین پر چھاجھم بادل برسے ہوں۔ تمہاری بیٹھک میں تمہاری ہر چیز کو محسوس کیا ہے اور اُس آئینے میں بھی اپنا چہرہ دیکھا جس میں ہر آدمی کا چہرہ غیریت کی حد تک بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ تم بے اختیار یاد آئے۔ بہت یاد آئے تم جمیل! اور پھر جب گھر آیا تو تمہارے سارے لکھے ہوئے خطوط پڑھ لئے۔ تمہاری زندگی میں اپنی ہی اُمنگوں، حسرتوں اور تمناؤں کا عکس پایا! جی! تمہیں بہت یاد کیا ہے۔ یہ آٹھ سات دن اور جب یہ خیال آتا تھا کہ زمانہ نہ معلوم ہمارے درمیان کتنی بڑی خلیج بن کے حائل رہے، تو ہول آتا تھا لیکن کوئی بات نہیں پیارے، ہم ایک ہیں، اور یہ مجھے اس وقت بھی محسوس ہوا جب تمہارے گھر کا ہر فرد مجھ سے ملنے کے لئے اتنا ہی بے چین نظر آتا تھا جتنے تم ہو۔ قیوم صاحب سے بھی اسی لئے میں دو بار ملا ہوں۔

اچھا پیارے میں نے پرچے (جیسا کہ تمہیں یقین تھا) اچھے کئے ہیں۔ تردد کی ضرورت نہیں، پاس ہو جاؤں گا۔ جمیل آٹھ دن پڑھائی کی ہے پاس ہونا بھی غنیمت ہے۔ البتہ اب تمہیں مجھے ایم اے کرانا ہے۔ اس سلسلے میں ابھی سے مجھے کچھ کیا کرنا ہے۔ تم یوں محسوس کرو کہ احمد شمیم نہیں بلکہ تم خود دوبارہ ایم اے میں داخل ہو رہے ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کب آؤ گے؟ تمہارا یہاں آنا اتنا ضروری ہے کہ ــــ

مقبول کا رول نمبر ملا ہے۔ بھئی بہت بہت شکریہ۔ اس کی امی تمہیں متواتر اور مسلسل دعائیں دیتی ہیں —— اور اب بار بار تمہیں یاد کرتی ہیں اور دعائیں دیتی ہیں۔ ہم ناداروں کے پاس اور ہے ہی کیا، لیکن جمیل یہ بھی بہت ہے۔ کیوں ہے نا! میری جان مجھے فوراً لکھو یہاں کب آؤ گے؟ —— کسی اور پروگرام کو بیچ میں حائل نہ ہونے دینا، سمجھے،

فقط تمہارا اپنا
احمد شمیم

میرپور (آزاد کشمیر)
۴ر اپریل ۱۹۵۸ء

جان سے پیارے جمیل!

تنہا بھی ہوں، اداس بھی ہوں تمہیں خط لکھ رہا ہوں تو اپنی تنہائی کا اور بھی احساس ہوتا ہے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اپنی ہی آگ میں کب تک یونہی جلنا ہے۔ زندگی گیلی لکڑی کی آگ کیوں بن گئی ہے! کاش ہم لوگ ایک ہی بار بھڑک کے بھسم ہو جاتے۔ قدم قدم پر ناکامیاں —— آخر یہ سب کچھ ہمیں ہی کیوں دیکھنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات اردگرد زندگی اس شدت سے مہک اٹھتی ہے کہ خواہ مخواہ رو دینے کو جی کرتا ہے اور پھر یہ احساس کہ ہم اپنے ہی دکھوں کے جزیرے میں ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے اسیر ہیں —— بھائی تم ہی کچھ کہو، آخر ہم کہاں تک اس زندگی سے اس طور نباہ کریں۔

جمیل دل میں کیا کیا ارمان تھے، اور پھر کسی زمانے میں اپنی امیدوں کے محل اس دھرتی پر تعمیر کرنے کا "دم خم" بھی تھا لیکن اب تو معلوم ہوتا ہے یہ سب ایک فریب تھا۔ وہ تو پردے حائل تھے اور اب جو یہ پردے ہٹ گئے ہیں تو سامنے اپنی بے بسی اپنا منہ چڑاتی نظر آ رہی ہے، شام کو یہ بڑا چاند طلوع ہوتا ہے تو اپنی بے کسی اور تنہائی یوں بول اٹھتی ہے جیسے پانی کی بوند آگ میں گر کے بول اٹھے —— اور ہر قدم پر یہی محسوس ہوتا ہے۔ آج کل دنیا سے یوں قطع تعلق کیا ہے کہ ذہنی اور جسمانی طور پر اپنے دکھوں کے جزیرے میں مقید ہو کے رہ گئے ہیں۔ تمہارا کیا حال ہے؟ —— تم اجنبی انسانوں کے بھرے جنگل میں ہر صورت کو حیران حیران تکتے ہو کہ نہیں! لاہور بھرا بھرا شہر ہے نا! لیکن مجھے معلوم ہے تمہارے اور زندگی کے درمیان کتنا ناقابل عبور فاصلہ ہے۔ وہ جو تم نے اکسیر اعظم کی بات کی ہے، تو مجھے یا اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش کیوں کرتے ہو۔

اکسیر اعظم نہ تمہارے پاس ہے نہ ہو گا —— تم اپنے آپ کو فریب دینا چاہتے ہو، ہم یہ بھی نہ کریں تو یہ پہاڑ سی تنہائی کی گھڑیاں کیسے بیت جائیں گی۔ تمہارے خط سے مجھے تمہارے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک اور گھاؤ، ایک اور زخم تمہیں نصیب ہوا ہے —— سنبھالے رکھو ان زخموں کو، پھر انہیں قیمتی تجربات کا حسین نام دے کر خوش ہو جانا۔ لیکن ہم بھی کیا کریں شاعر ہیں نا:

ہم نے خود اپنی تمنا کو بنایا ہے صلیب

صلیب کبھی مسیح کے حصے میں آئی، یا کبھی میرے تمہارے —— اور ہم جیسے ہزاروں لوگوں کے حصے میں!

میں نے عید پر پنڈی جانے کا فیصلہ کیا تھا:

سو وہ بھی نہ ہوا!

۲۶ر تاریخ کو پنڈی جاؤں گا امتحان کے سلسلے میں۔ اب کسی ڈھنگ سے پڑھائی شروع کی ہے۔ پاس ہو ہی جاؤں گا۔

تمہارے لئے بہت بہت سے پیار

تمہارا اپنا
احمد شمیم

جمیل ملک

احمد شمیم
کیلئے

نوحے — نظمیں — گیت

دوہری ہجرت کا کشف

وہ طفلِ زرگر
جب اپنے بابا کی نرم انگلی پکڑ کے اُس کی دکاں پہ جاتا
تو دیکھتا — کس طرح سے سونا
پگھل کے زیور کی نو بہ نو صورتوں میں تبدیل ہو رہا ہے
تب اُس کے چہرے پہ ایک ایسی چمک اُبھرتی
جو اُس کی معصومیت کو اتنا نکھار دیتی
کہ وہ بھی کندن کا ایک پیکر دکھائی دیتا

کبھی مؤذن کی پہلی آواز
جب اُسے خواب سے جگاتی
تو وہ اُفق پار سے اُبھرتی ہوئی بشارت کو
اپنے باغوں کے رنگ در رنگ حسن سے عطر بیز کرتا
عظیم سورج بھی طفلِ زرگر کے گرد کرنوں کا جال بُن کر
جمیل چاندی سے تھال میں
سُرخ سُرخ سیبوں کی ایک جنت سجا کے
اُس کے حسین گھر میں بکھیر دیتا
جہاں وہ اپنے شفیق ماں باپ
خوبصورت بہن
جواں بھائی کی رفاقت میں چل رہا تھا
وہ طفلِ زرگر تھا اور کشمیر کی اِسی زرنگار وادی میں پل رہا تھا

جواں ہوا جب تو اُس نے دیکھا
کہ اس کے بابا کی سب سے اُونچی دکان، سونے کی کان پر
جلنے والی وہ آگ بجھ گئی ہے
جو اُس کو کندن بنا رہی تھی
سنہرے پربت کا سارا سونا بکھر چکا ہے
چمن چمن کی روش روش پر اُترنے والی
مہین کرنوں کی صاف شفاف جھالروں پر
بجھے ہوئے بے شمار چولہوں کی راکھ جالے بنا رہی ہے
اور اُس کا وہ مہربان سورج
جسے وہ حیرت سے اور مسرت سے دیکھتا تھا
مہیب، گہری، طویل راتوں کی گردشوں کا اسیر ہے
اپنی اُس بشارت کو ڈھونڈتا ہے
جو ایک بے برگ و بار

صحرا نشیں اسیری کے گھپ اندھیرے میں کھو گئی ہے

وہ طفلِ زرگر، جوانِ رعنا
جو آج بھی جلتے بجھتے سورج کی روشنی کا سفیر تھا
مہربان سورج کے ساتھ
اپنے بدن پہ وادی کی راکھ مل کر
سمیٹ کر تن کے خالی دامن میں
شاہِ ہمدان کی دعائیں
لپیٹ کر من کے سونے پن میں
ریاضتیں للّہ عارفہ کی
بنوں میں کھوئی ہوئی بشارت تلاش کرتا
پہاڑ کی چوٹیوں کا برفاب اپنے دل میں انڈیلتا
جب زمیں پہ اُترا
تو اس طرح پاؤں پاؤں چھلنی تھا
اور یوں پور پور زخمی تھا
جیسے اُس کا رفیق سورج لہولہو تھا
مگر جسے اس نئی نویلی حسیں دھرتی پہ
اپنی کھوئی ہوئی بشارت طلوع ہوتے ہی مل گئی تھی

وہ طفلِ زرگر، جوانِ رعنا
جو ہر بُنِ مو سے رِستے زخموں کا
آج تھا آپ ہی مسیحا
طلوعِ خورشید دیکھ کر
اِک نئی نویلی حسین دھرتی پہ پاؤں رکھ کر
لطیف احساسِ مشترک اور شدید جذبے سے چیخ اُٹھا تھا
کہ سبز دھرتی کا رنگ تو اُس کی اپنی دھرتی کا رنگ بھی تھا
جو ساری دھرتی کا رنگ بھی ہے
جو سب کے دل کی اُمنگ بھی ہے
یہ رنگ سورج تو رنگ بھی ہے

مگر یہی تو غضب ہے
سورج کسی جگہ بھی نہیں ٹھہرتا
مدام خود بھی سفر میں رہتا ہے
ہم سفر ساتھیوں کو بھی یوں سفر میں رکھتا ہے
جیسے پیہم سفر ہی اس کائنات کا نقطۂ نظر ہو
یہی ہُوا
اک نئے وطن کی حسین سرسبز کھیتیوں پر
اُبھرنے والی نئی بشارت بکھیر کر
تابناک اور گرم کار سورج
نئی زمینوں کی دُھن میں نکلا
جہاں خدائی جلیل مہماں کے خیر مقدم کو ہر قدم پر
جواں لہو پیش کر رہے تھے

وہ طفلِ زرگر، جوانِ رعنا
یہاں اکیلا تھا، اجنبی تھا
مگر اب اُس کی ہتھیلیوں پر
نئے وطن کے عظیم بابا کی روشنی کے چراغ تھے
جن میں اجنبی سا، مگر شناسا سا
وہ اپنے بوڑھے، نحیف بابا کے بولتے ہونٹ دیکھتا تھا
جو اپنے بیٹے کو اپنی دھرتی کا ایک پختہ مکان
اِس کا مکیں بنانے کی آرزو ہی میں چل بسا تھا
مگر جسے یہ یقین بھی تھا
کہ اُس کا بیٹا
وطن وطن کی سُلگتی بھٹی میں
تپ کے نکلے گا جب
تو اپنے بدن کا سونا
تمام عالم کی وسعتوں میں بکھیر دے گا

نئے دیاروں کی

ریگزاروں کی خاک جب اُس کے سر میں اُڑتی
تو اُس کو کمرہ ور ماں کا دُکھ سے بھرا ہوا گیت یاد آتا
جو دیس پردیس کی مسافت کا نوحہ خواں تھا
وہ ماں جو لمبی جدائی کا قفل توڑ کر
ایک روز بیٹے کی سمت
پاگل ہوا کے ساتھ اتنی تیز بھاگی
کہ یوں گری، پھر نہ اُٹھ سکی
اور اب بھی زیرِ زمین آنکھیں کھُلی ہیں اُس کی

وہ جب بھی باغوں میں پھُول چُنتا
اکیلی راتوں میں خواب بُنتا
تو اُس کو اپنی جواں بہن کا
وہ پھول سا خواب خواب چہرہ
بہت ستاتا، بہت رُلاتا
بہن جو بھائی کے دُکھ میں
اپنا سہاگ بھُولی ہوئی ہے
کھڑکی سے یوں لگی اُس کی راہ تکتی ہے
جیسے پردیس جانے والا
کبھی نہ آئے گا
اور ابد تک یہ گھر کی کھڑکی کھُلی رہے گی

وہ جب کبھی یہ پکار سُنتا
کسی زمیں پر بھی بسنے والے
تمام انسان بھائی بھائی ہیں
اُس کی آنکھوں میں ڈوب کر
اُس کے پیارے بھائی کی
مسکراتی، عمیق آنکھیں سوال کرتیں
"وہ کیا خطا تھی
کہ عمر بھر کی سزا ہمیں دے کے چل دیے ہو

وہ سرزنش، میری ڈانٹ!
اُس میں تو ایک بھائی کی زندگی کا خلوص تھا
اور محبتوں سے اُچھلتے دل کا خروش تھا
آج بھی یہ دل کا کھُلا سمندر
تمھاری یادوں سے گونجتا ہے"

وہ اپنے یاروں کے ساتھ
جب کوئے یار کے راستوں سے ہوتا ہُوا
سوئے دار جا نکلتا
تو اُس کو اپنے پرانے یاروں کی محبتیں کتنی یاد آتیں
جو اُس کی ہجرت کے بعد
تاریک راستوں میں مثالِ خورشید
اپنی کھوئی ہوئی بشارت تلاش کرنے کی دھن میں
ایک ایک کر کے جاں سے گزر گئے تھے

وہ دن بھی اُس کو عزیز تر تھے
کہ وہ بھی جب
دل کشا، سنہری، بسیط وادی کے ایک کالج کا
اک ذہین و فطین، سُرخ و سفید لڑکا تھا
خوبصورت تھا اور بہادر تھا
ظلم کے تند و تیز دریا میں تیر سکتا تھا
جیسے اس دیس کے ہزاروں
جری، نڈر، سخت جان لڑکے
ملوکیت، جبر اور جہالت کے بحرِ زخار کی تہوں سے
اُچھل اُچھل کر
کروڑوں موجوں کے تازیانے
برہنہ تن پر سجا سجا کر
اُسی کنارے کی سمت بڑھتے ہوئے چلے جا رہے ہیں
جس کی کھُلی فضا میں، ہوا میں

چاہت کی، امن کی چاندنی ہے، خوشبو ہے
عدل و انصاف، علم و عرفاں کی روشنی ہے
جو سب زمانوں سے آ رہی ہے
جو سب زمانوں کو جا رہی ہے
وہ حوصلہ آج بھی جواں ہے
کہ وہ بھی جب مہرباں سورج کی ہمرہی میں
اُفق اُفق کے سبھی سمندر عبور کرتا
اُسی کنارے پہ جا رہا تھا
تو اس کنارے پہ آ گیا تھا
جہاں پھر اُس کی وہی بشارت
اسی طرح کھو گئی تھی جیسے
حسین وادی میں گم ہوئی تھی

عظیم بابا بھی جا چکا ہے
جلیل سورج بھی اس زمیں کو
نئی بشارت سنا کے پھر آج تک نہ لوٹا
جبھی سے اس سرزمین کے زائچے میں
سارے نجس ستارے ٹھہر گئے ہیں
جو رات کے ہمرکاب اس پر
گہن، بلائیں، عذاب، آسیب اور آفات بھیجتے ہیں
یہاں کے سب زندہ دل سپوتوں کی
اور روشن ضمیر لوگوں کی قسمتوں میں
گھروں کے اندر، گھروں کے باہر
وطن میں رہتے ہوئے بھی
اتنی طویل ہجرت لکھی گئی ہے
کہ کتنے لوگوں کی سانس ٹوٹی
مگر یہ جاں قید سے نہ چھوٹی

وہ طفلِ زرگر، جوانِ رعنا
جو خوبصورت تھا اور بہادر تھا
کب سے دوہرے عذاب میں ہے
تب ایک ہجرت
اب ایک ہجرت
اسی مسافت میں
اُس کے سر پر محیط
صدیاں گزر رہی ہیں
اِسی مسافت میں اس کا اپنا وطن بھی چھوٹا
نئے وطن میں پناہ لی
اور دل بھی ٹوٹا
وطن بھی ٹوٹا
کچھ اتنی لمبی ہے یہ مسافت
کبھی کبھی اُس کی سانس بھی
دھونکنی کی مانند چلنے لگتی ہے
رُوح میں غم کی اتنی میخیں گڑی ہوئی ہیں
کہ پھیپھڑوں میں بھی کتنے سوراخ ہو گئے ہیں
لطیف، سرخ و سفید، کندن سے جسم پر راکھ اُڑ رہی ہے

کئی برس سے
وہ ایک چھوٹے سے گھر میں
اپنی حسیں پناہ گاہ میں پڑا ہے
جہاں منیرہ ہے اور نگہت ہے
صائمہ، فائزہ ہے، بیلا ہے
اُس کا ہمزاد ہے
جو ہمسائیگی میں رہتا ہے
اتنے چہروں میں
کتنے چہروں کا رنگ اور روپ
چھاؤں اور دھوپ دیکھتا ہے
جو اُس سے ایسے بچھڑ گئے ہیں

کر آبلے دل میں پڑ گئے ہیں

کبھی کبھی گھر کی چھت پہ آکر
وہ دُور اُفق پار کے پہاڑوں کو
ٹکٹکی باندھ کر، لگاتار تکتے تکتے
کسی تحیّر میں ڈوب جاتا ہے
تب تحیّر کی کوکھ سے
پھر اُبھر اُبھر کر رفیق سُورج
اسے بلاتا ہے
اور یہ اپنے بازوؤں کو اُٹھا اُٹھا کر
اُسے بُلاتا ہے
اور فضاؤں کے نیلے گنبد میں
ایک آواز گونجتی ہے
اُدھر وہ کہتا ہے
"آ رہا ہوں!"
اِدھر یہ کہتا ہے
"آ رہا ہوں!"

جُدائی کا ایک گیت

چھُوٹا ہاتھ سے ہاتھ

دور دیس سے ایک مسافر آیا میرے پاس
میرے ساتھ ہی کاٹا اُس نے اپنا سب بن باس
میرے پاس ہی چھوڑ گیا وہ پیار کی سب سوغات
چھوٹا ہاتھ سے ہاتھ

اِک دوجے کی چھاؤں میں ہم نے ساری عمر بتائی
سوچ رہا ہوں، یار تھا میرا یا تھا میرا بھائی
من کے ورق پہ لکھ لی مَیں نے اس کی اک اک بات
چھوٹا ہاتھ سے ہاتھ

گھر آنگن میں لایا تھا جو اپنے پیار کی ڈولی
بچوں کے رنگوں سے رچائی جس نے دُلار کی ہولی
آج اُسی کے گھر سے نکلی یہ کیسی بارات
چھوٹا ہاتھ سے ہاتھ

دُکھ کی شاخ سے ٹوٹ گیا اک سُرخ سفید گلاب
روئیں اس کی ساری کتابیں گھر گھر میں سیلاب
سب ڈوبے، یوں گھِر گھِر آئی اب کے برس برسات
چھوٹا ہاتھ سے ہاتھ

ہم تم دُکھ سکھ کے ساتھی تھے کیوں یہ رشتہ توڑا!
آپ گئے منزل پر، مجھ کو رستے ہی میں چھوڑا!
پیارے! خوب نبھایا تم نے جنم مرن کا ساتھ
چھوٹا ہاتھ سے ہاتھ

باجے میری سانس میں تیرے نغموں کی شہنائی
ماں کی گود میں تو جا سویا، اپنا زخم جدائی
جگمگ جگمگ کرتی جائے امرملن کی رات
چھوٹا ہاتھ سے ہاتھ

ڈیڈ لائن

عدیلہ فون پر کہتی ہے
"ابو گھر کب آئیں گے!"
جواب آتا ہے
"بیٹی جلد آؤں گا
تری خاطر، ترے جیسے
نرالے، خوبصورت، بھولے بھالے
نرم و نازک سے کھلونے ساتھ لاؤں گا
اور ان میں سب سے پیارا
ایک ٹیلیفون بھی ہوگا
وہ جس کے سانس کی ڈوری
تجھے مجھ سے ملاتی ہے
مجھے جینا سکھاتی ہے"

عدیلہ اپنے ننھے سے کھلونے
اپنے ٹیلیفون سے باتیں کرے
کھیلے کودے
اپنے ابو کو پکارے
کچھ نہیں حاصل
اُفق کے اُس کنارے سے ریسیور کون اٹھائے گا!

یہاں اب کون آئے گا!
کہ ٹیلیفون کا وہ رابطہ
وہ سانس کی ڈوری
تو کب کی کٹ چکی ہے
اب تو اس آواز کی
اُس دُور سے آتی ہوئی آواز کی
اِک گونج باقی ہے
فقط اِک گونج باقی ہے

دوستو اُس کی باتیں کرو

دوستو اُس کی باتیں کرو
کل جو ہم میں تھا اور آج ہم میں نہیں
زندگی کے کسی بیش و کم میں نہیں
گھر سے نکلا
تو پردیس میں مر گیا
جو کہا، کر گیا

دوستو اُس کی باتیں کرو
جو چناروں کی صورت دہکتا رہا
پھر بھی ہر سانس جس کا مہکتا رہا
جو صنوبر تھا شمشاد بھی
قید بھی اور آزاد بھی
جو سرابوں کی، خوابوں کی انجان راہوں پہ چلتا رہا
جو سدا تتلیوں، جگنوؤں سے بہلتا رہا

دوستو اُس کی باتیں کرو
جس کا دل کرب تھا
اور قلم ضرب تھا

جو لڑا ہر سیہ رات سے
ظلم کی گھات سے
روشنی جس کے اندر تھی باہر نہ تھی
صبح جس کا مقدر نہ تھی

دوستو اُس کی باتیں کرو
تنگ آ کر جو شہرِ ستم سے گیا
زندگی کے ہر اک بیش و کم سے گیا
اُس کی یادوں کے جھرمٹ میں دن کاٹ دو
پاس اُس کو بُلا لو
بسر اُس کے ساتھ اپنی راتیں کرو
دوستو اُس کی باتیں کرو

درد کی گواہی

اُس نے اپنی شہادت کی انگلی اُٹھا کر کہا تھا
خدا ایک ہے
اور ہر دل میں روشن
اسی رب کی قندیل ہے
پرندوں کا آہنگ، پھولوں کا ہر رنگ
سورج کا یہ جذبۂ آگہی
چاند تاروں کا یہ نغمۂ سرمدی
رات دن کے تسلسل میں سب کچھ سمویا ہوا ہے
گزرتے ہوئے وقت کی چشمکیں ہوں
کہ فطرت کے سینے سے باہر لپکتی ہوئی دھڑکنیں ہوں
زمینوں میں اور آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے
اُسی کی تفصیل ہے
اُسی ذاتِ واحد کے دھاگے میں سب کچھ پرویا ہُوا ہے

اُس نے اپنی شہادت کی انگلی اُٹھا کر کہا تھا
خدا ایک ہے
اور اُس کی نظر میں
سبھی ایک جیسے ہیں
کوئی بڑا اور چھوٹا نہیں ہے
یہ رنگوں کی تفریق
نسلوں کی یہ برتری
قبیلوں کے، طبقوں کے یہ فاصلے تو وہ بُت ہیں
جہاں کے خداؤں نے جن کو تراشا ہے
کتنی بلند اور بالا فصیلوں کی صورت
خدا اور انسان کے درمیاں
لا کے ان کو کھڑا کر دیا ہے
ان کا قد کتنا چھوٹا تھا
کتنا بڑا کر دیا ہے —!

اُس نے اپنی شہادت کی اُنگلی اُٹھا کر کہا تھا
مرے پاس آ میرے عکسی! مرے پاس آ میرے بیٹے!
یہاں کس قدر حبس ہے
حبس میں میرا دم گھُٹ رہا ہے
اِسی حبسِ زنداں کا مارا ہُوا شخص ہوں
تو مرا روپ ہے، تو مرا عکس ہے
آ تجھے جاتے جاتے بتا دوں
تو معصوم ہے، تیرا دل خانۂ کبریا ہے
مگر تیرے قدموں میں پھیلی ہوئی زر کی دُنیا تو آزرنما ہے
تجھے سارے بُت توڑنے کے لیے
آگ کو لہلہاتا ہُوا باغِ جنت بنانے کی دھُن میں
آج پھر آگ میں کودنا ہے
ہمارے پیمبر نے غارِ حرا سے اُبھرتے ہوئے نُور کو

سارے آفاق کی روشنی
سب زمانوں کی سُرخی بنانے کی پاداش میں
جتنے بھی دُکھ اُٹھائے تھے، وہ سب اثاثہ ہے تیرا
ترا جوہرِ بے بہا ہے
زمانہ اگر ظلم ڈھائے
ترے شیشۂ دل میں بھی بال آئے
تو اپنے پیمبرؐ کا وہ خطبۂ آخریں یاد رکھنا
جو سب آنے والے زمانوں پہ احسان ہے
حسن کی، خیر کی اور صداقت کی میزان ہے
اپنی پہچان ہے !

آخری خط

تمھارا شکریہ
اتنے برس تم
میری ہی ضد
میرے ہی اصرار پر زندہ رہے
میری اندھیری سرد راتوں میں
محبت کے چمکتے جگنوؤں سے
روشنی کرتے رہے
تم زندگی کو موت ہی کی دوسری صورت سمجھتے تھے
مگر کھلتے ہوئے پھولوں کی خاطر
موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتے تھے
تمھیں معلوم تھا
سب تتلیوں کے رنگ کچے ہیں
مگر میرے لیے پھر بھی
رفاقت کے جواں جذبوں کا دم بھرتے رہے
لیکن کہو
یہ دوستی آخر کہاں کی ہے

کہ میں جو دن نگاہوں سے ہُوا اوجھل
تو تم نے بھی نگاہیں پھیر لیں اپنی

سفر پر جب نکلتے ہیں
محافظ ساتھ ہوتے ہیں
بھلا دستِ مسیحا سے بھی
اپنا دردِ دل کوئی چھپاتا ہے !
وفا کی عمر بھر تم نے
مگر یہ کیا ہوا
اپنے نگہباں سے بھی آخر کج ادائی کی
نہ کچھ رختِ سفر باندھا
نہ مجھ کو ساتھ ہی رکھا
اکیلے ہی سفر
لمبے سفر پر چل دیے ہو تم
میں اپنی ضد پہ شرمندہ ہوں
اپنے پیار کے اصرار پر نادم ہوں
روتا ہوں
کہ میری ضد
مرے اصرار سے بھی
تم نے آخر بے وفائی کی

آخری بوسہ

منیرہ ! موم کے پھولوں سے کب تک گھر سجاؤ گی
یہ سارے موم کے پیکر
پگھلنے کے لیے ہیں
تم پگھلنے سے انھیں کیسے بچاؤ گی
تم ان لکڑی کے ٹکڑوں پر
کہاں تک اُس کا پیارا نام کاڑھو گی

کہ جانے والا کب کا جاچکا ہے
تم کہاں تک اُس کی تصویروں سے
یادوں کی سنہری گرد جھاڑو گی
یہ مُسکرانے کا فن جو تم نے سیکھا ہے
نظر کا ایک دھوکا ہے
تمھیں ہر جھُولتے ہینگر میں جو چہرہ دکھائی دے رہا ہے
کل وہی زندہ حقیقت تھا
مگر اب خواب ہے، سایا ہے، چھایا ہے، چھلاوہ ہے
منیرہ! تم بڑی فن کار ہو
تم نے تو اُس کو آخری شب بھی
ہمیشہ کی طرح دولہا بنایا تھا
تمھیں معلوم تھا شاید
کہ اُس کو صبح ہوتے ہی
بڑی لمبی مسافت پر نکلنا ہے
جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آتا
جہاں رُت ایک سی رہتی ہے، چاہے کوئی موسم ہو
وہ رُت شاید جو تم سے بھی زیادہ خوبصورت ہے
منیرہ! تم تو خود بھی اُس کا چہرہ ہو
تمھیں پھر وہ دکھائی کیوں نہیں دیتا
وہ خود بھی چاند تھا اور چاند کے شب تاب چہرے پر
تمھاری ہی تو آنکھیں تھیں
تو پھر یہ جاتے جاتے کیوں کہا اُس نے
منیرہ! کچھ نظر آتا نہیں مجھ کو
مرے ماتھے پہ بوسہ دو، مجھے رخصت کرو
تم میری بیوی ہو، مرے بچوں کی ماں ہو
میری دھرتی ہو
اسی دھرتی کے ناتے سے
سبھی ماؤں کی تم پر چھاؤں ہے
تم میری بھی ماں ہو
مرے ماتھے پہ بوسہ دو، مجھے رخصت کرو
دیکھو یہاں کتنا اندھیرا ہے
مجھے اُس دیس جانا ہے
جہاں ماں کی مقدس روشنی ہے
پھیلتا بڑھتا سویرا ہے —!

آخری ملاقات

شہرِ ممنوع میں
چُپ کے ویراں کدے کے نئے موڑ پر
سب کی نظروں سے چھُپ کر
مگر سب کے پیشِ نظر
وہ مجھے یوں مِلا
جیسے پہلے مِلا ہی نہیں
اُس کی آنکھوں کی ہلکی نمی
میرے دل کو شرابور کرتی گئی
اُس کے ہونٹوں کی بے چین سی مسکراہٹ میں پابندِ نَے
کتنے نغموں کے سُر دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوتے گئے
اُس نے یوں ہاتھ میں ہاتھ لے کر دبایا
کہ مَیں اس کی شدّت
محبت کی حدّت سے اندر ہی اندر پگھلتا گیا
مگر پھر وہ یوں ان کہی کی زباں میں
خدا جانے کیا کیا فسانے سناتا ہُوا مجھ سے رخصت ہُوا
روشنی کے لیے یوں اندھیروں میں گم ہو گیا
آج تک زخمِ دل کا سِلا ہی نہیں
وہ مجھے یوں مِلا
جیسے پہلے مِلا ہی نہیں

سیف الملوک

کبھی میں بھی تھا شہزادہ
سنہرے پربتوں، بہتے ہوئے چشموں
حریری وادیوں میں کھلنے والے شوخ پھولوں کا
مگر نیلم پری کی کھوج میں نکلا
تو ویرانے میں آ پہنچا
جہاں کی خشک، چٹیل سرزمیں کے تنگ اور تاریک زنداں میں
مری نیلم پری پر دیوِ استبداد کا پہرہ ہے برسوں سے

اُدھر مجھ کو سنہری وادیاں آواز دیتی ہیں
اِدھر مجھ کو طلب ہے اُس پرندے کی
کہ جس میں دیوِ استبداد کی جاں ہے
پرندہ جب ملے مجھ کو
تو شاید میں اماں پاؤں
نہیں تو — کسی طرح یوں قید میں نیلم پری کو چھوڑ کر جاؤں!
کدھر جاؤں - !!
اجازت ہو تو مر جاؤں!

تیز رَو

اُسے جانے کی جلدی تھی
بہت ہم نے پکارا
وہ نہیں ٹھہرا
خدا جانے اُسے اب کے بلاوا کس طرف کا تھا
وہ سب کو چھوڑ کر رُخصت ہُوا
جو یار سب کا تھا
اُسے جانے کی جلدی تھی!

وہ اِک ستارا

وہ اِک ستارا
جو آسماں پر چمک رہا ہے
تری محبت کا استعارہ ہے
آنے والے دنوں کا
کتنا حسیں اشارہ ہے
میری تنہا، اُداس راتوں میں
روشنی کا سفیر ہے وہ
جہاں کا روشن ضمیر ہے وہ

گیت

او مرا گوانڈی یار خبرے کتھے گیا
سنجا ویڑا، چپ درواںے
یار دے بوہے اُتے جا کے
مَیں دیواں اوہنوں آوازے

پر او مُونہوں کجھ نہ بولے
تاں چاہواں نال لگے دھکے
اپڑیں گھر دا بوہا کھولے

کوئی نہ پُچھے میریاں ساڈاں
مَیں اک واورولے وانگوں
درواںے نال ٹکراں ماراں

اوہیاں گلاں، اوہیاں باتاں
دل وِچ سانبھ کے رکھیاں ہوئیاں
اوہدے پیار دیاں سوغاتاں
اوہدی جھولی پاواں دردی جتھے گیا
او مرا گوانڈی یار خبرے کتھے گیا

دروازے دا پھٹ

دروازے دا اک پَٹ ٹُٹ جاوے تے
دوجا ٹھک ٹھک وجے
دروازے دا اک پَٹ
کل مکلا
بُوہے اُتے آن کھلوتے
طوفاناں نُوں
روک نہ سکے
ٹوک نہ سکے

ربا کسے دا یار نہ وچھڑے
اپڑیں یار نوں یاد کرے تے
رہ رہ کے کرلاوے
ٹکراں مارے
کیویں دل دا پھٹ چھپاوے
باہروں سب کجھ نظریں آوے
اوہدا اکھن کوئی نہ کجے
دروازے دا اِک پَٹ ٹُٹ جاوے تے
دُوجا ٹھک ٹھک وجے

آفتاب اقبال شمیم

شجرستانِ ہجر کا مسافر — احمد شمیم

جب سہ پہر کی ڈھلوانوں سے روشنیاں بہہ جاتی تھیں
جب انگشت ستارے کی
تھرانے لگتی تھی شام کے بربط پر
اور معطر سی گمبھیر اُداسی کے ویرانے میں
شاخِ شجر سے اُڑتی تھیں
لرزاں لرزاں پیلی تانیں پتوں کی
اُس دم جانے کون صدا دیتا تھا — آؤ!
بجھتے رنگوں کے یہ تحفے
آؤ — اپنے کل کے سپنوں کی قیمت میں
لیتے جاؤ
اس آواز کے راتوں لمبے رستے پر
دو رویہ خاموشی میں
ہجر کے شجرستان کی جانب ہم دونوں چل پڑتے تھے
یاد ہے؟ تو کہتا تھا اپنی خوشبو کی سرگوشی میں
ہجر مسافت جان سے جان کے ملنے کی
کس نے کب طے کی ہے پیارے
ہجر فنا کا رستہ ہے
شوقِ تحیر سے گزرے تو وقت کی سرحد سے آگے نادِقت ملے
اور تحیر صدیوں کے پھیلاؤ میں
جانے کون سی نادیدہ منزل کی سمت اشارہ ہے

اس سے پہلے — روزِ سفارت لفظوں کی
بے آواز چلی آتی ہے وعدے کی اسناد لیے
خالی آنکھ کے ایواں میں
یعنی ایک کبھی نہ آنے والے کل کے آنے تک
بس اک خواب کے درشن کرنا، کرتے رہنا
جیتے رہنا، مرتے رہنا
تیشے سے
کوہِ مقدّر سر کر کے
آخر میں اپنے ہی خوں کی ندی پر
اپنی پیاس بجھانا ہے
ہجر زدہ صحرا زادے
نااُمید نہیں ہیں جان لُٹا کر بھی
اب تو جاتے ہیں لیکن پھر آئیں گے
(جینا خون بہا ہے شاید مرنے کا)
جب سانسوں کے امبر پر
ٹوٹ رہے ہوتے ہیں تارے پیلی رُت کے آنگن میں
دل پر دستک ہوتی ہے
اور دریچے کی چلمن سے ساحر آنکھیں
کیسے شوخ اشاروں میں
پھولوں کے آدرش کا مژدہ دیتی ہیں

دل کا بحر

شناور جذبے اور تصوران ہونی سی باتوں کا ۔
آس کے در اک لمحے پروا ہوتے ہیں
لہروں کی خواصیں کندھوں پہ تھال اُٹھائے آتی ہیں
اور اُلٹتی جاتی ہیں
ریزہ ریزہ روشنیوں کے گوہر ریت کی جھولی میں
دیکھا تھا نا ہم نے ، ہجر کے شجرستاں میں
وہ برگد کے سائے میں
صبح و شام کے خاکستر سے کرنیں چُنتا رہتا تھا
دھیان سے اُڑتی خوشبو کے مرغولوں سے
سپنے بُنتا رہتا تھا
جانے اُس کے نوُر کا کس پر کشف ہوا
وہ شہزادہ عمروں کے بن باس میں اب بھی
تنہا پھرتا رہتا ہے
خبروں کے انبار میں اک نادیدہ حرف محبّت کا
ڈھونڈیں پر کیسے ڈھونڈیں
دُکھ کے معرکہ زاروں میں
ہونے والی جنگوں کے طے ہونے کا امکان نہیں
روز مجھیرا نامعلوم تعاقب میں
رنگ و بو کا جال اُٹھائے آتا ہے
اور خلیجِ شام سے آگے
بے تکمیل سفر کے لمبے سایوں میں کھو جاتا ہے
لیکن آ تسلیم کریں
یہ سوچیں کم معنی ہیں
لفظ ذرا سے گونگے بھی ہیں بہرے بھی
ہوش مساحت گر ٹھہری اندازے کی ، اندیشے کی
ہم کیا جانیں کون تماشا گر ہے ان دنیاؤں کا
جن کے سناٹے ہیں وقت کا ٹپکاؤ
ہستی کے گلزار کھلاتا رہتا ہے
ہم اس ہونے ، نہ ہونے کے عالم گیر تماشے میں
ناظر بھی ہیں ، منظر بھی تمثیلوں کے
ہم کیا جانیں ہم کیا ہیں !

یاد نہیں کیا ؟

کیسے جشن کی کیفیت تھی دن کے چڑھتے منظر میں
آئینہ در آئینہ
عکسوں کی گھما گھمی سی رہتی تھی
تازہ زخموں کی جھنکاریں
ہم دونوں کو
آوارہ رکھتی تھیں دل کے قریے میں

اوّل اوّل
جب میں مُونج کی چپّل پہنے
اور بسنتی خواب کی چھتری سر پہ تانے
برفوں کے اُونچے پربت سے اُترا تھا
تم بستی سے باہر دھوپ کی سنگت میں
مجھ کو لینے آئے تھے
تم نے میرے لمبے بالوں ، نسواری پیراہن کو
کتنے غور سے دیکھا تھا
پھر جیسے تم نے مجھ کو ، میں نے تم کو پہچان لیا

یاد ہے نا! وہ بے چینی سی
دل کی ممنوعہ گلیوں میں جانے کی
دُور کہیں بُرجوں پر جلتی قندیلیں
چاندنیوں کے گیت، تھرکتے پاؤں سے اُڑتی چاندی کے
چھینٹوں میں
رقص کی لہروں پر ہچکولے کھاتی آنکھیں
دن کی بارہ دریوں میں —
شہرِ صبا آباد خرامِ لالہ رُخاں
ہر نفسے ہم رنگِ پیامِ لالہ رُخاں
کھِل کھِل جانا نیم شگفتہ زخموں کا
اور بہت چاہت دل میں مر جانے کی
گرم لہو کی لوریاں سُنتے سُنتے ہم
اونگھنے لگتے تھے رنگیں افسانوں کے گہوارے میں
پھر ہم دونوں
ٹھہرے مٹی کی جنت سے، اپنے ہی اُکسانے پر
مٹی کے دُکھ کا بے نام ثمر چکھ کے
ہونے کا، نہ ہونے کا تاوان ادا کرنے نکلے
باہر ایک تماشا ہر سُو بے چہرہ انبوہوں کا
سایہ سایہ زُلفیں کھولے
دُھوپ پرانی دہلیزوں پر بیٹھی تھی
گھر کے کچے آنگن میں
بے شکوہ آنکھوں سے قطرہ قطرہ گرتی بینائی کی آہٹ سی
بوڑھے ہاتھوں میں رعشہ ناداری کا
زید کے ماتھے کی تختی پر لکھا تھا
یہ مٹی، یہ آل اولاد ستاروں کی

قحط کی فصلیں کیوں ہر سال اُگاتی ہے
اے داتا! ان ناحق مرنے والوں کو
اپنی بخشش سے تو لمبی عمریں دے
آئندہ کی دنیا میں
قصر بہت اُونچے تھے عشرت گاہوں کے
جن کے شب زادوں میں پھول مہکتے تھے
بوٹے جیسے قد و قامت کی نوخیز کنیزوں کے
جن کے زینے سے خلقت پر جینے کا انعام اُترتا رہتا تھا
آتے جاتے موسم سبز صلیبوں کے
خاک کا دامن بھر جاتے تھے سُرخ سجیلے جسموں سے
جبر کے ظلمت خانے میں
خوف، اندھیرے اور دھوئیں کے سناٹے
زنگی پہرے داروں کی چنگھاڑیں رات کے جنگل میں
گرتے خون کی موسیقی پر رقص برہنہ شعلوں کا
کیا دیکھا؟ — بے چشم مصنف بستی کی دیواروں پر
سہ پہروں کے سائے لکھتا رہتا تھا
طاقت کے شاہی قلعے ماخذ ساری تہذیبوں کے
جن کے دانش زادوں نے تعمیر کیے
زر کے بیجوں سے اُگتی بدحالی کے پس منظر میں
چمنستان ثقافت کے
یاد ہے؟ ہم دونوں نے اپنے سارے خون کی شدت سے
نفرت، نفرت، نفرت کا اقرار کیا
اے شاعر! آ
عمروں کے فاقے سے برفائے ہاتھوں کو بوسہ دیں
روشنیاں اُنڈیلیں ٹھنڈے سینوں میں

اتنی کہ صبحوں کے گھاؤ پڑ جائیں
ربِ جبر کی نازل کردہ ظلمت کی پیشانی پر
خواب پرندے اور نشیمن آنکھوں کے
آدم زادے شہرِ ازل کی گم کردہ جنت کی دُھن میں یوں نکلے
جوں عشاق نکلتے ہیں
اے ایام کی مٹی یاد گواہی دے
ہم فردا کے دُزد اندھیری راتوں میں
روشنیوں کے نعرے دیواروں پر لکھتے رہتے تھے
لگتا تھا کہ دل نورُستہ جذبوں کی طغیانی میں بہہ جائے گا
لیکن کیسے قد آور سالاروں نے
ڈھلتی عمروں کی ٹھنڈی آسائش کے خس خانے میں
منصوبے تیار کیے پسپائی کے
دام بچھائے نافہمیدہ سچائی کی منطق نے
پھر — ہم بھی کچھ ایسے تھے
ناآموز شناورِ بحرِ ہمت کے
ڈوبے حیلے اور حوالے کے گدلے گردابوں میں
ہم کیا کرتے
(ہم نے سوچا) بہتر ہے سمجھوتے سے
ہم ابہام کے پیچ و خم میں کھو جائیں
ورنہ یہ جابر سلطان زمانے کا
ہم آزادوں سے مانگے گا جزیہ باجگزاری کا
بہتر ہے کہ سر پر لے لیں تہمت کم کم جینے کی
کیا ہے؟ غور سے دیکھو تو
زر دِگولے کی مٹھی میں نیک کمائی تنکوں کی
سارے جذبے لاحاصل

اس سے آگے منظر شام سرائے کا
چائے کے مٹیالے گھونٹوں سے گرمائے لہجے میں
پہروں خود سے چھُپ کر خود سے باتیں کرنا
باہر از تفریٰ ٹوٹے آئینوں کے عکسوں کی
خالی کمرے میں مجمع آوازوں کا
بے پیغام، تہی تمثیلیں معنی اور حوالے کی
ایک تمسخر ہونٹوں پر
لایعنی فعلوں کی زریں فصلیں بونے والوں کا
بس ایسے ہی کاٹ دیا
اکتا دینے والے روز و شب کے آنے جانے میں
ہم نے رہتی عمروں کو
اے شاعر! آ
ہجر کے اندر ہجر کے اس دوراہے پر
موڑ مڑیں ایسے کہ کوئی منظر پچھلی یادوں کا
نظروں سے روپوش نہ ہو
بچھڑیں لیکن اگلی رُت میں پھر ملنے کے وعدے پر
ہم کہ پیوستہ ہیں خون کے رشتے میں
دُکھ کے زرد قبیلے سے
دیکھ! یہاں پر
ہجر کے شجرستان میں کیسے لمبے لمبے سائے ہیں
اے جنموں کے آوارہ! اے ازلوں کے سیلانی! آ
دل کے عرشش پہ چل کے تارے چنتے ہیں
دلبر سے ملنے سایوں کی بستی میں
پیارے! کل پھر آنا ہے

ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو

منصور قیصر

مظہرالاسلام کی کتاب "گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی" کی تقریبِ رونمائی تو میرپور آزاد کشمیر میں ہونا تھی لیکن احمد شمیم راولپنڈی میں اس کے لیے جذباتی ہو رہا تھا۔ جذباتی ہونے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس تقریب کا اہتمام اس کے ذمے تھا اور دوسری یہ کہ کافی مدت بعد اُسے میرپور میں مضمون پڑھنا تھا جہاں وہ کسی زمانے میں حکومت آزاد کشمیر کے انفارمیشن افسر کے طور پر تعینات رہ چکا تھا۔ میرپور سے اسے ویسے بھی ایک جذباتی لگاؤ تھا۔ وہ مقبوضہ کشمیر سے ڈوگروں کی قید سے فرار ہو کر جب آزاد علاقے میں داخل ہوا تھا تو میرپور کی اُس قدیم بستی سے گزر کر ہی پاکستان آیا تھا جو اَب منگلا جھیل میں ڈوب چکی ہے اور اب صرف ایک مندر کے کلس سے اُس ڈوبی ہوئی بستی کا نشان ملتا ہے۔

تقریب کے اہتمام کے لیے احمد شمیم نے پہلے ہی میرپور میں رشید دیوانہ، عارف کمیلوی، اشفاق سلیم مرزا، حاجی رانا فضل حسین، ستارہ پاکستان ڈاکٹر غلام حسین اظہر اور دیگر دوستوں کو مطلع کر دیا تھا۔ دوستوں کی آسائش کے لیے ایک ریسٹ ہاؤس بھی بک کروا دیا تھا۔ جس روز تقریب تھی اُس دن اُس نے محکمۂ اطلاعات کی وین میں گھر گھر جا کر مجھے، مظہرالاسلام، حسن عباس رضا، طاؤس بانہالی، شورش ملک اور فتح محمد ملک کو جمع کیا اور اس انداز سے میرپور روانہ ہوا جیسے کوئی ٹورسٹ گائیڈ ہو۔ اُس روز احمد شمیم مجھے ایک ایسا ٹورسٹ گائیڈ معلوم ہوا جو کشمیر کے ایک ایک پتھر سے محبت کرتا ہو بلکہ ہر پتھر میں اپنا عکس دیکھتا ہو۔ دینہ سے منگلا کی طرف مڑتے ہی اُس نے کشمیری عوام کی جد و جہد آزادی کی تاریخ اور اُس خطے کا جغرافیہ بتانا شروع کر دیا۔ وہ ضلع پونچھ کے لوگوں کے جذبۂ جہاد کی داستانیں سناتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ میرپور کے لوگ سیاسی طور پر سب سے زیادہ بیدار لوگ ہیں۔ آمریت، جبر اور غیر آئینی اقدام کے خلاف ان کا ردِعمل بڑا شدید ہوتا ہے۔
منگلا ڈیم کے قریب پہنچے تو اس نے اپنے دائیں جانب اشارہ کر کے کہا "یہاں سے چند میل کے فاصلے پر کھڑی شریف ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نہ صرف سیف الملوک کے مصنف حضرت میاں محمدؒ کا مزار ہے بلکہ یہ وہی جگہ ہے جہاں اس دھرتی کے سپوت پورس نے سکندر مقدونی کی غیر ملکی فوجوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔" سفر کے دوران شورش ملک سنجیدہ باتیں کرنے یا سننے کے موڈ میں نہیں ہوتا وہ کچھ دیر تک تو خاموشی سے سنتا رہا کیونکہ فتح محمد ملک حسبِ عادت "ہاں جی ہاں جی" کیے جا رہا تھا۔ پھر اُس نے احمد شمیم اور طاؤس بانہالی سے مخاطب ہو کر شرارتاً کہا "ہم ان کشمیری ہاتووں سے بڑے تنگ آ گئے ہیں، پتہ نہیں کب واپس جائیں گے۔"
احمد شمیم جھٹ بولا "ملک جی! ہم کشمیریوں کے بغیر تو پاکستان بھی مکمل نہیں۔ پھر آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ جس شاعر نے پاکستان کا تصور دیا تھا وہ بھی کشمیری ہاتو تھا۔"
شورش ملک کی جملہ بازی میں حسن عباس رضا اور میں بھی شریک ہو گئے کہ ہم جانتے تھے کہ شمیم اور طاؤس کی سب سے بڑی کمزوری کشمیر ہے اور اسی موضوع پر انھیں زچ کیا جا سکتا ہے۔ احمد شمیم کو چڑانے کے لیے حسن عباس رضا نے ایک لطیفہ سنایا جو شاید آپ نے

بھی سُن رکھا ہو۔ وہ یہ ہے کہ ایک مراثی نے دوسرے مراثی سے کہا "سنا تم نے! یو۔این۔او نے کشمیر کا مسئلہ حل کر دیا ہے"۔ دوسرا بولا "نہیں تو تم ہی بتاؤ کہ کیا فیصلہ ہوا ہے؟" پہلے نے بتایا "فیصلہ یہ ہوا ہے کہ کشمیر ہندوستان کو اور کشمیری پاکستان کو دے دو"۔

دین میں قہقہوں کے بلبلے پھوٹنے لگے۔ شمیم اپنی کچی پکی پنجابی میں بولا "فکر نہ کر پتر! ہم جیتے جی ہی اپنے دیس لوٹ جائیں گے"۔

اُس وقت ہم منگلا ڈیم کے پاس سے گزر رہے تھے۔ طاؤس بولا "یہ ڈیم ہماری قوت کا سرچشمہ ہے۔ یہ ہمارے کشمیر میں واقع ہے۔ اس وقت تم لوگ ہمارے علاقے میں سے گزر رہے ہو۔ بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

شورش ملک نے جھٹ جملہ کسا "وہی سلوک جو ایک مظلوم کشمیری اپنے آقا کے ساتھ کیا کرتا ہے"۔

ہم سب ہنس پڑے لیکن احمد شمیم نہ صرف خاموش رہا بلکہ اس کے چہرے پر کرب کی لکیریں رینگنے لگیں اور وہ اپنی جیب سے چھوٹا سا پمپ نکال کر اپنے حلق میں سپرے کرنے لگا۔ یہ عمل وہ اُس وقت دہرایا کرتا جب اُس کا سانس رکنے لگتا۔ اُس کے دل پر نہ جانے کب سے عذاب کی دیواروں کا ملبہ گر رہا تھا۔ اس ملبہ کی دھول سے فضا اتنی آلودہ ہو چکی تھی کہ اس کے لیے سانس لینا بھی مشکل ہو چکا تھا اور وہ چند برسوں سے مصنوعی سانس کے سہارے جی رہا تھا۔

اگست ۸۲ء کے اوائل کی بات ہے کہ صبح صبح احمد شمیم نے فون کر کے کہا "میں آج مظفر آباد جا رہا ہوں۔ چلنا ہے تو ساتھ چلو۔ آمد و رفت کا مفت انتظام ہے"۔

میں نے کہا "میرا تو ابھی کوئی ارادہ نہیں"۔

"بھئی تمہارے سسرال والے ہیں وہاں"۔

"نہیں میری خیر خیریت بتا دینا لیکن تم کس خوشی میں مظفر آباد جا رہے ہو؟"

وہ اپنے مخصوص سٹائل میں طنزیہ لہجے میں بولا "وہاں سرکار دربار میں میری پیشی ہے"۔

میں نے مذاقاً کہا "فکر نہ کر برخوردار تم پیدا ہی پیشیاں بھگتنے کے لیے ہوئے ہو"۔

"اس کے لیے کہتا ہوں کہ جو ہونا ہے ایک ہی دفعہ ہو جائے۔ یہ روز روز صلیب اٹھانے سے تو نجات مل جائے۔ رات ایک غزل ہوئی ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارا شاعری والا خانہ خالی ہے پھر بھی سن لو"۔

اُس نے وہ غزل سنائی جو بعد میں اس کی زندگی کی آخری غزل ثابت ہوئی۔ دو شعر یہ تھے:

میں بھی راہوں میں پریشاں ہوں ہوا کی صورت — منتظر وہ بھی ہے چپ چاپ صنوبر کی طرح
میری آنکھوں سے مگر رونق بازار نہ دیکھ — شہر ویراں تجھے آئے گا نظر گھر کی طرح

تیسرے روز صبح صبح ڈاکٹر ایوب مرزا کا فون آیا کہنے لگا "میں نے اپنی نثری نظموں کا مسودہ "عذاب کا عہدنامہ" کے عنوان سے مرتب کر لیا ہے۔ بس صرف احمد شمیم کو دکھانا باقی رہ گیا ہے۔ شام کو اس کے ہاں جانے کا پروگرام ہے مجھے اس کا بلڈ پریشر بھی چیک کرنا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چلنا"۔

میں نے بتایا کہ وہ تو مظفر آباد گیا ہوا ہے غالباً حکام بالا کے سامنے اس کی پیشی ہے۔

ڈاکٹر بولا "مجھے طاؤس نے بتایا ہے کہ وہ آج سہ پہر کو پنڈی پہنچ جائے گا۔ شام کو اُسے ریڈیو سے کشمیری زبان میں LIVE تقریر کرنا ہے"۔

میں نے ڈاکٹر کے ساتھ جانے کی حامی بھر لی۔ ڈاکٹر ایوب مرزا کی بات کوئی نہیں ٹالتا کیونکہ وہ ادیبوں کا اعزازی طبی مشیر ہے۔ اسی دوپہر ریڈیو سٹیشن سے یعقوب والی کا فون آیا۔ اس کی آواز بڑی گھبرائی ہوئی تھی "یار اگر تم نے فلاں روز کے لئے تقریر لکھ لی ہو تو کل آ کر ریکارڈ کروا جاؤ"۔

میں نے کہا "ایسی بھی کیا جلدی ہے وقت پر آ کر LIVE نشر کر دوں گا۔"

یعقوب لالی قریب قریب خوف زدہ ہو کر بولا "نہ نہ خدا کے لیے ایسا نہ کرنا جب موقع ملے آ کر ریکارڈ کروا جانا۔ احمد شمیم نے بھی تو LIVE تقریر کرنے کے لیے کہا تھا مگر......"

"مگر احمد شمیم کو کیا ہوا؟"

"تمہیں نہیں معلوم؟ میں سمجھا تمہیں معلوم ہو گا۔ وہ رات ہی مظفر آباد سے واپس آ گیا تھا لیکن آج علی الصبح اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ عصر کے بعد اس کا جنازہ ہے۔"

ہارٹ فیل کی سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خود فیل ہو گیا ہوں، لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر میرے خشک ہونٹوں پر جم گئے اور میں ایک زندہ لاش کی طرح کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ صرف سوچ کی سوئیاں ذہن میں چبھتی رہیں۔ اُسے یوں اچانک کیا ہو گیا، اُسے کس کی نظر کھا گئی؟ اس نے تو جانے سے قبل صرف اُس کی آنکھوں سے رونق بازار نہ دیکھنے کا مشورہ دیا تھا، یہ تو نہیں کہا تھا کہ اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بجھ جائیں گی۔ اُس نے تو ہمیشہ مجھ سے LIVE باتیں کی تھیں۔ وہ تو زندہ اور متحرک باتوں کا دلدادہ تھا۔ ریڈیو پر اس کی ناپسند تحریریں تو اس کی معاشی مجبوری تھیں۔

احمد شمیم جس نے ہم سے کہا تھا کہ وہ چپکے سے اپنے دیس لوٹ جائے گا، صرف اکاون برس کی عمر میں تتلیوں کے دیس لوٹ گیا۔ ان اکاون برسوں میں وہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں تلاش کرتا رہا اور بڑے بڑے غم پالتا رہا۔ وہ بظاہر مسکراتا رہا اور اندر ہی اندر عذاب کا عہد نامہ لکھتا رہا۔ پچھلے چار برس اُس پر بڑے کربناک گزرے۔ جس کشمیر کی آزادی کے لیے اس نے ڈوگرا جیل کاٹی تھی، اُسی کشمیر کے آزاد علاقے میں وہ اچانک "پرسونا نان گریٹا" ہو گیا۔ وہ جب ترقی پا کر اور آزاد کشمیر کے محکمۂ اطلاعات کا ڈائرکٹر ہو کر مظفر آباد گیا تو اس کی اپنی ذہانت، علم، دانش اور شہرت اس کے لیے دشمن بن گئی۔ ڈڈوؤں کو اپنے درمیان وہیل مچھلی ایک آنکھ نہ بھائی اور اسے واپس گہرے سمندروں میں دھکیلنے کے لیے اسے ڈیپوٹ کروا دیا۔ شمیم نے اس حق تلفی کے خلاف آزاد کشمیر ہائی کورٹ میں رٹ دائر کر دی۔ پہلا ہارٹ اٹیک اسے انہی دنوں میں ہوا کہ پنڈی اور مظفر آباد کے درمیان بار بار چکروں نے اس کے ذہن کو ماؤف کر کے رکھ دیا۔ ہائی کورٹ نے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا لیکن فیصلے پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔

طاؤس بانہالی کی طرح احمد شمیم کے بھی پاکستان میں اپنے بیوی بچوں کے سوا اور کوئی رشتے دار نہ تھا۔ دونوں آزاد کشمیر ریڈیو سے صرف اس لیے بولا کرتے تھے کہ مقبوضہ کشمیر میں، ان کی مائیں ان کی آواز سن سکیں۔ میں نے احمد شمیم کو پہلی بار ایک ویران پارک میں اُس وقت بچوں کی طرح روتے دیکھا جب اس کی ماں کے انتقال کی خبر ملی۔ ۱۹۴۷ء میں طاؤس اور شمیم نوجوانی کے عالم میں کشمیر میں اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑ کر نئے وطن کی محبت میں سرشار پاکستان آ گئے تھے۔ وہ دونوں چونکہ بنیادی طور پر شاعر اور آئیڈیلسٹ تھے اسی لئے انہیں دنیا داری بھی نہ آئی لہٰذا اپنے آدرش کی خاطر اپنے لیے کوئی مستقل چار دیواری بھی حاصل نہ کی۔ تیس برس پہلے جب احمد شمیم کی ملاقات جمیل ملک سے ہوئی تو جمیل نے اپنے پڑوس میں اپنے ایک عزیز کا گھر اُسے کرایے پر لے دیا اور پھر آخر اسی گھر سے اس کا جنازہ اُٹھا۔

احمد شمیم کو اردو، انگریزی اور کشمیری زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ وہ تینوں زبانوں میں بلا تکلف لکھتا تھا۔ وہ اگرچہ بنیادی طور پر ترقی پسند ادیب تھا لیکن گزشتہ چار برسوں کے حالات نے اسے شدید قسم کے ناسٹلجیا میں مبتلا کر دیا تھا۔ اُسے اپنی گمشدہ جوانی کے روشن دن بہت یاد آنے لگے تھے۔ واپس سری نگر نہ جانے کا احساس اس کے لیے کابوس بن گیا تھا۔ لمحہ لمحہ بکھر جانے کے خیال نے اُس سے "کبھی ہم خوبصورت تھے" جیسی نظمیں لکھوانی شروع کر دی تھیں۔ دل کے عارضے کے ساتھ اُسے دمہ کی شکایت بھی شروع ہو گئی تھی۔

عصر کے وقت جب میں محمد منشا یاد، غضنفر مہدی اور علی محمل واسطی کے ہمراہ احمد شمیم کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے کے لیے جا رہا تھا تو بیس برس پر پھیلی ہوئی ان گنت یادیں میری آنکھوں میں ایک منظر تازہ بنا رہی تھیں۔ میری یادوں کا دریچہ کھلتا تو مجھے کشمیری سیب کی طرح ایک

سرخ و سفید نوجوان ایک سیاہ برقعے میں لپٹی لپٹائی لڑکی کے ساتھ راولپنڈی کی مال روڈ پر باتوں میں محو واک کرتا ہوا نظر آتا۔ دونوں چلتے چلتے تھک جاتے تو پلازہ سینما کے سامنے باغیچے میں بیٹھ جاتے۔ گاہے اسی باغیچہ کے دوسرے کونے میں سلیم عاصمی اور ریحانہ بیٹھے اسی قسم کی باتیں کر رہے ہوتے جیسی شمیم اور منیرہ کیا کرتے۔ منیرہ اُس سے ملنے کے لیے واہ چھاؤنی سے آیا کرتی۔ پھر یہ منظر دلہا دلہن کے چونچلوں میں ڈھل جاتا۔ جمیل کا پڑوس نقرئی قہقہوں اور چوڑیوں کی چھنچھناہٹ سے آباد ہو گیا۔ پنڈی کے ٹی ہاؤس "دوگیز" میں احمد شمیم کی آمد کم ہو گئی۔ یہ دوگیز پنڈی شہر کا واحد کلچرل سنٹر تھا جہاں مل بیٹھنے والوں میں یوسف ظفر، مختار صدیقی، باقی صدیقی، ریاض قادر، عطا حسین کلیم، اختر احسن، جعفر طاہر، ابراہیم سلیم اظہار کاظمی، منو بھائی، شفقت تنویر مرزا، سلیم رفیقی، احمد شمیم، طاؤس بانہالی اور چاچا قدوس شامل تھے۔ پھر ریڈیو سٹیشن کا وہ گیراج نظر آنے لگا، جہاں بیٹھ کر احمد شمیم نے لفظ و صوت کے محاذ پر ۶۵ء کی جنگ میں حصہ لیا۔ شدتِ جذبات سے کبھی اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا اور کبھی غصے سے مزید سرخ ہو جاتا۔

پھر تمام منظر آخرِ شب کے ستاروں کی طرح ڈوب گئے اور ایک متحرک تصویر گرم سلاخ کی طرح آنکھوں میں چبھ گئی۔ یہ ایک جنازے کی تصویر تھی جو پراچہ سٹریٹ سے باہر سڑک پر آ رہا تھا۔ ایسا جنازہ جو صرف دوستوں کے کندھوں پر تھا۔ جمیل ملک، آفتاب اقبال شمیم، نثار ناسک، اختر امام رضوی، ریڈیو والے محمد عمر اور طاؤس بانہالی بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے جیسے اُن سے اُن کا کوئی خونی رشتہ بچھڑ گیا ہو۔ ہم سب سر نیوڑھائے جنازے کے ساتھ ساتھ ہو لیے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا اپنے کلینک جانے کے لیے ہمیشہ اسی سڑک سے گزرتا ہے، اُس روز اچانک وہاں سے گزرا۔ اس کی نظر جنازے میں بہت سے دوستوں پر پڑی۔ وہ کار کو سائیڈ پر روک کر قریب آ کر پوچھنے لگا۔ "یہ کس کا جنازہ ہے؟"

"احمد شمیم کا۔" منظر الاسلام نے بتایا۔

"نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" ڈاکٹر نے حواس باختہ ہو کر کہا۔

احمد شمیم حسبِ عادت اُسے بھی آخری وقت میں سرپرائز دے گیا۔ ایوب مرزا سکتے کے عالم میں جنازے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اُس وقت بھی اس کی نثری نظموں کا مسودہ اُس کی گاڑی میں پڑا تھا جسے لے کر شام کو احمد شمیم کے ہاں جانا تھا لیکن شمیم نے ڈاکٹر صاحب کا انتظار کیے بغیر خود ہی عذاب کا عہد نامہ لکھ ڈالا تھا۔

عیدگاہ قبرستان میں قبروں پر بیٹھی ہوئی اداس اور ویران شام ایک زندہ شاعر کے سرہانے نوحہ کناں تھی۔ لحد میں اتارنے سے پہلے آخری دیدار کے لیے احمد شمیم کے چہرے سے کفن سرکایا گیا تو جمیل ملک نے اپنے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے ہونٹوں سے اُس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور مجھے یوں آواز آئی جیسے احمد شمیم کہہ رہا ہو:

"ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو جگنوؤں کے تتلیوں کے دیس جانا ہے"

میرے خواب ریزہ ریزہ

ڈاکٹر غلام حسین اظہر

احمد شمیم کی شخصیت اور فن کے بارے میں میں نے جب بھی سوچا ہے، تو مجھے اس کے یہاں اپنی ذات ہی کی شکست سنائی نہیں دی بلکہ مجھے اہل کشمیر کی تقریباً نصف صدی پر پھیلی ہوئی زندگی کا وہ آئینہ دکھا دیا ہے جس میں ہم اپنے ریزہ ریزہ خوابوں کی کرچیاں بکھری ہوئی دیکھ سکتے ہیں ـــــ اس نسل کے خوابوں کی شکست کا منظر جو ۱۹۴۷ء میں اپنی منزل پاکستان کو قرار دے چکی تھی اور اس نے ہر مصلحت سے بالاتر ہو کر ہر اُس قوت سے ٹکر لی جو اسے اس راہ میں حائل نظر آئی۔ اس نئی نسل نے اس شخص کو لوہے کے چنے چبوائے جسے اس کے بزرگوں نے شیر کشمیر کا خطاب دیا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں ایک طالب علم کی حیثیت سے احمد شمیم نے جو سیاسی مظاہرہ کیا وہ پنڈت جواہر لعل نہرو کے خلاف تھا۔ اس مظاہرے کی پاداش میں اسے جیل کی ہوا کھانی پڑی لیکن یہ قید اس کے جوشِ جنوں کو کم نہ کر سکی ۱۹۴۸ء میں اقوامِ متحدہ کا کمیشن سری نگر گیا تو احمد شمیم نے ایس۔ پی کالج کے طلبا کا سب سے بڑا مظاہرہ منظم کیا۔ ایس۔ پی کالج کے سامنے ہزاروں طلبہ نے بھارتی جارحیت کے خلاف مظاہرہ کیا۔ اس مظاہرے کے دوران احمد شمیم نے دھواں دھار تقریر کی۔ کمیشن چلا گیا تو بھارتی فوج، ڈوگرہ پولیس اور نیشنل کانفرنس کے غنڈوں نے کالج کو گھیرے میں لے لیا اور طلبا کو بُری طرح پیٹا۔ کچھ مسلمان پروفیسر بھی اس عذاب کا شکار ہوئے ـــــ احمد شمیم سب سے بڑا ستم کا نشانہ بنا۔ اس کے کپڑے پھاڑ دیئے گئے اور پورا جسم لہولہان کر دیا گیا۔ اسے بھارتی فوج کی جیپ میں ڈال کر تھانہ کوٹھی باغ پہنچا دیا گیا جہاں پہلے ہی کئی طالب علم زخموں سے چور فوج کے نرغے میں تھے۔ جیپ سے گھسیٹ کر شمیم کو ایک بند کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ شمیم جب اس کمرے کے فرش پر ایک بے جان جانور کی طرح پڑا تھا تو پروفیسر حاجنی اس کی طرف لپکے، اور اس کا سر گود میں رکھ کہنے لگے:

"MY SON, OUR PROPHET HAS SUFFERED MORE THAN THIS"

احمد شمیم جب کبھی ان واقعات کا ذکر کرتا تو کئی گھنٹے تک وہ اس گفتگو میں محو رہتا۔ موت سے تقریباً ایک ماہ قبل اس نے مجھے تھانہ کوٹھی باغ میں قادر گا ہندربلی کے ہاتھوں ڈھائے جانے والے مظالم کی لرزہ خیز تفصیل سنائی اور مجھ سے وعدہ کیا کہ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۸ء تک کی تمام سرگزشت بالتفصیل بیان کرے گا۔ شمیم جیل سے نکلا تو اس نے اپنے والدین، بہن اور بھائی کو چھوڑ کر اپنے خوابوں کی سرزمین پاکستان کی راہ لی۔ پاکستان آنے تک اور یہاں آ کر اپنے خوابوں کے ریزہ ریزہ ہونے کی داستان اس نے اپنے افسانہ قصہ سیف الملوک میں بیان کی ہے۔ اس افسانے میں ہیں بدیع الجمال یعنی آزادی کی تلاش میں نکلا شہزادہ سیف الملوک بالآخر اس حالت میں دکھائی دیتا ہے "میں بدیع الجمال کی سنسنی خیز خبریں چھپوا کر روٹی کھاتا ہوں" ـــــ اس حالت کا شکار یہاں آنے والے بہت سے اہل کشمیر ہوئے لیکن احمد شمیم کا سب سے بڑا عذاب یہ تھا کہ ظاہری مفاہمت کے باوجود وہ اپنی داخلی کشمکش اور ضمیر کی کسک سے نجات نہ پا سکا۔ یہ کرب، یہ کسک اس کے یہاں مختلف صورتوں میں ابھرتی رہی۔ افسانوں میں یہ کسک "قصہ سیف الملوک" میں ڈھلی ہے تو غزل میں بھی اس کرب کا اظہار بڑی شدت سے ہوا ہے:

مجھے خریدا گیا جھوٹ بولنے کے لئے | مری سزا بھی وہی ہے، جو میرا پیشہ ہے
جو خبریں شام کو میں خود بنانے بیٹھا ہوں | سویرے ان پہ مجھی کو یقین کرنا ہے
مجھے تو سچ کی طرح جھوٹ بولنا ہے یہاں | عبث ہے کوئی اگر آئینہ دکھاتا ہے

پہلے تو عرصہ تک کشمیر کم از کم موضوعِ سخن تو رہا لیکن آہستہ آہستہ جب اس کا ذکر تک بھی فراموش کر دیا گیا، تو شمیم کا کرب اور بڑھا:

تیس برس سے ہجر کی چادر اوڑھ کے ایک سفر میں ہوں | چار قدم کا رستہ طے ہو، تو آئے میرا گھر بھی

شمیم کے یہاں احساس بڑی شدت سے کارفرما ہا کہ ہم سب جس راہ پر چل رہے ہیں۔ یہ حقیقی آزادی کی راہ نہیں۔ آزادی کی راہ لہو کی راہ ہے جس پر چلنے سے ہم سب گریزاں ہیں۔ ہمارے الفاظ عمل سے تہی ہونے کی وجہ سے کھوکھلے اور بے معنی ہیں۔ اسی احساس کی وجہ سے بے معنی اور کھوکھلے الفاظ کے لئے شمیم نے ان گنت امیجز استعمال کئے ہیں۔ وہ خود فریبی کے پردوں کو چاک کرتے ہوئے کہتا ہے:

علم کون اٹھائے
کہ ہاتھوں نے سوچوں کی زنجیر پہنی ہوئی ہے
کون میلوں سفر پہ نکلنے کو تیار ہے
کون ناپام کو چوم کر پابرہنہ سفر پہ نکلنے کو تیار ہے
کون تیار ہے تیاگنے کے لئے راحتیں
ماؤ کے سارے اقوال برحق سہی
کون تیار ہے (ہوا فاحشہ ہے)

بین الاقوامی تحریکوں کے مطالعے نے اس پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ انقلاب بندوق کی نالی سے جنم لیتا ہے۔ مذاکرات اور گفت و شنید سے نہیں، چنانچہ وہ یہی راہ اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے:

یہ سب لہو کی بوندیں
میں تیری تقدیر اور میری سزا
راستہ چننے کی گھڑی
راستہ تسلیم کرنے کی گھڑی

وہ لانگ مارچ کی راہ کو آزادی کی راہ تصور کرتا ہے:

سلائیوں میں پرو کے آنکھیں چلو
کہ ہم اپنا عکس ڈھونڈیں
عذاب کی رات لاش بن کر
ہماری دہلیز پر گری ہے (لانگ مارچ)

لیکن آہستہ آہستہ اس پر یہ احساس غالب آ گیا کہ ہم صرف باتیں کر سکتے ہیں عمل کی راہ پر دو قدم نہیں چل سکتے۔ اس اندوہگیں احساس کو اس نے بڑی شدت سے محسوس کیا، اور کئی طرح سے اس احساس کو زبان دی ہے:

تمام شہروں کو گدلے پانی کی سازشوں نے حصار میں لے رکھا ہے
کہیں تو وہ مردمی سے محروم شاہزادہ ملے

تو ہم اس کو یہ بتا دیں
کہ اب سریہ کی سلطنت گدلے پانیوں کا حصار ہے (لامعنی سفر کا مرثیہ)

مرے لہو میں مری ندامت
کہ شہر ماتم پہ خوف کی ریت گر رہی ہے
بدن کی بستی کو وسوسے چاٹنے لگے ہیں
تمام خوابوں کی کھڑکیوں سے
کٹے ہوئے جسم جھانکتے ہیں
سلگتی آنکھیں سپاٹ ماتھوں پہ جل رہی ہیں
ہم آنے والوں کے راستوں میں ہزیمتوں کی نشانیاں ہیں
ہزیمتوں سے سفر کا آغاز کرنے والو (اگر کہیں ہو)
سفر پہ نکلو
گواہیوں کی گرسنہ ساعت پکارتی ہے
بلند چوٹی سے آگ لے کر آنے والا پرومیتھیس
بیکراں سمندر کے سامنے
ریت پر پڑا ہے (اجنبی موسم میں ابابیل)

پابند سلاسل نہیں، رسوا نہیں کوئی — اس شہرِ ندامت میں تماشا نہیں کوئی
اے بچھڑے ہوئے شہر بہت یاد نہ آنا — غربت میں ترا درد سمجھتا نہیں کوئی

اب آہستہ آہستہ طویل کشمکش کے بعد اس پر حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ جس فضا میں وہ سانس لے رہا ہے وہ بانجھ ہو چکی ہے۔ یہاں صرف نفرتوں، تعصبات اور چھوٹے چھوٹے مفادات کی فصل ہی کاشت ہو سکتی ہے۔ اعلیٰ مقاصد کی فصل کو بار آور کرنے کے لئے یہ دھرتی بنجر ہو چکی ہے۔ اپنے دھرتی کے بنجر پن کا یہ احساس اس کے یہاں عدم تحفظ کے تصور کی صورت میں بھی اگتا دکھائی دیتا ہے:

بانجھ دھرتی جہاں حرف تخلیق بھی جرم ہے
جس میں جینا عبث، جس میں مرنا عبث
ہر طرف ادھ کٹے پہاڑوں کے ننگے بدن
اور بونوں کی جادوگری ہے

بونوں کی اس بستی کا ایک منظر اس کے ایک ڈرامے میں یوں ابھرتا ہے "ٹاپو میں کوئی درخت نہیں بس ننگی چٹانیں اور ہر طرف ویرانی ہے" یہاں بدیع الجمال کے متلاشی سیف الملوک کا دم گھٹنے لگتا ہے تو اس کے لبوں پر یہ صدا آتی ہے:

ہم بھٹکتے ہیں خلاؤں میں صدا کی صورت — کون سنتا ہے ہمیں حرفِ دعا کی صورت
نہ کوئی خواب، نہ خواہش، نہ تمنا کوئی — دل بھی اک عمر سے ہے دستِ گدا کی صورت
دشتِ جاں پر کسی آواز کا سایہ بھی نہیں — دل کٹا خیمہ گہہِ دشتِ وفا کی صورت

لفظ معنی سے تہی اور عبارت جھوٹی
جیسے صحراؤں میں نقشِ کفِ پا کی صورت

خلاؤں میں بھٹکنے کے اس احساس نے اس کے اندر اپنی دھرتی سے بچھڑ جانے کا کرب بہت گہرا کر دیا۔ وہ خلا، وہ گھاؤ، جو وہ عرصہ سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا پچھلے چند برسوں میں گہرے کچوکے اور دکھ اٹھانے کی وجہ سے بہت نمایاں صورت اختیار کر گیا۔ اپنی سرزمین کے دو ٹکڑوں میں بٹ جانے، عزیزوں اور دوستوں سے بچھڑ جانے کا المیہ اس کے یہاں بار بار جھب دکھانے لگا:

ہم کہ دو زمانوں
دو خداؤں میں بٹ گئے ہیں
کبھی جو چہرہ پہن کے نکلے تھے اپنے گھر سے
راستے کے غبار میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا ہے
دو پلوں کی مسافت میں ہم
اجنبی خیمہ گاہوں میں ٹوٹی ہوئی سانس کو
دوسروں کی طنابوں سے باندھا کریں۔

دو زمانوں اور دو خداؤں میں بٹ جانے کا یہ احساس نظم اور غزل کے علاوہ اس کے ڈراموں میں بھی در آیا۔ ریڈیائی ڈراموں میں "لمحہ ابد لمحہ"، "لمحہ جو ابد نہیں" اور ٹی وی ڈرامے "انکشاف" میں یہ دکھ بالکل نمایاں ہے۔ "لمحہ ابد لمحہ" اور "لمحہ ابد نہیں" دراصل اس کی اپنی آپ بیتی ہے۔ اس ڈرامے میں وہ اپنی ممی کو خود سے پیار کرتے دیکھتا ہے۔ سراپا انتظار ماں یہ کہتی ہے:

"اور وہی لمبے لمبے بال، لمبا تیکھا ناک، گہری شربتی بھوری آنکھیں اور پتلی پتلی بھنویں وہی ہو گا۔"

ماں یہ بھی سوچتی ہے

"نہ جانے کیوں وہ کانچ کے کھلونوں کی طرح چورہ چورہ ہو کر بکھر گیا ہے۔"

"ریت پہ سفر" کا لمحہ میں بھی اس نے اپنی جوانی، اور رعنائی کا ذکر کرتے ہوئے ماں سے یہ کہا ہے:

ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو تتلیوں کے، جگنوؤں کے دیس جانا ہے

لیکن یہ تتلیوں اور جگنوؤں کا دیس، جب اسے اپنے خوابوں کا دیس نظر نہیں آتا، تو وہ یہ کہتا ہے:

ہر انساں پتھر جیسے، ہر ایک نگر صحرا جیسے
گویا میں نے بھول میں اپنایا ہو یہ رستہ جیسے

زندگی بھر کے لئے تہمتِ یک خواب بہت
خواہشِ آب بہت، کاسۂ گرداب بہت

اب تو اک زخم لگے، آرزوئے صبحِ گلاب
بھر گئے ریت سے اس سال بھی تالاب بہت

صرف آنکھوں سے ابھرتا ہوا سیلاب نہ دیکھ
بستیاں خواب کی سوئی ہیں تہہ آب بہت

اپنی مٹی سے بچھڑنا تو نہ تھی وجہِ ملال
دل کی بربادی کے تھے اور بھی اسباب بہت

میں نے اپنا نام چنا تھا موسم کی پیشانی سے
اب تو ہوا کی مٹھی میں ہوں اک سوکھا پتا جیسے

شہرِ شکستہ شکل سے جانے کو جی کرے
اک یاد ہے جو اب بھی عناں گیر سی لگے

بہتے دریا کا سفر میرے مقدر میں نہیں
میں تو پانی میں پڑا رہتا ہوں پتھر کی طرح

میری آنکھوں سے مگر رونقِ بازار نہ دیکھ — شہر ویراں تجھے آئے گا نظر گھر کی طرح
عمر گذری ہے کہ ہم گھر سے نکل آئے ہیں — ذہن میں تازہ ہے یہ بات مگر کل کی طرح

دو میل پر دریائے جہلم کے کنارے کھڑے اسے ان گنت گنے لمحوں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ ان گذرے لمحوں کی چاپ "دریا بتلا رہا ہے" میں یوں سنائی دیتی ہے:

"ابھی ابھی جو موج گذری ہے، وہ میرے مکان کا نقشہ لیے میرے سامنے اُبھری ہے، اور میرا سارا من اتھل پتھل ہوا ہے، کیا معلوم اس موج میں میری بہن کی محبت کی خوشبو ہو، کوئی خوشبو کو قید کر سکتا ہے۔"

تو غزل میں انہی لمحوں کی چاپ یوں پرتوفگن ہے:

شاید میرے گھر کی دیواروں کو چھو کر آیا ہے — اک مانوس مہک سی آتی ہے دریا کے پانی سے
پانی کی خوشبو سب پرانے موسم یاد دلاتی ہے — میرے بچھڑے گھر کو چھو کر آیا ہو دریا جیسے

اس کی نظموں میں بھی دریائے جہلم سے گفتگو کا پہلو نمایاں ہے:

ہر روز دریا
میرے گھر کا عکس اُٹھائے
میرے دروازے پر آکر رک جاتا ہے
اونچے پیڑوں کی شاخوں سے جب شام اُترے
میں تجھ سے باتیں کروں
پاس بہتے ہوئے دریا کی طرح
بے انت دریا میں گرتا رہوں اور مرتا رہوں

دیا اس کے یہاں اس طرح یادوں کے عذاب کی گٹھڑی اُٹھائے آتا ہے جیسے اس کے خیالوں میں اپنی ماں اور بہن کا سراپا اُبھرتا ہے:

ماں ____

کہ میرا لختِ جگر
تمنا کی شہ نشیں کا چراغِ روشن
نہ جانے کس طاق پر
ہوائے غمِ زمانہ کی سرد مہری کا نوحہ خواں ہے

بہن ____

وہاں بہت دور چاند کی وادیٔ حسیں میں
ہمارے بھیا نہ جانے کن اجنبی خیالوں میں کھو گئے ہیں
نہ جانے کس اجنبی گلستاں کی تازہ و نوشگفتہ کلیاں
دیارِ بے نام کی بہار آفریں و شاداب وادیوں میں
ہمارے بھیا کو لے گئی ہیں

(گھر کا رستہ بھول گیا)

"گھر کا رستہ بھول گیا" منظوم کھیل میں اس کا یہ خلاء اور گھاؤ، بچھڑنے والوں کی یادوں کا بلاوا بہت جانکاہ ہے لیکن یہ جاں ستاں کیفیت اس کے یہاں سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد زیادہ گمبھیر ہو گئی۔

سقوطِ ڈھاکہ کے دن اسے ہارٹ اٹیک ہوا۔ اس سے قبل دوسری نگر جیل سے ہی دمہ کا مریض تھا۔ بعد میں وہ السر اور ٹی۔بی کے مراحل سے بھی گذرا لیکن اسے سقوطِ مشرقی پاکستان اپنے خوابوں کے دھڑام سے گرنے کی اولین منزل نظر آئی۔ اس قومی سانحہ کے بعد آہستہ آہستہ اسے جن حالات سے گذرنا پڑا، ان کی وجہ سے اس کی دل گرفتگی بڑھتی گئی۔ اب اسے میر واعظ یوسف شاہ صاحب کی محبت اور شفقت بھی حاصل نہ رہی تھی جو پردیس کے صحرا پر ایک بادل کی طرح سایہ فگنی رہی۔ پہلی بار جب اسے ریڈیو کی ملازمت سے الگ کیا گیا تو میر واعظ صاحب کی بدولت اسے محکمۂ اطلاعات میں ملازمت ملی لیکن گذشتہ دو تین برسوں میں عدم تحفظ کا احساس بڑا شدید ہو گیا اور ماضی کی یادیں اور مراجعت کی خواہش اس کے یہاں بار بار ابھرنے لگی۔ چنانچہ اس نے گذشتہ سال "سفر سے واپسی کی خواہش" نظم لکھی جس میں اس نے اپنی کہانی کو پوری طرح سمو دیا۔

یہی نگر تھا ہماری آنکھوں ہمارے دل میں
اسی نگر کی سہانی خوشبو ہوا کی چادر میں رچ گئی تھی
اسی نگر کے تمام جادو ہمارے لفظوں میں بولتے تھے
ہرے دنوں کی صدا پر اپنے گھر سے نکلے
پرانی یادوں کا سر برہنہ جلوس
میلے لباس کا سا بدن سے اترا
ازل صفت ماماتا کے آنگن کی سر برہنہ پکار
گذری ہوئی حکایتیں
سب بچھڑنے والوں کو سونپ دی تھیں
بچھڑنے والے امانتوں کے عذاب میں تھے
بچھڑنے والوں کی واپسی کے سراب میں تھے
بچھڑنے والو!
مری صدا شہر سبز پرچم سے جب بھی سننا
ازل صفت ماماتا سے کہنا
کہ میرے کمرے میں میرے کپڑوں سے گرد جھاڑے
میری کتابوں میں میرے ہاتھوں کے نقش ڈھونڈے
خموش آنگن میں اُگتے پیڑوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر پکارے
کہ آؤ، اب شام ہو گئی ہے

دوریوں کی یہ صدا، اس کے فن کا ایک جزو لاینفک ہمیشہ رہی، لیکن اب یہ صدا، زیادہ دلفگار تھی۔ گذشتہ پینتیس برس سے بچھڑے ہوئے خانوادوں پر دوریوں کا عذاب جس طرح سے مسلط ہے اس سے ہر کشمیری واقف ہے۔ رانا فضل حسین نے ان دوریوں کو ان الفاظ

کا روپ دیا ہے:

ان حشر برو بر پاڑاں ناکاۓ ملن کی ٹاکی لگے نہ

(ان حشر برابر دوریوں کو ملنے کا کوئی پیوند نہیں لگ رہا)

لیکن احمد شمیم پر ایک اور حقیقت بھی منکشف ہونے لگی، اس حقیقت کو اس نے اپنے کشمیری کلام میں ان الفاظ میں اجاگر کیا:

احمد شمیم چون وطن لک اتھن تنز

دچھ ٹیٹوالک حال، دچھ پانژال ونے کیا

(اے احمد شمیم تمہارے وطن پر لوگوں کے ہاتھوں کیا بیتی، ٹیٹوال کا حال دیکھ، پیر پنجال کو دیکھ میں تجھے کیا بتاؤں)

یہ وہ تلخ حقیقت تھی، جسے منٹو نے "ٹیٹوال کا کتا" میں پیش کیا تھا۔

احمد شمیم کو یہ شعور اس وقت حاصل ہوا، جب انسان ضروریاتِ زندگی میں اتنا دھنس چکا ہوتا ہے کہ آگے قدم بڑھانا مشکل نظر آتا ہے۔ احمد شمیم کو اہل کشمیر کا نصف صدی کا سفر ریت کا سفر نظر آتا ہے، جس پر کوئی نقش پا تک باقی نہیں رہتا۔ اس کی خواہش یہ تھی کہ وہ گذشتہ پچاس برس کی جدوجہد آزادی کا جدلیاتی تجزیہ سوڈیڑھ سو صفحات کی کتاب میں انگریزی زبان میں پیش کرے۔ وہ کئی برس سے یہ منصوبہ بنا رہا تھا۔ کئی بار ہم دونوں نے مل کر اس بارے میں سوچا۔ بالآخر ہماری سمجھ میں یہی بات آئی کہ کسی انقلابی فکر کے بغیر کوئی آزادی کی تحریک آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یہ منصوبہ اس کے کئی دیگر منصوبوں کی طرح تشنۂ تعبیر ہی رہا۔ اس سے قبل اس نے کشمیری ادب کی تاریخ لکھنے کا پروگرام طاؤس بانہالی سے مل کر بھی بنایا لیکن اس کی روایتی سہل انگاری کی وجہ سے یہ دونوں منصوبے پورے نہ ہو سکے۔

احمد شمیم اب "بکرا ازم" اور "شیرا ازم" کی دلدل سے بھی نکل چکا تھا۔ بین الاقوامی سطح پر بھی اس کے خواب بکھر چکے تھے۔ بیروت میں بیتنے والی قیامت نے اسے دونوں قوتوں کے استعماری عزائم سے باخبر کر دیا تھا۔ وہ سخت دل گرفتہ تھا۔ اس دل گرفتگی کا اظہار اس نے اپنی نظم "موت سے پہلے اپنا نوحہ" میں کیا، لیکن اس مایوسی اور دل گرفتگی کے باوجود اس نے دعا مانگی:

خدا رحمان اور بخشنے والا ہے

شاید ہم کو گیلی ریت کے ماتھے پر لکھے لفظ کو

پڑھنے کی توفیق دے

کشمیر کی نئی نسل کے سامنے منزل واضح ہے، اس لئے شاید وہ اس تحریر کو پڑھ سکے جسے احمد شمیم کے دور کی نسل نہ پڑھ سکی اور زندگی بھر عذاب میں مبتلا رہی۔ لیکن اس نئی نسل کی راہ میں وہی سب سے بڑی حائل دیوار ہے۔

اجنبی موسم میں ابابیل

رسول طاؤس

عمر گزری ہے کہ ہم گھر سے نکل آئے ہیں
ذہن میں تازہ ہے یہ بات مگر کل کی طرح

یہ شعر احمد شمیم نے ۱۲ مارچ ۱۹۸۲ء کو آزاد کشمیر ریڈیو تراڑکھل کے سٹوڈیو میں پڑھا تھا۔ آپ پوچھیں گے کہ اس طرح کے سینکڑوں شعر احمد شمیم نے سٹوڈیو میں پڑھے ہوں گے، پھر اس میں کیا خصوصیت ہے اور میں یہی خصوصیت آپ سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

اُس روز شمیم نے پہلی بار سٹوڈیوز میں یا کسی ادبی محفل میں اس تواتر کے ساتھ موت کا، بچھڑنے والوں کا، یادوں کے آشوب کا اور خود مرجانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کشمیر کے پس منظر میں لکھے گئے کہانیوں کے مجموعے پر گفتگو کے دوران ہم سب لوگ ـــــ یعنی احمد شمیم، ڈاکٹر غلام حسین اظہر، طاؤس اور کہکشاں ملک ـــــ ٹھٹھک کر رہ گئے تھے، احمد شمیم نے کہا تھا کہ پینتیس سال سے ہجرت کا عذاب سہنے والے ہم یادوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگ مر کیوں نہیں جاتے۔ پھر ایک دم قنوطیت کا یہ چولا بدل کر وہ اپنے روزمرہ کے رجائی لباس میں افسانوی تنقید پر اُتر آئے اور کہنے لگے کہ ہماری بہن کہکشاں ملک یادوں کی گٹھڑی سر پر اُٹھائے ہم سے آگے نکل گئی ہیں۔ وہ مستقبل کے بچوں کے لئے کشمیر کے ماضی کو قلمبند کر کے سبکدوش ہو گئی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس ادبی گفتگو کی ریکارڈنگ سے فارغ ہونے کے بعد احمد شمیم نے وہ مضمون میرے حوالے کیا جو اسے تین دن بعد ریڈیو پر ہی میری کتاب کی تعارفی تقریب میں پڑھنا تھا۔ کہنے لگے۔ پرسوں کوئی اہم سرکاری میٹنگ ہے اور مجھے بسلسلۂ چاکری بہرحال وہاں موجود رہنا ہوگا۔ تم یہ مضمون کسی سے پڑھوا لینا۔ میں مضمون لے کر خاموش ہو گیا۔ شمیم نے ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی ـــــ وہ بہت ندامت محسوس کر رہا تھا۔ کہنے لگا "یار میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح پہنچ ہی جاؤں۔" اور اُس روز یعنی ۱۶ مارچ کو وہ آخری وقت پر سٹیشن پہنچ گیا اور آتے ہی اپنا مضمون پڑھنا شروع کیا۔ عنوان تھا "اجنبی موسم میں ابابیل"۔ شمیم نے لکھا تھا:

"موت شیر ہے مورکھ بھاگ کے کہاں جائے گا"

یہ شیخ نورالدین ولی سے میرا پہلا تعارف تھا ـــــ ایک ازلی اور ابدی حقیقت ـــــ موت کے حوالے سے۔ پھر یوں ہوا کہ میں اپنی جان بچانے کے لئے گھر سے بھاگ نکلا ـــــ اُسی زمانے میں ایک اور مورکھ اپنے آپ سے بھاگنے کی دھن میں گھر سے چلا۔ نام اُس مورکھ کا غلام رسول تھا لیکن جب مجھ سے ملا تو طاؤس ہو چکا تھا۔ میں نے پوچھا "کون ہو تم؟"

کہنے لگا "پتہ نہیں فی الحال بھگوڑا ہوں۔"

میں نے کہا "لاؤ ہاتھ، میں بھی بھگوڑا ہوں۔"

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

پھر گزرتی رہی ہر چند کہ خوب نہ گزری۔ ایک دن جو میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ طاؤس میرے سرہانے ندامت کی تصویر اور پچھتاوے کا پیکر بنا ایک کتاب لئے کھڑا ہے۔

"کیا زندہ رہنا کافی ندامت کا کام نہیں جو تو نے اُس پر کتاب کے بوجھ کا اضافہ کیا ہے؟"

"سائیں بس ہو گئی"۔ اُس نے اپنے بے ارادہ گناہ کا اعتراف کیا۔

اب آپ لوگوں کے سامنے میں جو یہ بے تکی باتیں کر رہا ہوں، دراصل وہ باتیں نہیں جو پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے کرنی چاہئیں مثلاً یہی بات کہ: "اے بھائی طاؤس، کیا اس صدی کا بوجھ کچھ کم ہے جو تو نے اس پر گزشتہ سات صدیوں کے بوجھ کا اضافہ ضروری سمجھا۔" میں آپ کو ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کے حوالے سے ہم پر یہ بات کھل جائے کہ موت ابدی حقیقت ہے اس لئے ہمیں اپنی زندگی کو کوئی معنی پہنانے چاہئیں۔ گرو دیو ساز تر بھی یہی کہتا تھا۔ اب معنی پہنانے کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے گل کو درست کیجئے اور بھوکوں مریئے ۔۔ دوسرے یہ کہ ایک عالی شان کوٹھی۔ کار۔ ایک آرام دہ زندگی کا طریقہ سیکھ لیجئے۔"

احمد شمیم کے مضمون سے یہ طویل اقتباس نقل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ لہجے کی تلخی، تلون اور کرب کے باوجود اُس اپنائیت سے آگاہ ہوں جو اس تحریر کے ہر جملے سے ٹپکتی ہے۔۔۔ لیکن جس شمیم کو میں نے پینتیس سال پہلے دیکھا تھا، وہ بہت مختلف تھا۔ ہوٹلوں میں شب بسری کرنے والا یہ خوبصورت نوجوان اپنے ہمعصر ادیبوں اور شاعروں میں سب سے زیادہ ذہین، پڑھا لکھا، پرلے درجے کا لاابالی اور منہ پھٹ تھا۔۔۔ میری اور اُس کی عمر میں پانچ چھ سال کا فرق تھا۔۔ میں کشمیر کے ایک ہائی سکول سے بھاگا ہوا ایک دیہاتی لڑکا اور وہ ایس پی کالج کا سٹوڈنٹ لیڈر۔۔ ترقی پسند شاعر، براڈ کاسٹر اور نہ جانے کیا کیا۔۔۔ لیکن چند مہینوں میں ہم ایسے گھل مل گئے کہ بقول یار لوگوں کے میں کشمیر کے اس مرزا سودا کا غنچہ بن کر رہ گیا۔ یوں شمیم کے ہوٹل والے کمرے میں روزانہ حاضری دینا اور کوئی نئی کتاب یا رسالہ معہ ہدایات لے کر واپس جانا میرا روز کا معمول بن گیا۔۔ شمیم کے کمرے میں کتابوں اور رسالوں کے علاوہ ایک نوخیز لڑکا بھی ہوتا تھا۔۔ جس کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اختر شیرانی کی شاعری والا "ننھا قاصد" تھا۔۔۔ پھر مجھے کچھ نیم سیاسی نیم جذباتی نوعیت کے ایک کام کی وجہ سے سٹیشن چھوڑ کر جانا پڑا تو واپسی پر معلوم ہوا کہ احمد شمیم کو ترقی پسندی کے جرم میں ریڈیو کی نوکری سے برطرف کیا گیا ہے اور حکومت آزاد کشمیر کے عبوری نگراں میر واعظ مولینا محمد یوسف شاہ صاحب کی ذاتی یقین دہانی پر احمد شمیم آزاد کشمیر کے محکمۂ اطلاعات میں ملازم ہو گیا ہے۔ کچھ برس بعد شمیم پر ریڈیو کے دروازے دوبارہ کھل گئے اور ہم دونوں نے سن ساٹھ کی دہائی کے دوران ریڈیو کے لئے مل کر پروگرام لکھے اور نشر کئے۔ لیکن سن ستر کے آتے آتے ہماری عینیت پرستی خاصی کمزور ہو چلی تھی دسمبر ۸۱ء میں شمیم پر دل کا دورہ پڑا اور اسی دہائی میں ملازمت کی ترقی، اور تنزل دونوں اُس کے لئے وبال جان ثابت ہوئے۔ سن اسی کی دہائی کے آتے آتے ہم دونوں کو خاصا صبر آ چکا تھا اور شب ہجراں میں وہ اگلی سی درازی نہیں رہی تھی۔

کبھی شمیم کے گھر تفصیلی ملاقات ہوتی تو عمر گزشتہ کی راکھ میں چنگاریاں تلاش کرنے بیٹھ جاتے۔ "یار طاؤس وہ کشمیری ادب والی مختصر تاریخ ہم اب لکھ ہی ڈالیں۔ وغیرہ وغیرہ"۔ لیکن ہم جانتے تھے کہ غم دوراں کے علاوہ ہماری جسمانی صحت اور دوسرے عوامل ہماری جوانی کے منصوبوں کے لئے موافق نہیں ہیں۔

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ ہم دونوں میں بڑی تلخ کلامی ہوئی۔۔۔ میں نے اسے دوغلا، رجعت پسند اور نہ جانے کیا کچھ کہا۔۔۔ آپ شاید اندازہ نہ کر سکیں کہ ایک ایسے شخص پر میرے اس غیر متوقع رویے سے کیا بیتی ہو گی، جو مجھے نہ صرف اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا تھا

بلکہ جس نے مجھے داغ کی غزل اور اختری بائی کی ٹھمری سے نکال کر ترقی پسند ادب کی راہ پر ڈالا تھا۔

یہ اگست تیسری تاریخ تھی میں اس دکھ کی وجہ سے دوسرے روز دفتر بھی نہ آسکا۔ اگلے روز (۷، اگست ۱۹۸۲ء) دفتر آیا تو شمیم کا ٹیلیفون آیا ــــ پھر کچھ تلخ کلامی ہوئی۔ اور میں نے ٹیلیفون بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد ہمارے ایک دوست کے کمرے میں فون آیا جسے فون پر تلخ کلامی کا علم ہو چکا تھا۔ مجھے بلوایا گیا اور اُنھوں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے کہا۔ ــ انسانوں کی طرح کی بات کرنا۔ شمیم نے پھر فون کیا ہے ــــ میں نے مؤدب (رسمی) لہجے میں 'جی' کہا تو دوسری طرف سے اُسی ازلی ابدی آوارہ گرد بنجارے کی آواز آئی ــــ "حرامزادے، طاؤس، میں پرسوں تمہارے دفتر آکر سارا دن تمہارے ساتھ باتیں کروں گا ــــ پھر لہجہ دھیما پڑ گیا۔ ــ "بات یہ ہے مولوی طاؤس کہ تمہاری دوستی کے بغیر بھی انسان زندہ رہ سکتا ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ایک تو اذیت سہنے کا حوصلہ نہیں اور دوسرے زندگی اتنی تھوڑی رہ گئی ہے کہ نئے دوست تلاش نہیں کئے جا سکتے ــــ سُن رہے ہو؟"

میری آواز بھرا گئی ــــ یہ جمعرات کا دن تھا۔ ہفتے کو شدید بارش ہو رہی تھی۔ میں بھیگتا بھاگتا دفتر پہنچا کہ وہ آچکا ہوگا ــــ ڈیوٹی روم جا کر دریافت کیا تو وہی مشترک دوست بولے بیٹھ جاؤ۔ پھر اُنھوں نے مجھے آہستہ آہستہ یہ خبر سنائی کہ "دُنیا فانی ہے۔ ہم سب مر جائیں گے اور آج صبح احمد شمیم کا انتقال ہو گیا ــــ"

اور وہ باتیں جو ہم دونوں کرنے والے تھے اب مجھے تنہا کرنی ہوں گی ــــ یا شاید تنہا بھی نہ کر سکوں کیونکہ ہماری باتیں کشمیری شاعری کے گرد گھومتی تھیں اور اس موضوع پر احمد شمیم جیسی تنقیدی بصیرت اور تجزیاتی ذہن رکھنے والا کوئی اور کشمیری بھائی میرا واقف نہیں؛

توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

(حلقہ ارباب غالب راولپنڈی اسلام آباد میں پڑھا گیا)

حسن عباس رضا

ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو

وہ اک بے درد لمحہ تھا
جو تم سے سانس لینے کی ہر اک مہلت
نہ جانے کس سمندر میں ڈبو آیا!
ابھی تم کو بہت جینا تھا
اُجلے منظروں کو دیکھنے کی چاہ میں
اِس زندگی کی راہ میں —
— اس راہ پر جب بھی تمھیں
کشمیر میں بیتے زمانے یاد آتے تھے، تو
تم روتے تھے
آنکھوں میں سسکتی سسکیاں
ہونٹوں میں دب کر ٹوٹ جاتی تھیں
تو، تم بے ساختہ کہتے
کہ "امی تتلیوں کے پَر بہت ہی خوبصورت ہیں
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو تتلیوں کے، جگنوؤں کے
دیس جانا ہے —
ہمیں رنگوں کے جگنو،
روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو"

مگر ماتھے پہ بوسہ ثبت کرنے والی مائیں تو
بہت پہلے ہی مر جاتی ہیں
(بوسے کی تمنا خواب ہو جاتی ہے)
لیکن آنکھ کی شمعیں نہیں بُجھتیں

تمھیں اُن جگنوؤں نے
روشنی کی تتلیوں نے کیا صدا دی تھی
کہ اِس سُرعت سے تم اپنے
رفیقوں، بیٹیوں، بیٹے کو روتا، اور سسکتا چھوڑ کر
اُن منزلوں کو چل دیے
جن سے کوئی واپس نہیں آیا —
مبیّنہ اب کسے آواز دے گی
کِس سے پوچھے گی
مرا شاعر کہاں ہے؟؟

سنو احمد شمیم!
اِک عمر تم کو اپنے ماتھے پر کسی بوسے کی خواہش تھی
اُس اِک بوسے کی خواہش نے
تمھاری زندگی کا قطرہ قطرہ نوش کر ڈالا
تمھیں ویران کر ڈالا
مگر وہ پیار بوسہ، جو ابھی تم نے
وداعی گیت کے جُھرمٹ میں
اپنی بیٹیوں کی چاند سی پیشانیوں پر ثبت کرنا تھا
کہاں ہے!؟
بیٹیاں اُس پیار بوسے کو
کہاں ڈھونڈیں!
تمھی کہہ دو!
کہو نا — اب انھیں ماتھے پہ بوسہ کون دے گا
کون دے گا!؟

حمید بیورش

احمد شمیم

(رفافنوں کی مختصر ساعتوں میں سمیٹے ہوئے تاثرات)

وہ شہر جہاں انسان اکیلا ڈرتا ہو
اِک نگری جس پہ دشت گمان گزرتا ہو
وہ رستے جن پر جس جانب بھی جا نکلو
بے چہرگیوں کا کرب تعاقب کرتا ہو

اِک جسم کہ جس میں محرومی کا ہو کینسر
وہ ایک مسافر — کوسوں دُور ہو جس کا گھر
جو رُوح کے جگنو، جھیلیں، خُوشبو، بوسے، رنگ
راہوں میں کہیں کھو آیا ہو دورانِ سفر

اُس خاموشی کے مقفل میں جو کوئی چپکے سے
پاس آئے — اِتنا پاس کہ حیرت ہونے لگے
اور پھر وہ کہے "دیکھو، میں تمھیں پہچانتا ہوں!"
پھر اُٹھتے ہی جائیں اجنبیت کے سب پردے!

اک سحر تھا! — دل چاہا کچھ دیر یہ سحر رہے
حسرت تھی — وہ میرا کرب سُنے، اور اپنی کہے
لمحوں سے تقاضا ایک خفیف توقّف کا
چاہا، کہ ابھی تو نہ وقت کی ریت مزید بہے

اس شخص سے مل کر ایسا ہی کچھ احساس ہُوا
اک پیار سمندروں ڈوہنگا تھا، وہ دل دریا
وہ جگنو، تتلی، خوشبو، رنگ کا سوداگر
جو جھیل کنارے بوسے بانٹتا پھرتا تھا!

لیکن — جو پلٹ کر دیکھا — وہ موجود نہ تھا
یہ وار بڑا سنگین رہا، — اے دستِ قضا!

بشیر سرتاج

بیادِ احمد شمیم

یہیں ہوگا کہیں — وہ قافلہ سالار ڈھونڈو تو!
ہمالہ کی بلندی سے
ابھی کل رات ہی اس کو
اُترتے میں نے دیکھا ہے
اُسے ڈھونڈو بسنتی زعفراں زاروں کے گوشوں میں
وُلر کی وسعتوں میں
ڈل کی لہروں میں
توی کے مست دھاروں میں
اسے ڈھونڈو
چناب و نیلم و جہلم کے بانکے آبشاروں میں
اگر سرحد سے تھوڑی دُور جھانکو گے تو دیکھو گے
اُسی مردِ قلندر کے الاؤ ہیں جو جلتے ہیں
اِدھر خیبر سے کیماڑی تلک کے چپّے چپّے سے
خراج اُس کو ادا روشن ضمیر انسان کرتے ہیں
سرِ صحرا منوں ریت اُس کی آنکھوں میں سمائی تھی
تھکن سے چُور تھا، لیکن ہمیشہ مسکراتا تھا
حوادث کے مقابل، نانگا پربت تھا، ہمالہ تھا
تھکے ہارے ہوئے انسان کی ہمت بڑھاتا تھا
یہی تھا عزم، چاند آنگن میں اُترے گا تو سوئیں گے
شبستانوں میں رنگ و نُور بکھرے گا تو سوئیں گے
تھکن آخر تھکن ہے، وہ تو صدیوں کا مسافر تھا
چناروں کی گھنی چھاؤں تلے ستا رہا ہوگا
اگر مِل جائے، کہنا، یار! ایسی بے رُخی بھی کیا؟
لیے آنکھوں میں آنسو، گُل بداماں یاد کرتے ہیں
تجھے سندھ اور راوی کے نگہباں یاد کرتے ہیں

جاوید انور

نوحہ — احمد شمیم کا

گزرتے لمحوں کی کہکشاں میں
جو اپنی آنکھوں کے چور رستوں سے ایک ہی رنگ دیکھتا تھا
وہ مٹتے رنگوں میں سو چکا ہے!
کنوارے رستوں پہ چلنے والا
کہ تتلیوں اور جگنوؤں کی تلاش میں تھا
خمارِ عہدِ گداز بھی ساتھ لے گیا ہے!
نہ اب سرِ پیہ کی سلطنت ہے نہ کوئی احمد شمیم ہے اب
ہوائے شہرِ فراق
اب تیری دستکیں کس کے واسطے ہیں؟
کہ زرد مٹی کی نبض پر جس کا ہاتھ تھا
اس کا گھر ادھوری شبوں، ہشیتوں میں پھیلے نامرد سورجوں کی پہنچ
سے باہر ہے

تُو بھی سو جا!
ہوائے شہرِ فراق سو جا!!

جاوید انور

احمد شمیم کی نذر

○

کوئی فصیل اُٹھانا، پھر اُس میں در رکھنا
بڑا عذاب ہُوا خواہشِ سفر رکھنا

حقوق ضبط ہوئے سب بحقِ عدل ہوا
کھُلی فضاؤں میں رہنا، نہ بال و پر رکھنا

گھنی ہے شب تو ستاروں کو دیکھ کر چلنا
سحر کا خواب بہر حال معتبر رکھنا

نصیب جاگے تو اُن کے جو سو رہے ہیں ابھی
ہُنر ہُوا ہے یہاں دستِ بے ہنر رکھنا

نگر میں آ کے پرندے نہ بے نگر ٹھہریں
مکاں بنانا تو آنگن میں اِک شجر رکھنا

ہوا کا حرف مقدّم سہی مگر جاوید
"کوئی چراغ تو دیوارِ شہر پر رکھنا"[۱]

[۱] احمد شمیم

احمد لطیف

مجھے ماتھے پہ بوسہ دو

چلو کچھ دیر سو جائیں
کہ میری ماں کی آنکھوں نے
دریچے پر ہی مجھ کو روک لینا ہے
مگر وہ تیرے سنگ اُڑنے کی الھڑ خواہشیں
پہلو بدلتی ہیں
تتلی آنکھ ملتی ہیں — مچلتی ہیں
"کہ ہم کو تتلیوں کے جگنوؤں کے دیس جانا ہے°"
مگر رستے میں تیرے نقشِ پا کی تھرتھراتی لو
مجھے چلنے نہیں دیتی
مرا پنڈا لرزتا ہے
کہ یہ تُو سو نہ جائے
پھر مجھے "ماتھے پہ بوسہ دو" — !
"مجھے ماتھے پہ بوسہ دو" —!!

° احمد شمیم

نوید جمیل

ایک خوبصورت شخص کا نوحہ

وہ کتنا خوبصورت تھا
جسے رنگوں کے جگنو، روشنی کی تتلیاں آواز دیتی تھیں
جو آخر اپنی ماں کا آخری بوسہ
سجا کر اپنے ماتھے پر
اُڑا اور تتلیوں کے جگنوؤں کے دیس جا پہنچا

اور اب میں انتظارِ شام کرتا ہوں
کہ جب سارے پرندے لوٹ کر میری طرف آئیں
تو میں پیارے پرندوں کے پَروں پر
خوبصورت شخص کی لکھی ہوئی
ساری ہی نظمیں
دُور کی جھیلوں میں بسنے والے لوگوں کو سُنا آؤں
مگر ہر شام جب زخمی پرندے میرے آنگن میں اُترتے ہیں
تو وہ روتے ہوئے کہتے ہیں -
پگلے !
کون لکھے گا
ہمارے پنکھ پر نظمیں
تمہارے واسطے
اب کون لکھے گا !
بتا
اب کون لکھے گا ؟ !

سحر صدیقی

سبز سایہ

(احمد شمیم کی یاد میں)

اُداس شاخوں پہ برف افسوس کی کہانی سنا رہی ہے
ملول لفظوں کی معنویت سفید چادر میں چھپ گئی ہے
بہار لمحوں پہ تیرے دُکھ کے تمام موسم زوال ساعت سے لڑ رہے ہیں
قرار رنگوں کو تتلیوں کے پروں پہ تیری محبتوں کی کہانیاں ہیں
اُفق کے ہونٹوں پہ تیری اُنگلی کا سبز سایہ ٹھہر گیا ہے
جو تُو نے سوچا :
وہ اب صدا کے سمندروں میں امر جہازوں کا راستہ ہے
جو تُو نے لکھا ؛
وہ تیز بارش میں قطرہ قطرہ اُترتی حیرت کا معجزہ ہے
وہ آگہی کی طلب میں ہجرت کا حوصلہ بھی بنا رہے گا

صفدر صدیق رضی

احمد شمیم کے لیے

اک قلم
تتلیوں، جگنوؤں اور پھولوں کی آغوش میں
روشنی رنگ مہکار کا سحر
تاریکیوں نفرتوں سازشوں کے حصاروں میں
پھیلا رہا تھا
بدن جس کا
اپنے معاصر کے اشغال کی گرد سے
چند لمحوں کو میلا رہا تھا
وہی عطر بیز اور اُجلا بدن
کیوں ہر اک مہرباں کی نظر کا ہدف ہے
ہمیں باعثِ فخر و عزّ و شرف ہے !

قتیل شفائی

○

یارب ساری جھیلوں کو آئینہ کر دے
یا پھر چاند ستاروں کو نابینا کر دے

بے حس ہے ان ٹھہرے دریاؤں کا پانی
بھیج اک ایسی لہر جو پار سفینہ کر دے

ختم ہوا جاتا ہے سارا حسن غزل کا
آنکھوں کو ساغر، جسموں کو مینا کر دے

جس پیشانی پر سورج نے دیا ہے بوسہ
اُس پیشانی کا گلرنگ پسینہ کر دے

ہجر کا غم وہ جادوگر ہے پریت نگر کا
جو دن کو پھیلائے اور مہینہ کر دے

برسیں پھول تو دنیا حق جتلائے اپنا
تیر چلیں تو آگے میرا سینہ کر دے

جس نے ہجرت کی ہے نفرت کی نگری سے
میرے دل کو اس کے لیے مدینہ کر دے

باتیں بہت قتیلؔ، مگر اس ڈر سے چپ ہوں
یہ واعظ دشوار نہ میرا جینا کر دے

○

ذہنوں میں اس کا پورا سراپا بھی آئے گا
آتا ہے جو بکھر کے وہ یکجا بھی آئے گا

سورج کے ہمسفر جو بنے ہو تو سوچ لو
اس راستے میں پیاس کا دریا بھی آئے گا

کمرہ ہی بند ہے تو ہواؤں کا کیا قصور
کھڑکی کوئی کھلے گی تو جھونکا بھی آئے گا

ایسا نہیں کہ خشک ملے ہر جگہ زمیں
پیاسے جو چل پڑے ہیں تو دریا بھی آئے گا

اس شہرِ بے صدا کی خطا جب ہوئی معاف
مُردے بھی جی اُٹھیں گے، مسیحا بھی آئے گا

یہ ہجرتوں کی شب ہے، گھروں سے نکل پڑو
اُس کا کرم ہوا تو مدینہ بھی آئے گا

جو دل جلا رہے ہیں مرا، خوب سوچ لیں
اس روشنی کی زد میں اندھیرا بھی آئے گا

شاعر نہیں تو پیر ہی بن جائیے قتیلؔ
پُوجا بھی ہوگی آپ کی، پیسہ بھی آئے گا

قتیل شفائی

○

کانچ کی چادر سب کے پاس ہے
آج یہی سب کا لباس ہے

ہم نے صبر کے گھونٹ پی لیے
کیا تلخی ہے کیا مٹھاس ہے

ندی نہیں دو اشک چاہییں
ہم میں اِک مفلس کی پیاس ہے

کسی پیڑ پر نہیں چاندنی
من پنچھی کتنا اُداس ہے

بھر لے اپنے خُون سے
خالی جس جس کا گلاس ہے

آج کا ٹھٹھرا ہوا آدمی
اوڑھے ہوئے خوف و ہراس ہے

سونپ دیے سب غم قتیلؔ کو
قسمت کیا مردم شناس ہے

○

شہرِ سخن کی دید غزل ہے
اک روشن خورشید غزل ہے

ذہنوں کا صد رنگ تحیّر
جذبوں کی تجدید غزل ہے

کل بھی یہ معشوقِ جواں تھی
آج بھی قابلِ دید غزل ہے

اس کے رسیا شیخ و برہمن
دیوالی اور عید غزل ہے

محتسبوں کا خوف ہے جن کو
اُن سے نا اُمید غزل ہے

سب درباری شاعر سُن لیں
مدح نہیں، تنقید غزل ہے

میں ہوں اگلی رُت کا راہی
میری آس اُمّید غزل ہے

پیاسو میرے ہاتھ سے پی لو
میری خاص کشید غزل ہے

اپنا عہد [illegible] قتیلؔ ہو جس میں

فارغ بخاری

○

پہن کے نکلا کوئی کیا، کسی کو کیا معلوم
تمہارا چہرہ کہ میرا لہو جُدا معلوم

اُجڑ گیا ہے دل ایسا، نہ خواہشیں ہیں نہ خواب
سفر پہ نکلا ہوں اور راستہ ہے نامعلوم

اِسی سے رابطہ ہے، جس پہ ہے نفس کا مدار
کسے ہواؤں کا ہے دوسرا سرا معلوم

میں میکدے سے چلا، میکدے میں جا پہنچا
نہ دیر کا نہ حرم کا تھا راستہ معلوم

ہر ایک اپنے ترازو میں تولتا ہے ہمیں
کسے ہے میکدۂ فکر کا نشہ معلوم

نہ چہرہ جانتا ہے، عکس کی حقیقت کو
نہ آئینے کو ہے قربت کا فاصلہ معلوم

محبتوں کو سلامت روی پہ وار دیا
مری خطا ہے کہ تیری عطا ہے، کیا معلوم

عجب مسافتِ بے آبرو ہے یہ فارغؔ
"نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم"

گوہر ہوشیارپوری

○

صبح تاروں کی جو قربانی ہوئی
پھول کو کھلنے میں آسانی ہوئی

ہجر کیا تھا، ہجر کے دُکھ کے سوا
بڑھ کے سوچا تو پریشانی ہوئی

ایک چھوٹی سی حکایت درد کی
ہوتے ہوتے کتنی طولانی ہوئی

مرنے والوں سے بھی شرمندہ ہے
زندہ رہ کر بھی پشیمانی ہوئی

قحطِ ایماں کا سبب کیا جانیے
زعمِ ایماں کی فراوانی ہوئی

دل تو پھر کافر کا کافر رہ گیا
صرفِ سجدہ صرفِ پیشانی ہوئی

یار اپنے پھر بھی گوہرؔ یار ہیں
جس کو جو توفیق ارزانی ہوئی

گوہر ہوشیار پوری

○

وہی اندوہِ تنہائی یہاں بھی
طبیعت آ کے گھبرائی یہاں بھی

ہُنر ہم بے کسوں کے ہاتھ کیا تھا
کہ آ پہنچے تماشائی یہاں بھی

یہاں بھی پتھروں تک بات پہنچی
نہ ٹھہری شرطِ شنوائی یہاں بھی

وہاں بھی کچھ نہ تھا اُس کے علاوہ
یہی ہے ایک سچائی یہاں بھی

کہے کون اب مرے بیدادگر سے
مری قسمت چلی آئی یہاں بھی

ابھی کیا دیکھنا باقی ہے، دیکھیں
وہی چلتی ہے پُروائی یہاں بھی

بہت بنتے تھے نکتہ کار گوہر
چلے کچھ نکتہ آرائی یہاں بھی

○

کہنے کو تو خیر مر گیا وہ
اثباتِ حیات کر گیا وہ

دریا میں اُتار کر سفینہ
دریا میں کہیں اُتر گیا وہ

بادل تھا کہ کھل گیا برس کر
سایہ تھا کہ بس گزر گیا وہ

جا کر بھی حواس لے گیا تھا
آ کر بھی اداس کر گیا وہ

دیکھا تھا تو خواب کیا غلط تھا
آیا نہ سہی ـــــ مگر گیا وہ

لگتا ہے ہوا کے تیوروں سے
منزل پہ چراغ دھر گیا وہ

گوہر اُسے کس طرح بھلائیں
موضوعِ سخن ٹھہر گیا وہ

محب عارفی

○

دل میں سُورج کے جاگزیں ہم تھے
ہم نہیں تھے تو بس ہمیں ہم تھے

شوق ہونے کا تھا بہت ہم کو
ہو کے دیکھا تو کچھ نہیں ہم تھے

ایسے بکھرے کرن کرن ہو کر
کچھ نہیں تھا، جہاں کہیں ہم تھے

شکل بے صورتی کی تھی اپنی
اور خود صورت آفریں ہم تھے

ہم پہ رنگینیاں حرام رہیں
ویسے ہر رنگ کے امیں ہم تھے

ہر طرف خواب کی فضائیں تھیں
جن کی بیداریاں نہ تھیں، ہم تھے

بول اُٹھے ہیں ہمارے نقشِ قدم
پہلے ہی سے تھے اور یہیں ہم تھے

اب جہاں ہیں کسی کی نظروں میں
اب کہاں ، ہاں کبھی وہیں ہم تھے

ہم نہ ہوں گے محبؔ تو کیا ہوگا
وہ بھی تھا وقت جب نہیں ہم تھے

○

اس طرف بھی جو کوئی موج دل آسا ہو جائے
ایسا کِھل جاؤں کہ ساحل مرا دریا ہو جائے

میرے ہر گام پہ دو گام بڑھے میری طرف
یوں ملے مجھ سے کوئی، عکس ہی میرا ہو جائے

پھر تو ہو جائے گی سیر، لے ہوسِ دید اگر
دیکھتے دیکھتے جلوہ تہ و بالا ہو جائے

پردہ بنتی ہے تھکن پائے نظر کی یعنی
یہی معراج نظر ہے کہ تماشا ہو جائے

اُسے تصویر میں کھینچا ہے مع بندِ قبا
اب یہ سودا ہے کہ وہ بندِ قبا وا ہو جائے

خشکیوں تک مرے دریا کی رسائی ہے محال
یہ تو ممکن ہے کہ سیلاب ہی صحرا ہو جائے

راز کھلتا ہے کہ ہستی کا بھرم کھلتا ہے
راز دانو! کہیں یہ راز نہ رُسوا ہو جائے

کچھ نہ ہونے پہ یہ عالم ہے کہ میں ہی میں ہوں
کچھ نہ ہونا ہو سبھی کچھ تو کوئی کیا ہو جائے

وہم سایہ ہو تو کیا موجبِ سایہ ہو تو کیا
فہم کی حد ہے وہ مفہوم جو عنقا ہو جائے

وقت کے فیض سے کھلنے کا وہ پایا ہے مزہ
پھول اس فکر میں ہے، پھر سے شگوفہ ہو جائے

غم کوئی عیب ہے کیا جس کو چھپاتے ہو محبؔ
وہ کوئی شعر نہیں ہے جو معما ہو جائے

آفتاب اقبال شمیم

○

پنجوں کے بل کھڑے ہوئے شب کی چٹان پر
ناخن سے اِک خراش لگا آسمان پر

برسوں درونِ سینہ سُلگنا ہے پھر ہمیں
لگنا ہے قفلِ حبس ہوا کے مکان پر

بس اِک دہاڑ چاروں طرف سے سُنائی دے
گرداب سمت بن گئیں آنکھیں مچان پر

سرکش کو نصفِ عُمر کا ہو لینے دیجئے
بِک جائے گا کسی نہ کسی کی دُکان پر

ایسے طلوعِ قطرۂ خوں، کُنجِ لب سے ہو
باقی رہے نہ قرضِ خموشی زبان پر

ہر دم زمینِ عمر سے بے دخلیوں کا خوف
جیسے یہ کشتِ جبر ملی ہو لگان پر

○

منزل قریب آئی تو ایسے بہک گئے
رستے ہمارے پاؤں تلے سے سرک گئے

نکلے کبھی نہ اپنے مضافات سے پرے
اپنی تلاش میں جو بہت دُور تک گئے

اِک نسل کے لہو سے چراغاں تھے راستے
یہ کیا ہُوا کہ قافلے پھر بھی بھٹک گئے

خبروں کے شعبدے وہ دکھا کر دمِ سحر
شہ سرخیوں سے چشمِ بصارت کو ڈھک گئے

آئے نظر چراغ سے چہرے فضاؤں میں
یادیں جو ٹمٹمائیں، اندھیرے مہک گئے

دیکھو نا اب بھی ہال کی خالی ہیں کُرسیاں
ہم تو دکھا دکھا کے کرامات تھک گئے

○

نئے شعور، نئے وقت کا طلسم لگے
کہ اپنا اسم مجھے ہر کسی کا اسم لگے

ہمیشہ اپنی فنا میں بقا تلاش کرے
بڑی عجیب مجھے جستجوئے جسم لگے

گرا جو نارِ زمانہ میں، سرفراز ہوا
یہ آگ آتشِ نمرود کی ہی قسم لگے

یہ واہمہ ہے کہ افسوں کہ وصفِ خاص اس کا
کبھی وُہ سایہ لگے اور کبھی وہ جسم لگے

جو دُور ہو تو جگائے ہوسِ فسوں کیا کیا
قریب آئے تو ہر چیز بے طلسم لگے

شہزاد احمد

○

اس سے کرنی ہے شکایت نہ گلہ رکھنا ہے
لیکن اے بے طلبی! زخم ہرا رکھنا ہے

چومنے بھی ہیں دل و جاں کو مسلتے ہوئے پاؤں
اور ہتھیلی پہ بھی نقشِ کفِ پا رکھنا ہے

لوگ جاگیں بھی مگر آنکھ نہ کھُلنے پائے
ایسا جادو بھی پسِ بانگِ درا رکھنا ہے

انگلیاں توڑ کے نکلے یہ بلا جب نکلے
ہاتھ میں دیر تلک سنگِ صدا رکھنا ہے

خوش بھی ہوتا ہوں، لرزتا بھی ہوں ہر آہٹ پر
چور کا ڈر بھی ہے، دروازہ بھی وا رکھنا ہے

یوں تو آنکھوں میں ہیں دُنیا کے مناظر کیا کیا
غافل اس شخص سے ہوں جس کا پتہ رکھنا ہے

وہ اشارت، وہ شرارت، وہ حرارت نہ رہی
اور جو باقی ہے وہ ربط بھی کیا رکھنا ہے

بار بار اُس کی ملاقات کی خواہش کرنا
عمر بھر سانپ کو سینے سے لگا رکھنا ہے

خوابِ عبرت جسے کہتے ہیں بڑی چیز ہے وہ
شرط اس نیند میں آنکھوں کو کھُلا رکھنا ہے

فلکِ دشت پہ اب تو نظر آتا ہی نہیں
وہ ستارہ جو مجھے راہنما رکھتا ہے

شبِ غربت کی ہَوا تیز بہت ہے شہزاد
اب ہمیں آنکھ کے اندر ہی دیا رکھنا ہے

○

جس نے تری آنکھوں میں شرارت نہیں دیکھی
وہ لاکھ کہے، اُس نے محبت نہیں دیکھی

اِک روپ مرے خواب میں لہرا سا گیا تھا
پھر دل میں کوئی چیز سلامت نہیں دیکھی

آئینہ تجھے دیکھ کے گلنار ہُوا تھا
شاید تری آنکھوں نے وہ رنگت نہیں دیکھی

یوں نقش ہُوا آنکھ کی پُتلی میں وہ چہرہ
پھر ہم نے کسی اور کی صورت نہیں دیکھی

خیرات کیا وہ بھی، جو موجود نہیں تھا
تُو نے تہی دستوں کی سخاوت نہیں دیکھی

صد شکر، گزاری ہے قیامت تنِ تنہا
اس رات کسی نے مری حالت نہیں دیکھی

کیا تجھ سے کہیں، کیسے کٹی، کیسے کٹے گی
اچھا ہے کہ تُو نے یہ مصیبت نہیں دیکھی

شاید اسی باعث وہ فروزاں ہے ابھی تک
سُورج نے کبھی رات کی ظُلمت نہیں دیکھی

سب کی طرح تُو نے بھی مرے عیب نکالے
تُو نے بھی خدایا! مری نیت نہیں دیکھی

تنکا ہوں مگر سیل کے رستے میں کھڑا ہوں
اے بھاگنے والو! مری ہمت نہیں دیکھی

جو ٹھان لیا دل میں، وہ کر گزرا ہے شہزاد
آئی ہوئی سر پر کوئی آفت نہیں دیکھی

حمید کوثر

○

شوقِ منزل نہ راستا معلوم
ہم کہاں ہیں، کسی کو کیا معلوم

خاک خوئے بہشت رکھتی ہے
گل کے انداز سے ہُوا معلوم

آپ کو بھول ہوگئی ہوگی
دل تو ناداں ہے، اس کو کیا معلوم

جو نہ میں نے کہا نہ تم نے سُنا
کیسے لوگوں کو ہوگیا معلوم

دیدۂ شوق میں جو ہے تصویر
وہ ترے آئینے کو کیا معلوم

دونوں عالم قریب تر نکلے
ایک معلوم، ایک نامعلوم

موت کے بعد پھر سے جی اُٹھنا
آپ آئے تو ہوگیا معلوم

○

زندگی نے شعور تو پایا
تجھ کو دیکھا تو دیکھنا آیا

وہ شبِ قدر کا اُجالا تھا
میں تو پلکیں جھپک کے پچھتایا

پتّے پتّے کی اوک میں ہم نے
سبز گنبد سجا ہوا پایا

چاند اُترا نہ آسماں سے مگر
عکس اپنا ندی میں لہرایا

اشک آنکھوں میں اب نہیں ڈھلتے
منجمد ہوگیا ہے سرمایا

لیث قریشی

تیری جفا ہوئی کہ جہاں کا غضب ہُوا
ہم پر تو جو ستم بھی ہُوا، بے سبب ہُوا

اُس ساعتِ سعید کو کیا نام دیجئے
انساں اسیر، وقت کے زنداں میں جب ہُوا

شعلہ صفت ہیں رقص میں اپنے چمن کے پھول
اِس عالمِ بہار میں یہ کیا غضب ہُوا

جاری ہے ایک تیرگی و روشنی کی جنگ
جب سے شعورِ سلسلۂ روز و شب ہُوا

حدِ نگاہ تک کہیں شعلے، کہیں دُھواں
یہ خاک و خوں کا کھیل گلستاں میں کب ہُوا

اِس حادثے پہ آپ کا جو تبصرہ بھی ہو
ہیں آشنائے محفلِ عیش و طرب ہُوا

کتنے عظیم لوگ تہِ خاک ہو گئے
تُو بھی ہُوا جو لیثؔ تو پھر کیا عجب ہُوا؟

تری تلاش کا یہ ماحصل بھی کیا کم ہے
کہ راستہ تو زیادہ ہے، فاصلہ کم ہے

وہ کچھ زیادہ ہی شاکی ہے میری فطرت سے
وہ ایک شخص کہ جو مجھ سے آشنا کم ہے

مجھے ملا ہے بہت کچھ، مجھے ملے گا بہت
مجھے ہے کب یہ شکایت، مجھے ملا کم ہے

فریب بھی ہے وفا بھی، مزاجِ دنیا میں
مگر فریب زیادہ ہے اور وفا کم ہے

حسد کی آگ ہے، دشمن ہے اور اپنا وجود
مثالِ گُل ہوں شگفتہ، یہ معجزہ کم ہے!

ہمارا خوں ہے ہماری ہی جان کے درپے
ہے پھر بھی رُوح توانا، یہ حوصلہ کم ہے!

عذابِ جاں سے گزرنے کے باوجود اے لیثؔ
میں جی رہا ہوں تبسم بہ لب، یہ کیا کم ہے!

لیث قریشی

○

ہوس حفظِ بدن کی خاطر
لوگ، زندہ ہیں کفن کی خاطر
جاں فروشی کی تمنا ہے ہمیں
منصبِ دار و رسن کی خاطر
خونِ دل، خونِ جگر صرف کیا
ہم نے تزئینِ چمن کی خاطر
کتنے پروانوں نے جاں تک دے دی
صرف اک جلوہ فگن کی خاطر
کچھ غزالوں کے تعاقب میں ہیں لوگ
آج بھی مشکِ ختن کی خاطر
عزتِ نفس سے بھی ہم تو ہو گئے
حرمتِ خاکِ وطن کی خاطر
لوگ صف بستہ و لب بستہ رہے
روشِ سرو و سمن کی خاطر
کتنے کتبے ہیں سرِ لوحِ مزار
ایک بوسیدہ بدن کی خاطر
اپنا اسلوب نہ بدلا ہم نے
اپنے معیارِ سخن کی خاطر
ایک دیرینہ روایت ہی سہی
ہم غزل کہتے ہیں فن کی خاطر
لوگ کیا کیا نہیں کرتے اے لیث
لذتِ کام و دہن کی خاطر

○

یہ مسئلہ ہے اور کوئی مسئلہ نہیں
اپنا حریف میں ہوں، کوئی دوسرا نہیں
کل مجھ پہ کھل گیا ترا حسنِ منافقت
اس سانحہ کے بعد کوئی سانحہ نہیں
دنیا سے چند روز میں سب کچھ تو مل گیا
ملنا اب اور کیا ہے جو اب تک ملا نہیں
چھوٹا ہوں اس لیے مجھے احساں ہیں سب کے یاد
محسن کو بھول جاؤں میں اتنا بڑا نہیں
ممکن نہیں کہ آئیں عزائم میں لغزشیں
افتادِ وقت ہی تو ہے، افتادِ پا نہیں
اے مصلحت پسند! ہمارا بھی تیرے ساتھ
ہر چند رابطہ ہے مگر رابطہ نہیں
احوالِ واقعی تو ہے خود ہی زبانِ حال
لیکن سرِ غیور کہیں بھی جھکا نہیں
میں تجھ کو یاد آؤں اور آؤں تمام عمر
اے دوست! میں برا ہوں پر اتنا برا نہیں
خوابِ بقا کی بس یہی تعبیر ہے کہ لیث
دنیا میں صرف ایک فنا کو فنا نہیں

صمد انصاری

○

دستکوں کی طرح ویرانیٔ در میں رہتے
رنگ پرواز کے ٹوٹے ہوئے پر میں رہتے

رنگ ہوتا مرے فن کا مری دیواروں پر
میرے موسم کبھی آ کر مرے گھر میں رہتے

آنکھ میں دن کی، اترتا نہ تماشہ شب کا
میرے اخبار اگر میری خبر میں رہتے

پاؤں کی گرد سے راہوں کی مسافت کھلتی
راستے آ کے مرے زادِ سفر میں رہتے

دشتِ تعبیر میں گر یوسفِ اِمکاں ہوتا
عرصۂ دید بھی کنعانِ نظر میں رہتے

فرق سے تاج اُترتے بھی تو اِک مدت تک
کج کلاہی کی طرح کاسۂ سر میں رہتے

لے گئی چھاؤں اُڑا کے نئے موسم کی ہوا
مدتوں برگ ابھی شاخِ شجر میں رہتے

زُلف لہرا کے مرے پارۂ سخن پر گرتی
زاویے فن کے اگر عرضِ ہُنر میں رہتے

کتنا آباد رکھا دہر میں گمنامی نے
ورنہ تا حشر صمدؔ نام کے ڈر میں رہتے

○

نہ سحر جسم میں اُس کے، نہ خد و خال میں تھا
طلسم اُس کا مرے محشرِ خیال میں تھا

بقا کا راز کھلا ہے فنا کی منزل پر
مرے کمال کا نقطہ مرے زوال میں تھا

سراغ پاتے مرا، وہ مجھے گنوائے بغیر
یہ شائبہ تو مرا کب سے میرے حال میں تھا

تلاش کرتا رہا خود کو عکس کے مابین
وہ آئینہ کہ ابھی صورتِ مثال میں تھا

شگفتِ گل بھی تھی کچھ موجِ بُو کے حلقوں میں
پروں کا رنگ بھی کچھ موسموں کے جال میں تھا

ابد شناس کیا مجھ کو ایک لمحے نے
شعورِ عمر کا، محدود ماہ و سال میں تھا

ثباتِ اہلِ سخن میں تھا پائے محرومی
جراحتوں کا نشان نقشِ اندمال میں تھا

مری طلب نے اُسے خود سے ہمکنار کیا
وہ کب سے بند صمدؔ سرحدِ جمال میں تھا

محسن احسان

○

(نذرِ یگانہ)

نہ ہم سخن کوئی نکلا، نہ ہم زباں نکلا
اگرچہ سارا زمانہ مزاج داں نکلا

مری نظر بھی ہے محدود، سوچ بھی محدود
جسے غبار سمجھتا تھا، کارواں نکلا

قبولیت کے لیے آسماں کا در نہ کھُلا
مری دُعا کا سفر کتنا رائیگاں نکلا

بھنور میں کام مرے، میرا دستِ شل آیا
کہ ناخدا تو طرف دارِ دشمناں نکلا

کسی نے بھی نہ دیا مجھ کو منزلوں کا سراغ
میں خود ہی راہ نما، خود ہی کارواں نکلا

میں جس کے نام سے کرتا ہوں ہر سخن آغاز
مجھے ملا تو وہی مجھ سے بدگماں نکلا

بیانِ دردِ اسیری کا زعم تھا لیکن
ہر ایک حلقۂ زنجیر بے زباں نکلا

بقول یاسؔ یگانہ یہ بارہا سوچا
"ہوس تو نکلی مگر حوصلہ کہاں نکلا"

نہال کر گیا مجھ کو ٹھہر کے رات کی رات
وہ میہماں تھا مگر میرا میزباں نکلا

جُدا بدن سے ہوئی رُوح اسطرح محسنؔ
کماں سے جیسے کوئی تیر ناگہاں نکلا

○

(نذرِ غالب)

میں تیرا ہالا ہوں، میرے بغیر تُو کیا ہے
برونِ دائرہ، مرکز کی آبرو کیا ہے

بجا کہ حرفِ صداقت کا دعویدار ہے تُو
مگر یہ مصلحت آمیز گفتگو کیا ہے

زمین کے تو مسائل، زمیں پہ حل نہ ہوئے
خبر نہیں ہے کہ معراجِ جستجو کیا ہے

مجھے بتا تو سہی، سربراہِ حلقۂ علم!
مُعلّمانِ محبت کی آبرو کیا ہے

اگر ہوں میں ہی فقط رونقِ جمالِ حیات
تو پھر یہ انجمنِ حسُن چار سُو کیا ہے

یہ کم ہے کیا کہ ہے محسنؔ مصاحبِ غالبؔ
وگرنہ شاعروں میں اس کی آبرو کیا ہے

انور شعور

○

ہم رکاب و ہم سفر کوئی نہ تھا — ورنہ سدِّ رہگزر کوئی نہ تھا
راستے میں ایک آواز آئی تھی — مُڑ کے دیکھا تھا مگر کوئی نہ تھا
کوئی ہوتا تو رُلاتا اس طرح ؟ — چشمِ تر اے چشمِ تر! کوئی نہ تھا
کون کرتا ہے پسند آوارگی — شاید آوارہ کا گھر کوئی نہ تھا
چاہتے تھے ہم بھی سستانا مگر — راستے بھر میں شجر کوئی نہ تھا
دستکیں دینا تماشا ہو گیا — روشنی کیوں تھی؟ اگر کوئی نہ تھا
آپ کے ہونٹوں سے نکلا تھا مگر — خوش ہمارے نام پر کوئی نہ تھا
میری تنہائی کا ساتھی شہر میں — جانتا ہے شہر بھر، کوئی نہ تھا
ابتلا کے دور میں بھی خیر خواہ — تھا تو لیکن اس قدر کوئی نہ تھا
کاش ہو جاتی ملاقات آپ سے — اتفاقاً رات گھر کوئی نہ تھا
چٹھیاں آتی رہیں، جاتی رہیں — بیچ میں گو نامہ بر کوئی نہ تھا
پارسا تو اور بھی تھے شہر میں — آپ جیسا باہُنر کوئی نہ تھا
دل کے آئینے کو پہنچا آنچ تھیں — اس قدر نازک نظر کوئی نہ تھا
رات، آلودہ تھے سب دامن مگر — محتسب آیا تو تر کوئی نہ تھا
ٹکٹکی باندھے ہوئے تکتا رہا — گو مرے پیشِ نظر کوئی نہ تھا
چھیڑ دی کیوں داستانِ دل شعورؔ — کیا فسانہ مختصر کوئی نہ تھا

○

کنارے آج کشتی لگ رہی ہے — مجھے ہر چیز اچھی لگ رہی ہے
ترے ہوتے جو جچتی ہی نہیں تھی — وہ صورت آج خاصی لگ رہی ہے
جہاں تک ہو سکے، آنکھیں کھُلی رکھ — اگر دُنیا بُری بھی لگ رہی ہے
وہ اچھی کہہ رہا ہے اپنی حالت — مگر جیسی ہے ویسی لگ رہی ہے
گلی پر ایک خاموشی ہے طاری — یہ آہٹ تو تمھاری لگ رہی ہے
محبت میں پلٹ آتا ہے ماضی — جوانی، نوجوانی لگ رہی ہے
کوئی گُم ہو گیا ہے بھیڑ میں کیا — نظر بھٹکی ہوئی سی لگ رہی ہے
چراغاں دید کے قابل ہے لیکن — مجھے تو رات اندھیری لگ رہی ہے
شعورؔ آدم نہ آدم زاد کوئی
عجب سنسان بستی لگ رہی ہے

خلیل رامپوری

نہ ڈاکٹر تھا، نہ بیمار کوئی پڑتا تھا
نہ جانے کیسے ہوا میں چراغ جلتا تھا

کوئی خوشی اسے اپنی نہ راس آتی تھی
وہ گلستاں کی طرح تھا، مگر اکیلا تھا

قبول کی نہ مری آج چائے بھی اس نے
بڑا اُداس تھا، کھویا ہوا سا بیٹھا تھا۔

پسے ہوئے بھی پریشان حال پھرتے تھے
گھروں میں رات تھی، باہر مگر سویرا تھا

کسی زمانے میں پھل پھول اتنے ہوتے تھے
نہ سونگھتا تھا کوئی اور نہ کوئی کھاتا تھا

اندھیری رات میں آنکھیں چراغ ہوتی تھیں
نہ لالٹین تھی پہلے نہ کوئی ہنڈا تھا

سُنا ہے پہلے تو مٹی بھی چاٹ لیتے تھے
سُنا ہے آدمی پودے کی طرح بڑھتا تھا

کوئی گلہ تھا زمینوں نہ آسمانوں سے
مری طرح سے جو جس حال میں تھا اچھا تھا

وہ لوگ ہم سے تو آسودہ حال لگتے تھے
کہ جھونپڑے میں بھی گھی کا چراغ جلتا تھا

میں سوچتا ہوں کہ کتنے عظیم تھے وہ لوگ
سفر میں اُن کو سمندر بھی کچھ نہ کہتا تھا

اب استعاروں، کنایوں میں بات ہوتی ہے
وہ پہلے والا زمانہ تو سیدھا سادا تھا

وہ آس پاس کی دُنیا سے آشنا تھے کب
اُنھوں نے کب یہ ہوائی جہاز دیکھا تھا

بدل دیا ہے شبوں کو دنوں میں دُنیا نے
مرے بزرگوں نے کب اس طرح سے سوچا تھا

سمندروں سے ہوا کی طرح گذرتے ہیں
کہانیوں کو حقیقت میں آج ڈھلنا تھا

وہ آج سیر کو نکلا تھا آسمانوں کی
وہ آج ہاتھ میں البم اُٹھائے پھرتا تھا

بڑا سمارٹ نظر آرہا تھا یاروں میں
وہ رات جیسے کنیڈا سے ہو کے آیا تھا

اُسے تو تھل سے محبت جنوں کی حد تک تھی
جہاں بھی ملتا تھا تھل کا ہی ذکر کرتا تھا

گھرا ہوا تھا وہ ان میں، جو میرے دشمن تھے
نظر بچا کے مجھے بھی وہ دیکھ لیتا تھا

وہاں خلیق خدا یاد آ رہا تھا بہت
وہ بھائی جی! کوئی آفت زدہ علاقہ تھا

ظفر اقبال

○

یہ کوہ و دشت و کوچہ و بازار کس کے ہیں
یہ بھی بتلایئے کہ طلب گار کس کے ہیں

ہے کس کا انتظار، یہ آثار کس کے ہیں
اُمیدوار یہ در و دیوار کس کے ہیں

پکڑا ہمیں کہ ہاتھ میں تھا پرچم خطا
اِتنا تو دیکھتے کہ خطا کار کس کے ہیں

سب کو خبر تھی، اور، سبھی پُوچھتے بھی تھے
صیّاد کون ہے، گُل و گلزار کس کے ہیں

مت پُوچھنا خدا ہمیں دکھلا رہا ہے کیا
یہ دیکھنا کہ طالب دیدار کس کے ہیں

جن کا علاج کوئی نہیں ماسوائے وصل
تشخیص تو کرے کوئی بیمار کس کے ہیں

آکر ہماری سمت ہی کرتا کوئی درست
دشمن ہے کون، دَرپئے آزار کس کے ہیں

خیر، آپ کی وفاؤں کے لائق نہیں تھے ہم
یہ تو بتائیں، آپ وفادار کس کے ہیں

ہم جانتے ہیں آپ کی مجبوریاں، ظفؔر
اور مانتے ہیں آپ نمک خوار کس کے ہیں

○

عجیب سلسلۂ روزگار رکھتے ہیں
کہ معتبر نہیں، اور، اعتبار رکھتے ہیں

ہمیں ہے عشرتِ آغازِ خواب ہی کافی
اگرچہ خواہشِ پایانِ کار رکھتے ہیں

کچھ اُس کے لطف و کرم کا حساب ہے کوئی
نہ اپنی حسرتِ دل کا شمار رکھتے ہیں

اگر شہیدِ ہوس ہیں تو اِس قماش کے ہم
کہ جس پہ مرتے ہیں، اُس کو بھی مار رکھتے ہیں

وہ سامنے ہو تو بے اختیار ہو جائے
ہم اپنے دل پہ یہی اختیار رکھتے ہیں

یہاں پہ تھا تو یہ ضد تھی کہ وہ چلا جائے
چلا گیا ہے تو اب انتظار رکھتے ہیں

اُسے ہی آب و ہوا راس ہے محبّت کی
نہ ہم ہی موسمِ دل خوشگوار رکھتے ہیں

نجانے ختم بھی ہوگی کہیں یہ بارشِ خاک
نظر میں گرد ہے، دل میں غبار رکھتے ہیں

چراغِ چہرہ کو بجھنے نہیں دیا، کہ ظفؔر
ہم اپنے گرد ہوا کا حصار رکھتے ہیں

ظفر اقبال

○

یوں بھی نہیں کہ میرے بلانے سے آگیا
جب رہ نہیں سکا تو بہانے سے آگیا

ہم کر کے بات پھنس گئے اپنے ہی جال میں
کیسا پلٹ کے تیر نشانے سے آگیا

وہ مرحلہ کہ ڈرتے رہے جس سے ایک عمر
خوابوں کے ساتھ خواب ملانے سے آگیا

آتا نہ تھا کبھی ہمیں اپنا خیال کچھ
اتنا بھی اُس کے پاس بٹھانے سے آگیا

اپنا تھا کون، اُس کے لیے چھوڑتے جسے
ہاں، وہ بھی کٹ کے سارے زمانے سے آگیا

کیا لاتعلقی سے ہُوا فائدہ ہمیں
کیا اُس کے ہاتھ بات بڑھانے سے آگیا

اب جو سلوک بھی وہ کرے، ہے روا اُسے
کیوں میں ہی اُٹھ کے اپنے ٹھکانے سے آگیا

اِس عشقِ بے مُہار سے انکار تو نہیں
لیکن قرار بھی ترے جانے سے آگیا

کچھ اور بھی سپتو لیے حصّہ دار تھے ظفرؔ
میں اپنے آپ اُٹھ کے خزانے سے آگیا

○

سرکش سہی، فی الحال تو سر بھی نہیں رکھتے
ہم اہلِ نظر ہیں کہ نظر بھی نہیں رکھتے

کرتے ہیں گِلہ بھی کہ ثمر ہی نہیں آتا
کچھ رابطۂ شاخ و شجر بھی نہیں رکھتے

اِک لرزشِ بے نام ہے پہلو میں گرہ گیر
ظاہر میں کوئی خوف و خطر بھی نہیں رکھتے

دُنیا سے بھی محتاط ہیں اور دل سے بھی مجبور
روتے بھی ہیں، اور دیدۂ تر بھی نہیں رکھتے

کچھ تو ترے جانے کا یقیں بھی نہیں ہم کو
کچھ ہم ترے آنے کی خبر بھی نہیں رکھتے

یہ نالۂ دل ہے کہ اثر ہی نہیں کرتا
کر جائے تو ہم تابِ اثر بھی نہیں رکھتے

کافی ہے یہاں ایک اشارہ ہی سفر کا
کہتے ہو تو ہم رختِ سفر بھی نہیں رکھتے

جس دن سے اُدھر جانے سے روکا ہے ذرا سا
اُس دن سے قدم آپ اِدھر بھی نہیں رکھتے

شرمندہ بہت ہیں، ظفرؔ اس عیبِ سخن پر
اور، اس کے سوا کوئی ہنر بھی نہیں رکھتے

کشور ناھید

○

وہ میرا شریکِ غم ہوا تھا
یہ زعم مجھے اتم ہُوا تھا
نکلے تھے کہ اُس کو دیکھ پائیں
آنکھوں میں دُھواں رقم ہُوا تھا
سوچا تھا کہ بات بھی کریں گے
غنچے کا دہن قلم ہُوا تھا
بیٹھے تھے تھکن پہن کے گھر میں
رستے میں یہ ذکر کم ہُوا تھا
ٹھہرے تھے کہ اس کی چھاؤں میں نیں
وہ دشتِ سکوتِ یم ہُوا تھا
کپڑوں پہ مہکتی سلوٹوں کو
پہنا تو حباب کم ہُوا تھا
سوچا تھا اُسے کہ سوچنے کو
منظر بھی مثالِ خم ہُوا تھا
کھُلتا تھا دریچہ جس گلی میں
واں شورِ خزاں قدم ہُوا تھا
دیکھا تھا تجھے بھی دیر اُس نے
شائستہ غم بھی کم ہُوا تھا
تسبیحِ ملال تھی وظیفہ
آنکھوں کے قریب نم ہُوا تھا
خواہش کو یہ آسماں بھی کم تھا
کیا حسنِ خرام، دم ہُوا تھا
اے آگ! تجھے ہم تو خس برابر
جو کچھ بھی ہُوا، سو کم ہُوا تھا

راحت ملک

○

میں ریزہ ریزہ ہوں اور اُلجھنوں کے جال میں ہوں
چراغِ آخرِ شب کی طرح زوال میں ہوں

صدائیں کوہ سے ٹکرا کے لوٹ جاتی ہیں
نظر ملا کہ میں تیرے ہر اک سوال میں ہوں

قبائیں سبز مگر دو غلے بدن ہیں یہاں
یہ کیا درست ہے، میں شہرِ بے مثال میں ہوں

نہ میں خدا سے ہوں مخلص نہ آدمیت سے
عجب تماشا ہے نہ میں سُر میں ہوں نہ تال میں ہوں

مثالِ سیل رواں راستے بناتا ہوں
تُو میری راہ سے ہٹ جا کہ میں جلال میں ہوں

میں اپنے کاغذی پیکر پہ ناز کرتا ہوں
خوش نصیب میں اربابِ لازوال میں ہوں

مچان میں ہیں ستمگر، اسیرِ دام ہوں میں
زمانہ گذرا کہ میں رہزنوں کی چال میں ہوں

مرا شمار نہ ہے تین میں نہ تیرہ میں
کہ میں ہنوز بیابانِ قیل و قال میں ہوں

خودی کا حصہ ہوں راحت انا کا قصہ ہوں
کتابِ عشق میں، فرہاد کی مثال میں ہوں

مظفر حنفی

○

جسم تمام آبلہ، گرد ہی گرد ہر طرف
آنکھوں میں سبز خواب ہیں، موسم زرد ہر طرف

گرم ہوا کی ہم عناں ریگِ رواں چہار سُو
ریگِ رواں کے ساتھ ہم صحرا نورد ہر طرف

آئینہ آئینہ وہی ایک شبیہہِ دل نواز
خُون میں ٹیس مارتا موجۂ درد ہر طرف

ایک وجُود کا شرار اور فضا دھواں دھواں
برف ہی برف ہر طرف، صرصرِ سرد ہر طرف

آج ہر ایک اِزم ہے ٹوٹے ہوئے طلسم سا
خوف زدہ معاشرہ، خوار ہے فرد ہر طرف

ہاتھ لگائیے تو راکھ، آنکھ ملائیے تو خاک
قوم کی عورتیں بہت، قوم کے مرد ہر طرف

کوئی دریچہ وَا نہیں، کوئی بھی در کھُلا نہیں
گھوم رہا ہے شہر میں خوفِ نبرد ہر طرف

○

ہمارے ساتھ کا ہنس اُڑ گیا درختوں پر
چلیں کہ شام کا میلہ لگا درختوں پر

ستارۂ سحری کا جُگر جُگر کرنا
وہ چاندنی کا کتھک ناچنا درختوں پر

غزل سُنائی مجھے موج موج دریا نے
ہوا نے میرا قصیدہ پڑھا درختوں پر

تلاش کرتے رہے ڈال ڈال پر جگنو
کہیں بھی رات کا پنچھی نہ تھا درختوں پر

ہمارا جاگنا پتّوں کی چہچہاہٹ سے
وہ دُھند، جیسے ابوالہول سا درختوں پر

ہر ایک شاخِ ثمر بار جھُول جھُول گئی
یہی خطا ہے تو آرے چلا درختوں پر

ہر اک پرند مظفر گلو بریدہ ہے
ہر ایک برگ لرزتا ہُوا درختوں پر

محسن بھوپالی

○

بچھڑ کے لوگ زیادہ جیا نہیں کرتے
شجر سے پتّے یوں ہی تو گرا نہیں کرتے

جو آنے والے ہیں موسم، انھیں شمار میں رکھ
جو دن گزر گئے ان کو گنا نہیں کرتے

نہ دیکھا جان کے اُس نے، کوئی سبب ہوگا
اسی خیال سے ہم دل بُرا نہیں کرتے

وہ مل گیا ہے تو کیا قصّۂ فراق کہیں
خوشی کے لمحوں کو یوں بے مزا نہیں کرتے

زمانہ کس کو سدا سازگار ملتا ہے
اگر یہ خوف ہے تم ابتدا نہیں کرتے

منافقت پہ جنھیں اختیار حاصل ہے
وہ عرض کرتے ہیں، تجھ سے گلا نہیں کرتے

متاعِ عیش، غمِ زیست کے عوض مت مانگ
دُعا کے نام پہ یوں بد دُعا نہیں کرتے

ہمارے قتل پہ محسنؔ یہ پیش و پس کیسی
ہم ایسے لوگ، طلب خوں بہا نہیں کرتے

○

اپنا آپ تماشا کر کے دیکھوں گا
خود کو خود سے منہا کر کے دیکھوں گا

وہ شعلہ ہے یا چشمہ، کچھ بھید کھُلے
پتھر دل میں رستہ کر کے دیکھوں گا

کب بچھڑا تھا، کون گھڑی تھی، یاد نہیں
لمحہ لمحہ یک جا کر کے دیکھوں گا

وعدہ کر کے لوگ بُھلا کیوں دیتے ہیں
اب کے میں بھی ایسا کر کے دیکھوں گا

کتنا سچّا ہے وہ میری چاہت میں
محسنؔ خود کو رسوا کر کے دیکھوں گا

حسن اختر جلیل

○

یہ دل نہ تھا تپِ ہجراں سے آشنا پہلے
بدن کو آگ لگاتی نہ تھی ہوا پہلے

اب التفاتِ جفا بھی ہے دوسروں کے لیے
ستم طراز نہ تھا اتنا بے وفا پہلے

مرورِ وقت نے بدلا چلن محبت کا
جو دل شکن ہیں، وہی غم تھے جانفزا پہلے

رہیں تو اس کی گلی میں، قرینِ در نہ سہی
یہ کیا ضرور، ہمیں پر ہو، ہر جفا پہلے

تمھیں سے عشوہ فروشی ہوئی نہیں آغاز
جہاں میں اور بھی گزرے ہیں خوش ادا پہلے

یہ کس نے برق سمو دی ہوائے گلشن میں
سموم بن کے جلاتی نہ تھی صبا پہلے

جلیل رسمِ جہاں کوئے یار تک پہنچی
یہاں بھی جرم سے ملنے لگی سزا پہلے

خورشید رضوی

○

سفر خواب کا عمر بھر کس لیے
ستاروں سے ربطِ نظر کس لیے

نہیں آسماں میں اگر کوئی در
تو پھر خاکداں سے مفر کس لیے

یہ آئینہ ساں، آمنے سامنے
بنائے گئے بحر و بر کس لیے

زمیں آپ غرقاب ہونے کو ہے
سمندر سے نکلے گہر کس لیے

یہ کیوں آج میں نے تبسم کیا
یہ دیوارِ گریہ میں در کس لیے

بہاروں میں کیا اب کے آسیب تھا
لگا مجھ کو پھولوں سے ڈر کس لیے

نہیں میرے لب پر مرے دل کی بات
ہُوا اُس کے دل پر اثر کس لیے

یہ مانا کہ خورشید تیری غزل
بڑی دل نشیں ہے، مگر کس لیے

آصف ثاقب

○

چلے چلیں گے ابھی شغلِ ہاؤ ہُو کرنے
رُکے ہیں گھر کی خموشی سے گفتگو کرنے

قیامِ شب ہے گھروں سے منافقت اپنی
کہ صبح نکلیں گے تاروں کی جستجو کرنے

سفید خون پیے ہم وطن سے جاتے ہیں
دیارِ غیر، مرادوں کو سرخ رُو کرنے

تمام شہر میں خوشبو و رنگ پھیلیں گے
کھڑے ہیں چوک میں دل کو لہو لہو کرنے

عبادتوں کے کڑے دشتِ آزمائش میں
لگے ہیں آج سرابوں سے ہم وضو کرنے

رشک خلیلی

○

تنگ دستی میں غنیمت ہے انا ہی رہ گئی
مطمئن ہوں میں کہ شرمِ کج کلاہی رہ گئی

موسمِ گل اپنے سب خوش رنگ منظر لے گیا
اور ہمارے پاس آوارہ نگاہی رہ گئی

جب مکمل ہو گئی میرے جرائم پر جرح
یوں ہُوا محسوس جیسے اک گواہی رہ گئی

فاتح و مفتوح آخر دونوں رخصت ہو گئے
جنگ کے میدان میں لیکن تباہی رہ گئی

فاصلوں کے شور میں گم ہو گئی میری پکار
دور تک آواز پہنچی تو صدا ہی رہ گئی

مصلحت آثار آنکھیں ہیں مگر چہرے اُداس
دوستوں کے دل میں گھٹ کر خیر خواہی رہ گئی

چھُپ گئے سارے ستارے بجھ گئے سارے چراغ
رشک اب تو اپنی آنکھوں کی ضیا ہی رہ گئی

رشک خلیلی

○

نشان کوئی نہیں ، سنگِ میل کوئی نہیں
سفر طویل ہے لیکن دلیل کوئی نہیں

اِک آس ہے کہ یہ دُنیا ہے عالمِ امکاں
ترے وصال کی ورنہ سبیل کوئی نہیں

کسے چڑھاؤ گے سُولی ، کسے پلاؤ گے زہر
ہمارے شہر میں بطلِ جلیل کوئی نہیں

سحر کے آنے میں تاخیر ہو گئی ورنہ
تمام راتیں ہیں یکساں طویل کوئی نہیں

جب اپنا حسنِ نظر چھن گیا تو ہم سمجھے
ہر آدمی ہے ہیولیٰ، شکیل کوئی نہیں

غرور و کبر کے اصنام کون توڑے گا
ہر ایک شخص ہے آذر، خلیل کوئی نہیں

ہمیں ہی ظلم کی یلغار روکنا ہو گی
یہ شہر ہے وہ ہے کہ جس کی فصیل کوئی نہیں

ہمیں خبر ہے کہ اس بیش و کم کے عالم میں
خود اعتماد سہی خود کفیل کوئی نہیں

نہ کوئی آیۂ رحمت ، نہ کوئی وحیِ سکوں
ہمارے دَور میں کیا جبرئیل کوئی نہیں!

○

نہ کوئی رنج نہ کوئی ملال ختم ہوا
اگرچہ عمر کا اِک اور سال ختم ہوا

حسین ہے مرے ماضی سے میرا مستقبل
میں اس خیال سے چونکا تو حال ختم ہوا

نہ آہٹوں پہ بھروسا، نہ دستکوں پہ یقیں
ترے وصال کا ہر احتمال ختم ہوا

بکھر گیا خس و خاشاک کی طرح تو کیا
میں خوش نصیب تھا، گل کی مثال ختم ہُوا

اب آئینہ ہی نہ تیری نظر سے گر جائے
ترا زمانۂ حسن و جمال ختم ہُوا

مری اُمیدوں کو بخشی تھی روشنی جس نے
وہ رنگِ خواب، وہ حسنِ خیال ختم ہُوا

اسے خوشی ہے کہ اس نے دیا نہ کوئی جواب
مجھے یہ غم ہے کہ میرا سوال ختم ہُوا

چلا تھا رشک زمانے کے ساتھ مگر
قدم قدم پہ ہوا پائیمال، ختم ہُوا

خادم رزمی

○

سبز بستی نہ سہی، کوئی کھنڈر تو آئے
جو بھی منزل ہے، بہر طور نظر تو آئے

تُو نے چاہا تو جُدا تجھ سے بھی ہو جاؤں گا
اے مری خانہ خرابی! مرا گھر تو آئے

مجھ کو بجھنے سے تو انکار نہیں ہے لیکن
شب کے صحرا میں کہیں بادِ سحر تو آئے

سر میں سودا تھا سفر کا، کہ نہ ٹھہرے پل بھر
ورنہ رستے میں کئی سبز شجر تو آئے

ہم وہ پاگل کہ تری سمت ہوا کو بھیجے
منتظر ہیں کہ تری کوئی خبر تو آئے

رُت اُڑانوں کی پرندوں کو کہاں ملتی ہے
یہ بہت ہے کہ میسر انھیں پر تو آئے

ہم بھی خالی تو نہیں آئے تری بستی سے
گُل بداماں نہ سہی، خاک بسر تو آئے

پھر ہوئے نذر اُسی تند ہوا کی، رزمی
اب کی رُت میں بھی درختوں پہ ثمر تو آئے

ممتاز حیدر ڈاھر

○

ہر لمحے کے پس منظر کو دھیان میں رکھ
سادہ کاغذ ہی چشمِ حیران میں رکھ

تاریکی میں سب آئینے دھندلے ہیں
کوئی روشن عکس مرے دالان میں رکھ

دریا دریا جھوٹ، سماعت سے اتریں
بوند بوند سچائی میرے کان میں رکھ

نام نشان تو پانی پر تحریریں ہیں
میرے لفظوں کو میری پہچان میں رکھ

دھوپ کی خواہش میں بوسیدہ چھت نہ گرا
بے موسم کی بارش بھی امکان میں رکھ

سفر سے آخر واپس لوٹ کے آنا ہے
اس کے وصل کی خواہش کو سامان میں رکھ

سامنے تیرا سینہ بھی ہو سکتا ہے
یعنی سوچ سمجھ کر تیر، کمان میں رکھ

برف رُتوں میں زندہ رہنا ہے حیدر
آگ ذخیرہ اپنے بند مکان میں رکھ

اظہر عنایتی

○

کتابیں جب کوئی پڑھتا نہیں تھا
فضا میں شور بھی اتنا نہیں تھا

جوانوں میں تصادم کیسے رُکتا
قبیلے میں کوئی بوڑھا نہیں تھا

بڑی معصوم سی اپنائیت تھی
وہ مجھ سے روز جب ملتا نہیں تھا

عجب سنجیدگی تھی شہر بھر میں
کہ پاگل بھی کوئی ہنستا نہیں تھا

پرانے عہد میں بھی دشمنی تھی
مگر ماحول زہریلا نہیں تھا

کہاں شہرت مرا پتھر لگاتی
کوئی خالی ہی چورا ہا نہیں تھا

سبھی کچھ تھا غزل میں اس کی اظہرؔ
بس اک لہجہ مرے جیسا نہیں تھا

○

آنے والوں کے لیے کچھ تو بچا کر رکھ لوں
اپنی آنکھیں ہی وصیت میں لکھا کر رکھ لوں

رُت بھی سردی کی ہے اور یہ بھی نہیں ہے ممکن
رات کے واسطے کچھ دھوپ اُٹھا کر رکھ لوں

چاند سا روپ، گھٹا بال، سمندر آنکھیں
ایک منظر ہو تو آنکھوں میں چھپا کر رکھ لوں

پھر کوئی آئے گا جھونکا تو بکھر جائیں گے
میں تو بکھرے ہوئے پتوں کو اُٹھا کر رکھ لوں

شاید آجائے کوئی رنگ پرکھنے والا
خون سے زینے میں تصویر بنا کر رکھ لوں

زندگی، میری طرح تُو بھی تو زخمی ہے بہت
آ ترے زخم میں لفظوں میں سجا کر رکھ لوں

سجاد بابر

○

یوں اُسے حیرت کی دلدل میں اُتار آئے کوئی
ساری پُونجی ایک ہی داؤ میں ہار آئے کوئی

گرد اُتری ہے تو کتنے عکس اُبھرے ہیں وہاں
ڈر ہے، ان شیشوں پہ اب پتھر نہ مار آئے کوئی

صبح کی زرتار کرنوں میں نہیں دیکھا ہُوا
چاندنی میں شہر کا صدقہ اُتار آئے کوئی

یہ کبھی دیواروں پہ لکھا تھا ہَوا نے بارہا
سبز ہوتے پیڑ کی شاخیں سنوار آئے کوئی

جی مچلتا ہے کہ خوشبو سی کوئی تقریب ہو
مجھ سے ٹکرانے کی خاطر بار بار آئے کوئی

ساحلوں پر ریت کی ٹھنڈک نے وہ دھوکے دیے
گرمیاں جیسے پہاڑوں پر گذار آئے کوئی

(دوبئی)

○

اب منڈیروں پہ چراغوں کو بُجھانا چاہے
میرے آنگن میں ہَوا راکھ اُڑانا چاہے

وہ ستارہ ہے، دیا ہے، کہ کوئی آنسو ہے
پر بڑی دیر سے کچھ بات بتانا چاہے

جانے کیا ہے کہ رفاقت کے کرم سے پہلے
وہ نجومی کو مرا ہاتھ دکھانا چاہے

سادہ لوح ایسا کہ کاجل کی سلائی لے کر
میرے چھوڑے ہوئے خاکے کو بنانا چاہے

میں بھی کیا ہوں کہ ان آنکھوں کے کہے میں آکر
اُس سے بیزار ہُوا جس کو زمانہ چاہے

(دوبئی)

سجاد بابر

○

مرے آئینوں میں بھی تھا کبھی عجب ایک عکس بسا ہُوا
وہی بال سایہ کیے ہوئے وہی انگ انگ کھُلا ہوا

وہ گلی گلی نئی چاہتیں وہ قدم قدم کئی لغزشیں
وہ مزاج کب کا بدل چُکا وہ سُرور کب کا ہَوا ہُوا

مگر اب تو خواب سی بات ہے مرے ہاتھ میں ترا ہاتھ ہے
وہ اُفق پہ صبح کھڑی ہوئی، وہ فلک پہ چاند جما ہُوا

مرے آس پاس رچی ہُوئی اُسی ایک شام کی سسکیاں
اگر آنکھ تک نہیں آسکا کہیں دل میں درد رُکا ہُوا

یہ بڑا کرم مرے دل پہ تھا کہ ہدف یہ پیشہ وروں کا تھا
"نہ کسی کی ضرب غلط پڑی نہ کسی کا تیر خطا ہُوا"

مجھے چھاؤں میں کئی مرتبہ یہ دُعا شجر کی سنائی دی
مرے زرد پتّے کی خیر ہو تھا ہَوا کے ساتھ گیا ہُوا

مرے واسطے یہی کم نہیں بھری انجمن میں کبھی کبھی
مرا نام آئے تو کہہ اُٹھیں کہ یہ نام تو ہے سُنا ہُوا

(دوبئی)

○

کچھ یوں ہے، ہواؤں میں ہلچل کوئی ایسی ہے
اُڑتی ہوئی خوشبو کی مچلی ہوئی لَے سی ہے

پوریں تو شناسا ہیں دہلیز کی مٹّی سے
پہچان اندھیرے میں رکھی ہوئی شے سی ہے

آنکھوں میں چمک جل گئے، لب تشنہ ہی رہ جاتیں
برسات بھی صحرا کی، بالکل ترے جیسی ہے

اَن دیکھے جزیروں کی بل کھاتی ہوئی بدلی
پل پل جیسے ترسیں گے، اِک بھُولے سمے سی ہے

ہر چیز اُڑائی ہے رہ رہ کے بگولوں نے
بس درد کی لذّت ہے جو ویسی کی ویسی ہے

کھُلتی ہی نہیں اکثر سوچوں کی کلائی سے
باتوں میں رکاوٹ کی زنجیر بھی کیسی ہے

سجّاد! کوئی حیلہ، اُس دھُوپ دریچے تک
جاتی ہی نہیں سیلن آنکھوں میں اب ایسی ہے

رام ریاض

○

وہی دلدار، وہی یارِ یگانہ اپنا
اُسی کافر سے تعلق ہے پرانا اپنا

از سرِ نو مجھے جینے کا قرینہ مل جائے
پھر سے دہراؤ کوئی ایک بہانہ اپنا

تم زمانے کے مخالف تھے مگر تم پر بھی
کچھ نہ کچھ چھوڑ گیا رنگ زمانہ اپنا

آخری بار وہ اس شان سے بچھڑا ہے کہ پھر
اس سے ملنے کو کبھی دل نہیں مانا اپنا

پرسشِ درد پہ دُنیا کا حوالہ دینا
مرا پوچھے تو اُسے حال سنانا اپنا

تیرے ہمسائے بنے ہیں تو یہ معلوم ہُوا
کتنا مشکل ہے کوئی غیر بسانا اپنا

کیسے صحرا میں، چمن چھوڑ کے آباد ہوئے
جہاں پانی کہیں اپنا ہے نہ دانہ اپنا

وہی دشمن، وہی دربار ہے یارانِ قدیم!
سر چلا جائے مگر سر نہ جھکانا اپنا

کون اب حق کی حمایت میں اُٹھائے گا قلم
شاعرو! شیشہ گرو! ہاتھ اُٹھانا اپنا

صبح تک رامؔ کسی نے ہمیں آواز نہ دی
اس طرح ٹوٹ گیا خواب سہانا اپنا

○

اور سہارے تو دھرتی کے تجارتی ہیں
اپنی ٹانگیں اپنا بوجھ سہارتی ہیں

تیری میری ایک ہیں بنیادی قدریں
اس کے علاوہ سب آداب سفارتی ہیں

میں جن آوازوں کو وحشت میں چھوڑ آیا
اب تک مجھ کو تنہائی میں پکارتی ہیں

ان آنکھوں پہ کون بٹھائے پہرے، جو
مظلوموں کو ہنگاموں پہ اُبھارتی ہیں

سوچتے سوچتے سو جانا ہی اچھا ہے
خالی ذہنوں میں راتیں پھنکارتی ہیں

رامؔ اب بھی دیہاتوں میں بوڑھی مائیں
چرخا کات کے پچھلا پہر گذارتی ہیں

رام ریاض

○

آج نیند آنکھوں میں پہلے سے زیادہ ہے
تو کہے تو سو جائیں تیرا کیسا ارادہ ہے

ایسے آدمی جاناں ! ہمسفر نہیں ہوتے
میں بھی پا پیادہ ہوں تو بھی پا پیادہ ہے

اپنی بے گناہی کی اور کیا صفائی دوں !
دل پہ کچھ نہیں لکھا، یہ ورق بھی سادہ ہے

جس پہ تیرا قبضہ ہے یہ زمین میری ہے
اس کے آب و دانہ پر میرا حق زیادہ ہے

کب زمین پھٹ جائے اور ہم سما جائیں
اب تو اس کا ہر ذرّہ ظلم کا بُرادہ ہے

خاکیوں سے ملتا ہے اس کے باوجود اس کا
خوشبوؤں کا پیکر ہے نور کا لبادہ ہے

بے ستوں مکانوں سے پیڑ رام اچھے ہیں
گو دبی کشادہ ہے چھاؤں بھی زیادہ ہے

عرشی زادہ

○

ایک سا اندھیرا ہے مہر و ماہ و کوکب کیا
تیرہ بخت کیا جانیں صبح کیا ہے اور شب کیا

تشنگی نہیں مٹتی، تشنگی نہیں مٹتی
ہونٹ تر کیے جب کیا، جام رکھ دیا اب کیا

یاس کا کوئی خنجر آس کا کوئی نشتر
پرسشِ غمِ دل سے آپ کا ہے مطلب کیا

دل پہ گرد ہوتی تو نقش بن کے رہ جاتا
ہم کو یاد کیا رہتا کہ گئے تھے تم کب کیا

میرزا یگانہ کو پڑھ کے دیکھیے صاحب
کچھ سمجھ میں شاید آئے شاعری کا ہے ڈھب کیا
(رام پور)

خالد اقبال یاسر

مطلعے

یہ نہیں کہ وہم و گمان میں اسے دیکھنا
مجھے چہرہ چہرہ جہان میں اسے دیکھنا

اُڑان کے لیے پَر اپنے تولنے تک ہے
مری یہ سُست رَوی جسم کھولنے تک ہے

ہنسی ہنسی میں وہ آنکھیں مری بھگو بھی گیا
وہ حادثہ جسے ہونا تھا، آج ہو بھی گیا

جتنے اذہان ہیں اتنے ہی مطالب ہوں گے
میں جو کہہ دوں گا وہی لفظ مناسب ہوں گے

اس سے پہلے کب زمانے سے گذر میرا ہُوا
پھر وہی منظر نظر آیا مجھے، دیکھا ہُوا

در و دیوار پہ افلاس کی تحریریں ہیں
روشن آنکھوں میں مگر آس کی تحریریں ہیں

گلی کی شہر والوں نے نشانی کیا بتائی تھی
مکاں سے اس کے وابستہ کہانی کیا سنائی تھی

لوگ یونہی راہیٔ ملکِ عدم ہوتے رہے
شاخ کو ہر دم نئے غنچے بہم ہوتے رہے

اُلفت رسول

○

صورتِ اضطراب ٹھہرا ہے
آنکھ میں کیسا خواب ٹھہرا ہے

اُڑتے جاتے ہیں ماہ و سال مگر
ایک لمحہ عذاب ٹھہرا ہے

اب تو یاروں کی حرف گیری کا
ایک چُپ ہی جواب ٹھہرا ہے

بند کر لوں تمام دروازے
آج خود سے خطاب ٹھہرا ہے

جس کی دُھن میں سفر پہ نکلا ہوں
وہ مرا ہمرکاب ٹھہرا ہے

کب حقیقت کی سطح ساکت پر
مصلحت کا حباب ٹھہرا ہے

بات کرتا ہے سُو قبیا نہ وہ
جیب سے عزّت مآب ٹھہرا ہے

جو سجاتا رہا ہے خواب مرے
کس کی تعبیر خواب ٹھہرا ہے

کھیتیاں — پیاس کی کُھلی باہیں
آسماں پر سحاب ٹھہرا ہے

دل میں طوفان ہیں بغاوت کے
لب پہ لفظِ جناب ٹھہرا ہے

کاوش بٹ

○
○

ابھی ہمارے معاشرے میں صد اقتوں کا گزر نہیں ہے
قدم قدم مصلحت شناسی، گنوار پن ہے، ہنر نہیں ہے

حسین لوگوں کی انجمن میں سکون ملتا ہے بیٹھنے سے
ہماری بے کیف ساعتوں کو اس انجمن کی خبر نہیں ہے

یہ بات محسوس کر رہے ہیں شجر پہ بیٹھے ہوئے پرندے
سوائے چند ایک کے زمیں پر کسی کا محفوظ گھر نہیں ہے

شدید حالات کے تقاضوں کو جان لیتے تھے لوگ پہلے
گماں گزرتا ہے اب کہ شاید کوئی بھی اہلِ نظر نہیں ہے

وفا کی راہوں پہ گامزن ہیں مرے قبیلے کے لوگ تنہا
رہا کے اس دورِ پُر جفا میں کسی کو باطل کا ڈر نہیں ہے

ستم کے ہاتھوں شکستہ دل ہیں تمام بستی کے لوگ کاوش
مگر یہ افسوس ہے کہ ان میں کوئی بھی آشفتہ سر نہیں ہے

شبنم شکیل

○

دل کی باتوں کو بڑے پیار سے ٹالا ہوگا
خود کو جب ایک نئی راہ پہ ڈالا ہوگا

اُس سے منسوب ہوں جتنے بھی فسانے، سُننا
اُن میں شاید کہیں میرا بھی حوالہ ہوگا

ہم تو کہتے تھے، دیئے گُل نہ کرو آخرِ شب
تم کو اصرار کہ کچھ دم میں اُجالا ہوگا

آج یہ سوچ کے حیرت سی مجھے ہوتی ہے
کس طرح میں نے کبھی دل کو سنبھالا ہوگا

جو ہیں پروردۂ غم، اُن سے شکایت کیسی
اُن کا ہر ڈھنگ زمانے سے نرالا ہوگا

صفحۂ دل پہ اُبھر آئی ہیں کیسی سطریں
میں نے ماضی کی کتابوں کو کھنگالا ہوگا

○

ہاتھ نہ آئی دُنیا بھی اور عشق میں بھی گمنام رہے
سوچ کے اب شرمندہ ہیں، کیوں دونوں میں ناکام رہے

اب تک اس کے دم سے اپنی خوش فہمی تو قائم ہے
اچھا ہے جو بات میں اُس کی، تھوڑا سا ابہام رہے

ہم نے بھی کچھ نام کیا تھا، ہم کو بھی اعزاز ملے
عشق میں ہم بھی اِک مدت تک موردِ صد دشنام رہے

میرے پاس تو اپنے لیے بھی اکثر کوئی وقت نہ تھا
ہاں جو فراغت کے لمحے تھے، تیری یاد کے نام رہے

واقفِ حال تو ہے وہ اپنا، منصف جانبدار سہی
اُس کے ہر انصاف کا لیکن میرے سر الزام رہے

آج کا دن بھی بے مصرف سی سوچوں ہی میں بیت گیا
آج کے دن بھی یوں ہی پڑے پھر گھر کے سارے کام رہے

شبنم شکیل

○

چاند نکلا کہ چاند ڈوب گیا
اِن مناظر سے واسطہ نہ رہا
اُس کو کھونے کا رنج ہے دل کو
جس کو ہرگز کبھی نہ پایا تھا
ٹوٹ سکتا ہو، جُھک نہ سکتا ہو
ایسا کوئی نظر نہیں آیا
پھر دیئے سے دیا جلے کیسے
جب کہ خود بُجھ چُکا ہو پہلا دیا

ق

زندگی یہ ہری بھری تھی جب
خود سے باہر نہ جھانک کر دیکھا
اب جہاں تک نگاہ جاتی ہے
ہر طرف ریت کا ہے اک دریا
قہر ایسا ہوا تھا کچھ نازل
شہر پورا لپیٹ میں آیا
حشر کا سا تھا ہر طرف ساماں
آدمی آدمی سے خوف زدہ
اپنے ماضی سے کٹ گئے تھے سب
حال سے بھی نہ جُڑ سکا رشتہ

○

میرے ہونے ہی کا احساس دلا دے مجھ کو
میں بھی زندہ ہوں، کوئی آ کے بتا دے مجھ کو

اپنا تاوان مجھے خود ہی ادا کرنا ہے
اسے بھولوں جو کبھی، یاد دلا دے مجھ کو

یہ نہ ہو میں بھی اسی بھیڑ میں گُم ہو جاؤں
راستہ کوئی الگ ہو تو دکھا دے مجھ کو

کسی تنکے کا سہارا نہیں منظور مجھے
اب کے طوفان جو آئے تو بہا دے مجھ کو

مجھ سے ہوتی نہیں برداشت بُرائی اُن کی
میرے پُرکھوں کے گناہوں کی سزا دے مجھکو

اِس نمائش کے تو خاکے ہیں ادھورے سارے
اب مکمل کوئی تصویر دکھا دے مجھ کو

راز کاشمیری

O

آ رہی ہے جو وقت کی آواز
یہ کہیں ہو نہ آخری آواز

چار سو اک مہیب سناٹا
موت کی نیند سو گئی آواز

جانے کس کو تلاش کرتی ہے
ہر دریچے میں جھانکتی آواز

حشر دل میں اٹھا گئی کیا کیا
سُن رہا ہوں ضمیر کی آواز

ایک گمبھیر خامشی ہر سمت
کس جگہ جا کے سو گئی آواز

رزم گاہِ جہاں میں ہوتی ہے
خامشی موت، زندگی آواز

کہہ گئی حسرتوں کا افسانہ
بھیگتی آنکھ، ڈوبتی آواز

ہر لبِ دل کے تار چھیڑ گئی
بزم در بزم راز کی آواز

O

ہم سے تو دیوانے اچھے
ہر غم سے بیگانے اچھے

خواب ہی نکلیں تعبیریں بھی
دیکھے خواب سہانے، اچھے

جو نہ کریں مجروح دلوں کو
سچ سے وہ افسانے اچھے

تھک کر اور بھی چُور ہوئے ہیں
بیٹھے ہم سستانے اچھے

غم کی دُھوپ نہ فکر کے سائے
درویشوں کے ٹھکانے اچھے

رازؔ کوئی اتنا تو بتائے
کب آئیں گے زمانے اچھے

سعید قیس

○

کبھی کبھی تو ستارہ شناس لگتا ہوں
میں غم پہن کے بڑا خوش لباس لگتا ہوں
مرے لہو کی یہ تلخی بھی کچھ عجب شے ہے
میں دوستوں کو سراپا مٹھاس لگتا ہوں
مرے وجود میں ہیں غار میری سوچوں کے
میں اپنی رُوح کا کوئی ہراس لگتا ہوں
وہ گلستاں میں ہے اک میٹھے پانیوں کی ندی
میں ریت کے کسی ٹیلے کی پیاس لگتا ہوں
یہ دُوریاں تو فقط راستوں کی ہیں، اے دوست
وگرنہ میں تو ترے آس پاس لگتا ہوں
رہِ وفا میں مرے نقشِ پا سلامت ہیں
میں ماضیوں کے سفر کا قیاس لگتا ہوں
لہو لہو مری سوچیں ہیں، زخم زخم خیال
میں تیرے حُسنِ بدن کا لباس لگتا ہوں

(بحرین)

○

عجب منظر ہے دل کے آئینوں میں
نظر آتا ہے وہ خالی جگہوں میں
مجھے پہچانتے ہیں دشت و صحرا
ترے سائے ہیں ان ویرانیوں میں
کبھی آباد تھا چڑیوں سے گلشن
پر اب کوئی نہیں ان گھونسلوں میں
برہنہ جسم ہیں یہ شہر والے
مگر لپٹے ہوئے ہیں چادروں میں
تمھارے بعد یوں ویران ہے گھر
پرندے بس گئے ہیں کھڑکیوں میں
کہاں ہیں قافلے، میں کس سے پوچھوں
کہ تنہا رہ گیا ہوں راستوں میں
نکل کر قیس ہم اُس کی گلی سے
بڑے رُسوا ہوئے ہیں دوستوں میں

(بحرین)

نکہت بریلوی

○

دیکھ کر ہم نے یہ موسم کا اثر جانا ہے
اب کے دستارِ حمیت نہیں، سر جانا ہے

اس کو ساحل پہ ہی کشتی سے اُتر جانا ہے
جس نے آسان محبت کا سفر جانا ہے

دل نے اس راہ میں بکھرے ہوئے کانٹوں کو گلاب
اور سُورج کی تمازت کو شجر جانا ہے

ہم نے پہلے بھی یہاں اہلِ ہُنر نے اکثر
غم کو منجملۂ اسبابِ ہُنر جانا ہے

کیا خبر قافلۂ شوق کو منزل کی طرف
کتنا چلنا ہے، کہاں جا کے ٹھہر جانا ہے

ہم بھی کیا سادہ طبیعت ہیں کہ ہم نے نکہتؔ
کج نگاہی کو محبت کی نظر جانا ہے

○

ہوا چمن میں کچھ ایسی چلی ہے اب کے بھی
گئی رُتوں کی طرح بے کلی ہے اب کے بھی

جو ہو تو کیسے درختوں پہ شور چڑیوں کا
کہ صبح سانچے میں شب کے ڈھلی ہے اب کے بھی

زباں ہلے، نہ سماعت کھُلے، نہ سر اُٹھے
یہ انتباہ بحرفِ جلی ہے اب کے بھی

متاعِ دیدہ و دل کو سنبھال کر چلیے
ہوائے کوئے بُتاں منچلی ہے اب کے بھی

وہی تکدّرِ ہجر و فراق ہے کہ جو تھا
نہ شب کٹی نہ قیامت ٹلی ہے اب کے بھی

سفر میں کیا ملا نکہتؔ بریلوی صاحب
یہی کہ خاک بدن پر ملی ہے اب کے بھی

سلطان محمود آشفتہ

○

لبوں پہ شک کے کلمے رَٹے ہوئے پاؤں
دُکھوں کی دُھول سے سینے اَٹے ہوئے پاؤں

گِھری گھٹائیں، ٹپکتی چھتوں پہ ہی دیکھوں
مہیب محلوں پہ بادل چَھٹے ہوئے پاؤں

کلاہِ شاہ پہ سجتا ہے جب نیا اک پَر
تو بے پروں کے سبھی پر کٹے ہوئے پاؤں

گلوں کے برگ بکھیروں روِش روِش لیکن
چمن سے نکلوں تو کپڑے پھٹے ہوئے پاؤں

بڑھوں تو کھینچ کے رکھوں نُکیل لمحوں کی
رُکوں تو سال کے سائے گھٹے ہوئے پاؤں

میں جس جہت بھی چلا، ایک ہی خدا دیکھا
خدا پرستوں کے رشتے بٹے ہوئے پاؤں

یہ بُخل ہوگا اگر داد دوں نہ آشفتہ
ہوس کے دشت میں سینے ڈٹے ہوئے پاؤں

(سعودی عرب)

○

میں نے پایا نہیں کچھ وسعتِ فن سے باہر
کس کو ملتا ہے سکوں اپنے وطن سے باہر

ساحلوں، بستیوں، باغوں میں چراغاں کر دوں
مہرِ مستور! کبھی آ تو گگن سے باہر

سوچ کے پاؤں میں گھنگھرو سا بندھا ہے جیسے
شعر کے روپ میں آتا ہے وہ چھَن سے باہر

رُوح کے داغ تو مٹنے سے رہے ظلِ الٰہ!
ہاتھ اندر ہوں کہ بے داغ کفن سے باہر

نام سلطان ہے، آشفتہ تخلص اس کا
میرا ہمزاد ہے اک میرے بدن سے باہر

سعید احمد اختر

○

وہ پہلے منظر میں ایسے پردہ گرا گیا ہے
کہ عمر بھر کو چراغ دل کے جلا گیا ہے

اُداس آنکھوں میں رتجگوں کی جلن چھپائے
ترا مسافر سلام کہہ کر چلا گیا ہے

تری وفائیں سمٹ کے نقطہ سی رہ گئی ہیں
مری محبت کا دائرہ پھیلتا گیا ہے

اُجاڑ راتوں کے سنگ نیچے مجھے ملی ہیں
کسی کی ریشم لحاف نیندوں کا کیا گیا ہے

بہ چشمِ نم آ کے میری میّت پہ میرا قاتل
بڑے سلیقے سے اپنا دامن بچا گیا ہے

ہمیں خبر تک ہوئی نہ اختر مقدمے کی
وہ مدعی اپنا فیصلہ بھی سنا گیا ہے

○

خستہ تن ، آبلہ پا بھی ہوں گے
اور ہم بانگِ درا بھی ہوں گے

بھولتا جاتا ہے چہرہ اُن کا
کھو گئے ہم تو خفا بھی ہوں گے

زخم بھی ہوں گے وہ میرے دل میں
اور ہونٹوں پہ دُعا بھی ہوں گے

ریت دُنیا کی کہاں بدلے گی
مل گئے ہیں تو جُدا بھی ہوں گے

اپنی قسمت میں ستم ہیں ورنہ
شہر میں اہلِ وفا بھی ہوں گے

ارشد ملتانی

○

دواریں، بولتی در بولتا ہے
کمالِ فن سے پتھر بولتا ہے

سماعت کی خدا توفیق دے تو
سکوتِ شب کا منظر بولتا ہے

خموشی ساحلوں کی یوں ہے جیسے
تلاطم میں سمندر بولتا ہے

کبھی ہوتی ہے خاموشی مسلط
کبھی جذبوں میں محشر بولتا ہے

کبھی دی آسمانوں نے گواہی
کبھی ہاتھوں میں کنکر بولتا ہے

بظاہر خامشی طاری ہے لیکن
اک افسوں ہے جو گھر گھر بولتا ہے

تری باتوں، ترے لفظوں میں ارشد
محبت کا سمندر بولتا ہے

○

دیر کو گوشۂ حرم جانا
ہر حقیقت کو محترم جانا

عشرتیں لاکھ تھیں زمانے میں
حاصلِ زیست تیرا غم جانا

اپنی تاریخ کو، ثقافت کو
اپنے اجداد کا بھرم جانا

بارشوں کو تری عطا سمجھے
خشکیوں کو ترا کرم جانا

اپنے فکر و نظر کی عفت کو
حرمت و عظمتِ قلم جانا

اشرف بخاری

○

پرچم کشا ہو شب تو نمودِ سحر لکھو
یہ حکم ہے، خزف کو مثیلِ گہر لکھو

اس شہرِ کم سواد میں پروا کسی کو کیا
یوں لاکھ بے اساسیٔ عرضِ ہنر لکھو

شاید وہ اَن لکھی سی بھی تحریر پڑھ سکے
چہرے پہ کوئی چیختی ایسی خبر لکھو

یارو امیرِ شہر کی آؤ منائیں خیر
جتنی شکایتیں ہیں، مرے نام پر لکھو

اشرفؔ تمھاری طول نویسی ہے اِک وبال
اب کے لکھو جو اُس کو تو خطِ مختصر لکھو

شاھد واسطی

○

مری گرفت نہیں ہے تمام لفظوں پر
رقم ہیں کتنے فسانے ہزار چہروں پر

اس ایک سوچ میں گم ہوں کہ رُت یہ کیسی ہے
پرند کیوں نہیں آتے گھنے درختوں پر

ہمارے نام ہی لکھی گئی ہے تیرہ شبی
ہمیں نے چاند اُتارے ہیں ان زمینوں پر

جنھیں گلی میں رُکے پانیوں سے خطرہ تھا
گھٹائیں ٹوٹ کے برسیں اُنھی مکانوں پر

اس ایک پل کی رفاقت نے کتنا ساتھ دیا
محیط ہو گئی میرے تمام لمحوں پر

ہائیڈگر کا "آتھینٹک مرد" اور اقبال کا "مردِ مومن"

ڈاکٹر سید عبداللہ

مغربی فکر میں "آتھینٹک" فرد (AUTHENTIC INDIVIDUAL)[1] یا صاحبِ یقین شخص کا سوال اس وقت اٹھا جب مغربی مابعد الطبیعیات، طبیعیات سے شکست کھا گئی جب سائنس زدگی کے زیرِ اثر مادی خارجیت اور خالص حواسیت کو غلبہ حاصل ہو گیا تو باطن کی دنیا اور خود ذات کے حقیقی ہونے کے بارے میں بھی شک کیا گیا کہ یہ نفس الامر میں ہے بھی یا نہیں[2]۔ بلاشبہ نفسیات نے داخلی پہلو کی جستجو کی، اور لاشعور کی گہرائیوں میں اترنے کی دعویدار ہوئی مگر اس کے نتائج اور فیصلوں نے انسان کو اپنے بارے میں اور بھی متشکک بنا دیا، یہاں تک کہ کارخانۂ عالم کی لغویت (ABSURDITY) بلکہ عدمیت (NOTHINGNESS) کا خیال عام ہو گیا ہے، جس سے خود بیزاری، ہر شے سے غیریت (ALIENATION) اور کربِ تنہائی جیسے میلانات[3] (امراض) اُبھر آئے۔

ان میلانات کا بڑا حصہ دراصل، انسان کی سالمیت[4] (WHOLENESS) سے انکار کا نتیجہ تھا یعنی اس بات کا انکار کہ انسان، مادی خارجی و حسی احوال کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے، اور اس "بہت کچھ" میں عقیدہ و یقین بھی ایک ایسی داخلی حالت ہے جو خارجی و حسی احوال میں ایک ربط پیدا کر کے وجود کو بامعنی اور بامقصد بنانے میں بڑا حصہ لیتی ہے۔

اسی داخلی حالت (یعنی عقیدے اور یقین) کی نفی کی وجہ سے مغربی معاشرے کے فرد کے باطن میں ایک خلا اور کھوکھلا پن پیدا ہوا، جس نے علوم کی بے پایاں وسعت اور زندگی کی ساری گھن گرج کے باوجود، فرد کو باہر سے سجا ہوا اور اندر سے خالی بنا دیا۔

اندروں چوں گورِ کافر پُر خلل   اندروں قہرِ خدائے عز و جل

یہی وہ فرد ہے جسے اصطلاحِ عام میں (NON-AUTHENTIC INDIVIDUAL) کہا جا سکتا ہے۔ یہ فرد حواس کا غلام، بے یقینا اور لا مقصد ہے۔

جب مغرب میں خارجیت اور حواسیت کے خوفناک نتائج سے آگاہی بڑھی تو بعض اہلِ فکر نے ان میلانات و رجحانات کے سامنے بند باندھنے کی ٹھانی تاکہ فرد کا اپنی ذات میں یقین بحال ہو سکے، اسے اپنی زندگی بامعنی و بامقصد معلوم ہو اور وہ اس حالت سے بہرہ ور ہو جائے جسے سکونِ قلب اور وثوقِ ذات کہتے ہیں۔

اسی سوچ نے کئی رُخ اختیار کیے۔ مثلاً عینیت پر مزید زور، مذہب اور عقیدے کی بحالی کی سعی اور مقصد کی تلاش۔ اس سلسلے میں وجودیت (EXISTENTIALISM) کی سوچ بھی ایک رُخ کی نمائندگی کرتی ہے جسے بعض اہلِ فکر نے مجموعۂ اضداد کہا ہے ——— اس لحاظ سے کہ ایک طرف تو اس کے مفکر زندگی کو لایعنی اور لغو اور انسان کو OUTSIDER اور[5] STRANGER کہہ کر اسے یتیم اور لاوارث

---

[1] میں نے کئی وجوہ سے اس عنوان کو ترجیح دی ہے۔ تفصیل حواشی میں آتی ہے۔ ہمارے ادبوں میں فرد کے خصوصی شعور و اعتماد کے لیے کئی اور الفاظ بھی گئے ہیں: صاحبِ ایمان، مردِ مومن) حق اور صاحبِ تصدیق تو عام ہیں لیکن ایک اور جہت سے سعدی کے یہاں صاحبِ دل، اور صائب تبریزی کے یہاں، مردِ روشن دل، یار روشن ضمیر بھی استعمال ہوا ہے۔ میرے نزدیک انسانِ کامل ہمارے موجودہ مقصد کے لیے موزوں لفظ نہیں۔ نیز دیکھیے حواشی (حاشیہ ۱)

(TRAGICALLY ORPHANED) کا خطاب دیتے ہیں اور دوسری طرف انھیں کسی ایسے فارمولے کی جستجو بھی ہے جو زندگی کو بامقصد بنا سکے اور انسان کا اپنے بارے میں اعتماد بحال ہو جائے۔

وجودیوں کے دو دبستان ہیں، ایک میں البرٹ کامیو، ژاں پال سارتر جیسے لوگ شامل ہیں جو خدا کی ہستی کو نہیں مانتے، اور دوسرے میں کرک گارد، گیبریل مارسل، مارٹن بوبر اور کارل یسپرز جیسے لوگ ہیں جو خدا کے قائل ہیں، مگر عجیب بات یہ ہے کہ ان کے باخدا و بے خدا دونوں گروہ تشکیکی ہیں، تاہم زندگی کو بامقصد بنانے کی آرزو دونوں رکھتے ہیں، مگر دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے کی وجہ سے وہ کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچے اور ابھی تک AUTHENTIC INDIVIDUAL (صاحبِ یقین اور خودی آشنا فرد کی جستجو) کے چکر میں ہیں۔ (یعنی AUTHE-NTIC EXISTENCE OF THE INDIVIDUAL کے لیے تڑپ رہے ہیں)

دراصل یہ سب باتیں عزتِ نفس، کثرتِ دولت، انتہاپسندانہ سائنسی زندگی اور ایمان کے فقدان کا نتیجہ ہیں۔ جب تک اندر کا شیطان رام نہیں ہوتا، یقین کا چہرہ دیکھنا محال ہے۔ وجودیوں پر غالب کا یہ مصرع صادق آتا ہے ؏

عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

اصل قصہ ایمان کی بحالی کا ہے، مگر وہ اِدھر نہیں آتے۔ ان وجودیوں میں انامانو (UNAMANU) زندگی میں مقصد کو ذریعۂ تسکین مانتا ہے، اور قدرے بہتر مارٹن بوبر (BUBER) ہے جس کا فلسفہ I & THOU یا ڈائیلاگ (مَیں اور تو یا مکالمہ و مخاطبہ) کسی قدر انسان کی سالمیت کی طرف ایک مثبت قدم ہے، اور اسی سالمیت کے اندر سے ایک پگڈنڈی ایمان کی طرف بھی نکلتی ہے اگرچہ ٹیڑھی میڑھی اس میں بھی ہے۔ یہ مسلک دراصل ٹھیٹھ مادہ پرستوں، وجودیوں اور احیائے مذہب کے دبستان کے درمیان کہیں واقع

یہ معلوم ہے کہ احیائے مذہب (خصوصاً عیسائیت کے تعلق میں) ایک توانا تحریک یورپ میں کچھ سوشیالوجی کے رستے سے اور قدرے نفسیات کے توسط سے آئی ہے۔ جو انسان کے یقین و ایمان کی بحالی کے لیے کوشاں ہے۔ اس گروہ میں پال ٹلش (PAUL TILLICH) ٹالکاٹ پارسن (TALCOTT PARSON) وغیرہ شامل ہیں۔ یہ لوگ فکر کی بند گلیوں میں اُچھل کود کرتے رہتے ہیں، کہیں انسانیت نوازی (HUMANISM) کی جذباتی اپیل سے اور کہیں معاشرتی علوم سے استفادہ کر کے یقین، امید اور ایمان کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن اصل شے تو نفس کی پہچان اور اس کے مافوقی حصے کا مقابلہ ہے۔ وہ ابھی ابھر کر سامنے نہیں آئی۔

یقین و ایمان کی یہ تحریک کہاں تک کامیاب ہوئی، اس پر کوئی قطعی رائے دینا مشکل ہے، دراصل سارا قصور اس تصور کا ہے جو اہلِ مغرب نے خدا، کائنات اور انسان کی جدائی کے بارے میں قائم کر رکھا ہے، اور وہ دماغوں میں راسخ ہے۔ مغربی اس تکون (مثلث) میں ربط پیدا کرنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوئے اور اس ربط کے بغیر اطمینان اور اعتماد کی بحالی ممکن ہی نہیں۔ اصل علاج کلیت اور سالمیت میں اعتماد ہے جس میں یہ تکون اور حواس اور قلب و وجدان سب جمع ہو جاتے ہیں۔ اقبال کے بقول ؏

یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

لیکن مغرب کا بگڑا ہوا مزاج اِدھر نہیں آتا، اور تغیر کے نظریے کی یکطرفہ تعبیر کی وجہ سے، جدت برائے جدت اور ہمہ حال پیش قدمی کے خیال کی وجہ سے ایک ثابت شدہ غلطی کا علاج بھی ایک دوسری غلطی سے کرتا رہتا ہے۔ وہ ناک کی سیدھ چلتا ہے اور کھڈ پر پہنچ کر بھی نہیں رکتا۔ اسے معلوم ہے کہ نفسِ مافوقی اسے خراب کر رہا ہے مگر اپنی لذت دوستی و جدت پسندی کی وجہ سے وہ نفس سے آنکھیں چار کرنے کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس کا پیغمبر ڈاکٹر فاؤسٹس ہے اور اس کے ذہنی ہیرو اوڈی پس اور الیکٹرا ہیں۔

یہاں پہنچ کر میں اس موضوع کے تعلق میں اسلامی فکر کی طرف کچھ اشارے کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مسلم

زم کی سوچ میں دیگر کچھ خامیاں ہوں گی لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ اس کی فکریات میں یہ کجی نہیں جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ اس فکر میں انسان کو نہ صرف صاحبِ یقین و تصدیق مانا گیا ہے بلکہ اسے نائبِ حق کا شرف بھی حاصل ہے۔ قرآنی تصورِ خدا، کائنات اور انسان کی مومن میں گہرا عقیدہ پیدا کرتا ہے۔ انسان کے لیے ایمان کو اساسی حیثیت دے کر اعمالِ صالحہ اور تصورِ آخرت (جزا و سزا) کو اس کے ساتھ مربوط کر کے صاحبِ یقین و تصدیق افراد پیدا کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان وہ سنگِ بنیاد ہے جس پر تصدیقِ قلبی اور عمل بالجوارح کی ایک مکمل عمارت تیار ہو سکتی ہے۔

اس عقیدے کی لہر مسلمانوں کے افکار میں ہر جگہ دوڑتی نظر آتی ہے۔ اس میں اہلِ دین تو علمبرداروں کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن صوفیہ اور حکما تک بھی کسی نہ کسی رنگ میں انسان کو ذمے داری اور نیابتِ حق کے اعزاز سے مشرف مانتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ شیخ اکبرؒ ابن عربی کی فکریات کی غلط اور ادھوری تعبیر سے بعض اوقات غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس سے انسان کے احساسِ ذمہ داری اور ذوقِ یقین کو نقصان پہنچا ہے لیکن ابن عربی کو زیادہ ہمدردانہ پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ شیخ کے یہاں بھی انسان کی حیثیت ذمے دارانہ اور مستقل ہے۔ شیخ نے مراتبِ وجود کی جو ترتیب قائم کی ہے، نزولی، صعودی اور دَوری ہونے کے باوجود شرفِ انسانی کے لحاظ سے وہ ارتقائی اور انکشافی ہی ہے اور جب کہ حقیقتِ محمدیہ کو نورِ اعلیٰ (تجلی) کا مرکزِ خاص یا مرکزِ اول قرار دیا ہے اور حقیقتِ انسانیہ کو اسی نکتے کے اردگرد لپیٹ دیا جائے تو یہ بھی رتبہ انسان کا ایک بلند مقام ہے اور اس سارے سلسلے میں ایمان، روحانی تجربہ، یقین، رہنمائی کرتا رہتا ہے اور دعا اس کے لیے قربتِ الٰہی اور یہ قربتِ اعلیٰ اس کے لیے اطمینان و سکون کا وسیلہ بنتی ہے۔ (دیکھیے علامہ اقبال کا انگریزی خطبہ حقیقتِ دعا)

شیخ اکبر کے تصور کا اثر اپنے زمانے سے آج تک برابر قائم ہے چنانچہ اس کی شعاعیں عبدالکریم الجیلیؒ، محمود شبستریؒ، رومیؒ، جامیؒ اور متاخرین میں شاہ ولی اللہؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ تک میں پائی جاتی ہیں اور ایک مختلف رنگ میں شیخ مجدد سرہندیؒ، میرزا بیدلؒ، اور ان سے کچھ مختلف خواجہ میر دردؒ دکھاتے ہیں۔ یہ سب علما انسان کو خلاصۂ کائنات مان کر اسے صاحبِ امانت (نائبِ حق) قرار دیتے ہیں اور نائبِ حق کا منصب پختہ اور گہرے یقین کے بغیر سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

انسان کے متعلق علامہ اقبال کا تصور اصولی طور سے قرآنی ہے۔ انھوں نے یہ تصور خودی کے نظریے سے مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ اس میں صاحبِ ایمان انسان کو نائبِ حق اور مردِ مومن سے مخاطب کیا گیا ہے —— اور قرآنی الفاظ میں عبد (جمع عباد) کہا گیا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ اقبال کے نزدیک عبد اور عبدہٗ میں فرق ہے۔ عبد سے عام صاحبِ ایمان انسان —— اور عبدہٗ سے حضور سرورِ کائناتؐ کی ذاتِ مبارک مراد ہے۔ اس غلط فہمی کا ازالہ لازمی ہے کہ اقبال کے یہاں انسانِ کامل کا جو تصور ہے وہ ابنِ عربی کے تصورِ انسان الکامل اور نطشے کے فوق البشر سے ماخوذ ہے جیسا کہ انھوں نے خود تشریح کی ہے۔ یہ کارلائل کے ہیرو سے بھی مختلف ہے اور یہ CHRISMATIC PERSON سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس میں عبدہٗ بقول اقبال چیزے دیگر است مگر محض عبد بھی یقین و ایمان کی توانائی سے اوپر اٹھتا، اور اطاعت اور ضبطِ نفس کے ذریعے نائبِ حق کے منصب پر فائز ہو کر ستاروں سے بھی آگے بڑھ جانے کی آرزو رکھتا ہے۔

عبد کے اوصاف اور امکاناتِ ترقی (متناہی سے لامتناہی کی طرف بڑھنا)، اس کی تفصیل "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" میں موجود ہے اور بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے یہاں، انسان خدا کا مطلوب ہے۔ "زبورِ عجمؒ" کا یہ مصرع اس کی تائید میں ہے ؏

ما از خدای گم شدہ ایم او بجستجو است

اور یہ بھی کہ ؏

خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

مرشدِ رومی تو انسانم آرزوست کہتے کہتے ممکن ہے کامیاب ہو گئے ہوں لیکن اقبال کا انسان، لاہوت کی جانب گرم پرواز ہے۔ وہ اس شاہین کو دام میں لانا چاہتا ہے جو سدرۃ المنتہیٰ اور اعلیٰ علیین سے بھی آگے لامتناہی کی فضا میں کہیں ہے جس کا نشان نہیں پایا جاسکتا لیکن اقبال کہتے ہیں ؏ یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

انسان کے مقاماتِ بلند کا یہ اعتراف اس کے بارِ امانت، ذوق و شوق، عشق اور ایمان و یقین کی وجہ سے ہے جو "یومنون بالغیب" کے مصداق، یقین کے مقناطیس سے ان حقائق پر بھی آہنی گرفت رکھتا ہے جو ہنوز مرئی و محسوس نہیں مگر اس کا قلب گواہی دیتا ہے کہ یہ سب سچ ہے۔ عبدہٗ، کائنات اور خدا تینوں حقیقت میں اور عبدہٗ (بقول ابن عربیؒ) فردیت بصورتِ اعلیٰ کے مقام پر متمکن ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ افراد، صاحبِ یقین و اعتماد تبھی ہو سکتے ہیں جب انہیں اپنے منصب کا گہرا شعور ہو، وہ تعلق باللہ کی ذہنی تصدیق قلبی رکھتے ہوں اور مقدس تکون (خدا، کائنات اور انسان) کے باہمی ربط کو ناگزیر سمجھ کر زندگی کو تفریق و تجزیے (یعنی جز جز اجزاء دیکھنے) کے بجائے اسے سالم اور کل کے طور دیکھتے ہوں، وہ یومنون بالغیب ہوں اور دنیا کو اس کے تابع، بامقصد اور بامعنی بناتے ہوں۔ وہ خود کو مکلف اور ذمہ دار مانتے اور کائنات کو خدا کی کتاب سمجھ کر عقبیٰ و آخرت میں اعتقاد رکھتے ہوں اور خدا کی حکمتوں کے عملی شارح اور اوصافِ خداوندی کا عملی نمونہ بن جائیں۔ اس منزل کی طرف رہنمائی عقلِ محض نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے ذوقی و روحانی تجربہ (ایمان) درکار ہے جو تصدیق کے بعد ذکر و فکر سے جلا پاتا ہے۔ قرآن مجید کی رہنمائی یہی ہے اور یہ آیات اس کی گواہی دیتی ہیں۔

انَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ والارضِ وَ اخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَ النَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ○
الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ہٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ [۳ (آل عمران) ۱۹۰-۱۹۱]

[ترجمہ: بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حالت میں) خدا کو یاد کرتے اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے (اور کہتے) ہیں کہ اے ہمارے پروردگار تو نے اس مخلوق کو بے فائدہ (عبث) نہیں پیدا کیا۔ تو پاک ہے۔ تو (قیامت کے دن) ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیو]

درحقیقت انہیں عناصر سے ایک آہنگ فرد کی ساخت ہوتی ہے مگر اس کے لیے چشمِ باطن کا وا ہونا ضروری ہے۔

حواشی

۱- میں نے "آہنگ فرد" کا ترجمہ صاحبِ یقین فرد وجودیت کے فلسفے کے حوالے سے کیا ہے۔ اس فکر میں EXISTENCE کے کئی معنی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فرد کی ذات مشکوک ہے مگر ایک یہ بھی ہے کہ خود کو اپنی ذات کے بارے میں یقین ہو کہ یہ ہے اور حقیقی ہے۔ درج ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں:

'TO EXIST IS TO REALISE MAN CAN BE NOTHING'. TO REACH BEYOND ONE'S OWN BEING; TO STAND OUTSIDE ONESELF, TO EXTEND BEYOND ONESELF WHEN A SERIOUSLY EXISTING MAN ALLOWS HIS LIFE TO UNDERGO INTERROGATION TO ITS VERY ROOTS, HE WILL SENSE THAT HIS LIFE IS BOTTOMLESS; TO EXIT IS TO VALUE PERSONAL AUTHENTICITY MORE HIGHLY THAN SCIENTIFIC EXACT-ITUDE.'

(CHRISTIANITY & THE EXISTENTIALISM ED. BY CARL MICHALSON, P.17).

لیکن یہ بھی واضح ہے کہ کلا اپنے الجھاؤ کی وجہ سے، بہت سے مواقع پر نفی بے یقینی، شک اور معاشرے سے آزاد محض فردیت (نہ کہ انفرادیت) پر منتج ہو جاتا ہے۔ اس لئے میں نے مرکزی معنی کو لیا ہے۔ اس سے بعض صاحبوں کی تسلی نہ ہو گی مگر ہم محض ترجمہ کرنے والے طوطے ہیں۔ میں بھی طوطا ہوں لیکن میں نے اپنے ماحول کے مطابق، ایک قریب ترین ترکیب اختیار کر لی ہے۔ دیگر متبادلات یہ بھی ہو سکتے تھے، فرد تصدیقی، فرد حقیقی، فرد قائم بالذات وغیرہ وغیرہ۔
میں نے اس کا ترجمہ مرد مومن کرنے سے دانستہ گریز کیا ہے کیونکہ اس کا ماحول خالص اسلامی اور قرآنی ہے۔ میں نے عام اطلاق کو مدنظر رکھا ہے۔
مردِ مومن سے ملتی جلتی ترکیبیں، اور بھی ہیں، مثلاً مردِ حق، فرد بالحق، مردِ خدا، فردِ مطلق، مردِ ذمہ دار وغیرہ
میری رائے میں اس میں اقبالؔ اور ابنِ عربی دونوں کے انسان کامل یا فوق البشر کا مفہوم موجود نہیں۔ البتہ مردِ خودی آشنا ہو سکتا ہے۔ مقصد فقط یہ ہے کہ ایک فرد جسے اپنے وجود یا ذات کے موجود ہونے کا پورا یقین ہو اور وہ اپنے اعمال کی ذمہ داری لیتا ہو اور اچھے اور برے اعمال کا انتخاب کر کے جزا سزا کو حقیقت مانتا ہو۔

۲- جیسا کہ وجودیت کے اس دبستان میں جس کی سربراہی سارتر اور کامیو (CAMUS) کرتے ہیں جن کے مسلک کو فلسفیانہ NIHILISM (نافیت) کہا گیا ہے، لیکن ہائیڈگر نفی کے بجائے اپنے تصور کو فنا اور معدومیت سے وابستہ کرتا ہے۔ اس کے خیال کا خلاصہ یہ ہے: - NOTHINGNESS BELONGS TO BEING AS SUCH لیکن مجموعی طور سے مذکورہ ادب سے اکثر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ کائنات عبث ہے اور انسان (فرد) کا وجود محض تماشائے آب و گل ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ انسان کے حقیقی ہونے کے بارے میں اہلِ نفسیات نے بھی سوال اٹھایا ہے (دیکھئے آگے)۔ اس خیال کو بعض مصنفوں نے ایک اور پہلو سے واضح کیا ہے اور یہ زیادہ تر تمثیلی ادب کے ذریعے۔ مثلاً شکسپیئر کے اس خیال کو اہمیت دی جاتی ہے کہ "دنیا ایک سٹیج ہے اور ہم سب گویا ایکٹر ہیں"، ظاہر ہے کہ ایکٹنگ اپنا عمل یا کردار نہیں ہوتا، یہ کسی اور کا بہروپ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے علامہ اقبالؔ نے ٹوکا اور کہا:

حریم تیرا خودی غیر کی معاذ اللہ دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات (نظم تمثیل)

بہر حال زندگی اور وجود کے غیر حقیقی ہونے کا تصور خاصا عام ہے۔ یہاں تک کہ زندگی کے سنجیدہ کاروبار کے لئے بھی ایکٹ (ACT) اور رول (ROLE) اور سٹیج (STAGE) جیسے الفاظ لائے جاتے ہیں۔ از زیادہ تفصیل کے لئے دیکھئے:

DRAMA IN LIFE, ED BY I.E COMBS & M.W MANSFIELD, 1976 (U S A)

خصوصاً اس کے ابواب: (۱) SOCIETY AS DRAMA اور (۲) MAN AS AN ACTOR

مرزا غالبؔ نے ایک اور مفہوم میں کہا تھا: بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

۳- اس بحث کا تعلق EXISTENTIAL PSYCHOLOGY سے ہے، ورائے شخص کی تشریحات کے طور پر واضح کیا گیا ہے لیکن یہ بحثیں پیچیدہ ہیں، ان کا مذہب کی نفسیات سے رشتہ جوڑا گیا ہے۔ مثلاً GORDON ALLPORT نے ایک مکمل اور کامل مذہب کی نفسیات پر اچھی بحث کی ہے اور اس میں ایک مذہبی عمل یہ بھی بتایا ہے کہ ایک صاحب بلوغ شخص (MATURE PERSON) ہمیشہ اپنی ذات اور اس کے فیصلوں کے بارے میں شک سے آگے بڑھتا ہے۔
PERSON کی تشریح کے لئے دیکھئے FOUNDATIONS FOR A SCIENCE OF PERSONALITY مصنفہ ANDRAS ANGYAL طبع انگلستان ۱۹۴۱؛ PERSONALITY مصنفہ گارڈنر مرفی ۱۹۴۷؛ THE COCEPT OF MAN مرتبہ پی۔ ٹی۔ راجو ۱۹۶۶ء برطانیہ۔

۴- ان میلانات کی تفصیل کے لئے دیکھئے RELIGION AND MODERN MAN مصنفہ J.B. MAGEE (طبع نیویارک ۱۹۶۷) صفحہ ۲۰۳ تا ۲۱۲۔
ان میلانات کا نمایاں اظہار مغرب کے ذہنی ادب اور فن میں بھی بڑے جوش و خروش سے ہوا ہے۔ مثلاً کامیو (CAMUS) کے ناول THE PLAGUE میں جس میں اس کے کرداروں نے کارخانۂ عالم کو عبث اور بے معنی قرار دیا ہے۔ دستوفسکی کے ناول زندگی کے الم کے ترجمان ہیں لیکن ٹامس کی بھی اس پر

اُٹھتی ہے CAN AUTHENTIC HUMAN LIFE BE LIVED IN AN ABSURD WORLD DEVOID OF MEANING?
طالسٹائی نسبتاً بہتر ہیں۔ لیکن جیمز جوائس، سارتر (NAUSEA)، ادو ہیمنگوے، کافکا وغیرہ سب انھیں تشکیکات کی عکاسی اور ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں یہاں تک کہ فن کے نقاد J MARITAIN کا جھکاؤ بھی ادھر ہی ہے۔

۵۔ جدید مغربی فکر بالعموم اجزا پسندی اور تفریق پسندی کا سایہ ہے۔ غضب یہ ہے کہ اس نے انسان کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں اور اس طرح سالم (اور کُل) انسان کو ریزہ ریزہ کر کے اس کے اجزا کے ایک ایک حصے کو کل سمجھ لیا ہے اور بس اسی پر توجہ مرکوز کر کے ناک کی سیدھ ریسرچیں ہو رہی ہیں۔ کے۔ ڈی۔ ماجونے (THE CONCEPT OF MAN) میں صحیح لکھا ہے کہ ہماری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہم جب انسان پر کچھ لکھتے ہیں تو سالم انسان (THE WHOLE MAN) کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ غور کیجیے تو انسان سب سے پہلے ایک مادی مخلوق ہے۔ پھر ذی حیات (حیوان) ہے اور یہ حیوان، حیوانِ ناطق بھی ہے اور عاقل بھی۔ وہ معاشرے کا ایک حصہ بھی ہے اور اس کی باطن کی جبلتوں کا تقاضا ہے کہ اس کا کوئی مقصد بھی ہو، وہ مادی ترقی بھی کرے اور روحانی دنیا میں متناہی سے لامتناہی کی طرف بھی بڑھے۔ اس لحاظ سے وہ ایک مذہب پسند مخلوق ہے اور سچائیوں کی جستجو اس کی فطرت کا حصہ ہے۔ اس لحاظ سے وہ ایک مرکب کثیر العناصر مخلوق (COMPLEX CREATURE) ہے۔ مگر عموماً اس سالم انسان کو جز جز دیکھا جاتا ہے، اسی سے انتشارِ فکر اور معاشرتی بحران پیدا ہوئے۔ (کتاب مذکور ص ۳۸)

اگر صرف اندر کی پوری دنیا کے حوالے سے ہی خارج کے متعلق کچھ نتیجے نکالے جائیں تو اس سے بھی فائدہ ہو سکتا ہے مثلاً میکڈوگل کی بیان کردہ جبلتوں کے کلی نقطۂ نظر ہی سے بات کی جائے تو بھی ہم خاصے کامیاب ہو سکتے ہیں مگر مغربی جدت برائے جدت اور تخصص کے میلان میں اس قدر اسیر ہیں کہ انھوں نے انسان یعنی سالم انسان کے پرزے اڑائے ہیں۔ اسی طرح کتاب CONCEPT OF HOLINESS میں مصنف نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ WHOLENESS افضل ہے HOLINESS سے کیونکہ سابق الذکر میں ذمے داری اور جد و جہد ہے اور موخر الذکر ایک عطیۂ ایزدی ہے۔ WHOLE کی مزید تشریح کے لئے دیکھیے ROUNER کی کتاب PHILOSOPHY, RELIGION & CIVILIZATION

۶۔ کامیو (CAMUS) کی کتاب ہے۔

۷۔ MAGEE کی مذکورہ کتاب (RELIGION AND MODERN MAN) صفحہ ۲۷ و بعد

۸۔ دیکھیے بیوبر کی کتابوں کے علاوہ مذکورہ بالا کتاب کا باب THE ETHICS OF DIVINE HUMAN DIALOGUE .

۹۔ سوشیالوجی کے شعبے میں WEBER اور DURKHEIM کے خیالات اور خالص مذہبی شعبے میں پال ٹلش اور RICHARD NEIBUHR اور WILFRED SMITH آتے ہیں (ملاحظہ ہو کتاب BEYOND BELIEF مصنفہ ROBERT N. BELLAH ص ۲۵۵ و بعد)

۱۰۔ NAGEE کی کتاب مذکورہ۔

۱۱۔ حدیث میں آیا ہے: واعدیٰ عدوک نفسک التی بین جنبیک (ترجمہ: تمہارا سب سے بڑا دشمن نفس ہے جو تمہارے پہلوؤں میں ہے)

۱۲۔ صحیح نقطۂ نظر کے لیے دیکھیے حسین نصر کی انگریزی کتاب THE THREE SAGES، مطبوعہ ہارورڈ ۱۹۶۴ء، ص ۱۰۲ تا ۱۸۸۔

۱۳۔ انھیں تنزلات ستہ بھی کہتے ہیں۔

۱۴۔ ان کی کتاب کا نام الانسان الکامل ہے جو عربی میں ہے۔ اس کے ایک سے زیادہ ترجمے ہوئے ہیں۔ اردو میں ایک ترجمہ (دو جلدوں میں) ظہیر احمد ظہیری نے ۱۹۰۸ء میں کیا اور مطبع فیض بخش فیروز پور شہر میں طبع ہوا۔ کچھ اور ترجمے بھی ہیں

۱۵۔ ان کی کتاب گلشن راز ہے جس میں انھوں نے سترہ سوالوں کے منظوم جواب دیے ہیں۔ ان سوالوں میں ایک سوال "مرا از من خبر کن" بھی ہے۔ اس میں انسان کے شرف اور مقام بلند کا ذکر کرتے ہوئے بشیر و ہم نذیر کہا ہے۔ اس کتاب کے مطالب کو اگر BUBERISM کے حوالے سے پڑھا جائے تو مفید نتائج

برآمد ہوں گے۔ علامہ اقبال نے اس کے جواب میں گلشن راز جدید لکھی ہے۔ اس کے علاوہ مناجات عبداللہ انصاری (فارسی) بھی مفید کتاب ہے۔

۱۶۔ مثنوی معنوی۔ اس میں مردِ خدا کا تصور ہمارے موضوع سے قریبی تعلق رکھتا ہے

۱۷۔ لوائح جامی ایک طرح سے ابن عربی کی فارسی میں تشریح ہے۔

۱۸۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کی ایک سے زیادہ کتابیں تصوف کے موضوع پر ہیں۔ ان میں لمعات سطعات اور ہمعات اہم ہیں۔ یہ ایک حد تک ابن عربی کے طرزِ فکر سے متاثر ہیں۔

۱۹۔ شاہ شہید نے عبقات میں کچھ تو شاہ ولی اللہ صاحب سے اثر قبول کیا ہے مگر ایک لحاظ سے، اسے ابن عربی ہی کی حکمت کا بیان جدید کہا جا سکتا ہے اس کا عمدہ اردو ترجمہ مناظر احسن گیلانی نے کیا ہے

۲۰۔ ان کے فکر کی تفصیل ملک حسن علی کی کتاب تعلیمات مجددیہ (اردو) میں ہے جو ان کے مکتوبات پر مبنی ہے۔

۲۱۔ مرزا عبدالقادر بیدل کی کلیات کابل میں طبع ہوئی ہے۔ عام طور سے اہل علم نے ان کی مثنویات کا گہرا تجزیہ نہیں کیا۔ ان کی مثنوی عرفان ابن عربی کے افکار پر ریاضیاتی سوچ (حساب اور اعداد فیثاغورث کی) کی روشنی میں نیا اضافہ ہے، یہ مثنوی اس قابل ہے کہ اس کا فلسفیانہ مطالعہ (نفسیات عامہ اور نفسیات مذہب کی روشنی میں) کیا جائے، اس میں ذاتِ باری، حقیقت انسان اور حقیقت کائنات پر نہایت عمیق خیالات ملتے ہیں۔ شرفِ نفس، انسان اور کائنات بطور ایک "مسئلہ حسابی" اس کے اہم مباحث ہیں۔ یوں بیدل کی دوسری مثنویات "طلسمِ حیرت" اور "محیطِ اعظم" بھی قابلِ توجہ ہیں۔ بیدل کی مثنوی "عرفان" میں تین باتیں، اہلِ فکر کے لیے قابلِ مطالعہ ہیں۔ اول یہ کہ وجود کے اثبات کے لیے کسی غیر کا ہونا ضروری ہے، غیر کا یہ تصور آگے بڑھ کر تمام موجودات پر حاوی ہو جاتا ہے خواہ مجازی ہی کیوں نہ ہو (غیر بینی است خویشتن بینی) دوم حقیقتِ انسانیت جملہ کائنات پر حاوی ہے اور اس سب کا مرکز حقیقت محمدیہ ہے جو ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔ سوم یہ کہ عام انسان کے لیے جو بے تربیت یا ہنوز زیرِ تربیت ہے تردد توکل سے بہتر ہے۔ غیر کے سلسلے میں شعر ہے:

غیر تا در نظر مقابل نیست — ہیچ کس را شعور حاصل نیست

ہر یکے را مقابلے در کار — تا ز تحقیق خویش یابد بار (ص ۹۹)

ص ۱۲۶ کا یہ عنوان قابل مطالعہ ہے:

نیست پوشیدہ زار بابِ نظر — کہ تردد ز توکل بہتر

در توکل چہ آبرو دیدی — جز فسردن دگر چہ فہمیدی

۲۲۔ خواجہ میر درد، عہد محمد شاہ و احمد شاہ کے صوفی بزرگ اور نامور اردو شاعر تھے۔ ان کے والد نے تصوف کے ایک سلسلہ طریقہ محمدیہ کو رواج دیا جو کئی لحاظ سے شیخ مجدد کے سلسلہ قیومیہ (احمدیہ) سے الگ سوچ یا تجربے کا مظہر ہے۔ ان کی اہم کتاب "علم الکتاب" (مع واردات) فارسی میں ہے جس میں، انھوں نے اپنے مسلکِ محمدیہ کی تشریح کے علاوہ حقیقتِ انسانیہ اور حقیقت محمدیہ کی بڑی فکر انگیز تشریح کر کے اصطلاحات تصوف کے اپنے معنی بتائے ہیں۔ یہ بڑے سائز کی ضخیم کتاب ہے اور اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ طبع کیا جائے۔

۲۳۔ یہ اشارے "جاوید نامہ" میں حلاج کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رتبے کی تشریح کرتے ہوئے حلاج کہتا ہے:

پیش او گیتی جبیں فرسودہ است — خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است

عبدہٗ از فہم تو بالاتر است — زاں کہ او ہم آدم و ہم جوہر است

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر — ما سراپا انتظار او منتظر
عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہ ست — ما ہمہ رنگیم او بے رنگ و بو است

عبدہٗ چند و چگونِ کائنات — عبدہٗ راز درون کائنات

(جاوید نامہ در کلیات اقبال فارسی مطبوعہ غلام علی سنز، ص ۸-۱۲۹-۱۱-۷۱-۷۱۸) یہ وہ مقام ہے جہاں اقبال خاصی حد تک ابن عربی کے فکر کے متوازی آگئے ہیں۔ تاہم حضرت مجددؒ کے تصورِ عبدیت کے بھی قریب ہیں۔

۲۴۔ اقبال کی یہ غزل (نظم) بڑی قابلِ توجہ ہے:

ما از خدائے گم شدہ ایم او بجستجو است — چوں ما نیازمند و گرفتارِ آرزو است
گاہے بہ برگِ لالہ نویسد پیامِ خویش — گاہے درونِ سینۂ مرغاں بہ ہاو ہو است

در خاکدانِ ما گہرِ زندگی گم است — ایں گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست

(کلیات اقبال فارسی غلام علی ایڈیشن، ص ۹۳-۴۸۵)

۲۵۔ ابن عربی کی فصوص الحکم کی ستائیسویں حکمت کا موضوع ہے: فردیت کی فص کلمۂ محمدیہ میں۔ اس حکمت کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمتِ فردیت اس واسطے سے ہے کہ آپ نوعِ انسانی میں موجود یعنی فردِ کامل ہیں۔ نوعِ انسانی سے بالاتر بھی ہیں اور اسی لیے امرِ وجود کا آغاز آپ سے ہوا اور آپ پر ہی انجام ہوا ...... (اردو ترجمہ از برکت اللہ رضا لکھنوی، ص ۴۲۲ تا ۴۴۰)
فصوص کی آٹھویں فصل ہے ــــ عالم انسان، حقیقت کی ایک صورت ہے (ص ۱۲۴)، یعنی انسان فرد کوئی مشکوک اور فرضی نقلی مخلوق نہیں، فیضِ تجلی کی بدولت قائم بالذات ہے۔

اقبال اور شاہ سلیمان پھلواروی

حسن مثنّیٰ ندوی

(۱)

۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے سلطنت مغلیہ کا تختہ اُلٹ دیا اور تخت و تاج اسلامیانِ برعظیم کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ ۱۹۴۷ء میں چھنا ہوا اقتدار و اختیار انگریزوں سے پھر واپس لیا گیا اور ایک نئی مملکت پاکستان وجود میں آئی۔ ان دونوں واقعات کے درمیان پورے نوّے سال کا عرصہ حائل ہے۔ کس مکشِ حیات اور جہادِ زندگانی کا عرصہ! تخت و تاج چھنتے ہی جو ہولناکیاں برپا ہوئیں، تباہیاں پھیلیں، شیرازہ بکھرا، قتل و غارت اور گیر و دار کا سلسلہ عام جاری ہوا تو اس وحشت و انتشار کی اندھیاری میں سید احمد خاں پہلے مسلمان تھے جو سنبھلے اور سنبھالنے کے لیے اُٹھے اور جس طرح بھی ان سے بن پڑا انھوں نے سنبھالا۔ یہ کام ان ہی کا تھا۔ پھر جب عنانِ حکومت و اقتدار انگریزوں سے واپس لینے کی ساعتیں آئیں۔ اور یہ طے نہ ہو پاتا تھا کہ اقتدار کی واپسی کے صورتِ نظم و انصرام کیا ہو گی تو اس ذہنی و فکری الجھنوں کے وقت ڈاکٹر محمد اقبال آخری مسلمان تھے جنھوں نے ایک فیصلہ کن فکر پیش کی۔ آخر فیصلہ اسی بنیاد پر ہوا۔ لہٰذا اس صد سالہ عرصۂ جد و جہد کا صحیفہ جب بھی آپ کے سامنے آئے گا۔ اس کے پہلے اور آخری صفحے پر یہی دو نام نمایاں نظر آئیں گے۔ سید احمد خاں اور اقبال۔

اقبال کی زندگی اور ذہنی ارتقا کے چار دور بہت نمایاں ہیں۔ پہلا دَور وہ ہے جو ابتدا سے ۱۹۰۵ء کا ہے۔ اس دَور میں ان کے گرد و پیش کی ملکی فضا کانگرس وغیرہ کے علاوہ خود مسلمانوں کی جاندار تحریکات مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن حمایت اسلام لاہور، اور ندوۃ العلماء کی ہماہمی سے معمور تھی۔ اور ان کے سالانہ اجلاسوں کی دھوم دھام سے سارا برِعظیم گونج رہا تھا۔ اس دَور میں اقبال تلاشِ حقیقت کی سرگردانیوں میں تھے۔ دوسرا دَور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا ہے۔ جب وہ یورپ میں مقیم تھے اور علمی تحقیق و تدقیق اور مطالعۂ کائنات میں مصروف تھے۔ اسی زمانے میں اسلامیانِ برعظیم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے اپنی پہلی سیاسی جماعت علیحدہ قائم کی تھی۔ تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۴ء تک کا ہے جس میں تنسیخ تقسیم بنگالہ، جنگِ بلقان، واقعہ مسجد کانپور، جنگ عظیم، تحریک خلافت، ترکی میں الغاءِ خلافت، ہندوستان میں شدھی سنگٹھن اور فسادات وغیرہ کی قومی اور بین الاقوامی "تلخیاں" اپنے شباب پر تھیں۔ چوتھا دَور ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک کا ہے۔ یہ عہد اقبال کی "منزل رسی" کا ہے اور فکرِ پاکستان اسی عہد کی ہے جس کا ایک خاص تصور ان کے ذہن میں تھا۔ اس تصور کی کچھ وضاحتیں ان کے خطبات[۱] میں ہیں، کچھ اردو اور فارسی نظموں میں، اور کچھ ان مکاتیب[۲] میں جو انھوں نے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۷ء تک قائدِ اعظمؒ کو لکھے تھے اور "رہنمائی" کی تھی۔ اقبال نرے فلسفی، مفکر اور شاعر ہی نہیں تھے بلکہ قائدِ اعظمؒ کی زبان میں "پریکٹیکل پالیٹیشین" بھی تھے۔

---

[۱] لیکچرز آن ری کنسٹرکشن، اور خطبات مسلم لیگ و مسلم کانفرنس ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۲ء [۲] خطوط اقبال بنام جناح

اپنی زندگی کی اس پوری مدت میں اقبال نہ جانے کن کن مراحل سے گزرے ہوں گے۔ کیسے کیسے لوگوں سے ان کے روابط قائم ہوئے ہوں گے، مراسلت رہی ہوگی۔ اور طرح طرح کے نکات زیرِ بحث آئے ہوں گے۔ یورپ کے مختلف ہمعصر مفکرین و محققین کے نام ان کی بعض تحریریں ملتی ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے مختلف علمائے سے اور زعمار سے بھی ان کے تعلقات تھے اور خود اس برِّعظیم کے مختلف بزرگوں سے مراسلت رہتی تھی۔ یہ سارے مکاتیب آج بھی جمع ہو جائیں تو ایک انمول ذخیرہ تیار ہو سکتا ہے اور ان کے ذہن و فکر کے نت نئے پہلوؤں پر روشنی پڑ سکتی ہے۔۔ مگر کون بتائے کہ یہ جواہر پارئے اب کہاں اور کس حال میں ہیں اور کیسے کیسے بیش بہا موتی تھے جو خاک میں رُل کر رہ گئے۔

ان ہی بزرگوں میں ایک حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کی ذات گرامی بھی تھی۔ شاہ صاحب کی زندگی گویا مسلمانوں کی سلطنت چھن جانے کے وقت سے لے کر دوبارہ اہلِ ملک کے ہاتھوں میں اقتدارِ حکومت واپس آنے تک کی پوری تاریخ ہے۔ شاہ صاحب کی ولادت اسی عہدِ انقلاب میں ہوئی تھی جسے "آزادی کی پہلی جنگ" کہتے ہیں۔ اور وفات اس وقت ہوئی جب ۱۹۳۵ء کا ایکٹ نافذ ہوا۔ کش مکش حیات کے اس پورے عرصے میں مسلمانوں کی جتنی تحریکیں اٹھیں وہ سب میں پیش پیش رہے۔ تحریکِ علی گڑھ، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن حمایت اسلام لاہور، ندوۃ العلماء، مسلم لیگ، خلافت، مسلم کانفرنس، جمعیۃ العلماء وغیرہ سب ہیں۔ ان کی ساری زندگی مسلمانوں کی قومی و ملی تنظیم اور دینی و دنیاوی، تہذیبی و ثقافتی تعلیمی و اقتصادی تعمیر کی جدوجہد میں گزری۔[۵۲] ہندوستان کے قدیم خانوادۂ تصوف میں وہ پہلے صوفی عالم تھے جنھوں نے سید احمد خاں کی تعلیمی تحریک کی پُرجوش حمایت کی۔[۵۳] اور اس قدر کہ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور شاہ سلیمان پھلواروی کے وعظ لازم و ملزوم تھے۔"[۵۴] وہ ایم اے او کالج علی گڑھ کے ٹرسٹی بھی رہے۔ مگر ساتھ ہی سرسید کی تبلیغی اُپج سے ان کو اختلاف بھی تھا۔ وہ کہتے تھے کہ "اسلام کو کسی کیشپ چندر سین کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ اسلام کی تعلیمات واضح اور صاف ہیں۔ ضرورت صرف عمل کی ہے"۔ لیکن اس اختلاف میں بھی بہر حال خلوص تھا۔ سرسید احمد خاں اپنے تہذیب الاخلاق میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جناب مولوی محمد سلیمان شاہ صاحب نے جو بہت بڑے عالم اور سجادہ نشیں صوفیائے کرام پھلواروی ہیں ایک نہایت عمدہ اور مفید لکچر مجلس ندوۃ العلماء میں دیا تھا۔ جس کی نسبت ہم نے سنا ہے کہ بعض مولویوں نے پورا پڑھنے نہیں دیا۔ درحقیقت وہ لکچر حسبِ حال زمانہ ہے اور اس لیے ہم اس کو جس طرح نجم الاخبار اٹاوہ میں چھپا ہے اپنے تہذیب الاخلاق میں درج کرتے ہیں۔ اس لکچر میں جناب مولوی صاحب نے نیچریوں کا نام بھی لیا ہے مگر وہ بھول گئے جو کچھ انھوں نے فرمایا ہے اس سے تو وہ خود نیچری معلوم ہوتے ہیں:

وجد و منبع بادہ ایں چہ کافر نعمتی است   منکرِ مے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن

یہ تحریر یکم محرم ۱۳۱۲ھ کی ہے۔ آج سے ٹھیک نوے برس پہلے کی۔ یہ زمانہ وہ تھا جبکہ قدیم و جدید کے نام سے مسلمانوں میں دو جداگانہ حلقے قائم ہو چکے تھے۔ ایک طرف "قدیم تر" اصحاب تھے، دوسری طرف "جدید تر" اصحاب تھے اور دونوں کے درمیان افتراق کی خلیج بڑھتی ہی چلی جاتی تھی۔ سرسید کی یہ تحریر (جس کے لب و لہجہ میں دوستانہ خلوص نمایاں ہے) بتاتی ہے کہ شاہ صاحب سے شکوہ ان کو بھی ہے اور بعض قدامت پسند علما بھی ناراض ہیں۔ سرسید کو شکوہ "منکرِ مے بودن" کا تھا اور قدامت پسند علماء کو غصہ "ہمرنگِ مستاں زیستن" پر۔ حالانکہ صوفی کو سرور اپنی "صہبائے خودی و خودشناسی" کا تھا۔ بلفظِ دیگر شاہ صاحب کی فکر دونوں جماعتوں سے الگ تھی۔ اور وہ ان دونوں

---

۵۱ شاہ صاحب نے رحلت ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کو فرمائی۔

۵۲ البشیر اٹاوہ، روزنامہ سنڈے نیٹ بمبئی، پیسہ اخبار لاہور وغیرہ ۱۹۳۵ء

۵۳ خاتم سلیمانی مصنفہ حضرت مولانا شاہ غلام حسنین ندوی

۵۴ صدق لکھنؤ (مولانا عبدالماجد دریابادی) ۱۹۳۵ء ۱۱ جون۔ رسالہ معارف اعظم گڑھ ماہ جولائی ۱۹۳۵ء

کے درمیان علمبردارِ توازن" کی حیثیت سے کھڑے تھے۔ وہی توازن جس کا فقدان قوم و ملت کے نظام و انصرام کو ہمیشہ تباہی کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ اسی توازن کی خاطر انھوں نے ندوۃ العلماء کی تحریک[۱] پیش کی اور اپنے ہم مشربوں کو ساتھ لے کر علماء کی شیرازہ بندی کے لیے جد وجہد کی تاکہ اس قبائلی جنگ وجدل اور نزاعِ باہمی کی لعنت کو قوم کے سر سے دور کیا جائے جو عام ہو رہی تھی اور یہی توازن تھا جس کی بنا پر وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک ہو کر دیوانہ وار سرگرمِ عمل رہے تاکہ جمعیتِ ملی پوری طرح منظم اور دولتِ علم و فضل سے مالا مال ہو۔ ندوۃ العلماء اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں انھوں نے بے شمار تقریریں کیں، اور ہر تقریر میں ان کا یہ توازنِ فکری ہمیشہ نمایاں رہا۔ ایک مرتبہ انھوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

ندوہ اور کانفرنس دونوں مل کر تم کو بامراد کر سکتے ہیں۔ تنہا کام نہیں چلے گا۔ جو لوگ دین کو دنیا سے علیحدہ کرتے ہیں وہ اسلام کے خانہ برانداز ہیں، حقیقت میں مسلمانوں کی دنیا دین سے علیحدہ نہیں اور نہ دنیا سے دین۔ پس اے عزیزو! جب اس قومی نماز کی اذان سنو تو حَيَّ عَلَى الصَّلوٰة کا مطلب سمجھو کہ اصلاحِ دین و دنیا زمندی کے لیے طلب کیے جاتے ہو فَفِرُّوْا اِلَی النَّدْوَة یعنی ندوہ کی طرف جاؤ، وہ اس کا ذمہ دار ہے اور جب حَيَّ عَلَى الْفَلَاح کی صدا سنو تو یہ سمجھو کہ فلاحِ دنیوی تمہاری اس قومی یونیورسٹی سے وابستہ ہے جس کی کانفرنس تم کو ہدایت کرتی ہے۔ ادھر آؤ اور کام میں مشغول ہو جاؤ اور یوں کہو رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّار اور سنو ہمارے صوفی صافی بزرگان فرماتے ہیں:

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست   بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

اور انہیں ہدایتوں نے مجھے انگریزی فیشن کے تعلیم یافتہ حضرات کی طرف متوجہ کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ واللہ اگر کوئی لڑکا بھی ہمارے کالج کا ملحد بے دین اور بدخلق ہو گیا تو پھر کل قیامت کے دن سرورِ کائنات صلعم کو ہم منہ نہیں دکھا سکیں گے .... پھر اگر یہ درست نہ ہوئے تو یاد رکھو قوم کی قوم ستیاناس ہو جائے گی۔ ہم انھیں کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر یہ ہمیں اولڈ فیشن کہہ کر دو چار ڈنڈے بھی لگا دیں گے تو ہم اسے بھی استقلال کے ساتھ برداشت ہی کر لیں گے اور ہمیں ڈر ہے کہ انھیں چھوڑ دیں گے تو خشک تعلیم جو مذہبی اخلاق سے معرا ہے، رفتہ رفتہ ان کو وحشت و جنون کی حد تک نہ پہنچا دے۔" (روئداد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس)

اس تقریر کا تخاطب جتنا جدیدوں سے تھا اتنا ہی قدیموں سے تھا۔ عرب کی پراگندہ حال قوم کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ کے برگزیدہ رسولؐ نے فرمایا تھا: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاق (میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ مکارمِ اخلاق کی تکمیل (تمام کردوں) اس لیے انفرادی، اور اجتماعی مکارمِ اخلاق کو شاہ صاحب قومی و ملی سربلندی کے لیے ایک لازمی شرط تصور کرتے تھے۔ کیونکہ اخلاق و کردار کی خرابی ہی سارے توازن کو بگاڑنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ وہ خود بھی اخلاق مجسم تھے۔ اور محمدیت کے رنگ میں سرتاپا ڈوبے ہوئے۔

یہ اثر تھا ان فیوض و برکات کا، جو انھیں علم و فضل کے مختلف اعلیٰ سرچشموں اور متضاد مکتبۂ خیال کے اربابِ کمال سے حاصل ہوئے تھے۔ ان کی وسعتِ قلب و نگاہ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ خود ایک ممتاز خانوادۂ تصوف کے فرد اور بڑے صوفی تھے۔ قوم و ملت کے لیے جذبۂ خدمت و جہاد کچھ تو براہِ راست اپنے آبا و اجداد سے پایا تھا اور کچھ اپنے اساتذہ سے جن میں ایک حضرت میاں صاحب مولانا نذیر حسین

---

[۱] خطبۂ قاضی سلیمان منصور پوری، مصنف رحمۃ للعالمین، اجلاس بستم ندوۃ العلماء ــــ "میں سمجھتا ہوں کہ جس ندوۃ العلماء کے بانیان قدیم جناب مولانا مولوی محمد علی مونگری اور جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواروی جیسے مالک سجادہ و صاحب و سادہ ہوں وہ مجلس کیوں نہ تصوف کا تحفظ کرے" ــــ روئداد ندوۃ العلماء ص ۱۱۲، پیسہ اخبار لاہور ۲۶ جون ۱۹۳۵ء، البشیر اٹاوہ ۱۹۳۵ء، روزنامہ خلافت، مولانا شوکت علی، بمبئی ۱۹۳۵ء ــــ نیز دیکھیے مضامین حسن مثنیٰ ندوی "فقہ اسلامی کی تشکیل جدید" روزنامہ امروز کراچی ۲۵ جون ۱۹۵۱ء "حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی" رسالہ العلم کراچی جنوری ۱۹۵۲ء "شبلی کی حیات معاشقہ" ہفت روزہ چٹان لاہور ۱۳ اگست ۱۹۵۱ء

محدث تھے جن پر ۱۲۹۰ھ میں انگریزوں نے علمائے صادق پور کے ساتھ مقدمۂ بغاوت چلایا تھا اور ایک سال تک راولپنڈی جیل میں محبوس رکھا تھا۔ دوسرے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے جہاد کیا تھا اور ہجرت کر کے مکۂ معظمہ چلے گئے تھے۔ تیسرے مولانا حکیم عبدالحمید عظیم آبادی ابن حضرت مولانا احمد اللہ صاحب قبوری اسیر انڈمان تھے جن کا سارا گھرانہ تنظیم ملی اور قیام حکومت اسلامی کے جرم میں پیس کے رکھ دیا گیا۔ شاہ صاحب کے ذہن و فکر کی پرورش ان ہی بزرگوں کے زیر اثر ہوئی تھی۔ اور حق تو یہی ہے کہ:

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

وہ اس کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے کہ لوگ اپنی اپنی گروہ بندیاں بنا کر اپنے لات و ہُبل تراش لیں، اس پر ان کا دل بہت کڑھتا تھا۔ وہ سارے برعظیم میں دیوانہ وار ایک ایک کو جھنجھوڑتے پھر رہے تھے، ساری فضا ان کی مثنوی کے سوز و گداز سے اور ساحرانہ خطابت سے گونج رہی تھی، مسلمانوں کے سارے فرقے اور جماعتیں، قدیم اور جدید سب یکساں مسحور تھے۔ مختصر یہ کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ندوۃ العلماء اور انجمن حمایت الاسلام لاہور کی عظیم الشان ملی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں۔ جب اقبال کے ذہن و فکر نے انگڑائیاں لیں۔ اُس عہد کی بڑی بڑی ہستیاں اپنے تمام تر منظر و پس منظر سمیت ان کی نظروں کے سامنے تھیں۔ خود اقبال کی شاعری کا تعارف بھی پہلے پہل انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس ہی سے ہوا تھا اور چونکہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے بھی شاہ صاحب کے وعظ و خطابت کے بغیر سُونے سمجھے جاتے تھے اس لئے قرینہ یہی چاہتا ہے کہ اقبال اور شاہ صاحب کے روابط کی ابتدا یہیں سے ہوئی ہو۔ خط و کتابت کا سلسلہ کب شروع ہوا اور کن کن مسائل پر بحث و تمحیص ہوئی اس پر تو جب ہی روشنی پڑ سکتی ہے کہ سارے مکاتیب مہیا ہو جائیں لیکن جو خطوط مجھ کو ملے ہیں اور جن کو میں یہاں پیش کر رہا ہوں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحب کے ساتھ ان کو ایک خاص ارتباط تھا ایک خط ۱۹ر اکتوبر سنہ ۱۹۱۰ء کا ہے۔ یہ خط اقبال نے ترینٹی کالج کیمبرج سے اپنے دوست خواجہ حسن نظامی صاحب کو لکھا تھا۔ مگر مخاطب اصل میں شاہ صاحب ہی تھے۔ اُس زمانے میں اقبال تصوف کی تحقیق و تنقید میں مصروف تھے اور یہ ذمہ داری انھوں نے خواجہ صاحب کے سپرد کی تھی کہ شاہ صاحب سے ضروری جواب حاصل کر کے ان کے پاس بھیج دیں۔

مکتوب اول | اس خط کی عمر باسٹھ تریسٹھ سال ہے:

"اسرار قدیم سید حسن نظامی۔ ایک خط اس سے پہلے ارسال کر چکا ہوں، امید ہے کہ پہنچ کر ملاحظۂ عالی سے گزرا ہوگا۔ اس خط کے جواب کا انتظار ہے اور بڑی شدت کے ساتھ۔ اب ایک اور تکلیف دیتا ہوں اور وہ یہ کہ قرآن شریف میں جس قدر آیات صریحاً تصوف کے متعلق ہوں ان کا پتہ دیجئے۔ سپارہ اور رکوع کا پتہ لکھیے۔ اس بارے میں آپ قاری شاہ سلیمان صاحب سے یا کسی اور سے مشورہ کر کے مجھے بہت جلد مفصل جواب دیں۔ اس مضمون کی سخت ضرورت ہے اور یہ گویا آپ کا کام ہے۔

قاری شاہ سلیمان صاحب کی خدمت میں میرا یہ خط بھیج دیجئے اور بعد التماس دعا عرض کیجئے کہ میرے لیے یہ زحمت گوارا کریں اور مہربانی کر کے مطلوبہ قرآنی آیات کا پتہ دیدیں، اگر قاری صاحب موصوف کو یہ ثابت کرنا ہو کہ مسئلہ وحدۃ الوجود یعنی تصوف کا اصل مسئلہ قرآن کی آیات سے نکلتا ہے تو وہ کون کون سی آیات پیش کر سکتے ہیں اور ان کی کیا تفسیر کر سکتے ہیں۔

کیا وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ تاریخی طور پر اسلام کو تصوف سے کیا تعلق ہے؟ کیا حضرت علی مرتضیٰؓ کو کوئی خاص پوشیدہ تعلیم دی گئی تھی؟ غرض کہ اس امر کا جواب معقولی اور منقولی اور تاریخی طور پر مفصل چاہتا ہوں۔ میرے پاس کچھ

ذخیرہ اس کے متعلق موجود ہے مگر آپ سے اور قاری صاحب سے استصواب ضروری ہے۔ آپ اپنے کسی اور صوفی دوست سے بھی مشورہ کر سکتے ہیں، مگر جواب جلد آئے۔ باقی سب خیریت ہے۔

اقبال

مکتوب ثانی | یہ خط اقبال نے براہِ راست ۲۴ رفروری ۱۹۱۶ء کو لاہور سے لکھا تھا۔ یہ خط بھی چونکہ تصوف ہی کے سلسلے میں ہے۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۶ء تک خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا مگر افسوس کہ اب ان مکاتیب کا کہیں پتہ نہیں ہے لکھتے ہیں

مخدوم مکرم حضرت قبلہ مولانا السلام علیکم

گو اب میں سمجھتا ہوں کہ میں قطعی نتیجے تک پہونچ چکا ہوں لیکن اس وقت بھی مجھے اپنے خیال کے لیے کوئی ضد نہیں ہے۔ اس لیے بذریعہ عریضہ ہذا آپ کی خدمت میں ملتمس ہوں کہ آپ از راہِ عنایت و مکرمت چند اشارات تسطیر فرمادیں۔ میں ان اشارات کی روشنی میں نصوص اور فتوحات کو پھر دیکھوں گا اور اپنے علم و رائے میں مناسب ترمیم کروں گا۔ تجلی ذاتی کا ذکر کرتے ہوئے شیخ اکبر فرماتے ہیں وما بعد ھذا التجلی الا العدم المحض فلا تطمع ولا تتعب فی ان ترقی من ھذہ الدرجۃ من التجلی الذاتی۔ اس میں شیخ نے تجلی ذاتی کو انتہائی مقام قرار دیا ہے اور اس کے بعد عدم محض۔ حضرت مجدد نے یہ فقرہ ایک مکتوب میں نقل کیا ہے۔ میری کتابیں اس وقت لاہور میں موجود نہیں ہیں کہ صفحہ و مقام کا پتہ دے سکتا۔

آپ کا خادم

محمد اقبال

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بحث اس مقام پر ہے جہاں دونوں کی رائے میں اختلاف ہے لیکن اقبال کی طلب و تحقیق، وہ جذبۂ تلاش و جستجو کی شدت و صداقت پر بھی اس خط سے کافی روشنی پڑتی ہے، وہ اس بات پر آمادہ ہیں کہ جن کتابوں کو ایک بار بلکہ شاید بار بار پڑھ چکے ہیں، ان کو ایک مرتبہ پھر غور سے پڑھیں صرف اس لئے کہ یہ امکان بہر حال موجود ہے کہ کسی عبارت کا مفہوم سمجھنے میں چوک ہوگئی ہو اور یہ اسی کا اثر ہو کہ ماحصل یا تو پورا نہیں نکل رہا ہے یا کچھ اور نکل رہا ہے اور اگر اس چوک کا پتہ چل جائے تو ان کو اپنی رائے بدل لینے میں کوئی تکلف محسوس نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایک طالبِ صادق اور محقق کا انداز تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔

اس خط سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اقبال کو عربی زبان پر کتنی قدرت حاصل تھی کیونکہ فلسفۂ تصوف کے اس نازک اور اہم مقام کا یہ عربی جملہ انھوں نے اپنے حافظے سے نقل کیا ہے

مکتوب ثالث | یہ خط ۹ رمارچ ۱۹۱۶ء کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل والے خط کے ساتھ انھوں نے اپنی کتاب مثنوی اسرارِ خودی شاہ صاحب کی خدمت میں ارسال کی تھی اور رائے مانگی تھی۔ یہ خط بھی براہ راست ہے لکھتے ہیں:

مخدومِ و مکرم حضرت قبلہ مولانا السلام علیکم

جناب کا والا نامہ مل گیا جس کو پڑھ کر مجھے بہت اطمینان ہوا۔

مجھے اس کا یقین تھا کہ آپ کو مثنوی پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے کمالِ روحانی کے ساتھ علم و فضل سے آراستہ کیا ہے —— میں نے خواجہ حسن نظامی صاحب کو بھی لکھا تھا کہ مثنوی سے اختلاف نہ کیجیے۔ دیباچے میں جو بحث ہے اس پر لکھیے مگر افسوس ہے کہ انھوں نے آج تک ایک حرف بھی نہیں لکھا۔

آپ کی تحریر سے مجھے یقیناً فائدہ ہوگا۔ مگر میری استدعا ہے کہ مثنوی کے متعلق بھی جو خیال آپ نے اپنے خط میں ظاہر فرمایا ہے اس مضمون میں ظاہر فرمایئے تاکہ جو غلط فہمی خواجہ حسن نظامی کے مضامین سے پیدا ہوگئی ہے وہ دور

ہو جائے۔ دیباچے کی بحث ایک علیحدہ بحث ہے۔ وحدۃ الوجود کا مسئلہ اس میں ضمناً آگیا ہے۔ اس مسئلے کے متعلق جو کچھ میرا خیال ہے وہ میں نے پہلے خط میں عرض کر دیا تھا۔ فارسی شعرا نے جو تعبیر اس مسئلے کی کی ہے اور جو جو نتائج اس سے پیدا ہوئے ہیں ان پر مجھے سخت اعتراض ہے۔ یہ تعبیر مجھے نہ صرف عقائد اسلامیہ کے مخالف معلوم ہوتی ہے بلکہ عام اخلاقی اعتبار سے بھی اقوام اسلامیہ کے لیے مضر ہے۔ یہی تصوف عوام کا ہے اور شیخ علی حزیں نے بھی اسی کو مدنظر رکھ کر کہا تھا کہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" لیکن حقیقی تصوف کا میں کیونکر مخالف ہو سکتا ہوں خود سلسلہ عالیہ قادریہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں نے تصوف کا لٹریچر کرات سے دیکھا ہے بعض لوگوں نے ضرور غیر اسلامی عناصر اس میں داخل کر دیئے ہیں، جو شخص غیر اسلامی عناصر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے وہ تصوف کا خیر خواہ ہے نہ کہ مخالف، انھیں غیر اسلامی عناصر کی وجہ سے ہی مغربی محققین نے تمام تصوف کو غیر اسلامی قرار دے دیا ہے کہ یہ حملہ انھوں نے حقیقت میں مذہب اسلام پر کیا ہے۔ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ تصوف اسلامیہ کی ایک تاریخ لکھی جائے جس سے معاملہ صاف ہو جائے اور غیر اسلامی عناصر سے منقطع ہو جائے۔ سلاسل تصوف کی تاریخی تنقید بھی ضروری ہے اور زمانۂ حال کا علم النفس جو مسالہ تصوف پر حملہ کرنے کے لیے تیار کر رہا ہے اس کا پیشتر ہی سے علاج ہونا ضروری ہے۔ میں نے اس پر کچھ لکھنا شروع کیا ہے مگر میری بساط کچھ نہیں۔ یہ کام اصل میں کسی اور کے بس کا ہے۔ میں صرف اس قدر کام کر سکوں گا کہ جدید مذاق کے مطابق تنقید کی راہ دکھلا دوں۔ زیادہ تحقیق و تدقیق مجھ سے زیادہ واقف کار لوگوں کا کام ہے۔

آپ کے مکتوب نہایت دلچسپ ہوتے ہیں اور حفاظت سے رکھنے کے قابل نہ کہ ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کے قابل جیسا کہ آپ نے لکھا ہے۔ میں نے ان کو خود پڑھا ہے اور بیوی کو بھی پڑھنے کو دیا ہے۔ یہ اعتراف ضرور کرتا ہوں کہ بعض بعض مقامات سے مجھے اختلاف ہے اور یہ مقامات وحدت وجود سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب آپ اپنے مضمون میں زیادہ تشریح سے کام لیں گے تو ممکن ہے مجھے اختلاف نہ رہے کیونکہ مکتوبات میں ایک آدھ جگہ مسئلہ مذکور کی ایک ایسی تعبیر بھی ہے جس سے مجھ کو مطلق اختلاف نہیں اور نہ کسی مسلمان کو ہو سکتا ہے۔ امید ہے کہ جناب کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

آپ کا خادم۔ اقبال

اس خط میں بھی عجز و انکسار کی وہی فراوانی نظر آتی ہے جو ان کے مرتبہ و مقام کی بلندی کی دلیل ہے کہ سراپا علم و فضل ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ہیچمدان ہی تصور کرتے ہیں، اقبال بھی اور شاہ صاحب بھی۔ اس خط سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ مراسلت کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہا اور وہ شاہ صاحب کے مکاتیب کو حفاظت سے رکھتے تھے۔ اگر یہ مکاتیب مل جاتے تو معلوم ہوتا کہ ان دونوں بزرگوں کے درمیان کس مقام پر پہونچ کے ہم خیالی پیدا ہوئی۔ کیونکہ یہ اختلاف اور وہ بھی تھوڑا سا اختلاف وحدت وجود کے بعض پہلوؤں ہی پر رہ گیا تھا جس کے لیے انھوں نے مزید تشریح چاہی تھی ورنہ ویسے تمام مسائل و نکات پر اتفاق تھا۔ اقبال نے اپنی مثنوی اسرار خودی میں جو فکر پیش کی ہے اس کی نسبت شاہ صاحب کی پسندیدگی کا تذکرہ اسی خط میں موجود ہے۔ اس خط سے یہ بھی واضح ہے کہ یورپ کی دسیسہ کاریوں پر اقبال کی نظر کتنی رہتی تھی، انھوں نے اس حقیقت کی طرف خاص طور پر توجہ مبذول کرائی ہے کہ حملے اسلام پر تو یورپ کی طرف سے ہوتے ہی رہتے ہیں مگر سب سے خطرناک حملہ وہ ہے جو علوم و فنون کے بھیس میں ہوا کرتا ہے چنانچہ "مغربی محققین" کی تنقید تصوف کو انھوں نے اسلام پر حملہ قرار دیا ہے اور "زمانۂ حال کا علم النفس جو مسالہ تیار کر رہا ہے" اس کو بھی وہ اسی

سلسلے کی بڑی خطرناک کڑی تصوّر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس قسم کے حملوں سے بچنے کے لیے مسلمان پہلے ہی تیار رہیں اور اپنے آپ کو مسلح رکھیں۔ اقبالؔ اگر آج زندہ ہوتے تو اسلام غالباً اپنا پیغام انسانیت پوری حفاظت کے ساتھ ساری دنیا کو پہنچانے میں مصروف ہوتا۔ اور وہ ساری الجھنیں بھی تقریباً ناپید ہوچکی ہوتیں جو پاکستان حاصل ہوچکنے کے بعد بھی ہم پر بدستور مسلط ہیں، ہمارا طرزِ فکر ہی یکسر بدل چکا ہوتا۔ وہ دیکھتے کہ اب علم النفس کے اس مسالے نے خود علم النفس، اور یورپ اور امریکہ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ کیونکہ علم النفس کی ایک شاخ اب خود مذہب اور اس کی توثیق کی طرف مڑ گئی ہے۔

سیاسی اعتبار سے ہم قائدِ اعظم کا یہ فقرہ اوپر لکھ چکے ہیں کہ اقبال ایک "پریکٹیکل پالی ٹیشین" تھے[1]۔ یہاں بھی، اقبال اور شاہ صاحب کے درمیان ہمیں ایک ہم خیالی سی نظر آتی ہے۔ اور سبب بالکل واضح ہے کہ دونوں کا منتہائے نظر اور مقصودِ حیات فقط اسلام تھا۔ شاہ صاحب کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس والی تقریر کو پڑھیے اور اقبالؔ کا یہ مصرع دیکھیے ؏

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

دونوں نے اپنی ساری عمر اسی حقیقت کی تبلیغ میں صرف کردی۔ پھر یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جس توازن کے علمبردار عہد سرسید میں شاہ صاحب نظر آتے ہیں اسی توازن کے علمبردار اپنے عہد کمال میں ہمیں اقبال نظر آتے ہیں یعنی "جدید تر" اور "قدیم تر" کے بین بین۔ ایک خصوصی طرزِ فکر اور خصوصی نصب العین کے حامل۔ نہرو رپورٹ کے واقعہ پر کانگرس اور جمعیۃ علمائے دہلی سے علیحدہ ہوکر مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا نثار احمد، مولانا عبد العلیم صدیقی، علمائے فرنگی محل، علمائے بدایوں اور دیگر علما و زعما نے الگ کل ہند جمعیۃ علما قایم کی تو اس کے صدر شاہ صاحب ہی منتخب کیے گئے تھے اور مسلمانوں کی علیحدہ اسلامی قومیت پر اسی کل ہند جمعیۃ علما کے اجلاس میں پہلی مرتبہ بصورت قرار داد مقاصد، زور دیا گیا تھا[2] اور مغربی تصور کی جغرافیائی وطنیت و قومیت کی شدت کے ساتھ مخالفت کی گئی تھی۔ اسی کے بعد ۱۹۳۰ء میں اقبالؔ کی صدارت میں الٰہ آباد میں مسلم لیگ کا وہ اجلاس ہوا جس کا خطبۂ صدارت فکرِ پاکستان کی پہلی قسط تصور کیا جاتا ہے اور جس کی مزید تفصیل انھوں نے مسلم کانفرنس کے اجلاس لاہور منعقدہ ۱۹۳۲ء کے خطبۂ صدارت میں پیش کی۔ یہ دونوں خطبات "اسلام" پر اقبالؔ کے دو بہت ہی عالمانہ اور محققانہ لیکچر ہیں۔ ان کا آخری مضمون جو انھوں نے بسترِ مرگ پر پڑے پڑے لکھا، اسلام اور وطنیت ہی کے عنوان پر تھا اور یہ زندۂ جاوید شعر کہ :

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

(۲)

اقبالؔ اور شاہ سلیمان پھلواروی کے ربط و ارتباط اور باہمی مراسلت پیش کرنے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان مکاتیب کے اندر جو نازک مباحث درپیش ہیں اور جن اہم نکات کے متعلق اشارات ہی نہیں براہِ راست استفسارات کیے گئے ہیں ان پر بھی کسی قدر روشنی ڈالی جائے۔

---

[1] مجموعۂ تقاریر قائد اعظم، از جمیل الدین احمد "پیغام یوم اقبال" لاہور ۹ دسمبر ۱۹۴۴ء

[2] خاتم سلیمانی، از مولانا شاہ غلام حسنین ندوی، نیز الامان مولانا مظہر الدین دہلی و وحدت دہلی جون ۱۹۳۵ء و عصر جدید کلکتہ ۲ جون ۱۹۳۵ء و انقلاب لاہور ۶ جون ۱۹۳۵ء

اقبال نے اپنے خط میں شاہ صاحب سے استفسار کیا تھا کہ (۱) قرآن شریف میں جس قدر آیات صریحاً تصوف کے متعلق ہوں اُن کا پتہ دیجیے۔ (۲) وحدۃ الوجود کا مسئلہ کن کن آیتوں سے نکلتا ہے (۳) تاریخی طور پر اسلام اور تصوف کا کیا تعلق ہے (۴) کیا حضرت علیؓ کو کوئی پوشیدہ تعلیم دی گئی تھی؟ وغیرہ۔ یہ خط اقبال نے ٹرینٹی کالج کیمبرج سے ۱۸ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو خواجہ حسن نظامی صاحب کے توسط سے لکھا تھا۔ اقبال اُس زمانے میں اپنا مقالہ (THESIS) تیار کر رہے تھے اور مصروف تحقیق تھے یہ مقالہ انھوں نے ۱۹۰۷ء میں پورا کیا جس پر ان کو ڈاکٹریٹ ملی۔ اور ۱۹۰۸ء میں وہ لاہور واپس آ گئے۔

۱۹۱۵ء کے اواخر میں اُنھوں نے اپنی مشہور مثنوی اسرار خودی شائع کی۔ اس کے شائع ہوتے ہی ان پر سخت اعتراضات ہوئے۔ خواجہ صاحب اور اقبال کے درمیان اخبار میں مباحثہ چھڑ گیا۔ پیرزادہ مظفر احمد صاحب فضلی نے بھی سخت مخالفت کی حضرت اکبر الہ آبادی اُس وقت زندہ تھے اور وہ بھی ناخوش تھے۔ اقبال سے اختلاف وحدۃ الوجود کے بارے میں تھا اور اس بارے میں بھی کہ اقبال نے حافظ شیرازی پہ تنقید کیوں کی حضرت اکبر الہ آبادی مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں کہ:

"اقبال صاحب کو آج کل تصوف پر حملے کا بڑا شوق ہے۔ کہتے ہیں عجمی فلاسفی نے عالم کو خدا قرار دے رکھا ہے اور یہ بات غلط ہے خلاف اسلام ہے۔" (خطوط اکبر)

"اقبال صاحب نے جب سے حافظ شیرازی کو علانیہ بُرا کہا ہے میری نظروں میں کھٹک رہے ہیں۔ ان کی مثنوی اسرار خودی آپ نے دیکھی ہوگی۔" (خطوط اکبر)

اس موقع پر خواجہ صاحب نے شاہ صاحب کی خدمت میں خط لکھ کر مسئلہ متنازعہ فیہ کے متعلق استفسارات کیے اور اقبال کے بارے میں تبصرہ چاہا کیونکہ شاہ صاحب اپنے عہد کے امام العلما اور امام الصوفیہ تھے۔ اقبال کی مثنوی اُس وقت تک شاہ صاحب کی نظر سے نہیں گزری تھی لیکن اخبارات میں جو بحث چھڑی تھی وہ نظر سے گزر چکی تھی۔ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ:

"اُن کا وہ خط جو بنام آپ کے خطیب اور وطن میں شائع ہوا ہے وہ میں نے مکرر پڑھا، اُس پر یہ رائے قائم کر سکتا ہوں کہ میرے مخلص اقبال نے اصل مسلک حضرت شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہ اور ان کے متبعین کا نہیں سمجھا ہے۔" (شمس المعارف)

یہ جواب وحدۃ الوجود کے بارے میں تھا مگر جہاں تک حافظ شیرازی کا تعلق ہے شاہ صاحب کا جواب یہ تھا کہ:

"صحابہ کرامؓ میں جوش و مستی کا غلبہ تو ہوتا تھا مگر وہ اس میں پڑے نہیں رہتے تھے بلکہ اُنھوں نے عالم صحو میں نشو و نما پائی سکر میں چونکہ نقص ہے اس لیے خدا نے ان کو اس حالت میں نہ رکھا اور وہ تمام عالم کے لیے کامل و مکمل ہوئے پھر وہ حافظ شیرازی کی طرح "خود گویم و خود در قسم خود چنگ خوش آوازم" کا مصداق کیونکر رہ سکتے تھے۔" (شمس المعارف)

بلفظ دیگر شاہ صاحب نے اقبال کے رد کی تائید فرمائی اور یہ کہا کہ حافظ شیراز کا عالم، عالم صحو نہیں بلکہ عالم سکر ہے، اور سکر نقص کی دلیل ہے۔ "مرشد طریقت اندرونی سوزش والتہاب کی روک تھام کے لیے مریدوں کو عالم سکر میں ڈالتا ہے نہ یہ کہ تمام عمر کے لیے انھیں افیونی بنا ڈالے کہ بیٹھے بیٹھے مکھیاں مارا کریں۔" اور اقبال متصوفین کے اسی "افیجی پن" سے نالاں تھے۔

اِدھر اقبال نے (شاہ صاحب کا یہ خیال معلوم ہونے پر؟) ۲۴ فروری ۱۹۱۶ء کو یہ خط لکھا کہ:

"بذریعہ عریضۂ ہذا آپ کی خدمت میں ملتمس ہوں کہ آپ از راہ عنایت و مکرمت چند اشارات تسطیر فرما دیں، میں ان اشارات کی روشنی میں فصوص اور فتوحات کو پھر دیکھوں گا اور اپنے علم و رائے میں مناسب ترمیم کر لوں گا۔"

ساتھ ہی اپنی مثنوی بھی ملاحظہ کے لیے ارسال خدمت کی۔ مثنوی کے بارے میں شاہ صاحب نے جو خیال ظاہر فرمایا وہ اقبال

کی حمایت میں تھا چنانچہ اس کے بعد ہی ۹ مارچ ۱۹۶۱ء کو جو خط لکھا تو اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ تھا جو سر سے اتر گیا۔

"جناب کا والا نامہ مل گیا جس کو پڑھ کر مجھے بہت اطمینان ہوا۔ مجھے اس کا یقین تھا کہ آپ کو مثنوی پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے کمال روحانی کے ساتھ علم و فضل سے آراستہ کیا ہے ...... آپ کی تحریر سے مجھے یقیناً فائدہ ہوگا مگر میری استدعا ہے کہ مثنوی کے متعلق جو خیال آپ نے اپنے خط میں ظاہر فرمایا ہے اس مضمون میں ظاہر فرمائیے تاکہ جو غلط فہمی خواجہ حسن نظامی کے مضامین سے پیدا ہو گئی ہے وہ دور ہو جائے۔

(اور یہ مسئلہ مسلک شیخ) جب آپ اپنے مضمون میں زیادہ تشریح سے کام لیں گے تو ممکن ہے مجھے کوئی اختلاف نہ رہے کیونکہ مکتوبات میں ایک آدھ جگہ مسئلہ مذکورہ کی ایسی تعبیر بھی ہے جس سے مجھ کو مطلق اختلاف نہیں اور نہ کسی مسلمان کو ہو سکتا ہے۔"

اب ملاحظہ فرمائیے وہ مکتوب جو خواجہ صاحب کے جواب میں شاہ صاحب نے ارسال فرمایا تھا:

مکتوب اول | میرے مکرم خواجہ، تحیت سلام قبول فرمائیے! اب عرس سے فارغ ہو کر آپ کا کرم نامہ ہاتھ میں لیتا ہوں اور آپ کے سوالات کے جوابات مختصر طور سے عرض کیے دیتا ہوں ملاحظہ فرمائیے:

(۱) قرآن شریف سے بہ نص قطعی بدلالہ فقط وحدت معبود ثابت ہے اور مدار نجات اسی پر ہے۔ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود جس کے صوفیہ اسلامیہ قائل ہیں وہ اشارۃ النص سے ثابت ہوتی ہے اور یہ دونوں ہرگز وحدتِ معبود کے مخالف نہیں۔ ہاں حکمائے مشائین و براہمہ اور جوگیہ اشراقیین جس وحدتِ وجود کو ثابت کرتے ہیں وہ وحدت معبود اور نصِ قرآنی کی مخالف ہے اس لیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی ہستی مستقل علیحدہ سے نہیں رہتی بلکہ عالم موجود ہی خدا کا وجود ہے اور خدا کا وجود مثل کلی طبعی کے رہ جاتا ہے بمعنی وجود اشخاصہ فی الخارج، اس کو صوفیہ بالکل الحاد و زندقہ سمجھتے ہیں، بلکہ صوفیہ وجودیہ تو یوں فرماتے ہیں ؎

معنیٔ حسن تو در صورتِ جاں می بینم   عکسِ رخسارِ تو در جامِ جہاں می بینم

(۲) توحید ایک ایسا لفظ ہے جو وحدتِ معبود، وحدتِ وجود، وحدتِ شہود تینوں پر شامل ہے۔ اس حیثیت سے توحید اور وحدتِ وجود میں یہی فرق ہے کہ وہ عام ہے اور یہ خاص، اور دونوں میں باہم عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے پس مطلق توحید سے وحدت وجود سمجھنا غلطی ہے۔

(۳) اسلام دین فطرت ہے فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا پس اسلام قوائے انسانی کو اپنے صحیح مرکز پر رکھنے کو آیا ہے اصل مقصود اس کا اس کے ذریعے سے یہ ہے کہ مخلوق اپنے خالق کو پہچان لے۔

(۴) اخلاقی حالتوں کا درست کرنا اور انوار و تجلیات کا مشاہدہ کرنا، خدا و رسولؐ کی باتوں کا عین الیقین و حق الیقین پیدا ہونا، یہی تصوف کا انتہائی مقصد ہے۔

(۵) چونکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی علتِ غائی سوتوں کو جگانا، غافلوں کو ہوشیار کرنا، بیہوشوں کو ہوش میں لانا اور نادانوں کو عاقل بنانا تھی، اور اپنے پاک خیالات اور اخلاقی خوبیوں کو تمام عالم میں شائع کرنا مقصود تھا کیونکہ آپ کی بعثت الی کافۃ الناس بشیرًا و نذیرًا تھی اس لیے صحابہ کرامؓ میں جوش و مستی کا غلبہ تو ہوتا تھا مگر وہ اس میں پڑے نہیں رہتے تھے بلکہ انھوں نے "عالم صحو" میں نشو و نما پائی "سکر" میں چونکہ نقص ہے اس لیے خدا

نے ان کو اس حالت میں نہ رکھا اور تمام عالم کے لیے کامل و مکمل ہوئے۔ پھر وہ حافظ شیراز کی طرح "خود گویم و خود رقصم خود چنگ خوش آوازم" کا مصداق کیوں کر رہ سکتے تھے۔

(۶) صوفیہ کی حالتِ سکر مثل "مخدرات" دواؤں کے ہے۔ طبیب شدتِ درد وغیرہ میں بے چینی کم کرنے کے لیے استعمال کراتا ہے۔ اسی طرح مرشدِ طریقت اندرونی سوزش والتہاب کی روک تھام کے لیے مریدوں کو عالمِ سکر میں ڈالتا ہے نہ یہ کہ تمام عمر کے لیے انھیں افیونی بنا ڈالے کہ وہ بیٹھے بیٹھے مکھیاں مارا کریں۔

(۷) وحدت وجود انکشافِ توحید کا نام ہے جس کا تعلق صرف مشاہدہ سے ہے۔ جامی فرماتے ہیں:

مغرور مشو بریں کہ توحید خدائے　　واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

یہ اربابِ مشاہدہ اس حالت کو ایک عارضی مقام نہیں سمجھتے بلکہ حقیقتِ حقہ، واقعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کے اوراس کے، دربعد و سدکچھ بھی نہیں۔ شیخ ابن عربی قدس اللہ نفسہٗ وحدتِ وجود کے بعد نہ کوئی مقام قائم کرتے ہیں نہ عدم محض کہتے ہیں۔

(۸) اس میں کوئی شک نہیں کہ وحدت الوجود ایک علمی مسئلہ ہے جس کو اصطلاح علمی میں "رابطۃ الحادث بالقدیم" کہتے ہیں۔ اور تمام کتبِ الٰہیات میں اس کا ذکر ہوتا ہے۔ اسلامی سیر و سلوک اور مشاہدۂ انوار و تجلیات سے اس کا تعلق تو ضرور ہے مگر مدار نجات سے اس کو کوئی واسطہ نہیں۔　　　والسلام خیر الختام

میرے مخدوم! مسٹر اقبال کی مثنوی اب تک میرے پاس نہیں پہنچی ہے اس لیے اس کی نسبت میں کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا مگر ان کا وہ خط جو آپ کے خطیب اور وطن میں شائع ہوا ہے وہ میں نے مکرر پڑھا۔ اس پر یہ رائے قائم کرسکتا ہوں کہ میرے مخلص مسٹر اقبال نے اصل مسلک حضرت شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ اور ان کے متبعین کا نہیں سمجھا ہے۔ حضرت مجدد کے اتباع نے جو کچھ لکھا ہے اسی کو دوسرے الفاظ میں انھوں نے ادا کیا ہے اور متعصب مورخین کے افترا رات و بہتانات کو انھوں نے یقین کرلیا ہے، ورنہ میں خدائے وحدہ لاشریک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہمارے شیوخ کرام اور بزرگانِ طریقت جن کا سلسلہ دائر و سائر ہے مثلاً حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ شہاب الدین سہروردی، معین الدین چشتی، خواجہ بہاء الدین نقشبند، سید ابوالحسن شاذلی، سید احمد رفاعی۔ سید احمد بدوی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، کسی نے کسی فرقہ جوگیہ و براہمہ و زرتشتی وغیرہ کی صحبت نہیں اٹھائی اور نہ ان سے کسی قسم کا استفاضہ کیا۔ علیٰ ہذا القیاس قرامطہ اور فرقۂ باطنیہ سے بھی میل جول اور ان کا ہم عقیدہ اور ہم مشرب ہونا محض علامہ ابن خلدون کا افترا ہے، اپنے دعوے کی وہ کوئی دلیل سند کے ساتھ نہ پیش کرسکے ورنہ پیش کیا ہے۔ ان لوگوں کے ٹھوس دماغ میں ہمارے حضرات صوفیہ کے معارف سماتے نہ تھے اس لیے کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا۔ ہمارے حضرات صوفیہ کا براہمہ اور زرتشتیوں اور قرمطیوں سے استفاضہ کرنا بجنسہٖ ویسا ہے جیسا متعصب عیسائی رسول اللہ صلعم پر افترا کرتے ہیں کہ حضورؐ نے توریت و انجیل سے سرقہ کرکے قرآن بنایا اور شامی عیسائیو ں سے استفاضہ کیا۔ واللہ ذالک بہتان عظیم، انا للہ و انا الیہ راجعون۔　　(شمس العارف)

یہ خط اپنے مفہوم و معنی کے لحاظ سے تشنہ تو نہیں ہے لیکن مختصر اور مجمل ضرور ہے اس کے علاوہ متعدد علمی اصطلاحیں اس میں آگئی ہیں جن سے بالعموم لوگ واقف نہیں۔ وحدت معبود، وحدت وجود، وحدت شہود، عین الیقین، حق الیقین، عالم صحو اور عالمِ سکر، پھر ان صوفیانہ اصطلاحوں کے علاوہ فقہی اصطلاح عبارۃ النص و اشارۃ النص اور منطقی اصطلاح کلی طبیعی۔ پھر طبی اصطلاح مخدرات وغیرہ متقاضی

ہیں کہ آدمی وسعت علم ونگاہ کا حامل ہو۔ حاصل یہ ہے کہ اہلِ فکر ونظر نے کائنات اور خالق کائنات کی باہمی نسبت وتعلق اور اس کی حقیقت کو جاننے پہچاننے کی جدوجہد کی۔ اس تلاش وجستجو میں وہ جن نتائج تک پہونچے ان کو ذہن نشین کرانے کے لیے علوم متعارفہ کی اصطلاحیں استعمال کیں، یہ لوگ خود تمام علوم پر پوری طرح حاوی ہوتے تھے۔ بہرحال اس جستجو میں اس پر توسب کا اتفاق تھا کہ ہستیٔ واحد موجود ہے لیکن اس ہستیٔ واحد کے ساتھ کائنات کا ربط کس قسم کا ہے اس کی تشریح میں اہلِ فکر کے بیانات مختلف ہو گئے۔

کسی نے کہا —— وہ ہستیٔ واحد صانع ہے، خالق ہے اور یہ کائنات اس کی صنعت ہے اور مخلوق ہے لہٰذا دونوں کے درمیان وہی نسبت ہے جو کسی صانع اور اس کی صنعت کے درمیان ہوتی ہے۔

کسی نے کہا —— وہ ایک کلی طبعی ہے اور اس کائنات کی حیثیت اس کے اجزاء واشخاص وافراد کی ہے اور کلی طبیعی کا کہیں خارج میں وجود نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا اب وہ الگ کوئی ہستی نہیں۔

کسی نے کہا —— وہ گویا آفتاب ہے، اور کائنات اس کا ظل وعکس، لہٰذا نسبت تجلی کی ہے۔

کسی نے کہا —— وہ گویا سمندر ہے اور کائنات اس کی امواج وحباب۔ لہٰذا نسبت ظہور کی ہے، ظہور وحدت در کثرت۔

پہلا قول متکلمین وارباب ظواہر کا ہے، دوسرا قول منطقیین وحکمار کا ہے، تیسرا قول صوفیہ شہود کا ہے اور چوتھا قول صوفیہ وجودیہ کا۔ (صوفیوں کے ان دونوں گروہوں میں فرق بس اتنا ہے کہ اربابِ شہود کے نزدیک یہ کہنا درست نہیں کہ آفتاب دھوپ ہے اور دھوپ آفتاب مگر ارباب وجود کے نزدیک یہ کہنا غلط نہیں کہ سمندر موج وحباب ہے اور موج وحباب سمندر)

اس خط کے اختصار واجمال کی شکایت خواجہ صاحب کو بھی ہوئی اور انھوں نے مزید شرح وبسط کے ساتھ جواب چاہا جس کے بعد دوسرا خط شاہ صاحب نے یہ لکھا:

مکتوب ثانی | جناب خواجہ صاحب السلام علیکم

اما بعد، آپ کو میرے مختصر خط سے تعجب وحیرت کے ساتھ اجمال نویسی کی شکایت ہوئی مگر مخدوما! جیسا سوال ویسا جواب۔ اگر آپ سوالات وشبہات کو تفصیلی طور سے لکھتے تو جواب میں بھی شرح وبسط کا خیال کیا جاتا۔ لہٰذا اتنا ضرور کہوں گا کہ مسئلہ وحدت وجود اور وحدت شہود ہمارے حضرات صوفیہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا وجدان وکشف ہے اور وہ لوگ اس کی تمہید میں مختلف العبارات والالفاظ ہیں مگر جہال مشائخ وپیرزادگان کی سمجھ سے یہ مسئلہ دور ہے اور وہ جس طور سے تمہید کرتے ہیں محض الحاد وزندقہ ہے کیونکہ اس مسئلے کے لیے امور عامہ والٰہیات کی دانست کے ساتھ ریاضات ومراقبات وحدت کی ضرورت ہے ورنہ معقولات ومشاہدات کی تطبیق نہ ہو سکے گی۔ اور ایک نہ ایک پہلو اس کا ہمیشہ کمزور رہے گا۔

اب ذرا آپ توجہ تام کے ساتھ ادھر متوجہ ہو جیے۔ مخدوما! یہ مسئلہ "ربط الحادث بالقدیم" کا ہے یعنی محدثات وممکنات اور مخلوقات کو حضرتِ خالق واجب الوجود وقدیم بالذات سے کیا نسبت وتعلق ہے۔

متکلمین اربابِ ظواہر کہتے ہیں کہ محض نسبتِ صدور وخلق" ہے کہ اس نے ہمیں پیدا کیا اور بنایا۔ جس طرح نجار (بڑھئی) کو اس کے بنائے ہوئے تخت سے تعلق ہے۔ یعنی دونوں کی حقیقت میں مغائرت تامہ ہے، وہ علت ہے اور یہ معلول ہے، وہ خلق ہے اور یہ مخلوق ہے، بس اسی قدر باہمی نسبت وتعلق ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ کاتب یعنی لکھنے والے کو جو نسبت وتعلق حروف ونقوش کے ساتھ ہے، یعنی حروف ونقوش سب کاتب کے دست وقلم کا نتیجہ ہیں مگر حروف ونقوش اور شے ہیں اور کاتب اور شے۔

اور حکماء اور براہمہ اور جوگیہ کی تحقیق یہ ہے کہ باہم "نسبت عینیت و وحدت محضہ" ہے یعنی وہ ذات واحد پہلے اجمال میں تھی، اب اس کی تفصیل ہوگئی۔ اب اس کی ذات ہی عالم ہے۔ ہمارا وجود ہی اُس کا وجود ہے۔ اور ظاہر ہے جب ظہور ہوا خفا جاتا رہا۔ جب تفصیل ہوئی تو پھر اجمال نہ رہا۔ اس کی مثال یہ لوگ تخم و درخت سے دیتے ہیں کہ درخت کی اصل تخم ہے، اسی سے تنہ، ٹہنیاں، پھل پھول، پتے سب کچھ ہوئے۔ سب کے نام علیحدہ علیحدہ ہیں۔ مگر حقیقت ایک ہے یعنی وہی تخم۔ اب وہ تخم، بحالتِ تخمی، اپنی جگہ پر باقی نہیں۔ وہ تمام و کمال صورت شجریہ میں ظاہر ہوگیا۔

اور صوفیہ اسلامیہ فرماتے ہیں کہ حادث و قدیم کے درمیان نسبت ظہور کی ہے یعنی ذات جناب باری تعالیٰ مستقل بالذات ہے مگر تمام اشیاء کائنات اسی کی ذات کے ساتھ پائے جاتے ہیں، مگر اس کی ذات سے ہم قطع نظر کرلیں تو تمام اشیاء معدوم ہیں پس بہ امتیازِ اشیاء باخود ہا اور نیز اس ذات مستقلِ جناب باری تعالیٰ عزّ اسمہٗ سے "بوجوہ تشخصات ہیں" جن کو "وجوداتِ خاصہ" کہتے ہیں۔ اور اس کی مثال یوں دیتے ہیں کہ جیسے سیاہی اور حروف و نقوش یعنی اصل تمام حروف و نقوش کی وہی سیاہی ہے مگر وہ عین سیاہی نہیں بلکہ اس سیاہی سے پیدا ہوئے ہیں، پس باعتبار "حقیقت ہستی" فی الجملہ "عینیت" ہے اور باعتبار "ظہور" وہی "نسبتِ صدور و مغایرت" ہے، پس مذہب حکماء و ملاحدہ سے ان کی تحقیق کو کوئی واسطہ نہیں، وہاں "عینیت محضہ" ہے، یہاں "وجوداتِ خاصہ" بھی ہیں۔ وہاں مستقل وجودِ حضرت باری اب باقی نہیں اس لیے کہ وجودِ کلی طبیعی یعنی وجود اشخاصہ فی الخارج ہے اور یہاں الآن کما کان۔ مولوی جامی کیا خوب فرماتے ہیں رحمۃ اللہ علیہ:

آں کان حسن بود، نہ بود از جہان نشان — الآن ان عرفت علی ما علیہ کان

اعداد و کون و کثرت صورت نمائش است — فالکل واحد یتجلی بکل شان

"الآن ان عرفت" پر خوب غور کیجیے کہ اس عالمِ ظہور سے اس پاک وجود کو اپنی ہستی کے بعینہٖ بقا و کمال میں کوئی تفاوت نہیں بس اس قدر کہ انّ العالم اعراض مجتمعۃ فی عینٍ واحد اور وہ عین واحد، وہی ذات وجود منبسط ہے۔

اور شعر ثانی کے دوسرے مصرعے پر بھی نگاہ غور ڈالیے فالکل واحد۔ ایک مستقل ابتدائی عدد ہے پھر اس سے ایک۔ دو، تین، چار اور پانچ سب ہیں، مگر سب میں وہ ایک شامل ہے اور پھر ان سب سے علیحدہ ایک وجود مستقل بھی اس "ایک" کا ہے۔ اسی طرح وہ وجود تمام کائنات میں ہے۔ پھر فی نفسہٖ موجود مستقل ہے۔ اس میں کوئی نقص و زیادت نہیں۔

آثار تعینات چوں یافت خللے — کثرت ہمہ وحدت است بے ہیچ شکے

چوں صورت "صفر" شد نہاں از قیمت — بنگر کہ "دہ" و "صد" و "ہزار" است یکے

اسی طرح نقطہ و خطوط کی مثالیں ہیں مگر یہ سب کہہ کر بھی یہ کہتے ہیں کہ لیس کمثلہ شیٔ (شوریٰ) وللہ المثل الاعلیٰ (نحل) ولنا مشاهدات و مکاشفات

در عقل نمی گنجی در فہم نمی آئی

ھذا طورٌ وراء طور العقول المتوسطۃ (ملا حسن وغیرہ)

اب رہی یہ بات کہ صوفیوں کو اس مسئلے کی تحقیق اور اس میں لب کشائی کی کیا ضرورت ہوئی۔ جیسا کہ متکلمین اور عامہ مومنین وحدت معبود کے قائل تھے اور صرف نسبت صدور کو تسلیم کرتے آئے، یہ بھی اسی حد تک رہتے — اس کا جواب یہ ہے کہ صوفیہ کہتے ہیں کہ شریعت فقط قیل و قال کا نام نہیں ہے بلکہ عملی حصے سے فائدہ اٹھانے کا نام ہے اور ہم نے جب

خلوص عمل کیا تو انوار و تجلیات جیسے صحابہ کرام پر منکشف ہوئے تھے ہم پر بھی منکشف ہونے لگے۔ ہم نے بفرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک نماز میں رویت خداوندی کا مراقبہ کیا اور گویا چشم حقیقت سے اسے دیکھا اور کبھی اس کو اپنا دیکھنے والا پایا۔ اب تجلیات و مشاہدات نے ہمیں اپنی نسبت کے دریافت کی طرف متوجہ کیا، اس کے کلام کی طرف توجہ کی ھو خلقکم اور واللہ خلقکم وما تعلمون، ذالکم اللہ ربکم خالق کل شئ پر غور کیا۔ بس اپنی نسبت صدور اور اس کی معبودیت کو موجب نجات سمجھا مگر تجلیات عرفانی نے قدم ذرا آگے بڑھا دیا تو پھر ان آیات ربانی پر غور کیا۔ ھو معکم اینما کنتم (حدید) فی انفسکم افلا تبصرون (ذاریات) نحن اقرب الیہ من حبل الورید (ق) سَنُرِیھم ایاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق اولم یکف بربک انہ علی کل شئ شھید۔ الا انھم فی مریۃ من لقاء ربھم الا بکل شئ محیط۔ وَمَا رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ۔ وان الّذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم۔ اللہ نور السمٰوٰت والارض۔ وھو الذی فی السماء الہ وفی الارض الہ، اینما تولّوا فثم وجہ اللہ۔

ان آیات پر غور و فکر کے بعد مکاشفات و مشاہدات نے وحدت وجود یا وحدت شہود کے اعتقاد حقہ پر مجبور کیا۔ اور یہ سمجھے کہ شریعت کا اصل عرفان یہی ہے اور اسی عرفان سے صحابہ و تابعین اور اولیائے متقدمین رضوان اللہ علیہم اجمعین، مدارج علیا کو پہونچے۔ مگر وہاں تمہید و تقریر کی ضرورت نہ تھی محض سینہ بہ سینہ تھا اب ہمیں یہاں بوجہ بُعد زمانہ اور قلت فہم عامہ افہام و تفہیم کی زیادہ ضرورت تھی۔ مجبوراً اس اپنے مشاہدے کی تمہید کرنا پڑی اور وہ تمہید مذہب متکلمین کی ضد اور منافی نہیں ہے۔ اور عبارت النص قرآنیہ کی مخالف نہیں بلکہ اشارات النص بکثرت اس کی موئیدات ہیں لیکن اصل دارومدار ہمارا مشاہدہ اور مکاشفہ پر ہے۔ اس لئے ہم ہمیشہ کہتے آئے کہ:

"قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید"

پس بلا مشاہدہ تجلّیات ہمارے مسلک کی توجیہ و تمہید محض خوش عقیدگی ہے اور لایسمن ولایغنی من جوع۔ بلکہ الحاد و زندقہ میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔

مخدوما! یہ ہمارے حضرات کی تقریر ہے اسے بغور و بہ انصاف دیکھنا چاہیئے۔ شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ نے اس مسئلہ کو بسط و بسیط کیا ہے ورنہ ان سے قبل بھی علمائے صوفیہ لکھتے آئے ہیں۔ حضرت امام غزالی کیمیائے سعادت و اربعین اور احیاء العلوم میں اسے ذکر فرماتے ہیں اور ملتقط احیاء میں یوں ہے:

اعلم[1] ان التوحید علی اربع مراتب الاولیٰ ان یقول لا الہ الا اللہ باللسان وقلبہ غافل عنہ او منکر لہ کتوحید المنافق، والثانیہ ان یصدق بمعنی اللفظ قلبہ کما یصدق بہ عموم المسلمین وھو اعتقادہ۔ والثالثہ ان یشاھد ذٰلک بطریق الکشف بواسطہ نور الحق وھو مقام المقربین وھو ان یری اشیاء کثیرۃ لکن یرھا صادرۃ من الوحدۃ والربعۃ لا یری فی الوجود الا وحدہ وھو مشاھدۃ الصدّیقین

---

[1] معلوم ہو کہ توحید کے چار درجے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی زبان سے تو لا الہ الا اللہ کہے مگر قلب اس کا غافل ہو یا منکر ہو جیسے منافقین کی توحید، دوسرا درجہ یہ ہے کہ جو زبان سے کہے اس کی تصدیق دل بھی کرے جیسے عام مسلمان جو زبان سے کہتے ہیں اور اس کا اعتقاد بھی رکھتے ہیں۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ کشف کے ذریعے نور حق کے واسطے سے اس کا مشاہدہ بھی کرے اور یہ مقام مقربین کا ہے وہ دیکھتا تو اشیاء کثیرہ کو ہے مگر سب کا صدور وحدت ہی سے مشاہدہ کرتا ہے۔ چوتھا درجہ یہ ہے کہ وجود میں اب اس ایک ہستی کے سوا کسی کو نہ دیکھے یہ مشاہدہ صدیقین کا ہے۔

اس توحید کے مدارج کو حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری قدس سرہٗ نے بہ بسط تمام وکمال لکھا ہے اور ماخذ اس کا ملتقطہ احیا و اربعین ہے۔ ذرا اسے بھی دیکھیے گا۔ تیسری صورت "اَلوَحدۃ فی الکثرۃ" جو مقامِ مقربین ہے اور چوتھی صورت ہیں کمال مشاہدہ نے کثرت کو مٹا دیا ہے پھر ایک ہستی کے سوا کچھ نہیں پاتا۔ ؎

مجموعۂ کون را بقانون سبق　　کردیم تصفحے ورقاً بعد ورق

حقا کہ ندیدیم و نخواندیم درا و　　جز ذاتِ حق و شیون ذاتیۂ حق

اے برادر! سالک طالب بالخصوص وہ اگر اہل علم بھی ہو جب اس راہ میں آتا ہے اور مجاہدات میں پڑتا ہے تو مسلک متکلمین اور اعتقاد جامد نسبت صدور اس کو بڑھنے سے روکتا ہے ادھر تجلیاتِ وحدت اس کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ الغرض وہ غریب عجیب کشاکش میں ہوتا ہے۔ پھر جب استغراق نے اسے پکڑا تو بیڑا پار ہے ورنہ بے خوابی اور بے چینی میں جانے کیا کچھ بول جاتا ہے کبھی کہتا ہے انا الحق، کبھی کہتا ہے سبحانی ما اعظم شانی، پھر جب اپنے اصلی مرکز پر آتا ہے تو فقط مشاہدہ کی تنزیت دگر ہیچ، اپنے قول پر ندامت اور اپنی فضول گوئی سے خجل ہے۔ ہمارے ایک بزرگ تھے حضرت جدی مولانا احمدی قدس سرہٗ علم ظاہر میں شیخ الکل بالخصوص امور عامہ میں بحرِ زخار، اور حضرت مخدومی وجدی شیخ العالمین۔ شاہ نعمت اللہ قدس سرہٗ کے خلیفۂ اجل، وہ بزرگ جب سب مراحل طے کر چکے تو یہ رباعی فرمائی:

یک چند ترا خود جدا دانستم　　چندے ہمہ خویشتن ترا دانستم

از نعمت شیخ رفتہ رفتہ آخر　　بندہ بندہ خدا خدا دانستم

ابتدا و توسط و کمال ہر زمانے کا حال وہ بتاتے ہیں اور شیخ کی ضرورت کو بھی سمجھاتے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ وہ توسط کا زمانہ جس میں آپ خدائی کی بڑ مارتے تھے۔ یہ کیسا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ غلبۂ حال و سطوتِ نورِ شہود نے جو چاہا کہلایا۔ انصاف یہ ہے کہ حالتِ سکر قابلِ معافی ہے نہ دار و گیر کا باعث۔ حضرت شیخ فرید الدین عطار کیا خوب فرماتے ہیں:

چوں زند دیوانۂ ایں شیوہ لاف　　تو ز سر کوری مکن با او مصاف

تو زباں از شیوۂ او دور دار　　عاشق دیوانہ را معذور دار

عاقلاں را شرع تکلیف آمدہ است　　بیدلاں را عشق تشریف آمدہ است

لاجرم دیوانہ را گرچہ خطا است　　ہر چہ می گوید بگستاخی روا است

حالتِ سکر سے مرکزِ استقامت پر لانا شیخ کا کام ہے اور ہمیشہ سکر میں پڑے رہنا نقصِ مدارج ہے اسی لئے حضرت غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ منصور حلاج کی کسی نے دست گیری نہ کی۔ میں ہوتا تو ایک درجہ اسے آگے بڑھا دیتا۔

اب لے ہی یہ بات کہ شیخ مرید کو حالتِ سکر میں کیوں ڈالتا ہے۔ سکر میں تو نقصان ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی بھاری اپریشن کرنا ہوتا ہے تو ڈاکٹر کلورافارم سے مریض کو بے ہوش کرنے پر مجبور ہوتا ہے مگر پھر وہ اسے ہوش میں بھی لاتا ہے۔ پس شیخ بھی ایسا ہی کرتا ہے۔ مگر ہمیشہ اسی حال پر نہیں چھوڑتا جو موجبِ نقص ہو۔ اس کی نظیر کتاب و سنت میں بھی پایئے گا۔ حضرت سیدنا موسیٰ کے واقعات کو و طور کو یاد فرمایئے ارنی کی درخواست، ادھر سے لن ترانی کا جواب۔ پھر تجلی اور حضرت موسیٰؑ کی بیہوشی اور پھر ہوش میں آنا۔ یہ کیا ہے مگر کمالِ ادب کی وجہ سے ہم اسے سکر کر کے تعبیر نہیں کر سکتے۔ مگر کم سے کم حالتِ وجدیہ تو ضرور کہتے ہیں۔ ستر بنی اسرائیل کی موت یا بیہوشی پر موسیٰ علیہ السلام بول اٹھے "اَتُھلکنا بما فعل السفہاء منا ان ھی الا فتنتک" الخ یہ الزام دینا وہی حالتِ وجدیہ (سکریہ) ہے

اور آدابِ پیغمبری کے بظاہر خلاف لیکن عشقِ پیغمبری میں جائز ہے اور خلافِ ادب نہیں، بقول مولوی رومی قدس سرہٗ:

گفتگوے عاشقاں در فعلِ رب — جوششِ عشق است نے ترکِ ادب
ہر کہ کرد از جامِ حق یک جرعہ نوش — بے ادب ماند درونے عقل و ہوش

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ اور بعض دیگر انبیاء کے حالات میں بھی ایسے مواجید پائیے گا اور خود آنحضرت صلعم پر کچھ دنوں وحی کی آمد بند ہو گئی تو جذباتِ عشق نے حضرت صلعم کو پہاڑ پر چڑھا کر گرانا چاہا اور بار ہا ایسا قصد فرمایا مگر حضرت جبریل علیہ السلام کو جب دیکھتے تو قلب پر نزولِ سکینہ ہوتا اور اس ارادے سے باز رہتے۔ عامۂ کتبِ احادیث و سیر میں ہے "وجعل یعدو الیٰ راس الجبل لیتردیٰ منہا فکلما اوفی بذروۃ جبل تبدی لہ جبرئیل فیقول انک رسول اللہ حقاً فیسکن لذلک جاشہ و ترجع نفسہ"، اور اس حدیث کو مولانائے رومی اپنے الفاظ میں یوں ادا کرتے ہیں:

مصطفےٰ را ہجر چوں افراختی — خویش را از کوہ می انداختی
تا بگفتی جبرئیلش، ہیں مکن — کہ ترا بس دولت است امر کن

اور صحابہ کرام کی کیفیات وجدیہ و سُکریہ تو بے شمار ہیں اور صحاح و سنن و مسانید و آثار میں منقول ہیں۔ اگر اسے لکھوں تو دفتر کا دفتر چاہیئے مگر ہمیشہ وہ لوگ عالمِ سُکر میں نہیں رہتے تھے بلکہ عالمِ صحو میں ہو کر نظمِ دینی و دنیوی میں مصروف رہتے اور یہی کمال تھا:"

(شمس المعارف)

یہ خط کافی تفصیلی بلکہ سیر حاصل ہے۔ اس میں ان تمام استفسارات کا جواب موجود ہے جو اقبال کے ۱۹۰۵ء والے خط میں درج تھے بجز اس کے کہ اقبال کے آخری سوال کی نسبت کوئی خصوصی وضاحت اس میں نہیں ہے کہ "کیا حضرت علی کو کوئی پوشیدہ تعلیم دی گئی تھی؟" — البتہ تعمیم کے ساتھ اتنا ضرور درج ہے کہ — "عہدِ رسالت میں" تمہید و تقریر کی ضرورت نہ تھی محض سینہ بہ سینہ تھا" مگر اقبال کی کتاب "فلسفۂ عجم" کا مطالعہ جب ہم کرتے ہیں تو اس میں یہ عبارت ہمیں ملتی ہے کہ:-

"یہ ثابت کرنے کے لیے کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے کہ پیغمبرِ عرب نے فی الواقع حضرت علیؓ یا حضرت ابو بکرؓ کو کوئی باطنی علم سکھلایا تھا۔ بہر صورت صوفیہ کا دعوے ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے قرآن کی تعلیم کے ماسوا ایک باطنی تعلیم (حکمت) بھی دی تھی اس دعوے کی تائید میں وہ قرآن کی حسبِ ذیل آیت پیش کرتے ہیں "ارسلنا فیکم رسولا منکم یتلوا علیکم آیاتنا ویزکیکم ویعلمکم الکتاب والحکمۃ ما لم تکونوا تعلمون"۔ ان کا خیال ہے کہ "حکمت" کا جو ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے وہ ایسی چیز ہے جس کو قرآن کی تعلیم میں نہیں بیان کیا گیا۔ جو پیغمبر علیہ السلام نے بار بار فرمایا کہ قرآن کی تعلیم آپ سے پہلے کے پیغمبروں نے بھی دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس "حکمت" کو قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے تو اس آیت میں "حکمت" کا جو لفظ آیا ہے وہ حشو و زائد ہوگا۔" میرے خیال میں یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ قرآن و احادیثِ صحیحہ میں صوفیانہ نظریہ کی طرف اشارات موجود تھے لیکن وہ عربوں کی خالص عملی ذہانت کی وجہ سے نشو و نما نہ پا کر بار آور نہ ہو سکے۔"

اس کے علاوہ اقبال نے مسئلہ تصوف کے اثبات و تائید میں بھی وہی آیتیں، سورۂ ذاریات، سورۂ نور، سورۂ ق، سورۂ شوریٰ کی کچھ اور آیات کے ساتھ پیش کی ہیں، جو حضرت شاہ صاحب کے مکتوب میں درج ہیں — اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۰۵ء میں جو جواب شاہ صاحب کی طرف سے اقبال کے پاس گیا تھا وہ کیا ہوگا۔

۱۹۰۵ء سے آواخرِ عمر تک اقبال پر تین دَور گزرے ہیں۔ ایک علم الیقین کا، دوسرا عین الیقین کا، تیسرا حق الیقین کا — خدا

کی ہستی و وجود کا اعتقاد جازم اگر دلائل و براہین سے پیدا ہو تو اسے علم الیقین کہتے ہیں، اگر اس کے انوار و تجلیات کا مشاہدہ بھی ہونے لگے تو اسے عین الیقین کہتے ہیں۔ اور اگر صرف مشاہدہ ہی نہ ہو، بلکہ سالک اس کو پا بھی لے اور تجلیات ذاتی میں استغراق اس کو پیدا ہو جائے تو وہ حق الیقین ہے۔ سالکِ راہِ حقیقت کو ہمیشہ انھیں تین مقامات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں میر حسن الدین بی اے ایل ایل بی عثمانیہ مترجم فلسفۂ عجم نے ترجمے کی اجازت اقبال سے چاہی تو انھوں نے اجازت تو دیدی مگر یہ لکھا کہ .... "اس وقت سے بہت سے نئے امور کا انکشاف ہوا ہے اور خود میرے خیالات میں بھی بہت سا انقلاب آچکا ہے ...." لیکن وہ انقلاب کیا تھا؟ اس کا جواب ظاہر ہے کہ اب اقبال کی نظموں ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور مابعد کی نظمیں یہ بتاتی ہیں کہ وہ وجودی ہو گئے تھے۔ مثلاً

وہی اصل مکان و لامکاں ہے مکاں کیا شے ہے؟ اندازِ بیاں ہے
خرد کیوں کر بتائے، کیا بتائے اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

اس رباعی پر اربابِ وجود و شہود دونوں کے زاویۂ نظر کو سامنے رکھ کر غور کیجیے۔ یہ رباعی اقبال کے عہدِ منزل رسی کی ہے۔ سالک جب اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کی زبان سے جب نکلتا ہے یہی نکلتا ہے کہ:

زمین و آسمان و چار سو نیست درین عالم بجز اللہ ھُو نیست
نہ ہے زمیں نہ زماں لا الہ الا اللہ

حضرت علیؓ کا قول ہے العلم نھرٌ والحکمۃ بحرٌ، العلما حول النھر یطوفون، والحکماء وسط البحر تحوضون والعارفون فی سفن النجاۃ یسیرون، علم ایک نہر ہے، حکمت ایک دریا ہے، علماء نہر کے اردگرد چکر کاٹتے رہتے ہیں، حکماء دریا کے بیچ میں غوطے کھاتے رہتے ہیں، اور عارف سفینۂ نجات پر بیٹھے سیر کرتے نظر آتے ہیں۔ صوفیوں کے مرشدِ اعلیٰ (بعد النبیؐ) علی مرتضیٰ ہی ہیں، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اقبال کے کلام میں (جو سلسلۂ قادریہ سے تھے) حضرت علیؓ کے اسماء و القاب مثلاً ید اللہ، حیدرِ کرار، ابو تراب اور باب مدینۃ العلم، وغیرہ کے اسرار و رموز کی والہانہ تشریح اور حیات افروز نکات آفرینی کے جلوے بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔

نوادرِ غالب — غیر مطبوعہ فارسی خطوط

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

ا۔ تمہید

مرزا غالب اپنی معاشی ضرورت سے والیانِ ریاست کے درباروں میں رسائی کے لیے برابر کوشش کرتے رہتے تھے اور اور اُن کے جو احباب مقربین بارگاہ ہوتے تھے اُن کے توسط سے اپنے معروضات اور مدحیہ اشعار بھیجتے رہتے تھے۔ اُنھوں نے راجستھان کی ریاست ٹونک سے بھی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ تقریباً ۲۸۰۰ مربع میل میں پھیلی ہوئی چھوٹی سی ریاست جو پانچ متفرق قصبوں میں بٹی ہوئی تھی، ۱۸۰۶ء میں نواب امیر خاں نے بزورِ شمشیر قائم کی تھی، اور اسے ۱۸۱۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک معاہدے کی رُو سے تسلیم بھی کر لیا تھا۔ نواب امیر خاں سے تو غالب کا کوئی ربط قائم نہیں ہو سکا کیونکہ وہ بزم کے نہیں رزم کے آدمی تھے۔ اور غالب بھی اُس وقت تک شاعر کی حیثیت سے زیادہ نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ البتہ اُن کے انتقال کے بعد ۱۸۳۴ء میں نواب وزیر محمد خاں مسند نشیں ہوئے اور اُن کو مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی (۱۸۰۶ء-۱۸۳۷ء) نے بھی ایک شاہی فرمان کی رو سے نواب وزیر الدولہ خطاب عطا کیا، تو غالب نے اُن سے ربط پیدا کرنا چاہا۔ یہ ایک علم دوست فرماں روا تھے۔ مومن خاں مومن نے بھی اُن کی مدح میں اشعار کہے ہیں۔

غالب نے ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء سے پہلے کسی وقت میر تفضل حسین خاں کی معرفت ایک قصیدۂ تہنیت عرفی شیرازی کی زمین میں کہہ کر بھیجا تھا، جس کا مطلع تھا:

اے ذاتِ تو جامع صفتِ عدل و کرم را — اے بر شرفِ ذاتِ تو اجماع، امم را

پھر ہر سال بقرعید کے موقع پر قصیدۂ تہنیت بھیجنے لگے۔ عیدالاضحیٰ ۱۲۶۷ھ (۹ راکتوبر ۱۸۵۱ء) کے موقع پر مبارکباد دیتے ہوئے اُنھوں نے جو قصیدہ بھیجا اُس کا مطلع تھا:

عیدِ اضحیٰ بسرِ آغازِ زمستاں آمد — وقت آراستنِ حجرۂ دالیواں آمد

اِس قصیدے کا صلہ ملنے میں تاخیر ہوئی تو ایک قطعہ تقاضے کا بھیجا گیا:

آیا چہ بود کہ میرِ نواب — ننوشت جوابِ نامہ ام ہاں
آں گونہ عریضہ کہ دانی — درویش نوشتہ سوئے سلطاں
آں گونہ قصیدہ کہ گوئی — از صفحۂ دمیدہ سنبلستاں
ایں ہر دو رسید نیست پیدا — زاں سو اثرے بہ ہیچ عنواں

اِس میں آگے چل کر یہ کہا ہے کہ دراصل نواب صاحب نے دمشق سے دیبا، روم سے مخمل، عراق سے گھوڑے، دکن سے ہاتھی، نیشاپور سے فیروزے اور بدخشاں سے یاقوت درآمد کرنے کا حکم دیا ہوگا اور ان چیزوں کے آنے میں دیر ہو رہی ہے، یہ آجائیں تو مجھے عنایت

فرمائی جائیں گی۔ مولانا حالی نے اِسے تجویلیح کی مثال میں پیش کیا ہے۔ بہرحال اِس تقاضے کے تیور بھانپ کر نواب وزیرالدولہ نے حکم دیا کہ پانسو روپے (۵۰۰) سگ ماد موی مرزا کو بطورِ صلہ بھیج دیئے جائیں۔ یہ روپے مرزا کو ۴ر صفر ۱۲۶۸ھ (۹ر دسمبر ۱۸۵۱ء) کو وصول ہوئے، اور غالب نے اپنے خط کے ساتھ اِس کی رسید بھیجی۔ سید منظور الحسن برکاتی کا مضمون "غالب کی ایک فیصلہ کن نادر تحریر" (آج کل فروری ۱۹۵۵ء) اسی سے متعلق ہے اور اس کا عکس رسالہ "غالب نما" جے پور (۱۹۷۰ء) میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

نواب وزیرالدولہ وزیر محمد خاں نے ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں انتقال کیا اور اُن کے بیٹے نواب محمد علی خاں مسند آرا ہوئے۔ غالب نے اُن کی مسند نشینی پر بھی نو (۹) شعروں کی ایک مثنوی بطور تہنیت بھیجی جس کا پہلا شعر یہ تھا:

دریں سال نواب عالی جناب — بروئے زمیں غیرتِ آفتاب

اور آخری شعر میں مادۂ تاریخ نظم ہوا تھا:

کہ چوں اخترِ نیک آمد بفال — ہم از "اخترِ نیک" پیداست سال
۱۲۸۱

نواب محمد علی خاں بہت اولوالعزم اور جیالے فرمانروا تھے۔ انگریزوں کو خوف ہوا کہ نواب امیر خاں کی طرح یہ میدانِ کارزار گرم نہ کریں، اس لیے انہیں ایک قتل کے مقدمے میں ملوث کر کے معزول کر دیا۔ ریاست ان کے بیٹے نواب ابراہیم علی خاں (۱۸۶۴ء - ۱۹۳۰ء) کو دے دی اور انہیں جلاوطن کر کے بنارس بھیج دیا۔ یہ باقی عمر وہیں رہے اور علمی مشاغل میں زندگی بسر کی۔ کتب خانہ سعیدیہ ٹونک [جو اب تین حصوں میں بٹ چکا ہے: مخطوطات کا ایک حصہ نیشنل میوزیم نئی دہلی میں، اور دوسرا ٹونک کے عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اور مطبوعات کا ذخیرہ "سعیدیہ ڈسٹرکٹ لائبریری" ٹونک میں پایا جاتا ہے] زیادہ تر نواب محمد علی خاں ہی نے بنارس میں اپنے قیام کے دوران جمع کیا تھا۔ سید نجف علی جھجری جنھوں نے معرکۂ قاطع برہان کے سلسلے میں اور غالب کی حمایت میں کتاب "دافع ہذیان" (اکمل المطابع دہلی ۱۲۸۱ھ) لکھی تھی، بنارس میں نواب محمد علی خاں کے ساتھ تھے۔

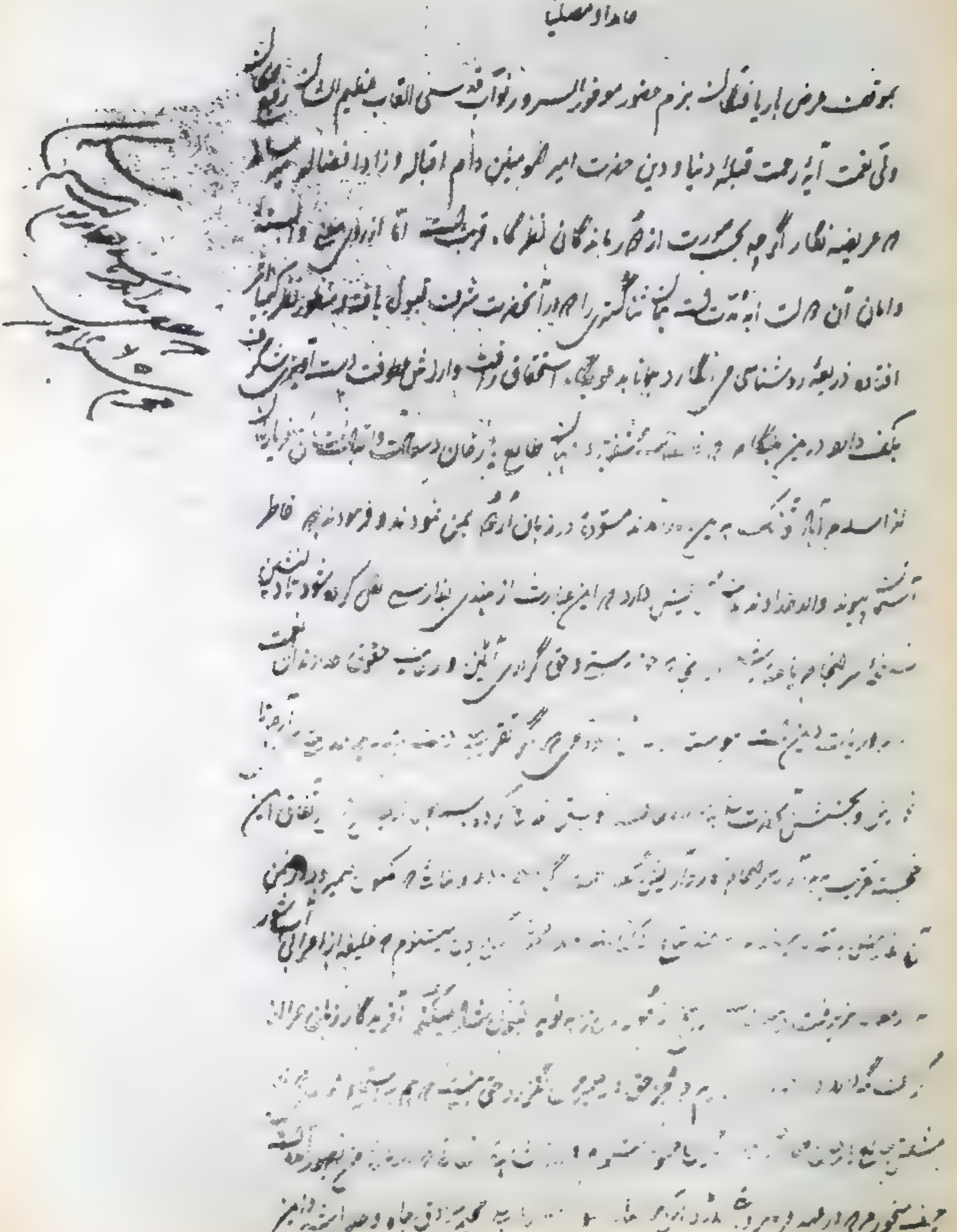
۱۲۷۱ھ/۱۸۵۳ء میں غالب نے طالع یار خاں کے توسط سے اپنی کتاب "مہر نیمروز" کا ایک نسخہ نواب وزیرالدولہ کی خدمت میں بھیجا تھا جو ۲ر جمادی الثانیہ ۱۲۷۱ھ (۷ر مارچ ۱۸۵۵ء) کو کتب خانہ میں داخل کیا گیا تھا۔ اس نسخے کی تفصیلات سید جمیل الدین نے [نوائے ادب (بمبئی) جولائی ۱۹۵۱ء - جنوری ۱۹۵۲ء] میں شائع کر دی تھیں۔ اسی طرح غالب نے ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۸ء) میں اپنی تصنیف "دستنبو" کا ایک نسخہ نواب وزیرالدولہ کی نذر کیا اور اُس پر اپنے قلم سے یہ اشعار لکھے،

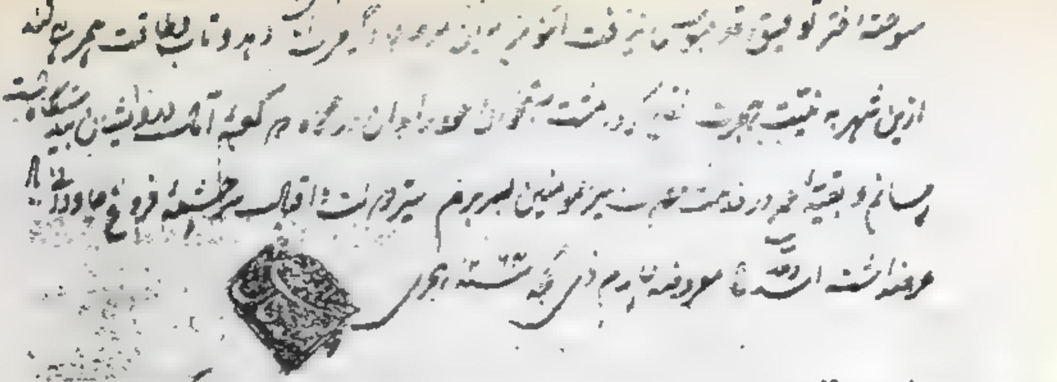
نذرِ نواب وزیرالدولہ
آں محیطِ کرم و دانش و داد
ہم بدیں حیلہ مگر یاد آید
غالبِ خستہ کہ رفتست زیاد

اس نسخے کا تعارف بھی سید جمیل الدین شائع کرا چکے ہیں (نوائے ادب، جولائی، اکتوبر ۱۹۵۶ء)

یہاں مرزا غالب کے تین غیر مطبوعہ فارسی خطوط کا متن (اور ان خطوں کا عکس) پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ تینوں خطوط نواب وزیرالدولہ کے نام ہیں۔ ایک قطعہ تہنیت فارسی میں بھی ہے جو اُنھوں نے عیدالاضحیٰ کی مبارکباد کے طور پر بھیجا تھا۔ یہ سب ریاست ٹونک کے "منشی خانہ" میں موجود تھے جو اب راجستھان اسٹیٹ آرکائیوز میں ضم ہو چکا ہے۔ مجھے ان خطوط کے عکس مولانا محمد عمران خاں صاحب ٹونکی کی عنایت سے دستیاب ہوئے، اُن کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

غالب کے فارسی خط کا عکس (۱)




سوخته اختر توفیق قدمبوس نیافت اکنون بر آن سرم که اگر مرگ امان دهد و تاب و طاقت همرہی کند
ازین شهر به نیت هجرت نقل کرده مشت استخوان خود را بدان درگاه که کعبه آمال درویشان بے دستگاه است
رسانم و بقیه عمر در خدمت حضرت امیرالمومنین بسر برم نیر دولت و اقبال سرچشمه فروغ جاودانی باد
عرضداشت اسدالله معروضه چهارم ذی الحجه سنه ۱۲۶۴ هجری

حکم شد
که عرضی هذا بدفتر باشد فقط۔ مرقوم بست هشتم محرم ۱۲۶۵ هجری

۲ خطوط کا فارسی متن

(۱)

حامداً و مصلیاً

بموقف عرضِ باریافتگانِ بزمِ حضورِ موفور السرور، نواب قدسی القاب، عظیم الشان، رفیع المکان، ولی نعمت، آیهٔ رحمت، قبلهٔ دنیا و دین، حضرت امیرالمومنین دام اقباله و زاد افضاله می رساند که عریضه نگار اگرچه بحسب صورت از دور ماندگان نظرگاهِ قربت است، اما از روئے معنیٰ وابستهٔ دامانِ آں دولت ابد مدت است۔ ہماں ثناگستری را که دراں حضرت شرفِ قبول یافته، و منظورِ نظر کیمیا اثر افتاده، ذریعهٔ روشناسی می انگارد۔ ہمانا بدعویٰ گاه استحقاقِ رافت و ارزشِ عطوفت دست آویزے شگرف بکف دارد۔ دریں ہنگام که خان صاحب مشفق و مہربان طالع یار خان و سعادت و اقبال نشان اصغر یار خان از اسلام آباد ٹونک بدیں دیار آمدند، مسودهٔ بزبانِ اردو بمن نمودند و فرمودند که خاطرِ آسمان پیوندِ والا خداوند بداں گرایش دارد که ایں عبارت از ہندی بفارسی نقل کرده شود تا دلنشیں نسخه سرانجام یافته باشد۔ ازاں جا که حق پرستی و حق گذاری آئین، و رعایتِ حقوقِ خداوندانِ نعمت از ضروریاتِ دین است، پیوسته در بندِ آں بودمے که اگر تقریبے دست بہم دہد خدمتے بجا آرم، تا نوازش و بخشش آں حضرت را باندازهٔ طاقتِ خویشتن تلافی کرده باشم۔ چوں از میامنِ حسنِ اتفاق ایں خجسته تقریب پدید آمد، به سرانجامِ کار و آرایشِ گفتار ہمت گماشتم و دعا و ثنائے که مکنونِ ضمیر بود درضمنِ آں نگارش به تقدیم رساندم۔ ہرچند متاعِ اندک است و ہدیه محقر، لیکن چوں می شنوم که خلیفه از اعرابی آبِ شور به ارمغاں پذیرفت، و سلیماں پائے ملخ از مور، دل را به نویدِ قبول شاد میکنم۔ آفریدگار زبانِ مرا از گزافت نگه دارد، و از حق امیدوارم که جز حق در ضمیرِ من نگذرد۔ حق ایں است که ہم به استماعِ محامدے که از مشفق طالع یار خاں خصوصاً و از دیگراں عموماً می شنوم و ہم بمشاہدهٔ التفاتے که درباره من بظہور آمده است، حیف می خورم که در عہدِ فرمانروائی لارڈ الن برا بہادر سوادِ شہرِ دہلی مخیمِ سرادقِ جاه و جلال شد و ایں سوخته اختر توفیقِ قدمبوس نیافت۔ اکنوں برآں سرم که اگر مرگ امان دہد و تاب و طاقت ہمرہی کند ازیں شہر به نیتِ ہجرت نقل کرده مشتِ استخوانِ خود را بداں درگاه که کعبهٔ آمالِ درویشاں بے دستگاه است رسانم و بقیهٔ عمر در خدمتِ حضرت امیرالمومنین بسر برم۔

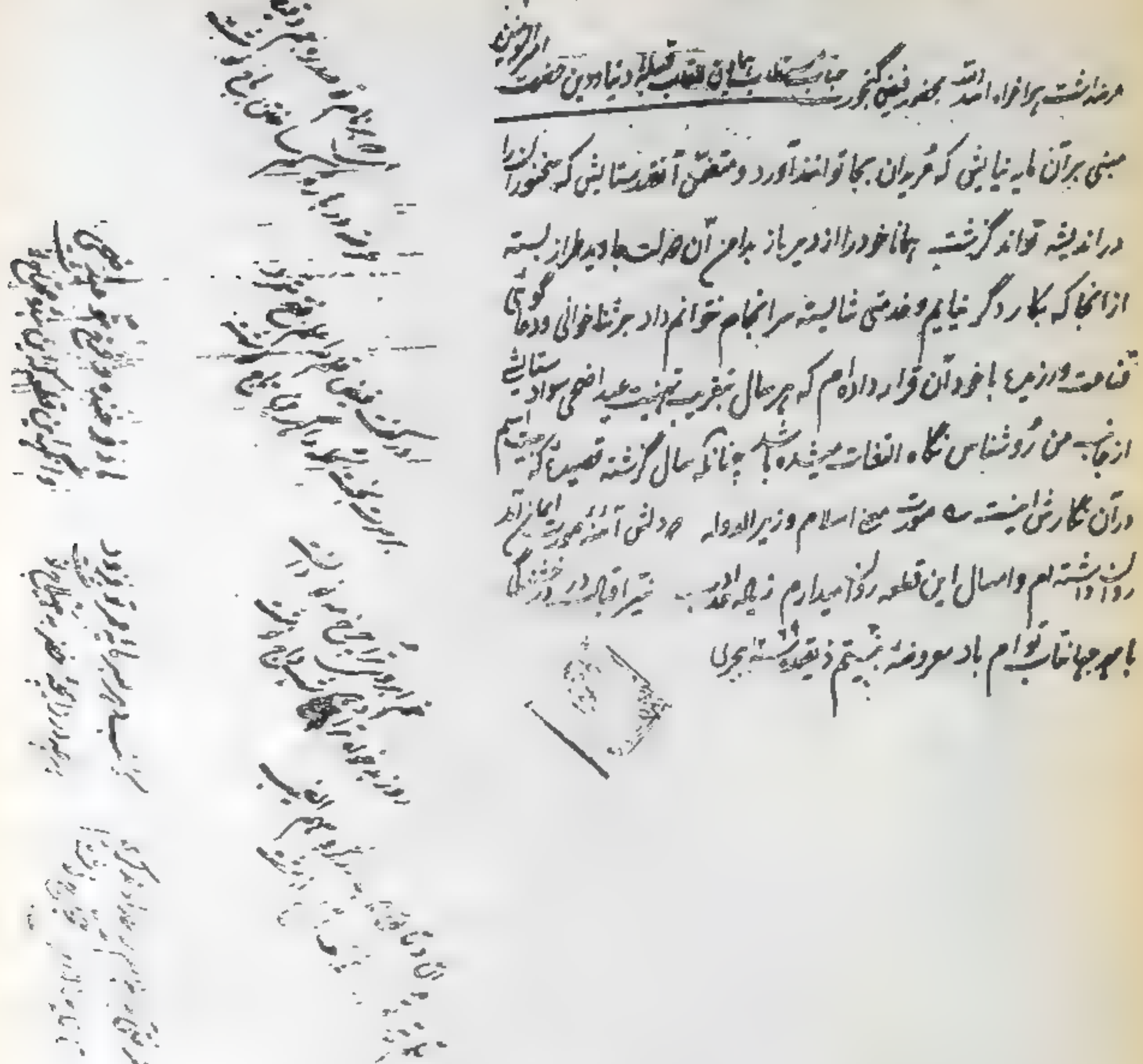
نیرِ دولت و اقبال سرچشمهٔ فروغِ جاودانی باد۔

عرضداشت اسدالله، معروضه چہارم ذی الحجه ۱۲۶۴ ہجری

مہر

الله
محمد
اسد خاں

غالب کے فارسی خط کا عکس (۲)



(۲)

عرضداشت ہواخواہ اسداللہ بحضور فیض گنجور جناب مستطاب ہمایوں القاب، قبلۂ دنیا و دین حضرت امیر المومنین دام اقبالہٗ

مبنی براں مایۂ نیایش کہ مریدان بجا توانند آورد و متضمن آں قدر ستایش کہ سخنوراں را در اندیشہ تواند گذشت ہمانا خود را از دیر باز بدامن آں دولتِ جاوید طراز بستہ، ازاں جا کہ بکارِ دگر نیایم و خدمتے شائستہ سرانجام توانم داد، بر ثنا خوانی و دعا گوئی قناعت ورزیدہ باخود آں قرارداده ام کہ ہر سال بتقریب تہنیت عید اضحیٰ سوادِ ستایشے از جانبِ من روشناس نگاہ التفات می شدہ باشد چنانکہ سالِ گذشتہ قصیدۂ کہ بیتِ اسم دراں نگارش اینست:

صورتِ معنی اسلام وزیر الدولہ　　　کہ دلش آئینۂ صورتِ ایماں آمد

رواں داشتہ ام، و امسال ایں قطعہ رواں می دارم۔ زیادہ حد ادب، نیر اقبال در درخشندگی با مہر جہانتاب توام باد۔

معروضہ بیستم ذیقعدہ ۱۲۶۹ ہجری

مہر

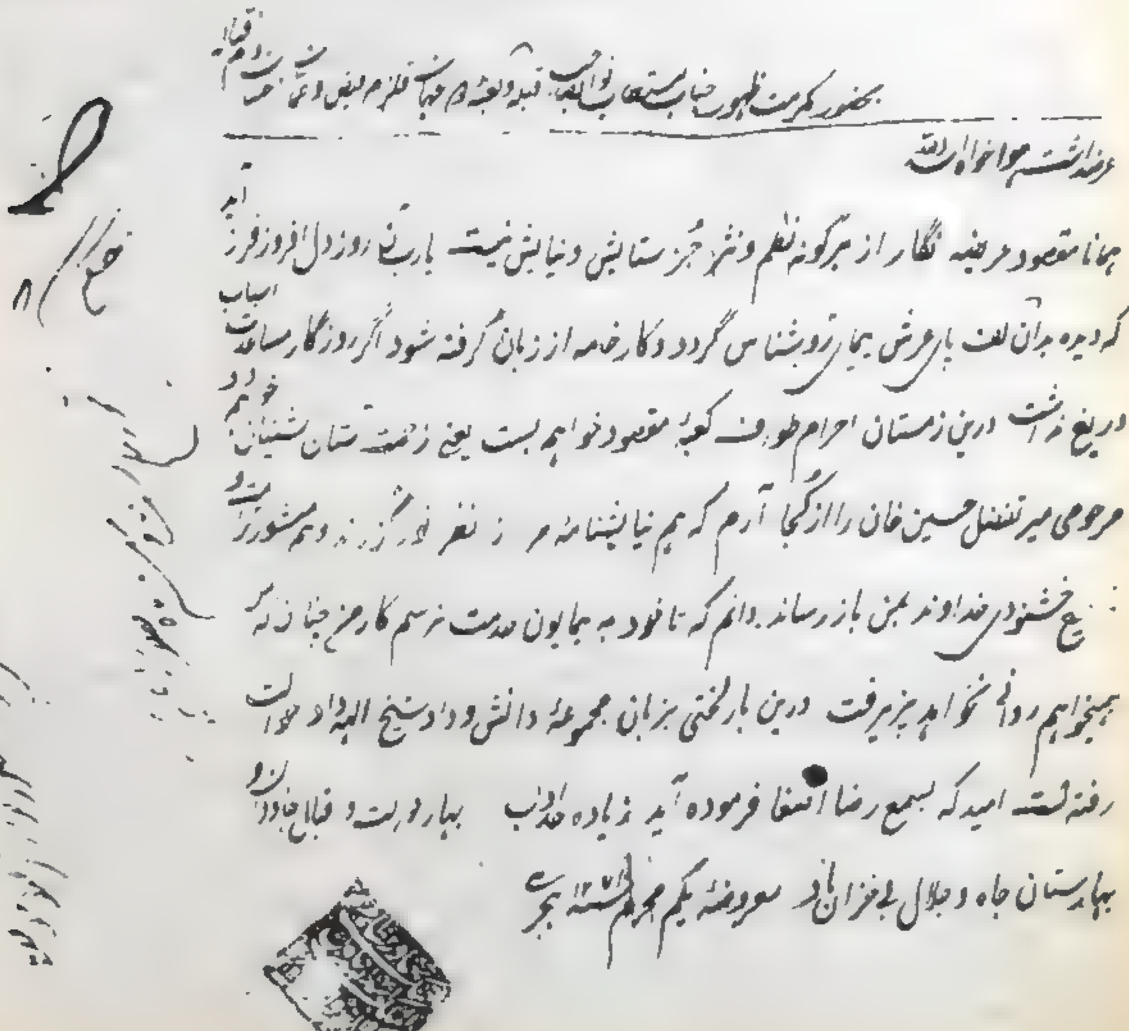
نجم الدولہ دبیر الملک
اسد اللہ خاں بہادر
نظام جنگ

(۳) قطعہ تہنیت:

اے کہ بر نامِ تو صدرہ جم و قیصر صد بار — عرضہ در بارۂ کم ساختنِ باج نوشت
در کفِ فیض قلم را عَلَمِ فتح شمرد — بر سرِ بخت انگہ را گہرین تاج نوشت
خمِ ابروے ترا چرخ مہِ نو دانست — روزِ بدخواہِ ترا دہر شبِ داج نوشت
آں دقائق کہ بود کہ در گروِ سہم الغیب — قلمِ تیرِ تو بر صفحۂ آماج نوشت
تو ز فتح و بنامِ تو خداوندِ کریم — رقمِ قافلہ سالاریِ حجاج نوشت
کاتبِ دہر بسرمایۂ عمرِ تو فزود — ہر چہ در زائچۂ خضر بہ بیاج نوشت

بادِ فرخندہ و فرخ بتو عیدِ اضحیٰ
وانکہ ایں قطعہ کہ ایں بندۂ محتاج نوشت

غالب کے فارسی خط کا عکس (۳)


عرضداشت ہواخواہ اسد اللہ

(۴)

بحضور بکرمت ظہور جناب مستطاب نواب صاحب قبلہ و کعبۂ دوجہان قلزم فیض و عمانِ احسان دام اقبالہٗ
عرضداشت ہواخواہ اسد اللہ۔

ہمانا مقصود عریضہ نگار از ہر گونہ نظم و نثر جز ستائش و نیایش نیست، یارب آں روزِ دل افروز فراز آید کہ دیدہ بداں کف پائے عرش بیمائے روشناس گردد و کار خامہ از زبان گرفتہ اگر روزگار مساعدت اسباب کز دریغ نہ داشت، دریں زمستاں احرامِ طوافِ کعبۂ مقصود خواہم بست، یعنی زحمتِ آستاں نشیناں خواہم داد، مرحومی میر تفضل حسین خاں را از کجا آرم کہ ہم نیایش نامۂ مرا از نظر انور گذراند و ہم منشور کرامت و توقیعِ خوشنودیِ خداوندیمن باز رساند۔ دانم کہ تا خود بہ ہمایوں خدمت نرسم، کارِ من چنانکہ من ہمی خواہم روائی نخواہد پزیرفت۔ دریں بار نخستے بزبان مجموعۂ دانش و داد شیخ الہ داد حوالت رفتہ است۔ امید کہ بسمعِ رضا اصغا فرمودہ آید۔ زیادہ حدِّ ادب۔ بہار دولت و اقبال جاوداں و بہارستانِ جاہ و جلال بے خزاں باد معروضۂ یکم محرم ۱۲۷۱ ہجری

مہر

نجم الدولہ دبیر الملک
اسد اللہ خاں بہادر
نظام جنگ

۴ حکم شد کہ
از شیخ الہ داد حال عارض دریافتہ بحضور گذارش نمود شود
تحریر بتاریخ بست و ششم ماہ صفر ۱۲۷۱ھ

(۳) اردو ترجمہ:

۳:۱ اللہ کی حمد اور رسول پر درود کے بعد

نواب قدسی القاب عظیم الشان رفیع المکان، ولی نعمت، آیۂ رحمت قبلۂ دنیا و دین حضرت امیر المومنین دام اقبالہٗ و زاد افضالہٗ کی (خوشیوں بھری بزم کے باریابوں کی) خدمت میں عرض ہے کہ عریضہ نگار اگرچہ بظاہر نظر گاہِ قربت سے دور پڑے ہوؤں میں سے ہے، لیکن بباطن دامانِ دولت ابد مدت سے وابستہ ہے، اور اس قصیدہ نگاری کو جو آج حضرت کی نظر سے گزرتی ہے اور شرف قبول پاتی ہے، اپنے تعارف کا ذریعہ اور آپ کی رافت و رحمت کے استحقاق کی دستاویز سمجھتا ہے۔

اِس زمانے میں جب خان صاحب مشفق و مہربان طالع یار خاں اور سعادت و اقبال نشان اصغر خاں، اسلام آباد ٹونک سے اس شہر میں آئے تو انھوں نے اردو زبان میں ایک مسودہ مجھے دکھایا اور فرمایا کہ خداوند کی خاطرِ آسمان پیوند اس طرف مائل ہے کہ اس عبارت کو ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا جائے تاکہ دلنشیں عبارت میں ایک نسخہ تیار ہو جائے۔

چونکہ حق پرستی و حق گزاری میرا آئین، اور خداوندِ نعمت کے حقوق کی رعایت من جملۂ ضروریاتِ دین ہے، مسلسل اس فکر میں تھا کہ کوئی تقریب ہاتھ آئے تو کچھ خدمت انجام دوں، تاکہ آں حضرت کی نوازش و بخشش کی اپنے مقدور بھر کچھ تلافی کر سکوں۔ چونکہ حسن اتفاق سے یہ تقریب نکل آئی ہے، میں نے عبارت آرائی کر کے اسے انجام دینے کی ہمت کرلی اور جو دعا و ثنا ضمیر میں پوشیدہ تھی اُسے بھی اس نگارش کے ضمن میں بطورِ مقدمہ لکھ دیا۔ ہرچند یہ ایک متاعِ قلیل اور ہدیۂ حقیر ہے، مگر جب سنتا ہوں کہ خلیفہ نے ایک بدو سے کھاری پانی کا ہدیہ، اور سلیمان نے چیونٹی سے ٹڈی کی ٹانگ کا تحفہ قبول کیا تھا تو میں بھی اپنے دل کو نویدِ قبول سے شاد کر لیتا ہوں۔ خدا میری زبان کو ڈینگ مارنے سے بچائے اور حق سے امیدوار ہوں کہ سوائے حق کے میرے ضمیر میں کچھ نہ گذرے۔ حق یہ ہے کہ آپ کے محامد مشفقی طالع یار خاں سے خصوصاً اور دوسروں سے عموماً سنتا ہوں، اور میرے حال پر آپ نے جو التفات فرمایا ہے اُس کے مشاہدے کے بعد یہ افسوس

ہوتا ہے کہ لارڈ ڈالہن بہادر کی فرمانروائی کے زمانے میں جب شہر دہلی آپ کے جاہ و جلال کا خیمہ گاہ بنا تھا تو اس سوختہ اختر کو قدمبوسی کی توفیق نہ ہوئی۔ اب سوچتا ہوں کہ اگر موت نے مہلت دی اور تاب و طاقت نے ساتھ دیا تو اس شہر سے ہجرت کی نیت سے نکلوں اور اپنی مٹھی بھر ہڈیوں کو اُس درگاہ میں جو بے دستگاہ درویشوں کی امیدوں کا کعبہ ہے، پہنچا دوں اور باقی عمر حضرت المومنین کی خدمت میں بسر کروں۔ خدا کرے نیرِ دولت و اقبال سرچشمہ فروغِ جاودانی رہے۔

عرضداشت اسداللہ، معروضہ چارم ذی الحجہ ۱۲۶۴ ہجری۔

مُہر

۲:۳ عرضداشت ہواخواہ اسداللہ، بحضور فیض گنجور جناب مستطاب ہمایوں القاب قبلۂ دنیا و دین حضرت امیرالمومنین دام اقبالہٗ

اُس نیازمندی کی بنا پر جو مرید بجا لا سکتے ہیں، اور اُس ستایش کے ضمن میں جو شاعروں کے اندیشے میں گذر سکتی ہے، میں نے خود کو ایک مدت سے اس دولتِ جاوید طراز کے دامن سے وابستہ کر رکھا ہے۔ چونکہ کسی اور مصرف کا نہیں ہوں اور کوئی ڈھنگ کی خدمت انجام نہیں دے سکتا، اس لئے ثناخوانی اور دعاگوئی پر قناعت کرکے، اپنے اوپر یہ لازم کر لیا ہے کہ ہر سال عیدالضحیٰ کے موقع پر مبارکباد کی ایک تحریر اس روشناسِ نگاہِ التفات کی جانب سے ہوا کرے، جیسا کہ سالِ گزشتہ ایک قصیدہ جس کی بیتِ اسم یہ ہے:

صورتِ معنیٔ اسلام وزیرالدولہ   کہ دلش آئینہ صورتِ ایماں آمد

بھیجا ہے، اور اس سال یہ قطعہ روانہ کر رہا ہوں۔ زیادہ حدِ ادب، الٰہی نیرِ اقبال مہرِ جہانتاب کی طرح چمکتا رہے۔

مُہر

معروضہ بستم ذی قعدہ ۱۲۶۹ ہجری

۳:۳ تہنیت کے اشعار کا ترجمہ:

۱۔ اے وہ کہ جمشید و کسریٰ نے تجھے سو بار سو سو طرح سے اپنی درخواست بھیجی ہے کہ اُن کے باج کی رقم کچھ کم کر دی جائے۔
۲۔ فیض تیرے ہاتھ میں قلم کو فتح کا عَلَم سمجھتا ہے، اور بخت تیری کلاہ کو گوہرِ تاج لکھتا ہے۔
۳۔ آسمان تیرے خمِ ابرو کو مہِ نو جانتا ہے، اور زمانہ تیرے بدخواہ کے دن کو بھی سیاہ رات لکھتا ہے۔
۴۔ وہ اسرار (قضا)، جو غیبی تیر میں پوشیدہ ہوتے ہیں انھیں تیرے قلمِ تیر نے چاندماری کے کھلے صفحے پر لکھ رکھا ہے
۵۔ اگرچہ تو گیا نہیں، مگر خداوند کریم نے قافلۂ حج کی امارت تیرے نام میں لکھ دی۔
۶۔ زمانے کے کاتب نے وہ سب تیرے سرمایہ عمر میں جوڑ دیا ہے جو خضر کے جنم پترے میں اُن کی عمر کے بارے میں لکھا تھا۔
۷۔ تجھے عیدِ سعیدِ قرباں مبارک ہو اور یہ قطعۂ تہنیت بھی، جو اس بندۂ محتاج نے لکھا ہے۔

۴:۳ عرضداشت ہواخواہ اسداللہ، بحضور مکرمت ظہور جناب مستطاب نواب صاحب قبلہ و کعبہ دو جہاں قلزم فیض عمّان احسان دام اقبالہٗ

چونکہ یہ عریضہ نگار ہر طرح کی نظم و نثر سے سوائے تعریف اور اظہارِ نیازمندی کے کچھ اور غرض نہیں رکھتا ہے خدا کرے وہ دل افروز دن بھی نکلے جب یہ آنکھیں اُن عرش پیما قدموں سے روشناس ہوں اور قلم کا کام زبان سے لیا جائے۔ اگر زمانے نے مساعدت کے اسباب سے دریغ نہ کیا تو اب کی جاڑوں میں اُس کعبۂ مقصود کے طواف کا احرام باندھوں گا یعنی آپ کے آستانے پر پہنچوں گا۔

مرحومی میر تفضل حسین خاں کو کہاں سے لاؤں، جو میرے نیازنامہ کو نظرِ انور سے گذاریں اور خداوند کا فرمان و پروانہ خوشنودی میرے پاس بھیجیں۔ جانتا ہوں کہ جب تک خود خدمتِ مبارک میں نہ پہنچوں گا میرا کام حسبِ دل خواہ نہ ہوگا۔ اس بار مجموعۂ دانش و داد شیخ الہ داد

سے کچھ زبانی عرض کیا ہے امید ہے کہ آپ شرف سماعت بخشیں گے۔ زیادہ حدِ ادب الٰہی بہارِ دولت و اقبال جاوداں، اور بہارستان جاہ و جلال بے خزاں رہے۔

مُہر

معروضہ یکم محرم ۱۲۷۱ ہجری

۴۔ حواشی:

۱۔ نواب وزیرالدولہ کا پورا خطاب "وزیرالدولہ امیرالملک نواب وزیر محمد خاں بہادر نصرت جنگ" ہے اور اکبر شاہ ثانی نے جس فرمان کے رو سے یہ خطاب مرحمت کیا تھا وہ اب ادارۂ تحقیقاتِ عربی و فارسی (ٹونک) میں محفوظ ہے۔

۲۔ میر تفضل حسین خاں: مرزا غالب کے گہرے دوست تھے اُن کا مولد خیرآباد تھا۔ دہلی میں تعلیم حاصل کی، اور ٹونک جاکر نواب وزیرالدولہ کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ اُنھوں نے ریاست کی طرف سے سفیر بناکر جنرل اوکٹرلونی کے پاس اجمیر بھیج دیا تھا۔ ان کے بھائی ارشاد حسین خاں بھی ٹونک میں وکیل تھے۔ میر تفضل حسین خاں کے توسط سے غالب نے ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں ایک قصیدہ، عرفی شیرازی کی زمین میں لکھ کر نواب وزیرالدولہ کی خدمت میں بھجوایا تھا اُس پر نواب صاحب کی طرف سے صلہ ملنے میں دیر ہوئی اور غالب اپنا فارسی دیوان مطبع دارالسلام سے چھپوانے والے تھے، اُنھوں نے میر تفضل حسین خاں کو لکھا:

"نواب ٹونک نے مجھ کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور میری مدح گوئی کو نگاہ میں نہیں لائے اس لیے میں نے طے کر لیا ہے کہ میں بھی بے حوصلگی سے کام لوں اور اس قصیدہ:

اے ذاتِ تو جامع صفاتِ عدل و کرم را — وے بر شرفِ ذاتِ تو اجماع امم را

کو قلمزد کر دوں، دیوان میں درج نہ کروں۔ نواب نے میرا نام اپنے دربار میں پسند نہیں کیا، میں بھی نواب کا نام اپنے دیوان درج کرنا پسند نہیں کروں گا۔"

بعض حضرات کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ تفضل حسین خاں کی زندگی میں غالب کو ریاست ٹونک سے صلہ نہیں ملا۔ انھیں ۴ار صفر ۱۲۶۸ھ (۹ر دسمبر ۱۸۵۱ء) کو پانسو روپے (۵۰۰) وصول ہوئے تھے۔

میر تفضل حسین خاں کا انتقال ۱۲۷۰ھ (۴-۱۸۵۳ء) میں ہوا۔ غالب نے ہرگوپال تفتہ کے نام اپنے خط میں اس حادثے پر رنج و غم کا اظہار کیا ہے (۲۲ر فروری ۱۸۵۴ء) اور اُن کا قطعۂ تاریخِ وفات بھی لکھا تھا جو کلیاتِ نظم فارسی میں موجود ہے۔

احمد حسین خاں اِن کے صاحبزادے بھی سفیر ریاست مقرر ہو گئے تھے مشہور شاعر افتخار حسین مضطر خیرآبادی ان کے بیٹے، اور جاں نثار اختر پوتے تھے تفضل حسین خاں کے نام غالب کے خطوط "سبدِ باغِ دو در" (مرتبہ وزیر الحسن عابدی) میں شامل ہیں جن کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے (تحریک دہلی اپریل ۱۹۷۴ء)۔ مزید تفصیلات کے لیے رجوع کیجیے:

عبدالرؤف عروج: بزمِ غالب ۱۱۷-۱۱۹

منظور الحسن برکاتی: "غالب کی ایک نادر فیصلہ کن تحریر" "آج کل" (دہلی) جون ۵۵ء

" " " غالب کا ایک باکمال دوست۔ میر تفضل حسین خاں "شاعر" (بمبئی) فروری۔ مارچ ۱۹۶۹ء

وزیر الحسن عابدی: (مرتب) سبدِ باغِ دو در۔ لاہور

۳۔ طالع یار خاں اور اصغر یار خاں: ان کے والد کا نام "بزمِ غالب" (ص ۲۵۳-۲۵۴) میں نواب محمد یوسف خاں دیا گیا ہے مجھے اُن کے اخلاف سے جو شجرہ ملا ہے اُس کی رو سے اِن کے والد نواب محمد سعید خاں تھے۔ ممکن ہے نواب محمد یوسف خاں عرف کلو خاں

(جن کے نام سے ایک گلی "حویلی کلو خواص" آج بھی بازار چتلی قبر سے سوئی والوں کی طرف جاتے ہوئے داہنے ہاتھ پر موجود ہے) نواب محمد سعید خاں کے والد ہوں۔ "بزمِ غالب" میں انھیں حمید الدین ناگوری اور شیخ عطاء اللہ بخاری کی اولاد بتایا گیا ہے۔ غالباً انھیں حمید الدین ناگوری کا ایک قلمی رسالہ در فنِ کیمیا سازی ٹونک کے کتب خانے میں ملتا ہے اور یہ بظاہر حمید الدین ناگوریؒ (خلیفہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری) اور قاضی حمید الدین ناگوری سہروردیؒ (متوفی رمضان ۶۴۳ھ) سے مختلف شخصیت معلوم ہوتے ہیں۔ اول الذکر شیخ فاروقی اور ثانی الذکر شیخ صدیقی تھے۔

طالع یار خاں دہلی میں پیدا ہوئے، ریاست ٹونک میں ملازم ہوئے تو وہاں رہنے کے لئے ایک حویلی اور وزیر پورہ کا علاقہ جاگیر میں دیا گیا تھا جس کے کاغذات بیکانیر آرکائیوز میں موجود ہیں۔ مولانا محمد عمران خاں صاحب ٹونکی کی تحقیق کے مطابق یہ ۱۸۳۴ء کے بعد ٹونک گئے ہوں گے لیکن اگر یہ ۱۸۲۳ء میں نواب وزیر محمد خاں کو فنونِ سپہگری سکھانے پر مامور ہوئے تھے تو اُس وقت نواب صاحب دہلی میں ہوں گے۔ انھوں نے فنِ بانک پر ایک رسالہ اردو زبان میں لکھا تھا اور اُسی کو نواب وزیر الدولہ کی فرمائش پر فارسی میں مرزا غالب سے ترجمہ کرانا چاہتے تھے۔ غالب نے یہ ترجمہ مکمل کر دیا تھا مگر وہ ابھی تک دستیاب نہیں ہے۔

طالع یار خاں کے دو بیٹے صفدر یار خاں اور اصغر یار خاں اور چار بیٹیاں تھیں۔ صفدر یار خاں کا نام بعض جگہ غلطی سے "سفندیار خاں" لکھا گیا ہے (مثلاً مولانا عمران خاں کا مضمون: "غالب کا ٹونک سے تعلق"۔ "تحریک" دہلی ستمبر ۱۹۷۴ء)

غالب کے ایک خط سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صفدر یار خاں اور اصغر یار خاں ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے ٹونک سے رخصت لے کر دہلی آئے تھے کہ یہاں ہنگامہ شروع ہو گیا اور یہ واپس نہیں جا سکے۔ فتح دہلی کے بعد دار و گیر شروع ہوئی تو دونوں بے گناہ پکڑے گئے اور پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔

"اُن (طالع یار خاں) کے دو بیٹے ٹونک سے رخصت لے کر آئے تھے۔ غدر کے سبب نہیں جا سکے۔ یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں۔ زندہ ہیں، پر یقین ہے کہ مردہ سے بدتر ہوں گے۔" (عودِ ہندی۔ بنام انور الدولہ شفق)

لیکن غالب نے مصلحتاً حقیقت کو چھپایا ہے۔ بغاوت کا اعلان ہونے پر یہ دونوں جنگِ آزادی میں حصہ لینے کو دہلی آئے تھے اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ اصغر یار خاں نے ایک انگریز کو گولی مار کر ہلاک بھی کر دیا تھا۔ بعد فتح دہلی دونوں بھائی فرار ہو کر ٹونک جا رہے تھے مگر الور میں گرفتار کر لئے گئے اور دہلی لا کر انھیں پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ ابو الفیض عثمانی "تاریخ ۱۸۵۷ء کی ترتیب میں خطوطِ غالب کی اہمیت"۔ "بشارت" (جے پور) یکم و ۵ اگست ۱۹۷۲ء)۔ نواب وزیر الدولہ کے انتقال (۱۸۶۴ء) کے بعد طالع یار خاں بھوپال چلے گئے تھے اور غالباً وہیں انتقال ہوا۔

صفدر یار خاں کے تین بیٹے تھے، سکندر یار خاں، افضل یار خاں اور محمد یار خاں۔ ان میں افضل یار خاں سے نسل چلی جن کے دو بیٹے احمد یار خاں اور سلطان یار خاں اور تین بیٹیاں (محمدی، محمودہ، مقصودہ) ہوئیں۔ افضل یار خاں کی شادی سید شیر زماں خاں کی صاحبزادی ملکہ بیگم سے ہوئی تھی۔ شیر زماں خاں کے دو بیٹے سید احمد اور سید محمد تھے۔ بیگم عابدہ احمد (ممبر پارلیمنٹ و چیرمین غالب انسٹیٹیوٹ نئی دہلی) مؤخر الذکر کی نواسی ہیں۔ ان کی رشتہ داریاں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خاندان میں بھی تھیں۔ ملکہ بیگم حضرت عبدالعزیز محدث دہلوی کو "ماموں" کہا کرتی تھیں۔

نواب طالع یار خاں کے نواسوں میں دہلی کالج کے سابق پرنسپل مرزا محمود بیگ مرحوم اور مولانا ابو الکلام آزاد کے پرائیوٹ سکریٹری ایم۔ اے۔ مسعود بھی تھے۔ شجرۂ خاندان جو مجھے نواب طالع یار خاں کے پر پوتے سلطان یار خاں (ایڈوکیٹ سپریم کورٹ آف انڈیا) سے ملا ہے یوں ہے:

نواب سعید خاں

نواب طالع یار خاں (متوفی ۱۸۶۴ء)

صفدر یار خاں (۱۸۵۸ء) — اصغر یار خاں (۱۸۵۸ء) — دختر ۴

سکندر یار خاں (لاولد) — افضل یار خاں — محمد یار خاں (مجرد)

احمد یار خاں — سلطان یار خاں — محمدی — محمودہ — مقصودہ

۴- لارڈ ایلن برا: یہ ۱۸۴۲ء میں لارڈ آکلینڈ کی جگہ گورنر جنرل ہو کر آئے تھے۔ اِن کی مدح میں غالب نے (۴۰) اشعار کا ایک قصیدہ کہہ کر سید الاخبار دہلی میں چھپوایا تھا جس کا مطلع ہے:

اے برتر از سپہرِ بلند آستانِ تو — تو پاسبانِ مُلک و مَلک پاسبانِ تو

ایلن برا نے سرکار انگریزی سے غالب کو خلعتِ ہفت پارچہ بھی دلایا تھا اور اُن کے توسط سے غالب نے ایک (۷۷) اشعار کا قصیدہ ملکہ وکٹوریا کی مدح میں لکھ کر انگلستان بھی بھیجا تھا، جو ملکہ کے سامنے پیش بھی ہو گیا تھا۔ اُن کا گورنر جنرلی کا دور بہت مختصر رہا۔ ۱۸۴۴ء میں یہ انگلستان واپس ہو گئے تھے۔

۵- شیخ الہ داد کے بارے میں سر دست کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ بظاہر یہ نواب وزیر الدولہ کے متوسلین میں سے تھے۔ خط نمبر ۳ پر صاد کا نشان نواب وزیر الدولہ کے قلم سے ہے، اور نیچے لکھا ہے "حکم شد کہ از شیخ الہ داد حالِ عارض دریافتہ، بہ حضور گذارش نمودہ شود۔ فقط تحریر بتاریخ بست و ششم ماہ صفر ۱۲۷۰ھ"

مراجع: ریاست ٹونک سے مرزا غالب کے تعلقات کے سلسلے میں مندرجہ ذیل مضامین ملاحظہ ہوں:

۱۔ سید جمیل الدین: "مہر نیم روز کا ایک نسخہ"۔ "نوائے ادب" (بمبئی) جولائی ۱۹۵۱ء - جنوری ۱۹۵۲ء
۲- جوہر ٹونکی: غالب اور ٹونک۔ "نگار" (لکھنؤ) ستمبر ۱۹۵۱ء
۳- منظور الحسن برکاتی: یادِ غالب۔ "آج کل" (دہلی) فروری ۱۹۵۲ء
۴- منظور الحسن برکاتی: "غالب کی ایک نادر فیصلہ کن تحریر"۔ آج کل - جون ۱۹۵۵ء
۵- سید جمیل الدین: "دستنبو کا ایک خاص نسخہ"۔ نوائے ادب (بمبئی) اکتوبر ۱۹۵۶ء
۶- سید قدرت نقوی: غالب اور ٹونک۔ ماہ نو (کراچی) فروری ۱۹۵۸ء
۷- منظور الحسن برکاتی: غالب کے دوست۔ آج کل۔ فروری ۱۹۵۸ء
۸- منظور الحسن برکاتی: غالب اور ٹونک۔ "غالب نما" (جے پور) ۱۹۷۰ء
۹- محمد عمران خاں: "غالب کا ٹونک سے تعلق"۔ "تحریک" (دہلی) ستمبر ۱۹۷۴ء
۱۰- ابو الفیض عثمانی: "راجستھان سے مرزا غالب کا تعلق"۔ "نخلستان" اکتوبر ۱۹۷۵ء
۱۱- منظور الحسن برکاتی: "غالب کا ایک باکمال دوست"۔ "شاعر" (بمبئی) فروری، مارچ ۱۹۶۹ء
۱۲- ابو الفیض عثمانی: تاریخ ۱۸۵۷ء کی ترتیب میں خطوط غالب کی اہمیت۔ اخبار "بشارت" (جے پور) یکم و ۱۵ اگست ۱۹۷۲ء
۱۳- منظور الحسن برکاتی: "ٹونک میں غالب کے احباب"۔ "تحریک" (دہلی) اپریل ۱۹۷۳ء

غالبیات کی دوسری صدی

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

(۱)

۱۹۶۹ء میں غالبؔ کی پہلی صد سالہ برسی اہتمام سے منائی گئی ــــــ ۱۹۷۰ء سے گویا مطالعۂ غالبؔ کی دوسری صدی کا آغاز ہوتا ہے۔ زیرِ نظر معروضات کی حیثیت ایک طرح سے مطالعۂ غالبؔ کی دوسری صدی کی پہلی دہائی کے ایک جائزے کی سی ہو جاتی ہے۔ میری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ غالبؔ کی صد سالہ برسی (۱۹۶۹ء) کے بعد نہ "غالبیات" کو فراموش کیا گیا ہے، نہ یہ موضوع بعض اہلِ علم کی رائے کے برعکس از کار رفتہ ہوا ہے، بلکہ اس عرصے میں بہت سی ایسی اہم اور مؤثر تصنیفات سامنے آئی ہیں جنہیں ان بارہ تیرہ برس ہی میں نہیں اگلے پچھلے برسوں کے حوالے سے بھی غالبیات میں قابلِ قدر اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۲ء تک کا کوئی برس ایسا نہیں گزرا کہ غالب کے بارے میں کوئی نہ کوئی قابلِ لحاظ کتاب نہ چھپی ہو، مثلاً میں یہاں سال بہ سال صرف چار چار کتابوں کے حوالے دیتا ہوں:

۱۹۷۰ء

جاگیرِ غالب، پرتھوی چندر، دہلی، صفحات ۳۱۱
گلِ رعنا (غالب) مرتبہ و متعارفہ: مالک رام، دہلی، ص ۲۰۶
غالب کی شخصیت اور شاعری، رشید احمد صدیقی، دہلی، ص ۴۵+۹۶
نقشِ غالب، اسلوب احمد انصاری، دہلی، ص ۱۴۲

۱۹۷۱ء

تفسیرِ غالبؔ، ڈاکٹر گیان چند، سری نگر، ص ۵۷۶
غالبؔ کون؟ سلیم احمد، کراچی، ص ۱۶۰
غالبؔ اور آہنگِ غالبؔ، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، دہلی، ص ۴۴۷
جوہرِ آئینہ ـ جائزہ کلامِ غالبؔ، طالب کاشمیری، دہلی، ص ۳۴۴

۱۹۷۲ء

غالبؔ شناسی نمبر ۲، ڈاکٹر ظ. انصاری، بمبئی، ص ۲۱۹+۱۵۰
غالبؔ دی پوئٹ اینڈ ہز ایج، مرتبہ: رالف رسل، کیمبرج، ص ۱۳۶
غالبؔ ببلیوگرافی، ڈاکٹر محمد انصار اللہ، علی گڑھ، ص ۱۲+۹۶+۲۲+۲۶۸+۱۸
غالبؔ کی تہذیبی شخصیت، جیلانی کامران، راولپنڈی، ص ۶+۷۰

۱۹۷۳ء

عرفانِ غالب، مرتبہ: آلِ احمد سرور، علی گڑھ، ص ۳۰۰
غالبیات کے چند مباحث، ڈاکٹر ابو محمد سحر، لکھنؤ، ص ۲۱۶
تعبیرِ غالب، ڈاکٹر سید نیر مسعود رضوی، لکھنؤ، ص ۲۰۸
غالب اور ان کے معترضین، سید لطیف الرحمٰن، کلکتہ، ص ۴۰۵

۱۹۷۴ء

غالبؔ شخص اور شاعر، مجنوں گورکھپوری، کراچی، ص ۱۲۶
غالبؔ اور شاہانِ تیموریہ، ڈاکٹر خلیق انجم، دہلی، ص ۱۶۰
ڈس ٹریکٹنگ ورڈز، مترجم: ڈاکٹر محمد ذاکر، دہلی، ص ۱۳+۸۲
غالب اور انقلاب ستاون، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور، ص ۲۱۶

۱۹۷۵ء

غالبؔ ـ ابتدائی دور، ڈاکٹر خورشید الاسلام، دہلی، ص ۲۸۴
گلِ رعنا (غالبؔ) مرتبہ و متعارفہ: سید قدرت نقوی، کراچی، ص ۱۲+۳۵۵+۱۲۰
غالبؔ اور سرور، ایم حبیب خاں، دہلی، ص ۱۳۲
مرادِ غالبؔ، منظور احسن عباسی، لاہور، ص ۴۳۲

۱۹۷۶ء

بیاضِ غالب۔ تحقیقی جائزہ، کمال احمد صدیقی، سری نگر، ص ۴۸۸

رموزِ غالب، ڈاکٹر گیان چند، دہلی، ص ۳۴۴

ذکرِ غالب، مالک رام، دہلی، ص ۲۷۹

غالب اور انقلاب ستاون، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور، ص ۲۸۸

۱۹۷۷ء

اردو غزلز آف غالب، مترجم: ڈاکٹر یوسف حسین خاں، دہلی، ص ۳۲۶+۱۱+۴

فسانۂ غالب، مالک رام، دہلی، ص ۱۹۱

غالب مدح و قدح کی روشنی میں (۱) صباح الدین عبدالرحمٰن، اعظم گڑھ، ص ۴۴۲

غالب اور بنگال، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، کلکتہ، ص ۱۶۸

۱۹۷۸ء

غالب کی شخصیت اور شاعری، رشید احمد صدیقی، دہلی، ص ۱۰۴

اقبال اور غالب۔ تخلیقی عمل کا مطالعہ، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، سرینگر، ص ۲۳۵

متعلقاتِ غالب، کالیداس گپتا رضا، بمبئی، ص ۱۷۸

دیوانِ غالب، مالک رام، لاہور، ص ۲۱۶

۱۹۷۹ء

غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، دہلی، ص ۲۰۵

غالب۔ تقلید اور اجتہاد، ڈاکٹر خورشید الاسلام، علی گڑھ، ص ۲۶۰

مطالعۂ خطوطِ غالب، عبدالقوی دسنوی، لکھنو، ص ۱۴۰

دیوانِ غالب، مالک رام، دہلی، ص ۲۱۶

۱۹۸۰ء

پرشین غزلز آف غالب، مترجم: ڈاکٹر یوسف حسین خاں، دہلی، ص ۱۹۲+۱۶۰

غالب کے معنوی اساتذہ، ظفر ادیب، دہلی، ص ۱۴

دیوانِ غالب، مرتبہ: مولانا حامد علی خاں (لاہور)

مقدمہ: ڈاکٹر نورالحسن نقوی، علی گڑھ، ص ۲۵۶

انتخابِ آتش و غالب، چکبست، مرتبہ: کالی داس گپتا رضا، بمبئی، ص ۱۹۶

۱۹۸۱ء

شرح غزلیاتِ غالب (فارسی) صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، لاہور، جلد اول ص ۱۲+۴۸۴

جلد دوم، ص ۶+۸۴۵

غالب اور صفیر بلگرامی، مشفق خواجہ، کراچی، ص ۲۰۸

خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ، کاظم علی خاں، لکھنؤ، ص ۲۱۲

تحقیقِ غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، کراچی، ص ۲۸۸

۱۹۸۲ء

دیوانِ غالب اردو، نسخۂ عرشی، نقشِ ثانی، امتیاز علی خاں عرشی،

دہلی، ص ۱۰۸+۱۰+۵۸۳

خطوطِ غالب۔ فنی تجزیہ، حامدہ مسعود، علی گڑھ، ص ۲۶۳

غالبیات۔ چند عنوانات، کالی داس گپتا رضا، بمبئی، ص ۲۲۴

غالب اور عصرِ غالب، ڈاکٹر محمد ایوب قادری، کراچی، ص ۲۵۶

۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۲ء تک کے بارہ تیرہ برسوں میں بسلسلۂ غالب، بہت کچھ لکھا گیا ہے اور برابر لکھا جا رہا ہے۔ میرے ذاتی ذخیرۂ غالبیات میں جسے کسی طرح بھی مکمل نہیں کہا جا سکتا، اس عرصے کی لکھی یا چھپی ہوئی سلسلۂ غالب کی کتابوں کی تعداد ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہے اخبارات و رسائل اور ریڈیو یا ٹی وی وغیرہ کی تحریروں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ یہ ساری چیزیں قدرِ اوّل کی نہ سہی لیکن یہ اتنا بڑا ذخیرہ اور سرمایہ ہے جسے یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔

(۲)

گزشتہ بارہ تیرہ برس کے اس ذخیرے میں تصانیفِ غالب کی اشاعتیں بھی ہیں، انتخاباتِ نظم و نثرِ غالب بھی، نگارشاتِ غالب کے تراجم بھی، کلامِ غالب کی تشریحات بھی، غالب کے اسلوبِ نثر کی پیروی کی ادّعائی کاوش بھی، غالب کی زمین میں نعت و غزلیات کے مجموعے بھی، غالب کے عہد اور ان کی زندگی پر مبنی ڈرامے اور رپورتاژ بھی، اشاریے اور کتابیاتِ غالب بھی۔

اِس عرصے میں غالب کی حیات اور فکر و فن پر متعدد نسبتاً اعلیٰ درجے کی تنقیدی اور تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں، بعض اہم تصنیفات کے

نئے ایڈیشن نکلے اور بعض معروف اور کچھ نسبتاً کم اہم رسائل و جرائد کے غالب نمبر بھی چھپے ـــــ اور غالبیات کی تسوید و طباعت کا یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ مختلف جامعات میں اعلیٰ تر علمی اسناد کے لیے غالب پر جو تحقیقی کام اس دوران میں ہوا، یا ہو رہا ہے، وہ اس پر مستزاد ہے۔

یہاں بالاختصار، موضوع وار، میرے لیے غالبیات کے اُس سرمائے کا احصار، و احاطہ کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں جو ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۲ء تک کے عرصے میں چھپا اور جو بالفعل میرے ذاتی کتاب خانے میں موجود اور محفوظ ہے۔

اِن دس بارہ برس کے درمیان غالب پر چھپی ہوئی ہر کتاب تک رسائی مقصود رہی بھی ہو، لیکن یہ ممکن نہیں تھی۔ اگرچہ اس ضمن میں اپنے بہت سے دیدہ و نادیدہ مہربانوں کے لطفِ کریمانہ کے لیے ممنون ہوں کہ اُنھوں نے مجھے استحقاق سے زیادہ نوازا اور غالبیات کی سوغات سے کبھی محروم نہیں رکھا، بایں ہمہ کچھ مطبوعات (بالخصوص بھارتی) یا اُن کے بارے میں معلومات، دستیاب نہیں ہو سکیں، مثلاً غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے سہ ماہی مجلہ "غالب نامہ" کے اولین شمارے (جنوری، اپریل ۷۹ء) کے صفحہ ۱۹۹ پر "غالب مصوّر" کا تذکرہ نظر سے گزرا کہ "غالب صدی کا یہ یادگار اور نظر نواز تحفہ اردو اور ہندی میں علاحدہ علاحدہ چھاپا گیا ہے[۱] ـــ" سات برس ہونے کو آئے، یہ مجموعہ مجھے میسر نہیں آیا۔

۱۸ر نومبر ۱۹۸۲ء کے ایک گرامی نامے میں ڈاکٹر مختار الدین احمد نے علی گڑھ سے تحریر فرمایا کہ:

"غالب مصوّر" میں نے نہیں دیکھی۔ ممکن ہے دہلی میں مل جائے بلکہ یقین ہے مل جائے گی۔ میں نے اس کے لیے محمد حبیب خاں صاحب لائبریرین انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کو لکھ دیا ہے، یہ کتاب آپ کو پہنچے گی۔"

۲۴ر نومبر ۱۹۸۲ء کے ایک دوسرے عنایت نامے میں مختار الدین احمد صاحب نے لکھا کہ:

"یہ خط حبیب خاں صاحب کی معرفت آپ تک پہنچے گا۔ آپ کی مطلوبہ کتاب کے لیے انہی کو دہلی لکھا تھا۔ "غالب مصوّر" نہ انھوں نے دیکھی نہ مالک رام صاحب نے۔ میں نے تو نام آپ سے سنا۔ محمد حبیب خاں صاحب کہتے ہیں کہ انھیں اطلاع ملی ہے کہ احوالِ غالب میں جو تصاویر میں نے چھاپی ہیں، انھیں کچھ اضافے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ قیمت پہلے تین سو تھی، اب وہ پانسو بتاتے ہیں ـــ کیا "غالب مصوّر" واقعی اس قیمت پر بھی آپ کے لیے خرید لی جائے؟"

اس معلوم یا کچھ دوسری نامعلوم محرومیوں کے باوجود، میرا احساس یہ ہے کہ بنیادی اہمیت رکھنے والی کوئی چیز شاید نظر انداز نہ ہوئی ہو۔ اس لیے زیرِ نظر جائزہ غالبیات کے کل مطبوعہ ذخیرے (۱۹۷۰ء تا ۱۹۸۲ء) پر حاوی نہ سہی، لیکن اس حدِ زمانی کے لیے اسے یکسر ناکافی یا غیر نمائندہ بھی خیال نہیں کیا جائے گا۔

(۳)

تصانیفِ غالب: زمانۂ زیرِ بحث میں غالب کی بعض تصنیفات کے اچھے اور نئے ایڈیشن شائع ہوئے:

۱۔ گُلِ رعنا، غالب	مالک رام (مرتّب)	دہلی، ۱۹۷۰ء
۲۔ گُلِ رعنا، غالب	سید وزیر الحسن عابدی (مقدمہ)	لاہور، ۱۹۷۰ء
۳۔ اردوئے معلّیٰ، حصہ دوم	مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (مرتّب)	لاہور، ۱۹۷۰ء
۴۔ قادر نامہ، غالب	عبدالقوی دسنوی (مرتّب)	بھوپال، ۱۹۷۱ء
۵۔ گُلِ رعنا، غالب	سید قدرت نقوی (مرتّب)	کراچی، ۱۹۷۵ء

---

[۱] ترتیب: نور الدین آزاد، رنگین تصاویر: رام کمار بشرا، لائن تصاویر: فیض مجدد، اردو ایڈیشن تین سو روپے، ہندی ایڈیشن: دو سو روپے

۶- دیوانِ غالب	ملک حسن اختر (مرتب)	لاہور، ۱۹۷۵ء
۷- دیوانِ غالب	ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (مرتب)	لاہور، ۱۹۷۶ء
۸- دیوانِ غالب، آثار نسخہ	ذوالفقار اخگر (تصحیح)	لاہور، ۱۹۷۷ء
۹- دعائے صباح	کالیداس گپتا رضا (مقدمہ)	بمبئی، ۱۹۷۷ء
۱۰- دیوانِ غالب	مالک رام (مرتب)	لاہور، ۱۹۷۸ء
۱۱- دیوانِ غالب	رخسانہ نکہت (مرتب)	لاہور، ۱۹۷۸ء
۱۲- دیوانِ غالب	مالک رام (مرتب)	دہلی، ۱۹۷۹ء
۱۳- دیوانِ غالب، نسخہ طاہر	گوہر نوشاہی (مرتب)	لاہور، ۱۹۸۰ء
۱۴- دیوانِ غالب، نسخہ حامد علی خاں	ڈاکٹر نور الحسن نقوی (مقدمہ)	علی گڑھ، ۱۹۸۰ء
۱۵- دیوانِ غالب اُردو نسخہ عرشی	امتیاز علی خاں عرشی (ترتیب و تحقیق)	دہلی، ۱۹۸۲ء

تصانیفِ غالب کے حلقے سے اس دہائی کا سب سے زیادہ قابلِ ذکر واقعہ غالب کے اردو اور فارسی کلام کے اولین انتخاب "گلِ رعنا" (مرتبہ ۱۸۲۸ء) کی دریافت اور اشاعت ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں اس عرصے میں اس کے ایک سے زیادہ متن منظرِ عام پر آئے لیکن گلِ رعنا بخطِ غالب کے مطابق متن کا مرتب کیا جانا ابھی باقی ہے۔

اس عرصے میں غالب کا اردو دیوان اہلِ علم کی توجہ کا بطورِ خاص مرکز رہا۔ اس ذیل کا سب سے زیادہ معتبر اور تابندہ کارنامہ غالب کے اُردو دیوان کے نسخۂ عرشی کے نقشِ ثانی کی اشاعت ہے۔ نقشِ اول کوئی ایک چوتھائی صدی پہلے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ نقشِ ثانی، دیر بعد آیا لیکن ایسا آیا کہ تا دیر اسے ایک عینی معیار اور پیمانے کا درجہ حاصل رہے گا۔ اس میں کیا قریب، کیا دور، کیا پیرانِ آزمودہ اور کیا نو آموز، سب طرح کے اور ہر جگہ کے محققین کے لیے سبق اور سند لیا ہے کہ تصانیفِ غالب کے کسی تحقیقی اور تدوینی ایڈیشن کو کس رتبے اور مرتبے کا ہونا چاہیے ـــــ یہاں تحدیثِ نعمت کے طور پر کہنے کی ایک بات یہ ہے کہ نسخۂ عرشی مجھے ڈاکٹر خلیق انجم (دہلی) کی عنایت سے میسر آیا۔

(۴)

انتخاباتِ نظم و نثرِ غالب: اِس مدتِ زمانی میں غالب کی اُردو نظم و نثر اور فارسی کلام کے بعض اچھے انتخابات بھی ہوئے جو اگرچہ بجائے خود بھی قابلِ قدر ہیں لیکن یہ انتخاب، ادبی اور تہذیبی زندگی کے بعض نامور اور معتبر ترین اصحاب سے منسوب ہونے کی بنا پر بھی قابلِ لحاظ ہیں:

۱- انتخابِ غالب	ڈاکٹر ذاکر حسین	دہلی، ۱۹۷۰ء
۲- غالب شناسی نمبر ۲	ڈاکٹر ظ- انصاری	بمبئی، ۱۹۷۲ء
۳- عکسِ غالب	آلِ احمد سرور	علی گڑھ، ۱۹۷۳ء
۴- انتخابِ غالب	مشرف انصاری	لاہور، ۱۹۷۳ء
۵- حافظ و غالب (ہم طرح انتخابات)	چودھری نبی احمد باجوہ	لاہور، ۱۹۷۴ء
۶- انتخابِ خطوطِ غالب	ڈاکٹر عبادت بریلوی، مشرف انصاری	کراچی، ۱۹۷۵ء
۷- غالب اور فنِ تنقید (اُردو خطوط)	اخلاق حسین عارف	دہلی، ۱۹۷۷ء
۸- انتخابِ آتش و غالب	برج نرائن چکبست، مرتبہ، کالیداس گپتا رضا	بمبئی، ۱۹۸۰ء

ڈاکٹر ذاکر حسین کے "انتخابِ غالب" میں غالب کی فارسی مثنویات اور غزلیات کے سوا دو سو شعر بھی نہیں لیکن یہ کڑا انتخاب خواجہ احمد فاروقی کے بقول "نا تمام ہونے کے باوجود دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ شاعر کے درونِ جان اور فکرِ جمیل ہی کا محرم نہیں، ذاکر صاحب کے جوہرِ ذات اور شخصیت کا بھی رازدار ہے جس میں شعروں کے انتخاب سے خود ان کے خلوت کدۂ ذات کا حجاب اُٹھ گیا ہے"۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری کی کتاب "غالب شناسی نمبر ۲" جو مجھے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (دہلی) نے عطا فرمائی، غالب کے اردو اور فارسی کلام کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس انتخاب میں چار ہزار کے لگ بھگ شعر جگہ پا گئے ہیں — "اس انتخاب کو اپنے مکمل اور جامع و مانع ہونے کا دعویٰ تو نہیں، تاہم شاعر کے اردو اور فارسی کلیات سے (جن میں اب چودہ ہزار سے زیادہ اشعار ملتے ہیں)، یہ بڑی حد تک بے نیاز ضرور کر دیتا ہے۔" ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے ٹھیک کہا ہے کہ "نیا جاندار شعر وہ ہے جو ذرا دیر تک نیا رہے۔ غالب کے ہاں نیا پرانا ہر طرح کا شعر ملتا ہے مگر وہ جو اپنے جنم دن سے سوا سو سال بعد آج تک تازہ دم معلوم ہوتا ہے اور خود ہماری زندگی کی پیچ دار، ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی، دور دراز تک پھیلی ہوئی پگڈنڈیوں پر ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے، وہ اس انتخاب کی نظر سے اوجھل نہیں رہا ہوگا۔"

اس بھرپور انتخاب کا جاندار دیباچہ پچھلے ایک سو برس کی غالب شناسی کے اہم نکات کو اپنے دائرے میں لے لیتا ہے اور جو کچھ ڈاکٹر ظ۔ انصاری کو اپنی طرف سے کہنا یا جتانا تھا، وہ بھی مختصر اور مؤثر پیرائے میں کہہ دیا گیا ہے۔ یہ جائزہ اپنی خیال افروزی اور معنی خیزی کے اعتبار سے غالب شناسی کا ایک منفرد معیار پیش کرتا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی غالب کمیٹی نے غالب کے خطوں کا ایک ایسا انتخاب شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا جو غالب کے بہترین خطوط پر مشتمل ہو اور جس سے نہ صرف غالب کی شخصیت، ان کے ماحول، مزاج اور مشاغل کا اندازہ ہو جائے، بلکہ اس کے ذریعے سے طلبا اور عام اردو قاری غالب کی روح تک پہنچ سکیں اور اردو نثر میں عموماً اور مکتوب نگاری کی تاریخ میں خصوصاً ان خطوط کی اہمیت کا احساس کر سکیں"۔

ان حدود میں "عکسِ غالب" کے نام سے غالب کے اُردو خطوں کے انتخاب کی خدمت پروفیسر آل احمد سرور نے انجام دی ہے۔ جن کا نام، اس کام کے معیار کی ضمانت ہے۔ سرور صاحب کا "پیش لفظ" (صفحہ ۷۔۱۵) مطالعۂ غالب کے ذیل میں ایک نئی بصیرت کا حکم رکھتا ہے۔

چکبست نے اکتوبر ۱۹۱۸ء میں لکھنؤ سے "صبحِ امید" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا، جنوری ۱۹۲۱ء تک وہ کم و بیش اس کے ہر شمارے میں قدیم مذاقِ سخن کی یاد تازہ رکھنے کی غرض سے قدیم شعرا کے کلام کا انتخاب پیش کرتے رہے۔ انتخابِ کلام کے لیے سب سے پہلے انھوں نے آتش اور غالب کو منتخب کیا تھا۔ اس گیتا رضا نے "صبحِ امید" کے ان نایاب پرچوں سے چکبست کا کیا ہوا، انتخابِ کلامِ آتش و غالب جتنا بھی میسر آ سکا، کتابی صورت میں یکجا کر دیا ہے۔

(۵)

نگارشاتِ غالب کے تراجم: غالب کی متفرق اور مستقل نگارشات کے کچھ اچھے کتابی تراجم کے تراجم بھی اس عرصے میں سامنے آئے ہیں:

۱۔ نقش ہائے رنگ رنگ	ڈاکٹر ظہیر الدین صدیقی	دہلی، ۱۹۷۰ء
۲۔ شش جہاتِ غالب	چودھری نبی احمد باجوہ	لاہور، ۱۹۷۲ء
۳۔ غالب ریویلیرہم سیلف	ڈاکٹر نور الحسن نقوی (مؤلف/مترجم)	علی گڑھ، ۱۹۷۲ء
۴۔ (مثنوی) چراغِ دیر	اختر حسن	حیدر آباد دکن، ۱۹۷۴ء
۵۔ ڈسٹریکٹ ٹنگ ورڈز	ڈاکٹر محمد ذاکر	دہلی، ۷۰، ۱۹۷۴ء
۶۔ اردو غزلز آف غالب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	دہلی، ۱۹۷۷ء
۷۔ پرشین غزلز آف غالب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	دہلی، ۱۹۸۰ء
۸۔ د غالب کلام	سراج الاسلام سراج	پشاور، ۱۹۷۲ء

ان تراجم میں غالب کی اردو اور فارسی غزلیات کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے پچھلی دہائی ہی میں نہیں بلکہ آگے پیچھے کے سارے حوالوں اور زمانوں کے اعتبار سے ہمیشہ قابلِ لحاظ رتبہ اور مرتبہ حاصل رہے گا۔ "اردو غزلز آف غالب" میں غالب کی ۲۳۴ اردو غزلوں کے علاوہ، نسخۂ حمیدیہ کی ۸۲ غزلوں کے منتخب اشعار کا انگریزی میں ترجمہ شامل اشاعت ہے۔ "پرشین غزلز آف غالب" میں، ردیف وار غالب کی ۲۵۵ فارسی غزلیات کا ترجمہ آگیا ہے۔

اس طرح بحیثیتِ مجموعی اردو غزلیاتِ غالب کے سترہ سو سے زیادہ اشعار اور غالب کی فارسی غزلوں کے کوئی بارہ سو منتخب اشعار کے اس انگریزی ترجمے سے مطالعۂ غالب کے ایک نئے اور وسیع تر دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اب غالب اور غزل کی روح اور خوشبو، اہلِ مغرب کے افکار اور اذہان پر بھی دستک دے سکے گی اور دست انداز ہو سکے گی!

"ڈسٹرکٹ ٹنگ ورڈز" (آشفتہ بیانی) کے کتابی نام سے انگریزی خواں اصحاب کے لیے غالب کے ۱۴۳ اردو/فارسی اشعار کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر محمد ذاکر کی ایک قابلِ تحسین کاوش ہے۔ یہ کتاب غالباً پہلی بار اکتوبر ۱۹۷۳ء میں چھپی تھی۔ میرے پیشِ نظر ستمبر ۱۹۷۶ء کی اشاعت ہے جس کی فوٹو اسٹیٹ نقل تیار کر لینے کی اجازت اور سہولت مجھے ڈاکٹر فرمان فتحپوری (کراچی) سے میسر آئی۔

ڈاکٹر نورالحسن نقوی کی کتاب "غالب، اے ویلیڈ ہِم سیلف" (ہز لائف تھرو ہز رائٹنگز) ایک طرح سے غالب کی آپ بیتی ہے جسے غالب کی تحریروں کی مدد سے مرتب اور متشکل کیا گیا ہے۔ غالب کی متفرق اردو/فارسی تحریروں کا انگریزی ترجمہ کارِ دشوار تھا جس سے ڈاکٹر نورالحسن نقوی آسان و کامران گزر گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں "سیلیکشنز فرام غالب" کے تحت غالب کے چالیس کے قریب اردو اشعار کا انگریزی ترجمہ بھی شامل ہے۔

ایک اور ترجمہ اختر حسن نے کیا ہے۔ یہ غالب کی فارسی مثنوی "چراغِ دیر" کا کامیاب منظوم اردو ترجمہ ہے۔ غالب کے فارسی کلام کا ایک ہمہ جہتی انتخاب اور اس کا منظوم اردو ترجمہ "شش جہاتِ غالب" چودھری نبی احمد باجوہ کی کاوش، دروکاہش کا نتیجہ ہے۔ اس انتخاب میں مختلف اصنافِ سخن (قطعات، رباعیات، مثنویات، قصائد، غزلیات اور ترکیب بند) کے دو ہزار کے قریب فارسی اشعار صفحہ بہ صفحہ منظوم اردو ترجمے کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔ یہ منظوم اردو تراجم بڑی حد تک اصل فارسی اشعار کے تیور اور ان کی تہہ دار معنویت کے حامل ہیں اور مترجم کی غالب شناسی اور ذوقِ سلیم دونوں پر دلالت کرتے ہیں۔

غالب کی ۲۵۶ فارسی غزلیات اور مثنویات کے ۳۱۸ اشعار کا انتخاب اور ان کا اردو نثر میں ترجمہ "نقش ہائے رنگ رنگ" کے نام سے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے کیا ہے۔ ترجمہ عام فہم اور واضح ہے اور اس انتخاب میں غالب کے اکثر اچھے اشعار جن میں خیال کی ندرت یا زبان کی لطافت ہے، آگئے ہیں۔

اب تک نگارشاتِ غالب کے جن تراجم کا ذکر ہوا، وہ فارسی سے اردو نظم یا نثر میں ہوئے یا اردو فارسی نظم و نثر سے انگریزی میں کیے گئے۔ ان سے الگ یہاں میں بطورِ خاص غالب کے اردو کلام کے ایک ایسے ترجمے کا ذکر کرنا چاہوں گا جو پشتو زبان میں ہوا ہے۔ یہ قابلِ قدر کاوش سراج الاسلام سراج کی مخلصانہ توجہ اور غالب سے ان کے شغف کا نتیجہ ہے۔ "دَ غالب کلام" کے نام سے غالب کے اردو کلام کا یہ منظوم پشتو ترجمہ پہلی بار ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ ۲۴۶ صفحات پر مشتمل اس کتابچے کے دوسرے ایڈیشن میں جو ۱۹۷۴ء میں چھپا ہے غالب کی ۲۵ سے زیادہ اردو غزلیں منظوم پشتو ترجمے کے ساتھ شامل ہیں۔ مترجم سراج الاسلام سراج اکوڑہ خٹک کے ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی مادری زبان پشتو ہے لیکن وہ اردو شعر و ادب کا کتنا ستھرا ذوق رکھتے ہیں، اس کا اظہار اس حُسنِ انتخاب سے ہو رہا ہے جو کلامِ غالب کے پشتو ترجمے کے لیے انھوں نے روا رکھا ہے۔ پشتو ترجمے کی داد انھیں میاں امان الملک نور کاکاخیل سے ملی ہے جو پشتو اور اردو دونوں میں ایم اے ہیں اور جنھوں نے "دَ غالب کلام" کا تحسینی تعارف تحریر کیا ہے۔

(۶)

تشریحاتِ کلامِ غالب: غالب کے اردو اور فارسی کلام کی شرح نویسی کا سلسلہ انیسویں صدی ہی میں شروع ہو گیا تھا (کلامِ غالب کے اولین شارح خود غالب تھے!)۔ ان بارہ تیرہ برس (۱۹۷۰ء–۱۹۸۲ء) میں کلامِ غالب کی نئی شرحیں بھی سامنے آئیں اور بعض پچھلی شرحیں مفید ترمیم و اضافے کے ساتھ بھی شائع ہوئیں:

۱۔ تفسیرِ غالب	ڈاکٹر گیان چند	سری نگر، ۱۹۷۱ء
۲۔ الہاماتِ غالب	عنایت اللہ ملک	کراچی، ۱۹۷۱ء
۳۔ شرح طباطبائی اور تنقیدِ کلامِ غالب	مسعود حسن رضوی ادیب	لکھنؤ، ۱۹۷۳ء
۴۔ تعبیرِ غالب	ڈاکٹر سید نیر مسعود رضوی	لکھنؤ، ۱۹۷۳ء
۵۔ افکارِ غالب	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	لاہور، ۱۹۷۳ء
۶۔ مرادِ غالب	منظور احسن عباسی	لاہور، ۱۹۷۵ء
۷۔ شرحِ دیوانِ اردوئے غالب	نظم طباطبائی	لکھنؤ، ۱۹۷۷ء
۸۔ شرح غزلیاتِ غالب (فارسی) جلد اول:	صوفی غلام مصطفےٰ تبسم	لاہور، ۱۹۸۱ء
۹۔ شرح غزلیاتِ غالب (فارسی) جلد دوم:	صوفی غلام مصطفےٰ تبسم	لاہور، ۱۹۸۱ء

مطالعۂ غالب کی اس دوسری صدی کی اب تک کی سب سے زیادہ ہمت آفریں شرح ڈاکٹر گیان چند کی "تفسیرِ غالب" ہے۔ یہ کتاب جو میرے حال پر اکبر علی خاں عرشی زادہ (رامپور) کے لطف و کرم کی یادگار ہے، غالب کے غیر متداول اردو کلام کی شرح ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کی "تفسیر" سے جیسا کہ بالعموم ہر تفسیر کا مقدر رہا ہے، ہر جگہ پوری طرح اتفاق کرنا مشکل ہے، بایں ہمہ اس تشریح و تفسیر نے غالب کے اُن اشعار کے طلسم کا بندِ نقاب وا کر دیا ہے جنہیں اردو شاعری کے ذخیرے میں شاید سب سے زیادہ دقیق اور مغلق خیال کیا جاتا تھا۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب نے سید علی حیدر نظم طباطبائی (۱۸ نومبر ۱۸۵۳ء – ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء) کی مشہور شرح دیوانِ غالب (اردو) کے بعض اجزا کو ایک نئی ترتیب سے اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ تالیفِ تازہ کا لطف بہم پہنچاتی ہے۔

ڈاکٹر سید نیر مسعود رضوی کی کتاب "تعبیرِ غالب" اپنے شائستہ لہجے اور نکتہ آفرینی کے باعث تفہیمِ غالب کے جدید ترطرزِ احساس سے ہم آہنگ ہے۔ یہ کتاب الفاظ پر ڈاکٹر نیر کی مضبوط گرفت اور ان کے استعمال پر ان کی خلاقانہ قدرت اور قوت کی ایک دلپذیر مثال ہے۔

منظور احسن عباسی نے "مرادِ غالب" کو غالب کے اردو دیوان کی "مختصر ترین شرح" کے طور پر پیش کیا ہے۔ تشریح، الفاظ و اشعار کے پیشِ نظر کی گئی ہے، شاعر سے کوئی غرض نہیں رکھی گئی۔ یہ طرزِ کار تشریحاتِ غالب کی مروجہ روش سے مختلف اور تنقید کے جدید آداب سے شاید ہم آہنگ نظر نہ آئے لیکن "اختصار" اسی صورت ممکن تھا جو اس شرح کی اولین امتیازی خصوصیت ہے۔

عباسی صاحب نے بالعموم ہر شعر کا مطلب دو چار سطروں میں بیان کرنے کے بعد آخر میں اس شعر کا حاصلِ مدعا ایک لفظ یا چند الفاظ کے ایک مرکب میں بتانے کی کوشش کی ہے جسے شعر کا عنوان قرار دیا جا سکتا ہے اور اسی جہت سے کتاب کا نام "مرادِ غالب" رکھا گیا ہے، اس اختصار کے اعتبار سے یہ اشاراتی شرح متعلمین سے زیادہ معلمین کو کفایت کرتی ہے!

غالب کی فارسی غزلوں کے اردو ترجمے اور تشریح کا ایک اہم اور تازہ کام صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی یادگار ہے۔ صوفی صاحب نے ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ غالب کی فارسی غزلیات کی شرح نویسی کا کام شروع کیا اور کوئی سات برس میں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا لیکن وہ

خود اپنی اس تصنیف کو چھپتا اور پھیلتا نہ دیکھ سکے۔ اُن کے انتقال (۱۹۷۸ء) کے کوئی تین برس بعد غالب کی تین سو بارہ فارسی غزلیات کی یہ تشریح دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ پہلی جلد (ص ۴۸۴) ردیف ا تا خ کی ایک سو دس غزلوں کی تشریح پر مبنی ہے۔ دوسری جلد (ص ۸۴۵) ردیف د سے ی تک کی دو سو بارہ غزلوں کی تشریح پر مشتمل ہے۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی یادگار، یہ شرح مجھے سید بابر علی ریبگز، لاہور نے مرحمت فرمائی جن کے زیر اہتمام یہ دو ضخیم جلدیں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی ہیں۔ سید بابر علی کا یہ احساس بجا ہے کہ "غالب جس کی اردو مشکل ہے، فارسی اور بھی مشکل ہے۔۔۔۔" اس عقب میں صوفی صاحب کا "یہ احسان موجودہ اور آئندہ آنے والے طالب علموں پر ہمیشہ رہے گا کہ انھوں نے غالب کی فارسی غزلوں کی تشریح آسان اردو میں کر دی ہے۔۔۔" (پیش لفظ، جلد اول)

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے ہم عمر اور ہم عصر رفیقِ دیرینہ ڈاکٹر سید نذیر احمد نے جلد اول کے "تعارف" میں کتاب کی تنقید اور اس کے دفاع میں سچ کہا ہے کہ "بعض جگہ ایسا احساس ہوتا ہے کہ ان کی تشریح ایک اوسط درجے کے طالب علم کے لیے کافی نہ ہو گی، اور اسے تشنہ رکھے گی بعض دوسری جگہوں پر نظر آتا ہے کہ شارح، شعر کے اصل خیال کو چھوڑ کر صرف و نحو کے کسی ضمنی مسئلے کی طرف نکل گیا ہے اور کئی جگہ تشریح کی بجائے صرف ترجمے پر اکتفا (کیا) ہے، حالانکہ وہاں تشریح کی ضرورت تھی لیکن یہ میٹریل صوفی صاحب کی امانت ہے اس میں ردوبدل کا کسی کو حق نہیں۔ ان اسقام پر، جو بہت کم ہیں نظر ڈالتے ہوئے یہ خیال کرنا چاہیے کہ غالب کی فارسی غزلیات کی تعداد ساڑھے تین سو کے قریب ہے، اور ان کی تشریح ہزار صفحے سے زیادہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اتنے بڑے کام کو، جو برسوں کی محنت سے انجام تک پہنچا ہے، یکساں توجہ سے کرتے چلے جانا، کسی جوان شخص کے لیے بھی مشکل ہوتا، چہ جائیکہ اس شخص کے لیے جس کی عمر ستر سے متجاوز تھی۔ یہ کام جیسا بھی ہوا ہے ہماری پوری ملت پر ایک احسان ہے کہ اس کے ذریعے سے اس کا فراموش شدہ ثقافتی ورثہ اسے واپس دلایا جا رہا ہے۔ ہم صوفی صاحب مرحوم کی اس بے بہا خدمت کا بدلہ نہیں چکا سکتے۔۔۔۔"

(۷)

غالبیات کے سلسلے کی بیشتر کتابیں ملی جلی سوانحی، تشریحی، تنقیدی اور تحقیقی نوعیت کی ہیں۔ بعض "تصانیفِ غالب" کو "متنی تحقیق" کے تحت شمار کیا جانا چاہیے (دیوانِ غالب اردو، نسخۂ عرشی)، کچھ "تشریحات" ۔ "تراجم" کے ذیل میں آئیں گی (شرح غزلیات غالب۔ فارسی، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم)، "بعض تشریحات" کو انتقادی کتب کے تحت بھی رکھا جا سکتا ہے (افکارِ غالب، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم)، بعض ایک متعین موضوع پر ہوتے ہوئے بھی "تشریحات" کے تحت شمار کی جا سکتی ہیں (غالب اور تصوف، سید محمد مصطفےٰ صابری)، بعض کتابیں خالصتاً تنقیدی ہیں (غالب کی شخصیت اور شاعری، رشید احمد صدیقی)، بعض واضح طور پر تحقیقی (تحقیقِ غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)، بعض ملی جلی تنقیدی اور تحقیقی (غالب۔۔۔ شاعرِ امروز و فردا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری)، "یادگارِ غالب" (حالی) کی عام شہرت "سوانح" کی ہے، لیکن یہ صرف سوانح نہیں ہے۔

اس دشواری کے باوجود کہ "سوانحی" ۔ "تنقیدی" ۔۔۔ اور "تحقیقی" کام کے درمیان خطِ فاصل کھینچنا آسان نہیں، اور بعض صورتوں میں کسی ایک غالب رجحان یا رنگ کی بنا پر بھی ان کی موضوعاتی تقسیم پر سب کا اتفاق ضروری نہیں، اگر پچھلے بارہ تیرہ برس (۱۹۷۰ء تا ۱۹۸۲ء) میں چھپنے والی اُن کتابوں کی جو میرے ذخیرۂ غالبیات کی زینت ہیں، ایک موٹی سی موضوعی تقسیم عمل میں آئے تو اس خانہ بندی کا نتیجہ کچھ یوں ہو گا:

(۸)

سوانح: ۱۔ غالب — پیرجی شریف احمد عثمانی — لاہور، ۱۹۷۰ء

۲۔ غالب نما — سید مرتضیٰ حسین بلگرامی — علی گڑھ، ۱۹۷۰ء

۳۔ غالب کی آپ بیتی	نثار احمد فاروقی (مرتب)	دہلی، ۱۹۷۱ء
۴۔ چچا غالب	محمد حسین حسان ندوی (مرتب)	دہلی، ۱۹۷۲ء
۵۔ غالب کی کہانی	محمد شفیع الدین نیر	دہلی، ۱۹۷۴ء
۶۔ ذکرِ غالب	مالک رام	دہلی، ۱۹۷۶ء
۷۔ یادگارِ غالب (حالی) حصہ اوّل	مالک رام (مرتب)	دہلی، ۱۹۷۷ء
۸۔ حیات غالب	ڈاکٹر ایس۔ ایم اکرام	لاہور، ۱۹۸۲ء

پچھلے بارہ تیرہ برس میں کوئی ایسی نئی قابلِ لحاظ کتاب شائع نہیں ہوئی جو تمام وکمال احوالِ غالب (سوانح) پر مشتمل ہو۔ غالب کی معروف سوانح "ذکرِ غالب" (مالک رام) کا پانچواں ایڈیشن، بارہ برس بعد (۱۹۷۶ء میں) شائع ہوا جس کا ایک نسخہ فرستادہ مالک رام (دہلی) اس وقت پیشِ نظر ہے، کہا گیا ہے اور یہ بات انہی لفظوں میں کتاب کی دوسری اشاعت (۱۹۵۰ء) سے سرورق پر ثبت چلی آ رہی ہے کہ کتاب "پوری نظرِ ثانی اور اضافے کے ساتھ" شائع کی گئی ہے، لیکن "ذکرِ غالب" کا یہ ایڈیشن بالخصوص "غالب صدی" کے بعد بہت سا نیا اور قیمتی مواد و مسالہ سامنے آنے اور متداول آثار کی تنقیح و تصحیح کے بعد پہلی بار شائع ہو رہا تھا جس وقتِ نظر کے ساتھ نظرِ ثانی چاہتا تھا، اس کا موقع غالباً مل نہیں سکا۔ ڈاکٹر ایس۔ ایم اکرام کی کتاب "حیات غالب" (۱۹۵۰ء) کا دوسرا ایڈیشن بھی کوئی چوتھائی صدی بعد کسی ترمیم یا اضافے کے بغیر سامنے آیا ہے۔

(۹)

تنقید: ۱۔ غالب کا فن	اسلوب احمد انصاری	علی گڑھ، ۱۹۷۰ء
۲۔ نقشِ غالب	اسلوب احمد انصاری	دہلی، ۱۹۷۰ء
۳۔ غالب کی شخصیت اور شاعری	رشید احمد صدیقی	دہلی، ۱۹۷۰ء
۴۔ غالب کے سات رنگ	ڈاکٹر سہیل بخاری	سرگودہا، ۱۹۷۰ء
۵۔ غالبیاتِ نو (غالب اسٹڈیز ۶)	ڈاکٹر عابد رضا بیدار	دہلی، ۱۹۷۰ء
۶۔ شہنشاہِ سخن غالب کے کلام پر ناقدانہ نظر	ڈاکٹر سید عارف شاہ گیلانی	کراچی، ۱۹۷۰ء
۷۔ غالب کون؟	سلیم احمد	کراچی، ۱۹۷۱ء
۸۔ سرو و صنوبر	مخمور اکبر آبادی	کراچی، ۱۹۷۱ء
۹۔ غالب اور آہنگ غالب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	دہلی، ۱۹۷۱ء
۱۰۔ جوہر آئینہ۔ جائزہ کلام غالب	نند لال کول طالب کاشمیری	دہلی، ۱۹۷۱ء
۱۱۔ غالب کی تہذیبی شخصیت	جیلانی کامران	راولپنڈی، ۱۹۷۲ء
۱۲۔ طرزِ غالب	محمد عرفان	لکھنؤ، ۱۹۷۲ء
۱۳۔ غالب۔ حقیقت کے آئینے میں	ہنس راج رہبر	دہلی، ۱۹۷۲ء
۱۴۔ غالب۔ اپنے آئینے میں	اختر صدیقی	دہلی، ۱۹۷۳ء
۱۵۔ عرفانِ غالب	آل احمد سرور (مرتب)	علی گڑھ، ۱۹۷۳ء
۱۶۔ فلسفی غالب	احمد رضا	لکھنؤ، ۱۹۷۳ء

۱۷۔ عرفانِ غالب	سلطان صدیقی	لاہور، ۱۹۷۴ء
۱۸۔ دیدارِ غالب	عرش ملسیانی	نکودر، ۱۹۷۴ء
۱۹۔ غالب۔ شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	کراچی، ۱۹۷۴ء
۲۰۔ غالب۔ فکر وفن کے آئینے میں	حبیب الرحمٰن	پشاور، ۱۹۷۶ء
۲۱۔ ہفت رنگ غالب	اخلاق حسین عارف	لکھنؤ، ۱۹۷۷ء
۲۲۔ غالب سے اقبال تک	ایم حبیب خاں (مرتب)	علی گڑھ، ۱۹۷۷ء
۲۳۔ غالب اور تصوف	سید محمد مصطفےٰ صابری	کلکتہ، ۱۹۷۷ء
۲۴۔ حکیم فرزانہ	ڈاکٹر شیخ محمد اکرام	لاہور، ۱۹۷۷ء
۲۵۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں (۱)	صباح الدین عبدالرحمٰن	اعظم گڑھ، ۱۹۷۷ء
۲۶۔ اقبال اور غالب۔ تخلیقی عمل کا مطالعہ	ڈاکٹر حامدی کاشمیری	سری نگر، ۱۹۷۸ء
۲۷۔ غالب کی شخصیت اور شاعری	رشید احمد صدیقی	دہلی، ۱۹۷۸ء
۲۸۔ غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	دہلی، ۱۹۷۹ء
۲۹۔ غالب کی شخصیت اور شاعری	رشید احمد صدیقی	لاہور، ۱۹۸۱ء
۳۰۔ خطوطِ غالب۔ فنی تجزیہ	حامدہ مسعود	علی گڑھ، ۱۹۸۲ء

تنقیدی اندازِ نظر کی ان تیس کتابوں میں سے تین (نمبر ۹، ۲۲ اور ۲۴) ۱۹۷۰ء سے پہلے کی مطبوعات کے نئے ایڈیشن ہیں۔ ان تین میں سے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب "غالب اور آہنگ غالب" کا دوسرا ایڈیشن 'ایک طرح سے نئی کتاب ہے۔ ان معنی میں کہ پہلے ایڈیشن (دسمبر ۱۹۶۸ء، صفحات ۳۱۲) کے مقابلے میں کتاب کا یہ دوسرا اڈیشن (ستمبر ۱۹۷۱ء، صفحات ۴۴۷) اضافے اور ترمیم کے بعد کم وبیش ڈیڑھ گنا ہو گیا ہے۔'

رشید احمد صدیقی کی کتاب "غالب کی شخصیت اور شاعری" (نمبر ۳، ۲۷ اور ۲۹) دراصل اُن کے 'نظام اردو خطبات' ہیں جو انھوں نے غالب کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر دہلی یونیورسٹی کے ٹیگور ہال میں دیے۔ اس کتاب کے کم از کم تین ایڈیشن تو ضرور چھپ چکے ہیں! "کم از کم" اس لیے کہ خود رشید صاحب کے بقول "جب سے ہم کو آزادی نصیب ہوئی ہے اُردو کا تو کوئی مصنف یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اُس کی تصانیف کے کتنے ایڈیشن ہندوستان اور پاکستان میں اس کی مرضی یا علم کے بغیر اور انسان و اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کے علی الرغم ذاتی منفعت کی خاطر سے علی الاعلان شائع نہ ہو چکے ہوں گے، ہو رہے ہوں گے یا ہوتے رہیں گے۔" پچھلے بارہ تیرہ برسوں میں سلسلۂ غالب کی کسی اور تنقیدی کتاب کے اتنے ایڈیشن نہیں چھپے۔ ایک یہی بات کتاب کے معقول اور مقبول ہونے کے لیے بہت ہے!!

"غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات" ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے 'غالب خطبات' ہیں جو غالب اکیڈمی (دہلی) کے زیر اہتمام اکتوبر ۱۹۷۷ء میں ہوئے لیکن کتابی صورت میں ان کی اشاعت ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے انتقال (۲۱ فروری ۱۹۷۹ء) کے بعد (اپریل ۱۹۷۹ء میں) رو بہ عمل آئی۔ پہلا خطبہ (صفحہ ۹-۶۹) غالب اور اقبال کے کلام میں ہیئت اور اسلوب کی تخلیقی توانائی سے متعلق مباحث پر مبنی ہے۔

دوسرے خطبے (صفحہ ۷۰-۲۰۲) میں غالب اور اقبال کے کلام سے 'متحرک جمالیات' کی مثالیں دے کر اُن استعاروں اور علامتی پیکروں کی نشاندہی کی گئی ہے جن سے حرکت وعمل اور آرزومندی اور آزادی کی اقدار کا اظہار ہوتا ہے۔ 'متحرک جمالیات' سے

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی مراد شاعری میں ایسے استعاروں اور علامتی پیکروں سے ہے جن سے حرکت و عمل کا احساس ہو اور یہ احساس حسن آفریں ہو۔

ڈاکٹر سید عارف شاہ گیلانی کی "شہنشاہِ سخن غالب کے کلام پر ناقدانہ نظر" اُن کے انگریزی میں لکھے گئے مقالے ـــــ "GHALIB - HIS LIFE AND PERSIAN POETRY" (مطبوعہ کراچی ۱۹۵۶ء) کا اردو روپ ہے۔ اس مقالے پر بمبئی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند عطا کی گئی۔ اردو میں اس مقالے کو "اضافات" کے بعد "نئی شان" سے پیش کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے لیکن کتاب کسی طرح بھی تحقیقی مزاج کی نہیں ہے اور اس کا تنقیدی پایہ بھی نہایت سقیم ہے۔

بحیثیتِ مجموعی بارہ تیرہ برس کے اس اکتساب کا ایک حصہ شاید معیاری یا متوازن نہ قرار پائے، بعض مطالعات یک طرفہ بھی ہو سکتے ہیں اور نزاعی بھی ـــــ بایں ہمہ مطمئن اور مسرور ہونے کے لیے کیا یہ کافی نہیں کہ تنقیدی اندازِ نظر کے حامل اس شعبۂ غالبیات میں آلِ احمد سرور کا مُرتبہ مجموعۂ مضامین "عرفانِ غالب" بھی شامل ہے اور رشید احمد صدیقی، اسلوب احمد انصاری، مجنوں گورکھپوری اور ڈاکٹر حامد کاشمیری کی کتابیں بھی ـــــ یہ ایسے بصیرت افروز، ہمہ جہت اور تازہ کار جائزے ہیں جنہیں نقدِ غالب میں نظر انداز کرنا آسان نہیں ہوگا۔

(۱۰)

تحقیق:

۱۔ جاگیرِ غالب	پرتھوی چندر	دہلی، ۱۹۷۰ء
۲۔ اشاریۂ کلامِ غالب	رشید حسن خاں (و دیگر)	دہلی، ۱۹۷۰ء
۳۔ نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی	عبدلقوی دسنوی	بھوپال، ۱۹۷۰ء
۴۔ غالب ـ شاعرِ امروز و فردا	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	لاہور، ۱۹۷۰ء
۵۔ غالب نام آورم	نادم سیتاپوری	لاہور، ۱۹۷۰ء
۶۔ خیابانِ غالب	نادم سیتاپوری	کراچی، ۱۹۷۰ء
۷۔ غالب کے کلام میں الحاقی عناصر	نادم سیتاپوری	کراچی، ۱۹۷۰ء
۸۔ نذرِ غالب	ڈاکٹر وحید قریشی	لاہور، ۱۹۷۰ء
۹۔ انٹرنیشنل غالب سیمینار (انگریزی)	ڈاکٹر یوسف حسین خاں (مرتب)	دہلی، ۱۹۷۰ء
۱۰۔ ذکرِ غالب، ذکرِ عبدالحق	سحر انصاری (مرتب)	کراچی، ۱۹۷۱ء
۱۱۔ ہم عصروں پر غالب کا اثر	ظفر ادیب	دہلی، ۱۹۷۱ء
۱۲۔ غالب ـ دی پوئٹ اینڈ ہز ایج	رالف رسل (مرتب)	کیمبرج، ۱۹۷۲ء
۱۳۔ غالب اور ذکا	ضیاء الدین احمد شکیب	دہلی، ۱۹۷۲ء
۱۴۔ غالب ببلیوگرافی	ڈاکٹر محمد انصار اللہ	علی گڑھ، ۱۹۷۲ء
۱۵۔ تلمیحاتِ غالب	محمود نیازی	دہلی، ۱۹۷۲ء
۱۶۔ غالبیات کے چند مباحث	ڈاکٹر ابو محمد سحر	لکھنؤ، ۱۹۷۳ء
۱۷۔ غالب اور اُن کے معترضین	سید لطیف الرحمٰن	کلکتہ، ۱۹۷۳ء

۱۸۔ قاطع برہان کا پہلا مسودہ	امتیاز علی خاں عرشی	دہلی، ۱۹۷۴ء
۱۹۔ غالب اور شاہانِ تیموریہ	ڈاکٹر خلیق انجم	دہلی، ۱۹۷۴ء
۲۰۔ غالب اور انقلاب ستاون	ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	لاہور، ۱۹۷۴ء
۲۱۔ غالب اور سرور	ایم۔ حبیب خاں	دہلی، ۱۹۷۵ء
۲۲۔ غالب۔ ابتدائی دور	ڈاکٹر خورشید الاسلام	دہلی، ۱۹۷۵ء
۲۳۔ بیاضِ غالب۔ تحقیقی جائزہ	کمال احمد صدیقی	سری نگر، ۱۹۷۶ء
۲۴۔ رموزِ غالب	ڈاکٹر گیان چند	لاہور، ۱۹۷۶ء
۲۵۔ غالب اور انقلاب ستاون	ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	لاہور، ۱۹۷۶ء
۲۶۔ غالب اور بنگال	ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ	کلکتہ، ۷۷ء۱۹
۲۷۔ فسانۂ غالب	مالک رام	دہلی، ۱۹۷۷ء
۲۸۔ متعلقاتِ غالب	کالیداس گپتا رضا	بمبئی، ۱۹۷۸ء
۲۹۔ غالب تقلید اور اجتہاد	ڈاکٹر خورشید الاسلام	علی گڑھ، ۱۹۷۹ء
۳۰۔ مطالعۂ خطوطِ غالب	عبد القوی دسنوی	لکھنؤ، ۱۹۷۹ء
۳۱۔ غالب کے معنوی اساتذہ	ظفر ادیب	دہلی، ۱۹۸۰ء
۳۲۔ خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ	کاظم علی خاں	لکھنؤ، ۱۹۸۱ء
۳۳۔ غالب اور صفیر بلگرامی	مشفق خواجہ	کراچی، ۱۹۸۱ء
۳۴۔ تحقیقِ غالب	ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	کراچی، ۱۹۸۱ء
۳۵۔ غالب اور عصرِ غالب	ڈاکٹر محمد ایوب قادری	کراچی، ۱۹۸۲ء

ان تحقیقی مزاج کی کتابوں میں سے نمبر ۵، ۷ اور ۸، ۱۹۷۰ء سے پہلے کی مطبوعات کے نئے ایڈیشن ہیں۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام کی کتاب (کتابیں نمبر ۲۲ اور ۲۹) دراصل ان کی کتاب (طبع اول ۱۹۶۰ء) کے اس دہائی کے دو ایڈیشن ہیں جو الگ الگ کتابی نام سے شائع ہوئے ہیں۔ کتاب نمبر ۲۵ "غالب اور انقلاب ستاون" کتاب نمبر ۲۰ کا نظرِ ثانی کے بعد اضافہ شدہ ایڈیشن ہے۔ اس پر رشید حسن خاں سے ان الفاظ میں داد ملی: "غالب اور انقلاب ستاون" کو لفظ بہ لفظ پڑھا۔ بلا شائبۂ تکلف کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے یہ کام نہایت درجہ سلیقے اور اہتمام کے ساتھ انجام دیا ہے۔ سلسلۂ غالبیات میں جو چند کتابیں واقعتاً قابلِ ذکر قرار پائیں گی، اُن میں اس تالیف کا شمار ضرور کیا جائے گا اور یہ بڑی بات ہے ——۔" میرے لیے یہ "واقعتاً بڑی بات ہے" ان معنی میں کہ کلمات رشید حسن خاں کے ہیں جو "ہند تا سند" اپنی سخت گرفت کے لیے بہت شہرت رکھتے ہیں۔ اگر یہ استثنیٰ نہیں تو پھر میں نے رشید حسن خاں کے قلم کو رسمی جملوں یا روایتی تعریف سے کبھی آلودہ نہیں پایا! اور یہ کچھ کم بڑی بات نہیں!!

ان کتابوں میں جو اپنے غالب رنگ اور رویے کی بنا پر مجھے "تحقیق" سے زیادہ ہم آہنگ دکھائی دیتی ہیں، دو کتابیں بالخصوص "نادرات" میں شمار ہونی چاہیئے "بیاضِ غالب۔ تحقیقی جائزہ" (کمال احمد صدیقی) اپنی بہت زیادہ اور بے جواز قیمت کے باعث جو پانچسو روپے ہے اور پرتھوی چندر کی کتاب "جاگیرِ غالب" کا نسخہ (مطبوعہ دہلی، ۱۹۷۰ء، صفحات ۳۱۱)، کہ یہ کتاب چھپی ضرور لیکن بشکل موجودہ شائع

نہیں کی گئی، بوجوہ ضایع کردی گئی یہاں تحدیث نعمت کے طور پر یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ "بیاض" کے لیے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے التفات اور "جاگیر" کے لیے خود پرتھوی چندر جی کے لطفِ خاص کا منت پذیر ہوں۔

"غالب اور صفیر بلگرامی" میں نہ صرف غالب اور صفیر کے تعلقات کی تفصیلات آگئی ہیں بلکہ مشفق خواجہ نے تا بحدامکان غالب اور صفیر کی ساری متعلقہ تحریروں کو یکجا کر دیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے مکاتیب غالب بنام صفیر اور مکاتیب صفیر بنام غالب پہلی بار صحیح تر صورت میں سامنے آئے ہیں۔ اس ضمن میں متنی تقابل کے لیے "عود ہندی" طبع اول کے بجائے ایک نسبتاً نئے نسخے کو بنیاد بنایا گیا ہے اس سے بچا جا سکتا تو اچھا تھا۔

صفیر بلگرامی نے "جلوۂ خضر" میں غالب کے ایک مختصر رسالے کا ذکر کیا ہے جو اردو زبان کی تحقیق کے حال میں غالب نے ۱۸۶۲ء میں لکھا تھا، یہ اب معدوم ہے۔ مشفق خواجہ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۱ کے حاشیے میں صفیر بلگرامی کے اس بیان کو درست تسلیم نہیں کیا، صرف اس لیے کہ یہ رسالہ اب ملتا نہیں ہے' ایک معاصر عینی شہادت کی موجودگی میں بلا دلیل، اس شہادت کی تردید، مزید غور و فکر چاہتی ہے۔

مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ اس رسالے سے مراد "نکات غالب" ہے جو رقعاتِ غالب کے ساتھ ۱۸۶۷ء میں چھپا تھا۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ "نکاتِ غالب"، "پنج آہنگ" (مطبوعہ) کے "آہنگ دوم" (مشفق خواجہ نے سہواً اسے "آہنگ چہارم" بتایا ہے) کا ترجمہ ہے جو فارسی قواعد سے متعلق ہے ۔۔۔ جبکہ صفیر بلگرامی نے جس رسالے کو غالب سے لے کر دیکھا اور پڑھا وہ اُردو زبان کے ظہور کے حال میں لکھا گیا تھا۔

مشفق خواجہ عصرِ حاضر کے سر برآوردہ محققین میں ہیں۔ مطالعے کی وسعت اور ترتیب و تدوین میں حد درجہ کا سلیقہ اور احتیاط اُن کی ایسی نمایاں خصوصیت ہے جو انھیں ہم عصر محققین کی صف میں بھی نمایاں تر بناتی ہے۔ اُن کی کتاب "غالب اور صفیر بلگرامی" غالبیات کے تحقیقی اور تدوینی سرمائے میں ایک اہم اضافہ ہے۔

اس سلسلے کی ایک کتاب "تحقیق غالب" ہے جسے دور و نزدیک، "تنقید و تحقیق، دونوں شعبوں کے اہل نظر نے قابل التفات ٹھیرایا۔ کسی ادبی خدمت گزار کے لیے اس سے بڑا انعام اور کیا ہوگا!

"پچھلے پندرہ سال میں نہ صرف پچھلے دور کے کرتے ہوئے معیارِ تحقیق کی تلافی تین ناموں نے کردی ہے بلکہ یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ جب تک کسی شخص میں تحقیق کا فطری جوہر اور بنیادی خصوصیات موجود نہ ہوں گی تحقیق میں کوئی قابل ذکر ممکن نہیں۔ میری مراد ڈاکٹر سید معین الرحمن ڈاکٹر جمیل جالبی اور مشفق خواجہ کے ناموں سے ہے جنہوں نے اپنے متقدم پیشروؤں قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی، مالک رام اور ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کی روایت کو برقرار رکھا ہے بلکہ اپنے قابل قدر تحقیقی کاموں میں تنقید کا جوہر بھی شامل رکھا ہے۔۔۔۔"

ڈاکٹر سید معین الرحمن کا تازہ تحقیقی کارنامہ "تحقیق غالب" نہ صرف اُن کی دقتِ نظر، علمی دیانتداری، اور سلیقے کی ایک اہم مثال بن کر سامنے آیا ہے بلکہ یہ تنقید کی بھی صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ہر اعتبار سے غالب کے بارے میں ایک تازہ اور آئندہ زندہ رہنے والے مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ قابل قدر ہے۔ اس میں غالب پر تنقید اور تحقیق کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو نہ صرف تشنہ تھے بلکہ معین صاحب نے بعض بالکل نئے پہلوؤں کو بھی بے نقاب کیا ہے ۔۔۔۔" (پروفیسر شمیم احمد، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ)

ڈاکٹر خلیق انجم کے بقول "غالب کے محققین میں ڈاکٹر سید معین الرحمن سب سے کم عمر محقق ہیں۔ وہ پچھلے دس پندرہ سال سے غالب کی شخصیت، سیرت اور فن پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ غالب پر ان کی دو کتابیں "اشاریۂ غالب" اور "غالب اور انقلاب ستاون" غیر معمولی شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ غالب پر اُن کی تیسری کتاب "تحقیق غالب" اُن کے دس تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ وہ ایک باصلاحیت اور ذمہ دار

محقق ہیں اور اپنے موضوع کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے بہت سی نئی باتیں کہی ہیں لیکن وہ نئی باتیں کہنے کے شوق میں حقایق کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کرتے۔ پاکستان میں غالب محققین میں اُن کا نام سرفہرست ہے ــــ[۱]، کاش واقعتاً ایسا ہی ہوتا !!

(۱۱)

جامعاتی مقالات متعلق بہ غالب: مطالعۂ غالب کی دوسری صدی کے ابتدائی بارہ برسوں میں "غالب" اور "عہد غالب"، جامعات کا بڑا محبوب موضوع رہا۔ اس عرصے میں پاکستان اور ہندوستان میں غالب سے متعلق کم از کم پانچ مقالات پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے مکمل ہوئے:

۱۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	غالبیات کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ	سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۲ء
۲۔ ڈاکٹر حسن امام	غالب کی شاعری میں استعاراتی نظام	۱۹۷۸ء
۳۔ ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	اُردو کے ادبی معرکے۔ انشا سے غالب تک	دہلی، ۱۹۷۹ء
۴۔ ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی	اُردو شعرا کی فارسی اور اردو شاعری کا تقابلی مطالعہ	سندھ یونیورسٹی، ۱۹۷۴ء
۵۔ سبحان کور	اُردو ادبی تنقید میں غالب شناسی کا مطالعہ	کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۷۸ء

پہلا مقالہ (۱۹۷۲ء) جو غالب سے متعلق سی پاکستانی یونیورسٹی کا اب تک پہلا مقالہ بھی ہے۔ دو الگ الگ جلدوں میں "غالب کا مستقل تصنیفی سرمایہ" اور "غالب کا متفرق تصنیفی سرمایہ" کے عنوان سے زیرِ طبع ہے ــــ ڈاکٹر حسن امام کو ہندوستان کی کسی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ ڈگری تفویض ہوئی ہے لیکن کس یونیورسٹی سے؟ اس ضمن میں میرا ماخذ خاموش ہے[۲]۔

ڈاکٹر محمد یعقوب عامر کا تحقیقی مقالہ "اُردو کے ادبی معرکے" کے عنوان سے کتابی صورت میں چھپ چکا (ص ۴۴۸)۔ یہ مقالہ براہِ راست غالب پر نہیں، مقالہ نگار نے انشا سے غالب تک کے زمانے کے ادبی معرکوں کا سائنٹفک انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ پانچ ابواب کے اس مقالے کا چوتھا باب غالب و ذوق، غالب و حامیانِ قتیل، غالب اور حامیانِ برہان قاطع کے ادبی معرکوں کا احاطہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے بقول: "ڈاکٹر یعقوب نے بڑی محنت اور دیدہ (وری) سے اس موضوع پر تحقیقی مواد اکٹھا کیا ہے اور غیر جانبدار ہو کر نتائج اخذ کیے ہیں۔ اُنھوں نے معرکوں میں شریک ہونے والوں کی تخلیقات کا تجزیہ اس طرح کیا ہے کہ ان لوگوں کی شخصیت کے اہم پہلو ہمارے سامنے (آجاتے ہیں)، جو مستقبل کے نقادوں کی رہنمائی کرسکیں گے ــــ[۳]"

ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی کا مقالہ بھی اگرچہ براہِ راست غالب کے بارے میں نہیں لیکن اس کا ایک حصہ یقیناً غالب کی فارسی اور اردو شاعری کے تقابلی مطالعے پر مبنی ہوگا۔ سبحان کور نے "اُردو ادبی تنقید میں غالب شناسی کا مطالعہ" کے موضوع پر اپنا مقالہ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی نگرانی میں مکمل کیا اور شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی میں ۱۹۷۸ء میں ڈگری کے لیے داخل کیا[۴]۔ خیال ہے کہ اب تک اس پر ڈگری تفویض ہو چکی ہوگی۔

اس دہائی میں ہندوستان اور پاکستان کی کوئی دس مختلف یونیورسٹیوں میں دس بارہ ریسرچ اسکالرز غالب پر دادِ تحقیق دینے میں مصروف رہے ہیں:

۱۔ ہفتہ وار ہماری زبان، دہلی یکم جون ۱۹۸۲ء، ص ۳

۲۔ ہماری زبان، دہلی ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۲ء ص ۶

۳۔ ہماری زبان، دہلی یکم جون ۱۹۷۹ء، ص ۴

۴۔ سہ ماہی جامعات ہند، دہلی شمارہ ۳-۴ سال ۱۹۸۰ء ص ۲۷

۱۔ غوث محمد خاں	اُردو غزل میں تخلیقی عمل کا مطالعہ غالب کے خصوصی حوالے کے ساتھ	لکھنؤ، ۱۹۷۶ء
۲۔ نشاط بادی	انیسویں صدی کے ہندوستانی افکار کی روشنی میں غالب کی اردو شاعری کا مطالعہ	الٰہ آباد، ۱۹۷۶ء
۳۔ سید تبین الرحمٰن	اردو میں غالبیات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ[1]	بھوپال، ۱۹۷۶ء
۴۔ محمد موسیٰ خاں (موسیٰ مجروح)	غالب کی نثر	گورکھپور، ۱۹۷۶ء
۵۔ جمیلہ عباسی	خطوطِ غالب کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ	لکھنؤ، ۱۹۷۶ء
۶۔ سید ابوالعاصم	خطوطِ غالب کی روشنی میں غالب کا نثری اسلوب	دہلی، ۱۹۷۹ء
۷۔ محمد رفیع انصاری	خطوطِ غالب کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ	بنارس ہندو یونیورسٹی، ۱۹۷۶ء
۸۔ عبدالغنی فاروقی	ناقدینِ غالب	سری وینکٹیشور یونیورسٹی تروپتی، ۱۹۷۶ء
۹۔ صبیحہ انور	غالب کا غیر متداول کلام[2]	لکھنؤ، ۱۹۷۶ء
۱۰۔ طیبہ صدیقہ	غالب کا عہد	کلکتہ، ۱۹۷۹ء
۱۱۔ محمد ایوب	شارحینِ دیوانِ غالب (اردو) کی شروح کا تقابلی مطالعہ	پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۸۰ء
۱۲۔ کاظم علی خاں	غالب کا ادبی شعور۔ نثری تصانیف کے آئینے میں	لکھنؤ، ۱۹۷۹ء

ان اسکالرز میں سے بارھویں کھلاڑی کاظم علی خاں کا علمی ذوق تو اب بھی انھیں 'ڈاکٹر' بنائے ہوئے ہے، جلد یا بدیر رسم بھی یقین ہے کہ پوری ہو جائے گی اور عجب نہیں کہ پوری ہو بھی چکی ہو! 'فرسٹ الیون' کے لیے اچھی دعائیں اور تمنائیں!!

اِس عرصے میں غالب کے معاصرین اور تلامذہ بھی تحقیق کا موضوع رہے:

۱۔ ممنون۔ حیات اور شاعری	ڈاکٹر صدیقہ ارمان	کراچی، ۱۹۷۵ء
۲۔ امام بخش صہبائی۔ شخص، شاعر اور شارح	ڈاکٹر خواجہ محمد حامد	بمبئی، ۱۹۷۱ء
۳۔ صوفی منیری کی نثر نگاری	ڈاکٹر طیبہ ابدالی	پٹنہ، ۱۹۷۳ء
۴۔ عزیز صفی پوری۔ حیات اور ادبی خدمات	مسز ممتاز جہاں	لکھنؤ، ۱۹۷۹ء
۵۔ میر مہدی مجروح	محمد فیروز دہلوی	دہلی، ۱۹۸۱ء

اسی حدِ زمانی میں کم از کم پانچ معروف غالب شناسوں پر پی ایچ۔ ڈی کی سطح کا کام مکمل ہوا:

۱۔ نظم طباطبائی۔ حیات اور کارنامے	ڈاکٹر اشرف رفیع	جامعہ عثمانیہ، ۱۹۷۳ء
۲۔ رشید احمد صدیقی۔ طنز و ظرافت	ڈاکٹر اقبال اختر	پٹنہ، ۱۹۷۵ء
۳۔ حامد حسن قادری۔ احوال و آثار	ڈاکٹر نور محمد سرور اکبر آبادی	سندھ یونیورسٹی، ۱۹۸۱ء
۴۔ محی الدین قادری زور۔ احوال و آثار	ڈاکٹر نزہت اکرام	پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۸۲ء
۵۔ حمید احمد خاں۔ احوال و آثار	ڈاکٹر محمد احسان الحق	کراچی، ۱۹۸۲ء

اِس عرصے (۱۹۷۰ء۔ ۱۹۸۲ء) میں بعض دوسرے غالب شناس بھی تحقیق کا ہدف رہے:

---

[1] کتاب نما، دہلی، مئی ۱۹۷۹ء، ص ۲۱۔ ایک دوسرے ماخذ کے مطابق مقالہ نگار کا نام سید مطیع الرحمٰن (نوید، علی گڑھ یونیورسٹی گیا، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۴۷)

[2] کتاب نما، دہلی، مئی ۱۹۷۶ء، ص ۳۲۔ ایک دوسرے ماخذ (نوید، گیا، جون ۱۹۷۹ء، ص ۵۵) کے مطابق مقالہ نگار کا نام صبیحہ وجاہت۔

۱۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب — احوال و آثار	طاہر تونسوی	پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۷۷ء
۲۔ مسعود حسن رضوی ادیب — ادبی رویوں اور تنقیدی و تحقیقی خدمات کا تجزیاتی مطالعہ :	وسیم آرار	جامعہ ملیہ دہلی، ۱۹۷۹ء
۳۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب اور اردو ادب میں اُن کی خدمات :	چودھری محمد فہیم	لکھنؤ، ۱۹۷۶ء
۴۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ حیات اور ادبی خدمات	عائشہ صدیقہ عباسی	جامعہ ملیہ دہلی، ۱۹۷۹ء
۵۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں — احوال و آثار	شبیہہ کاظمی	پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۸۰ء
۶۔ عبدالرحمٰن بجنوری کی ادبی خدمات	نیّر سلطانہ صدیقی	علی گڑھ، ۱۹۷۶ء
۷۔ حامد حسن قادری بحیثیت ادبی مؤرخ	آصفہ بیگم چشتی	دہلی، ۱۹۷۹ء
۸۔ اثر لکھنوی — حیات اور شاعری	عبدالرب	لکھنؤ، ۱۹۷۹ء
۹۔ غلام رسول مہر — احوال و آثار	شفیق احمد	پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۸۰ء
۱۰۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ حیات و فن	نثار احمد قریشی	پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۷۸ء
۱۱۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ حیات اور فن	کے۔ بشیر احمد	سری وینکٹیشور یونیورسٹی ترو پتی، ۱۹۷۶ء
۱۲۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ حیات و کارنامے	ابرار احمد	لکھنؤ، ۱۹۷۹ء

طاہر تونسوی نے مقالہ ڈگری کے لیے پیش کر دیا ہے، اس کے ممتحن مقرر ہو چکے ہیں —— باقی گیارہ اسکالرز میں سے کچھ نے کام تقریباً مکمل کر لیا ہے، بعض تکمیلِ کار میں مصروف ہیں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ان میں سے کچھ دفترِ شوق لپیٹ یا سمیٹ چکے ہوں۔

پچھلے بارہ تیرہ برس میں، اعلیٰ علمی اسناد کے لیے مختلف یونیورسٹیوں میں جو تحقیقی اور تنقیدی کام ہوا، اس کا بیشتر حصہ اشاعت کا منتظر ہے۔ اس نوع کے آٹھ مقالات/ تہیدات جو ابھی چھپے نہیں ہیں، میرے ذخیرۂ غالبیات میں موجود ہیں ۔

(الف) پی ایچ۔ ڈی ۱۹۷۰ء

○ "غالبیات کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ" از : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

نگران کار : ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی، جامشورو (حیدر آباد) صفحات ۷۸۸

(ب) ایم۔ اے اردو ۱۹۷۰ء — ۱۹۷۸ء

۱۔ غالب کی امیجری (ص ۲۴۴)	زرینہ خٹک	نگران : ڈاکٹر عبادت بریلوی	پنجاب یونیورسٹی لاہور،	۱۹۷۰ء
۲۔ اردو رسائل کے غالب نمبر۔ اشاریہ (ص ۲۱۸)	شمیم اختر	" : ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی	ایضاً	۱۹۷۰ء
۳۔ کلامِ غالب میں فکری عناصر (ص ۱۱۹)	صابرہ بانو	" : سجاد باقر رضوی	ایضاً	۱۹۷۴ء
۴۔ مطالعۂ غالب بیسویں صدی میں (۲۰۱)	نجمہ نیاز	" : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	گورنمنٹ کالج فیصل آباد،	۱۹۷۴ء
۵۔ ڈاکٹر ایس۔ ایم اکرام بطور غالب شناس (ص ۲۱۰)	قمر النساء شیخ	" : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	ایضاً	۱۹۷۴ء
۶۔ مولانا غلام رسول مہر بطور غالب شناس (ص ۲۶۳)	نیّر سلطانہ	" : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	ایضاً	۱۹۷۴ء
۷۔ غالب اور حالی کا تحقیقی مطالعہ (ص ۱۴۰)	ناہید اختر، شاہدہ شاہین، خالدہ حق، زبیدہ افشاں، انجم زینت	نگران کار : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن		۱۹۷۸ء

یہاں صرف مؤخر الذکر کام کے بارے میں مجھے کچھ کہنا ہے: ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۰ء تک میں نے منجملہ دیگر کورسز، شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج فیصل آباد (لائل پور) میں ایم۔اے (اردو) کے ایک سمسٹر کورس "اصول تحقیق و تدوین" کی تدریس کی خدمت بھی انجام دی۔ ۱۹۷۸ء میں اس کورس کی تفویضات (ASSIGNMENTS) کے لیے میں نے کلاس کو پانچ پانچ کے گروپس میں تقسیم کر کے ہر گروپ سے موضوعاتی مناسبت سے مختلف تحقیقی جائزے مرتب کرائے — "غالب اور حالی کا تحقیقی مطالعہ" اس کورس کی ہوم ایسائن مینٹس کے طور پر طور پر لکھے گئے غالب اور حالی کے بارے میں پانچ اہم تحقیقی کتابوں کے تحقیقی جائزوں مشتمل ہے:

۱۔ شہنشاہِ سخن غالب کے فارسی کلام پر ناقدانہ نظر (ڈاکٹر عارف شاہ گیلانی)	جائزہ نگار:	ناہید اختر
۲۔ غالب اور انقلاب ستاون (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)	مقالہ:	شاہدہ شاہین
۳۔ حالی بحیثیت شاعر (ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی)	مقالہ:	خالدہ حق
۴۔ حالی کی اردو نثر نگاری (ڈاکٹر عبدالقیوم)	مقالہ:	زبیدہ افشاں
۵۔ حالی کا سیاسی شعور (ڈاکٹر معین احسن جذبی)	مقالہ:	اعجاز حنیف

غالب اور حالی کے بارے میں یہ پانچ کتابیں جنہیں وادیِ تحقیق کے نوآموز متعلمین نے اپنے مطالعے کے لیے منتخب کیا، ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۴ء کے درمیانی عرصے میں لکھی گئیں۔ ان میں سے ایک پر داؤد ادبی انعام دیا گیا جو پاکستان میں تحقیق و تنقیدِ ادب کا سب سے بڑا ادبی اعزاز ہے اور چار پر بمبئی، لکھنؤ، کراچی اور علی گڑھ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگریاں تفویض ہوئیں۔ اس عقب میں ان پانچ کتابوں کو غالب اور حالی پر پچھلی ایک چوتھائی صدی کے نمایاں ترین تحقیقی اکتساب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ خوشی اور اطمینان کی بات یہ ہے کہ ان نوخیز مقالہ نگاروں نے کتابوں کے انتخاب میں خوش نظری کا ثبوت دیا اور ان سب کو اپنے تحقیقی جائزوں کے نتائج کا اظہار کرنے کے لیے منضبط اور مؤثر پیرایۂ بیان میسر آیا۔

(۱۲)

متفرقاتِ غالب: اس دہائی میں متعدد ایسی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں جو براہِ راست غالب کے بارے میں نہیں لیکن جن کا غالب حصہ غالبیات سے متعلق ہے۔ یا کچھ ایسی تخلیقی تصنیفات بھی جو غالب کے سوانح کے ذیل میں نہیں آتیں، نہ انتخاب نہ شرح، نہ ترجمہ، نہ تنقید یا تحقیق — لیکن یہ ادب غالب ہی کا قابلِ قدر حصہ ہیں:

۱۔ غالب کا پیار (ڈراما)	مرزا صادق بیگ پارس	بمبئی، ۱۹۷۰ء
۲۔ تذکرۂ غالب و "غالب پسند" آم	غلام حسین راز گجراتی	گجرات، ۱۹۷۳ء
۳۔ تماشا اور تماشائی (غالب پر ایک اسٹیج ڈراما)	ڈاکٹر محمد حسن	دہلی، ۱۹۷۵ء
۴۔ غالب کون ہے (ڈراما)	سید محمد مہدی	دہلی، ۱۹۸۰ء
۵۔ غالب کی دلی (رپورتاژ، خاکے، انشائیے)	سید ضمیر حسن دہلوی	دہلی، ۱۹۷۷ء
۶۔ غالب کے نئے خطوط (غالب کے اسلوب میں)	ڈاکٹر انور سدید	سرگودہا، ۱۹۸۲ء
۷۔ پیامبرِ مغفرت، مخزنِ نعت مقبول (غالب کی تمام غزلوں پر نعتوں کا مجموعہ):	ابوالعجز ساجد اسدی	کراچی، ۱۹۷۵ء
۸۔ مدحتِ خیر البشر (غالب کی زمینوں میں نعتیں)	راغب مراد آبادی	کراچی، ۱۹۷۹ء

۹۔ پیکرِ تصویر (ہم طرح غالب)	سید محمد ظفر ترمذی	جھنگ، ۱۹۸۰ء
۱۰۔ فیضانِ غالب (غالب کے شاگردوں کے کلام کا انتخاب)	عرشی ملسیانی	دہلی، ۱۹۷۷ء
۱۱۔ ارمغانِ ایران	ڈاکٹر وحید قریشی (مرتب)	لاہور، ۱۹۷۱ء
۱۲۔ اردو تحقیق اور مالک رام	شاہد اعظمی (مرتب)	دہلی، ۱۹۷۵ء
۱۳۔ تحریکِ جدوجہاد بطور موضوعِ سخن	خواجہ منظور حسین	لاہور، ۱۹۷۸ء
۱۴۔ گنجینۂ تحقیق	سید احمد بیخود موہانی	لکھنؤ، ۱۹۷۹ء

ایران کے جشنِ دو ہزار و پانصد سالہ مناسبت سے ڈاکٹر وحید قریشی کا مُرتبہ "ارمغانِ ایران" (صفحات ۲۰۲) رسالہ "صحیفہ" (لاہور) میں ادبیاتِ فارسی سے متعلق چھپنے والے مقالات کے ایک مختصر انتخاب پر مشتمل ہے۔ سات منتخب مقالات میں سے چار (ص ۹۸ تا ۱۸۱) غالب کی زندگی اور ان کے فکر و فن کے بارے میں ہیں۔

شاہد اعظمی کے مُرتبہ مجموعۂ مضامین "اردو تحقیق اور مالک رام" (صفحات ۱۸۳) کے بارہ مضامین میں سے سات ابتدائی مضامین (۱-۷۵ صفحات) مالک رام کی تالیفات متعلق بہ غالب کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ "گنجینۂ تحقیق" (صفحات ۳۴۵) سید احمد بیخود موہانی کے پانچ تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے جس کے ابتدائی تین مقالات (= ۸۹ صفحات) "غالبِ عدیم المثال کے اُن احسانات کا حق ادا کرنے کی نظر سے لکھے گئے ہیں جو انھوں نے اردو علم و ادب پر کیے ہیں ــــــ"

پروفیسر خواجہ منظور حسین کی فکر انگیز کتاب "تحریکِ جدوجہاد بطور موضوعِ سخن" (صفحات ۷۷۶)، براہِ راست غالب کے بارے میں نہیں ہے لیکن اس کا بڑا حصہ غالب کے حوالے سے مباحث نے گھیرا ہے (غالب: صفحہ ۴۰-۶۱، ۲۷۰-۵۵۴، ۵۷۶-۵۷۷، ۵۸۶-۶۰۶، ۶۱۱-۶۳۱، ۶۶۶-۷۰۵، اور ۷۲۶ تا ۷۳۹)

یہ کتاب خواجہ منظور حسین کے مدۃ العمر کے غور و فکر اور دیدہ ریزی کا ثمر ہے۔ فاضل مؤلف اور مفکر نے اُن جذبات اور خیالات کے سرچشمے تک پہنچنے کی منضبط جستجو کی ہے جو غالب اور اُن کے ہم عصر شاعروں کے دماغ میں پکتے اور اُن کے کلام میں اُبلتے رہے۔

اس خیال افروز تالیف میں سید احمد شہید، شاہ اسمٰعیل شہید اور مولوی فضل حق کے ساتھ غالب کے رشتوں کی پیچ در پیچ گتھیاں کھولی گئی ہیں اور اُن کی شاعری کے لفظی و معنوی در و بست کو ٹٹول کے اُن کے جذباتی و فکری اتار چڑھاؤ کی روداد اور اس کے نفسی مضمرات کا تجزیہ کیا گیا ہے اور بعض تصفیہ طلب امور طے کیے گئے ہیں۔ خواجہ منظور حسین کی یہ کتاب کشف و انکشاف کے ایک جہانِ تازہ ہی میں نہیں لے جاتی، ایک اندازِ نظر بھی فراہم کرتی ہے جس کی روشنی میں پورے شعر و ادب کا از سرِ نو مطالعہ کرنے کی ضرورت کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے۔

(۱۳)

متعلقاتِ غالب: اس دہائی میں بعض علمی کتابوں میں غالب سے متعلق الگ حصے بھی قائم کیے گئے یا کچھ صفحات مخصوص کیے گئے، مثلاً:

۱۔ شان الحق حقی:	نکتۂ راز، کراچی، ۱۹۷۲ء	(تنقیدات صفحہ ۱۲۹-۱۵۱ و ص ۳۲۹-۳۶۲)
۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا:	نئے مقالات، لاہور، ۱۹۷۲ء	(مطالعۂ غالب، صفحہ ۲۵۵-۳۱۱)
۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی:	شعر، غیر شعر اور نثر، الٰہ آباد، ۱۹۷۳ء	(بسلسلۂ غالب، صفحہ ۲۷۴-۳۴۳)
۴۔ کالی داس گپتا رضا:	سہو و سراغ (مرتب: صابر دت)، بمبئی، ۱۹۸۰ء	(غالبیات، صفحہ ۱۹۵-۲۱۴)
۵۔ احمد ندیم قاسمی (مرتب):	نذرِ حمید احمد خاں، لاہور، ۱۹۸۰ء	(مرزا غالب، صفحہ ۳۲۳-۳۷۱)

پچھلے دس بارہ برس میں غالب کے معاصرین کے بارے میں بھی کتابیں شائع ہوئیں (عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کی کتاب مفتی صدرالدین آزردہ، دہلی، ۱۹۷۷ء)، تلامذہ غالب سے متعلق بھی (مظہر معانی دیوان مجروح، مرتبہ: ریاض احمد، لاہور ۱۹۷۸ء)، عہدِ غالب پر بھی (خدنگ نظر: معین الدین حسن خان، متعارفہ: خواجہ احمد فاروقی، دہلی، ۱۹۷۲ء) خانوادۂ غالب کے بارے میں بھی (خاندان لوہارو کے شعرا، حمید و سلطان احمد، دہلی، ۱۹۸۱ء)۔

اس حدِ زمانی (۱۹۷۰ء-۱۹۸۲ء) میں غالب کے معاصرین پر پی ایچ. ڈی/ ڈی لٹ کی سطح کے تحقیقی اور تدوینی کام کو بھی صورتِ اشاعت نصیب ہوئی؛

۱۔ ممنون دہلوی۔ حیات، شخصیت اور شاعری	ڈاکٹر منشا الرحمٰن خاں منشا	ناگپور، ۱۹۷۲ء
۲۔ مومن۔ شخصیت اور فن	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	دہلی، ۱۹۷۲ء
۳۔ ناسخ۔ حیات و تصانیف	ڈاکٹر محمد صدر الحق	کراچی، ۱۹۷۹ء
۴۔ کلیاتِ ذوق (اردو) ترتیب	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	دہلی، ۱۹۸۰ء

بعض معروف غالب شناس اہل علم پر تحقیقی و تنقیدی مقالے بھی شائع ہوئے:

۱۔ نیاز فتحپوری	ڈاکٹر امیر عارفی	دہلی، ۱۹۷۷ء
۲۔ اثر لکھنوی۔ حیات اور کارنامے	محمود خاور	حیدرآباد دکن، ۱۹۷۷ء

تلامذۂ غالب پر تحقیقی کام بھی منظرِ عام پر آیا۔ حالی سے قطع نظر، مثلاً: غالب کا عظیم المرتبت شاگرد صفیر بلگرامی۔ حیات و کارنامے" (مطبوعہ کلکتہ جون ۱۹۷۶ء) پر ڈاکٹر ظفر امام گانوی کو پٹنہ یونیورسٹی سے پی ایچ. ڈی کی ڈگری ملی۔ شارحینِ غالب پر بھی تحقیق ہوئی۔ حسرت موہانی سے قطع نظر مثلاً نظم طباطبائی۔ حیات اور کارناموں کا تنقیدی مطالعہ" (مطبوعہ حیدرآباد دکن دسمبر ۱۹۷۳ء) ڈاکٹر اشرف رفیع کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر اُنھوں نے جامعہ عثمانیہ سے ڈاکٹریٹ پایا۔

اِس عرصے میں برعظیم پاک و ہند کے بہت سے معروف اور ممتاز غالب شناسوں سے محرومی کا داغ بھی سہنا پڑا۔ بعض اسما رحافظے پر زور دیے بغیر نوکِ قلم پر آتے ہیں:

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف	حیدرآباد دکن،	۴ر نومبر ۱۹۷۱ء	۹۔ سید وقار عظیم	لاہور،	۱۷ر نومبر ۱۹۷۶ء
۲۔ مولانا غلام رسول مہر	لاہور	۱۶ر نومبر ۱۹۷۱ء	۱۰۔ تحسین سروری	کراچی،	۷ر دسمبر ۱۹۷۶ء
۳۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی	الہ آباد	۲۸ر جولائی ۱۹۷۲ء	۱۱۔ رشید احمد صدیقی	علی گڑھ،	۵ار جنوری ۱۹۷۷ء
۴۔ ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ اکرام	لاہور	۱۷ر جنوری ۱۹۷۳ء	۱۲۔ مسلم ضیائی	کراچی،	۵ر جون ۱۹۷۷ء
۵۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری	کراچی	۱۹ر مارچ ۱۹۷۳ء	۱۳۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم	لاہور،	۷ر فروری ۱۹۷۸ء
۶۔ حمید احمد خاں	لاہور	۲۲ر مارچ ۱۹۷۴ء	۱۴۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں	دہلی،	۲۱ر فروری ۱۹۷۹ء
۷۔ عبدالرحمٰن چغتائی	لاہور	۱۷ر جنوری ۱۹۷۵ء	۱۵۔ سید وزیر الحسن عابدی	لاہور،	۲۹ر جون ۱۹۷۹ء
۸۔ مسعود حسن رضوی ادیب	لکھنؤ	۲۹ر نومبر ۱۹۷۵ء	۱۶۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی	رامپور،	۲۵ر فروری ۱۹۸۱ء

ان غالب شناس بزرگوں کے انتقال پر اخبارات و رسائل نے اپنی اشاعتیں وقف کیں یا مقالات و مضامین کی اشاعت کا خاص اہتمام کیا، پی ایچ. ڈی کی سطح کا کام منظرِ عام پر آیا (رشید احمد صدیقی۔ شخصیت اور فن، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، مطبوعہ حیدرآباد دکن جون ۱۹۷۶ء) ان غالب شناس اصحاب کے بارے میں پی ایچ. ڈی کے لیے مقالے لکھے گئے یا لکھے جا رہے ہیں۔

ان اصحاب کے بارے میں کسی ڈگری کی قید سے آزاد سوانحی اور تنقیدی یا یادگاری کتابیں بھی آئیں (آپ بیتی۔ رشید احمد صدیقی، مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ۱۹۷۴ء، ۱۹۸۰ء، مطبوعہ دہلی ۱۹۷۷ء)۔ برعظیم پاک و ہند کے پہلے "غالب پروفیسر" سید وقار عظیم کے بارے میں کتاب: "سید وقار عظیم۔ سوانحی خاکہ" (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، اشاعت کراچی، ۱۹۸۰ء) یا مثلاً: مرزا جعفر حسین کی کتاب "مسعود حسن رضوی ادیب۔ حیات و خدمات" (مطبوعہ لکھنؤ، ۱۹۷۷ء)

اسی ذیل کا ایک قابلِ قدر مجموعہ "عبدالرحمٰن چغتائی۔ شخصیت اور فن" (مطبوعہ لاہور، مئی ۱۹۸۰ء) ہے۔ اسے ڈاکٹر وزیر آغا نے مرتب کیا ہے۔ اس ارمغان میں مختلف اہلِ قلم حضرات کے مضامین شامل ہیں۔ خود ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول "اس تالیف کا مقصد چغتائی کے فن کی توضیح سے کہیں زیادہ اُس کی رفعت اور عظمت کا اعتراف ہے۔ اب اس کے بعد اہلِ نظر چغتائی کے فن کا بھرپور مطالعہ کرنے کی طرف راغب ہوں گے اور اس سلسلے میں مضامینِ نو کے انبار لگاتے چلے جائیں گے۔۔۔"

اِسی نوع کا ایک یادگاری ارمغان "نذرِ حمید احمد خاں" ہے (مطبوعہ لاہور دسمبر ۱۹۸۰ء) جسے احمد ندیم قاسمی نے مرتب کیا ہے۔ انھوں نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "یہ مجموعۂ مقالات، اُن سب حضرات کی طرف سے، جن کے افکار اس کتاب میں شامل ہیں اور خود مرتب کی طرف سے مرحوم کی شخصیت کے حضور ایک نذرانۂ عقیدت ہے۔ وہ زندہ ہوتے تو اس کتاب کے مندرجات کے معیاروں کو یقیناً بہ نظرِ استحسان دیکھتے۔"

اس دہائی میں بعض دوسرے مسلّمہ غالب شناس احباب کے بارے میں بھی رسائل کے خاص نمبر چھپے یا اعترافی مجموعے مرتب ہوئے، مثلاً: "معاصر" (پٹنہ) کا "قاضی عبدالودود نمبر" اگست ۱۹۷۶ء، اور مالک رام کی پینسٹھویں سالگرہ پر پیش کئے گئے مجلّدات "ارمغانِ مالک" جلد اول، جلد دوم (دہلی ۱۹۷۱ء) مرتبہ: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور MALIK RAM FELICITATION VOLUME (دہلی ۱۹۷۲ء) جسے علی جواد زیدی نے ایڈٹ کیا ہے۔

(۱۴)

رسائل کے غالب نمبر (۱۹۷۰ء-۱۹۸۲ء)

۱- ادبِ لطیف، لاہور (مدیرہ: ناصر زیدی) ۱۹۷۰ء

۲- الشجاع، کراچی (ایس۔ ایم غیاث الدین) ۱۹۷۰ء

۳- جریدۂ غالب لائبریری، کراچی (مرزا ظفر الحسن) ۱۹۷۳ء

۴- صحیفہ، لاہور (ڈاکٹر وحید قریشی) اپریل ۱۹۷۳ء

۵- غالب، کراچی (مرزا ظفر الحسن)

- جنوری مارچ ۱۹۷۶ء
- اکتوبر ۷۶ء تا مارچ ۱۹۷۷ء

۶- غالب نامہ، دہلی (ڈاکٹر یوسف حسین خاں، نثار احمد فاروقی، نذیر احمد)

- جلد ۱، شمارہ ۱، ۲، ۱۹۷۶ء
- جلد ۱، شمارہ ۳، ۴
- جلد ۲، شمارہ ۱، ۱۹۸۱ء
- جلد ۲، شمارہ ۲، جولائی ۱۹۸۱ء

۷- قومی زبان، کراچی (جمیل الدین عالی، مشفق خواجہ، بشیر علی کاظمی

- فروری ۱۹۷۱ء
- فروری ۱۹۷۵ء
- فروری ۱۹۸۰ء
- فروری ۱۹۸۱ء

۸- کاروان، جھنگ (محمد حیات خاں سیال) ۱۹۷۰ء

۹- کتاب، لاہور (سید قاسم محمود)، فروری مارچ ۱۹۷۰ء

۱۰- ماہِ نو، کراچی (فضل قدیر):

- فروری ۱۹۷۰ء
- فروری ۱۹۷۱ء

۱۱- مجلّہ سیفیہ، بھوپال (عبدالقوی دسنوی) ۱۹۷۰ء

۱۲- نقوش، لاہور (محمد طفیل)، غالب نمبر ۱، ۲، ۱۹۷۱ء

۱۳- ہلال، کراچی (زہرا شہریار نقوی)، فروری ۱۹۷۰ء

ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی کے ترجمان سہ ماہی "غالب" (مدیرِ اعلیٰ: فیض احمد فیض، مدیر: مرزا ظفر الحسن) کے سالنامے ۱۹۷۶ء اور ۱۹۷۷ء کے ابتدائی حصے "غالبیات" کے لیے وقف رہے، یہ ایک اچھا ادبی اور علمی پرچہ تھا، افسوس کہ اب بند ہو چکا۔

"نقوش" لاہور (مدیر: محمد طفیل) کے پہلے دو معرکۃ الآرا غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں چھپے تھے۔ تیسرا غالب نمبر (صفحات ۶۰۴)، ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ یہ بھی اپنے قیمتی مواد اور حسنِ ترتیب کی بنا پر مستقل قدر و قیمت کا حامل ہے جس سے ہمیشہ رجوع کیا جاتا رہے گا۔ "نقوش" کے اس تیسرے "غالب نمبر" میں غالب کے بارے میں ایک مزید نمبر کی بشارت بھی دی گئی کہ "چوتھا بھی آ رہا ہے" دس برس سے زیادہ گزر گئے یہ ابھی تک آ نہیں چکا!

پہلی غالب صدی (۱۹۶۹ء) کے موقع پر سہ ماہی "صحیفہ" لاہور (مرتب: ڈاکٹر وحید قریشی) کے حصہ اول تا چہارم (چار شمارے) غالب نمبر کے طور پر نکلے تھے، پھر اپریل ۱۹۷۳ء کا شمارہ "غالب نمبر حصۂ پنجم" کے طور پر شائع ہوا۔ ۱۹۴ صفحات کے اس نمبر کے سولہ مشمولات میں سے ابتدائی سات مقالات (صفحہ ۱ تا ۱۰۴) براہِ راست غالب سے متعلق ہیں۔

"غالبیات" میں رسائل کے حوالے سے گزشتہ دہائی کا سب سے زیادہ خوشگوار اور قابلِ ذکر واقعہ، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی جانب سے مجلہ "غالب نامہ" کا اجرا ہے۔ ۱۹۷۶ء سے یہ پرچہ نکلنا شروع ہوا۔ اب تک اس کے پانچ چھ شمارے چھپ چکے ہیں۔ یہ پرچہ پاک و ہند کی علمی اور تحقیقی رفتارِ کار کا صحیح معنوں میں آئینہ دار ہے۔

(۱۵)

مختصر یہ کہ ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی کے حوالے سے پاکستان اور پاکستان سے باہر مشرق تا مغرب، غالب کی شخصیت اور ان کے فکر و فن پر لکھنے لکھانے کا جو شور اٹھا اور تار بندھا تھا، اس کا زور گو اب باقی نہیں رہا، لیکن "سالِ غالب" (۱۹۶۹ء) کی فصل گزر جانے کے بعد اہلِ علم نے غالب پر غور و فکر اور تنقید و تحقیق کا دروازہ اپنے لیے بند نہیں کیا، مطالعۂ غالب کی دوسری صدی (۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۲ء تک) کے ان بارہ تیرہ برسوں میں غالبیات سے شغف کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل اور سطح پر جاری رہا۔

اس حدِ زمانی میں، غالبیات کے میدان میں ترتیب و انتخاب، تراجم و تشریح، تخلیق اور تنقید و تحقیق کا کام پاکستان میں بھی ہوا ہے اور ہندوستان میں بھی۔ پھر یہ ملک اور بیرونِ ملک کے کچھ مخصوص شہروں یا خاص خاص تہذیبی مراکز ہی میں نہیں ہوا، دور و نزدیک چھوٹے بڑے متعدد شہروں اور مقامات سے غالب کے بارے میں کتابیں نکلی ہیں۔ ان میں لاہور، کراچی، فیصل آباد (لائل پور)، حیدرآباد جامشورو، راولپنڈی، پشاور، سرگودھا، گجرات، جھنگ، حیدرآباد دکن، سری نگر، دہلی، لکھنؤ، بمبئی، کلکتہ، اعظم گڑھ، علی گڑھ، الہ آباد، بھوپال، نکودر اور کیمبرج کے نام قابلِ ذکر ہیں ــــ قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ غالب پر یہ کام صرف کسی ایک ہی زبان میں نہیں ہوا، اردو، فارسی، انگریزی، سندھی اور ہندی وغیرہ مختلف زبانوں میں ہوا ہے ــــ اور یہ کام کیفیت اور کمیت دونوں کے اعتبار سے بحیثیت مجموعی اطمینان اور افتخار کے قابل ہے۔

(غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے زیرِ اہتمام "غالب اور عہدِ غالب" پر انٹرنیشنل سیمینار منعقدہ دہلی ۲۵-۲۷ دسمبر ۱۹۸۲ء کے لیے لکھا گیا)

ٹوٹتی پھوٹتی لکیریں

شہزاد احمد

ارتقا اور انقلاب انیسویں صدی کے تصورات ہیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے معانی میں وسعت آتی چلی گئی ہے۔ ڈارون کی حد تک، ارتقا محض حیاتیاتی نظریہ تھا اور شروع شروع میں انقلاب کی اصطلاح محض سیاست تک محدود تھی مگر اب زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں یہ دونوں اصطلاحیں مختلف النوع معانی میں استعمال نہ ہوتی ہوں۔ چنانچہ ایک مدت گزر جانے کے باوجود یہ دونوں تصورات ہم سے چمٹے ہوئے ہیں، یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم ان تصورات سے چپک کر رہ گئے ہیں۔ اس وقت پورا انسانی علم دو زمانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے — ارتقا اور انقلاب کی اصطلاحات سے پہلے کا زمانہ اور بعد کا زمانہ — اگر آپ تحقیق پر اتر آئیں تو آپ کو انسانی تاریخ کے ابتدائی دور میں بھی ایسے تصورات مل جائیں گے جنھیں موجودہ نظریات کی ابتدائی حالت کہا جا سکتا ہے۔ مگر جب تک ان نظریات نے باقاعدہ طور پر ایک منظم نظریے کی شکل اختیار نہیں کر لی، ان کے اثرات دور رس ثابت نہیں ہوئے۔ ہر عہد اپنے اردگرد کو اپنے مخصوص زاویے سے دیکھتا ہے اور کئی بار وہ نئے حقائق کی دریافت کے بہت قریب پہنچ جاتا ہے مگر ان کو دریافت نہیں کر پاتا۔ انسان لاکھوں برس سے اس کرۂ ارض پر زندگی گزار رہا ہے مگر نفسیات کا باقاعدہ علم شاید سو برس سے زیادہ پرانا نہیں۔ زمین، سورج اور ستارے بھی ہمیشہ سے موجود تھے مگر یہ سولھویں صدی میں منکشف ہوا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور سمندروں کا مدوجزر چاند کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جب یہ دریافت کر لیا گیا تو اسے قبول عام کی سند مدتوں تک نہ مل سکی۔

قبول عام کی سند بھی عجیب چیز ہے۔ پہلے ہم نئی چیزوں کے بارے میں مزاحمت کا رویہ اختیار کرتے ہیں مگر ایک بار ان کو قبول کرنے کے بعد ان کی مدافعت شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ ہمارے قبول کردہ نظریے میں بہت سے جھول ہیں تو ہم انھیں دیکھنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ زندگی ریل گاڑی کا سفر ہے۔ کوئی بھی نیا مسافر جب ریل کے ڈبے میں داخل ہوتا ہے تو پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگ شور مچا دیتے ہیں کہ جگہ نہیں ہے اور جب وہ کسی نہ کسی طرح اپنے لئے جگہ حاصل کر لیتا ہے تو پھر نئے مسافروں کے خلاف مدافعت میں وہ دوسروں کا ہمنوا بن جاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال سے ارتقا اور انقلاب کے نظریات بھی گزر رہے ہیں۔ ارتقا کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ بنیادی طور پر صورت حال میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو البتہ بعض آسانیاں اور ترقیاں پیدا ہوتی چلی جائیں۔ انقلاب سے یہ مراد ہے کہ سفر کرتے کرتے اچانک کوئی موڑ ایسا آئے جہاں منظر یکسر تبدیل ہو جائے اور پرانی تمام اقدار ممی بنا کر تاریخ کے عجائب گھر میں رکھ دی جائیں۔

دوسرے لفظوں میں ارتقا زندگی کے گراف کی ایک ایسی سیدھی اور مسلسل لکیر ہے جو ہر لحظہ بلند سے بلند تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ لکیر نہ کبھی نیچے آتی ہے اور نہ ٹوٹتی ہے۔ گویا وقت اور ارتقا کی اصطلاحیں اب ایک ہی معانی میں استعمال ہونے لگی ہیں۔ دوسری طرف انقلاب کے معانی گراف کی ایسی لکیر کے ہیں جو یکایک گراف پر بغیر کسی جواز کے نمودار ہوتی ہے۔ کبھی اوپر جاتی ہے کبھی نیچے اور کچھ مدت کے بعد خود بخود غائب ہو جاتی ہے۔ یہ نظریہ ان لوگوں کا ہے جو انقلاب کی نفی کرتے ہیں مگر جو انقلاب پسند ہیں۔ وہ اس لکیر کے ظاہر ہونے کے بعد اس کی وہی صورت بنا دیتے ہیں جو ارتقا کی ہے۔ یعنی اب نیا نظریہ قیامت تک ترقی ہی کے راستے پر گامزن رہے گا!

ارتقا کا عمل نظریاتی طور پر فطرت پر ہی چھوڑ دیا گیا ہے مگر انقلاب اب ایک فلاسفی یا سائنس کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ اس عمل کو ایک حد تک تیز بھی کیا جا سکتا ہے اور روکا بھی جا سکتا ہے۔ انسان اپنی قدامت پسند طبیعت کے باوجود انقلاب زندہ باد کے نعرے بھی لگاتا ہے، اور کبھی کبھی شدومد کے ساتھ عمل کی راہ بھی اختیار کرتا ہے۔ اس صورت حال میں جو شے انقلاب کے لئے راہ ہموار کرے وہ خیر اور جو رکاوٹ بنے اسے شر کا نام دیا جاتا ہے چنانچہ یہ خیر و شر کے ایسے معانی ہیں جو مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ مقصد کے تابع ہیں۔ اس صورتِ حال کو قبول کر لینے کے بعد خلاقیات کی بنیاد ہی تبدیل ہو جاتی ہے اور اس کا اثر واضح طور پر ادب، معاشرت اور فنونِ لطیفہ پر مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے مگر اس سے پہلے کہ ہم اس نکتے کی وضاحت کریں ہمیں یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ ارتقا اور انقلاب کے گراف کا موازنہ اگر ایک دوسرے سے کیا جائے تو کیا نتائج مرتب ہو سکتے ہیں؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ارتقا ہمیشہ ایک سیدھی مسلسل اور بلند ہوتی ہوئی لکیر بناتا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ کیجئے کہ کیا ارتقا محض ایک مقداری تبدیلی ہے جو آہستہ آہستہ رونما ہوتی رہتی ہے مگر اپنی شکل کبھی تبدیل نہیں کرتی۔ اگر ایسا ہوتا تو زندگی میں تصادم نام کی کوئی چیز نہ ہوتی اور زندگی میں اتنی رنگا رنگی نظر نہ آتی جو اس وقت موجود ہے۔ لہٰذا ارتقا کی اس تعبیر میں کہیں نہ کہیں کوئی گھپلا موجود ہے۔ خود حیاتیات کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ارتقا کا گراف سیدھی لکیر پر چلتے چلتے اچانک جست لگاتا ہے اور یوں مقداری تبدیلی معیاری تبدیلی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیدھی لکیر بلند ہوتے ہوتے ایک دم گر جاتی ہے یا غائب ہو جاتی ہے۔ پہلی صورت حال میں جہاں معیاری تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ انقلابی صورت حال ہے مگر دوسری صورت حال معدومی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ چنانچہ ارتقا میں دو طرح کی تبدیلیاں پیدا ہو سکتی ہیں پہلی تبدیلی تو وہ ہے جس میں انقلابی صورت حال جنم لیتی ہے اور ادب کے اندر معیاری تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ ایک طرح خطِ تنسیخ کھینچ جاتا ہے جو روایت اور زمانۂ حال میں واضح تفریق کر دیتا ہے۔ ادب میں یہ صورت حال کئی بار پیدا ہوئی ہے۔ نظیر اکبر آبادی کا روایتی غزل اور اُس کی غنائیت سے انکار، یگانہ کا تشکیکی رویہ، اقبال کی نئی مابعد الطبیعیات، میراجی اور راشد کی جدید نظم —— پھر جدید غزل اور اس کے بعد نثری شاعری اس کی چند مثالیں ہیں۔ معدومیت کی روایت کے کئی رخ ہیں۔ بعض رویے، لہجے اور حتیٰ کہ الفاظ بھی شعوری یا لاشعوری طور پر منسوخ ہو جاتے ہیں۔ شاعری اپنے سفر میں بعض چیزیں اپنے اوپر حرام کر لیتی ہے اور یوں ایک سیدھی مسلسل اور بلند ہوتی گراف لائن رک جاتی ہے۔ گر جاتی ہے یا ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ صورت حال کئی اصناف کے سلسلے میں پیش آ چکی ہے۔ مثلاً واسوخت، مثنوی، قصیدہ، مستزاد اور رباعی وغیرہ۔

چنانچہ ارتقا کا گراف ادب میں بھی کسی تسلسل کے ساتھ نہیں چلتا بلکہ کسی ایک مقام سے شروع ہوتا ہے، آگے بڑھتا ہے اور کچھ دیر تک بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر اُس کی لکیر ٹوٹ جاتی ہے اور کسی نئی صورت میں معیاری تبدیلی کے ساتھ ابتدا سے اپنا سفر شروع کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس کی کارفرمائی زندگی کے مختلف شعبوں اور ادب کے مختلف ادوار میں دیکھی جا سکتی ہے۔ دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ ادب کی اقدار دائمی ہیں۔ آج تک ہم ہومر، فردوسی، شیکسپیئر اور بے شمار دوسرے متقدمین کی شاعری سے حظ اٹھانے کی توفیق رکھتے ہیں۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ انسانی جذبات میں روزِ ازل سے لے کر اب تک کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی اس لئے یہ انسانی نفسیات کا ایک ایسا حصہ ہے جس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔ مگر یہ فیصلہ بہت جلدی میں کیا گیا ہے۔ انسانی ادبی تاریخ زیادہ سے زیادہ تین چار ہزار سال پرانی ہے اور یہ مدت کسی حتمی فیصلے کے لیے کافی نہیں۔ اگر یہ درست بھی مان لیا جائے کہ انسان نے اب تک اپنے اندر قدیم انسان کو موجود پایا ہے اور اس کے اثرات اس کے لاشعور کے حوالے سے خوابوں اور فنونِ لطیفہ میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں، پھر بھی اس کا طرزِ احساس تبدیل ہوتا چلا گیا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ واہمہ بھی موجود ہے کہ انسان کے لئے چند اقدار ایسی بھی ہیں جنہیں دائمی بھی کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس خیال کا اظہار عام طور پر کیا جاتا ہے کہ سائنسی حقائق بہت جلد تبدیل ہو جاتے ہیں جبکہ ادبی اقدار ہمیشہ قائم رہتی ہیں۔

سولژینتسن کے ناول "پہلا دائرہ" میں چند قیدی سائنس کی ترقی پر بحث کر رہے ہیں۔ ان میں ایک کردار جس کا نام گلیب نورزن ہے بڑے جذباتی انداز میں کہتا ہے "ترقی! ترقی کون چاہتا ہے۔ مجھے آرٹ کی یہی ادا تو پسند ہے کہ اس میں ترقی نام کی کوئی چیز واقع نہیں ہوتی"۔ اس کے بعد

وہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد طنزاً کہتا ہے: ”کیا اینا کرینینا میں کوئی ترقی ہوئی ہے؟“ —— دوسری طرف سارتر اپنے مضمون ”ادب کیا ہے“ میں ناول اور کیلے کا موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دونوں تازہ بہ تازہ ہی اچھے لگتے ہیں۔ چنانچہ اینا کرینینا کو گلے سڑے زمانہ ہو چکا۔

سولزینٹسن کا ہیرو اس نظریہ کا اظہار کرتا ہے کہ سائنس کی ترقی اسی طرح ہوتی ہے جس طرح قدم بہ قدم دیوار اٹھائی جاتی ہے یعنی لوگ اینٹ پر اینٹ رکھتے چلے جاتے ہیں لیکن ادب وقت کی قید سے آزاد ہے وہ ایک ایسا رنگین گیند ہے جسے فوارے کے چھلکتے ہوئے پانی پر چھوڑ دیا گیا ہے اور اب وہ ہر لحظہ نئے نئے رنگ دکھا رہا ہے۔ چنانچہ نورتزن نے سائنس کو دو جمع دو چار اور ادب کو (شمیم احمد کی طرح) دو جمع دو پانچ تصور کیا ہے۔ اگر نورتزن کے نظریے کو درست مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ادب آرٹ اور موسیقی بار بار ایک ہی آرکی ٹائپ کے تجربات کو نیا لباس اور اسلوب عطا کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب ایک ہی آرکی ٹائپ کا اعادہ ہوگا تو اس میں ارتقا کی شکل نکل آئے گی یعنی ہر تجربہ پرانے تجربے سے استفادہ کرتے ہوئے بلند سے بلند تر ہوتا چلا جائے گا۔ چنانچہ نیوٹن نے کہا تھا کہ ”میں دور تک اس لئے دیکھ سکتا ہوں کہ میں بہت سے دیوہیکل انسانوں کے کاندھے پر سوار ہوں“ کسی بھی سائنس، فن یا ادب پر ایسا ارتقائی دور آ سکتا ہے جب اس کی ترقی مسلسل ہو اور اس کی لکیریں دیر تک نہ کوئی جھول آئے اور نہ ہی ٹوٹنے کا کوئی امکان موجود ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک مدت تک ایسے فنکار پیدا ہوتے رہیں جو ارتقا کے لحاظ سے ایک دوسرے کے کاندھے پر سوار ہوں یعنی بات وہاں سے شروع کی جائے جہاں سے چھوڑ دی گئی تھی۔ اس کی ایک واضح مثال میرے خیال میں ہماری اردو غزل ہے جو ولی دکنی سے غالب تک ایسے ہی ارتقا سے گذری ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سارے کا سارا ادبی ارتقا گویا ایک ہی ثقافتی شخصیت کا ہوا ہے اور یوں ایک دوسرے کے کاندھوں پر سوار ہونے والے خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ مگر غالب کے فوراً بعد یہ بلند ہوتی ہوئی سیدھی اور مسلسل لکیر اچانک ٹوٹ جاتی ہے اور اس کے بعد شاعری میں فوری طور پر جو رویے جنم لیتے ہیں وہ کسی دیوہیکل کے کاندھے پر سوار نہیں ہوتے بلکہ بچے کی طرح قدم بقدم چلنا سیکھتے ہیں۔ چنانچہ نظم آزاد، حالی کی نیچرل اور اخلاقی شاعری اور داغ کی معاملہ بندی ایسی ہی مثالیں ہیں۔ البتہ غالب سے کچھ دیر پہلے ایک اور لکیر پیدا ہو چکی ہے جس کا تعلق کسی مابعدالطبیعیات سے نہیں ہے بلکہ اس کا موضوع معاشرتی محسوسات اور زمین سے قریبی رشتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی ساتھ کسی بھی مابعدالطبیعیاتی نظام کو قبول نہ کرنے کی کوشش ہے۔ یہ رویہ نظیر اکبرآبادی کے ہاں پیدا ہوتا ہے اور پھر دیر تک اس کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔

یہاں ایک نکتے کی وضاحت کرتا چلوں کہ ایک تخلیقی دور اور دوسرے تخلیقی دور کے درمیان کا وقفہ کیسے گذرتا ہے؟ کسی تخلیقی دور کی خصوصیات جب قبول کر لی جاتی ہے تو شاعری کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ شعر کہنے والا جانتا ہے کہ وہ جو کچھ کہے گا اس کا کیا اثر قارئین پر مرتب ہوگا چنانچہ وہ ایسے موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے جو فوری طور پر قبول کئے جا سکتے ہیں۔ قاری کے ذہن میں بھی شاعری کی ایک شکل متعین ہو جاتی ہے لہذا اسے شعر کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ چنانچہ تخلیقی ادوار کے درمیان میں آنے والے وقفے ایسی شاعری پیدا کرتے ہیں جو تخلیقی ہو نہ ہو فوری طور پر قبول عام کی سند ضرور حاصل کر لیتی ہے۔ البتہ شعر کے چھپے ہوئے معانی ظاہر ہونے سے ذہن قاری جو حظ اٹھا سکتا ہے اس سے یکسر محروم ہو جاتا ہے اور یوں شاعری گاتے ہوئے گیت کی صدائے بازگشت بن جاتی ہے۔ تحلیل نفسی کی اصطلاح میں اسے جبر اعادہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کی مثال اس بچے کی سی ہے جو بار بار ایک ہی کہانی سننے کے لئے مصر ہو جاتا ہو اور یہ صورت حال ارتقا سے بالکل متضاد ہے اور اگر آپ چاہیں تو اسے معدومی کی صورت حال بھی کہہ سکتے ہیں۔ شاعری ایسی شے نہیں کہ اس کی دیگ کا ایک دانہ چکھنا کافی ہو۔ اس کے برعکس وہ ایک اڑتے ہوئے بادل کی طرح ہے جسے اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں کئی تصویریں یکے بعد دیگرے بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہی صورت حال فنون لطیفہ کی دوسری اصناف میں بھی پیش آتی ہیں۔ نیا ادبی نقطۂ نظر کتنا ہی جامع اور ہمہ گیر کیوں نہ ہو آخر کار اپنی تازگی کھو دیتا ہے۔ جس ماں نے کبھی دیو ہیکل انسان پیدا کئے تھے انجام کار بونوں کو جنم دینے لگتی ہے۔

چنانچہ اب تک کی گفتگو سے ہم یہاں پہنچے کہ ارتقا ایک ایسا عمل ہے جو تسلسل کے ساتھ ترقی کا سفر اختیار کرتا ہے مگر ایک خاص مدت کے بعد اس کی ترقی کی لکیر ٹوٹ جاتی ہے اور پھر جب تک اس میں کوئی انقلابی روح نہ پھونک دی جائے دہرائے جانے کا عمل جاری رہتا ہے۔

ہم نے شاید میں اسلوب یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ادب سائنس کی طرح نہ سہی مگر ترقی ضرور کرتا ہے اور یوں ڈپٹی نذیر احمد کے مقابلے میں منٹو کے کردار کہیں زیادہ نفسیاتی گہرائی کے حامل ہو جاتے ہیں نظم آزاد، آزاد نظم کی وسعت تک سفر کرتی ہے اور غزل جب جدید غزل کا روپ دھارتی ہے تو اس کے موضوعات میں زندگی کے ایسے شعبے بھی شامل ہو جاتے ہیں جو کلاسیکی غزل کے لئے شجرِ ممنوعہ تھے۔ چنانچہ ادب کا سفر بھی ارتقا کے سفر کی طرح سیدھی لکیر میں نہیں ہے بلکہ اس میں کچھ خلا اور وقفے موجود ہیں۔ یہاں بھی مقداری تبدیلی آخر کار معیاری تبدیلی کی صورت اختیار کرتی ہے اور کئی مقامات ایسے بھی آتے ہیں جسے مسلسل ترقی کی بجائے جست ہی کہا جا سکتا ہے۔

فنی اور ادبی سطح پر جست کا عمل بھی ایک خاص نوعیت کا ہوتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جست لگانے کے لئے پیچھے جانا پڑتا ہے۔ ہر چھلانگ لگانے والا کافی پیچھے سے بھاگ کر اس مقام تک آتا ہے جہاں سے جست لگائی جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو یا تو جست لگائی ہی نہیں جا سکتی یا جست نامکمل اور بے حد مختصر ہو جاتی ہے۔ پھر اس میں وہ توانائی بھی موجود نہیں ہوتی جو بہت سے فاصلے کو ہوا ہی میں عبور کر سکتی ہو ــــ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جست لگانے کے لئے ہمیں روایت کی طرف پلٹنا پڑتا ہے کیونکہ یہی وہ زمین ہے جو جست لگانے کے لئے اکساتی ہے۔ مستقبل میں داخل ہونے سے پہلے یہ اندازہ کر لینا ضروری ہے کہ ہم کس اقداری سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری صورت میں اگر ہم نے محض دساور سے آئے ہوئے نظریات کو قبول کیا تو ہم جست تو لگا لیں گے مگر اس کے بعد ہوا ہی میں معلق ہو کر رہ جائیں گے اور ہمیں پھر کبھی زمین میسر نہیں آئے گی۔ اقبال اور میراجی دونوں نے جست لگائی۔ اگرچہ دونوں کے لئے اقداری سلسلے مختلف تھے مگر دونوں ہی ہماری روایت تھے۔ اقبال نے ایک مخصوص مابعد الطبیعیات سے انکار کیا مگر اسی کی ایک اور تعبیر کو قبول کر لیا۔ اس نے حافظ کی نفی کی مگر رومی کا اثبات کیا۔ میراجی نے غزل کی غنائیت تو قبول نہ کی مگر گیت کا سنگیت ضرور اپنا لیا۔

یہاں میں اس بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ قبول کی جانے والی روایت فنی یا ادبی روایت ہی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لوک ورثے یا کسی معاشرتی یا مذہبی روایت کو اپنا لیا جائے۔ پھر اس کے بعد یہ بھی لازم نہیں کہ ایک روایت کی وساطت سے جست لینے کے بعد ہمیشہ اسی روایت پر قائم رہا جائے۔ جست کی یہ کیفیت محبت کی حالت کی سی ہے۔ محبوب کی کوئی ایک ادا دل کو بھا جاتی ہے اور پھر اس کے گرد سارا تانا بانا محبت کرنے والا خود ہی بنتا ہے۔ روایت سیاہی کے ایسے دھبے کی طرح ہوتی ہے جس میں بہت سی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ ممکن ہے کسی اور کی آنکھ کو وہ منظر کبھی نظر ہی نہ آئے جو شاعر کی آنکھ دیکھتی ہے۔

ایک سطح پر تو یہ تجربہ ایک فیصلہ کن قدم ہے جو شاید برسوں میں ایک دو بار ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔ مگر دوسری سطح پر جسے انفرادی سطح کہنا مناسب ہو گا، یہ قدم بار بار اٹھانا پڑتا ہے۔ شاعری ایسی کمبخت چیز ہے کہ انسان ایک ہی بار شاعر نہیں ہو جاتا بلکہ ہر تخلیق کے ساتھ اسے ایک جست لگانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اپنے آپ کو دہرانے لگتا ہے اور اپنے کہے ہوئے کو دہرانا دوسروں کے کہے ہوئے کو دہرانے سے زیادہ معیوب بات ہے کیونکہ جو کچھ ایک بار تخلیق ہو چکا، انفرادی سطح پر اسے دوبارہ تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ البتہ اصولی طور پر ممکن ہے کہ دوسرے کے کہے ہوئے کو دہراتے وقت آپ شاید چھلانگ لگا سکیں۔

اسی باعث اکثر شعرا جو کچھ نوجوانی میں لکھ دیتے ہیں وہی ان کا سرمایہ ہوتا ہے اور اس کے بعد عمر جس قدر طویل ہو شاعری اتنی ہی بیکار ہو جاتی ہے۔ اجتماعی سطح پر ارتقا ایک دوسرے کے کاندھوں پر سوار ہونے کے مترادف ہے۔ مگر انفرادی سطح پر بلندی پر جانے کے لئے بقول نطشے "پہلے تو سیڑھی استعمال کی جاتی ہے مگر اس کے بعد جہاں سیڑھی ختم ہو جائے اپنے ہی کاندھوں پر قدم رکھ کر آگے بڑھنا سیکھنا پڑتا ہے" اور یوں شاعری بار بار اپنے آپ کو شکست دینے کی مسلسل کوشش ہے۔ یہ ایک ایسی لڑائی ہے جو اپنی ذات ہی سے لڑنی پڑتی ہے۔ ممکن ہے خود اذیتی شاعری پیدا کر سکتی ہو مگر خود پسندی کبھی تخلیقی عمل کی طرف رہنمائی نہیں کرتی۔ ذاتی سطح پر بھی گراف کی یہ لکیر مسلسل بلندی کی طرف بھی جا سکتی ہے، ٹوٹ بھی سکتی ہے، پھر شروع بھی ہو سکتی ہے اور ہمیشہ کے لئے معدومی کے ریگستان میں کھو بھی سکتی ہے۔

قوموں کی شکست و زوال کے اسباب — ایک جائزہ

محمد ارشاد

تاریخ کے مطالعہ سے جس بات کی جانب ہماری توجہ بار بار مبذول ہوتی ہے یہ ہے کہ بعض خاص خطوں میں بعض خاص دار میں انسانی معاشرہ ایک ایسی سطح پر پہنچ جاتا ہے جسے تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔ تہذیبیں زمان و مکان میں محدود ہوتی ہیں یعنی ں بھی تہذیب کے بارے میں یہ پوچھنا درست ہے کہ 'کب اور کہاں' اور زمان و مکان ہر دو کے حوالے کے بغیر اس سوال کا مکمل جواب ملن نہیں۔ تہذیب کی زمانی حدود سے مراد وہ دوران ہے جس میں کوئی تہذیب زندہ رہتی ہے۔ مثلاً بابل پر ایک دور ایسا گزرا ہے جس میں بابلی تہذیب ابھی وجود میں نہیں آئی تھی اور پھر ایک "دور" ایسا بھی آیا جب بابلی معاشرہ اپنی تہذیبی اقدار، روایات اور خصوصیات سے محروم ہو گیا۔ تہذیب کی مکانی حدود وہ علاقے اور خطے ہیں جہاں تک کوئی تہذیب پہنچتی ہے۔ مثلاً بابل کی تہذیب ایک خاص علاقے میں پیدا ہوئی، فروغ حاصل کیا اور وادی دجلہ و فرات کی سرحدوں سے باہر بھی پھیلی لیکن ناروے، روس، انگلستان، سوڈان اور جاپان تک کبھی نہ پہنچ پائی۔ یہی بات مصر، سمیریا، موہنجو داڑو، اشوریا، کالدیا، چین، ہند، فارس، یونان، روما اور بغداد کی تہذیبوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ پس کوئی تہذیب نہ تو محض مکان میں محدود ہوتی ہے کہ اس کے بارے میں 'کہاں' کا سوال نہ پوچھا جا سکے اور نہ صرف 'زمان' میں محدود ہوتی ہے کہ 'کب' کا سوال نہ کیا جا سکے۔

اگر ہم تہذیبوں کے عروج و زوال سے قطع نظر تاریخ نسل انسانی پر مجموعی لحاظ سے نگاہ کریں تو ہم یہ نتیجہ اخذ کیے بغیر نہیں رہیں گے کہ عہد ماقبل کی ہر تہذیب عہد مابعد کی تہذیب کا پیش خیمہ (PROLOGUE) ثابت ہوئی ہے۔ ہر مٹنے والی تہذیب علوم و فنون اور ٹیکنالوجی میں اپنی قابل قدر تخلیقات و ایجادات کا ثمرہ ورثے کے طور پر اپنے بعد آنے والی تہذیب کے حوالے کرتی نظر آتی ہے لیکن تہذیب مابعد کے حسنِ انتخاب کا تمام تر دار و مدار اس کے اس فلسفہ (اپنے وسیع مفہوم میں) پر ہوتا ہے جو اس کی جستجوؤں اور امنگوں کا تعین کرتا ہے۔

اقوام و ملل اور تہذیب و تمدن عروج و کمال کے بعد شکست و زوال سے کیوں دوچار ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر دور کے اصحاب علم و دانش کے لیے توجہ طلب رہا ہے لیکن معلوم تاریخ میں ابن خلدون پہلا مفکر ہے جس نے اس سوال پر بحث کے لیے سائنسی طریق کار استعمال کیا۔ ابنِ خلدون سے پہلے اس موضوع پر یا تو مذہبی نقطۂ نظر سے بحث کی جاتی رہی یا پھر علم نجوم کی مدد سے قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل تلاش کیے جاتے رہے۔ عِلِ تاریخ کو مذہبی نقطۂ نظر سے سمجھنے اور سمجھانے کی ابتدا یہودیوں سے ہوئی۔ علم نجوم کے اصول بابلی ستارہ پرستوں کی دریافت ہیں اور عِلِ تاریخ پر ان کے اطلاق کی اشاعت اہل سکندریہ اور ہنود کے ذریعے ہوئی۔

یہودیوں کا خیال تھا کہ تمام اقوام و ملل میں انہیں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور خدا (جہودا) کی نظر ان پر خاص طور پر ہے۔ وہ جہودا کے منظور نظر ہیں۔ جہودا ابتدا میں ان کے قبائلی دیوتا کا نام تھا۔ شرک و بت پرستی کے زمانے میں یہودی جہودا کے علاوہ دوسرے دیوتاؤں کی بھی پرستش کرتے تھے لیکن جب ان میں خدائے واحد کے تصور کو فروغ ہوا اور دوسرے دیوتاؤں کی پرستش گمراہی خیال کی جانے لگی تو جہودا

بلا شرکتِ غیرے تمام کائنات کا خالق و مالک تسلیم کر لیا گیا۔ جھودا کائنات کا خالق و مالک ہے اور کائنات کا خالق و مالک جھودا ہے۔ اس اشخاص کے ساتھ ہی ان کے اس عقیدے کے لیے بنیاد فراہم ہو گئی کہ چونکہ ان ہی کے جھودا نے تمام کائنات کو پیدا کیا ہے نہ کہ بابلیوں کے بعل یا مصریوں کے آتن نے (جھودا کی طرح بعل اور آتن بھی قبائلی دیوتاؤں کے نام تھے لیکن جب بابلیوں اور مصریوں میں تصورِ توحید کو فروغ ہو تو بعل اور آتن سے خدائے واحد مراد لی جانے لگی) اور تمام کائنات اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور چونکہ وہ جھودا کے سوا کسی کی پرستش نہیں کرتے اور نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں اور یہی جھودا بھی چاہتا ہے اس لیے اس پرانے قبائلی ربط و تعلق کی بنا پر، جو شرک و بت پرستی ترک کر دینے سے اور بھی مضبوط اور مستحکم ہو گیا ہے جھودا بنی اسرائیل کی خیر و فلاح میں خصوصی دلچسپی رکھتا ہے اور ان کی رہنمائی کے لیے ان کے بعض سرکردہ افراد کے ذریعے ہدایات بھیجتا رہتا ہے۔ تمام اقوام و ملل میں یہ خصوصیت صرف بنی اسرائیل کو حاصل ہے (یہ اسی عقیدے کا اثر تھا کہ جب آنحضرتؐ نے نبوت کا اعلان کیا تو یہودیوں کے انکار کی سب سے پہلی وجہ یہ تھی کہ ان کے نزدیک جو شخص بنی اسرائیل سے نہ ہو اس کا نبی اور رسول ہونا ناممکن ہے)، بنی اسرائیل جھودا کے چہیتے ہیں۔ صرف وہی نجات سے ہمکنار ہوں گے۔ دیگر تمام اقوام گمراہ اور ان کے مذاہب باطل ہیں لیکن مصریوں، آشوریوں، بابلیوں اور رومیوں کے ہاتھوں پے در پے ذلت آمیز شکستوں، اسیری، غلامی اور دربدری نے ان کے اس عقیدے کو ان کے لئے جواز طلب بنا دیا تھا کہ اگر وہ جھودا کے چہیتے ہیں اور کوئی بات جھودا کے اختیار سے باہر بھی نہیں تو جھودا نے انہیں اس قدر مصائب و آلام میں کیوں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ اپنے اس عقیدے پر کہ وہ جھودا کے چہیتے ہیں کسی قسم کی نظرثانی کئے بغیر جس جواب سے مطمئن ہو سکتے تھے یہ تھا کہ ان کے مصائب و آلام ان کے اپنے گناہوں اور بداعمالیوں کی سزا اور کفارہ ہیں۔ جس طرح باپ اپنے بیٹے کو اس کی کسی غلطی پر اصلاح کی غرض سے سزا دیتا ہے اسی طرح جھودا سزا کے ذریعے ان کا تزکیہ اور ان کی اصلاح کرنا چاہتا ہے[1]۔ بنی اسرائیل جب تک جھودا کے احکام سے روگردانی کرتے رہیں گے ان کے مصائب و آلام برقرار رہیں گے اور شکست، اسیری، غلامی اور دربدری کی صورت میں انھیں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا پڑتا رہے گا جبکہ[2] ورنہ دیگر دنیا کی کوئی قوم نہ انھیں شکست دے سکے گی اور نہ غلام بنا سکے گی۔

جن لوگوں نے عہد نامۂ عتیق کا بغور مطالعہ کیا ہے ہمیں بتاتے ہیں کہ اس راسخ العقیدگی (ORTHODOXY) کی تخم ریزی ان یہودی قبائل میں ہوئی جنہیں بخت نصر اسیر کر کے اپنے ساتھ بابل لے گیا تھا۔ جو یہودی فلسطین میں ہی رہ گئے تھے اس عقائدنامے سے ناواقف تھے اور اپنے آپ کو اپنے گرد و پیش کی دیگر اقوام سے مذہبی، اخلاقی اور قومی لحاظ سے چنداں مختلف اور برتر خیال نہ کرتے تھے جب کورش کبیر نے سلطنت بابل کو ۵۳۷ ق م میں تباہ کر دینے کے ایک سال بعد بابل میں اسیر یہودی قبائل کو رہا کر دیا اور یہ یہودی قبائل جب وطن واپس پہنچے تو انھیں یہ جان کر صدمہ ہوا کہ فلسطین میں مقیم یہودیوں نے غیر یہودی اقوام کے ساتھ مناکحت کے رشتے قائم کر رکھے ہیں۔ انھوں نے اس طرزِ عمل کے خلاف نہ صرف احتجاج کیا بلکہ جھودا کے احکام سے روگردانی قرار دیتے ہوئے اس طرح کے تمام رشتوں کو منسوخ کر دیا۔ حالانکہ تاریخی اعتبار سے یہودی اس قدر قوم پرست اور راسخ العقیدہ کبھی نہیں رہے جس قدر کہ بابل میں نصف صدی کی اسارت کے دوران پیدا ہونے والے اور جوان بوڑھے ہو کر آنے والے یہودی خیال کرتے تھے۔ یہ عقیدہ کہ یہودیوں کی شکست و تباہی کا باعث ان کا راسخ العقیدگی سے انحراف ہے انہی کا متعارف کردہ ہے اور عہد نامۂ عتیق کا تاریخی نقطۂ نظر سے مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس سے پہلے یہودی اس قدر راسخ العقیدہ کبھی رہے ہی نہ تھے[3]۔ سب سے زیادہ راسخ العقیدہ وہی یہودی تھے جو سب سے زیادہ پامال ہوئے۔ عمل تاریخ کے بارے میں یہ نقطۂ نظر خود مرکزی ہے اور اس کی مدد سے غیر یہودی اقوام اور ان کی تہذیبوں اور تمدنوں کے عروج و کمال اور شکست و زوال کی

---

۱ برٹرینڈ رسل

۲ برٹرینڈ رسل

توجیہہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے یہ طرزِ فکر غیر سائنسی طرزِ فکر ہے۔

یہ بیان قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مسیحیت کے عام شیوع و فروغ کا زمانہ کم و بیش وہی ہے جو اسلام کا ہے۔ اس زمانے میں جہاں ایک مذہب کے پیرو جاہلیت، جہالت اور تاریکی کی آخری پستیوں کی طرف بڑھ رہے تھے وہاں دوسرے مذہب کے پیرو علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی ان بلندیوں کو چھو رہے تھے جن تک ان سے پہلے کوئی نہ پہنچا تھا۔ ول ڈیورانٹ نے دی ایج آف فیتھ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ قرونِ مظلمہ کے مسیحی علما سے جب اس تفاوت کے بارے میں پوچھا جاتا تو اُن کا جواب یہ ہوتا کہ کفار (مسلمانوں) نے دنیا طلب کی جو انھیں مل گئی۔ ہم نے آخرت طلب کی جس میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

عملِ تاریخ کے بارے میں بابلی ستارہ پرستوں کا عقیدہ یہ تھا کہ چونکہ زمین پر رونما ہونے والے تمام واقعات و حادثات کی علت العلل اور سبب الاسباب ستاروں کے قرانات ہیں اور ممکنہ قرانات تعداد کے لحاظ سے محدود ہیں اس لیے غیر محدود زمان میں ہر ہر قران کا بالالتزام اعادہ بار بار ہوگا اور وہی معلولات و واقعات بغیر کسی قسم کے فرق کے لازمی طور پر بار بار وقوع پذیر ہوتے رہیں گے ــــ وہی انواع، وہی آرا، وہی قوانین، وہی احکام، وہی مذاہب و مسالک اور وہی مملکتیں اور حکومتیں باری باری آتی اور جاتی رہیں گی۔ عملِ تاریخ کا یہ تصور جو دولابی تصور کہلاتا ہے بابلی ستارہ پرستوں کی دین ہے۔ ابن خلدون، ویکو، دانیلیفسکی، ہیگل اور سپنگلر کے تصورِ عملِ تاریخ کو دولابی کہنا درست نہیں ہے۔

عملِ تاریخ کے بارے میں اسی مذکورہ بالا نقطۂ نظر کے زیرِ اثر گذشتہ زمانے کے وہ بادشاہ بھی تخت نشینی کے معاملے میں شبھ گھڑی کے منتظر رہتے تھے جو عملِ تاریخ کی اس خاص دولابی صورت میں تو یقین نہیں رکھتے تھے لیکن ستاروں کی گردش کے اثرات کے اس حد تک ضرور قائل تھے کہ بعض خاص ستاروں کے قران یا کسی ستارے کے کسی خاص برج میں داخلے کے موقع پر تخت نشینی سے ان کی حکومت کو فروغ و استحکام حاصل ہوگا۔ امیر تیمور کو صاحبقران اور شاہجہاں کو صاحبقران ثانی اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی ولادت قران السعدین کے موقع پر ہوئی تھی۔ چنانچہ کسی قوم یا ملک کے عروج و زوال کا انحصار اس قوم یا ملک کے مخصوص ستارے کی گردش، بانیٔ سلطنت اور اس کے جانشینوں کے مخصوص زائچوں پر تھا۔ اگر کوئی قوم یا مملکت دیگر قوموں اور مملکتوں سے زیادہ مہذب و متمدن اور علوم و فنون میں آگے ہے تو اس نقطۂ نظر کی رو سے اس کی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں برتری اس کی اپنی کوششوں اور جد و جہد کا ثمرہ نہیں بلکہ ستاروں کی گردش کا ثمرہ ہے کیونکہ اس کی ساری کوششیں اور جد و جہد، بطور ایک واقعہ کے، ستاروں کی گردش کا نتیجہ ہے۔ یوں عملِ تاریخ کا علم بعض خاص افراد اور ان کے اہلِ خانہ کی جنم پتریوں کے مطالعے تک محدود و محصور ہو کر رہ گیا۔

عملِ تاریخ کے بارے میں جب ہم مسلمانوں کے افکار کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے ابن خلدون کے مقدمۂ تاریخ سے اس وقت تک اعتنا نہیں کیا جب تک کہ اہلِ یورپ نے اس کی علمی اہمیت اور حیثیت کی طرف ہماری توجہ مبذول نہیں کرائی۔ مسلمان مقدمۂ ابن خلدون سے زیادہ تاریخ ابن خلدون کو اہمیت دیتے رہے۔ چنانچہ موجودہ صدی کے اوائل تک مسلمانوں نے اپنے عروج و زوال کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں تاریخ ابن خلدون سے تو بکثرت حوالے نقل ہوتے رہے ہیں لیکن مقدمۂ ابن خلدون کے حوالے سے کبھی کوئی بات نہیں کہی گئی۔ مسلمان کم و بیش یہ بات بھول چکے تھے کہ ابن خلدون نے تاریخ کے علاوہ مقدمۂ تاریخ بھی لکھا ہے۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ مقدمۂ ابن خلدون کی 'بازیافت' کے بعد بھی عملِ تاریخ کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر میں نمایاں تبدیلی نظر نہیں آتی۔ معروف مؤرخ اور مفکر تاریخ آرنلڈ ٹائن بی نے درست کہا ہے کہ کسی معاصر نے ابن خلدون سے استفادہ نہیں کیا نہ بعد میں آنے والوں نے اس سے استفاضہ کیا۔ اپنے مقدمۂ تاریخ میں اس نے جو فلسفہ پیش کیا ہے اپنی نوعیت کا عظیم ترین فلسفہ ہے

جس کی مثال کہیں بھی نہیں ملتی[۵۴]۔ ابن خلدون نے یہ فلسفہ ایک ایسے وقت میں ایک ایسی قوم کے سامنے پیش کیا جو اس سے استفادہ و استفاضہ کرنے کی صلاحیت و اہلیت سے محروم ہو چکی تھی۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ دیکو، ہیگل، دانی لیفسکی، سپنگلر، مارکس اور خود ٹائن بی میں سے ہر ایک کا فلسفۂ تاریخ، ابن خلدون ہی کے فلسفۂ تاریخ پر حاشیہ ہے۔ مارکس کا فلسفۂ تاریخ بظاہر مختلف معلوم ہوتا ہے لیکن فی الواقعہ مختلف نہیں ہے کہ ابن خلدون نے جہاں کہیں جغرافیے کے حوالے سے بات کی ہے وہاں جغرافیے سے اس کی مراد وہی ہے جسے عہدِ حاضر میں ECONOMIC GEOGRAPHY کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر آغا افتخار حسین نے "قوموں کی شکست و زوال کا مطالعہ"[۵۵] لکھ کر اردو زبان میں ایک ایسے موضوع پر بحث کا آغاز کیا ہے جس کے اہم ہونے میں کلام نہیں اور یہ موضوع جس قدر اہم ہے اسی قدر دقیق، پیچیدہ اور تھکا دینے والا بھی ہے۔ مزید برآں ان حلقوں میں جو اپنی شناخت علمی حلقوں کے نام سے کراتے ہیں، علمی معاملات میں رواداری کا رویہ شاذ ہے، اس لیے اس صورتِ حال نے زیرِ بحث موضوع کو کچھ زیادہ ہی حساس اور باعثِ اشتعال بنا دیا ہے۔ بنابریں یہ موضوع اپنی اہمیت کے پیشِ نظر جس قسم کی شرح و بسط کا متقاضی ہے اس سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کی صورت میں فاضل مصنف کے لیے اس مقصد کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے جو بنیادی طور پر ان کے پیشِ نظر تھا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی اس کتاب کے ذریعے سے قارئین کے لیے اس موقعے کا حصول ممکن بنانا چاہتے ہیں جسے افراد و اقوام کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ موقع تعصبات، خوش فہمیوں اور بلاضمانت بیم و رجا سے پاک خود تنقیدی کی صلاحیت کو بیدار کرنے اور بروئے کار لانے کا موقع ہے۔ "قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ" درحقیقت ایک دعوتِ فکر ہے ہر اس پڑھے لکھے آدمی کے لیے جو "ماضی و حال کی خامیوں اور غلطیوں کو سمجھ کر مستقبل کے لیے صحیح راستہ تلاش کرنا" چاہتا ہے۔ اس کتاب کے مخاطب زیادہ تر وہ افراد ہیں جنھیں اس موضوع سے متعلقہ علوم فلسفہ، تاریخ، فلسفۂ تاریخ وغیرہ کے تفصیلی مطالعے کا موقع نہیں مل سکا۔ مطالب کو عام قارئین کے لیے ممکن حد تک سہل الحصول بنانے کے پیشِ نظر ڈاکٹر صاحب نے بحث کو زیادہ گہرے پانیوں میں اتارنے سے اجتناب کیا ہے۔ دقیق مباحث کو متعلقہ علمی اصطلاحات استعمال کیے بغیر آسان زبان میں بیان کرنے سے بہت کچھ کھونا پڑتا ہے لیکن ایسا کر کے ڈاکٹر صاحب جو کچھ پانا چاہتے ہیں بجائے خود اتنا اہم اور وقیع ہے کہ اگر انھوں نے کچھ کھویا بھی ہے تو اس سے زیادہ پا لیا ہے۔ بایں ہمہ اس کتاب میں فضلا اور متخصصین کی دلچسپی کی گنجائش برابر موجود ہے۔

ڈاکٹر آغا افتخار حسین پاکستان کے ایک روشن ضمیر اور روشن فکر صاحبِ قلم ہیں۔ انھیں جو کچھ کہنا ہوتا ہے اسے کہنے کا طریقہ بھی جانتے ہیں۔ اپنی تحریروں میں ان کا لہجہ متواضع، متوازن، تعلّی اور تحدّی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ اس پیشگی خطرۂ اختلاف کے زیرِ اثر اپنے متوقع اختلاف کنندگان کے خلاف فتووں اور تبرّوں سے کام لے کر دانش و دشنام کو باہم آلودہ نہیں کرتے اور نہ اس طرح کی قبل از وقت مدافعت میں یقین رکھتے ہیں جس کی مثالیں بعض اہلِ قلم کی تحریروں میں نظر آتی ہیں لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اہم سے اہم بات بھی اگر منافقانہ انداز میں نہ کہی جائے تو ہمارے اصحابِ علم و فضل اس کی موافقت یا مخالفت میں کسی قسم کے ردِ عمل کا اظہار نہیں کرتے اور یوں یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کسی تحریر نے علمی حلقوں میں کس قسم کا تاثر چھوڑا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ "قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ" کے صفحات میں ڈاکٹر صاحب نے جو دعوتِ فکر دی ہے کسی گوشے سے اس کا کوئی جواب نہیں آیا حالانکہ اسے شائع ہوئے تین سال ہو چکے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں فاضل مصنف نے جو مواد فراہم کیا ہے اسے نہ صرف سلیقے سے ترتیب دیا ہے بلکہ اس پر بحث کے لیے سائنسی طریق کار اختیار کر کے اسی روایت کا احیا کیا ہے جس کا آغاز ابن خلدون سے ہوتا ہے۔ یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے اور ہر حصہ چند

---

۵۴ روحِ عصر، علی عباس جلال پوری

۵۵ قوموں کی شکست و زوال کے اسباب: ناشر مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور

در چند موضوعات کو محیط ہے۔ حصہ اول میں روما، بغداد اور دلی کی مغلیہ تہذیب کے زوال سے بحث کی گئی ہے۔ حصہ دوم میں مسلمانوں کی فکری تاریخ کا طائرانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں اخوان الصفا، امام غزالی، ابن خلدون اور کانٹ کے افکار کا تعارف کرایا گیا ہے اور چوتھا حصہ، جو اپنے موضوعات و مباحث کے لحاظ سے زیادہ متنوع ہے، قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کے بارے میں مختلف نظریات کے جائزے پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں اسی حصے میں ان چند خاص اصطلاحات کی بھی وضاحت کی گئی ہے جنھیں ان مباحث میں کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ اسی حصے میں علمِ تاریخ کے بارے میں انھوں نے اپنا نقطۂ نظر بھی پیش کیا ہے۔

اس کتاب کے بعض حصے مضامین کی صورت میں مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور اب جملہ موضوعات بہ مباحث کی شکل میں کتاب میں شامل ہیں۔ فاضل مصنف نے ان مضامین کو موجودہ صورت میں جس ترتیب سے پیش کیا ہے اس سے بہتر ترتیب ممکن نہ تھی لیکن کتاب کا موضوع ان مضامین میں ترتیب سے قطع نظر جس تسلسلِ بحث و بیان کی امید دلاتا ہے اسی صورت پوری ہو سکتی تھی کہ بعض حصے کتاب سے خارج کر دیے جاتے، بعض حصے زیادہ تفصیل سے لکھے جاتے اور بعض حصوں میں مختلف مواقع پر نئی عبارتوں کا اضافہ کیا جاتا۔ فاضل مصنف اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں تھے۔ ان کی کوشش یہی رہی کہ ان کے معروضات ایک ہی جلد میں قارئین تک پہنچ جائیں بصورتِ دیگر کتاب موجودہ ضخامت سے بہت بڑھ جاتی۔ ان کا یہ خدشہ بے بنیاد نہیں تاہم حصۂ سوم اور حصۂ چہارم کے بعض مباحث مثلاً غزالی، ابن خلدون اور کانٹ کو یکجا کر دینے سے وہ کچھ صفحات بچا سکتے تھے۔ بشرطیکہ متعلقہ حصے دوبارہ لکھے بغیر ایسا کرنا ممکن ہوتا اور یہ کہنا مشکل ہے کہ ایسا کرنے سے موجودہ ضخامت متاثر نہ ہوتی۔

کتاب کے حصۂ اول میں انھوں نے تہذیب روما، تہذیب بغداد اور دلی کی مغلیہ تہذیب کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اس حصے میں جس قدر صفحات انھوں نے تہذیب روما کے لیے مختص کیے ہیں اور ان صفحات میں جس انداز سے بحث کی ہے اتنے صفحات انھوں نے بوجوہ تہذیب بغداد اور مغلیہ تہذیب کے لیے وقف نہیں کیے، نہ بحث کا وہی انداز برقرار رکھا ہے لیکن چونکہ بغداد کا عروج و زوال مسلمانوں کی تاریخ کا انتہائی اہم واقعہ ہے اس لیے اس واقعے کے مختلف متعلقہ پہلوؤں سے کتاب کے آئندہ ابواب میں انھوں نے مناسب مواقع پر تفصیلی بحث کر کے اس کمی کا ازالہ کر دیا ہے جو شروع شروع میں محسوس ہوتی ہے، البتہ ہندوستان کی مغلیہ تہذیب پر انھوں نے تفصیل سے بحث نہیں کی، نہ حصہ اول میں اور نہ بعد کے ابواب میں، اگرچہ بطور ایک تہذیبی اکائی کے انھوں نے مغلیہ تہذیب کو تہذیبِ روما اور تہذیبِ بغداد کی سطح پر رکھا ہے۔

کیا ہندوستان کی مغلیہ تہذیب نے واقعی چند ایسی امتیازی خصوصیات پیدا کر لی تھیں جن کی بنا پر اس تہذیب کو تہذیبِ بغداد سے مختلف اور علیحدہ خیال کیا جا سکتا ہے اور ان خصوصیات کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تہذیب بجائے خود ایک کامل اور علیحدہ تشخص کی حامل تہذیب تھی، اس لیے اسے تہذیب بغداد کا تتمہ اور ضمیمہ خیال نہیں کرنا چاہیے۔ نیز مغلیہ عہد کا ہندوستان تہذیبی سطح پر اس دور کے ایران اور دولت عثمانیہ سے برتر حیثیت کا حامل تھا۔ فاضل مصنف اپنے متعین مقصد کی پابندی کے باعث اس سوال پر بحث کی گنجائش پیدا نہیں کر سکتے تھے تاہم یہ بات ظاہر ہے کہ ان کا جواب اثبات میں ہے۔ اگر یہی سوال میں اپنے آپ سے پوچھوں تو بغیر تحفظات کے ڈاکٹر صاحب کے جواب سے اختلاف یا اتفاق میرے لیے انتہائی مشکل کام ہو گا۔

وہ خصوصیات اور اوصاف جن کی بنا پر ایک تہذیب کو دوسری تہذیب سے ممتاز کیا جا سکتا ہے اس تہذیب میں کارفرما فلسفے کی خصوصیات ہیں۔ تہذیب فلسفے کا ثمرہ ہے اور فلسفہ تہذیب کا۔ کاروبارِ حیات کے سلسلے میں افراد اور جماعتوں کے عمومی رویوں، رجحانات اور طرزِ عمل کا تعین ان آرا و افکار سے ہوتا ہے جو جذب و قبول کے بعد تحت الشعور معتقدات کے طور پر سائنس، ٹیکنالوجی اور دیگر علوم و فنون

کے بارے میں ان کے فیصلوں، امنگوں، اور جستجوؤں (PERSUITS) کا رُخ متعین کرتے ہیں۔ ان معتقدات کی شعوری سطح پر کسی خاص دور کی THE CLIMATE OF OPINION استوار ہوتی ہے۔ یہی روحِ عصر اور مزاجِ عہد ہے۔ مختلف علوم و فنون کے رد و قبول اور ان میں انہماک و تعمق اور اکتشافات و ایجادات کے امکان و وقوع اور فروغ و شیوع کا سارا انحصار مزاجِ عہد یا روحِ عصر پر ہوتا ہے۔ جن علوم و فنون کو کسی خاص دور کی THE CLIMATE OF OPINION راس نہ آتی ہو وہاں ان کا پنپنا ممکن نہیں ہوتا کہ سوال یہاں بھی مطابقت اور موافقت کا ہے۔ صرف وہی علوم و فنون اور اکتشافات و ایجادات قبول کیے جاتے ہیں جو برسرِ اقتدار آرا و معتقدات کے مخالف نہ ہوں۔ قدیم مصری حنوط سازی اور اہرام سازی کے فنون کو ان کی ممکنہ انتہاؤں تک کبھی نہ پہنچا سکتے اگر انہیں یہ یقین نہ ہوتا کہ روح اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے کے بعد مردہ کے جسم میں واپس آجاتی ہے۔ تہذیبِ روما کے عہد میں جن مکاتبِ فلسفہ کو مقبولیت حاصل تھی رواقیت اور ابیقوریت ہیں۔ دونوں مکاتبِ فلسفہ میں افکار کی بجائے اعمال کو بنیادی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ رواقیت میں ضبطِ نفس، تحمل، استقامت اور حوصلہ مندی اعلیٰ ترین اقدار شمار ہوتی ہیں اور ابیقوریت میں طمانیتِ قلب اعلیٰ ترین قدر خیال کی جاتی ہے۔ فلسفہ ابیقورس کے نزدیک "ایک نظامِ عمل ہے جو پُرمسرت زندگی کے حصول کا ذریعہ ہے"۔ "فضیلت (VIRTUE) رواقیوں کے نقطۂ نظر سے "اس ارادے کا نام ہے جو فطرت سے پورے طور پر ہم آہنگ ہے"، اور ابیقوریوں کے نزدیک "اگر اس کے مفہوم میں وہ حکمتِ عملی (PRUDENCE) شامل نہیں جو طمانیت و سعادت (HAPPINESS) کے حصول کے لیے ضروری ہے تو ایک بے معنی اصطلاح ہے"۔ رواقیت خواص کا اور ابیقوریت عوام کا فلسفہ تھا، چونکہ رواقیت (رومی دور کی) اور ابیقوریت دونوں فلسفہ ہائے اخلاق ہیں اس لیے نظری علوم، ادبیات اور دیگر فنونِ لطیفہ کو تہذیبِ روما میں وہ مقام اور فروغ حاصل نہ ہو سکا جو یونانی دور میں حاصل ہوا۔ تہذیبِ روما کی سب سے بڑی دین مساوات، اخوتِ انسانی اور بین الاقوامیت ہے۔ "ایک انسانی گھرانے، ایک عالمگیر مذہب، ایک ہمہ گیر تہذیب اور ایک عالمی ریاست کا تصور جسے اہلِ روما نے بڑی حد تک عملی طور پر حاصل کر لیا تھا اس زمانے سے لے کر آج تک ذہین افراد کا نصب العین چلا آرہا ہے"[۵۰]۔ یہ اسی رواقی نقطۂ نظر کا اثر تھا کہ قانون، نظم و نسق، بڑی بڑی شاہراہوں کی تعمیر، مطلوبہ نتائج کے حصول اور عمل کے لیے بہتر مواقع فراہم کرنے کا باعث ہونے کی بنا پر اہلِ روما کی توجہ کا مرکز اور ہدف بنے رہے۔

پس "فلسفے اور تاریخِ تہذیب و تمدن میں فلسفے کے کردار میں کسی قسم کا قابلِ شناخت و امتیاز فرق نہیں پایا جاتا۔ کسی بھی تہذیبی خصوصیت، تہذیب میں کسی خاص الخاص عمل کی نشاندہی اور تعریف کیجیے یہی تعریف فلسفے کی بھی تعریف ہوگی"[۵۱]۔ فلسفہ ان مقاصد اور نصب العینوں کا اور ان سے وفاداریوں کی حدود کا تعین کرتا ہے جن کے حصول میں تہذیب کوشاں رہتی ہے لیکن جہاں ایک طرف فلسفہ تہذیب کی سمت اور نہج کا تعین کرتا ہے وہاں فلسفے کی اپنی سمت اور نہج کا تعین اس رویے سے ہوتا ہے جو تہذیبی سطح پر خود فلسفے کے بارے میں اختیار کیا جاتا ہے۔ "تہذیب و تمدن کی تاریخ میں فلسفہ اپنے کردار میں ایزادی (ADDITIVE) اور استحالی (TRANSFORMING) ہے۔ اس کا کام وہ سانچے فراہم کرنا ہوتا ہے جن میں مستقبل میں فکر و عمل کو ڈھالا جا سکے"[۵۲]۔ اگر فلسفے سے یہ ایزادی اور استحالی کردار سلب کر لیا جائے یا اس عمل میں رکاوٹ پیدا ہو جائے تو فلسفے اور تہذیب دونوں کا سفر رُک جاتا ہے۔ فلسفے کے تہذیبی کردار میں رکاوٹ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس سے بعض بلاضمانت توقعات وابستہ کر لی جاتی ہیں۔ یہ بلاضمانت توقعات فلسفے کو علمِ کلام اور تصوف کی صورت میں ڈھال دیتی ہیں یا مذہب کو فلسفے کے متبادل یا قائم مقام کے

۵۰۔ برٹرینڈ رسل ۔ ۵۱۔ وائٹ ہیڈ، فلسفہ اور تہذیب ۵۲۔ وائٹ ہیڈ، فلسفہ اور تہذیب

طور پر لا کھڑا کرتی ہیں کسی دور میں فلسفیانہ عمل میں عدم دلچسپی کا رویہ، ہو سکتا ہے بجائے خود ایک فلسفیانہ عمل کے نتیجے میں پیدا ہوا ہو جیسا کہ مسلمانوں کی تاریخ فلسفہ میں ابوالبرکات بغدادی، ابوالحسن زنجنی، قاضی افضل الدین المصری اور ابو حامد غزالی سے ظاہر ہوا۔ فلسفیانہ دلائل سے فلسفے کا رد بجائے خود فلسفہ اور فلسفیانہ عمل ہے لیکن اس کے نتیجے میں فلسفہ آخر کار ایک ایسی چیز میں بدل جاتا ہے جو فلسفہ نہیں رہتی، اس لیے کہ اس عمل کے جملہ نتائج و جوابات اگر قطعی اور یقینی ہیں اور ان پر شک و شبہ کی گنجائش نہیں تو مزید غور و فکر کی حاجت نہیں رہتی اور یوں ان قطعی اور یقینی جوابات کے حامل افراد اپنے ذہن کو ہمیشہ کے لیے معطل اور بند کر لیتے ہیں۔ نتائج جتنے یقینی ہوں گے شک کی گنجائش اتنی ہی کم ہوگی، ادعائیت (DOGMATISM) اتنی ہی زیادہ ہوگی، اور ذہن اتنا ہی زیادہ بند۔ درحقیقت[1] قطعی نتائج، عدم تشکیک، ادعائیت اور زوال تحقیق ہمیشہ ایک ساتھ رہتے ہیں۔

فلسفے کو تصوف میں بدلنے کی بنا غزالی نے ڈالی اور ابن عربی نے اسے ممکنہ انتہاؤں تک پہنچا دیا۔ غزالی نے فلاسفہ کے رد میں "تہافۃ الفلاسفہ" لکھی لیکن معلوم یہی ہوتا ہے کہ تہافۃ الفلاسفہ سے ان کا مقصود اپنے پیشرو فلاسفہ کی تردید تھا، خود فلسفے کی تردید نہ تھا۔ یونانیوں کی طرح مسلمانوں میں بھی فلسفہ علی الاطلاق نام تھا ریاضی طبیعیات اور مابعد الطبیعیات، ہر سہ علوم کا۔ مسلمان جب بھی فلسفے کی اصطلاح استعمال کرتے تھے، اس سے ان کی مراد یہی تین علوم ہوتے تھے۔ دیگر علوم عقلیہ مثلاً ہیئت، نباتیات، حیوانیات اور نفسیات وغیرہ انہی علوم میں شامل تھے۔ منطق کو علم فلسفہ کے حصول کا آلہ خیال کیا جاتا تھا۔ غزالی کا پیشرو فلاسفہ سے اختلاف صرف مابعد الطبیعاتی مسائل میں تھا ریاضی اور طبیعیات کی مخالفت سے نہ صرف غزالی نے گریز کیا بلکہ ان علوم کے لیے مذہبی حلقے کو نرم رویہ اختیار کرنے کی بھی سفارش کی۔ انھوں نے فقہ کو دینی علوم کی فہرست سے نکال کر دنیاوی علوم کی فہرست میں شامل کر دیا اور لوگوں کو اس طرف راغب کرنے کی کوشش کی کہ وہ فقہ کی بجائے طب کی تعلیم حاصل کریں۔ ان کے زمانے میں اطبا بالعموم عیسائی ہوا کرتے تھے۔ غزالی نے منطق کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا اور منطق کی تعلیم کو دینی علوم کی تحصیل کے لیے ضروری ٹھہرایا۔ یہ اسی فہمائش کا نتیجہ ہے کہ منطق آج تک دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں شامل چلی آ رہی ہے۔ جن مسائل میں غزالی نے اپنے پیشرو فلاسفہ سے اختلاف ظاہر کیا ان کی کل تعداد بیس ہے لیکن تردید صرف تین مسائل میں کی۔ دیگر سترہ مسائل میں فلاسفہ کو غزالی کے خیال میں "تکفیر کا مورد نہ ٹھہرایا جا سکتا تھا لیکن جن تین مسائل میں ان کی تردید غزالی نے ضروری خیال کی ان کے بارے میں اختتام کار غزالی کے رویے میں لچک آ گئی اور یہ عندیہ ظاہر کیا کہ یہاں بھی اتفاق کے پہلو نکل سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ غزالی اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن فلسفیوں کے خلاف جا بجا، بیجا تکفیر و تفسیق کے فتووں نے مذہبی گروہ کو ایسا اسلحہ فراہم کر دیا جسے خود فلسفے کے خلاف استعمال کیا گیا۔ غزالی کے افکار کا تخریبی پہلو ان کے تعمیری پہلو پر غالب آ گیا۔

غزالی بالطبع ایک مذہبی فلسفی تھے اور اس بنا پر ان کا رجحان حکمت مشائیہ کی بجائے حکمت اشراقیہ کی طرف تھا۔ تہافۃ الفلاسفہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں حکمائے مشائین کی تردید میں ہے۔ مشکوٰۃ الانوار میں انھوں نے جو افکار پیش کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکمت اشراقیہ کے موقف سے اتفاق رکھتے ہیں۔ مشکوٰۃ الانوار میں "مطاع" کو انھوں نے وہی درجہ دیا ہے جو افلاطون کے فلسفے میں DEMIURGE کو حاصل ہے اور جسے ابن عربی حقیقت الحقائق، عقل اول، العرش، قلم الاعلیٰ، روح الاعظم، اصول العالم، قطب الاقطاب، عین الاعیان، البرزخ، الہیولیٰ، انسان کامل وغیرہ کے القاب سے موسوم کرتے ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو فارابی اور بو علی سینا سے ان کے اختلافات کی وہ بنیاد منہدم ہو جاتی ہے جو ان کی تکفیر و تفسیق کا سبب ٹھہرائی جا سکتی تھی۔ مابہ الاختلاف صرف یہی بات رہ جاتی ہے کہ عقل و اشراق (وجدان) میں کس کو کس پر ترجیح حاصل ہے۔ چونکہ غزالی نے فلاسفہ کی تردید میں تکفیر و تفسیق اور تلعین و تبدیع سے کام لیا ہے اور اپنے

---

[1] اے سجے۔ باہم

قول کی تائید میں مذہبی عبارتیں پیش کرکے اپنے قول پر ایمان نہ لانے والوں کو کافر قرار دیا ہے اس لئے اس نتیجے کی طرف لوگوں کا ذہن منتقل ہونا فطری بات تھی کہ غزالی سرے سے فلسفے ہی کے خلاف ہیں اور ان کے اپنے انکار فلسفیانہ انکار نہیں مذہبی انکار ہیں۔ فلاسفہ کے مقابلے میں خود غزالی نے جو فلسفہ پیش کیا اس کے حق میں ان لوگوں کے رویّے میں جو غزالی سے اتفاق رکھتے تھے، ادعائیت اور تحکمانہ پن پیدا ہوگیا۔ مزید براں غزالی نے یہ کہہ کر کہ ان کے انکار کا ذریعۂ علم عقل نہیں کشف و وجدان ہے فلسفے کو تصوف میں بدل دیا۔

غزالی بلاشبہ ایک فقید المثال نابغۂ روزگار تھے۔ ان کا مقصود حقائق کی دریافت تھی۔ وہ مابعدالطبیعاتی مسائل کے حل میں اسی قطعیت اور یقینیت کے طلبگار تھے جو ریاضی اور طبیعیات میں پائی جاتی ہے۔ ان کی عقلی بلوغت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک "جب ہم کو اس بات کا علم ہو جائے کہ دس تین سے زیادہ ہیں اور اس کے بعد ایک شخص بول اُٹھے کہ نہیں تین زیادہ ہیں اور اس کی دلیل یہ پیش کرے کہ میں لاٹھی کو سانپ بنا سکتا ہوں اور واقعی لاٹھی کو سانپ بنا بھی دے تو اس کے معجزے، کرامت یا سحر کی وجہ سے کسی کو اس امر میں شک نہیں ہوسکتا کہ دس تین سے زیادہ ہیں البتہ اس کے فعل سے اس کی قدرت کے متعلق جس نے لاٹھی کو سانپ بنادیا تعجب ضرور ہوگا۔ لیکن اس علم میں (کہ دس تین سے زیادہ ہیں) کسی قسم کا شک نہیں ہوسکتا۔" غزالی کے نزدیک جو علم اس پائے کا نہ ہو نا قابلِ اعتماد ہے۔ ان کے بقول "میں نے اپنے نفس کو اس علم سے عاری پایا جو اس وصف سے موصوف ہو سوائے حسیات اور ضروریات کے اور اس طرح مایوس ہونے کے بعد ہمارے پاس مشکلات کو حل کرنے کے لئے سوائے جلیات یعنی حسیات اور ضروریات کے اور کوئی صورت نہیں۔"

دیکارت، ہیوم اور کانٹ کا یہ عظیم فکری پیش رو اپنے فکری سفر کے اختتام پر جس منزل پر کھڑا تھا تصوف کی منزل تھی جہاں لاٹھی کو سانپ بنتے دیکھ کر انھیں یقین آجاتا ہے کہ "تین دس سے زیادہ ہیں۔"

غزالی نے تصوف کو فلسفیانہ بنیاد فراہم کی اور ابنِ عربی نے اس بنیاد پر ایک ایسا نظامِ فکر مرتب کیا جو منطقی نظم و ضبط کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے۔ آیا ابن عربی ایک فلسفی صوفی تھے یا صوفی فلسفی۔ جواب کچھ بھی ہو وہ بہرحال اس بات کے پوری طرح حقدار ہیں کہ انھیں فلسفے کی تاریخ میں جگہ دی جائے۔ اگر فلاطینوس کو یہ حق دیا جاسکتا ہے تو ابن عربی کو اس سے محروم رکھنا زیادتی ہوگا۔ بارھویں صدی کے سپین نے دو انتہائی باثر مفکر پیدا کئے، ابن رشد اور ابن عربی۔ ابن رشد نے مغرب کو اور ابن عربی نے مشرق کو جن راہوں پر ڈالا آج تک انہی راہوں پر رواں دواں ہیں۔

ابن عربی اور ان کے متبعین نے فقہا کے برعکس فلسفے (ریاضی، طبیعیات اور مابعدالطبیعات) کو براہِ راست زک کبھی نہیں پہنچائی کہ ان کا اپنا نظامِ فکر بھی فلسفے (مابعدالطبیعات) پر مبنی ہے۔ لیکن ان کا نظامِ فکر قبول کرلینے کے بعد ریاضی اور طبیعیات کی اہمیت اور حصول کی گنجائش بمشکل ہی پیدا کی جاسکتی ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ ان علوم کا دائرۂ کار جلیات تک محدود ہے اور صوفیا جلیات کو مظاہر کا عالم خیال کرتے ہیں اور مظاہر ان کے خیال میں التباس ہیں اور دوسرے اس وجہ سے کہ صوفیا کا انہماک اور تعمق جن مسائل و امور میں تھا ان کے فہم و عبور میں ریاضی اور طبیعیات کا علم کسی قسم کا فائدہ نہ پہنچا سکتا تھا۔ صوفیا کی نظروں میں وہی علم وقیع تھا جس کا حصول نجاتِ اُخروی کے لئے ضروری تھا چونکہ ریاضی اور طبیعیات نجاتِ اُخروی میں ممد و معاون ثابت نہیں ہوسکتے تھے اس لئے ان علوم کا حصول ضیاعِ عمر تھا۔ نجاتِ اُخروی سے صوفیا کی مراد فنا فی اللہ ہے۔

صوفیا کا یہ رویہ صرف علوم عقلیہ ہی سے مخصوص نہیں، علوم نقلیہ کے بارے میں بھی وہ ایسا ہی رویہ رکھتے ہیں۔ صوفیا علم کی اصطلاح اپنی کیفیات و واردات قلبی کے بارے میں استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ چونکہ علم میں عالم و معلوم کی دوئی موجود ہوتی ہے جبکہ صوفیا کے نزدیک

وحدت ہی حقیقت ہے۔ اس لیے علم خواہ عقلی ہو یا نقلی، حجاب اکبر ہے۔ جب تک عالم و معلوم کے درمیان یہ حجاب اور دوئی برقرار ہے، حقیقت تک رسائی محال ہے۔ فقہا اور محدثین صوفیا کی نظروں میں اسی لئے علمائے ظاہر پرست شمار ہوتے ہیں کہ ان کے علم میں عالم و معلوم کی دوئی موجود ہوتی ہے، جبکہ حق واحد، حقیقت وحدت اور دوئی باطل ہے۔ صوفیا اپنے علم کو عرفان، معرفت اور حقیقت کا نام دیتے ہیں۔

صوفیا کے برعکس فقہا اور محدثین جو صوفیا کے اصل حریف ہیں، عرش پر مستوی و متمکن خدا کے قائل رہے ہیں اور بعض کے بقول خدا تمام انسانی اعضا و جوارح سے متصف ہے سوائے ڈاڑھی کے۔ ان کے خیال میں ابلیس نے صوفیا کو تلبیس میں ڈال رکھا ہے اسی لئے وہ خدا اور کائنات کی دوئی سے انکار کرتے ہیں اور کائنات کو اس کا مظہر گردانتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ کھلا ہوا زندقہ ہے اور **کفر ھم اشد من کفر الیھود**۔ ان کی احادیث موضوع اور تفاسیر من گھڑت ہیں اور جس چیز کو وہ حکمت الٰہیہ کہتے ہیں حکمت ضالہ ہے اور یونانیات ملعونہ سے ماخوذ ہے۔ یہ وہ حکمت نہیں جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے اور جس کے حامل فقہا و محدثین ہیں۔ حکمت کیا ہے؟ اس سوال کا پہلی بار واضح جواب فقہا و محدثین کی طرف سے ابن تیمیہ نے دیا ہے۔ ابن تیمیہ کے خیال میں حکمت سے مراد منہاج نبوت اور سنت رسالت ہے۔ یہ حکمت فقہا و محدثین کو حاصل ہے۔" دنیا میں حکمت صادقہ کا اس حکمت سے الگ کوئی وجود نہیں۔ علم و بصیرت کا اصل سرچشمہ کتاب و سنت ہے۔" صرف فقہا و محدثین ہی اس سرچشمے سے سیراب ہیں پس حکمت سے مراد، ابن تیمیہ کے نزدیک نہ تو فلسفہ ہے اور نہ تصوف جس کے صوفیا مدعی ہیں۔

اب تک حکمت علی الاطلاق سے مراد فلسفہ اور حکما سے مراد فلاسفہ ہی لئے جاتے تھے۔ مابعد الطبیعات کے لئے الٰہیات اور حکمت الٰہیہ کی اصطلاحیں بھی مستعمل تھیں۔ ہر چند دور تراجم میں فلسفے کی اصطلاح کا ترجمہ نہیں کیا گیا اور یہ اصطلاح من وعن لے لی گئی لیکن متکلمین کے زیر اثر فلسفہ اور حکمت بہر حال ہم معنی شمار ہونے لگے تھے۔ چونکہ فلاسفہ یونان کی طرح مسلمان فلاسفہ کندی، فارابی، بوعلی سینا، ابوبکر رازی اور ابن رشد دیگر علوم کے ساتھ ساتھ طب میں بھی مکمل مہارت اور دستگاہ رکھتے تھے اس لئے طب بھی حکمت میں شامل تھا۔ رفتہ رفتہ دیگر علوم زوال اور فراموشی کی نذر ہو گئے لیکن طب اپنی بُری بھلی صورت میں ابھی تک باقی ہے۔ ماضی میں فلسفے کے ساتھ اسی گہرے تعلق کی بنا پر آج بھی طبیب کو حکیم اور طب کو حکمت کہا جاتا ہے۔

حکمت کی جو تشریح اور مفہوم ابن تیمیہ نے پیش کیا اسے ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیم نے اس کے منطقی انجام تک پہنچا دیا۔ طب رائج الوقت کو یونانیات ملعونہ خیال کرتے ہوئے حافظ ابن قیم نے طب یونانی کے مقابلے میں طب نبوی کی اصطلاح وضع کی اور "زاد المعاد" کی ایک جلد میں آنحضرتؐ سے منسوب وہ تمام روایات یکجا کر دیں جن کے مطابق انھوںؐ نے کسی چھوٹے موٹے عارضے کی حالت میں کسی خاص چیز کے استعمال کی یا اس سے پرہیز کی ہدایت کی تھی [جو حلقے طب یونانی کو طب اسلامی منوانے پر مصر ہیں۔ حافظ ابن قیم نے انھیں لمحۂ فکریہ فراہم کیا ہے] ابن خلدون نے ابن قیم کی اس کوشش کو بے سود اور مضحکہ خیز قرار دیتے ہوئے لکھا کہ پیغمبر اس لئے نہیں بھیجے جاتے کہ لوگوں کو طب کی تعلیم دیا کریں۔ ان کا کام نجات اُخروی کا حصول ممکن بنانا ہوتا ہے۔ ابن خلدون کے بقول طب نبوی کی ذیل میں جو ٹوٹکے جمع کئے گئے ہیں۔ انھیں آنحضرتؐ کے ساتھ اختصاص حاصل نہیں اس طرح کے گھریلو علاج اہل عرب میں پہلے سے مستعمل تھے۔

حکمت کا جو مفہوم اور تشریح ابن تیمیہ اور ابن قیم پیش کرتے ہیں اس کی تہ میں موجود فکری مغالطے کی نشاندہی ضروری معلوم ہوتی ہے ان اصحاب نے حکمت کو منہاج نبوت اور سنت رسالت کے مترادف ٹھہرا لینے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اس سے منطق، مابعد الطبیعات و طب وغیرہ کا استخراج و استنباط کر کے حکمت کی وہی تشریح تسلیم کر لی جسے وہ بظاہر رد کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک تو بات درست تھی کہ قرآن میں جہاں کہیں الحکمت کا لفظ آیا ہے اس سے مراد سنت ہے لیکن آگے چل کر انھوں نے سنت میں ان موضوعات کو بھی شامل ٹھہرا لیا جو حکمت یونانیہ

کو شمول ہیں۔ اگر حکمت میں طب تک شامل ہے خواہ طب سے مراد "طب نبوی" ہی کیوں نہ ہو تو "حکمتِ صادقہ" بھی انہی موضوعات، مسائل و مباحث کو محیط اور ان پر مشتمل ثابت ہوتی ہے جن پر "حکمتِ ضالہ" مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں حافظ ابن قیم نے ان مشکلات کو پیش نظر نہیں رکھا جو ان کی "طب" کے فارغ التحصیل کو چیچک، خسرہ اور مراق جیسی بیماریوں کی صورت میں پیش آ سکتی تھیں کہ ان کا کوئی نسخہ علاج ان کی کتاب میں درج نہیں ہے۔ آیا ان بیماریوں میں "اسلامی طبیب" کو "ملحدوں کے امام" بوعلی سینا[۵] اور ابوبکر رازی جیسے "زندیق" کے تجویز کردہ نسخوں سے علاج کی اجازت تھی یا نصوص سے استنباط و اجتہاد کا حکم تھا اور آیا اجتہاد ممکن بھی تھا یا نہیں،

چہ دست می بری اے تیغ عشق اگر داد است   ببر زبانِ ملامت گرِ زلیخا را

آج کل جدید طبعی علوم (NATURAL SCIENCES) کو "مسلمان" کرنے کی جو صدائیں گونج رہی ہیں بظاہر نئی معلوم ہوتی ہیں لیکن درحقیقت وہی آموختہ ہے جسے عصر حاضر کے ابن تیمیہ اور ابن قیم کہلوانے کے خواہشمند دہرا رہے ہیں اور اس کا نتیجہ بھی وہی ہوگا جو حکمتِ یونانیہ کو "مسلمان" کرنے کے بعد سامنے آیا ہے۔

یہی وہ علمی اور فکری پس منظر تھا جس میں مغلوں، ترکوں اور تاتاریوں کا ورود ہوا۔ ایک طرف صوفیا تھے اور دوسری طرف فقہا و محدثین علوم عقلیہ کے بارے میں دونوں کا رویہ ملتا جلتا تھا۔ گیارھویں صدی کے بعد ملّتِ اسلامیہ کا دریائے فکر انہی دو تنگ کناروں کے درمیان بہہ رہا تھا جس میں بڑے جہازوں کی آمد و رفت ممکن نہ رہی تھی۔

اب اگر ہندوستان کی مغلیہ تہذیب اپنے تشخص کے لحاظ سے اس تہذیب سے مختلف تھی جسے سہولت فہم و امتیاز کی خاطر عربی تہذیب کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے تو اس تہذیب میں وہی افکار کار فرما تھے جن کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ یہ افکار پوری مسلمان دنیا میں یکساں طور پر اشاعت یافتہ اور مقبول تھے۔ اس بنا پر ہندوستان باقی مسلمان دنیا کے مقابلے میں کسی قسم کی امتیازی خصوصیات کا حامل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں اس زمانے میں صرف ہندوستان پر ہی نہیں دیگر قابل ذکر مسلمان ممالک پر بھی ترکی خانوادے ہی حکومت کر رہے تھے۔ مصر، شام، عراق، اردن، فلسطین، لبنان، جزیرہ نمائے عرب، شمالی افریقہ، ایشیائے کوچک پر عثمانی ترکوں کی حکومت تھی۔ ہندوستان تیموری ترکوں کے زیرنگین تھا اور وسطی ایشیا میں ازبکوں، تیموریوں اور ترکمانوں کی حکومتیں قائم تھیں صرف ایران میں صفویوں کی حکومت تھی لیکن فکری اعتبار سے ایران دیگر مسلمان ممالک سے مختلف نہیں تھا، بلکہ مغل ہندوستان میں جو اثر و رسوخ ایرانیوں کو حاصل تھا مقامی باشندوں کو کبھی حاصل نہیں ہوا۔ مغلیہ دور کے ہندوستان میں ایرانی ہی تخلیقی اقلیت تھے اس لئے یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کی مغلیہ تہذیب صحیح معنوں میں کامل اور علیحدہ تشخص کی حامل تہذیب تھی۔

تاہم ڈاکٹر صاحب کے موقف کو آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے دلائل کی کمی نہیں ہے جن سے ان کے موقف کو تقویت پہنچتی ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب کے موقف کو بتمام و کمال قبول نہ بھی کیا جائے تو بھی اسے مکمل طور پر رد کر دینا ممکن نہیں۔ تہذیبوں کے تقابلی مطالعے کے سلسلے میں جن لوگوں کے افکار کو اہمیت حاصل ہے ان میں ایک وقیع نام دانیلیفسکی کا بھی ہے۔ دانیلیفسکی کے نزدیک تہذیبی عمل میں کردار کے لحاظ سے نوعِ انسانی کو تین قسم کی جمعیتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی جمعیت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو تعمیری اور تخلیقی کردار کے حامل ہوتے ہیں۔ تہذیب انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہے اور تہذیبی عمل کا سارا دار و مدار ان کی صلاحیتوں کی روبکاری پر ہوتا ہے۔ اس گروہ میں مصری، چینی، آشوری، فنیقی، بابلی، سمیری، ہندو، ایرانی، عبرانی، رومی، عرب اور جرمانی قبائل شامل ہیں۔ دوسری جمعیت ترک، مغول اور ہن قبائل کی ہے جن کا کردار تخریبی اور منفی ہوتا ہے۔ یہ قبائل حملہ آوروں کی صورت میں نزع میں گرفتار تہذیبوں کو موت

۵۔ بوعلی سینا کو ملحدوں کا امام اس کی اشارات کو ملحدوں کا قرآن اور ابوبکر زکریا رازی کو زندیق کے خطابات حافظ ابن قیم کے عطا کردہ ہیں۔

سے ہم کنار کرنے اور ان کا نام و نشان مٹا دینے کے بعد منظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ تیسری جمعیت ان قبائل پر مشتمل ہے جن کی جوششِ تخلیق، بوجوہ ابتدا ہی میں کچل گئی ہوتی ہے اس لئے یہ جمعیت نہ تو تعمیری، تخلیقی اور مثبت کردار ادا کرتی ہے اور نہ تخریبی اور منفی کردار کی حامل ہوتی ہے۔ بلاشبہ تہذیبوں کے تنوع اور بار آوری میں، اضافہ انہی کے باعث ہوتا ہے لیکن بجائے خود ان کی مثال اس غیر نامیاتی مادے[لہ] (یا ETHNOGRAPHIC MATERIAL) کی سی ہوتی ہے جو تاریخی عضویے (تہذیب) میں شامل ہوتا ہے جس کی علیحدہ کوئی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ تعمیری یا تخریبی عوامل کے آلۂ کار کے طور پر یا ان کے ہاتھوں خام مواد کے طور پر استعمال ہوتا ہے، خود اپنے طور پر یہ جمعیت کسی تہذیب کی بنیاد نہیں رکھ سکتی۔

بعض اوقات ایک ہی گروہ تخریبی اور تعمیری یعنی مثبت اور منفی دونوں کام انجام دیتا ہے مثلاً عربی اور جرمانی قبائل کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زوال پذیر اور جاں بلب مہذب اقوام ٹوٹ پھوٹ کر تیسری قسم کی جمعیت میں بدل جاتی ہیں تا وقتیکہ ایک نیا صورت گر اور تخلیقی اصول ان پریشان عناصر میں بعض نئے عناصر کی شمولیت کے ساتھ ایک ایسی وحدت پیدا کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں ایک مستقل حیثیت کی حامل نئی تہذیب پیدا ہوتی ہے۔ دانیلیفسکی کے خیال میں تاریخ سے اس کی مثال ان لوگوں کی دی جا سکتی ہے جنھوں نے مغربی رومی سلطنت (تہذیبِ روما) کی بنیاد رکھی۔ سلطنت کی تباہی کے بعد تیسری قسم کی جمعیت میں تبدیل ہو گئے۔ اس خام مواد کو جرمانی اقوام نے نئی صورت دی جس کا نتیجہ جرمانو رومانی تہذیب (جدید مغربی تہذیب) ہے۔

دانیلیفسکی نے مغلوں اور ترکوں کو منفی اور تخریبی کردار کی حامل جمعیت قرار دیا ہے۔ اس کے بیان کا یہ حصہ محلِ نظر ہے۔ یہ بیان یورپی تاریخ کے حوالے سے تو کسی حد تک درست قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ایشیا کی تاریخ اس بیان کی تردید کے وافر شواہد فراہم کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی اور جرمانی قبائل کی طرح مغل اور ترک بھی منفی اور مثبت یعنی تخریبی اور تعمیری کردار کے حامل رہے ہیں۔ یورپ پر باطوخان اور امیر تیمور کی لشکر کشی ان کی مہم جوئیوں کی تسکین کی خاطر تھی۔ یورپ کا موسم ایشیائی فاتحین کی اس خواہش کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا کہ وہاں وہ کسی مستقل سلطنت کی داغ بیل ڈالیں۔ باطوخان نے روس سے لے کر مشرقی جرمنی تک کئی ممالک تاراج کر ڈالے لیکن خان اعظم کی وفات کی خبر سن کر فتح یورپ کی مہم ادھوری چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ امیر تیمور نے ۱۳۹۵ء میں ماسکو فتح کیا، وہاں ایک سال تک قیام بھی کیا لیکن اس کے بعد اسے خیال بھی نہ آیا ہو گا کہ ماسکو جیسے چھوٹے شہر کی فتح اس کی فتوحات کی فہرست میں اہمیت رکھتی ہے۔ کریمیا کے تاتاری خوانین دو سو سال تک محض ایک ریزیڈنٹ کی وساطت سے ماسکو کی حکومت میں دخیل رہے اور خراج وصول کرتے رہے۔ عثمانی ترکوں کو بلاشبہ یونان، البانیہ چیکوسلاواکیہ، بلغاریہ، ہنگری، یوگوسلاویہ اور رومانیہ پر براہ راست تسلط حاصل رہا لیکن وہاں کی مسیحی اکثریت کے تعلیمی، مذہبی، اور ثقافتی امور میں مداخلت سے ہمیشہ اجتناب کیا اور یہ بات بھی ہمیں بھولنی چاہیئے کہ عثمانیوں کی آمد کے موقع پر یہ علاقے کسی لحاظ سے تہذیب و تمدن کے حامل علاقے نہ تھے بلکہ اسی تاریک دور میں سے گزر رہے تھے جس سے مغربی یورپ کے ممالک گزر چکے تھے۔ ان علاقوں میں تہذیب و تمدن کی شمع روشن ہی نہ تھی جسے عثمانیوں نے آ کر بجھا دیا ہو۔

دانیلیفسکی نے تصویر کا وہی رُخ پیش نظر رکھا جو یورپ کے سامنے آیا تھا۔ ایشیا نے تصویر کے دونوں رخ دیکھے۔ ہلاکو خاں جو سفاکی اور شقاوت میں چنگیز خاں سے کسی طرح کم نہ تھا، اپنے آخری دور میں ممکن حد تک علم پرور بھی ثابت ہوا ہے۔ اس نے مراغہ میں نہ صرف ایک بڑی رصدگاہ قائم کر کے نصیر الدین طوسی جیسے بے مثال ریاضی داں اور علم ہیئت کے ماہر اور محقق کو تحقیقات کی سہولت فراہم کی بلکہ ریاضی، طب، طبیعات، منطق، فلکیات اور مابعد الطبیعات پر چار لاکھ سے زیادہ کتابیں فراہم کر کے ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی قائم کیا جہاں حصول علم کی خاطر آنے والوں کو ہر طرح

[لہ] INORGANIC MATERIAL

کی سہولت حاصل تھی۔ قطب الدین شیرازی سے ایک بار ملاقات کے موقع پر ہلاکو خاں نے کہا تھا کہ "تم نصیر الدین طوسی کے ممتاز شاگردوں میں سے ہو، کوشش کرو کہ ان کے علوم کا کوئی حصہ تم سے چھوٹنے نہ پائے۔" ایسی ہی علم پروری کا ثبوت تیمور اور آلِ تیمور نے بھی دیا۔ تیمور ہر جگہ سے اصحابِ علم و ہنر اپنے ساتھ سمرقند لے جاتا تھا۔ سعد الدین تفتازانی اور سید شریف جرجانی کے سے اہل فضل اس کے متوسلین دربار میں سے تھے۔ تیمور کے جانشین مرزا الغ بیگ کی رصدگاہ اپنے زمانے کی سب سے بڑی رصدگاہ تھی۔ مغل، تاتاری اور ترک اپنا تخریبی کردار ادا کرنے کے بعد ایک نئے صورت گر تخلیقی اصول کے تحت پریشان عناصر (مفتوحہ مسلم اقوام) کو یکجا کر کے انھیں ایک وحدت کی شکل دیتے معلوم ہوتے ہیں لیکن انھیں جو صورت حال درپیش تھی اس صورت حال سے قطعاً مختلف تھی جو عربی اور جرمانی فاتحین کو پیش آئی تھی۔ عربوں اور جرمانیوں کو جن عناصر پریشاں سے سابقہ تھا، انھیں اس حالت میں یعنی تیسری قسم کی جمعیت میں تبدیل ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں۔ تہذیبِ روما اور تہذیبِ بغداد کے درمیان پانچ سو سال سے زیادہ کا اور تہذیب روما اور جدید مغربی تہذیب (جرمانو رومانی تہذیب) میں ڈیڑھ ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ حائل تھا۔ یہ انفعالی مواد (یعنی عناصرِ پریشاں) قبولیت عمل اور نتیجہ خیزی کے لئے پوری طرح موزوں تھا۔ اس کے برعکس مغلوں اور ترکوں کو جس مواد پر عمل کرنا تھا پوری طرح منفعل (PASSIVE) نہ تھا۔ عربی تہذیب بلاشبہ مغلوں اور ترکوں کے ظہور کے وقت تنزل پذیر ہو چکی تھی تاہم ایسی حالت میں نہ تھی کہ اسے تحجر اور خفتگی کی حالت کہا جا سکے۔ اس پر تاریکی کا کوئی دور اس طرح کا نہ گزرا تھا جس طرح کا دور تہذیب روما کے یورپ پر گزر چکا تھا، اس لئے مفتوحہ اقوام تیسری قسم کی جمعیت (ETHNOGRAPHIC MATERIAL) میں تبدیل نہ ہوئی تھیں۔ یہ مواد قبولیتِ عمل اور نتیجہ خیزی کے لئے پورے طور پر تیار نہ تھا۔ بنا بریں مغول و تاتار ایک نئے صورت گر تخلیقی اصول کی حیثیت سے عناصرِ پریشاں کو یکجا کر کے ایک نئی وحدت کی شکل دینے میں پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکے۔ عثمانیوں کے زیرِ تسلط علاقوں میں اگر اتنی کامیابی بھی حاصل نہ ہو سکی جتنی ایلخانیوں (آل ہلاکو) اور تیموریوں کے زیرِ نگیں علاقوں میں ممکن ہوئی تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ عثمانی ترک علم و تہذیب کے دشمن تھے جیسا کہ علمائے یورپ اور بعض علمائے عرب ہمیں باور کراتے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ عثمانیوں کو جن علاقوں پر تسلط حاصل ہوا، عربی تہذیب کے مراکز تھے اور ان علاقوں کی جمعیتیں ETHNOGRAPHIC MATERIAL میں کبھی تبدیل نہ ہوئی تھیں۔ علوم و فنون کے بارے میں ان کے تحت الشعور معتقدات تہذیبی سطح پر ان کی امنگوں اور جستجوؤں کے تعین کی صلاحیت سے عاری نہ ہوئے تھے۔ روحِ عصر، یا مزاجِ عصر میں کسی قسم کی تبدیلی نہ آئی تھی۔ "نو مسلم حکمران مذہب و علم سے نا آشنا تھے اس لئے مذہبی (اور علمی) حکومت تمامتر علماء و فقہاءِ مذاہب کے ہاتھ آ گئی تھی۔ یہ مغلوں اور تاتاریوں کے زیرِ نگیں علاقوں میں حال تھا، عثمانیوں کے زیرِ تسلط علاقوں دیارِ مصر و شام میں رسمی خانقاہوں اور خرقہ پوشوں کی شہنشاہی تھی۔" (تذکرہ ابوالکلام آزاد) مذہبی اور علمی معاملات میں آخری فیصلہ شیخ الاسلام کا ہوتا تھا۔ شیخ الاسلام کا عہدہ سب سے پہلے اسی دور میں قائم ہوا۔ شروع شروع یہ عہدہ ایک مذہبی عہدہ تھا لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس عہدے پر فائز اصحاب سیاست میں بھی دخیل ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مغل ہندوستان اور صفوی ایران کا اپنا اپنا شیخ الاسلام تھا یہی وہ CLIMATE OF OPINION تھی جس میں تبدیلی کم و بیش ناممکن ہو چکی تھی اور جس کے باعث مغلوں، تاتاریوں اور ترکوں کو ایک نئے صورت گر تخلیقی اصول کی حیثیت سے مکمل کارگردگی میں دشواری درپیش تھی۔

جن لوگوں نے تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ تہذیبوں کے جمالیاتی قالبوں (AESTHETIC FORM) کے حوالے سے کیا ہے ان میں برطانیہ کے سر فلینڈرس پیٹری (SIR FLANDERS PETRIE) اور جرمنی کے پال لگیٹی (PAUL LIGETIE) کے نام نمایاں ہیں۔ ہر دو کے خیال میں ہر تہذیب میں فنون کی مختلف اقسام اور صورتوں میں اور ان کی عہد بعہد نشو و نما میں ایک خاص ترتیب اور تسلسل پایا جاتا ہے۔ ابتدا فن تعمیر اور سنگتراشی سے ہوتی ہے اور سائنس اور میکانیات کا زمانہ آخر میں آتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر ہم ہندوستان کی

مغلیہ تہذیب کا جائزہ لیں تو ڈاکٹر آغا افتخار حسین کے موقف سے انکار مشکل ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان کی مغلیہ تہذیب صرف اپنے تعمیراتی، ادبیاتی اور مصوری کے ادوار ہی میں داخل ہوئی تھی اور اپنے عروج کو پہنچے بغیر ہی دم توڑ گئی جمالیاتی حوالے سے اگر تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ قابل اعتماد ہے (یقیناً بڑی حد تک قابلِ اعتماد ہے) تو اس حوالے سے پوری مسلم دنیا تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے دور میں داخل ہو چکی تھی۔ ہندوستان کی مغلیہ تہذیب کو زمانۂ ماقبل کی عربی تہذیب سے جس بنا پر ممتاز قرار دیا جا سکتا ہے اس بنا پر اسے ایران اور عثمانی دولت کے مقابلے میں کسی اختصاص کا حامل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مغل ہندوستان، صفوی ایران اور دولتِ عثمانیہ میں ایک ہی تہذیب نمو پذیر تھی مغل، ایرانی اور عثمانی دولتوں کا گراف ساتھ ساتھ اوپر جاتا اور نیچے آتا ہے۔ سترھویں صدی کے اختتام کے ساتھ ہی ان معاشروں پر تھکن کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں اور ایک صدی کے اندر اندر جرمانو رومانی تہذیب (جدید مغربی تہذیب) سائنس اور ٹیکنالوجی میں اپنی برتری کے باعث انہیں صدیوں پیچھے دھکیل دیتی ہے۔

مشرق اور مغرب کا یہ مقابلہ دو مختلف CLIMATES OF OPINION کا، زندگی کے بارے میں دو مختلف نقطہ ہائے نظر اور رویوں کا مقابلہ تھا۔ گیارھویں صدی کے بعد مشرق نے ریاضی اور طبیعات کو "مابعد الطبیعات" کی خادمائیں اور ماما ئیں خیال کرنا شروع کیا اور جلد ہی یہ سوچ کر کہ ان علوم کا حصول نجات اُخروی کے لئے ضروری نہیں، ان میں غور و فکر ختم کر دیا۔ ان حالات میں فضیلت (VIRTUE) کے ایک ایسے تصور کو فروغ ہوا جو بتمام وکمال پارسائی کے اس مفہوم سے وابستہ تھا جو علم و عمل کے دائرے کو بے حد تنگ کر دیتا ہے۔ نتیجۃً وہ اوصاف و فضائل مثلاً فلسفہ، سائنس، ٹیکنالوجی، طب، جراحی، ہندسہ اور فنون لطیفہ میں مہارت اور عبور جن کا تعلق فرد واحد کی نجات کی بجائے پورے معاشرے کی خوشحالی اور مسرت سے ہے ایک اچھے (VIRTUOUS) آدمی کے فضائل و اوصاف شمار نہیں ہوتے۔ فضیلت کے بارے میں اس نقطۂ نظر کے حامل افراد کے نزدیک ایک عابد شب زندہ دار کو اس شخص پر فضیلت حاصل ہے جو کسی مہلک مرض کا علاج دریافت کر کے بلا تمیز ملک و ملت پوری نسل انسانی کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ دوسری طرف مغرب، ریاضی اور طبیعات اور مابعد الطبیعات کو ان کی مستقل اور علیحدہ حیثیت میں برقرار رکھنا سیکھ چکا تھا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مراد بک نے علماء ازہر سے مشورہ طلب کیا۔ علماء ازہر کی متفقہ رائے یہی تھی کہ نپولین پر فتح حاصل کرنے کے لئے بخاری شریف کے ختم سے بڑھ کر تیر بہدف اور کارگر نسخہ اور کوئی نہیں۔ اِدھر اہرام کی لڑائی شروع ہوئی اور اُدھر جامعۂ ازہر میں بخاری شریف کا ختم شروع ہوا۔ ابھی بخاری شریف کا ختم ختم بھی نہ ہوا تھا کہ لڑائی ختم ہو گئی[۵۷] اور اس کے ساتھ ہی خالص تقویٰ کی فضا میں مصر کی اسلامی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا: خلق الله للحروب رجالاً ورجالاً لقصعة وثريد

کچھ ہی مدت بعد زار روس کی افواج جب بخارا پر حملہ آور ہوئیں تو اہل بخارا کو اپنی فتح کی تدبیر ختم خواجگان میں نظر آئی۔ ایک طرف آگ اُگلتی توپیں تھیں اور دوسری طرف خشوع و خضوع میں ڈوبی ہوئی "یا مقلب القلوب"، "یا محول الاحوال" کی دردناک پکار۔ تھوڑی ہی دیر بعد بخارا کی فصیل دیوار گریہ میں بدل چکی تھی جس سے لپٹ کر رو دیا تو جا سکتا تھا لیکن اس کے پیچھے پناہ نہیں لی جا سکتی تھی۔ مشرق کی "مابعد الطبیعات" مغرب کی طبیعات کے سامنے تھوڑی دیر بھی نہ ٹھہر سکی ؂

چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

سات صدیاں پہلے یورپ کے صلیبی بھی مسلمانوں کے مدفعوں سے نکلنے والے آتشیں بانوں کا مقابلہ دعاؤں سے کیا کرتے تھے اور یہی نتیجہ نکلا کرتا تھا[۵۸]

سارت مشرّقة وسرت مغرّب شتّان بين مشرّق ومغرّب

۵۷ غبار خاطر، ابوالکلام، مکتوب ۵، دسمبر ۱۹۴۲ء

۵۸ غبار خاطر، ایضاً

خطبۂ الوداع آخری طویل وحی غیر متلو تھی جو فصاحت و بلاغت اور ایجاز و تاثیر کے لحاظ سے وحی متلو سے کسی طرح کم نہ تھی اور سامعین بھی اس قدر کثیر تعداد میں اس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی جمع نہ ہوئے تھے۔ آنحضورؐ انھوں نے اپنے ہاتھ اپنے کانوں پر دھر رکھے تھے۔ اس لئے نہیں کہ آوازِ حق و صداقت ان کے کانوں میں نہ پڑ سکے، جیسا کہ اس سے پہلے ان میں سے بہتوں کا شیوہ رہ چکا تھا، بلکہ اس طرح کہ آنے والی آواز کانوں کے اوپر ہی اوپر سے کہیں اور نہ نکل جائے اور وہ جو کچھ کہا جا رہا ہے سننے سے محروم نہ رہ جائیں سننے والوں نے سنا۔ **ایاکم والغلو فی الدین۔ فانما اھلک قبلکم الغلو فی الدین** ۔یعنی دین میں غلو مت کرو کہ تم سے پہلی قومیں بھی اسی سے ہلاک ہوئیں پس ہماری ناکامیوں اور نامرادیوں، ہلاکتوں اور بربادیوں کا اصل سبب دین سے انحراف نہیں جیسا کہ گزشتہ کئی سالوں سے ہمیں باور کرایا جا رہا ہے بلکہ دین میں غلو ہے۔ مصر اور بخارا کے لوگ اسلام چھوڑ کر کسی نئے دین کے پیرو نہیں بن گئے تھے اور نہ اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اسلام سے ان کی وابستگی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ ان کے اربابِ حل و عقد علما تھے اور امور ریاست انہی کے مشورے سے طے پاتے تھے۔ پھر علمائے مصر و بخارا بدکردار لوگ بھی نہ تھے، بلکہ بڑے متقی، پارسا اور صالح لوگ تھے لیکن صالحیت صلاحیت کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ مرض کا علاج جس دوا سے ممکن تھا اس کا نسخہ ان کی قرابا دین میں سرے سے موجود ہی نہ تھا:

دانم کہ شفیق اند طبیبان ہمگی لیک　　مرہم کہ نہ مجوب نہد دشمن ریش است

اور نہ اس دوا کا پودا اس زمین میں اُگ سکتا تھا جو انھوں نے تیار کر رکھی تھی:

در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

جب علم کے بارے میں صدیوں سے یہ عقیدہ چلا آ رہا ہو کہ:

العلم ما کان فیہ قول حدثنا　　وما سوا ذاک وسواس الشیاطین

تو اس زمین میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا تخم کیونکر اگایا اور پروان چڑھایا جا سکتا تھا۔

اپنی کتاب میں متعلقہ مبحث میں ایک موقع پر ڈاکٹر صاحب نے جائز طور پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ مغلیہ دور میں بڑی بڑی عمارتیں تعمیر ہوئیں خوبصورت باغ بھی لگائے گئے لیکن کیا کسی یونیورسٹی کی بنیاد بھی رکھی گئی؟ گزشتہ بحث اسی سوال کے مختلف اور متنوع پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش ہے۔ شاید اس بحث سے قوموں کی شکست و زوال کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے نقطۂ نظر تک رسائی بھی آسان ہو جاتی ہے۔ قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا خلاصہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ "تہذیب یا معاشرہ کے عروج و زوال کی بنیاد افکار پر ہے۔ زوال پذیر معاشرہ وہ ہوتا ہے جہاں افکار تازہ پیدا ہونے بند ہو جاتے ہیں یا کم ہو جاتے ہیں یا افکار میں حرکت کم ہو جاتی ہے اور ایک طرح کا فکری جمود طاری ہو جاتا ہے۔ جب تک افکار میں حرکت رہتی ہے افکار زندہ رہتے ہیں یا جب تک افکار زندہ رہتے ہیں حرکت کرتے رہتے ہیں بعض اوقات غلط اور نقصان دہ افکار بھی ابھرتے ہیں لیکن افکار کی حرکت اور جدلیت انھیں کمزور کرتی چلی جاتی ہے معاشی اور معاشرتی تبدیلیاں انہی افکار سے پیدا ہوتی ہیں۔"

افکار کی زندگی اور حرکت کا دار و مدار ڈاکٹر صاحب کے نزدیک خود تنقیدی اور خود احتسابی کے عمل پر ہے۔ جو قومیں تنقید و احتساب سے گریز کا راستہ اختیار کرتی ہیں بالآخر شکست و زوال سے دوچار ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے افکار کا یہ پہلو انتہائی اہم اور توجہ طلب ہے اور گزشتہ ادوار کی مختلف تہذیبیں اس کی تائید میں وافر شواہد فراہم کرتی ہیں۔ گزشتہ بحث کا وہ حصہ جس میں تہذیب اور فلسفے کے باہمی ربط و تعلق کا بیان آیا ہے اس کی وضاحت و تائید میں دوبارہ پڑھا جا سکتا ہے۔

انشائیہ اور نثری نظم

سید مشکور حسین یاد

آپ جانتے ہیں میں انشائیہ کو ادب کی ام الاصناف کہا کرتا ہوں اور اس سے میری مراد یہ ہوتی ہے کہ ادب کی جس قدر بھی اصناف ہیں وہ انشائیہ کے بطن ہی سے وجود میں آئی ہیں۔ اس پر ایک صاحب بولے "یعنی آپ کا مطلب ہے شاعری کی اصناف بھی انشائیہ ہی کی کوکھ سے نکلی ہیں؟" میں نے اس کا جواب اثبات میں دیا تو ان صاحب نے بڑے زور سے لاحول پڑھی اور میرا مذاق اڑاتے ہوئے میرے پاس سے اُٹھ کر چلے گئے۔ اس کے بعد کئی دوسرے مواقع پر بھی دوستوں نے میری اس بات پر اتفاق کرنا تو در کنار کبھی سنجیدگی سے غور بھی نہیں کیا۔ ہاں میں کسی حد تک یہ بات منوانے میں ضرور کامیاب ہو گیا کہ نثری اصناف کی اماں حوا انشائیہ ہے لیکن اصنافِ شاعری کے بارے میں کوئی میری بات پر ذرا بھی دھیان دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ لہٰذا میں وقتی طور پر خاموش ہو گیا اور میں نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ یہ تمام نثری اصنافِ ادب انشائیہ کے وسیلے سے معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ میں اپنے قول کی مکمل صداقت کو منوانے کے لیے کسی خاص موقع کا انتظار کرنے لگا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ پچھلے دو تین برسوں سے نثری نظم[1] کا خوب چرچا ہے۔ آپ جانتے ہیں جس چیز کا بہت چرچا ہوتا ہے ہم اسے بہت نئی چیز بھی سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جس چیز کا بہت چرچا ہو رہا ہو وہ نئی بھی ہو۔ نثری نظم کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ ہے۔ یار لوگوں نے جہاں اس کا خوب خوب چرچا کیا وہاں یہ بات بھی مشہور ہوتی چلی گئی کہ نثری نظم ایک بالکل نئی چیز ہے۔

غور سے دیکھا تو نثری نظم قطعی طور پر نئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس یہ تو بہت پرانی یعنی باقاعدہ شاعری سے بھی پرانی چیز ہے۔ اور اگر یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ نثری نظم تو انسان کا اولین شاعرانہ اظہار ہے۔ اس سے قبل کہ میں اپنے اس قول کی تائید میں ایک نہیں بے شمار مثالیں پیش کروں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ نثری نظم کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے انشائیہ اور نثری نظم کے تعلق کو سمجھنا ضروری ہے۔

ممکن ہے آپ اس وقت یہ سوچ رہے ہوں کہ انشائیہ اور نثری نظم کو ایک رشتے میں منسلک کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ ان دونوں کا آپس میں کیا تعلق ٹھہرتا ہے۔ بغور دیکھا جائے تو آسانی سے پتہ چلتا ہے کہ انشائیہ اور نثری نظم ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ ہو سکتا ہے میرے اس بیان پر تو آپ کو اور بھی تعجب ہو لیکن اس کے جواب میں بھی میرا یہی کہنا ہے کہ انشائیہ اور نثری نظم کوئی دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر لکھنے والا کسی شعری تخلیق کے موڈ میں ہے اور وہ بھی کسی پابندی کے بغیر (یعنی اسے وزن کی پابندی بھی گوارا نہیں) تو پھر ایسی صورت میں جو چیز تخلیق ہو گی ہم اسے بنیادی طور پر تو انشائیہ ہی کہیں گے لیکن شاعرانہ اور غیر شاعرانہ تخلیق کے فرق کو قائم رکھنے کے لیے ہم اسے نثری نظم کا نام دے سکتے ہیں۔ تو گویا نثری نظم اصل میں انشائیہ ہے۔ انشائیہ کیوں ہے؟ اس سوال کے جواب میں بھی میری گزارش یہی ہے جسے میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ انشائیہ ہم اس ادبی اظہار کو کہتے ہیں جو کسی لکھنے والے کے قلم سے اسی وقت معرضِ وجود میں آتا ہے جب اس پر تخلیقی موڈ انتہائی شدت کے ساتھ طاری ہوتا ہے، اتنی شدت کے ساتھ کہ وہ اس کے اظہار کے لیے کسی قسم کی پابندی ضروری

---

[1] ضروری نہیں کہ ادارہ مصنف سے متفق ہو مگر اس موضوع پر دلچسپ اور مفید بحث کا آغاز یقیناً ہو سکتا ہے ——— ادارہ

نہیں سمجھتا۔ اس بات کو مزید وضاحت کے لیے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ انسان فطرتاً آزاد منش ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ پر جس قسم کی بھی پابندیاں عائد کرتا ہے ان کا وجود بعد کی چیز ہے اس لیے ادب میں بھی جو کچھ اس نے ابتدا میں تخلیق کیا وہ بھی اس کی آزاد منشی کا مظہر ہے۔ جملہ اصنافِ نثر و نظم کی جتنی بھی پابندیاں ہیں وہ قطعی طور پر بعد کی چیزیں ہیں۔ ابتدا میں وہ نہ نثر میں کسی پابندی کا قائل تھا اور نہ شاعری میں۔ چنانچہ اس کا جیتا جاگتا ثبوت نثری نظم ہے۔ نثری نظم کی بات میں خاص طور پر اس لئے کر رہا ہوں کہ نثر کی جملہ اصناف کی پابندیاں تو پھر بھی اتنی ظاہر نہیں ہیں کہ انھیں ایک عام قاری محسوس کر سکے۔ البتہ شاعری کے جملہ اصناف کی پابندیاں ایسی ہیں جن کو ہر ایک عام قاری بھی جلدی سے محسوس کر لیتا ہے اور شاعری کی سب سے بڑی پابندی وزن کی پابندی ہے لیکن دیکھ لیجئے یہاں بھی انسان نے جو ابتدائی شاعرانہ اظہار کیا ہے اس میں کوئی ظاہری پابندی روا نہیں رکھی۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ چونکہ نثری نظم میں لکھنے والے کو بہت آزادی حاصل ہوتی ہے حتیٰ کہ وزن کی پابندی بھی اس کے لیۓ ضروری نہیں ہوتی، اس لیے نثری نظم لکھنا کوئی آسان کام ہے، ایسا ہرگز نہیں۔ بھلا سوچئے تو سہی تخلیقِ ادب کیسے کوئی آسان کام ہو سکتا ہے۔ تخلیق ادب کے وقت تو ادیب خود بخود ایک بہت بڑی مشکل میں گرفتار رہتا ہے۔ اس کٹھن مرحلے سے گزرنے کے لئے آزادی اسے قطعی کوئی سہولت فراہم نہیں کرتی بلکہ اُلٹا اس کے ناتواں کاندھوں پر ایک بہت بڑا بوجھ لاد دیتی ہے اور وہ بوجھ ہوتا ہے ادب میں ایک تازہ اور تیکھے اظہار کا۔۔۔ پابندیوں کے ہوتے ہوئے تو پھر بھی ایک ادیب بہت سی باتیں آسانی کے ساتھ کہہ سکتا ہے لیکن پابندیوں کے بغیر ادب کی تخلیق ایک بہت بڑی ذمہ داری بن جاتی ہے لہٰذا اگر صحیح معنی میں سوچا جائے اور محسوس کیا جائے تو انشائیہ لکھنا یا نثری نظم کہنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔۔۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اسے عام لکھنے والا لکھ بھی نہیں سکتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جب عام لکھنے والا انشائیہ یا نثری نظم کو آسان چیز سمجھ کر لکھنے بیٹھتا ہے تو انشائیہ اور نثری نظم دونوں ہی بدنام ہونے لگتے ہیں۔۔۔ دیکھ لیجئے ہمارے یہاں جو انشائیہ اور نثری نظم پر اُلٹی سیدھی بحثیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کی وجہ بھی انشائیہ اور نثری نظم کو منہ کا نوالہ سمجھنا نہیں تو اور کیا ہے۔۔۔ انشائیہ اور نثری نظم کی اہمیت کو پوری طرح سمجھا اور محسوس کیا جائے تو ان کے بارے میں اس قسم کی فضول باتیں کبھی ہمارے سامنے نہ آئیں۔ اور انشائیہ اور نثری نظم اس طرح بدنام بھی نہ ہوں۔ غالباً میرے اس بیان سے انشائیہ اور نثری نظم کا آپس میں جو تعلق بنتا ہے وہ بھی واضح ہو گیا ہو گا اور اس کی بھی وضاحت ہو گئی ہو گی کہ انشائیہ اور نثری نظم ایک ہی چیز کے دو نام کیوں کہے جاتے ہیں۔

اور اب میں نے جو ابتدا میں کہا تھا کہ نثری نظم کوئی نئی چیز نہیں یہ تو انسان کا اولین شاعرانہ اظہار ہے، تو اس کے ثبوت میں کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے میرے قول کی صداقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ اور نہایت لطف کی بات یہ ہے کہ مجھے اس ضمن میں مثالیں پیش کرنے کے لیے دور کی کوڑی نہیں لانا پڑی۔ ملاحظہ فرمائیے ہمارے جتنے محاورے ہیں وہ قریب قریب سب کے سب مختصر ترین نثری نظمیں ہیں میں تو محاورے کے ساتھ ضرب الامثال کو بھی شامل کرتا ہوں۔ ان میں سے بھی اکثر میں انسان اپنے تجربات کو شاعرانہ اظہار کے ساتھ پیش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ پہلے محاوروں کو لیجئے ہتھیلی پر سرسوں جمانا۔ (غصہ میں) آگ بگولا ہونا۔ دن میں تارے نظر آنا۔ آسمان پر تھگلی لگانا۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا۔ خون کے گھونٹ پینا۔ رات دن ایک کر دینا۔ شیشے میں اُتارنا وغیرہ وغیرہ۔ خدارا انصاف کے ساتھ کہئیے کیا ان تمام محاوروں میں جو میں نے بغیر کسی انتخاب کے یہاں لکھ ڈالے ہیں انسان کے جذبات واحساسات کا شاعرانہ اظہار نہیں ہو رہا ہے اور کیا تمام محاورے مختصر ترین نثری نظمیں نہیں ہیں؟ اور جب یہ مختصر ترین نثری نظمیں ہیں تو کیا مختصر ترین انشائیے نہیں؟ یاد رکھیۓ اختصار ادب کی جان ہے۔ اس میں شاعری تو خیر ہے ہی، نثر کو بھی شامل سمجھئے۔۔ اور انشائیہ کا تو سب سے بڑا وصف ہی اختصار ہے۔۔ انشائیہ ذرا پھیلا، سمجھ لیجئے اس کی صورت مسخ ہو گئی۔ بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ محاورے مختصر ترین نثری نظمیں ہیں، اور اسی طرح بیشتر ضرب الامثال کا حال ہے۔ یہاں بھی دور جانے کی

ضرورت نہیں۔ مثال کے طور پر اسی ایک عام سی کہاوت کو لیجیے۔ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ دیکھ لیجیے اس عام سی کہاوت میں انسانی تجربہ کا اظہار کس قدر دکھ اور کرب کے ساتھ ہوا ہے اور پھر یہ اظہار محض انسانی تجربہ کا اظہار نہیں، اس میں بہت سے انسانی احساسات و جذبات سمٹ کر ایک ہو گئے ہیں اور سننے والے پر پورا تاثر چھوڑتے ہیں۔ اس تاثر کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس اظہار کا تعلق فقط انسان کے ماضی سے نہیں ہے یہ تو ہمیں اپنے حال اور مستقبل کے لیے بھی مسلح کرتا ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو کہاوتیں ہوتی ہی حال اور مستقبل کے لیے ہیں۔

انشائیہ اور نثری نظم کے تعلق کی ایک شہادت ہمیں انشائیے کے ان ناموں سے بھی ملتی ہے جنھیں ہم انشائیہ کے نام سے پہلے انشائیے کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم پہلے انشائیے کو انشائے لطیف کہتے رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں انشائے لطیف کے عنوان کے تحت جو کچھ ہمارے یہاں اردو میں لکھا جاتا رہا ہے وہ بھی دراصل ایک طرح کا شاعرانہ اظہار تھا اور اس لیے اگر ہم اسے نثری نظم میں شمار کریں تو کچھ ایسا غلط نہ ہوگا۔ یہ الگ بحث ہے کہ وہ شاعرانہ اظہار اتنا پختہ نہیں تھا جس طرح کی پختگی کہ ہمیں آج کی نثری نظم میں نظر آسکتی ہے۔

بہرحال میری اس تمام گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ انشائیہ اور نثری نظم میں بہت گہرا تعلق ہے اور تعلق بھی کیا، نثری نظم انشائیہ ہی کے بطن سے وجود میں آتی ہے۔ اور اگر شاعرانہ اظہار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا جائے تو پھر نثری نظم شعری انشائیہ ہے۔ جس طرح نثری انشائیے کے بطن سے نثر کی دوسری اصناف نے جنم لیا اسی طرح نثری نظم کے بطن سے دوسری شاعرانہ اصناف پیدا ہوئی ہیں اور آئندہ پیدا ہونے کے امکانات ہیں جن کو ہم فراموش نہیں کر سکتے۔ بالکل اسی طرح جس طرح انشائیہ کے بطن سے دوسری نئی اصنافِ نثر کے پیدا ہونے کے امکانات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

جدید اُردو افسانے کے مسائل — ایک مذاکرہ

طاہر تونسوی

محمد حسن عسکری نے ایک بار اعلان کیا تھا کہ اُردو افسانہ مر چکا ہے۔ معلوم نہیں یہ بات کہاں تک درست ہے۔ مگر اُردو ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں سمجھتا ہوں کہ اگر اُردو افسانہ مرا نہیں تو جمود کا شکار ضرور ہے۔ البتہ ایک خاص بات یہ ہے کہ پچھلی دو دہائیوں میں افسانے میں خاصے تجربے بھی ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے اردو افسانہ چند مسائل سے دوچار ہے۔ خاص طور پر جدید افسانے میں ابلاغ کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان کے قیام کے دوران میں نے لکھنؤ میں جدید اُردو افسانہ کے مسائل پر، ۷ جون ۱۹۷۹ء کو ایک گفتگو ریکارڈ کی، شرکائے گفتگو تھے۔ رام لعل، ڈاکٹر نیر مسعود، عابد سہیل اور ڈاکٹر صبیحہ انور[1] —— تین سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود لمحہ موجود میں بھی جدید اُردو افسانہ علامت، تجرید اور ابہام میں بدستور پھنسا ہوا ہے اور اپنی شناخت کھو بیٹھا ہے۔ یعنی آج بھی اُردو افسانے کی صورتِ حال ویسی کی ویسی ہے۔

طاہر تونسوی :- رام لعل صاحب۔ پچھلی دو دہائیوں میں اُردو افسانے نے اسلوب اور ہئیت کے اعتبار سے جو فنی سفر کیا ہے اور جو تبدیلیاں اس میں آئی ہیں، میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہوں گا کہ ان تبدیلیوں کی کیا صورت بنتی ہے۔

رام لعل :- طاہر صاحب۔ میں اس طرح سوچتا ہوں کہ ۱۹۲۰ء سے پہلے اور ۱۹۳۰ء تک ہمارے جتنے بزرگ افسانہ نگار تھے نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم اور اس طرح کے بہت سے دوسرے افسانہ نگار، ان میں سے بعض نے تو اور جنل افسانے لکھے، بعض نے تراجم کئے اور بعض نے (ADAPTATION) کی اور یوں انہوں نے جدید افسانے کی زمین میں کھاد کا کام کیا اور راہیں ہموار کیں۔ ہمارے اس گروپ کے لئے جو ۱۹۳۲ء کے بعد اُبھرا ہے ان میں سے کچھ لوگ تو وہاں سے آئے تھے۔ لندن اور امریکہ سے تعلیم حاصل کرکے۔ جیسے سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر رشید جہاں اور اس سے پہلے دوسرے لوگ، مگر تھے وہ ہندوستانی، لیکن ان کے بعد ایک اور گروپ جو ہندوستان میں اُبھرا۔ کرشن چندر، منٹو، بیدی وغیرہ کا، انہوں نے جو کچھ اپنے بزرگوں سے سیکھا تھا، اس کو ترقی دی، فن کو نکھارا اور اسلوب کے نئے زاویے پیش کئے۔ حقیقت نگاری کا ایک ایسا رُخ پیش کیا جو ہمارے افسانے کے کم از کم پچاس سال تک۔ شاید میں پچاس سال زیادہ کہہ گیا۔ چالیس سال تک حاوی ہے۔ میں اُردو افسانے کے فنی سفر پر بحث کرنے کے لئے

---

[1] رام لعل :- اُردو کے معروف افسانہ نگار

ڈاکٹر نیر مسعود :- لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر۔ رجب علی بیگ سرور پر پی ایچ ڈی

عابد سہیل :- افسانہ نگار، کتاب لکھنؤ کے ایڈیٹر

صبیحہ انور :- لکھنؤ کے مقامی گرلز کالج میں لیکچرر "اُردو میں خود نوشت سوانح عمری" پر پی ایچ ڈی۔ افسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

بات یہیں سے شروع کرتا ہوں۔

طاہر تونسوی :- عابد سہیل صاحب۔ آپ نے افسانے بھی لکھے اور افسانے کے قاری بھی ہیں۔ میں یہ دریافت کرنا چاہ رہا ہوں کہ اردو افسانے نے حقیقت نگاری سے علامت نگاری تک یعنی قدیم افسانے سے جدید افسانے تک جو رنگ بدلا ہے تو کیا آج کا افسانہ اس کا پورے طور پر جواز بھی پیدا کر سکا ہے یا نہیں۔

عابد سہیل :- دیکھئے طاہر صاحب، میرا خیال یہ ہے کہ آپ نے بڑی جلدی جست لگائی ہے۔ ابھی تو سفر کا ہی معاملہ ہے۔ جب تک کہ ہم ROOTS کو تھوڑا سا کھنگال نہ لیں اس وقت تک ہم اس مسئلے تک نہیں پہنچ سکتے۔ میرے خیال میں افسانے کا معاملہ شاعری سے تھوڑا سا مختلف ہے۔ وہ اس طرح سے کہ شاعری میں فن یعنی ہیئت اور مواد کو الگ کیا جا سکتا ہے، کم سے کم ANALYSIS کے لئے، لیکن افسانے میں اور ساری نثری اصناف میں چونکہ حالات یعنی الفاظ سے باہر کی دنیا کا جو تعلق ہے وہ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ اس میں آپ ہیئت اور مواد کو یعنی فن اور مواد کو الگ نہیں کر سکتے۔ یہی ایک سبب ہے کہ جس کی وجہ سے غالباً افسانوی ادب کی TECHNIQ YES (تکنیک) میں اگر آپ ان کو واٹر ٹائٹ کمپارٹمنٹس نہ بنائیں تو اتنے ہی تجربے ہوتے ہیں یا اتنی ہی TECHNIQYES ممکن ہیں جتنے کہ قابلِ ذکر افسانہ نگار ہوتے ہیں کیونکہ اس کا تعلق مواد سے اتنا گہرا اور جڑا ہوا ہوتا ہے کہ کسی جگہ پر تکنیک پورے طریقے سے افسانے پر یا افسانوی ادب پر حاوی نہیں ہو پاتی۔ یہ افسانوی ادب کی سب سے بڑی مربوطی ہے اور اسی مربوطی کی وجہ سے وہ بالکل فارمل نہیں بن پاتا۔ جیسے کہ شاعری فارمل بن سکتی ہے۔

طاہر تونسوی :- چلئے مان لیتے ہیں کہ اسلوب اور ہیئت دونوں اعتبار سے تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ جیسے افسانہ بکھر گیا ہو۔

رام لعل :- میرے خیال میں ہم لوگ اس بحث کا نتیجہ نکالنے کے لئے کسی بڑے افسانہ نگار کو لے لیں جو ہماری افسانہ نگاری پر ایک خاص عرصے تک حاوی رہا ہو یا کم از کم خاص دور ہیں ـــــ جیسے پریم چند ـــــ پریم چند کے ہاں افسانہ نگاری کا جو سفر شروع ہوا وہ داستان گوئی تھی یا داستان در داستان کا سا انداز تھا۔

عابد سہیل :- مجھے اس سے بنیادی اختلاف ہے۔

طاہر تونسوی :- مجھے ایک عرض کرنے دیجئے کہ پریم چند کے افسانے نے جو سفر کیا اور جو تبدیلیاں ہوئیں وہ باتیں طے شدہ ہیں۔ یہاں پریم چند کے بعد جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اور جو نئے افسانہ نگار آئے، ان کے بارے میں گفتگو مقصود ہے۔ اس سلسلے میں منیر صاحب، آپ فرمائیں کہ نئے افسانے میں ہیئت کے اعتبار سے جو نئی تبدیلیاں ہوئیں انہوں نے نئے افسانے پر کیا اثرات مرتب کئے۔

ڈاکٹر منیر مسعود :- حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگوں نے بہت سے الفاظ احتیاطاً ڈھالنا شروع کئے ہیں۔ حالانکہ اصل مسئلہ پرانے اور نئے افسانے کا ہے اور وہ سیدھا سیدھا ہے ـــــ توضیح اور ابہام کا ـــــ اصل شکایت یا جو موضوع گفتگو نئے افسانے کے سلسلے میں رہا ہے وہ ہے اصل میں اس کا ابہام ـــــ کہ وہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اب ابہام کو تسلیم کرنے میں تھوڑی سی اپنی سبکی ہوتی ہے یعنی یہ اعتراف ہوتا ہے کہ ابہام کا مطلب یہ ہے کہ ہم سمجھے نہیں تو یہ الزام عائد ہو سکتا ہے کہ غالباً آپ کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں کہ آپ اس نئے افسانے کو سمجھ سکیں۔ اس لئے آپ نے علامت اور تجرید وغیرہ کے نام لینا شروع کر دیئے۔ درحقیقت آپ لوگوں کی علامت اور تجرید سے مراد ہے ہی ابہام ـــــ کہ سمجھ میں نہیں آرہا ـــــ پہلے افسانے میں

یہ کیفیت نہیں تھی بالکل واضح افسانہ تھا۔ بیانیہ جو تھا، بالکل صاف، اس کا سبب ایک میری سمجھ میں یہ بھی آتا ہے کہ آزادی سے پہلے کے افسانے میں خاص طور پر ایک نہایت واضح طور پر نصب العین ہمارے سامنے تھا۔ ایک بہتر زندگی کی تمنا ہمارے سامنے تھی۔ اس کو پانے کی خواہش جتنی ہمارے افسانے میں ظاہر ہوئی ہے۔ اتنی کسی اور صنف میں نہیں ہوئی۔ آزادی کے بعد جو رنگ ہوا اس میں نصب العین کھو گیا یعنی اب ہم خود نہیں جانتے کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ ہم خود بھی اسی کیفیت میں مبتلا ہیں اور جو بالکل نئی نسل ہے وہ اس سے بھی زیادہ مبتلا ہے۔ یعنی وہ چاہتی کیا ہے؟ کس زندگی کی آرزو ہے اور اس کا نصب العین کیا ہے؟ تو گویا مستقبل گم ہو گیا۔ اس ابہام کا اثر پورے افسانے بلکہ شاعری پر بھی ہے۔

رام لعل :۔ نیر صاحب، آپ نے بھی تو ایک جست لگا دی اور فوراً علامت، تجرید اور ابہام تک پہنچ گئے۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ ہمارے افسانے کے فن نے جو بتدریج ترقی کی ہے اس کو آپ منزل منزل طے کرتے تو زیادہ اچھا رہتا۔ آزادی کے بعد کا ایک لمبا عرصہ ہے جو علامت اور ابہام وغیرہ تک نہیں پہنچا۔

ڈاکٹر نیر مسعود :۔ نہیں پہنچ سکا نا! تو وہ آپ کو یاد ہو گا کہ جمود کا دور کہلاتا تھا یا نہیں کہلاتا تھا۔ بلکہ اردو ادب میں جمود کا۔

رام لعل :۔ تھوڑا سا ایک عرصہ آیا تھا وہ،

طاہر تونسوی :۔ یہ تو پھر مقصدی ادب کے زمرے میں آتا ہے۔

ڈاکٹر نیر مسعود :۔ مقصدی کہاں؟

طاہر تونسوی :۔ مقصد کو سامنے رکھ کر ہی تو افسانہ تخلیق کیا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر نیر مسعود :۔ مقصدی کہاں، میں تو موضوع کی بات کر رہا ہوں۔

طاہر تونسوی :۔ درست ہے مگر موضوع میں مقصد کو آپ نے سب سے زیادہ اہمیت دی کہ مستقبل کی تلاش اور بہتر زندگی کی تمنا وغیرہ،

رام لعل :۔ نیر صاحب نے یہ کہا ہے کہ آزادی سے پہلے کے جو افسانہ نگار تھے۔ ان کے سامنے بہتر زندگی کا ایک تصور تھا۔ ان سے یہ پوچھا جائے کہ کیا اب ہمارے سامنے بہتر زندگی کا تصور نہیں ہے؟

ڈاکٹر نیر مسعود :۔ نہیں بالکل نہیں ہے۔

طاہر تونسوی :۔ گویا آپ میری اس بات سے متفق ہیں کہ اردو افسانہ ابہام کا شکار ہے۔ عابد سہیل صاحب آپ کا کیا خیال ہے؟

عابد سہیل :۔ دیکھئے نا، اردو افسانہ ابہام کا شکار ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ صرف اس طرح کے افسانے لکھے جا رہے ہیں جو مبہم ہیں۔

ڈاکٹر نیر مسعود :۔ میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔

عابد سہیل :۔ مگر یہ بات غلط ہے۔ میرے خیال میں اور آپ بھی متفق ہوں گے کہ ابہام کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ابہام آپ کے ہاں ایک موضوع کی شکل میں آتا ہے۔ جس سے افسانہ نگار واقف ہے اور وہ DELIBERATE ہے یعنی شعوری کوشش ہے ہماری ایک خاص جگہ پر ایک خاص انداز میں ایک خاص صورتِ حال میں ابہام پیدا کر دینا ممکن ہے اس لئے کہ اس ابہام سے آگے جا کے ہم اس کردار سے ایسے کام لینا چاہتے ہوں یا اس میں ایسی DIMENSION کا اضافہ کرنا چاہتے ہوں۔ جس کو ہم اس وقت REVEAL نہیں کرنا چاہتے۔ تو جب یہ صورت آتی ہے۔ افسانے میں، تو ابہام ایک تکنیک بن جاتا ہے۔ یعنی یہ ایک فنکاری بن جاتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے ابہام میں کہ جس کو ہیں

عجز افسانہ نگاری یا عجزِ بیان سمجھتا ہوں کہ میں کردار کو DEVELOP کرنے کا اہل نہیں۔ کہانی بننے کا مجھ میں ملکہ اور سلیقہ نہیں زبان پر میری گرفت نہیں اور بیان ایسا نہیں کہ چار جملوں یا دو پیراگراف سے زیادہ قاری پڑھ سکے تو اگر کوئی افسانہ نہیں پڑھتا تو قاری آزاد ہے۔

<u>ڈاکٹر نیر مسعود</u>:۔ اس میں تھوڑی سی ترمیم کردوں آپ کی اجازت سے۔ ایسے افسانوں میں ابہام خام ہے اور یہاں بڑے افسانے ہماری گفتگو سے خارج ہیں۔ جو افسانے ہمارے نزدیک اچھا یا صحت مند یا صحیح قسم کا ابہام رکھتے ہیں تو ہماری گفتگو ان پر ہوگی۔ چینیچر افسانہ نگاروں یا افسانوں کے بارے میں گفتگو نہ ہوگی۔ ویسے بھی اس سے پہلے کے افسانے میں جو وضاحت تھی واشگافی تھی، اس کا سبب یہ تھا کہ اس وقت سے لے کر آئندہ تک کے لئے ایک قسم کا خاکہ زندگی کا، چاہے وہ حقیقی ہو یا تمنائی ہو، موجود رہتا تھا، اب وہ موجود نہیں ہے۔ اس کا لامحالہ اثر پڑے گا ابہام پر ـــــ

<u>طاہر تونسوی</u>:۔ صبیحہ انور صاحبہ، آپ زیادہ نئی قسم کی نمائندہ ہیں۔ آپ کیا محسوس کرتی ہیں کہ آپ کے افسانے کے موضوعات بالکل صاف رہتے ہیں یا کچھ اُلجھن محسوس ہوتی ہے کہ ہم کیا لکھ رہے ہیں، کس موضوع پر لکھ رہے ہیں۔

<u>ڈاکٹر صبیحہ انور</u>:۔ بہت سے موضوعات ایسے سامنے آتے ہیں جن میں ابہام محسوس ہوتا ہے۔ میں جب افسانے پڑھتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ افسانہ نگار کہہ نہیں پایا وہ بات جو کہنا چاہ رہا تھا اور جو کہنا چاہتا تھا یعنی اُلجھ گیا ہے، CONVEY نہیں کرپایا MESSAGE کو۔ جہاں تک افسانے میں علامت، تجرید اور ابہام کا تعلق ہے تو میں سمجھتی ہوں کہ افسانے کا پہلا موضوع یا مقصد اپنی بات کو دوسرے تک پہنچانا ہے اور جو بات دل میں آتی ہے اس کا اظہار کردینا ہے۔ افسانے میں الجھاوے کو ہم ذاتی طور پر پسند نہیں کرتے۔ ابہام اور علامت سے تو ہم داستانی دور کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ حقیقی دور میں آنے کی بجائے۔

<u>رام لعل</u>:۔ میرا خیال ہے کہ ہم موضوع سے ہٹ رہے ہیں۔ تیسری دہائی میں ہمارے بعض بڑے افسانہ نگار ایسے آئے جنہوں نے بیانیہ افسانے لکھے جیسے نیر مسعود نے فرمایا۔ لیکن ان کے ہاں بڑے افسانہ نگار کے لوازم نہیں ملتے۔ جیسے منٹو ـــــ منٹو کا افسانہ بھی سراسر بیانیہ ہے مگر آج بھی وہ نئی نسل کے لئے ایک رہنما بنا ہوا ہے تو افسانہ، میں سمجھتا ہوں، بیانیہ ہو کر بھی جدید بھی ہو سکتا ہے، بڑا بھی ہو سکتا ہے۔

<u>عابد سہیل</u>:۔ افسانہ تو بیانیہ ہوگا ہی یہ اس کا TREND ہے، کمزوری نہیں اور اس میں ویسے بھی ہمیں APOLOGETIC ہونے کی ضرورت نہیں۔

<u>طاہر تونسوی</u>: بات نئے افسانے تک محدود ہونی چاہیئے۔

<u>رام لعل</u>:۔ نئے افسانے سے کیا مراد ہے۔ جدید افسانے کا سفر کہاں سے شروع ہوتا ہے۔

<u>طاہر تونسوی</u>:۔ میری مراد ہمعصر افسانے کے بارے میں ہے۔ منٹو، کرشن یا عصمت اور احمد ندیم قاسمی نے جو TRENDS استعمال کئے ان کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

<u>رام لعل</u>:۔ لکھے جا چکے ہونے پر تو بحث نہیں ہو رہی۔ جدید افسانہ میرے خیال میں ۱۹۳۳ء سے شروع ہوتا ہے۔

<u>طاہر تونسوی</u>:۔ نہیں اس سے ایک نئی روایت ضرور شروع ہوتی ہے۔ اس روایت سے جو سفر آگے بڑھا ہے۔ اس حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ آج کا افسانہ نگار فراریت کی ایک راہ تلاش کرتا ہے۔ یعنی کبھی زندگی اور اس کے مسائل سے، کبھی اپنی ذات سے اور کبھی اپنے اندر اور باہر کے انسان کے داخلی اور خارجی رویوں کے فرق سے، جو سراسر اس کا اپنا پیدا کردہ

ہے ۔ فرار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تبھی تو وہ علامت یا تجرید کا سہارا لیتا ہے۔

عابد سہیل :۔ آپ نے بہت زیادہ نمبر دے دیئے ۔ میرا خیال ہے وہ افسانہ نہیں لکھنا چاہتا۔ اس لئے علامت کا سہارا لیتا ہے یا افسانہ نہیں لکھ سکتا اس لئے ایسے سہارے ڈھونڈھتا ہے۔

ڈاکٹر سیّد مسعود :۔ آپ نمبر کاٹ رہے ہیں۔

طاہر تونسوی :۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ میری طرح علامت کے خلاف ہیں ۔

عابد سہیل :۔ نہیں میں علامت کے خلاف نہیں ہوں۔

رام لعل :۔ عابد سہیل صاحب، بات کو صاف کر لیا جائے۔ جو علامتی افسانے لکھے جا رہے ہیں اور ان میں ابہام پیش کیا جا رہا ہے یا شامل کیا جا رہا ہے، آپ نے ایک وجہ تو یہ بتائی کہ وہ شعوری کوشش ہے کہ افسانہ ایک خاص منطقی نتیجے تک پہنچے۔ ابہام کے راستے سے ہو کر ۔ میرا خیال یہ ہے کہ کوئی بھی فنکار، کسی عہد کا ہو، وہ اپنے عہد کو بھی سمجھتا ہے اور یہ بھی کہ اس عہد میں کتنی برائیاں ہیں، کتنا کنفیوژن ہے۔ اس عہد کی عکاسی اگر کسی طریقے سے کرتا ہے تو اُسے اتنا تو CONSCIOUS ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے افسانوں کے کنفیوژن کی بجائے اور اپنے فن کے کنفیوژن کی بجائے اپنے آس پاس کے کنفیوژن کو بہت CLAIRITY کے ساتھ پیش کرے۔

عابد سہیل :۔ پیش تو کرے ۔

رام لعل :۔ جی ہاں ضرور پیش کرے ۔ اب دوسری بات یہ ہے کہ ابہام شاعری کا تو حسن ہو سکتا ہے مگر افسانے کا کس حد تک ہو سکتا ہے؟

عابد سہیل :۔ ہاں زیادہ امکانات بروئے کار لائے جا سکتے ہیں۔

رام لعل :۔ اب میں اسی بات کی مثال دوں ۔ جمشید پور میں کتنا فساد ہوا۔ علی گڑھ میں ہوا۔ جمشید پور میں ہمارے ایک افسانہ نگار ذکی انور شہید ہوئے۔ اچھا اس پر وہ لوگ جو نئے افسانہ نگار ہیں۔ ان میں سے کوئی اگر افسانہ لکھے اور یہ بھی پتہ نہ چلے کہ فساد ہوا، کہاں ہوا، ذکی انور مارا گیا یا نہیں مارا گیا، ایسا افسانہ لکھنے کا کیا فائدہ؟

سیّد مسعود :۔ نہیں تو وہ ہماری گفتگو سے خارج ہو جائے گا۔

رام لعل :۔ ہماری گفتگو سے خارج ہونے سے بات نہیں بنتی ہے، پوری افسانہ نگاری کی بات ہو رہی ہے۔

طاہر تونسوی :۔ رام لعل صاحب، مسئلہ تو متاثر ہونے کا ہے۔ لکھا یا نہیں لکھا۔ لیکن آپ بھی تو افسانہ نگار ہیں اور اگر آپ متاثر ہوتے ہیں اور جیسا کہ آپ ہوتے ہیں تو آپ نے کیوں نہیں لکھا۔

رام لعل :۔ کس موضوع پر

طاہر تونسوی :۔ جمشید پور اور علی گڑھ کے فسادات پر

رام لعل :۔ ضروری نہیں کہ اس موضوع پر لکھا جائے۔

عابد سہیل :۔ ایک بات ہے کہ شاعری میں چونکہ دل کا INVOLVEMENT نہیں ہوتا اور میں شاعری کو فارمل پریکٹس سمجھتا ہوں۔ شاعری میں تو فوری ردِ عمل ہوتا ہے۔ ایسے موضوعات پر جن کا ابھی ذکر ہوا ہے ۔ شاعروں نے نظمیں لکھ دیں مگر افسانہ نگار کو اس سارے آگ کے دریا سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ایک کریکٹر اُبھرتا ہے اور یہ شرف تو صرف افسانہ نگار کو اور

افسانوی ادب کو حاصل ہے۔ چنانچہ مواد کے پکنے میں، کردار کے ڈھلنے میں، صورتِ حال کے کرسٹلائز ہونے میں اور اس کو افسانوی شکل بننے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ یہ نہیں کہ فوراً شعر بنا کر موزوں کر دیا اور نظم کہہ دی۔

رام لعل :- اس سلسلے میں ایک بات زیادہ اہم ہے اور وہ یہ کہ کئی سالوں کی بات ہے۔ جب مختلف جگہوں پر فسادات ہوئے تو کلام حیدری صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ لوگ جب پنجاب سے آئے تو بہت سے افسانے لکھے مگر جب یہاں فساد ہوئے تو آپ نے ایک بھی افسانہ نہیں لکھا۔ میں نے کہا افسانہ نہیں بن پایا۔ جب جبل پور میں فساد ہوئے تو میں نے اس کے کئی سالوں بعد افسانہ لکھا۔ اب کلام حیدری صاحب سے پوچھا جائے کہ اب جب کہ ان کے قریبی علاقوں میں فساد ہوا ہے تو انہوں نے افسانہ کیوں نہیں لکھا۔

حابر تونسوی :- یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ جب تک فسادات نہ ہوں آپ کو کوئی اور موضوع نہیں مل پاتا ـــ موضوع کو فسادات سے ہٹاتے ہوئے عابد سہیل صاحب میں آپ سے پوچھوں گا کہ آپ نے ایک آدھ افسانہ ایسا لکھا ہے جو نئے افسانے کی پیروڈی معلوم ہوتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

عابد سہیل :- شاید آپ کا اشارہ "میں اور میں" کی طرف ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس میں علامت کا استعمال اس طرح سے نہیں ہے کہ آپ اس میں کسی نتیجے تک پہنچ سکے ہوں یا بالکل ایک گنجلک سا ماحول ہو جائے۔ میں جس وقت یہ افسانہ لکھ رہا تھا اور یہ عجیب بات آپ کو بتاؤں کہ میں سمجھتا ہوں کہ اچھے افسانے یا ناول اور بڑے افسانے یا ناول کا ایک ٹیسٹ یہ بھی ہے جس کو کہ میں اچھے افسانے یا ناول اور بڑے افسانے یا ناول کا ایک ٹیسٹ یہ بھی ہے جس کو کہ میں ابھی بہت FORMULATE نہیں کر سکتا، یعنی یہ کہ اس میں کتنے کریکٹر مرتے ہیں۔ آپ معاف کیجئے۔ قیسی رامپوری اور ایم اسلم کے ناول دیکھ لیجئے۔ اس میں کریکٹر پیدا ہوتے جا رہے ہیں اور مرتے چلے جا رہے ہیں اور آپ انہیں قبروں میں پھینکتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک افسانہ نگار کے لئے ایک کردار کو مارنا اپنی شخصیت کے ایک جزو کو مارنا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کو کھلا پلا کے، اپنے جسم کا حصہ بنا کے، اپنی شخصیت کا پرتو بنا کے، اس میں زندگی ڈال کے اس کے ساتھ جیتا ہے اس کے ساتھ روتا ہے۔ اس کے ساتھ ہنستا ہے اور اس کے ساتھ مرتا ہے۔ تو یہ افسانہ جس کا آپ نے ذکر کیا "میں اور میں" جس میں کہ وہ مر جاتا ہے تو آپ یقین جانیئے کہ جب میں نے یہ افسانہ لکھنا شروع کیا تھا تو میرے ذہن میں کہیں اس کے مرنے کا نہیں تھا۔ لیکن جب وہ کریکٹر GROW ہونا شروع ہو گیا اور میرے مقابلے میں آکر کھڑا ہو گیا تو میں اُسے مرنے سے نہیں روک پایا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کریکٹر مرے اور اس کا مجھ پر بہت اثر ہوا اور میں بیان نہیں کر سکتا کہ کتنا اثر ہوا مگر وہ کریکٹر مر گیا اور میں اُسے مرنے سے نہیں روک سکا تو اس کریکٹر میں اتنی طاقت تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں اس طاقت کا اظہار کر پایا ہوں یا نہیں لیکن آج بھی جب میں خود کو اس افسانے سے الگ کر کے اس افسانے کے کریکٹر کو VISUALIZE کرتا ہوں تو وہ کریکٹر مجھے اتنا POWER FUL نظر آتا ہے کہ میں جو قلم ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا، اپنی ساری کوشش کے باوجود اُسے مرنے سے نہیں روک سکا۔

ڈاکٹر صبیحہ انور :- موت بھی زندگی کا ایک پہلو ہے، ایک رُخ ہے اور کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے۔

ڈاکٹر نیر مسعود :- اصل بات وقت ہے اور جب وقت کا دورانیہ بڑا لمبا دکھایا جائے۔ تو پھر مرنا پڑے گا۔

حابر تونسوی :- عابد سہیل صاحب، بعد کے افسانوں میں یہ اسلوب آپ نے کیوں برقرار نہیں رکھا۔

عابد سہیل :- دراصل اس اظہار کے لئے جس کا میں نے ذکر کیا ہے، یہ تکنیک مجھے زیادہ اچھی لگی اور میں اس کو مبہم نہیں

سمجھتا۔ آپ نے پیروڈی شاید اس لئے کہا کہ اگر میں خود کو منکشف کر دیتا تو آپ کہتے کہ یہ اوریجنل افسانہ ہے۔

نیر مسعود :۔ منکشف نہیں کیا، اس لئے تو انہیں شبہ ہو رہا ہے کہ یہ پیروڈی ہے۔

رام لعل :۔ عابد صاحب، آپ نے افسانہ لکھا اور ایک کریکٹر آپ نے مارا اور آپ نے شعوری طور پر ایسا نہیں کیا بلکہ تقاضا تھا حالات کا بھی اور کہانی کا بھی کہ اس کریکٹر کو یہاں مار دیا جائے اور یہ ایک MECHENICAL PURPOSE بھی ہے اور کرب بھی طاری ہوتا ہے لکھنے والے پر ـــــ لیکن بعض جگہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس افسانے کے لکھ چکنے یا چھپ چکنے کے بعد جب پھر کبھی آپ غور کرتے ہیں تو اس کردار کو زندہ کر کے اسے قبر سے واپس بلاتے ہیں اور یہ فن کا تقاضا ایسے بدل جاتا ہے کہ آپ اس کریکٹر کو دوبارہ زندہ کرنے کے آرزو مند ہوتے ہیں۔

عابد سہیل :۔ جیسا کہ صبیحہ انور صاحبہ نے کہا ہے کہ یہ تو نیچرل PROCESS ہے اور زندگی کی طرح موت بھی حقیقت ہے۔

ڈاکٹر صبیحہ انور :۔ کریکٹر کا مارنا قتل کے برابر ہو یا کوئی تکلیف دہ عمل ہو ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر کہانی کا تقاضا ہے اور بہت سی کہانیاں اسی کوے کے چلتی ہیں، جیسے ابھی فسادات کا ذکر ہوا تو جب تک موت کا ذکر نہیں کریں گے یا اس المیے کا ذکر نہ ہوگا تو ہمارا MESSAGE پہنچ ہی نہیں سکتا۔

ڈاکٹر نیر مسعود :۔ کردار کے مارنے کے سلسلے میں جو گفتگو ہو رہی ہے تو پرانے افسانہ نگاروں کے سامنے بھی یہی مسئلہ تھا۔ غالباً اور نئے افسانہ نگاروں کے سامنے بھی یہی مسئلہ ہے۔ اگر نئے افسانہ نگاروں کے سامنے نیا مسئلہ ہے تو پھر تو یہ ہماری گفتگو میں شامل ہے اور اگر پرانا مسئلہ ہے تو گفتگو سے خارج ہے۔

طاہر تونسوی :۔ کردار کے بارے میں تو میں سمجھتا ہوں یہ خاص اہم بات ہے اور اس بحث کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ افسانہ نگار، خاص طور پر آج کا افسانہ نگار، بعض اوقات ایسا کردار تخلیق کرتا ہے جو خود اسے بے بس کر دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں پہلے کا افسانہ نگار راستہ دکھاتا تھا اور منزل تک پہنچا دیتا تھا مگر آج کا افسانہ نگار احساس پیدا کر دیتا ہے قاری کے اندر ـــــ نتیجہ نہیں نکالتا۔

عابد سہیل :۔ حیات اللہ انصاری نے ایک بار ایک بہت خوبصورت بات کہی تھی جو میں بھول نہیں پاتا ہوں اور وہ یہ کہ پہلے زندگی ایک COMPLETE CIRCLE بناتی تھی اور آج نہیں بنا پاتی۔ گویا کہانی کے سلسلے راستے میں ٹوٹ جاتے ہیں اس وجہ سے کہانی LOGICALEND تک نہیں پہنچ پاتی جیسے پہلے پہنچ پاتی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت اہم بات ہے۔

ڈاکٹر نیر مسعود :۔ طاہر صاحب! بیّن فرق جو ہے وہ ہے بیان کرنے کا طرز ـــــ فرض کیجئے آپ کو یہ بیان کرنا ہے کہ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو کمرے میں ٹھنڈک تھی، میرے کپڑے بھی بھیگے ہوئے تھے۔ کچھ افسانہ نگار اسے یوں نہیں لکھیں گے بلکہ یوں کہ "جب میں کمرے میں داخل ہوا تو میرا کمرہ برف کا بت بنا کھڑا تھا اور میرے کپڑے آ کر مجھ سے لپٹ گئے اور میرے کوٹ کی آستینیں میرے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگیں" تو یہ ایک انداز جو ہے بیان کا یہ نیا انداز ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس کا جواز کہاں تک ہے۔ بہر حال مجھے یہ طریقہ پسند نہیں۔

طاہر تونسوی :۔ میں نے اسی بیان کو فرادیت کا نام دیا ہے یا اسے آپ نام نہاد علامت یا تجریدیت کہہ لیں ـــــ بات دراصل کردار کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ رام لعل صاحب سے پوچھتے ہیں کہ کیا انہوں نے کوئی ایسا کردار تخلیق کیا ہے جس نے انہیں بے بس کر دیا ہو۔

رام لعل :۔ جی ہاں ایسا ہوا ہے۔ میرا ایک افسانہ ہے "ننھا خدا" میں نے اس میں ایک بچے کو پیش کیا جو آٹھ نو سال کا

تھا۔ دراصل میں اس بچے میں داخل ہوا۔ اور میں اس AGE میں واپس گیا اور وہ جو اس وقت کے ذہن کی کیفیت ہوتی ہے وہ بالکل میٹامورفوسس ٹائپ کی بن گئی۔ وہ بچہ ایک خالی مکان میں داخل ہوتا ہے۔ جہاں سے وہ کم سے کم تین مہینے کے بعد واپس آتا ہے۔ اور اپنی عادت کے مطابق چھت پر دوڑتا ہوا ایک چھوٹی سی دیوار کراس کرتا ہے اور اس پڑوس کے مکان میں آتا ہے تو اس مکان میں بڑی ویرانی ہے، بڑی خاموشی ہے۔ اس ویرانی کو میں نے ایک جملے میں یوں پیش کیا ہے "وہاں سوکھے پتے بکھرے پڑے تھے" تو نیچے جب اترتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کھڑکی کھلی ہے یا روشنی ہے اور ایک لڑکی بیٹھی ہوئی ہے لکھ رہی ہے۔ وہ کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ مجھ سے بات کرے گی۔ مگر وہ اس کی طرف دیکھتی ہی نہیں۔ اُسی وقت بچے کے کانوں میں اپنے باپ کے پکارنے کی آواز آتی ہے اور وہ جلدی سے بھاگ ہوا اپنی چھت پر آتا ہے اور دیوار سے ہوتا ہوا اپنے گھر پہنچتا ہے اور سارے گھر والے حیرانی سے کہتے ہیں کہ تو کہاں گیا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ میں لڑکی سے ملنے گیا تھا مگر وہ مجھ سے بولی نہیں اور مجھ سے بات تک نہیں کی۔ میں کتنی دیر تک اس کے سامنے کھڑا رہا۔ اس کا باپ اور سارے گھر والے گھبرا جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ لڑکی مر چکی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس نے کوئی جن یا بھوت دیکھا ہے۔ لیکن ایسا نہیں۔ لڑکے کو اس لڑکی سے جو اس سے عمر میں بڑی تھی، شدید اور سچی محبت تھی اور اس نے اسے ہو بہو دیکھ لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ کردار میرے بس میں نہیں تھا۔ اس میں بناوٹی کیفیت میں نے پیش نہیں کی۔ بلکہ یہ کیفیت مجھ پر اُتری۔

ڈاکٹر نیر مسعود :۔ نہیں تو سوال یہ ہے کہ آپ اس بچے کو کیا دکھانا چاہ رہے تھے اور کس طرح پیش کرنا چاہ رہے تھے کہ وہ آپ پر حاوی آ گیا۔ آپ کا اپنا پلان کیا تھا۔

رام لعل :۔ اس بچے کی جو شدید محبت تھی یعنی معصوم ذہن کی محبت وہ اس پر اتنی زیادہ حاوی ہو گئی تھی کہ وہ اس کو چھوڑ نہیں سکتا تھا اور اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ مر چکی ہے، وہ تو محبت کے جذبے کے تحت چلا گیا تھا۔

جابر تونسوی :۔ یہ تو موضوع یعنی پلاٹ کے سامنے بے بس ہونے کی بات ہے۔

رام لعل :۔ اس میں خالی پلاٹ کی بات نہیں، کہانی کا فن بھی INVOLVE ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب اسے ANALYSE کیا جائے۔

عابد سہیل :۔ ایک بات اور ہے جس کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ دراصل اس میں بعض ایسی باتیں کہی گئی ہیں جو کہی نہیں گئیں۔ لیکن ظاہر ہو گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ گھر آسیب زدہ ہے۔ یہ اس کہانی میں کہیں نہیں کہا گیا اور اس گھر میں کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے کہ لڑکی اس طرح مری ہے جو عام طور پر موتیں نہیں ہوتی ہیں تو لوگ اس میں نہیں بستے ہیں۔ دیوار سے دیوار ملی ہے مگر وہاں کوئی جاتا نہیں مگر یہ لڑکا اپنے تجسس میں وہاں پہنچ گیا۔ اور پھر اس میں ہلکا سا شائبہ شاید حیات بعد حیات کا بھی ہے اور یہ چیز کہ بغیر کہے ہوئے بہت سی باتیں کہہ دینا ہمارے آج کے افسانے کو ماضی کے افسانے سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔

ڈاکٹر نیر مسعود :۔ صبیحہ انور سے بھی یہ سوال پوچھنا چاہیے کہ آپ نے کسی کردار کے بارے میں طے کیا ہو کہ اس طرح ڈیولپ کریں گے مگر وہ کسی اور طرح سے ہو گیا یعنی آپ کے پلان کے خلاف،

ڈاکٹر صبیحہ انور :۔ ویسے تو کسی نہ کسی پلاٹ کا لباس پہن کر کوئی مخصوص کردار ہوتا ہے بہرحال میں سمجھتی ہوں کہ ہمیشہ مجبور کرتا ہے اور کہانی لکھنے والا جب تک مجبور نہیں ہوتا اور کہانی جب تک اسے بے چین نہیں کرتی اس وقت تک کہانی لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ گویا آسیب کہانی کا بن جاتا ہے اس کے سر پر اور اس وقت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ جب تک کہ وہ لکھ نہیں لیتا۔ میری کہانی کا جہاں تک آپ نے پوچھا ہے

میں نے جب بھی کوئی کہانی لکھی ہے کردار اور پلاٹ میرے سامنے رہا ہے۔ اس کو میں نے حقیقی طور پر نکھارا ہے۔ تھوڑی سی تراش خراش کی ہے۔ بہر حال ذہن میں پہلے سے موجود رہا ہے۔ میرا ایک افسانہ ہے" اپنے کاندھے اپنی صلیب" یہ کہانی ایک لڑکی کی کہانی ہے اور ظاہر ہے میرے زیادہ تر افسانے لڑکیوں کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ لڑکی معمولی گھر کی لڑکی ہے اور خوبصورتی کی وجہ سے اس کی شادی زمیندار سے ہو جاتی ہے مگر وہ اپنے آپ کو وہاں ADJUST نہیں کر پاتی یا وہ لوگ اسے قبول نہیں کر پاتے۔ تھوڑے دن وہ وہاں رہتی ہے مگر زمیندار کی توجہ اس سے ہٹ جاتی ہے۔ دوسری دلچسپیوں کی وجہ سے اور وہ اسے طلاق دے دیتے ہیں۔ وہ واپس گھر آجاتی ہے۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے اور عام سی بات ہے مگر جب وہ گھر آتی ہے تو اس کے ماں باپ کو یہ بات پسند نہیں کہ ان پر بوجھ آگیا ہے تو وہ اسے طنزیہ" بیگم صاحبہ" کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہاں یہ بات ہے کہ عورت اگرچہ گھر کی مالکن ہے مگر وہ دوسرے حوالوں سے پہچانی جاتی ہے۔

طاہر تونسوی:۔ صبیحہ انور صاحبہ، آپ نے افسانے کے سفر کا مطالعہ کیا یعنی حقیقت سے علامت تک کا۔ آپ خود کس حد تک متفق ہیں۔

ڈاکٹر صبیحہ انور:۔ بہر حال میں سمجھتی ہوں کہ تجربے ہوتے رہنا چاہئیں۔ اچھے افسانے بھی لکھے گئے اور ایسا نہیں ہے کہ علامتی اور تجریدی افسانے جو ہیں وہ بالکل معنی سے خالی ہیں۔ ایسا نہیں۔ اچھی کوشش ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ ہم اپنے مقصد سے دور نہ ہوتے جائیں۔ فن وہی اچھا ہوتا ہے جو دل کو چھوتا ہے۔ جس میں اپنے دل کی بات اور اپنے ارد گرد کی بات ہوتی ہے۔

عابد سہیل:۔ طاہر صاحب، آپ علامت اور تجریدیت کو ہم معنی اور متبادل کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر نیر مسعود:۔ اور معیوب کے طور پر بھی،

عابد سہیل:۔ نہیں معیوب کے طور پر تو خیر نہیں مگر کیا آپ علامت اور تجرید کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں؟

طاہر تونسوی:۔ نہیں، علامت اور تجرید کے الگ الگ تصور میرے ذہن میں موجود ہیں۔ لیکن میں زبان کو تجریدی نہیں سمجھتا اور افسانے میں چونکہ زبان ہوتی ہے۔ اس لئے میں تجریدیت کے خلاف ہوں۔

عابد سہیل:۔ میں آپ سے متفق ہوں، اس لئے کہ زبان تو تجریدی ہو ہی نہیں سکتی۔ زبان زیادہ سے زیادہ علامتی ہو سکتی ہے اور وہ بھی علامت در علامت ——— جیسا کہ افلاطون نے کہا کہ حقیقت سے دوگنا دور تو علامت حقیقت سے دوگنا دور ہوگی

ڈاکٹر نیر مسعود:۔ عابد صاحب اس میں بڑی دقت پیدا ہوگی۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ زبان تجریدی نہیں ہو سکتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ افسانہ تو تجریدی ہو ہی نہیں سکتا۔

عابد سہیل:۔ علامتی افسانہ تو ممکن ہے لیکن تجریدی افسانہ کیسے ممکن ہے، یہ نیر صاحب مجھے سمجھا دیں۔

طاہر تونسوی:۔ عابد صاحب، علامتی اور تجریدی افسانے لکھے جا رہے ہیں اور خاص طور پر تجریدی افسانوں کو ہم تسلیم کریں یا نہ کریں مگر اصل مسئلہ تو ابلاغ کا ہے۔ اگر ابلاغ ہو رہا ہے تو وہ فن پارہ ہے اور اگر نہیں ہو رہا تو اسے آپ تجریدیت کہہ لیں یا بے جا علامت نگاری ——— اور میں سمجھتا ہوں کہ ابلاغ نہیں ہو رہا۔ تبھی تو جدید اردو افسانہ جمود کا شکار ہے یا ناکامی کا شکار ہے۔

رام لعل:۔ کیا ایک پینٹنگ تجریدی ہو سکتی ہے؟

عابد سہیل:۔ اس لئے ہو سکتی ہے کہ کلر کے بذاتِ خود کوئی معنی نہیں ہوتے۔

رام لعل:۔ COMMUNICATE تو کرتا ہے۔

عابد سہیل :- کلر جو ہے وہ آپ کو کہیں یہ لکھا ہوا نہیں ملے گا کہ ہرے کے معنی اسلام ہیں۔

ڈاکٹر نیر مسعود :- اصل میں وہ نشان ہے۔

عابد سہیل :- اس میں تو تجرید ممکن ہے کیونکہ کلر کا سفر ہی علامت سے شروع ہوتا ہے۔ زبان میں چونکہ ایک متعین معنی ہوتے ہیں اور علامت کا سفر زبان کے بامعنی استعمال سے شروع ہوتا ہے اس لئے تجریدی زبان ممکن نہیں۔

طاہر تونسوی :- تجرید کی بحث تو دور نکل جائے گی۔ نیر صاحب آپ یہ فرمائیں کہ ہندوستان میں آج جو افسانہ تخلیق ہو رہا ہے کیا آپ اس کی رفتار سے مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر نیر مسعود :- یقیناً مطمئن ہوں۔

طاہر تونسوی :- اگر آپ مطمئن ہیں تو کیا آپ ایسے افسانہ نگاروں کی نشاندہی کر سکتے ہیں جو آج کے عہد کا اصل افسانہ تخلیق کر رہے ہوں۔

ڈاکٹر نیر مسعود :- شفق ہیں۔ قمر احسن ہیں۔ انور خان ہیں۔ انور قمر ہیں۔ سلامت مرزا داغ ہیں۔ نام تو بہت سے ہیں۔ عابد سہیل اور رام لعل کو میں شمار نہیں کر رہا۔ اس سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ علامت اور ابہام کو لازم و ملزوم سمجھنا غلط ہے اس لئے کہ علامت اپنے طور پر قائم بالذات بھی ہوتی ہے اور اپنے طور پر نہایت واضح ہو سکتی ہے۔

طاہر تونسوی :- علامت ہی تو ابہام پیدا کرتی ہے۔

عابد سہیل :- میں علامت کے بغیر بھی ابہام پیدا کر دوں۔

طاہر تونسوی :- یہ تو آپ کا کمال ہو گا۔

ڈاکٹر نیر مسعود :- دیکھیں AN OLD MAN AND THE SEA اور موبی ڈک کو سامنے رکھیں تو ان میں کہیں بھی ابہام نہیں ہے۔ حالانکہ یہ خالص علامتی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ علامتی افسانہ جب بیان ہوتا ہے تو اپنی ذات میں مکمل ہوتا ہے۔ ابہام جو پیدا ہو گا اس کے کہنے سے کہ اس کی مراد کیا تھی۔

رام لعل :- آپ نے نیر صاحب' کافکا کے افسانے ترجمہ کئے۔ آپ نے کیا تاثر لیا؟

ڈاکٹر نیر مسعود :- اس کے بہت سے افسانے سمجھ میں نہیں آئے۔ سمجھ میں نہ آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کیا ہوا۔ کیوں ہوا' یہ سمجھ میں نہیں آیا۔

رام لعل :- ترجمہ کرنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آئے۔

ڈاکٹر نیر مسعود :- ہاں سمجھ میں نہیں آئے اس لئے کہ سینکڑوں تاویلیں ہو سکتی ہیں۔

طاہر تونسوی :- اصل مسئلہ یہ ہے کہ کہانی کار ابہام کا شکار ہے، آپ اسے تسلیم کیوں نہیں کرتے؟

رام لعل :- تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اردو افسانے میں کوئی فراڈ ہو رہا ہے؟

ڈاکٹر نیر مسعود :- جی ہاں ہم تو ایسا سمجھتے ہیں۔ ہو رہا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔

طاہر تونسوی :- صبیحہ انور صاحبہ کیا آپ نے علامتی افسانہ لکھا؟

ڈاکٹر صبیحہ انور :- بات دراصل علامت کی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ علامت ہر چیز میں ہے۔ لیکن علامتی افسانے سے مراد آپ کی یہ ہے کہ ہم نے اگر سورج کی کرن کا ذکر کر دیا تو وہ حرارت گرمی اور زندگی کا تاثر لے آئی اور ٹھنڈک یا برف کا ذکر کر دیا تو وہ جمود کی علامت ٹھہری تو میں نے ایسا افسانہ نہیں لکھا۔ ہاں علامتی افسانے پڑھے ہیں اور بعض لوگوں نے اچھے افسانے لکھے ہیں۔ مثلاً رتن سنگھ کے افسانے مجھے بہت اچھے لگے اور انہوں نے جو کچھ کہا وہ ہم تک پہنچا۔

عابد سہیل :- اگرچہ میرے ذہن میں یہ بات صاف نہیں ہے۔ لیکن سوچنے کے لئے سہی کہ ایک تو علامت لسانی پیکر کے طور پر اُبھرے گی اور ایک جگہ لسانی معنویت سے ابھرے گی رتن سنگھ کے ان لسانی معنویت سے علامت اُبھرتی ہے۔ دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں یہ نہیں۔

طاہر تونسوی :- تو یوں کہیئے کہ علامت کا ابلاغ ہوا ہے۔ نیر مسعود صاحب بار بار مجھ پر علامت کی مخالفت کا الزام لگاتے ہیں۔ حالانکہ میں اپنی بات میں بالکل صاف ہوں اور وہ یہ کہ علامت اگر قاری اور افسانہ نگار کے درمیان ایک پل کا کام نہیں دیتی تو رائیگاں جاتی ہے۔

ڈاکٹر نیر مسعود :- علامت رائیگاں نہیں جاتی اور اس سلسلے میں رتن سنگھ کے ایک افسانہ "داغ" کا نام لیا جا سکتا ہے

عابد سہیل :- لیکن ایک بات ہے کہ علامتی افسانے کی ایک کامیابی صرف اس صورت میں ممکن ہے جبکہ علامتی خول ہٹا دیا جائے تو اس کے بعد وہ افسانہ کوئی نہ کوئی معنی COMMUNICATE کرے اور لسانی سطح پر مکمل ہو۔ اگر وہ اس بات کا محتاج ہے کہ اس کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ علامت باہر سے لائیں اور ڈھونڈھیں تو پھر افسانہ خراب ہے۔

طاہر تونسوی :- یہی تو میں کہہ رہا ہوں اور یہ صورتِ حال پاکستان میں ہندوستان کی نسبت زیادہ ہے اور آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ علامتی افسانہ پاکستان سے ہی یہاں آیا ہے۔ اس حوالے سے پاکستانی افسانے نے ہندوستانی افسانے پر کیا اثرات مرتب کئے ہیں۔ عابد سہیل صاحب آپ فرمائیں۔

عابد سہیل :- دیکھئے صاحب میں ہندی کو بھی ساتھ لیتا ہوں اور ہندی افسانے کو بہت آگے سمجھتا ہوں اُردو افسانے سے۔ اس لئے نہیں کہ اُردو میں COMPETENT افسانہ نگار نہیں بلکہ اس لئے کہ ہندی کو اتنا بڑا علاقہ، اتنا بڑا ریجن، اتنے بہت سے لوگ، دیہات، گاؤں، شہر، طرح طرح کی بولیاں، ASSIMILATE کرنے کے لئے ملی ہیں کہ ان کے تجربے کا میدان اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ وہ اُردو افسانے سے بڑھ گئی ہے۔ یہ رائے میری آٹھ سال پہلے بھی تھی۔ جس کا میں نے ہندی افسانہ نمبر میں اظہار کیا تھا اور لوگوں نے بُرا مانا تھا اور آج بھی ہے۔ اگر پاکستان میں اُردو افسانہ ہندوستان میں اُردو افسانے سے آگے ہے اور ہے تو اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ اس کو اپنے آپ کو UN POLLUTE کرنے کے لئے اتنی بڑی دنیا ملی ہے کہ اگر وہ آگے نہ بڑھے تو بُری بات ہوگی۔ یہ دو ملک ہیں اور ان کے درمیان بڑی دیواریں ہیں۔ پاکستان کا ادب ہم تک اس طرح سے نہیں پہنچتا جس طرح سے کہ ہمارا ادب پہنچتا ہے اور پھر جو چیزیں پہنچتی ہیں وہ ایک طرح بہترین ہوتی ہیں۔ جہاں تک اثر قبول کرنے کا سوال ہے تو اس طرح سے نہیں قبول کیا جا سکتا کہ ہر اچھی چیز کا اثر قبول کر لیں بلکہ اس طرح سے قبول کیا جا سکے ہے کہ ہم کیا رد کرتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم کو کیا رد کرنا ہے اور کیا قبول کرتا ہے تو جب تک ہم یہ نہ جانیں گے کہ ہمیں کیا رد کرنا ہے اور یہ کہ خراب افسانے کس طرح لکھے جاتے ہیں جب تک ہم کو یہ معلوم نہ ہوگا ہم پاکستان کے افسانے سے اثر قبول نہیں کر سکتے۔

طاہر تونسوی :- آپ مانیں یا نہ مانیں اثر تو ہے۔ رام لعل صاحب آپ کا کیا خیال ہے؟

رام لعل :- عابد سہیل صاحب نے ہندی افسانے سے موازنہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے سامنے بڑی دنیا ہے تو اُردو افسانہ نگاروں کے سامنے بھی تو ہے۔

نیر مسعود :- ہندی میں جتنی چیزیں لکھی جا رہی ہیں اُردو میں نہیں لکھی جا رہیں۔

عابد سہیل :- ہندی میں چھوٹا ناگپور کے قبائل پر سترہ ناول ہیں۔

طاہر تونسوی :- یہ تو موضوع کی بات ہے کہ تہذیبی اور جغرافیائی اعتبار سے لامحدود ہیں۔

ڈاکٹر صبیحہ انور :- میرے خیال میں پڑھنے والے زیادہ ہیں ۔ جہاں تک پاکستانی افسانے کا سوال ہے ۔ میں سمجھتی ہوں کہ پاکستان میں اچھے افسانے لکھے جا رہے ہیں ۔

رام لعل :- کیا پاکستان کا ہر افسانہ اے ون ہوتا ہے ؟

ڈاکٹر صبیحہ انور :- اے ون کی بات نہیں ، عمدہ افسانہ ہوتا ہے ۔

عابد سہیل :- جب تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ کیا اے ون نہیں ہوتا اور ہمارے لئے یہ جاننا بہت ضروری ہے ۔

ڈاکٹر نیر مسعود :- ایسا ہے کہ پاکستان کے دو افسانہ نگار خاص طور پر یہاں بہت اثر انداز ہوئے ہیں ایک ان میں سے ہمارے طاہر تونسوی صاحب کی چڑ یعنی انتظار حسین ــــــ

طاہر تونسوی :- چڑ کا کیا مطلب ؟ انتظار حسین اچھے افسانہ نگار ہیں ۔

ڈاکٹر نیر مسعود :- خاص طور پر ان کا ہجرت کا موضوع لیکن اس لحاظ سے انتظار حسین کا کوئی اثر نہیں پڑا لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہجرت کے موضوع سے چڑ کیوں ہے ۔

طاہر تونسوی :- یہ تو سیدھا سادا پاکستانی اور پاکستانی ادب کا ہے ۔ بات صاف ہے کہ پاکستانی قوم ہونے کے ناتے آپ اپنی پہچان کہاں کرا رہے ہیں ۔ اگر آپ اپنی پہچان اس تہذیب و تمدن سے کرا رہے ہیں کہ جو آپ چھوڑ آئے ہیں ایک خاص نظریئے کی بنا پر ، تو پھر نئی نسل کو تو اعتراض ہوگا اور بجا طور پر ہوگا ۔

ڈاکٹر نیر مسعود :- سوال یہ ہے کہ ہجرت پر کتنے افسانے لکھے ہوں گے ، بہت کم ہیں ۔

طاہر تونسوی :- آپ نے خود ہی ہجرت تک محدود کر لیا ، ہم تو اس ارضی رشتے کی بات کرتے ہیں جو وہ ہندوستان سے جوڑتے ہیں ۔

ڈاکٹر نیر مسعود : میں دوسرے افسانہ نگار کی بات کرتا ہوں ــــ اے حمید ــــ اس کے ہاں بھی تو ہجرت کا موضوع ہے ۔

طاہر تونسوی :- موضوع سے چڑ نہیں مگر بات تو اس رونے کی ہے کہ ہائے میری زمین ، ہائے میرا گھر ــــ ہائے میری دھرتی ۔ اصل بات تو رویے کی ہے ۔ آپ کو اپنے اس گھر سے محبت ہونی چاہیئے ۔ جس میں آپ رہتے ہیں اور خاص طور پر ایک نظریئے کا ساتھ دے کر اور ماضی کی ساری محبتیں اور رشتے توڑ کر نئی دنیا بسائی ہے تو ایک طرح ان کے ہاں پچھتاوے کی جو صورت نظر آتی ہے اس کا کوئی جواز نہیں ۔

ڈاکٹر نیر مسعود :- انتظار حسین پر جو اعتراض ہے وہ غیر ادبی ہے ۔ سیدھا سادا ،

طاہر تونسوی :- بالکل نہیں ۔ اصل مسئلہ اپنی دھرتی میں جڑیں تلاش کرنے کا ہے ۔

ڈاکٹر نیر مسعود :- انتظار حسین کے ساتھ ساتھ انور سجاد کا نام بھی آنا ضروری ہے ۔

طاہر تونسوی :- آپ تسلیم کریں یا نہ کریں ، انور سجاد واقعی اثر انداز ہوئے ہیں ۔

ڈاکٹر نیر مسعود :- ہاں اثر ہے اور یہ ماننا بھی پڑے گا کہ وہ اچھا افسانہ نگار ہے لیکن تجرید کا جو سارا سیلاب ہے وہ انور سجاد کی دیکھا دیکھی ہے اور ظاہر ہے کہ ہر کوئی تجریدی افسانے نہیں لکھ سکتا ۔

طاہر تونسوی :- گویا اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ جدید اردو افسانہ مسائل سے دوچار ہے اور افسانہ نگار علامت ، تجرید اور ابہام کا خول چڑھا کر نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ قاری کو دھوکا دے رہے ہیں ۔

میرؔ کا طرزِ احساس اور جدید نظم

علمدار حسین گیلانی

شاعری جذبہ و احساس کی دھنک رنگی کو لفظوں کے سلسلوں میں سمونے کا نام ہے۔ شاعر جب اپنی روح میں مچلنے والے مسرت آمیز یا کرب ناک جذبوں کو لفظوں کی زبانی بیان کرتا ہے تو شعر وجود میں آتا ہے۔ اگر عقل کا گزر ہے کر انسانی جذبات و محسوسات کی پیمائش اور درجہ بندی کی جائے تو گنتی کے ازلی و ابدی جذبوں کی آسانی سے نشاندہی کی جا سکتی ہے اور اگر مزید سہولت حاصل ہو تو ان جذبوں کو مسرت آمیز اور الم ناک دو بڑی اور متضاد اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اب بڑی آسانی سے ان اقسامِ جذبہ کو عنوانات بنا کر کسی شاعر پر نہایت پُر مغز "مقالہ لکھا جا سکتا ہے لیکن مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب مختلف شاعروں کے درمیان حدِ امتیاز قائم کرنی پڑے۔ ویسے تو مختلف شاعروں کے تقابلی جائزے کے بھی کئی مجرب اور رامرت دھار قسم کے نسخے موجود ہیں۔ مثلاً فلاں آہ کا شاعر ہے اور فلاں واہ کا، فلاں کی شاعری تصوف کی شاعری ہے اور فلاں کی شاعری میں ہوسناکی کا پہلو غالب ہے، فلاں شاعرِ انقلاب ہے اور فلاں شاعرِ اسلام! لیکن یہ بہت کم دیکھا جاتا ہے کہ مختلف شاعروں نے ایک ہی جذباتی کیفیت کو کس طرح محسوس کیا۔ کسی شاعر کا طرزِ احساس ہی دراصل وہ حدِ امتیاز ہے جو اسے دوسرے شاعروں سے جدا کرتی ہے۔ ہر بڑا شاعر اپنا ایک الگ طرزِ احساس لے کر پیدا ہوتا ہے اور پھر اپنے جذبہ و احساس کی قوتوں اور فکری گہرائی کے بل بوتے پر جہانِ شعر میں ایک ایسا روشن ستارہ بن جاتا ہے جس کی روشنی میں دوسرے اپنی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ اردو ادب میں میر تقی میرؔ ایک ایسا ہی روشن ستارہ ہے جس کی تابندگی میں کئی رہروانِ منزل نے اپنی راہیں تلاش کی ہیں۔

میرؔ نے شاعری اُس وقت شروع کی جب اردو شاعری اپنی ابتدائی تشکیلات کے مرحلے میں تھی۔ اردو میں شاعری کرنا بالکل اسی طرح شانِ علمیت کے خلاف سمجھا جاتا تھا جس طرح آج کل ایم۔ اے اردو کرنا اور شاہانِ ذی وقار اور امرا اور نوابین اردو شاعروں کے ساتھ وہی سلوک روا رکھتے تھے جو آج کل ایم اے پاس بے روزگاروں کے ساتھ اربابِ حل و عقد روا رکھتے ہیں —— لیکن میرؔ نے نہ صرف ریختہ کو ذریعۂ اظہار بنایا بلکہ اپنے خونِ جگر سے اس کی آبیاری کر کے اس نوخیز کے روئے زیبا کو وہ لالی عطا کی کہ عروسِ فارسی کے حسن کی چمک دمک اس کے آگے ماند پڑ گئی ——

میرؔ کے عہد میں پیشہ ور شاعروں کی ایک پوری کھیپ نظر آتی ہے جن کا اوڑھنا بچھونا ہی شاعری تھا لیکن ان میں سے اکثر کی شاعری خود ان کے اپنے اوڑھنے بچھونے ہی کے کام آ سکی لیکن میرؔ کے منفرد طرزِ احساس نے اسے نہ صرف اپنے عہد میں شہنشاہِ تغزل قرار دلوایا بلکہ اسی بنا پر میرؔ کے نشتر آج بھی احساس کی گہرائیوں میں چرکے لگا جاتے ہیں۔ میرؔ کا یہ منفرد طرزِ احساس اپنے اندر وہ دلکشی اور آفاقیت رکھتا ہے کہ آج بھی شعر و ادب کا ہر سنجیدہ قاری اس سے از حد متاثر ہوتا ہے۔ میرؔ کے بعد ان گنت شاعروں نے اس کا انداز اپنانے کی کوشش کی اور جو شاعر میرؔ کے طرزِ احساس کو اپنی روح میں رچا بسا سکے ایوانِ ادب میں اپنی جگہ بنا گئے۔ مجھے تو یہ دعویٰ کرنے میں بھی کوئی سنسنی خیزی نظر نہیں آتی کہ آج کی شاعری بھی عظمت کی حامل اُسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کی رگوں میں میرؔ کا طرزِ احساس لہو بن کر موجزن ہو لیکن اس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جدید شاعری کو ہو بہو میرؔ کے رنگ میں ہونا چاہیے۔ نئی شاعری تو عہدِ جدید کی تخلیق ہے اور میرؔ کے عہد اور عہدِ جدید میں لگ بھگ دو سو سال کا

جو فاصلہ ہے اُسے نظر انداز کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی دانشمندی ـــــ کہا جاتا ہے کہ تخلیق تکرار کی بیری اور تلاش و جستجو کی ماں جائی ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ یک رنگی سے جلدی اکتا جاتا ہے اور یکساں سُروں کی دلکش ترین موسیقی بھی تھوڑی ہی دیر میں سننے والے پر غنودگی طاری کر دیتی ہے۔ فطرت انسانی ہر لمحے نئے رنگ روپ کی متلاشی رہتی ہے اور سچی بات یہ ہے کہ یہ نئے رنگ روپ اس پر اسی وقت اپنا انکشاف کرتے ہیں جب وہ فطرت کی یک رنگی سے متصادم ہوتی ہے۔ انسان فطرت کی یک رنگ پرتیں اُلٹ کر نئے جہانِ معانی کی سیر کرتا ہے۔ اور اس سے تجربہ و احساس کا امرت رس نچوڑتا ہے۔ پھر تجربہ و احساس کا یہی رس اس پر آگہی کے نئے رنگ و روپ اُجاگر کرتا ہے۔ زندگی کے نئے نئے مناظر اس کے روبرو نقاب اُٹھائے آتے ہیں اور ایک متجسس آنکھ کے لئے یہ سلسلہ سدا جاری رہتا ہے اور سالک دل کی گہرائیوں سے یہ خواہش کرتا ہے کہ:

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی　　　اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

نگاہِ شوق کے سامنے آنے والا لامتناہی سلسلۂ مناظر کہیں بھی تکرار کا شکار نہیں ہوتا بلکہ ہر نیا منظر اپنے دامن میں اَن گنت صد رنگ جلوے چھپائے انسانی تجربہ و احساس کا منتظر رہتا ہے۔ گویا عملِ تخلیق میں انسان کا تجربہ اور احساس فطرت سے ہم آہنگی اختیار کر لیتے ہیں اور یوں تخلیق کی گاڑی ظاہر و باطن کے پہیوں پر چلتی رہتی ہے لیکن یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ ہر نئے منظر کی تخلیق و تشکیل پچھلے سلسلۂ مناظر کی ہمہ جہت اور کامل آگہی کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ پچھلا منظر ہی نئے منظر کی نشاندہی کرتا ہے ـــــ گویا فطرت و حیات کے اس سلسلۂ مناظر میں دراصل ایک ہی رُوح کارفرما ہوتی ہے جو ہر دم نئے نئے بھیس بدل کر آگہی کے در وا کرتی ہے ـــــ کچھ یہی معاملہ شاعروں کے ساتھ بھی ہے۔ اعلیٰ ادب پاروں میں رنگوں اور سایوں (SHADES) کے اختلاف کے باوجود ایک ہی رُوح بولتی محسوس ہوتی ہے۔ اب "رُوحِ شاعری" کی تعریف و تعیین کے مسئلے پر اختلاف ہو سکتا ہے (اور اس مسئلے پر طولِ شبِ فراق سے بھی طویل تر بحثیں ہوتی رہی ہیں) لیکن اس کی موجودگی پر نہیں۔ اعلیٰ شاعری جو آفاقیت اور دوام کی حامل ہوتی ہے اپنے عہد کی حقیقی زندگی سے بھی مربوط ہوتی ہے ـــــ میتھیو آرنلڈ نے شاعری کو فنی حسن اور شاعرانہ صداقت کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تنقیدِ حیات قرار دیا تو اس کا مقصد بھی زیادہ تر اپنے ہی عہد کی زندگی پر تنقید تھا لیکن ایک اعلیٰ ادب پارے کا بنیادی وصف ہی یہی ہے کہ اس کی جڑیں چاہے اپنے دور کی زندگی میں پیوست ہوں لیکن وہ پھر بھی اس سے ماورا ہو کر آنے والے ادوار کا احاطہ کرے ـــــ اور میر کی شاعری میں یہ خوبی اپنی بھرپور جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ اس لئے جب میں کہتا ہوں کہ میر کا طرزِ احساس ہی جدید شاعری کو ارفعیت سے ہمکنار کر سکتا ہے تو میرا مقصد یہ قطعاً نہیں کہ جدید شاعری کو کاملاً میر کی شاعری کا رنگ و آہنگ اختیار کر لینا چاہیئے ـــــ اور پھر یہ دعویٰ کہ آج کی اچھی شاعری میں بھی میر کے طرزِ احساس کا لہو گردش کر رہا ہے، آج کی شاعری کو کم وقعت ثابت نہیں کرتا بلکہ اشارہ حیات اور تخلیق کے اسی تسلسل اور اس روحِ شاعری کی طرف ہے جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ حیات میں تسلسل کے ساتھ ساتھ ایک تغیر بھی موجود ہے اس لئے ہر دور میں شاعری کے انداز اور سانچے بدلتے رہے ہیں لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ کیا رُوحِ شاعری اور شاعرانہ طرزِ احساس میں بھی کوئی بنیادی تغیر رونما ہوا ہے؟ اس کا جواب مشروط طور پر ہاں میں ہوگا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ارفع شاعرانہ طرزِ احساس بنیادی طور پر وہی رہا ہے جو قدیم انسان میں تھا لیکن کچھ تغیرات کے ساتھ جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں ارسطو اور افلاطون اور دوسرے قدیم مفکروں اور شاعروں کی کئی باتوں پر اس لئے حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے بھی کسی بات کو ایسے ہی محسوس کیا جیسے ہم آج کرتے ہیں۔ ہومر، ملٹن اور سعدی، فردوسی و حافظ اسی بنا پر آج بھی شاعرانہ عظمتوں کے آستھان پر براجمان ہیں لیکن مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ جدید شاعری حافظ، فردوسی، سعدی، میر یا غالب کی شاعری نہیں بلکہ یہ کچھ اور بھی ہے۔ زندگی میں تغیر اس کے تسلسل میں واقع ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح شاعری اور شاعرانہ طرزِ احساس میں بھی تغیر اسی تسلسل کے ساتھ موجود رہا ہے۔ میر کی شاعری حافظ یا سعدی کی شاعری نہیں ہے۔ غالب کی شاعری میر کی شاعری اور اقبال کی شاعری غالب کی شاعری نہیں ہے۔ حافظ سے اقبال تک یہ تبدیلی ایک تسلسل کے ساتھ موجود ہے۔ اسی طرح جدید شاعری

ان سب سے مختلف ہے لیکن تغیر کے باوجود اس تسلسل سے منقطع بھی نہیں بلکہ اسی روایت کے عظیم الشان دھارے کی توسیع ہے جو فارسی میں حافظ و سعدی اور اردو میں میر و غالب نے قائم کی تھی۔ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قدیم صحتمند شعری روایت ہی دراصل آج کی شاعری کے مرکزی اور ذیلی دھاروں کو صحیح طور پر متعین کرنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے ـــــ اردو شاعری کی اعلیٰ اور صحتمند روایت کا دھارا میر کی شاعری ہی سے پھوٹتا نظر آتا ہے اور جدید شاعری کو بھی روایت کے اسی عظیم الشان دھارے کا ایک جزو اور توسیع ہونا چاہئے اسی لئے میں کہتا ہوں کہ میر کے شعری رویوں اور طرزِ احساس سے یکسر کٹ کر جو شاعری ہو رہی ہے وہ اپنی رہی سہی معنویت اور اہمیت بھی کھو بیٹھی ہے۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم آج کی شاعری کو میر کے شاعرانہ طرزِ احساس کی کسوٹی پر کس کر دیکھیں کہ اس میں کندن بننے کی صلاحیت ہے بھی یا نہیں؛ میر کا طرزِ احساس حزنیہ، دردوں ہیں، دھیما اور پرسوز ہے اور یہی طرزِ احساس میر کے شاعرانہ لب و لہجے میں دھیمی لے کا خالق ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میر کے ہاں کبھی کبھی خنگی، جھلاہٹ اور انانیت کا احساس بھی ابھر آتا ہے لیکن اس خفگی، جھلاہٹ، اس انانیت میں بھی وہی دھیما پن موجود رہتا ہے ـــــ اگرچہ میر کے طرزِ احساس میں کامل ہم آہنگی ہے اور کسی قسم کی دوئی نہیں لیکن جدید شاعری میں اس کی مطابقت تلاش کرتے ہوئے ہمیں اس کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنا پڑے گا کیونکہ تجزیہ نام ہی کسی شے کے اجزاء کو الگ الگ کر کے مشاہدہ کرنے کا ہے اور پھر ایک بنیادی مجبوری یہ بھی ہے کہ میر کے طرزِ احساس کے مختلف کیفیاتی پہلو مختلف جدید شاعروں کے ہاں مختلف انداز اور مختلف رنگوں میں ملتے ہیں۔

میر کی شاعری جذبوں کی شدت کی ترجمان ہے۔ میر نے اپنے احساسات کو کچھ اس سچائی اور خلوص کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر جذبوں کی زبان دی ہے کہ اس کے شعر تلملاتے جذبوں اور عمیق احساسات کی تجسیم کرتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ میر کی شاعری کو المیہ اور حزنیہ دبستان ادب سے متعلق گردانا جاتا ہے اور یہ ہے بھی حقیقت کہ میر کی شاعری میں الم و حزن کا عنصر غالب ہے۔ وہ خود اقرار کرتا ہے کہ

کیا ذکر ہم صفیراں یارانِ شادماں کا ‏ ‏ ‏ ‏ یا روئے یا رُلایا، اپنی تو یونہی گزری

میر کی ساری زندگی درد و سوز میں گزری اور وہ بارہا ٹھوکری سے ٹھیس لگنے سے آبلے کی طرح پھوٹ بہا لیکن اگر تھوڑا سا غور کرنے کی مشقت برداشت کر لی جائے تو میر کے غم والم پر مریضانہ قنوطیت کا شائبہ کم ہی گزرتا ہے۔ اس نے اردو کے منفرد الم پسند شاعر فانی بدایونی کی طرح غم کو عین مقصود سمجھ کر اپنی شاعری کی فضا کو تیرہ و تار نہیں بنا لیا بلکہ میر کے ہاں غم وسیع انسانی ہمدردی اور اعلیٰ انسانیت میں تبدیل ہو کر نسخۂ کیمیا بن گیا ہے۔ اس کا غم عالمگیر اجتماعی دردمندی و شفقت کا وسیلہ اور سرچشمہ بن گیا ہے ـــــ اور وقت کا اجتماعی احساس اس کے انفرادی احساس سے ہم آہنگ ہوتا نظر آتا ہے۔

'غم' کوئی یک رُخی اصطلاح نہیں اور نہ ہی یہ کوئی سیدھا سادہ تجربہ ہے۔ انفرادی اور اجتماعی ماحول میں اس کی کئی سطحیں ہوتی ہیں اس تجربے کا تجزیہ کرتے ہوئے پہلے تو یہ دیکھنا انتہائی ضروری ہوتا ہے کہ غم والم کے چرکے سہنے والی شخصیت کیسی ہے، پھر یہ کہ جو چرکے اس حساس شخصیت کے دل پر لگے اُن کی نوعیت کیا ہے۔ چیخوف، دوستوفسکی اور کئی دوسرے یورپی ادیبوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو بڑے دردناک انکشاف ہوتے ہیں مثلاً باپ کی بے اعتنائی اور انتہائی ظالمانہ رویہ، ماں کا جس کے خلوص اور ممتا کی قسمیں کھائی جاتی ہیں، اپنی نفسانی خواہشوں کے سامنے اولاد کو بے وقعت سمجھ لینا اور پھر معاشرے کا ان ادیبوں کے ساتھ سلوک وغیرہ۔ اگر اس قسم کے تجربے گرچہ محبوب میں آٹھ آٹھ آنسو بہانے والے ہمارے شاعروں کو ہوتے تو پتہ نہیں ان کی کیا حالت ہوتی۔ گھریلو سطح پر اس قسم کی RELATIONSHIP کا تجربہ ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو ہمارے معاشرے میں مروجہ مشترکہ خاندانی نظام کی بنا پر کم ہی ہوتا ہے لیکن میر ایک ایسی شخصیت ہے جس نے نہ صرف اردگرد کے ماحول میں رشتوں کی بے وقعتی کا مطالعہ کیا بلکہ خود اپنے اہل خاندان اور بھائی کا اس سے رویہ کچھ کم

حوصلہ شکن نہیں تھا ـــــ غم کا سامنا کرتے ہوئے کسی شخصیت کے کئی قسم کے رویے سامنے آتے ہیں۔ کوئی منفعل قسم کی شخصیت خود رحمی کا شکار ہو کر رنج والم ہی سے لذت اندوز ہونے لگتی ہے اور پھر اُن کی طرح غم ہی اس کے لئے جینے کا سہارا بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ شخص الفت ذات کی شدتوں کا اسیر ہو کر اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو گھن لگا بیٹھتا ہے۔ کسی بڑی شخصیت کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ غم کو ایک بصیرت افروز تجربہ بنا سکے اور پھر اس میں دوسروں کو شریک کرنے کی صلاحیت بھی ہو اور حوصلہ بھی۔ میر کی شاعری میں غم والم کی کم و بیش یہ سب سطحیں موجود ہیں کبھی وہ خود رحمی کا شکار ہو کر یہ کہتا ہے کہ:

رکھ ہاتھ دل پر میر کے دریافت کر کیا حال ہے　　　رہتا ہے اکثر یہ جواں کچھ ان دنوں بیتاب سا

وہ ہمدردی کے حصول کے لئے اپنے اپنے دل کی شکستگی کی نمائش بھی کرتا ہے:

دیدنی ہے شکستگی دل کی　　　کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

لیکن میر عموماً مریضانہ قنوطیت پسندی سے پہلو بچا جاتا ہے اس لیے اس کے شعر پڑھ کر طبیعت کثیف نہیں بن جاتی بلکہ اس میں ایک انشاطیہ کیفیت موجود رہتی ہے۔ میر کے غموں میں ایسا لطف پنہاں ہے کہ ان میں شرکت کو جی چاہتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ الم پسندی کے باوجود میر کے ہاں یکرنگی نہیں بلکہ جذبہ و احساس کی بوقلمونی ہے جس پر ایک دلکش اداسی کی فضا طاری ہے۔ میر کی شاعری کی اداس فضا جذبہ و احساس کے رنگ و آہنگ کو مزید دلپذیر بنا دیتی ہے۔ میر کے دل کی بات ہر کسی کو اپنے دل کی کہانی لگتی ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ خود ہر بڑے شاعر کی مانند شدید احساس تنہائی کا شکار رہے۔ اس کے دل میں سارے جہاں کا درد پنہاں ہے لیکن خود اس کے درد دل میں شرکت کرنے والا کوئی نہیں:

جو ہے سو مست بادہ وہم و خیال ہے　　　کس کو ہے یاں نگاہ کسو دُردنوش پر

میر کے اس شدید احساس تنہائی نے اسے عام زندگی میں تو مریضانہ حد تک تنہائی پسند اور مردم بیزار بنائے رکھا لیکن اس کے شعروں میں گفتگو کرنے کسی کو مخاطب کرنے (خطاب نہیں) کی شدید خواہش کا اظہار ملتا ہے۔ وہ خود اپنے شعروں کو "باتیں" کہتا ہے لیکن یہ کسی عامی کی باتیں نہیں بلکہ ایک نفیس مزاج شخصیت کی باتیں ہیں۔ وہ عام آدمی کی سطح سے بلند ہو کر بات کرتا ہے۔ کبھی وہ کسی اور کو اپنے دکھوں میں شرکت کا اہل نہ سمجھتے ہوئے خود اپنے آپ سے باتیں کرتا دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے اس خود کلامی کے انداز میں بھی اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کی شدید خواہش تملاتی محسوس ہوتی ہے ـــــ میر کا احساس تنہائی اس میں ایک طرح کی انانیت پسندی بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اُسے اپنے کمال فن پر ناز ہے اور وہ بجا طور پر یہ کہتا ہے کہ:

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں　　　تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

میر کے اس تفاخر کی بازگشت آج کے شاعر کے ہاں کچھ اس انداز میں سنائی دیتی ہے:

خدا کے ذہن کا فن پارۂ عظیم ہوں میں　　　تمام دہر کا دولہا ہوں میں، ندیم ہوں میں

لیکن یہاں بھی میر ہر بڑے شاعر کی طرح محض اپنی ذات کے بندھنوں میں اسیر ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ وہ بھی ندیم کی طرح انسان ہی کو "نقش جہات کا دولہا" اور کائنات کی ساری گردشوں کو اس کے براتی قرار دیتا ہے۔ وہ عظمت انسان کا صحیح ادراک رکھتا ہے۔ وہ ساری خدائی کو انسان پہ صدقے کرنے کا داعی ہے اور اس کا قائل ہے کہ "شان ارفع ہے میر انساں کی" کیونکہ

سب پہ جس بار نے گرانی کی　　　اس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

اسی احساس کی بنا پر میر کے والہانہ جذبے وجدان سے فکر کی طرف بھی سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کے جذبوں میں فکر کی گہرائی کا رچاؤ بھی موجود رہتا ہے جیسا کہ سلیم احمد کہتے ہیں:

"...... شاعری، بالخصوص بڑی شاعری کے دو طریقۂ کار ہیں۔ ایک طریقۂ کار احساس کو فکر بنانا یا محسوس کو معقول بنانا ہے، اور دوسرا طریقۂ کار فکر کو احساس میں ڈھالنا یا معقول کو محسوس کر دینا ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک طریقۂ کار کو اختیار کئے بغیر کسی قسم کی قابلِ قدر شاعری ممکن نہیں ہے۔

میرؔ فکرِ محسوس کے شاعر ہیں۔ یہاں ادراک احساس کے روپ میں جلوہ گر ہوا ہے۔" (دھوری جدیدیت ص ۱۲۵)

میرؔ کا کمال دراصل یہ ہے کہ وہ فکر کو ہمارے احساس میں اس طرح اتارتا ہے کہ وہ ہمارے لئے اجنبی نہیں رہتی۔ اس کی فکر ہمارے لئے کوئی خیالی نظریہ یا عقیدہ نہیں رہ جاتی بلکہ ایک گہرا تجربہ بنتی محسوس ہوتی ہے۔ فکر اور جذبہ و احساس کو یکجان کر کے پیش کرنے ہی میں میرؔ کی عظمت کا راز ہے ــــــ یہی شاعرانہ عظمت میرؔ کے ہاں تہذیب و شائستگی، پاسِ وضع اور پاسِ ناموسِ عشق کا شدید احساس پیدا کرتی ہے اور وہ پلکوں تک آئے ہوئے آنسو روک لینے کا حوصلہ رکھتا ہے لیکن پھر میرؔ کی "بد دماغی" اور "بے دماغی" کا سبب کیا ہے؟ اُسے ہر وقت:

الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

آخر کیوں؟ وہ یہ کہنے پر کیوں مجبور ہے کہ:

سدا ہم تو کھوئے گئے سے رہے　　　کبھو آپ میں تم نے پایا ہمیں؟

میرؔ کی بے دماغی اور بد دماغی کا سبب اُس کے شدید احساسِ تنہائی اور انانیت پسندی کو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس کا سبب چاہے کچھ ہو میرؔ کی بد دماغی کہیں بھی اسے تہذیب و شائستگی سے عاری نہیں کرتی۔ اُسے "پاسِ وضع" ہمیشہ رہتا ہے ــــــ میرؔ کی داخلیت پسندی اور دروں بینی اسے "چہار دیواری عناصر" کی نیرنگیوں کا مشاہدہ کرنے سے نہیں روکتی۔ وہ باطنِ فطرت میں جھانکنے والی نظر رکھتا ہے اور اسے ہر جگہ "جہانِ دگر" نظر آتا ہے۔ میرؔ نیرنگِ عناصر کے جلوؤں اور انسان کے نہاں خانوں کا رمز شناس ہے۔ اس کے قلب و ذہن کی غم آلود فضا اسے نیچر کے حسن کا مطالعہ کرنے سے باز نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے آپ میں گم رہنے اور مہینوں اپنے کمرے سے متصل باغ کو کھڑکی کھول کر نہ دیکھنے والے میرؔ کے اشعار میں ہمیں تصویر کاری اور امیج سازی کا بھرپور رجحان ملتا ہے، اگرچہ اسے احساس ہے کہ:

ہم نہ کہتے تھے کہ نقش اس کا نہیں نقاش سہل　　　چاند سارا لگ گیا تب نیم رخ صورت ہوئی

وہ یہ بھی جانتا ہے کہ عالمِ تصویر بھی اک عالم رکھتا ہے اس لئے اُس نے اپنے کلام میں جا بجا دلکش نقش ابھارے ہیں اور دلی کے "اوراقِ مصور" کے جلوے بار ہا دکھائے ہیں لیکن میرؔ کی تصویر کاری پر بھی اُس کی شاعری کا دھیما پن اور اداسی فضا طاری نظر آتی ہے اور اُسے بار بار یہ احساس ستاتا ہے کہ:

نہ کھنچے تجھ سے ایک جا نقاش　　　اُس کی تصویر وہ ہے ہرجائی

موت اور فنا ایک ایسی ناگزیر حقیقت ہے جس سے روگردانی ممکن نہیں۔ موت ایک ایسا بھرپور اور پہلو دار تجربہ ہے جس پر ہر بڑے شاعر نے سوچا اور لکھا ہے اور موت کے ذائقوں کا صحیح ادراک اگرچہ جیتے جی ناممکن ہے لیکن ایک حساس فکر انسان، انسانی زندگی کے اس اہم ترین تجربے کی مختلف کیفیتوں کا ادراک کرنے کی اپنی سی کوشش کرتا ہے۔ خوفِ مرگ تمام بنی نوعِ انسان کی مشترکہ میراث ہے اور موت سے بچنے کی جدوجہد ہی دراصل پوری انسانی زندگی پر محیط نظر آتی ہے۔ میرؔ بھی موت کی معنویت کو پانے میں کوشاں نظر آتا ہے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہے، اور اس کے عہد کی تصوف کی مضبوط ترین تحریک ادراکِ حقیقت میں اس کا سہارا بنتی ہے اور وہ موت کو "اک ماندگی کا وقفہ" قرار دے کر دل کو تسلی دیتا ہے۔ وہ موت کو ایک ابدی حقیقت جان کر قبول کرتا ہے اور وہ صوفی نہ ہونے کے باوجود ایک سچے صوفی کی طرح "ذوقِ فنا" میں محو ہے کہ یہی وصالِ حقیقت کا واحد ذریعہ ہے:

جیو خوش یا کوئی ناخوش ہمیں کیا　　　ہم اپنے محو ہیں ذوقِ فنا میں

تصوف کی مضبوط روایت ہر جگہ میرؔ کا سہارا بنتی ہے۔ اُس کا عشق اگرچہ سراسر مجازی ہے لیکن اس میں بھی حقیقت کی جھلک بار بار نظر آجاتی

ہے۔ میر موت و حیات کے ہر پہلو کو ایک سچے صوفی کی نظر سے دیکھتا ہے اور ہر مسئلے کو تصوف کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ حقیقتوں کی تلخیوں کا جگرداری سے سامنا کرنے والا میر یہ کہتا بھی سنائی دیتا ہے کہ:

کچھ نہیں، بحرِ جہاں کی موج پر مت بھول میر دور سے دریا نظر آتا ہے لیکن ہے سراب

یہ تو تھا میر کے احساس اور طرزِ احساس کا ایک اجمالی سا جائزہ۔ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر یہ باتیں اضافی معلوم ہوں لیکن یہ اس لئے ضروری تھا کہ جدید شاعری میں میر کے طرزِ احساس کے مختلف پہلو تلاش کرنے میں آسانی ہو اور یہ ہماری قومی روایت ہے کہ ہم ہمیشہ آسان راستے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں چاہے یہ منزل سے دور ہی کیوں نہ لے جائیں۔ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ "پیروئ میر" کا بے محابا رجحان ہماری شاعری میں عام مروج رہا ہے اور "میری" کہلانا باعثِ افتخار سمجھا جاتا رہا ہے۔ میر کے ان گنت پیروؤں نے میر کی روح کو سمجھے بغیر ہی اس کی پامال زمینوں اپنے پاؤں تلے لتاڑنے اور بحور و ردیف و قافیہ کی مماثلتیں قائم کرنے ہی کو میر کے تتبع کی معراج سمجھ لیا لیکن میر کی اس "معنوی اولاد" کی منصوبہ بندی کی اشد ضرورت رہی ہے کیونکہ محض ظاہری مماثلت قائم کر لینا یا میر کے دھیمے لہجے کی چند لرزشوں کو میر کی شاعری کی روح کا ادراک کئے بغیر اپنی شاعری میں سمونے کی کوششیں عموماً نہایت مضحکہ خیز نتائج سامنے لائی ہیں اور یوں "پیروئ میر" کجروی کی ایک مثال بن کر رہ گئی۔ بہت کم شاعروں نے میر کے طرزِ احساس کو اپنے محسوسات میں رچا بسا کر خود اپنے تخلیقی تجربے کو اپنی شاعری کی بنیاد دبنایا۔ مصحفی سے ناصر کاظمی اور مختار صدیقی تک گنتی کے چند شاعر ہی میر کے طرزِ احساس سے خود کو ہم آہنگ کر پائے اور انھوں نے میر کے رنگ میں رنگ کر اپنی آواز کو گم نہیں ہونے دیا بلکہ میر کے کرب کو اپنی ذات کا کرب بنا کر خود اپنے تخلیقی تجربوں کے سہارے میر کی صحت مند شعری روایت کو آگے بڑھایا نقادوں نے بھی میر کی شعری روایت کے تعین پر بہت کم توجہ دی ہے۔ لے دے کے مجنوں گورکھپوری کا ایک مضمون اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے چند تدریسی نوعیت کے مضامین ہی سامنے آتے ہیں یا پھر حال ہی میں ملتان یونیورسٹی میں "پیروئ میر" پر اپنا ایم۔اے کا مقالہ لکھتے ہوئے مس مسرت حفیظ نے ایک سنجیدہ کوشش میر کی شعری روایت کو سمجھنے کی کی ہے لیکن بدقسمتی سے انھوں نے "پیروئ میر" کے نام پر ہونے والی کجروی کی واضح حوصلہ شکنی کم ہی کی ہے۔ میں اپنے موضوع کی مناسبت سے پوری اردو شعری روایت کی بجائے صرف جدید شاعروں کے ہاں میر کے طرزِ احساس کی جلوہ گری کی نشان دہی کروں گا لیکن یہاں ایک اور گمبھیر مسئلے کا سامنا ہے اور وہ ہے کسی شاعر کی قدامت اور جدت کے تعین کا۔ کیونکہ موجودہ دور میں جسمانی طور پر موجود بعض "عظیم شاعر" ایک نسل پہلے اپنی شعری موت مر چکنے کے باوجود بدقسمتی سے ابھی تک کفنائے دفنائے نہیں گئے اور وہ آج بھی "قومی مشاعروں" میں اپنی ربع صدی قبل کی تخلیقات سنا کر داد کی بھیک مانگتے نظر آتے ہیں اور خود کو جدید شاعر کہلوانے پر بضد ہیں اور بعض کہنہ مشق شاعر اپنی ایک صدی کی پیرانہ سالی اور فرسودگی کا بوجھ اٹھائے، اب بھی معشوقانِ نوخیز سے بزرگ کہلوانے کی بجائے، سولی پر چڑھنے اور سو بار جہنم میں گرائے جانے کے نعرے لگا رہے ہیں اور پھر بعض نوجوان شاعروں کے کندھوں پر دھرا بوڑھا سر عصرِ جدید کے اصل تقاضے سمجھنے سے یکسر قاصر ہے۔ وہ جدت طرازی کے زعم میں پوری شعری روایت سے برأت کے نعرے تو بلند کرتے ہیں لیکن "اقتدائے مصحفی و میر" کے یہ تارک نہ ادھر کے رہے ہیں نہ ادھر کے۔ اس لئے مجھے عافیت اسی میں نظر آتی ہے کہ باری باری جدید شاعروں کے نام گنوانے کی بجائے جدید شاعری میں ایسے نمونے تلاش کروں جن میں عصرِ حاضر کی روحِ شعر کے پہلو بہ پہلو میر کا طرزِ احساس جھلکتا محسوس ہو۔ یہ طریقۂ واردات اس لئے بھی موزوں نظر آتا ہے کہ کوئی بھی جدید شاعر نہ تو میر کا طرز اپنا سکا ہے (مستثنیات سے قطع نظر) اور نہ ہی کوئی خود کو میر کا تابع مہمل کہلوانا پسند کرے گا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ میں "پیروئ میر" کے مختلف پہلو غزل کی بجائے نظم میں تلاش کروں گا اور وہ بھی ظاہری ہیئت کی بجائے ان کے باطن میں۔

میر کی شاعری کی طرح آج کی شاعری کی عمومی فضا بھی حزن و الم سے ترتیب پاتی ہے۔ میر کے حزن و الم کے سرچشمے اس کے خاندانی

ماحول، مصائب و آلام سے پُر ذاتی زندگی، زمانے کی بے قدری اور اس کے اپنے عہد کے کربناک اجتماعی احساسات اور واقعات سے پھوٹتے ہیں۔ میر کے انفرادی و اجتماعی ماحول کی اسی مطابقت نے اس کے غم کو انفرادی کے ساتھ اجتماعی بھی بنا دیا ہے اور یوں اس کی شاعری محض ذاتی اور انفرادی آلام کا نوحہ بن کر نہیں رہ گئی بلکہ میر نے اپنے شعروں میں ہر فرد کا درد سمو دیا ہے جس سے اس کے ہاں آفاقیت آگئی ہے۔ آج کے شاعر کے دکھ بھی اس کی انفرادی زندگی کے علاوہ اس کی اجتماعی زندگی کی دین ہیں۔ اگرچہ آج کے شاعر اور میر کے درمیان جو فکری و زمانی بُعد ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن۔ ایک ایسی چیز جو ان کو محسوساتی سطح پر مکمل طور پر نہیں تو قریب قریب اہم آہنگ کرتی ہے۔ ان کے انفرادی ماحول کا حزن والم ہے۔ اگرچہ اندرونی کرب والم کے بغیر بھی بہت سے مشہور شعرا مثلاً ذوق و ناسخ وغیرہ اردو شاعری کے ساتھ بڑے دھڑلے سے "استادی" کرتے رہے ہیں اور عہد حاضر میں بھی شاعروں کی ایک پوری کھیپ ان استادانِ سخن کے مجتہدانہ تتبع میں بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دے رہی ہے۔ سچی شاعری اپنا خونِ جگر صرف کئے بغیر ممکن نہیں لیکن آج کے مجتہد العصر اپنے بجائے دوسروں کا خون جلانے کے خواہاں نظر آتے ہیں ۔۔۔ اور جو دل جلا اپنے ہی خونِ جگر سے اپنی شاعری کا چراغ روشن رکھنے کی سعی کرتا ہے ہمارا معاشرہ اس کے ساتھ استادی کر جاتا ہے اور یوں میراجی اور مجید امجد اپنے انجام کو پہنچتے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ معاشرے کی اسی "استادی" کے طفیل ہی اعلیٰ شاعری وجود میں آتی ہے۔ ہماری سوسائٹی کے بے رحم رویّے آج کے شاعر کو ایک زبردست ذاتی و اجتماعی آشوب سے دوچار کرتے ہیں۔ پھر یہی آشوب، آشوبِ غمِ زیست بن کر اس کی شاعری میں اظہار پاتا ہے۔ عہدِ میر کو جاٹوں، سکھوں، مرہٹوں، روہیلوں، درانیوں اور پھر بدیشی تاجروں نے انتشار اور بے سکونی کے عالم میں رکھا۔ لیکن آج کے سکھ، جاٹ، مرہٹے وہ استبدادی قوتیں ہیں جنہوں نے پوری دنیا کو چند متحارب گروہوں میں بانٹ کر اس سے سکون و آشتی کو ناپید بنا دیا ہے۔ عہدِ حاضر کے یہ مداری سکون کی پونجی لوٹنے کے لئے دو ہولناک عالمی جنگوں کے ناٹک دکھا چکے ہیں اور اب اس سے بھی کہیں زیادہ خوفناک ناٹک کی تیاری میں بڑے انہماک سے لگے ہوئے ہیں۔ گزشتہ دو عالمی جنگیں محض چند ملکوں کے درمیان نہیں تھیں کہ ان کے اثرات محدود رہتے۔ یہ جنگیں دنیا کے ایک بڑے حصے کو کھنڈر بنانے کا باعث بنیں۔ ان جنگوں میں انتہائی پیچیدہ اور ہلاکت خیز اسلحہ استعمال ہوا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ متحارب قوتوں کے درمیان یہ شرط بدی ہوئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کو بیک وقت کس طرح اور کتنی آسانی سے ہلاکت و بربادی کا ایندھن بنایا جا سکتا ہے اور وسائلِ پیداوار کس طرح برباد کیے جا سکتے ہیں۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں انسان ایک دوسرے کو جنگلی درندوں کی طرح بھنبھوڑ رہے تھے۔ اس عالمِ وحشت میں مختلف مذہبی و روحانی اقدار توپ کے بے رحم گولوں کے آگے ڈھے رہی تھیں۔ قدیم عقائد کے بلند و بالا ستون بودے مورچوں کی طرح زمین بوس ہو رہے تھے اور انسان سوچ رہا تھا کہ یہ ظلم و جہل اور یہ بربادی آخر کیوں؟ کیا انسانی تہذیب و معاشرت کا ارتقا غیر فطری ہے؟ اور یہ فکری و ذہنی انتشار و کرب ایک ایسا تجربہ ہے جس سے میر یا میر کے عہد کا کوئی شاعر دوچار نہیں ہوا۔

برصغیر پاک و ہند اگرچہ ان جنگوں کی براہ راست تباہ کاری سے محفوظ رہا لیکن جاپانیوں کے قدم اس کی دہلیز کو بھی دہلا گئے تھے اور اس دھرتی کے لاکھوں سپوت اپنے بدیشی آقاؤں کی مرضی کے تحت دیارِ غیر میں بے بسی و بے کسی کی موت کا نوالہ بن رہے تھے یہاں ان گنت بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہو رہی تھیں۔ پھر برصغیر میں چلنے والی تحریکِ آزادی اور حکمرانوں کا جبر و تشدد، جلیانوالہ باغ کا واقعہ انسانی حقوق کی مسلسل خلاف ورزی ۔۔۔ ہندوستانیوں کی آپس کی منافرت و محاذ آرائی، فرقہ وارانہ اور نسلی فسادات وغیرہ ۔۔۔ یہ سب باتیں یہاں کے شاعر کے حساس دل کو پے بہ پے چرکے لگا رہی تھیں۔ یورپ میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے "ویسٹ لینڈ" لکھ کر اس بربادی و بے معنویت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی تو میراجی، ن۔ م۔ راشد، جوش، فیض، احمد ندیم قاسمی اور اس عہد کے دوسرے شاعروں کی شاعری بھی اس وقت کے ہندوستان کے کرب و ابتلا کا اظہار بن کر سامنے آئی۔ لیکن عہدِ حاضر کے شاعر کے لئے قریب ترین حوالے، ہندوستان کی تقسیم

اور پھر اس کے نتیجے میں ہونے والی وحشیانہ غارت گری اور کشت و خون بنتا ہے۔ صبح آزادی کے سورج نے درندگی و بہیمیت کے جو مناظر دیکھے وہ بہت ہی ہولناک تھے، ہر کوچہ کوچہ دار اور ہر گلی مقتل بن گئی۔ پھر جلاوطنی اور ہجرت کا شدید احساس دلوں میں اندوہ و غم کی ایک مستقل کسک چھوڑ گیا اس لئے تقسیم کے بعد اردو شاعری میں انسانی رشتوں اور مذہبی، روحانی و اخلاقی اقدار اور ان سے تغافل کے المیہ کو جذبوں کی زبانی پیش کیا گیا۔ کچھ اس قسم کے کرب انگیز حالات تھے جن میں میرؔ نے کہا تھا:

ان اُجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو

اب خرابہ ہوا جہان آباد ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی اُنھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

نئے شاعروں نے بھی برصغیر کی تاریخ کی اس ہولناک ترین بربریت اور تباہی و بربادی کو اپنی شاعری کی روح میں رچا کر پیش کیا۔ اس دور میں شریف کنجاہی کی "بچے کے نام"، "ہرچند کے نام"، اور "واہگہ پار کر گئے ایک دوست کے نام"۔ عارف عبدالمتین کی "ماں" اور "۳۰ جنوری" مجید امجد کی "متروکہ مکان"۔ مختار صدیقی کی "بازیافتہ"۔ ضیا جالندھری کی "یہ بہار"۔ ادیب سہیل کی "مرگِ خوں"۔ احمد ندیم قاسمی کی "طلوع"، "آزادی کے بعد" اور "جبر و اختیار" اور فیض، ن۔م۔ راشد، عرش صدیقی، احسان دانش، فراق گورکھپوری اور دوسرے کئی شاعروں کی بہت سی نظمیں بالواسطہ یا بلاواسطہ اس دور کے کرب اور سماجی شعور کا بیان ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی نظم "طلوع" کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بس اک ذرا سی کرن کی مجھے تمنا تھی
کہ ٹوٹ جائے یہ دیرینہ ظلمتوں کا طلسم
مگر چراغ کی لَو سے لہو نکلنے لگا
کچھ ایسی تند تھی جلتے لہو کی جولانی
جہانِ خواب مرا کروٹیں بدلنے لگا
جب آنکھ کھول کے آفاق پر نظر ڈالی
تو شششِ جہت سے لہو اس طرح ابلنے لگا
کہ تنکے بن کے بہے جا رہے تھے سینکڑوں جسم

اب میرؔ کے اس شعر میں اس قسم کی کیفیت کی بلیغ جھلک دیکھئے:

یہ عیش گاہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا

ان دونوں شعری کاوشوں میں "لہو" کا استعارہ دونوں شاعروں کی محسوساتی سطحوں کو آپس میں ملاتا نظر آتا ہے۔ دو مختلف زمانوں میں ماحول اور طرزِ اظہار کے اختلاف کے باوجود طرزِ احساس کا یہ میل ملتے جلتے بیرونی حالات کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اس کرب ناکی کی دین ہے جس کا شکار دونوں شاعر ہوئے۔ ندیم کو لہو کے ابلتے سیلاب میں سینکڑوں جسم بہتے نظر آتے ہیں تو میرؔ کو گلاب کا ہر پھول "ساغر بھرا لہو کا" محسوس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ انسانی خون کی ارزانی اور بے وقعتی کے وہ لاتعداد مناظر ہیں جن کا مشاہدہ دونوں شاعروں نے کیا۔ اس لئے عہدِ قدیم اور عہدِ جدید کے ہر دو شاعروں کو دنیا عیش گاہ سے زیادہ عذاب گاہ نظر آتی ہے۔

قیامِ پاکستان سے خوشحالی اور سکون کی بے پایاں توقعات وابستہ تھیں، لوگوں نے چند مقاصد کے حصول کے لئے قربانیاں دی تھیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ احساس ہوا کہ سب کچھ خواب و خیال تھا۔ بدیشی آقاؤں کے چلے جانے سے عوام کی حالت میں

بہتری کی امیدیں نقشِ برآب ثابت ہوئیں بلکہ بعض معاملات میں دیسی آقا بدیشی آقاؤں سے بھی بڑھ گئے۔ اس انتشار میں ملک میں بائیس سرمایہ دار استحصالی خانوادوں کی بے حد و حساب دولت کے انکشاف نے عام آدمی کے احساسِ محرومی کو مزید بڑھا دیا۔ ہر دور میں آقاؤں کے نمک خوار غلاموں نے اعداد و شمار کی بازی گری کے ذریعے حکمرانوں کا امیج بنانے کی کوششیں جاری رکھیں لیکن عام آدمی کے ذہن میں یہ سوال کلبلاتا رہا کہ اگر ملک میں پیداوار اور آمدنی بڑھ رہی ہے تو مجھے اس کا احساس کیوں نہیں ہوتا؟ یہی وجہ ہے کہ ملک میں مسلسل سیاسی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ عام آدمی کی بے اطمینانی نے کسی حکمراں کو ٹکنے نہیں دیا۔۔۔۔۔ ملک میں آنے والی مختلف تبدیلیوں کے تناظر میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہماری قوم کو ایک قلیل عرصے میں چند ایسے اچھے مواقع ملے جب وہ اپنے بدن پر موجود ناسوروں کا علاج کر کے اپنے تشخص کو بحال کر سکتی تھی۔ پہلا موقع ہجرت کا ہمہ گیر اور کرب انگیز تجربہ تھا لیکن یہ کئی قسم کی انفرادی و اجتماعی خود غرضیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اقتصادی لوٹ کھسوٹ اور ناجائز الاٹمنٹوں کے وسیع کاروبار نے مقامی اور مہاجر ہر دو طبقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بعض مہاجرین نے اپنی قربانیوں کی قیمت چکائی اور انصار نے بھی راتوں رات امارت کی دیوی کو گھر میں ڈالنے کے مواقع ہاتھ سے جانے نہیں دیئے۔ یوں قوم نے خود غرض سیاست دانوں کی گمراہ کن قیادت میں سب کچھ ضائع کر دیا۔ ۱۹۵۸ء تک اقتصادی و سیاسی افراتفری اپنے عروج پر پہنچ گئی اور جنرل ایوب خاں نے بقول خود مجبوراً اقتدار سنبھال لیا۔ اور بعد میں اقتدار واقعتاً جنرل موصوف کی مجبوری بن گیا۔ اس دور میں سیاسی جبر انتہا کو پہنچ گیا جس کا نتیجہ ایک بار پھر افراتفری کی صورت میں نکلا۔ اس دوران میں ۱۹۶۵ء میں بھارت سے جنگ ایک ایسا موقع تھا جب پاکستانی قوم اپنے اصل تشخص کو DISCOVER کر سکتی تھی کیونکہ اس مختصر سے وقفے میں قوم نے اپنے بہت سے مستقل رویوں میں زبردست تبدیلی پیدا کی۔ قربانی اعتماد اور جد و جہد کا بے انتہا ولولہ پورے معاشرے میں نظر آیا لیکن یہ سنہری موقع بھی جھوٹ کے نظام کی نذر ہو گیا۔ جنگ بندی کے بعد حکومتی حلقوں ہی سے "معاہدۂ تاشقند" (جس کے نتیجے میں جنگ بند ہوئی تھی) کے بارے میں متضاد آرا سامنے آنے لگیں اور عام آدمی سوچ میں پڑ گیا کہ ہم تو فاتح تھے، معاہدۂ تاشقند کی صورت میں مفتوح کیسے بن گئے؟ عوام کا اعتماد ایک دفعہ پھر بکھرنے لگا۔ اب وہ دور شروع ہوا جب لفظوں نے سچائی اور حرمت گنوا دی۔۔۔ ملک کا دولخت ہونا بھی کچھ کم اذیت دہ تجربہ نہیں تھا لیکن قوم میں جمود اور بے حسی کا لہو سرایت کرنے لگا۔ نئے پاکستان اور عوامی حکومت کے قیام کے دعوے ہوئے لیکن معاشرے میں بہتری کی بجائے ابتری بڑھتی گئی۔ پھر تقدیس کی عباؤں میں ملبوس مقدس لوگوں نے ملک کی "پاکی" کا بیڑا اٹھایا لیکن ایک حساس فرد نے دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ ایک بار پھر سیاست کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان حالات و کیفیات کو معاشرے کے حساس ترین فرد شاعر نے بہت شدت سے محسوس کیا۔ ان حالات سے درد، اندوہ اور کرب کے وہ سوتے پھوٹے جنھوں نے شاعر کے دل و نظر کو محیط کر لیا۔ منیر نیازی نے پوری قومی تاریخ کا نوحہ دو مصرعوں میں لکھ دیا:

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا

قوم کے استحصال اور زیاں کا احساس آج کے شاعر کی روح کا حصہ بن چکا ہے۔ ذاتی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر کرب کی یکساں لہریں شاعر کو مضطرب رکھتی ہیں بیتے برسوں کی بے سکونی کی کہانی ہی اس کی شاعری کا اہم ترین موضوع ہے لیکن اس معاشرے میں جہاں فرد کی بے وقعتی اہم قدر بن چکی ہے شاعر کو بھی قدم قدم پر اپنی گمنامی اور بے قدری کا شدید احساس ہے:

پوچھتا کوئی نہیں مجھ سے کہ پچھلے سال جب محبت کے پرانے تیس برسوں
سردیوں کی کہر میں دل کی تپش افسانہ تھی سکوں دشمن کہانی ڈھونڈتا
زرد، مدھم چاندنی میں اُس گلی کی سرد اینٹوں پر آخرِ شب کا مسافر کون تھا!

("مسافر آخرِ شب کا"۔ عرش صدیقی)

آخرِ شب کا یہ پرانے تیس برسوں کی سکوں دشمن کہانی کا متلاشی مسافر شاعر خود ہے۔ آزادی کے بعد ملک کی سیاسی اور اقتصادی صورت حال سے شاعر اضطراب اور کرب کی جس صورتِ حال سے دوچار ہوئے اس کا اظہار یوسف ظفر نے اس طرح کیا تھا:

'پاکستان بن گیا تو ہوس کاروں کی بن آئی۔ صدیوں کے بھوکے عزت کے کچلے ہوئے، اغراض کے مارے ہوئے ہوس کے پتلے' ننگے ہوئے اور انھوں نے شاہراہوں پر رقص شروع کر دیا۔ درندے شہروں میں اور انسان جنگلوں میں منہ چھپانے لگے!' (نوائے ساز ص۸)

یوسف ظفر تو مرحوم بن کر کربِ زیست سے اپنی جان چھڑا گئے لیکن آج کے ماحول میں تلخی کا زہر یوسف ظفر کے وقت سے زیادہ قاتل بن چکا ہے اور میر نے جو کہا تھا کہ:

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

میر کا یہ تجربہ کئی گنا ہولناکیوں کے ساتھ آج کے شاعر کو بھی ہو چکا ہے اور آج کا شاعر بھی اپنے عہد کے مظلوم بادشاہ کی کہانی کہتا ہے۔ آج کے جاٹ، سکھ، مرہٹے، ابدالی اور دُرّانی بھی بادشاہ وقت کو اپنی خواہشوں کا زندانی بنانے کے خواہاں، اور کوشاں رہے ہیں عہدِ میر میں شخصی اور اجتماعی شعور کی جہتیں آج سے مختلف تھیں، سیاسی اور اقتصادی مسائل اور طرح کے تھے شخصی اور قومی وفاداریوں کی نوعیت بھی کچھ اور تھی لیکن اپنے اپنے عہد کے مختلف ماحول کے باوجود میر اور آج کا شاعر ایک جیسے تخلیقی تجربوں سے دوچار ہوتے نظر آتے ہیں۔

جب خود غرضی اور بے حسی ہی لوگوں کی آخری پناہ گاہ رہ جائے تو نجیب خوار اور رذیل سرفراز ہوتے ہیں۔ سوچوں پر پہرے بٹھانے کی سعیٔ نامشکور کی جاتی ہے اور اہلِ دانش بے وقعت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ میر کا عہد اہلِ دانش اور اہلِ شرافت کے لئے ذلتوں کے سامان لایا۔ میر نے بارہا اہلِ دانش و ہنر کی بے وقعتی کا اظہار کیا۔ کچھ اسی طرح کی کیفیت عہدِ جدید میں پیدا ہوئی تو آج کے شاعر کا ردِّ عمل میر سے زیادہ تند و تلخ ہے۔ پروین شاکر جسے نسوانی لطافتوں کی شاعرہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس اذیت دہ تجربے سے دوچار ہوئی تو اس کی روح میں اٹھنے والی کرب کی لہر نے لفظوں کے اس سلسلے کو جنم دیا:

سو اب یہ شرطِ حیات ٹھہری
کہ شہر کے سب نجیب افراد
اپنے اپنے لہو کی حرمت سے منحرف ہو کے جینا سیکھیں
وہ سب عقیدے کہ ان گھرانوں میں
ن کی آنکھوں کی رنگتوں کی طرح تسلسل سے چل رہے تھے
سنا ہے ــ باطل قرار پائے
وہ سب وفاداریاں کہ جن پر لہو کے وعدے حلف اٹھے تھے
وہ آج سے مصلحت کی گھڑیاں شمار ہوں گی (تقیّہ)

حق پرستانہ اور تخلیقی سوچوں کو جبر کی زنجیروں میں جکڑنے کے زیاں کا احساس میر کو بھی تھا لیکن میر اپنے عہد کے سیاسی شعور کی مجبوریوں کی بنا پر مستقبل میں، اس کے زہریلے اثرات کا صحیح اندازہ لگانے سے قاصر تھا جبکہ پروین شاکر کی تربیت جس ماحول میں ہوئی ہے، س کے تحت وہ ماضی سے زیادہ حال اور بعض حال سے بھی زیادہ مستقبل کے دھندلکوں میں جھانکنے کی خواہاں ہے اس لئے اسی نظم میں آگے چل کر اپنے شہرِ منحرف کے کچھ غیور اور صادق افراد (کہ حرفِ انکار جن کی قسمت نہیں بنا ہے) کا تذکرہ کرتے ہوئے حاکمِ شہر کو مشورہ دیا ہے کہ جب بھی وہ اپنے غلاموں کو ان غیور انسانوں کو اسیر کرنے کے لئے بھیجے

تو ساتھ میں ایک ایک کا شجرۂ نسب بھی روانہ کرنا
اور ان کے ہمراہ سرد پتھر میں چننے دینا
کہ آج سے جب
ہزار ہا سال بعد ہم بھی
کسی زمانے کے ٹیکسلا یا ہڑپہ بن کر [illegible] جائیں
تو اس زمانے کے لوگ
[illegible] کو
[illegible] بھی [illegible] رہ جائیں (تقیّہ)

غرض وطنِ عزیز میں مستقل بے یقینی اور بے اعتمادی کی فضا نے کرب و اندوہ اور تذبذب و تشکیک کے جن رویوں کو پروان چڑھایا ہے، جدید شاعر کے ہاں اکثر و بیشتر انہی کربناک رویوں کی عکاسی ملتی ہے۔ یہی نہیں ذرائع مواصلات و ابلاغ نے پوری دنیا کو قریب کر دیا ہے اور خبر و نظر کی وسعتوں نے سمٹ کر پھیلتی دنیا کے دائروں کو آج کے شاعر کی آنکھوں کے سامنے عیاں کر دیا ہے۔ یہ بات بھی سکون کی بجائے بے سکونی کا باعث بنی ہے۔ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہونے والا اندوہگیں اور ہولناک واقعہ پوری دنیا کے حساس انسانوں کو دہلا دیتا ہے اور شاعر جو معاشرے کے حساس ترین افراد میں سے ہوتا ہے دنیا کے اذیت ناک ماحول سے کیسے پہلو بچا سکتا ہے۔ ہند چینی سے افریقہ کے کسی گوشے میں ہونے والا ظلم یا لاطینی امریکہ سے ایران و افغانستان یا مشرقِ بعید کے کسی ملک میں ہونے والی جارحیت سے آج کا شاعر نہ صرف متاثر ہوتا ہے بلکہ اظہار بھی کرتا ہے لیکن میرے خیال میں اس مسئلے پر بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے میں اپنے موضوع سے ہٹ جاؤں گا، اس لئے اب بھلائی اسی میں ہے کہ میں دنیا کی وسعتوں سے گریز اختیار کرتے ہوئے شاعر کی اپنی ذات کے نہاں خانوں میں جھانکنے کی کوشش کروں ـــــ لیکن یہاں پھر یہ مسئلہ درپیش ہے کہ ذات کی بات بھی کائنات کے حوالوں کے بغیر نہیں کی جا سکتی اور عہدِ جدید میں ایک اہم ترین حوالہ علم و سائنس کی لامحدود ترقی کا ہے۔ ان گنت سائنسی اور علمی انکشافات اور تحقیقات نے انسان کے بہت سے ایسے معتقدات کی بنیادیں ہلا دی ہیں جو اس کے لئے شدید ترین مصائب اور الجھنوں میں بڑا مضبوط سہارا فراہم کرتے تھے۔ ہولناک ہتھیاروں کی ایجاد کی بے تحاشا دوڑ سائنسی علوم کا وہ تاریک پہلو ہے جس نے انسانیت پر درندگی کو حاوی کر دیا ہے اور انسانی اور اخلاقی قدروں پر سے اعتقاد اٹھنے لگا ہے۔ پھر جدید نفسیات اور حیاتیات کے بعض انکشافات نے بھی ذہن انسانی کو بعض ہولناک دھچکوں سے دوچار کیا ہے، اور ان انکشافات کے نتیجے میں منہدم ہونے والے اخلاقی اور مذہبی اعتقادات کا سہارا کھو کر آج کا متفکر فرد سخت اضطراب اور تشکیک کا شکار ہے حتیٰ کہ خود سائنس کے بارے میں بھی وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ آج جو بات مسلمہ ہے ضروری نہیں کہ کل تک بھی تسلیم شدہ رہے۔ بے یقینی اور تشکیک کی یہ کیفیت شاعر کے اندرونی کرب میں مزید اضافہ کرتی ہے ـــــ آج کا شاعر دیکھتا اور محسوس کرتا ہے کہ انسانی رشتے اور خارج و باطن کے مقدرات آج ایک ایسے چوراہے پر ہیں جہاں ہر حقیقت اپنی واضح تصدیق اور تجدید چاہتی ہے ـــــ آج کا انسان سائنسی ترقی کے طفیل اپنے خارج پر کافی سے زیادہ قدرت رکھنے کے باوجود شدید باطنی کرب کا شکار کیوں ہے؟ وہ ماضی، حال، مستقبل اور ذات و کائنات کے بارے میں کس قسم کی تشکیک کا شکار ہے؟ اور اس تشکیک کو یقین میں کیونکر بدلا جا سکتا ہے؟ کیا وہ قدیم اعتقادات سے قطع تعلق کر کے اپنی فکری اور جذباتی بنیاد کھو چکا ہے؟ کیا عہدِ حاضر میں تمام فکری نظام اور فلسفے لغو ہیں؟ اور کیا آج تمام اجتماعی نظام لغو اور بے سود ثابت ہو چکے ہیں؟ جدید شاعر کے سامنے اسی قسم کے ان گنت سوال رقصاں ہیں ـــــ اگرچہ یہ سوال نئے نہیں لیکن نیا ماحول اور نئے ذہنی رویے، نئے علمی و سائنسی انکشافات انہیں نئی معنویت ضرور عطا کرتے ہیں اور آج کا انسان، آج کا شاعر اس پس منظر میں اپنا مقدر خود منتخب کرنے پر مجبور ہے۔ اس کی یہ مجبوری اسے ایک طرح کی آزادی بھی عطا کرتی ہے۔ وہ اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود تقلید کی بجائے اجتہاد کا علمبردار ہے اور دوسروں کے اعمال و معتقدات اس کے لئے سند کا درجہ نہیں رکھتے۔ وہ معقول کو منقول پر ترجیح دیتا ہے لیکن اس کی سوچ اور فکر کی یہی آزادی اسے ایک تلخ جبریت سے دوچار کرتی ہے کیونکہ اس طرح وہ محدودیت اور فنا کے شدید احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یوں آج کا شاعر اور ہر سوچنے والا فرد مختارِ کل بھی ہے اور انتہائی بے بس و مجبور بھی۔ یہی اختیار اور بے اختیاری آج کے شاعر کو آشوبِ زیست کی انتہائی تلخیوں کا ذائقہ آشنا بناتی ہے ـــــ آج کے شاعر کا کرب اور غم محض شخصی اور ذاتی نہیں بلکہ کائناتی ہے اور حال کے تلخ و شیریں حقائق اور کرب انگیز عصری میلانات سے اس کا اپنا باطن صورت پذیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حال کے شاعر میں افسردگی اور افسردہ دلی عام ہے اور بقول میرؔ:

افسردگیٔ سوختہ جاناں ہے قہر میرؔ
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

غم آج کے شاعر کے لئے سب سے بڑی حقیقت اور سب سے بڑا تخلیقی تجربہ بن کر سامنے آتا ہے۔ وہ اپنے شخصی و اجتماعی ماحول اور زندگی کے مختلف پہلوؤں سے جذباتی و احساسی سطح پر اس شدت سے وابستہ ہے کہ اس لئے کوئی خلاف توقع تبدیلی اس کی فکر اور محسوسات پر غم کا دبیز سائبان تان دیتی ہے اور یوں حیات و کائنات کا ہر گوشہ اسے غم آلود فضا کا اسیر نظر آتا ہے اور وہ اپنی حقیقت پسندانہ لیکن تلخ سوچوں سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ

مجھے نہ اب انت کی خبر ہے نہ اب کسی چیز پر نظر ہے
میں اب تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ نیستی کے سکوت کا حق
جہل مطلق۔ کہ علم مطلق ہے۔ جہل مطلق کے بحر بے موج
سے ملوں گا تو انت ہوگا

اس اقتباسِ حیات کا جو تمام دکھ ہے
میں دکھ اٹھا کر، مرے عزیزو میں دکھ اٹھا کر
حیات کی رمزِ آخریں کو سمجھ گیا ہوں، تمام دکھ ہے
وجود دکھ ہے، وجود کی یہ نمود دکھ ہے
حیات دکھ ہے، ممات دکھ ہے، یہ ساری موہوم و بے نشاں
کائنات دکھ ہے

شعور کیا ہے، اک التزام وجود ہے اور وجود کا التزام دکھ ہے
جدائی تو خیر آپ دکھ ہے، ملاپ دکھ ہے
کہ ملنے والے جدائی کی رات میں ملے ہیں، یہ رات دکھ ہے
یہ زندہ رہنے کا، باقی رہنے کا شوق، یہ اہتمام دکھ ہے
سکوت دکھ ہے کہ اس کے کرب عظیم کو کون سہہ سکا ہے
کلام دکھ ہے کہ کون دنیا میں کہہ سکا ہے جو ماورائے کلام
دکھ ہے
ثبات دکھ ہے، دوام دکھ ہے
میرے عزیزو تمام دکھ ہے۔

[میرے عزیزو تمام دکھ ہے (گوتم کا آخری وعظ) اسلم انصاری]

غرض دکھ ہی عہدِ جدید کے ہر حساس فرد اور ہر اچھے شاعر کا مقدر بھی ہے اور اس کے ادبی منشور کی اہم ترین شق بھی۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور کی شعری فضا پر سلگتی ہوئی افسردگی اور اندوہ کی اداس برکھا چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ بعض جدید شاعر شاید اپنی سوچوں کو صیقل نہ کر سکنے کے سبب کنفیوژن، فرسٹریشن، یاس پرستی اور بے جہتی کے اسیر ہو جاتے ہیں اور کائنات کی بے ثباتی کا شدید احساس، دوستی اور مروت کا سیاست کاری بن جانا جدید شاعری کو بعض اوقات فراریت کا شکار بنا دیتا ہے اور وہ جعلی لینڈ سکیپوں، بے سروپا شعری تحریکوں میں فرار کے سامان تلاش کرتا ہے لیکن میر کا سا جگر رکھنے والا جدید شاعر فرار کی ان راہوں کو اختیار کرنے کی بجائے زندگی کے دکھ اور درد کو اپنی ذات کے ترفع کے لئے استعمال کرتا ہے اسی لئے اسے دکھ بہت عزیز لگتا ہے لیکن جس طرح میر "افسردگی سوختہ جاناں" کے ازالے کے لئے دلوں کی بجھتی آگ کو اپنے دامن کی ہوا دے کر بھڑکانا چاہتا ہے اسی طرح آج کا شاعر بھی ہمیشہ منفعل افسردگی کا شکار نہیں رہنا چاہتا بلکہ زندگی سے اکتسابِ فکر و آگہی کرتا نظر آتا ہے۔ شاخِ نہالِ غم سے اترنے والے لہو لہو ثمر اس کے لئے پژمردگی کی بجائے زندہ رہنے کا نیا حوصلہ اور ولولہ ساتھ لاتے ہیں اور وہ بڑے عزم سے یہ نوید سناتا ہے:

تمہیں کیا خبر ہیں صعوبت کے کن کن مراحل سے کن کن
سیہ گھاٹیوں سے گذر کر
یہاں آ رہا ہوں
مرے راستے میں بیاباں جو آئے
انہیں میں نے دستِ جنوں سے سنوارا
بلاؤں کے ڈر سے سسکتی، سمٹتی ہوئی ساری آبادیوں کو
سکون اور راحت کا مژدہ سنایا!

("کامیاب سفر کا انعام"۔ عرش صدیقی)

لیکن جیسا کہ میر کی دردمندی اور غم بعض اوقات اس کی آنکھوں کو نمناک کر دیتے ہیں اور اس کے رویوں سے خود ترسی اور خود رحمی کا شائبہ گزرتا ہے خصوصاً جب وہ اس طرح کی باتیں کرتا ہے:

امڈ آتی ہیں آج یوں آنکھیں   جیسے دریا کہیں ابلتے ہیں

کیا میرؔ ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا — نمناک چشم، خشک لب و رنگ زرد تھا

اسی طرح آج کا شاعر بھی شخصی اور اجتماعی ماحول کے جبر کے ہاتھوں جس اندرونی غم و اندوہ کا شکار رہتا ہے وہ اسے اشکِ رواں سراپا بنا دیتا ہے اور اس کی کہانی میں اشکِ رواں کی کربناک روانی آجاتی ہے۔

ہوا کی لہروں کے نیچے ندی کی نرم رَو سطح جھلملاتی ہے، اور کہتی ہے آؤ آؤ!
تم اپنے دل میں چھپائے پھرتے ہو جو فسانے مجھے سناؤ!
مجھے سناؤ کہ میں ہوں اشکِ رواں سراپا
ہر اک کہانی مری روانی کو ڈھونڈتی ہے — (انجم رومانی)

لیکن آج کے شاعر کا المیہ یہ ہے کہ وہ چنگھاڑتی جبریت سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ اپنے آپ میں کم کم پاتا ہے البتہ اُس میں کم از کم یہ حوصلہ ہے کہ اپنی اس کوتاہی یا کم ہمتی کا اعتراف کر سکے اگرچہ اس میں بھی خود رحمی کا پہلو موجود رہتا ہے۔

جبر کے ماحول میں وہ اپنے جسم، اپنی روح اور اپنے خوابوں، غرض اپنی داستانِ زندگی کے ورق ورق کو کرب کے دوزخ کا ایندھن بنتے دیکھتا ہے اور اپنی ہی ذات کے مرثیے کچھ اس طرح لکھتا ہے:

مرا جسم جل رہا ہے — یہ لگی ہے آگ کیسی
مرے خواب جل رہے ہیں — کہ سیاہیوں کے جنگل سے گزر رہا ہوں جیسے
مری داستانِ جاں کے سبھی باب جل رہے ہیں — مری روح چیختی ہے کہ میں مر رہا ہوں جیسے — ("الاؤ"۔ شبنم رومانی)

جبر کے نتیجے میں پیدا ہونے والے کرب اور بے بسی کی یہی کیفیت جو خود شاعر کی ذات کے نہاں خانوں سے اُبھرتی محسوس ہوتی ہے شاعر کو اپنے اردگرد کے ماحول پر بھی طاری نظر آتی ہے اور ذات کے باہر کے سفر میں وہ غیرِ ذات سے اپنی دلی ہمدردیوں اور دکھ کا اظہار کرتا ہے اور خارج کے جبر اور خوف کی عکاسی استعاروں کی زبانی کرتا ہے۔

شخصی اور ذاتی سوچوں اور اجتماعی ماحول پر جبر اور خوف و دہشت کے پہرے ہوں تو انسان ایک ایسی تشکیک، بے یقینی اور نافہمی کا شکار ہو جاتا ہے جو اسے شدید قسم کے احساسِ تنہائی کے اذیت ناک جبڑوں میں جکڑ دیتی ہے۔ مذہبی و اخلاقی قدروں کی اکھاڑ پچھاڑ اور ہر قسم کے قدیم معتقدات کے بارے میں بے اعتباری اس احساسِ تنہائی کو اور بھی کرب انگیز اور شدید بنا دیتی ہے۔ جابر علی سید کے بقول:

"جدید طرزِ احساس کی نمائندگی صرف ایک لفظ سے کی جاسکتی ہے —"تنہائی"— یوں تو بیسویں صدی کا یہ خدا اپنا ایک بیٹا اور بھی رکھتا ہے یعنی شکستِ ذات اور عبثیت پرستی (ABSURDISM) لیکن بڑے خدا کی طرح پرستش اسی کی ہوتی ہے۔ یہ آج کے روزمرہ کا خدا ہے۔"

("جدید نظم، جدید غزل اور جدید طرزِ احساس"۔ مطبوعہ فنون جدید غزل نمبر)

میرؔ جو ساری زندگی تنہا رہا بہت شدید احساسِ تنہائی کا شکار نظر آتا ہے۔ اُسے زندگی بھر کوئی ایسا ہمراز دوست نہیں مل سکا جس کے سامنے وہ اپنے دل کی رام کہانی کہتا یہی احساسِ تنہائی میرؔ سے یہ کہلواتا ہے کہ:

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری — نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

عہدِ جدید کا شاعر بھی ہجوم میں تنہا ہے اور احساسِ تنہائی کے کرب کا مستقل اسیر بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید شاعری کے آغاز تک ہمیں تنہائی کے عنوان سے بے شمار نظمیں مل جاتی ہیں۔ فیضؔ، میرا جیؔ، ساقی فاروقی، اختر الایمان، مصطفےٰ زیدی، منظور حسین شور، منیر نیازی، اعزاز احمد آذر وغیرہ کے علاوہ اور بہت سے شاعروں نے تنہائی کے عنوان کے تحت اپنی روح کے کرب کو لفظوں کی زبانی بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ

ہمیں جدید شاعروں میں ان گنت نظمیں ایسی مل جاتی ہیں جن کا عنوان تو تنہائی نہیں لیکن شدید اور کربناک احساسِ تنہائی ان نظموں کا اسم اعظم ہے فیض کی نظم "تنہائی" دراصل آج کے شاعر کے اس احساس کا خوبصورت علامیہ ہے۔

منیر نیازی کی ساری شاعری اس کے پُراسرار احساسِ تنہائی کی عقدہ کشائی ہے۔ وہ خود کو اس معاشرتی ڈھانچے میں فٹ محسوس نہیں کرتا لیکن اس کے ہاں احساسِ تنہائی پر ایک عجیب سی پُراسراریت کا پردہ پڑا نظر آتا ہے۔ "تنہائی" کے عنوان سے اس کی ایک نظم کی چند سطور ملاحظہ ہوں:

چاروں سمت اندھیرا گھپ ہے اور گھٹا گھنگھور
کھولو بھاری دروازہ
وہ کہتی ہے "کون"؟
مجھ کو اندر آنے دو"
میں کہتا ہوں "میں"
اس کے بعد اک لمبی چپ اور تیز ہوا کا شور

آج کا ہر حساس فرد، ہر نیا شاعر عموماً اپنے اردگرد کے ماحول کی بے حسی اور لمبی چپ کا شکار رہتا ہے اور صرف اپنے اندر چلنے والی محرومی اور اندوہ کی تیز آندھیوں کا شور ہی اس کا مقدر ہے۔ زندگی اس کے لئے ایک اذیت ناک کالی آسیبی رات بن جاتی ہے جس میں نفرت کے عفریتوں کی ڈراؤنی آوازیں اس کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ آج کا شاعر دیکھتا ہے کہ عہدِ حاضر کا انسان جو ذرائع ابلاغ کی جدید ترین سہولتوں کے طفیل خود کو باخبر سمجھتا ہے لمبی مسافتوں کی کھنچی ہوئی طنابیں دنیا کے طول و عرض کے واقعات کو اس کے سامنے عیاں کر دیتی ہیں لیکن شاعر آج کے انسانوں کے بارے میں محسوس کرتا ہے کہ:

یہ گھر کے باہر کے لمحہ لمحہ سے باخبر ہیں
کوئی خود اپنے ہی گھر میں ہی اجنبی ہوا ہے
مگر انہیں اپنے گھر کی کوئی خبر نہیں ہے
دلوں کی قربت میں ریت دوری کی اُڑ رہی ہے
کسی کی خاطر پڑوس بستا ہے کاٹے کوسوں
عجیب سا فاصلہ اُگا ہے
("فاصلہ"۔ ادیب سہیل)

شدید احساسِ تنہائی اور جبریت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان کا اعتبار ہر شے سے اُٹھ جاتا ہے، اسے ہر شے کا وجود ہستی موہوم لگتا ہے اور دنیا محض توہم کا کارخانہ۔ میر نے کہا تھا:

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

اور:
بود نقش و نگار سا ہے کچھ
صورت اک اعتبار سا ہے کچھ

اگرچہ میر نے یہ باتیں مروجہ تصوف کے زیرِ اثر کہی تھیں لیکن انہیں محض تصوف کا پرتو سمجھ لینا ناروا ہوگا بلکہ سچی بات یہ ہے کہ میر نے تخلیقی سطح پر یہ محسوس کر کے اظہار کیا ہے۔ ن۔م۔ راشد کی مشہور نظم "گماں کا ممکن ــــ جو تو ہے، میں ہوں" میر کے اسی خیال کی خوبصورت توسیع ہے۔ اس نظم کے بارے میں راشد نے خود کہا تھا کہ:

"اس میں میں نے چند ذاتی اور چند اجتماعی یادیں آپس میں بُننے کی کوشش کی ہے اور یہ کہنا چاہا ہے کہ انسان مسلسل گمانوں کا شکار رہے۔ صرف اس حد تک پہنچ سکتا ہے کہ جہاں تک یہ گمان اجازت دیں یعنی گمان کے ممکن تک اور حقیقت کا دراصل کوئی وجود نہیں، ہے تو محض سیمیائی وجود ہے جو محض گمان کے ساتھ اضافی حیثیت رکھتا ہے۔"

میں یہ دعویٰ قطعاً نہیں کر رہا کہ راشد نے یہ نظم میر یا کسی اور صوفی شاعر کے زیرِ اثر لکھی بلکہ راشد کے ہاں ہمیں جدید و قدیم فلسفوں کا امتزاج نظر آتا ہے لیکن میں یہ بہ اصرار کہوں گا کہ یہاں راشد کا طرزِ احساس میر کے طرزِ احساس سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

شدید احساسِ تنہائی انسان کو خود اپنے وجود کے بارے میں بھی تشکیک کا شکار بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے ماحول کے تناظر میں اپنے وجود کا جواز نہیں تلاش کر پاتا۔ اسے اپنے اردگرد ایسا کوئی چہرہ نہیں نظر آتا جو اس کے وجود کی پُرآشوب واردات سے ہمکنار ہو کر اس کے وجود کے

اثبات کا باعث بنے۔ ایسی صورت میں شاعر کے ذہن کی لایعنیت اور ناامیدی پھر اس طرح لفظوں کا روپ دھارتی ہے:

رات تاریک ہے — آسماں کے تلے رہوں، میں رہوں کس لئے؟
کون کس کے لئے درد کی نیند سوئے؟ — تنگنائے بدن توڑ کر رہوں، میں رہوں کس لئے؟
میں جاگوں تو کس کے لئے جاگ کر بندشوں میں رہوں — ("مُردوں کی صف میں زندہ"۔ انیس ناگی)

اپنے آپ سے لڑتے لڑتے ایک زمانہ بیت گیا — کون ہوں میں؟
اب میں اپنے جسم کے بکھرے ٹکڑوں کے انبار پہ بیٹھا — اور کس تلوار سے میں نے اپنے جسم کے ٹکڑے کاٹے ہیں
سوچ رہا ہوں — اب میں کیا ہوں؟
میرا ان سے کیا رشتہ ہے؟ — اور اب مجھ کو کیا کرنا ہے
ان کا آپس میں کیا رشتہ ہے — ("یادوں کی زنجیر"۔ شہزاد احمد)

شکستِ ذات کا یہ المیہ آج کی شاعری کی رُوح ہے، اپنی کرچی کرچی ذات کے ریزے چننا عہدِ جدید کے شاعر کا نصیبا ہے اور اس کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ اپنی بکھرتی ذات کو سمیٹتے ہوئے نفی سے اثبات کی طرف مراجعت کرے۔ وہ ازل سے اسی "برجِ کا کیشیا کا پرومی تھیس" ہے اور عرفانِ ذات کی "نیم روشن پہاڑی" ہی اس کا مسکن ہے:

مجھے سب خبر ہے — فقط نیم روشن پہاڑی ہے میری
مرا کچھ نہیں ہے — ازل سے میں اس برجِ کاکیشیا کا
نہ کہسار میرے — پرومی تھیس ہوں
نہ میدان میرا — ("پابہ زنجیر"۔ عرش صدیقی)

باہر کے ماحول اور باطن کی جبریت، اذیت، بے یقینی اور تشکیک کے صلے میں نئے شاعر کو ودیعت ہونے والا فنا کا تصور اس کے لئے "صالحین" سے زیادہ کربناک ہے۔ فنا یا موت کا تصور روزِ ازل سے ایک بہت بڑا چیلنج بنا رہا ہے۔ مختلف مذاہب نے حیات بعد الموت اور جنت دوزخ کا تصور پیش کر کے خوف زدہ انسان کی دل بستگی کی کافی حد تک کامیاب کوشش کی۔ موت کو ایک نئی، ان دیکھی، پُراسرار زندگی کا پیش خیمہ قرار دیا گیا:

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

پھر آخرت کا تصور اور ہر چیز کے فانی ہونے کا یقین بھی ایک زود کی تشفی کرتا ہے۔ یہ یقین کہ ایک دن صورِ اسرافیلؑ کی آواز پوری کائنات کو فنا سے ہمکنار کرے گی مکمل فنا کا ایک ایسا تصور سامنے لاتا ہے جو انفرادی فنا کے خوف کو کم کر دیتا ہے ـــــ لیکن سائنس جو بہت سے انسانی دکھوں کا علاج بن کر آئی ہے فنا کے معاملے میں ہماری کوئی مدد کرنے سے قاصر ہے۔ یہاں پر سائنس جسے انسان اپنی زندگی کا سہارا سمجھ بیٹھا ہے اس کے ہاتھوں سے کھسکتا نظر آتا ہے اور یہاں سائنس جس نے انسان کے بہت سے ایسے معتقدات کو تہ و بالا کر دیا ہے جو ایسی صورت میں انسان کے دکھوں کا مداوا بنتے تھے اس کا ساتھ چھوڑتی نظر آتی ہے۔ وہ شخص جو تیقن اور عقیدے کی اساس کھو چکا ہے موت اس کے لئے ایک اذیت ناک لیکن بے معنی حادثے سے زیادہ کچھ نہیں، وہ موت کے خوف میں تشکیک و بے یقینی اور کرب کے بے آب و گیاہ صحرا میں ٹھوکریں کھانا اس کا مقدر ہے ـــــ موت ایک خوش خصال صوفی کے لئے ایک نیا مسرت انگیز تجربہ ضرور بن سکتی ہے جو ذاتِ حق سے وصال کی خبر لاتا ہے لیکن اس کے لئے جس کے دل میں شک کے اکھوے پھوٹ رہے ہوں یہ ایک نہایت پیچیدہ، پہلو دار اور کرب انگیز تجربہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر نئے شاعروں کے ہاں فنا کا خوف بڑا شدید نظر آتا ہے اور موت اس کے ذہن پر آسیب کی طرح سوار نظر آتی ہے۔ عہدِ حاضر میں معاشی، معاشرتی، سیاسی اور بین الاقوامی جبر کے ہاتھوں بار بار معنوی

موت مرنے والے حساس شاعر کے لئے جسے زندگی کے ہر موڑ پر اپنی سچی سوچ اور مرضی کے خلاف کئی ناگزیر سمجھوتے کر کے جیتے جی موت کا ذائقہ چکھنا پڑتا ہے، موت شعوری اور لاشعوری سطحوں پر ایک اہم اور بڑا تخلیقی تجربہ بنتی ہے جو اپنی پوری شدت کے ساتھ نئی شاعری میں اظہار پاتا ہے ـــــ میر کے لئے مذہب اور تصوف کی عظیم روایت بہت بڑا سہارا تھی اور وہ موت کو ماندگی کا وقفہ جان کر پرسکون رہتا تھا لیکن آج کے شاعر کی تشکیک آمیز کلبلاتی سوچیں اسے سکون نہیں لینے دیتیں۔ عہدِ حاضر کا ایک صوفی منش شاعر یوسف ظفر بھی موت کو اس طرح دیکھتا ہے:

موت ہی موت ہے ہر سمت جدھر دیکھتا ہوں
بال افشاں ہے نظر ایسی فضاؤں میں یہاں
کہ جہاں قبروں کے ملبوں میں ہے ہر نغمہ
کہ جہاں سایوں کے مدفن میں ہیں انوارِ نہاں
کون اس موت کے ہاتھوں سے رہائی دے گا
کب مجھے قبروں کے اس پار دکھائی دے گا
("وقت کی موت")

خوفِ مرگ کے مہیب سائے فیض کی شاعری پر بھی چھائے نظر آتے ہیں لیکن فیض ترقی پسند ہونے کے باوجود اپنی تہذیبی، ورمذہبی روایت، ورطرزِ احساس سے کٹ جانا پسند نہیں کرتا بلکہ فیض کا طرزِ احساس قدیم کلاسیکی شعراء کی توسیعی صورت محسوس ہوتا ہے فیض کی شاعری میں زنداں مقتل، شہادت اور لہو وغیرہ موت کے تلازمات ہیں اور فیض کے ہاں یہ تلازمات ایک طویل تاریخی اور سماجی پس منظر کے ساتھ آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فیض اور فیض کے قبیلے کے دیگر شعراء موت کو ایک خوبصورت محبوبہ کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ وہ زندگی، موت اور اس کی مابعد الطبیعیات کو یکسر رد نہیں کر دیتے بلکہ باطنی طور پر اسے قبول کرتے ہیں۔ فیض کے یہ شعر دیکھئے:

جس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
خواہ قاتل کی طرح آئے کہ محبوب صفت
دل سے بس ہوگی یہی حرف وداع کی صورت
للہ الحمد بانجام شب دل زدگاں
کلمۂ شکر بنام لبِ شیریں سخناں

موت چاہے محبوب صفت بن کر آئے یا قاتل سرشت اس کا آنا ابدی امر ہے۔ مجید امجد کی نظم "بنواڑی" موت کے اذیت ناک سلسلے ہی کی عکاس ہے:

ایک چتا کی راکھ ہوا کے جھونکوں میں کھو جائے　　شام کو اس کا کمسن بالا بیٹھا پان لگائے
جھن جھن جھن جھن چونے والی کٹوری بجتی جائے　　ایک پتنگا دیپک پر جل جائے دوسرا آئے

خوفِ مرگ شاعر کے حواس پر طاری ہو تو اسے زندگی بھی ایک سزا لگتی ہے۔ وہ اپنے خواب بے دردی سے بکھرتے اور لٹتے دیکھتا ہے، مسرت کے ایک خنک تاب لمحے کی پاداش میں اسے ان گنت تپتی ساعتوں کو اپنے سینے سے لگانا پڑتا ہے۔ اسے اپنی زندگی اک بحرِ بے موج سے ابھر کر عمر بھر کی تگ و تاز کے بعد لازوال ساعتوں کے بیاباں میں جذب ہو کر فنا ہوتی نظر آتی ہے۔ اسے وقت کی شاخِ زریں سے جھڑ کر گرتے ہوئے برگ ریزے آن د حد میں معدوم ہوتے نظر آتے ہیں، اور زندگی کی ظالم مسافت کے دشتِ رواں میں لاحاصلی کا دکھ اس کی قسمت ہے:

اگر سارے منظر فریبِ تمنا کا بے فیض ثمرہ، فریبِ نظر ہیں　　اگر تو یہی ہے
اگر تیرگی کی شبِ خونچکاں ساعتِ نور کی گھات میں ہر قدم　　تو کن قبل ہستی کے سنگیں گناہوں کی سنگیں سزا ہے
موت بن کر کھڑی ہے　　کہ تیرا ہر اک پل بھی اتنا گراں ہے!؟
تو پھر زندگی، زندگی تو کہاں ہے　　("اگر خواب گل دیکھنے کی سزا" ـ اسلم انصاری)

لاحاصل کا یہ دکھ زندگی سے بے اعتباری اور شدید احساسِ مرگ بعض جدید شاعروں میں موت کی خواہش کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے جدید شعرا کے ہاں خودکشی کے موضوع پر یا موت کی کسی اور صورت میں خواہش کی لاتعداد مثالیں مل جاتی ہیں۔ خواہشِ مرگ ہمیں میر کے ہاں بھی ملتی ہے:

جیو خوش یا کوئی ناخوش ہمیں کیا　　ہم اپنے محو ہیں ذوقِ فنا میں

میر کو یہ ذوقِ فنا مذہب اور تصوف کے وسیلے سے حاصل ہوا تھا اور وہ صوفی نہ ہونے کے باوجود موت کو ایک ایسا تجربہ سمجھتا تھا جس کے بعد ایک طویل پُرمسرت زندگی نصیب ہوتا تھی لیکن آج کا شاعر موت کو زندگی کی تلخ حقیقتوں سے فرار کا ایک ذریعہ بھی سمجھتا تھا۔ ن۔م۔ راشد کی ایک نظم "خودکشی" پر اردو تنقیدِ شاعری میں بہت لے دے ہوتی رہی ہے۔ عہدِ حاضر کے بہت سے شاعروں کے ہاں خوفِ مرگ ایک جبلت سے زیادہ بے معنویت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ان کے ہاں راشد کی طرح زندگی میں کوئی معنویت نہیں رہتی کیونکہ آئندہ کے لیے اُن کے ہاں کوئی امید نہیں۔ وہ موت سے ڈرتے ہیں، پناہ گاہیں تلاشتے ہیں لیکن موت کو نظرانداز کرنا ان کے بس میں نہیں بعض اوقات آج کا شاعر جھنجھلا کر خود موت کو فنا کے گھاٹ اتار دینا چاہتا ہے۔ راشد کی نظم "مرگ، اسرافیل پر آنسو بہاؤ" اسی خواہش کی عکاس ہے۔

لیکن عہدِ جدید کے بعض شاعروں کے ہاں موت ایک حسرت بھرا پُراسرار تجربہ ہے جس کے پیچھے پُراسرار عشرتوں کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ منیر نیازی کی اسرار پسند طبیعت کو موت میں عجیب قسم کی مسرت انگیز پُراسراریت نظر آتی ہے اور یوں میر کی طرح موت اس کے لئے ایک حیرت بھرا تجربہ بن جاتی ہے۔

ہر طرف خاموش گلیاں زرد رُو گونگے مکیں　　اُجڑے اُجڑے بام و در اور سونے سونے شہ نشیں
ٹیلوں پر ایک گہری خامشی سایہ فگن　　رینگ کر چلتی ہوا کی بھی صدا آتی نہیں
اس سکوتِ غم فضا میں اک طلسمی نازنیں　　سرخ گہرے سرخ لب اور چاندی پیلی جبیں
آنکھ کے مبہم اشارے سے بلا تی ہے مجھے　　اک پُراسرار عشرت کا خزانہ ہے وہ چشمِ دل نشیں　　(موت: منیر نیازی)

احساسِ مرگ اور خوفِ مرگ کا پرتو آج کی اکثر شاعری پر محیط نظر آتا ہے۔ محمد صفدر، زاہد ڈار، اختر الایمان، وزیر آغا، عرش صدیقی، میراجی، ن۔م۔ راشد، کشور ناہید، امجد اسلام امجد، اسلم انصاری، اصغر ندیم سید، انجم رومانی، شبنم رومانی، سلیم احمد، احمد فراز، شہزاد احمد، فیض اور احمد ندیم قاسمی کے علاوہ اکثر شاعروں کی بہت سی نظمیں احساسِ مرگ کی کربناکی کا مختلف انداز میں اظہار ہیں لیکن مختلف شعرا کے ہاں یہ عظیم تخلیقی تجربہ اپنے مختلف پہلو اجاگر کرتا نظر آتا ہے۔ بعض شعرا کو ان کا عقیدہ سہارا دیتا ہے اور وہ اس انتشار سے بیسی، اور خوف و دہشت سے بچ جاتے ہیں جو تشکیک، الحاد کے عفریت کے جبڑوں میں کسمساتے ہوئے بعض نئے شاعروں کا مقدر ہے۔

میر کی شاعری کو لہجے کی شاعری کہا جاتا ہے جس میں زورِ بیان اور خطابت کی کمی ہے۔ گفتگو کا دھیما لہجہ، خود کلامی کا انداز اور پُرسوز مدھم لَے میر کی شاعری کا خاصہ ہے۔ عہدِ جدید میں موٹے دل کی شاعری میں ترقی پسند شعرا اور اقبال کے متاثرین کو چھوڑ کر جن کے ہاں نظریاتی مزدوروں کے تحت جوش و خروش اور بلند آہنگ لہجہ چھایا ہوا ہے۔ اکثر شاعروں کے ہاں میر ہی کی طرح خطابت اور زورِ بیان کی شدید کمی ہے اگرچہ جدید شاعروں میں لہجوں کا وہ تنوع نہیں جو میر کے ہاں ملتا ہے۔

میر کے ہاں تصویر کاری کا رجحان بڑا شدید ہے اور جدید شاعروں کے ہاں بھی اس تصویر کاری اور امیج سازی کا بے پناہ رجحان مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور آج کے بعض شعرا محض امیج ہی کی خاطر شاعری کرتے ہیں۔ امیج یا تمثال ہی ان کے یہاں کلیدِ شاعری ہے۔ امیج کا استعمال جدید شاعری میں اظہار کا موثر ترین ذریعہ ہے اور اس نے تشبیہ و تمثیل اور کسی حد تک استعارے کی جگہ لے لی ہے کیونکہ مشابہتوں کا عمل ایک محدود ذہنی عمل ہے تمثیل بھی مشابہت اور تشریح سے ترکیب پاتی ہے۔ اس لئے جدید شاعر کے وسیع ذہنی تناظر میں تشبیہ و تمثیل کی معنویت کم ہوتی جا رہی ہے۔ امیج کا جواز انیس ناگی کے خیال میں اس لیے ہے کہ:

"نئی شاعری روایت کی جزو ذہنی کی بجائے باطنی حقائق کی متھ (MYTH) کی تخلیق کر رہی ہے، اور اس سارے اسلوبِ زیست کو نمایاں کر رہی ہے جس میں وہ اسیر ہے اور اس کی ذہنی سرگزشت ایک نئی لَے کی موضوعیت سے نمایاں ہو رہی ہے اس لئے کہ اس کے بیشتر وسائل کی نوعیت بدل گئی ہے۔ وسائل کی بحث میں موضوع ناگزیر ہے۔ شاعر کا موضوع اس کی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں اس کی تکمیل ہے۔ شاعر جن باطنی حقائق کی متھ کی آزمائش اور جستجو کر رہا ہے۔ اس عمل میں امیج اس کا سب سے بڑا رفیق ہے۔" 　("نئی شاعری اور امیج" مطبوعہ نئی شاعری۔ مرتبہ افتخار جالب)

ایمج کسی باطنی ضرورت کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس کے بطن میں کوئی نہ کوئی داخلی تجربہ موجود ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح کا محاکاتی استعارہ ہے جس میں اختصار و توضیح کے اوصاف پہلو بہ پہلو موجود رہتے ہیں ۔ لیکن ایمج اور ایمجری پر جدید شاعری کے حوالے سے بحث ایک اہم اور بڑا موضوع ہے جبکہ میرا مقصد محض میرؔ کی ایمجری کی غم آلود فضا کو جدید شاعری میں دیکھنا ہے اور یہ بات پہلی ہی نظر میں واضح ہو جاتی ہے کہ آج کی شاعری کی ایمج سازی پر بھی میرؔ کی طرح ایک اداس، اداس فضا طاری ہے۔ جدید شاعری کی تصویر کاری میں داخلیت کا پہلو حاوی نظر آتا ہے۔ منیر نیازی کی یہ نظم ایمج کے نئے تصور کو اجاگر کرتی ہے:

سڑکوں پہ بے شمار گلِ خوں پڑے ہوئے
پیڑوں کی ڈالیوں سے تماشے جھڑے ہوئے
کوٹھوں کی چھتوں پہ حسیں بت کھڑے ہوئے
سنسان ہیں مکان کہیں در کھلا نہیں
کمرے سجے ہوئے ہیں مگر راستہ نہیں
ویراں ہے پورا شہر کوئی دیکھتا نہیں
آواز دے رہا ہوں کوئی بولتا نہیں

("زمین اور شہر")

منیر نیازی کی اس نظم میں تحیّر، آسیب اور اسرار کی کیفیت سے ایک ایمج تراشا گیا ہے۔ منیر دراصل 'اپنی میں' اور اس کی تنہائی کا تاثر پیدا کرنا چاہتا ہے جو اپنے اردگرد سے منقطع ہے۔ وہ اپنے ماحول بلکہ پوری کائنات کو ایک سناٹے اور ہو کی کیفیت میں دم بخود محسوس کرتا ہے، اور یہی اس کا باطنی تجربہ ہے جو ایمج کے روپ میں جلوہ گر ہوا ہے۔ عرشؔ صدیقی کی "دیدۂ یعقوب" کی اختتامی سطور دیکھئے:

ہوٹلوں میں، رقص گاہوں میں گھروں میں، دشت میں
ہر بشر اک دیدۂ یعقوب ہے!
آرزوؤں میں، نگاہوں میں، دلوں میں، ذہن میں
لیکن اس کی تیرگی ہے بیکراں!
ایک ویرانی مسلط ہے کہ کنعاں میں نہ تھی
بے کراں!
حسرتوں کی دھول میں لپٹی ہوئی ہے زندگی
اور بے اماں
گم ہوا ہے ہر نظر سے اک نہ اک یوسف یہاں
اور مستقل!!

ان سطور میں ایمج اور استعارے کی حدود باہم ملتی نظر آتی ہیں لیکن فضا کرب انگیز ہے۔ زندگی کی لاحاصلی کا دکھ شاعر کی روح پر محیط ہے اور یہی دکھ، یہی کرب عرشؔ صدیقی ہی نہیں، عہد حاضر کے ہر شاعر کی تقدیر کا اہم ترین نوشتہ ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی اس نظم میں عہد حاضر کے انسان کے باطنی اور خارجی کرب سے ابھرتے ایمج دیکھئے:

اُدھر سورج اُبھرتا ہے
اِدھر شاموں کے سناٹے
شفق میں بھیگ کر
نور و نوا کے منتظر ذہنوں کے صحنوں میں اترتے ہیں
اُدھر مشرق سے سیلابِ تجلی جب افق کے ساحلوں کو
پھاند جاتا ہے
اِدھر مغرب سے تاریکی کے فوارے اُبل کر
روشنی کی سب لَوؤں کو چاٹ لیتے ہیں
اُدھر موسم بدلتا ہے
اِدھر گل تو نہیں کھلتے، مگر پتھر جو یخ تھے تپنے لگتے ہیں!
اُدھر پتوں پہ شبنم آئنے بن کر اترتی ہے
اِدھر ٹوٹے ہوئے ذرّے کا جوہر
اپنے دانتوں میں لئے شہ رگ زمیں کی
دندناتا پھر رہا ہے
جیسے اب جو کچھ بھی ہوگا، صرف اس کے حکم سے ہوگا!
اُدھر کے اور اِدھر کے پاٹ میں انسان دب کر رہ گیا ہے
اور چکی چلنے والی ہے!

(سنہ ۱۹۰۷ء)

اختر حسین جعفری کا "آئینہ خانہ"

فتح محمد ملک

اختر حسین جعفری بھی عجب شاعر ہے۔ جتنا جدید ہے اس سے بڑھ کر قدیم ہے جتنا قدیم ہے اُس سے کہیں زیادہ جدید ہے۔ عجب شاعر ہے کہ ابن العربی کے تصورِ کائنات اور فلسفۂ عشق سے جس انہماک کے ساتھ فیض پاتا ہے اُسی اہتمام کے ساتھ جدید شاعر کے لئے ایذرا پاؤنڈ کے بتلائے ہوئے اوامر و نواہی کی پابندی کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ:

"شاعری ایک مسلسل ریاض کا عمل ہے جس طرح خوبصورتی کی کوئی آخری تعریف نہیں۔ اسی طرح خوبصورت مصرعے کی بھی کوئی آخری تعریف نہیں۔ چنانچہ شاعر کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جس فارم میں اظہار کرتا ہے اُس کے تمام امکانات دریافت کرنے کی سعی کرے[1]۔"

چنانچہ حسن اور حسنِ کلام کا یہ شاعر "بادلوں کے نام زمین کا اولین مکتوب" لکھتے وقت اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ:

"مظاہر و مخفیات کی گفتگو سننے کا سمعی، بصری اور حسی طریقہ، شنید کے اس تجربے کی درونِ ذات تحلیل کا فن، اس تجربے کی شعری تمثیلات اور پیکر سازی کے حوالے سے ترسیل میں لو بہ لو پیرہن تلاش کرنے کی تخلیقی خو کے اشارے مجھے غالب، ایذرا پاؤنڈ، ٹی ایس ایلیٹ جیسے مستند ہنر مندوں اور پیاو نرودا، رابرٹ سینسی جیسے با صلاحیت ہم فکر اور ہم عصر رفقائے کار کی علمی مصاحبت میں ملے۔"

اختر حسین جعفری کے شعری مزاج اور فکری افتاد کو سمجھنے میں "آئینہ خانہ" کا ابتدائیہ ہی نہیں بلکہ ایذرا پاؤنڈ، احمد ندیم قاسمی اور مجید امجد پر اُس کی نظمیں اور ابن العربی سے ماخوذ یہ نظم ہماری رہنمائی کو کافی ہیں:

ہوا نے بھید سبھی موسموں کے کھول دیئے
نقاب اُلٹا تو سب بادشہ فقیر گئے
شہود، غیب، زمیں، آسماں، وجود، عدم
مسافرانِ سحر رات کے سفیر گئے

کفِ گلاب پہ بکھرا تھا رنگ دل کا لہو
درونِ سنگ دلِ آئینہ دھڑکتا تھا
بدن یقیں کا معتوب مجرموں کی طرح
درِ گماں کی زنجیر سے لٹکتا تھا

ہوا نے ارض و سما پر کمند جب پھینکی
حقیقتوں کی گرہ گردنوں پہ تنگ ہوئی
نجوم تیرہ، تو شاخِ زغال تھی روشن
زمین دیکھ کے اپنا جمال دنگ ہوئی

○ آئینہ خانہ (نظمیں)، اختر حسین جعفری۔ قیمت ۳۰ روپے۔ ناشر: التحریر۔ اردو بازار۔ لاہور

[1] "اختر حسین جعفری سے ایک ملاقات"۔ عطاء الحق قاسمی۔ نوائے وقت۔ لاہور

ہوا نے بھید سبھی موسموں کے کھول دیئے
شہادتوں کا ہر اک حرف منحرف نکلا

رُخِ بشر سے جو پردہ اُٹھا تو حیرت میں
وہی تھا چہرہ جو صبحِ ازل کو دیکھا تھا

(ہوا نے کھول دیئے بھید)

ابن العربی سے ماخوذ یہ خوبصورت نظم "حرفِ شہود، غیب، زمین، آسماں، وجود، عدم" ہی کے بھید نہیں کھولتی بلکہ اختر حسین جعفری کی شعری شخصیت کے راز بھی منکشف کر رہی ہے۔ کاروانِ وجود تضادات کے بھنور میں چکراتا، ڈولتا جس منزل کی طرف رواں ہے اُس پر غور و فکر کے دوران مسلمانوں نے جو فکری نظام مرتب کیا ہے اور اس فکری نظام کے زیرِ اثر جو شعری روایت وجود میں آئی ہے اُسے ہمارے زمانے میں بڑی حد تک فراموش کر دیا گیا ہے مگر اُس شعری و فکری روایت سے اختر حسین جعفری کا پیمانِ وفا استوار ہے۔ یہاں کائنات تہ در تہ معانی سے لبریز ہے اور ساغرِ جلوہ سرشار ہے ہر ذرۂ خاک۔ چنانچہ منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ۔ شاعر "ہوا سے ستارے کی گفتگو، پھول سے دھنک کا مکالمہ کہیں پورا کہیں ادھورا ــــ اور پیوند لگی چادر کی دھواں چھوڑتی بلوں سے شکایت سنتا ہے"، اور "نوکِ مژہ پر ہویدا اشک سے پسِ حجاب کلام کرنے" اور "برگِ گل پر متحیر شبنم سے ہزار ہا سورجوں کی تمازتوں کے درمیان زندہ رہنے[۵۰]" کی تعلیم پاتا ہے۔ اس شعری روایت سے مکتبِ شاعر زمین، ہوا، پھول، ستارے، بادل اور دھنک کے حجابات میں مستور معنیٔ کائنات سے یوں ہمکلام ہوتا ہے:

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے   آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

یہ شعر غالبؔ کا ہے اور مجھے اس وقت یوں یاد آیا ہے کہ ہر چند عہدِ حاضر کی شاعری من و تو کے اس تصور سے بڑی حد تک نا آشنا ہے مگر اختر حسین جعفری کی شاعری اس نورِ من و تو سے محروم نہیں ہے۔ مسلمانوں کے فلسفۂ عشق سے پھوٹنے والے حقیقت و مجاز کے تصورات ہی اختر حسین جعفری کی شاعرانہ شخصیت کا تار و پود ہیں مگر وہ عصری زندگی اور علوم کے حوالے سے ان تصورات کے تازہ تعینات کا اظہار مولانا رومؔ کی طرح مثنوی میں یا مرزا غالبؔ کی طرح غزل میں نہیں بلکہ ایذرا پاؤنڈ کے سے کینٹوز میں کرتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اختر نظمِ جدید کی تازہ تر ہیئتوں کو آزماتے وقت بھی تغزل کی روایت سے انحراف نہیں کرتا اور عارضی میں ابدی کی اور مادیت میں ماورائیت کی جھلک دیکھنے اور دکھانے کے لئے مسلمانوں کی صوفیانہ اور حکیمانہ شاعری سے آئینے کا استعارہ اخذ کرتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مغربی عقلیت پسندی کے پتھروں کی زد میں آکر جس تمثال دار آئینے کے ٹوٹ جانے پر غالبؔ کی زندگی ماتمِ یک شہرِ آرزو بن کر رہ گئی تھی، اختر حسین جعفری نے اسے پھر سے ثابت و سالم کرنے کی ٹھانی ہے۔ طویل نظم "آئینہ خانہ" اس تخلیقی مہم کا بہترین ثمر ہے۔ اس کے نزدیک:

"آفتاب اور ماہتاب کے آئینے صرف وہی تصویریں، وہی اشکال اور وہی چہرے دکھاتے ہیں، انہی اعداد کی تفہیم کراتے ہیں جنہیں کورچشم دیکھنا اور سمجھنا چاہیں ــــ اور زمین پر اب تک صلیب کی صورت وہی میزان گڑی ہے، جس کے پلڑے براہِ راست فکر کی عمودی قوت کے منکر ہیں۔ اسی میزان کے ایک پلڑے میں انسان ایک پرغمالی کی صورت زندہ اپنی رہائی کی قیمت پوچھ رہا ہے[۵۱]"

آفاق میں انسان کے اس المناک مقدر کو اختر حسین جعفری "اپنی قومی تاریخ کے استحصالی تناظر" میں سمجھتا اور پیش کرتا ہے۔ اُس کے آئینہ خانہ میں جو مختلف اور متنوع مناظر جلوہ گر ہیں اُن سے ایک ایسے عہدِ منحرف کی تصویر اُبھرتی ہے جہاں سپیدۂ سحری میں ظلمت گھلی ہوئی ہے تو حلقۂ نور کے اردگرد اندھیرے خیمہ زن ہیں۔ جہاں گلی گلی میں ہراساں پیغمبروں کی آواز گونج رہی ہے تو پرندے آبِ وضو کو ترس رہے ہیں۔ جہاں

---

[۵۱] زمین کا اولین مکتوب۔ ابتدائیہ آئینہ خانہ

خاکِ شفا کا سینہ زہر میں بجھے خنجروں کا ہدف ہے تو حدِ نظر تک شکستہ خول، کھلی بکتریں، جلے ہتھیار بکھرے پڑے ہیں. جہاں انسان یرغمالی ہے یا بقا کی جنگ کا ہارا ہوا سپاہی اور جہاں:

سفر کی رات تعاقب میں ہے سگِ مامور
جہاں پہ ڈھونڈتی ہے مفرور قیدیوں نے پناہ
نشانِ پا سے سراغِ بدن نکالے گا
اُفق اٹھائیں گے پھر سے کوئی نئی دیوار
مدد کرے گا عدد کی نکل کے ابر سے چاند
بنیں گے غولِ بیابان باڑ لوہے کی
دکھائے گا کہ سبھی ہست و بود کی راہیں
ہوا کہے گی کہ خود یافتی کی منزل پر
قدم قدم پہ انہی جنگلوں سے ملتی ہیں
فصیلِ ذات سے محکم کوئی فصیل نہیں

اختر حسین جعفری خود یافتی کی منزل اپنے عہد کے سیاق و سباق میں، جسے وہ کبھی عہدِ ملامت کا نام دیتا ہے تو کبھی عہدِ خجالت کا، سر کرنے کا تمنائی ہے. آئینہ کو اپنی شاعری کا مرکزی استعارہ بنا کر وہ "طلسمِ پسِ نگاہ" کھولنے اور "حجاباتِ شاہد و مشہود" اٹھانے میں کوشاں ہے. نظم "آئینہ خانہ" میں موضوعات کی کثرت کو جواز لی و ابدی سوال وحدت بخشتا ہے اُسے اقبال نے ان لفظوں کا قالب دیا ہے:

میں کہاں ہوں، تو کہاں ہے؟ یہ مکاں کہ لامکاں ہے؟
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی

مَن و تو اور مکاں و لامکاں کے سربستہ روحانی رازوں کے انکشاف کی تمنا میں اختر حسین جعفری مادی دنیا سے فرار کا راستہ اختیار نہیں کرتا بلکہ انسانی زندگی کے جبلّی مطالبات کے حسن میں ہی حسنِ ازل کی جھلک دیکھتا ہے اور معاشرتی اور سیاسی حقائق کے تصادم میں ہی حقیقتِ مطلق کا متلاشی ہے. وہ کارزارِ حیات کا خاموش تماشائی نہیں بلکہ زندہ، متحرک اور جارحانہ عزائم کے ساتھ اس جنگ میں شریک ہے:

اک اور شورِ قیامت کہ بند قبر کھلے
وہ ہفت رنگ ستارہ جو آسماں میں نہیں
اک اور ضرب کہ تمثال دار آئینہ
ہمارے ساتھ غریب الدّیار جس کے لیے
تمام عکسِ مکرّر ترے رہا کر دے
دنوں کی شاخِ برہنہ، شبوں کی زلف تھی
اک اور ضرب کہ بود و نبود کی تقسیم
قدم اک اور کہ آگے وہ معرکہ ہے جہاں
اسی فصیل، اسی خشتِ ماسوا تک ہے
صداقتوں کے مقابل صداقتیں ہوں گی
قدم اک اور کہ اُس کا رخ و کہ میں روشن ہے

اختر حسین جعفری من و تو کے مابعد الطبیعیاتی ابعاد پر غور و فکر کرتے وقت مادیت کی چمن آرائی کا احساس اپنے اندر زندہ رکھتے ہیں. کہاں ہے جوہر صورت کہاں زرِ معنی؟ —— اختر کا تجسس خدا کی تلاش میں نکلتا ہے تو خلقِ خدا سے اپنا رشتہ مزید استوار کر لیتا ہے. غالب نے کیا خوب کہا تھا:

بقدرِ حوصلۂ عشق جلوہ ریزی ہے
دگرنہ خانۂ آئینہ کی فضا معلوم

اختر حسین جعفری کے حوصلۂ عشق کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے ہاں صوفیانہ احساس اور سیاسی شعور شیر و شکر ہیں. احمد ندیم قاسمی کے خیال میں تو "روحِ عصر اس کی ایک ایک سطر، ایک ایک لفظ سے جھانکتی نظر آتی ہے." ہمارے عصری معائب کا جو سچا، گہرا اور فنکارانہ احساس اختر حسین جعفری کی شاعری میں جلوہ گر ہے وہ آج کی شاعری میں بڑی حد تک نایاب ہے. سلطانیِ جمہور کے خوابوں کی شکست کے موضوع پر اُس کی متعدد نظموں میں سے ایک ملاحظہ ہو:

اب نہیں ہوتیں دعائیں مستجاب
اب کسی ابجد سے زندانِ ستم کھلتے نہیں

سبز سجادوں پہ بیٹھی بیبیوں نے
جس قدر حرفِ عبادت یاد تھے، پَو پھٹے تک انگلیوں پر گن لئے
اور دیکھا —— رحل کے نیچے لہو ہے
شیشۂ محفوظ کی مٹی ہے سرخ
سطرِ مستحکم کے اندر بست و در باقی نہیں
یا الٰہی مرگِ یوسف کی خبر سچی نہ ہو
ایلچی کیسے بلادِ مصر سے
سوئے کنعاں آئے ہیں
اک جلوسِ بے تماشا گلیوں بازاروں میں ہے
تعزیہ بردوشِ انبوہِ ہوا
روزنوں میں سر برہنہ مائیں جس سے مانگتی ہیں، منتوں کا اجر، خوابوں کی زکوٰۃ
سبز سجادوں پہ بیٹھی بیبیو!
اب کسی ابجد سے زندانِ ستم کھلتے نہیں
اب سمیٹو مشک و عنبر، ڈھانپ دو لوح و قلم
اشک پونچھو اور ردائیں نوکِ پا تک کھینچ لو
کچی آنکھوں سے جنازے دیکھنا اچھا نہیں
(نوحہ)

انسان کے جبلی جذبات کی مصوری ہو یا اس کے اجتماعی مقدر کا انکشاف ہو، اختر کے ہاں شاعری مرصع سازی کا عمل ہے۔ اس کی نظمیں مکمل ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر نا تمامی کا ایک حسین احساس رکھتی ہیں اور وہ واشگاف نگاری کی بجائے استعاروں اور علامتوں میں بات کرتا ہے وہ اپنے شاعرانہ طریق کار کے بارے میں عطاء الحق قاسمی کے ایک سوال کے جواب میں کہتا ہے کہ:

"اظہار میں اپنی تشخص، اور شعری صداقت کے لئے ضروری ہے کہ فن کار اُن علامتوں اور استعاروں سے کام لے جو اس کی تاریخ اور تہذیب کا بنیادی حصول۔ لہٰذا اگر میں نے اپنی شاعری میں کربلا کے استعارے اور مسلمانوں کے عروج و زوال اور ان کی نصرتوں اور ہزیمتوں کے واقعات کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے تو اس لئے کہ اس کے بغیر نہ میری پہچان ہوتی ہے نہ میرے فن کی اور نہ اس زبان کی جس میں میں شعر کہتا ہوں۔ شاعر کے پاس اُس کا شناختی کارڈ ہونا چاہیئے۔ قوموں کا ماضی خواہ وہ شکستہ ہو یا نصرتوں سے پُر ہو، وہ لمحۂ موجود کی تفہیم کے لئے ایک ضروری استعارہ ہوتا ہے کیونکہ اس کے بغیر حال اور مستقبل کے خواب نہیں دیکھے جا سکتے"[1]

یہ طرزِ فکر اُس طرزِ فکر کی ضد ہے جس کا پرچم لے کر نئی نظم نمودار ہوئی تھی۔ اب سے پچاس برس پہلے میرا جی اور راشد نے نئی نظم کی ترویج کے لئے مروجہ شعری ہیئتوں سے بیزاری کا اعلان کرتے وقت اپنی تاریخی اور تہذیبی روایات کے خلاف کچھ اس زور شور سے علم بغاوت بلند کیا تھا کہ جدت پسندی اور اپنی تاریخ اور تہذیب سے بیزاری ہم معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ اختر حسین جعفری نئی نظم کی ہیئت کے تازہ تر امکانات کو بروئے کار لاتے وقت اپنی تاریخ و تہذیب کو فراموش نہیں کرتا اور عصرِ رواں کے کرب و الم کو اسلامی استعاروں اور علامتوں میں بیان کرتا ہے۔ ہے نا عجب شاعر!

---

[1] اختر حسین جعفری سے ایک ملاقات۔ نوائے وقت، لاہور۔ ادبی ایڈیشن

قرۃ العین — اپنی تلاش میں

فتح محمد ملک

قرۃ العین حیدر کے ہاں تلاشِ ذات کے سفر کے موجودہ مرحلے[1] کا خیال کرتا ہوں تو اقبال یاد آتے ہیں۔ اس تلازمِ خیال پر غور کرتا ہوں تو اقبال اور قرۃ العین کے کارنامۂ فن میں چند در چند مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ اقبال ہی کے مانند قرۃ العین بھی آتشِ رفتہ کے سراغ میں ہیں اور ان کی ساری سرگزشت بھی کھوئے ہوؤں کی جستجو سے عبارت ہے۔ اقبال نے ہماری شاعری کو فلسفیانہ رنگ و آہنگ بخشا تو قرۃ العین نے ہماری فکشن کو گہرے فلسفیانہ انداز میں سوچنا سکھایا۔ دونوں کی تخلیقی بے چینی کا سرچشمہ ایک ہے۔ دونوں کا سوز و سازِ آرزو ہندی مسلمانوں کے اجتماعی مقدر پر غور و فکر سے پھوٹا ہے اور دونوں کے ہاں یہ موضوع بالآخر وقت اور تاریخ کی ماہیت و معنویت پر فکری و تہذیبی مراقبہ بن گیا ہے۔ پھر ہر دو مفکر فن کا رہم نصیب بھی ہیں۔ اقبال عمر بھر جس فکری تنہائی اور روحانی اضطراب سے دوچار رہے، فکری اجنبیت اور روحانی جلاوطنی کا وہی احساس قرۃ العین کا مقدر ہے:

> "دور سے جبل الطارق نظر آیا۔ اماں بہت مضطرب ہو کر کھڑکی سے لگی اس چٹان کو دیکھا کیں اور اقبال کے اشعار دہراتی رہیں اس پوری نسل کو اقبال اور اسلامی تاریخ اور اسلامی تجدید کے جذبے اور اپنے ماضی کے ورثے اور اس کی المناک گم شدگی کا بڑا شدید احساس تھا حالانکہ ان لوگوں نے کسی اسکول یا کالج میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ دورِ حاضر کی کوئی لڑکی میرے خیال میں جبل الطارق کو دیکھ کر متاثر نہ ہوگی۔ شاید اسے اس چٹان کی معنویت کا علم نہ ہو۔"[2]

قرۃ العین عہدِ حاضر کی شخصیت ہیں لیکن انہیں جبل الطارق کی تہ در تہ تاریخی اور جذباتی معنویت کا احساس ہے۔ یہی احساس انہیں اپنے معاصرین میں ایک یگانۂ روزگار ہستی بھی بناتا ہے اور فکری تنہائی اور تہذیبی بے چارگی سے بھی دوچار کرتا ہے۔ جس زمانے میں قرۃ العین حیدر نے شعور کی آنکھ کھولی وہ زمانہ ہماری ادبی دنیا میں نئے اور ترقی پسند ادب کے فروغ کا زمانہ ہے۔ اپنی تہذیبی اور ادبی روایات کا باغی ادب فقط حاضر و موجود کی اسیری پر نازاں ہے۔ اقبال کے طرزِ فکر و احساس سے بغاوت اور آبائی چلن سے انحراف جدت پرستی اور ترقی پسندی کا لازمہ ہے۔ ایسے میں قرۃ العین اپنے والدین سے کسی نفسیاتی پرخاش یا فکری عناد کو پروان چڑھانے کی بجائے ان سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہیں جن روایات اور اقدار سے ان کی زندگیاں عبارت تھیں۔ انھیں سینے سے لگاتی ہیں۔ ان کی شخصیتوں میں انھیں نور ہی نور رنگ ہی رنگ نظر آتا ہے۔ جس باشعور محبت کے ساتھ انھوں نے اپنے عظیم باپ کی شخصیت[3] اور محمد علی ردولوی کے فن[4] پر قلم اٹھایا ہے وہ جدید ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب اپنی تاریخ اور تہذیب کو رد کرنا ایک غالب ادبی رجحان تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنے مخصوص تاریخی اور تہذیبی پس منظر کے حسن و قوت کو اجاگر کیا اور اس بات پر غور و فکر ترک نہ کیا کہ ان کے ابا اماں وقت بے وقت اقبال کے اشعار کیوں گنگناتے رہتے تھے؟ یہ اسی غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ مادی ہمہ اوست کے عہد میں انھوں نے برملا اعلان کیا کہ:

---

[1] کارِ جہاں دراز ہے

[2] دستانِ طراز، مطبوعہ سویرا لاہور ۱۵، ۱۶

[3] سید سجاد حیدر یلدرم مطبوعہ نقوش، شخصیات نمبر حصہ اول

[4] ردو نیمز

"لکھنا ایک مابعد الطبیعاتی فعل ہے۔ اس طرح لکھنا جیسے صفحے پر بارش ہو رہی ہو، ادراک، کتساب، تجزیہ، تشریح، ترجمانی، اطلاع، خبر رسانی، یہ سب ایک عمل میں شامل ہے...... کوئی ایک معمولی سا واقعہ اور آپ ایک نئے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

تین چار سال ہوئے آپا نے مشین پر سلائی کرتے ہوئے یوں ہی باتوں میں کہا، "اپنے قصبے میں جاڑے آتے ہی ہم ہار سنگھار سے دوپٹے رنگتے تھے اور جب بسنت آتی تھی ـــــ"

ان کی بچی نے جو چار سال کی عمر سے کراچی میں رہ رہی ہے ایلوس پریسلے کی سوانح حیات پر سے سر اٹھا کر پوچھا "اماں بسنت کیا ہوتی ہے؟"

اس ایک جملے کو سننے کے بعد میں نے آٹھ سو صفحات کا ناول لکھ مارا۔ "اماں! بسنت کیا ہوتی ہے؟

ساری دنیا، ساری کائنات کا تجزیہ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا مگر تلاش کسی ایک نقطے سے تو شروع کی جا سکتی ہے[۵۱]۔"

بسنت کی تلاش میں قرۃ العین "آگ کا دریا" عبور کر کے اپنے آبائی قصبے میں پہنچیں تو وہاں اور ہی نقشہ پایا۔ اب یہاں نہ وہ بسنت تھی نہ وہ بستی نہ وہ لوگ۔ "آگ کا دریا" کے آخری باب میں جب کمال رضا، ہری شنکر اور گوتم نیلمبر سے ملے بغیر پاکستان لوٹ آتا ہے تو وہ دونوں اکٹھے سوچنے لگتے ہیں کہ:

"ابو المنصور کمال الدین کس طرح ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور کس طرح ہندوستان سے نکل گیا![۵۲] ـــــ"

ـــــ بسنت کیسے ہندوستان میں نمودار ہوئی تھی اور کیوں کر غائب ہو گئی؟ ـــــ نہٹور کی بستی کیسے بستے بستے بسی تھی اور کس طرح آن کی آن میں تاراج ہو گئی؟ ـــــ یہاں سے قرۃ العین کے ہاں تلاش کا وہ نیا سفر شروع ہوا جس کے احوال و مقامات اور واقعات و مشاہدات "کارِ جہاں دراز ہے" میں جلوہ گر ہیں۔

'کارِ جہاں دراز ہے' کی شانِ نزول حضرت شاہ ولی اللہؒ کے تجدیدی کارناموں کے نقطۂ آغاز کی یاد دلاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ نے خواب میں اشارہ پا کر "حجۃ اللہ البالغہ" لکھنا شروع کی تھی اور قرۃ العین نے نہٹور کے ویران آبائی مکانات کے کھنڈرات میں ہاتف کی صدائے "برخیز و بنگر" سن کر کوفہ سے کوفہ تک صدیوں پر پھیلے ہوئے سفر کا عزم باندھا اور جب بارہ سو سال تک مختلف زمانوں اور زمینوں میں سرگرداں رہنے کے بعد منزل پر پہنچیں تو انجام میں آغاز کا منظر دیکھا:

"میں دشتِ لوط کے کنارے کھڑا ہوں۔ کس طرف جاؤں؟ موت کہیں بھی کسی راستے سے آ سکتی ہے۔ چمکیلے خنجر کا وار۔ زہر کا بلوریں پیالہ۔ زنداں کے دروازے پر جلاد کی دستک۔"

یوں قرۃ العین اپنی جڑوں اور "حقیقت کی دوسری جہات اور تہوں کی تلاش کے لئے" دل کی "مشعل جلا کر وقت کی اندرونی ہفت خواں" طے کرتے کرتے ۱۲۲ھ کے دمشق میں امام زید بن زین العابدینؒ تک جا پہنچتی ہیں۔ اقبال قرۃ العین کے خون میں بولنے لگتا ہے اور عہد در عہد صدیاں پھر سے زندہ ہو کر ان کے کانوں میں ایسا طلسم پھونکتی ہیں کہ ہر واقعہ سراسر حیرت اور تنبیہہ الغافلین نظر آتا ہے اور اپنی تمام تر جلاوطنیوں اور ہجرتوں کا سبب اسلام پر ملوکیت کے غلبے میں دیکھتی ہیں:

"اللہ کی دنیا بڑی عجیب و غریب ہے۔ کون کون کدھر نکل گیا۔ کیسی کیسی اجنبی اقوام کے درمیان جا بسے۔ آگے کیا ہوگا۔ ڈر لگتا ہے۔ فتح توران کو عرصہ ہو چکا۔ بخارا، سمرقند اور ترمذ میں عرب نو آبادیات قائم ہیں۔ دمشق و بغداد سے بہت دور ما وراء النہر میں شاید امن نصیب ہو۔ ایک وقت تھا کہ ہم آلِ حسنؓ و حسینؓ مدینہ میں خاموشی سے رہتے تھے مگر خدا کی قسم منصور کے جاسوسوں نے ہماری زندگیاں تلخ کر دیں۔

---

۵۱ کیا موجودہ ادب روبہ تنزل ہے۔ مطبوعہ نقوش لاہور دسمبر ۱۹۵۹ء
۵۲ صفحہ ۸۴۲

کہا جاتا ہے کہ اہلِ ایران شہزادی شہر بانو کی وجہ سے ہم سے محبت کرتے ہیں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ سیاسی معاملات زیادہ پیچیدہ اور نازک ہیں۔ میری سمجھ میں کبھی نہ آئے۔

بلخ کے آتش کدے سرد ہو چکے۔ امیر سامان نے کلمہ پڑھ لیا۔ دیلم کے کریم بن شہر یار نے کلمہ پڑھ لیا مگر ساسانیت ہے کہ بڑھتی جا رہی ہے۔ حاکموں نے بادشاہت کے آداب اختیار کر لئے۔ سامان کے لڑکوں کو حکومتیں بخشی گئیں۔ نوح سمرقند، احمد فرغنہ، الیاس ہرات۔ سب نے اپنا شجرۂ نسب بہرام چوبین سے جوڑا۔ سارے حاکم خود کو خسرو اور دارا کہلوا کر خوش ہو رہے ہیں۔ بخارا اور سمرقند گھوم کر آؤ تو پتہ چلتا ہے کہ دنیا کیسی بدلی ہے۔ سامانی دربار میں رودکی قصیدے پڑھتا ہے،

شاہ ماہ است و بخارا آسماں   شاہ سرو است و بخارا بوستاں

ہائے ابوذر غفاریؓ

ملک گیری، کشور کشائی اور ملوکیت کے معاملات عبرت ناک ہیں ......"

—— ملوکیت کے معاملات عبرت ناک ہیں چنانچہ کلمہ گو شہنشاہوں کے قیصر و کسریٰ سے مستعار آئینِ جہانداری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والوں پر ظلم و ستم کے وہ وہ پہاڑ توڑے گئے کہ لوگ دار و گیر کے خوف سے جنگلوں اور ویرانوں کو نکل گئے اور!

"یہ جو بعض اصحاب کا قول ہے کہ مذہب اسلام میں قطع علائق ممنوع ہے۔ اکابر صوفیا، راہبانِ مسیحی و اہل ہنود سے متاثر ہوئے، ہمارے نزدیک یہ نظریہ چنداں صحیح نہیں۔ کس واسطے کہ جب امتِ رسول کے حاکموں نے طور طریق شاہانِ عجم کے اختیار کیے۔ خود کو بصد ناز خسرو و دارا کہلوایا، وہ اور اُن کے حاشیہ بردار مظالم غربا پر کرتے تھے۔ تب ائمہ و اولیا نے اقتدار پرستی کے خلاف ایک تحریک گویا شروع کی اور ہم جو ائمہ اور صوفیا کی نسل سے ہیں ارکانِ دولت میں شامل ہو کر داخل طبقہ امرا میں ہوئے۔ لبادے کارچوبی طلائے مغرق زیب تن کرتے تھے۔ ہاتھیوں پر سوار ہوتے تھے۔ شیخینؓ اور اویس قرنیؓ اور ابوذر غفاریؓ کو بھولے تھے اور یہ سراسر فراموش کر چکے تھے کہ ملوکیت و شہنشاہیت کے معاملات عبرتناک ہیں۔"

—— شہنشاہیت کے معاملات عبرتناک ہیں۔ سو، امام زین العابدینؒ کی اولاد میں سے ایک صوفی بزرگ غریب الوطنی کو شہنشاہیت کے ساتھ سمجھوتہ بازی پر ترجیح دیتے ہیں اور یوں سید کمال الدین ترمذی "کفار کو دین مبین" کی راہ پر ڈالنے کے عزم سے" اپنے بی بی بچوں کے ساتھ "ہندوستان" ہجرت کرتے ہیں "کارِ جہاں دراز ہے" سید کمال الدین ترمذی کی اولاد کی بارھویں صدی عیسوی کے ربع آخر سے لے کر بیسویں صدی کے ربع آخر تک پھیلی ہوئی نسل در نسل مادی اور روحانی سرگزشت ہے۔ دس برس کی دلسوزی اور دیدہ ریزی کے ساتھ قلم بند ہونے والی اس "طلسم ہوشربا" کو قرۃ العین نے سوانحی ناول کہا ہے مگر میں اسے اسلامیان ہند کی تہ در تہ اجتماعی شخصیت کا آئینہ سمجھتا ہوں۔ مسلمانوں کے برصغیر میں جڑ پکڑنے سے لیکر برگ و بار لانے کے سماں تک اور پھر بیت جھڑ کی چیرہ دستیوں سے دوچار ہو کر مانند ایک خوشبو کے دیس دیس ہجرت کی داستان اپنے تمام تر ابعاد کے ساتھ اس نادر و نایاب فن پارے میں جلوہ گر ہے۔

اسلامیانِ ہند دورِ سلطنت سے دورِ مغلیہ میں کیونکر داخل ہوئے ہیں، اس دورِ جاگیرداری کی فضا سے نکل کر ڈپٹی کلکٹروں کی سول لائینز میں خان بہادروں کا نیا طرزِ زیست کس ٹھاٹھ سے اپناتے ہیں اور پھر برطانوی سنگینوں کے زور سے قائم کی گئی جغرافیائی وحدت کے ٹوٹنے پر پاکستان بنگلہ دیش اور بھارت کی آزاد ریاستوں میں جبر و قدر کی گتھیاں سلجھانے میں کس طور سرگرداں نظر آتے ہیں —— آٹھ صدیوں پر پھیلی ہوئی یہ رزمیہ قرۃ العین نے جس آفاقی تناظر اور جس باشعور جنوں کے ساتھ بیان کی ہے وہ اقبال کے بعد آج تک کسی دوسرے فن کار کو نصیب نہ ہو سکا۔ پھر اسالیب کا ایسا حیرت انگیز تنوع ہے کہ قصہ قدیم و جدید واقعتاً کم نظری کی دلیل معلوم ہوتا ہے اور پوری کتاب زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک——

کا جیتا جاگتا ثبوت بن جاتا ہے۔ راوی عہد بہ عہد اپنی شکل بدلتا ہوا قرونِ وسطیٰ کا سفرنامہ نگار، مورخ، صوفی تذکرہ نگار، درباری وقائع نویس، داستان گو، جدید ناول نویس، سیاسی کالم نگار اور اردو افسانہ نگار کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ خود قرۃ العین نے "حادثات و واقعات کے الاؤ کے سامنے" "بیٹھے ہوئے اس "پیرِ جہاں دیدہ کا دوسرا نام وقت" بتایا ہے۔

وقت کی تیغِ قاطع اور برہانِ ناطق ہے قرۃ العین کے ہاں عصرِ رواں سے زمانِ دائم اور زمانِ دائم سے عصرِ رواں بنتا نظر آتا ہے:

"یاد رہے کہ پچھلا وقت آج سے منسلک ہے۔ کوئی سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ ازل سے ابد تک وجود بہم اور مسلسل اور متحرک ہے۔ ماضی کا ہر واقعہ ہم سے بہت نزدیک ہے۔ تاریخ کی مجموعیت اور تسلسل اور معنویت کا جس قدر شدید احساس ہم ہندوستانی لوگوں کو ہے، دنیا کی کسی قوم کو نہیں۔ ہر واقعہ اور ہر حادثہ موجود ہے۔ ہم حال میں زندہ ہیں مگر ماضی میں اسی شدت کے ساتھ شامل ہیں۔ ہر زمانے میں ہم شریک رہے ہیں۔ بات مابعد الطبیعیات کی طرف چلی جائے گی ......"

بات اکثر مابعد الطبیعیات کی طرف نکل جاتی ہے، خصوصاً جب قرۃ العین ماضی کی ہم عصریت اور حال میں ماضی کی کارفرمائی پر غور و فکر کرتے وقت مسلمانوں کے تصورِ زماں اور تصورِ تاریخ سے روشنی لے رہی ہوں۔ ایسے میں "تیرہ سو برس کی تاریخ کے بے بہا خزانے" ان کے کرداروں کے "نسلی حافظے اور خون" میں کروٹیں لینے لگتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان میں سے:

"ہر فردِ بشر اپنے جامداتِ خیال، اپنا عالم رویا رکھتا ہے جس میں کوئی دوسرا شامل نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ہم کسی دوسرے کی موت کی تکلیف نہیں چکھ سکتے۔ کبھی دوسرے کے خواب ہمیں نظر نہیں آتے۔ ہر انسان کے دن رات، صبح شام محاسبِ منفرد، وہ علیحدہ ہیں۔

عذابِ قبر۔ وہ سزائیں جو تم بھگتو گے۔ اس حس کے ذریعے سہو گے جو صرف تمہاری حس ہوگی اور جو زندگی میں تمہیں حاصل نہیں۔

اس عالم سے اس عالم تک خالص ازبان، فرشتے اور وحی اور الہام اور۔ یا ان کرتے ہیں۔ سہروردیؒ نے کہا تھا یا ابن العربیؒ نے؟

ابھی جنوں کی ایک جماعت ادھر سے گزری۔ سب کی صورتیں مختلف۔ رجال الغیب ہوا میں اڑتے پھر رہے ہیں۔ اخیار و ابدال اور ابرار اور اوتاد اور اقطاب کے گروہ آسمان پر چل رہے ہیں۔

سارا عالم قوس و قزح میں تبدیل ہو گیا ___"

یہ واردات ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے باغی سپاہی میر احمد علی کی ہے جسے قرۃ العین نے "شخصِ نامعلوم" کے عرف کے ساتھ روحِ عصر قرار دیا ہے۔ اسلامیانِ ہند کی روحِ حریت کا یہ استعارہ گاگن ندی کے خاموش پانیوں کے کنارے بیٹھا صدیوں کو یاد کر کے روتا ہے اور سوچتا ہے:

"ضیاء الدین صاحب پھر واپس آگئے؟ وہ کیا سامنے کھڑے ہیں۔ فلاسفہ کی کتابوں میں آیا ہے کہ ہمارے سارے اجداد ہمارے اندر زندہ ہیں جسمانی اور مابعد الطبیعیاتی دونوں طرح۔

ہم خود اس وقت میر ضیاء الدین کی آنکھوں سے اس سرد ویرانے کو دیکھتے ہیں۔ ضیاء الدین کی آنکھیں اور ہماری آنکھیں ایک ہیں۔

ہمارے ہاتھ کسی اور کے دادا کے ہاتھ ہیں۔ دماغ، عقل، فہم یا نافہمی کسی اور بڑے کی عقل یا نافہمی ہے۔

خون ہزار ہا برس سے شریانوں میں گردش کر رہا ہے۔ تجدید الخلق۔ سوچ کر پھریری سی آتی ہے۔ مولانا روم نے کیا فرمایا تھا۔ کچھ ضرور فرمایا تھا۔ یاد نہیں آ رہا۔ حافظہ کمزور ہو چلا ___"

بے شک ہمارا حافظہ کمزور ہو چلا ہے۔ اقبال کے بعد تو ہمارا حافظہ کمزور ہوتے ہوتے معدوم ہو چلا تھا کہ بعد ایک مدت کے قرۃ العین حیدر ہمارا اجتماعی حافظہ بن کر نمودار ہوئیں اور پتہ چلا کہ ہماری تہذیب میں مافوق الفطرت، فطرت کی توسیع ہے، ماورائے حقیقت، حقیقت کا جزوِ لاینفک ہے، عشق کی تقویم میں اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام اور یہ زمانے عصرِ رواں میں جاری و ساری بھی ہیں اور عصرِ رواں سے الگ تھلگ بھی ہیں:

"بارہویں اور بیسویں صدی کے درمیان وقفہ صرف ایک پل ایک آن کا ہے۔" (پیجموں سے جنا)

"آنسوؤں کا فرات تیرہ سو برس سے بہہ رہا ہے۔ ساری دنیا میں بکھرے ہوئے غلامانِ اہلِ بیتِ اطہار اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں گویا واقعہ کربلا آج کی بات ہے۔" (امام باڑہ)

"چھ سو برس قبل ابن بطوطہ نے رپورٹ کیا تھا کہ کنارے فرات شہر دجلہ میں، مسجد کے دروازے پر حریر کا پردہ لگا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امام مہدی قائم آلِ محمدؐ اسی مسجد میں داخل ہو کر مستور ہوئے۔ روز شام کو غروبِ آفتاب کے وقت شیعہ وہاں جمع ہو کر گریہ و بکا کرتے ہیں۔ اخرج یا صاحب الزماں۔ اخرج یا قائم المنتظر ——— رات گئے تک روتے چلاتے رہتے ہیں۔ حریر کا پردہ اسی طرح ساکت رہتا ہے۔ پھر وہ مایوس ہو کر گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔

مگر اے پاشاؤ، شریفو، آغاؤ، سیدو، خان بہادرو، آج سارا دارالسلام سرنگوں ہے۔ سب مل کر پکارو — اخرج یا صاحب الزماں اخرج یا حجت اللہ، یا قائم المنتظر۔

خفیہ کارروائیاں ہو رہی ہیں۔ جگہ جگہ چپکے چپکے میٹنگیں کی جا رہی ہیں۔ طہران، استانبول، قاہرہ، بغداد کے تہہ خانوں میں سازشیں ہو رہی ہیں۔ زمانہ نازک ہے اور دیکھو کل کی بات ہے جب بنی امیہ کے خلاف، بنی عباس کے خلاف، بنو فاطمہ کے خلاف کیا کیا خفیہ میٹنگیں نہ ہوئیں۔ یہی کوچہ و بازار، یہی دشت و صحرا، یہی انسان، ان کے اب و جد۔ آج شاہانِ قاچار اور آلِ عثمان اور خاندانِ رامنوف اور اولادِ وکٹوریہ کی باری ہے۔

طہران، استانبول، سینٹ پیٹرزبرگ، ماسکو، یا کولندن، پیرس، کلکتہ، ہر شہر میں سرپھرے لونڈے خفیہ مسکوٹ کر رہے ہیں۔ زمانہ خطرناک ہے۔

مستقبل کی محراب کا پردہ اسی طرح ساکت ہے اور نوجوان ایشیا اور افریقہ اس کے سامنے کھڑا چلا چلا کر پکار رہا ہے۔ اخرج یا صاحب الزماں۔ اخرج یا روحِ انقلاب۔" (باب عالی)

یہ بیسویں صدی کے آغاز کا ایک لمحہ ہے۔ آج بیسویں صدی اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے مگر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ لمحہ دنیائے اسلام میں منجمد ہو کر رہ گیا ہے:

"مسلمان محض دعاؤں اور عظمتِ رفتہ کے خوابوں کے سہارے جی رہا ہے۔ نئی دنیا اُس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کربلائے معلےٰ، نجف اشرف اور مشہد ہر جگہ سے حسبِ معمول گریہ و زاری کا شور بلند ہو رہا ہے۔" (باب عالی)

اور سلاطین و ملوک:

"کا نازنینوں کی طرف حسبِ معمول کمال استغراق ہے اور صاحب لوگ جنٹلمین لوگ، فوجی، سویلین اور تاجر پی اینڈ او کے جہازوں پر سوار جبل الطارق اور سویز سے گزرتے ہوئے مراقش سے لے کر افغانستان تک بادیہ نشینوں کے خیام لوٹنے میں مصروف ہیں۔ مشرق میں ہر سمت سوا جہالت، سوا پس ماندگی اور درماندگی، غلامی، ناداری، تباہی اور کیا نظر آتا ہے۔

السلام علیک یا بنتِ رسول اللہ۔" (باب عالی)

جمود و زوال اور تباہی و بربادی کا یہ لمحہ دنیائے اسلام میں اٹل ہو کر کیوں رہ گیا ہے؟ ——— قرۃ العین نے اس سوال پر جذباتیت اور

رقت کے بجائے ایک حقیقت شناس اور ترقی پسند شعور کے ساتھ تخلیقی مراقبہ کیا ہے اور اس عمل کے دوران خود کو اپنے مراعات یافتہ طبقے سے بخوبی الگ کیا ہے:

"ستمبر ۱۹۵۳ء ...... منی بس میں میرے برابر بیٹھے ہوئے کزن نے کہا: باجی یہ سارا علاقہ اپنا تھا! معلوم ہے۔ وہ خدایا! یہ زمین، تیری نہیں تیری نہیں۔ تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں میری نہیں۔ یوپی اور سارے ہندوستان میں مسلم اہل حرفہ کا ایک متمول اور ترقی پذیر طبقہ پیدا ہو چکا ہے۔" (تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا)

"بالا خونداآئی برخیز! ___ نہٹور، لانگڑی، محمود پور ___ اُردوئے شاہجہانی کے ان تین گمنام، ویران خیموں کی روداد ___ بنگر! ___ فیوڈل سماج اپنے افراد کو DELUSIONS OF GRANDEUR میں مبتلا رکھ کر عمر طبعی کو پہنچ کر کس طور سے ختم کرتا ہے۔ کھول آنکھ! اور اسی محلہ سادات سہ دری میں صدیوں کے درماندہ بُنکروں اور کاریگروں کی نئی خودداری اور خوش حالی کو ذرا دیکھ کہ یہ نئے سماجی انقلاب کی ایک خوش آیند علامت ہے۔ مغنی کجائی کہ وقت گل ___

یہ انقلاب میں نے بات کاٹی، خاصا سست خرام ہے اور ادھوری علامتیں کافی نہیں۔ مجھے چیزوں کی ابتدا جاننے کی ہمیشہ ٹوہ رہی۔ میر صاحب، خاں صاحب اور نواب صاحب رفعت پناہ کیوں تھے اور ناحق چوٹ جولاہا کیوں کھاتا تھا۔ وجہ معلوم ہے علاوہ ازیں خانہ جنگی اب بھی موجود ہے!" (تعارف)

قرۃ العین حیدر مسلمانوں کی فکری اور تہذیبی تاریخ کو مسلمانوں کے امپیریل ماضی سے الگ کر کے دیکھتی ہیں۔ لکھنا ان کے لئے "ایک مابعد الطبیعیاتی فعل ہے"۔ اور اقبال کے مصرعے صفحۂ قرطاس پر بارش کی مانند گرتے ہیں[۱]۔ کچھ یہی صورت انبیاء و ائمہ اور صوفیا و اولیاء کے ملفوظات کی ہے۔ مسلمانوں کا زندہ ماضی اُن کے خون میں یوں گردش کر رہا ہے کہ "سری رنگا پٹنم" کا "بورڈ دیکھ کر ہی دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا ہے"۔ اور دورانِ سفر بھکارن سے یہ گفتگو ہوتی ہے:

"کیا نام ہے؟"

"چاند بی بی!"

"بچے کا نام؟"

"حسین صاحب!"

"چاند بی بی، ٹیپو صاحب، حسین صاحب! ___ صاحب یہ مابعد التواریخ ہے"۔ (دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں)

برسوں پہلے "نقوش" کے شخصیات نمبر میں ابن سعید کے مضمون پر اپنے فٹ نوٹ میں قرۃ العین نے لکھا تھا:

"قصہ یہ ہے کہ مجھے اپنا احوال رقم کرنے سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا پڑے گا کیونکہ میں ان سب سے علیحدہ کوئی الگ ہستی نہیں ہوں۔"

اور جب سارے گھرانے کا احوال رقم کرنے بیٹھیں تو مابعد التواریخ کی خوابناک فضاؤں میں جا نکلیں۔ کائنات اور وقت کے باطن میں قرۃ العین حیدر کا سفر ہنوز جاری ہے۔ دیکھئے اگلی منزل کہاں ہو؟

---

[۱] مثال کے لئے دیکھئے باب بعنوان: یا حیلۂ افرنگی یا حملۂ ترکانہ۔

عطا کے "عطائیے"

فتح محمد ملک

عطاءالحق قاسمی میرے عزیز دوست ہیں اور ان کی یہ ادا مجھے عزیز تر ہے کہ وہ بہ یک وقت احمد ندیم قاسمی اور مجید نظامی، عارف عبدالمتین اور نعیم صدیقی، امجد اسلام امجد اور تحسین فراقی سے محبت کا برملا اظہار کر سکتے ہیں، اپنے پیمانِ محبت کو نباہ سکتے ہیں اور ایسا کرتے وقت کسی فکری یا جذباتی تعصب کا شکار نہیں ہوتے۔ میری نظر میں عطا اور "عطائیے" کی سب سے بڑی عطا یہی ہے۔ بجا کہ عطا نے "علاءالدین کے جن کا زوال" اور "کچا پکا کلچر" کے سے انشائیے لکھ کر ہمعصر انشائیہ نگاروں کو ایک نئی سمت دکھائی ہے —— معنویت اور مقصدیت کی سمت! آج کے انشائیہ نگار اور انشائیہ نگاری کے نظریہ ساز معنی و مقصد سے مفرور ہیں۔ ایک تاریخی اتفاق نے انہیں فرصت کے وہ رات دن بخش رکھے ہیں جن میں تصورِ جاناں اور تصورِ جاں کئے ہوئے بیٹھے رہنے کی گنجائشیں وافر ہیں، سو وہ سنجیدہ اور منطقی استدلال سے گریزاں رویے کو انشائیہ نگاری کا لازمہ ٹھہراتے ہیں "علاءالدین کے جن کا زوال" اور "کچا پکا کلچر" اس رویے سے انحراف کی مثال ہیں:

اس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال — آدم نہیں ہے صورتِ آدم بہت ہے یاں

مگر عطا انشائیے سے ہی نہیں، انشائیہ نگار سے بھی معنی کا سوال کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ صورتِ آدم میں آدم کی تلاش عطا کی خاکہ نگاری کا محرک ہے۔ عطا نے مختلف ہی نہیں متصادم نظریات رکھنے والی شخصیات میں اشتراک اور یگانگت کے پہلو تلاش کر کے ہمارے ایک دردناک تہذیبی گھاؤ کا اندمال پیش کیا ہے۔ خاکہ نگاری کے فن کا ایک دل خوش کن پہلو یہ ہے کہ مرقع نگار اور خاکہ نویس جس شخص کا مرقع کھینچتا یا خاکہ اڑاتا ہے اس کی ذات نمایاں ہو نہ ہو خود خاکہ نگار کی شخصیت ضرور بے نقاب ہو جاتی ہے۔ عطا کے خاکے پڑھ کر خود عطاءالحق کی پہچان آسان ہو جاتی ہے۔ شبنم رومانی پر قلم اٹھاتے وقت وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ:

"کراچی میں میرے کچھ بزرگ بھی ہیں جن سے میں برخورداروں کی طرح ملتا ہوں، کچھ ہم عصر ہیں، جن سے ہم عصروں کی طرح ملتا ہوں کچھ منافق ہیں جن سے منافقوں کی طرح ملتا ہوں اور کچھ دوست ہیں جن سے دوستوں کی طرح ملتا ہوں۔"

ہر چند عطا کے خاکوں میں شخصیات تو دو ایک ہی ہیں باقی فقط اشخاص ہیں مگر عطا نے ان اشخاص میں شخصیت بننے کے امکانات کو بڑی محبت، ذہانت اور جرأت سے اجاگر کیا ہے۔ محبت اور ذہانت تو اوروں کے ہاں بھی مل جاتی ہے جرأت کی مثال ذرا کم دستیاب ہے۔ اسی محبت بھری جرأت نے ہمارے تہذیبی المیے کو اجاگر کیا ہے۔ یہ المیہ "عطائیے" کے ایک بزرگ کے اس فقرے میں سمٹ آیا ہے:

"ایک شاعر کے لئے مذہبی ہونا ضروری نہیں مگر ایک مذہبی شخص کے لئے پوئٹک وژن ضروری ہے۔"

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارا شاعر مذہبی احساس سے عاری ہے تو ہمارا عالمِ دین شاعرانہ احساس سے محروم ہے۔ نتیجہ یہ کہ اب ہمارے

ہاں یہ واقعہ ظہور پذیر نہیں ہو سکتا کہ مولانا فضلِ حق خیرآبادی، شاہ ولی اللہ کو پڑھتے پڑھتے اُٹھیں اور کڑی دوپہر میں اپنی انجمن لے کر مرزا غالب کے پاس پہنچ جائیں اور بعدازاں اپنے دوستوں اور رفیقوں کو بڑے فخر کے ساتھ بتائیں کہ تصوف کے بیان میں جس عقدے نے مجھے پہروں دق کئے رکھا اُسے مرزا غالب نے چٹکی بجاتے میں حل کر دیا۔ گویا مرزا غالب مولانا فضل حق خیرآبادی کا پوئٹک وژن تھے اور فضل حق خیرآبادی، غالب کی رفعتِ تخیل اور گرمیٔ اندیشہ کا لاجکنگ پیڈ تھے۔ پھر پیرویٔ مغرب نے ہمارے ہاں دین اور ادب کو جدا جدا کر دیا۔ دین اور سیاست کا جدا ہونا چنگیزی ہے تو دین اور ادب کا جدا ہونا ابلیسی ہے۔ ہمارے زمانے تک آتے آتے ابلیسیت کا یہ طور ہو گیا ہے کہ اب دین اور ادب دو الگ الگ علاقے ہیں جن میں سرحدی تنازعات کے علاوہ اور کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ چنانچہ فیض احمد فیض یا ابوالاعلیٰ مودودی، شاعر ہو یا دینی مفکر، ہر دو کو اپنی لغزش کا احساس اُس وقت ہوتا ہے جب چڑیاں کھیت چگ گئی ہوتی ہیں اور ہم آپ

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

کی بے کل مایوسی میں لپیٹے کسی جھوٹے نجات دہندہ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہوتے ہیں۔ دینی فکر اور جمالیاتی تجربے میں اس دوئی اور مغائرت نے ہماری اجتماعی شخصیت کو دولخت کر رکھا ہے۔ ہم اپنے لخت لخت وجود کے لئے جس مرہم اندمال کی تلاش میں ہیں اُس کی مہک مجھے عطاء الحق قاسمی کے اُس اندازِ نظر سے آئی ہے جس کے زیرِ اثر وہ احمد ندیم قاسمی اور مجید نظامی میں ظہیر کاشمیری اور نعیم صدیقی میں انسانی جذبہ و عمل کے اشتراک و یگانگت کی کیفیت دیکھتے ہیں۔ خدا کرے یہ نیا تہذیبی رویہ ہمارے ہاں عام ہو جائے اور ہمارا ادھ موا نیم اجتماعی وجود پھر سے سالم ہو جائے اور ہم تفسیر و تعبیر کے اختلاف سے ڈرنے کی بجائے اس اختلاف کو اپنی زندگی کے لئے باعثِ رحمت بنا سکیں۔

بھا منصور

منیر احمد شیخ

بھا منصور اب پچاسی برس کا ہوگیا۔ ہونے کو تو پچاس کا میں بھی اسی سال ہوگیا تھا۔ لیکن میں تو چپکے سے چار دیواری کے اندر اس منزل تک پہنچ گیا اور اس کی خبر میری چار دیواری کے باہر کسی کو کانوں کان نہ ہوئی مگر بھا منصور تو چار دیواری کو پھلانگ کے "دائرے" میں کود پڑا اور یوں دنیا کو خبر ہو گئی کہ بھا نے بڑی منزل مار لی ہے۔ اس نے یقیناً بہت بڑا معرکہ سر کیا ہے۔ اس لئے کہ جس جہاں میں وہ زندہ ہے وہاں زندگی کو کم کرنے والے حادثات کی کوئی کمی نہیں مگر جو اس کے باوجود پچاس کے سن کو چھو لیتا ہے وہ بڑی ڈھیٹ چیز ہوتا ہے اور بھا منصور تو ڈھیٹوں کا بادشاہ ہے۔ وہ حادثات سے شکست کھانے سے ابھی تک انکاری ہے اور زندگی کی گاڑی کو بڑی ہمت اور پامردی سے کھینچے چلا آرہا ہے۔

آپ یقیناً پوچھیں گے کہ وہ میرا ہم عمر ہے مگر میں ہمیشہ اُسے بھا منصور یا بھا کہہ کر کیوں بلاتا ہوں؟ حالانکہ بھا جیسا کہ اہلِ پنجاب جانتے ہیں اپنے سے بڑے بھائی کو کہتے ہیں مگر یہ بھا ہر رنگی والا بھا نہیں۔ یہ لاہوری بھا ہے۔ اس نے اپنا بچپن اس شہر میں گزارا اور اپنے ساتھ لاہوری بھا کی تمام خصوصیات لے کے دوسرے شہروں میں چلا گیا مگر لاہوری بھا اس کی رگوں میں ایسا اُترا کہ پھر آج تک اس کے خون سے جدا نہ ہو سکا۔ یہ لاہوری بھا، فیض باغ، مصری شاہ، موچی، بھاٹی، ٹکسالی اور کشمیری دروازوں والا بھا ہے۔ جس کی رگ رگ میں وہ بو لتا ہے اور جو اس کے جیلوں میں بھی لنگوٹ باندھے مالش کرتا اور ڈولے بناتا دکھائی دیتا ہے۔ میں نے اُس کی تحریروں کو کئی مرتبہ پڑھنے کے بعد سوچا کہ اگر یہ گمراہ ہو کر ادیب نہ بنتا اور معاشرے کا ایک صحت مند رکن ہوتا تو پھر یہ کیا ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ ادیب نہ ہوتا تو ٹکسالی دروازے کے باہر کسی اکھاڑے پہ بڑا سا پٹکا باندھ کر خلیفہ کا رول ادا کر رہا ہوتا جو پٹھوں کو داؤ پیچ کے علاوہ اپنی گھٹائی گیری مونچھوں کو تاؤ دے کر کرتا ہے۔ اگر اُسے کوئی اکھاڑہ نصیب نہ ہوتا تو وہ شاہی مسجد لاہور کے سامنے اقبال پارک میں خلیفے کے روپ میں بیٹھ کر گُڈیوں کے پیچ لڑانے والوں کو پیچ جیتنے کے گُر سکھلاتا یعنی اُن کا "ٹیکنیکل ایڈوائزر" ہوتا اور شام کو شرطوں سے اکٹھی ہونے والی رقم اپنی ڈب میں ڈال کر گھر لوٹتا۔ اور اگر چار ول اور اُسے خلیفہ بننے کا چانس نہ ملتا تو پھر ایک ہی کام اس کے لئے رہ گیا تھا یعنی "عامل معمول" کے تماشے میں عامل کا کردار، جس میں وہ اپنے معمول سے کہتا، "گھوم جا" اور جب وہ "گھوم جاتا" تو اس سے کہتا "خدا، رسول اور پنجتن پاک کا سایہ تیرے سر پہ رہے! بتلا تجھے کیا نظر آرہا ہے؟" جب وہ کہتا "کچھ نہیں" تو یہ کہتا "اندھا مت بن بیٹا۔ تجھے سب کچھ دکھائی دے رہا ہے مگر تو دیکھنے سے انکاری ہے۔ اور اگر دیکھ رہا ہے تو بولنے سے انکاری ہے! بیٹا مت ڈر، بول جو تجھے دکھائی دیتا ہے۔ پنجتن پاک کا سایہ تیرے سر پہ ہے۔

ا۔ یہ مضمون منصور قیصر کی پچاسویں سالگرہ پہ اسلام آباد میں پڑھا گیا۔

بول اور سچ سچ بتا دے!" اور اس تگ و دو میں وہ پسینوں پسینے ہو کر بالآخر معمول کے منہ سے وہ اگلوا لیتا جسے وہ دیکھتے ہوئے بھی کہتے سے ڈرتا تھا۔

عزیزہ! یہی "عامل" منصور قیصر اپنے "معمول" یعنی "ادب" کے منہ سے یہی کام کروا رہا ہے۔ اس نے اس بیچارے معمول کو بہت "گھمایا" اور اس کام میں خود بھی نڈھال ہو گیا مگر "معمول" کو بالآخر وہی کہنا پڑا جو وہ دیکھتا تھا۔ اس کا "معمول" ابھی تک اس سحر سے باہر نہیں نکل سکا جو اُس نے اُس پہ پھونکا ہوا ہے اور پچھلے تیس پینتیس برس سے ہم تماشائی اُس کے اِس کھیل کو دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔

اِس کے بعد اگر میں آپ کو حاضرین کی بجائے ناظرین کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ تو پیارے ناظرین! منصور قیصر سے میری پہلی ملاقات میرے شہر گوجرانوالہ میں ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ یہ ملک ابھی ابھی وجود میں آیا تھا اور بھابڑہ بازار میں جینیوں کی ایک لائبریری میں اُردو کے نوخیز لکھنے والوں کا ایک مختصر سا اجتماع ہوا تھا۔ منصور قیصر جس کی مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں، لاہور سے ایک مضمون پڑھنے کے لئے وہاں آیا تھا۔ ایک خوش شکل، تر و تازہ، چاق و چوبند کشمیری نوجوان عمدہ لباس زیبِ تن کئے ہوئے ہال کمرے میں آیا۔ اُس کے ظاہر کا رُعب ہم پر بہت پڑا، باطن کی خبر تو کہیں برسوں بعد جا کے ہوئی۔ منصور اور میں بچوں کے رسالے میں خطوط اور چھوٹے چھوٹے مضمون اور کہانیاں لکھتے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کو اسی حوالے سے پہچانا۔ ہماری تہذیبی نشو و نما جس دور میں ہوئی اس میں دو آنے کا رسالہ ہم خریدتے تھے۔ ڈھائی آنے میں بے بی نور جہاں، لیلا چٹنس اور پوپ کی فلمیں دیکھتے تھے اور جب گھر سے دو آنے بھی نہیں ملتے تھے تو گلی میں ایک ٹکہ آٹا دے کر بائیسکوپ میں "بارہ من کی دھوبن" "کلکتہ شہر" اور "مکہ مدینہ" کی تصویریں دیکھتے تھے۔

اِس کے بعد منصور قیصر ایک جوان گبھرو کے روپ میں ۱۹۵۶ء میں لائل پور کے گھنٹہ گھر کے پاس کچہری بازار میں ایک صحت مند کشمیری لڑکی سے ملا جو اس کی بیوی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ سجے ہوئے تھے، اور منصور قیصر کی چاق چوبندی میں "کہکشاں" کی گرہ لگنے سے مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے لکھنے لکھانے کے شغل میں شادی کا حادثہ بالکل حارج نہ ہوا تھا اور وہ یہ ثابت کرنے پر تُلا ہوا دکھائی دیتا تھا کہ دیکھتے ہیں کہ کون زیادہ طاقتور ہے۔ دنیا کے تقاضے یا اندر کا بے چین آدمی جو کچھ نہ کچھ کہنے پر مجبور ہے۔ اُس بے چین آدمی کو نہ شادی چت کر سکی نہ ملازمت بلکہ سچ پوچھئے تو اس نے ان سب کو چت کر دیا۔ لکھنے کے جنون میں اس نے ایک اچھی بھلی ملازمت کھو دی اور لوگوں کے کہنے کے باوجود "بندے دا پتّر" نہ بنا۔ کہکشاں اپنے پتی دیوتا کی پوجا کرتے کرتے بالآخر صوفی بن گئی اور دُنیا اور اس کی آلائشوں سے اس نے کنارہ کیا۔ مگر بھا منصور رُولا پانے سے باز نہ آیا۔ وہ دوسرے دنیاداروں کی طرح چُپ کر کے ایک خوشحال و پُر اطمینان زندگی بھی بسر کر سکتا تھا مگر وہ جماندرو ادیب تھا۔ ذرا سی کوئی ٹیڑھی چیز دیکھتا تو ڈنڈ پا پا کے آسمان سر پر اٹھا لیتا اور جیسے کہ میں نے شروع میں عرض کیا، ڈھیٹوں کے بادشاہ ساری عمر ہی کرتے رہتے ہیں اور انہیں کوئی باز نہیں رکھ سکتا اور نہ ہی ایسے لوگوں کو باز رکھنے کی کوئی کوشش کرنا چاہیئے۔

چند برس اور بیت گئے تو ہم نے دیکھا کہ لاہور شہر کا یہ بوٹا پنڈی شہر میں اپنی جڑیں جما چکا ہے۔ اگرچہ اس نئے شہر کی آب و ہوا اس کے شہر سے مختلف تھی مگر اس نے اس آب و ہوا کو خوب خوب قبول کر لیا تھا، البتہ جو پھول اس پودے کے ساتھ لگتے تھے ان کی بُو باس داتا کی نگری کی تھی۔ اس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اس شہر میں گزارنے کے باوجود لاہوری بھا کو کبھی مرنے نہ دیا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لاہوری بھا کے تمام مخفی گن بھی سامنے آنے لگے۔

منصور قیصر دوستوں میں بے حد مقبول شخص ہے۔ وہ کسی سے اختلاف لاکھ بھی سکتا ہے تو اُسے انسانی رشتے پر اثر انداز نہیں ہونے دیتا، بلکہ کبھی کبھی مجھے اس پر غصہ بھی آجاتا ہے کہ یہ فلاں شخص سے نفرت کرتا ہے مگر پھر بھی اپنی زندگی سے اُسے خارج نہیں کر پاتا۔ یہ اس کی کون سی مجبوری ہے؟ آخر ہم خیال لوگوں میں بھی تو وہ اپنی زندگی بہتر طور پر بسر کر سکتا ہے۔

مگر بھا منصور دوستی میں انتخاب کا قائل نہیں۔ اسی لئے اُس نے اپنے آپ کو کسی ایک گروہ، ادبی فرقے یا کسی جماعت میں محدود نہیں کیا۔ ویسے مجھے ان لوگوں سے ڈر لگتا ہے جن کا کوئی دشمن نہ ہو۔ شاید بھا منصور کی یہ صفت مجھے اس سے دور کر دیتی۔ لیکن بھا منصور کے خلوص نے ساری عمر مجھے اس کے ساتھ چپکائے رکھا۔ اس سے الگ ہونا تو کجا میں اُلٹا اس خوف میں مبتلا رہتا ہوں کہ زندگی کے اس ساتھ میں یہ کبھی مجھ سے جُدا نہ ہو جائے۔

ناظرین کرام! منصور قیصر کے اسی خلوص کی وجہ سے بعض لوگ اُسے بیوقوف سمجھتے ہیں۔ وہ دوستوں کا دوست ہے۔ کسی دوست کو تکلیف میں دیکھتا ہے تو جو اس کی ہمت اور بساط میں ہوتا ہے کر گزرتا ہے۔ ادیب ہونے کے ناتے وہ اپنے سب سے موثر ہتھیار قلم کو ہاتھ میں تھما کر اس سے تیر کا کام لیتا ہے۔ اس نے اپنے ادیب دوستوں کے دکھوں اور تکلیفوں پر اس شدت اور تیزی سے لکھا کہ اکثر ثقہ لوگوں کی جبینوں پر بل آ گئے۔ لوگ کہنے جو ئے پائے گئے کہ منصور قیصر ذاتیات پر اُتر آتا ہے اور جو باتیں نہیں کہنے کی ہوتیں وہ بھی کہہ ڈالتا ہے۔ وہ غیر ذمہ دار ہے۔ اسے کسی کی عزت اور مرتبے کا خیال نہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر منصور نے اپنے خلوص کے ہاتھوں یعنی اپنی بیوقوفی کے ہاتھوں بہت سوں کو ڈھیر کیا۔ ناپسندیدہ لوگوں کو ایکسپوز کرتے ہیں اس کا قلم ایک تند گھوڑے کی طرح دوڑنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بغیر قیمت کے نہیں ہوتا۔ بھا منصور نے اپنی نوکری گھوڑے دوڑانے کے اسی کام میں گنوا دی اور پھر سڑک پر آن بیٹھا۔

لیکن صاحبو! انصاف کی بات ہے کہ بھا منصور کا خلوص اگرچہ آج کے زمانے میں ایک اجنبی شے بن چکا ہے مگر اس کی یہی صفت اس کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اسی طاقت سے اس نے اپنے دوستوں کے دلوں کو مسخر کیا اور اسی طاقت سے اس نے اپنی تحریروں کو قوت بخشی۔ اس کا خلوص اپنے دوستوں سے لے کر اپنی دھرتی تک یکساں طور پر پھیلا ہوا ہے۔ میں نے اکثر دیکھا کہ جب کبھی اُسے کسی ادیب کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ اپنی دھرتی کے ساتھ مخلص نہیں ہے تو اس نے اپنی پوری بیڑی کے ساتھ اس پر چارج کیا اور کبھی معاف نہیں کیا۔ وہ ایک سچا پاکستانی ہے جو اس ملک کی بقا میں اپنی اور آنے والی نسلوں کی بقا دیکھتا ہے۔ اس معاملے میں بھا منصور کو بڑی سے بڑی طاقت بھی متزلزل نہیں کر سکتی۔ یہ ملک اس کا ایمان ہے۔ اس نے اپنی ذات کے حوالے سے کسی کو دشمن نہیں بنایا مگر ملک کے حوالے سے اس کا ایک ہی دشمن ہے اور وہ "ملک دشمن" ہے۔

بھا منصور کے اسی خلوص نے مجھے اس کا گرویدہ بنائے رکھا۔ میں اسی اعتماد میں اُس سے بہت سی ایسی باتیں کہہ جاتا تھا جو کسی ایسے ہی دوست سے کی جا سکتی ہے۔ مگر ہمیشہ ایسا ہوا کہ وہ باتیں جو میں بھا سے بڑے اعتماد کے عالم میں کہہ جاتا تھا وہ اگلے روز کسی اخبار کے کالم میں نظر آجاتیں۔ بھا کی اس "خوبی" سے میں کئی مرتبہ خوف زدہ ہوا اور میں نے ہر مرتبہ ارادہ کیا کہ فلاں بات تو اُس سے ہرگز نہیں کروں گا مگر جب بھی وہ ملا تو اس کے خلوص کے آگے میری زبان چپ نہ رہ سکی۔ میں جب بھی اس کا کالم دیکھتا ہوں تو اپنے آپ سے عہد کرتا ہوں کہ اگلی مرتبہ احتیاط کروں گا مگر اگلی مرتبہ میں پھر دل کھول کے اس کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ اور اگلے روز پھر ایک کالم میں اس کا تذکرہ پڑھتا ہوں۔ پتہ چلا کہ بھا منصور کے نزدیک کوئی شے صیغۂ راز میں نہیں آتی۔ جو شے اندر بیٹھ رہی ہے اُسے عام ہونا چاہیئے۔ جو شے پردوں میں چھپا کے رکھنے کی ہے اُسے نمائش میں لگانا چاہیئے۔ رازوں کو اُگلو

کہ خلقِ خدا انہیں دیکھے اور عبرت پکڑے۔ پس بھا منصور سے بات کرنے سے پہلے سوچ لو کہ یہ بات اب تمہاری نہیں رہی، دنیا کی ہو گئی۔ یہ کام بھی وہ بڑے خلوصِ نیت سے کرتا ہے۔

وہ جب ۱۹۴۸ء میں گوجرانوالے میں مجھے ملا تھا تو ایک ادبی تقریب میں مضمون پڑھنے آیا تھا اور آج چونتیس برس بعد بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ جہاں کہیں بھی کوئی ادبی تقریب یا جلسہ منعقد ہو رہا ہوتا ہے، وہاں اسی طرح موجود ہوتا ہے جیسے کسی محلے میں دیگ کی خوشبو پہ جمعراتی مل۔ اس کا یہ شہرہ دیکھ کر بعض ثقہ ادیبوں نے کہا کہ یہ شخص شہرت کا بھوکا ہے اور ہر جلسے جلوس میں مضمون لے کر حاضر ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی رائے انہی لوگوں کی ہے جو بھا منصور کو قریب سے نہیں جانتے۔ بھا منصور کو جہاں تک میں جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسے نہ تو کبھی اس چیز کی خواہش ہوئی کہ اسے کوئی تمغہ ملے اور وہ ادیب کے بجائے صرف تمغے سے پہچانا جائے، نہ ہی اس کے دل میں کبھی یہ خواہش مچلی کہ تاریخِ ادب میں اس کا نام چھپ جائے۔ وہ اسی پر مطمئن ہے کہ "ادیبوں کی ڈائریکٹری" میں اس کا نام آگیا ہے۔ جہاں تک کام کا تعلق ہے تو وہ آنے والی نسلیں اور وقت ہی بتلائے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک ادب دوست آدمی ہے اور جہاں کہیں بھی ادب دوست اکٹھے ہو جائیں تو وہ تڑپنا شروع کر دیتا ہے کہ میں اس محفل میں کیوں نہیں۔ بس اتنی سی بات ہے جس کو خواہ مخواہ میں بڑھا دیا گیا ہے۔

اب میں بھا منصور کے اس پہلو کی جانب آتا ہوں جس کے تماشائی ہم سب ہیں۔ اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ منصور قیصر نے اردو ادب میں کون سا بڑا کارنامہ کیا تو میں پہلے تو "لفظ" "کارنامے" کے استعمال پر اعتراض کروں گا کہ زندہ اور سچے ادیب صرف ادب پیدا کرتے ہیں، کارنامے وہ بعد میں کہیں جا کے بنتے ہیں۔ میں ایک جملے میں یہ کہوں گا کہ منصور قیصر نے اور کچھ کیا ہے یا نہیں مگر اردو زبان کو پاکستانی لہجہ عطا کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ زبان جو ہندوستان کے ان علاقوں سے یہاں آئی تھی جو اب پاکستان کا حصہ نہیں ہیں، تو اس زبان کو اس علاقے کی زبان بنانے کے لیے منصور نے اس میں جس بے ساختگی سے پنجابی زبان کو داخل کیا اس پر شروع شروع میں نازک طبع لوگوں کو بہت اعتراض ہوا۔ یہاں تک کہا گیا کہ منصور اردو کے معنی کو بازاری زبان بنا رہا ہے مگر جس بازار میں اب وہ آگئی تھی اس بازار کا نام تو اب پاکستان تھا اور اگر اس زبان کو زندہ رہنا تھا اور کسی عجائب گھر کا حصہ نہیں بننا تھا تو اس کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ اب پنجاب، سرحد اور سندھ اور بلوچستان کے بازاروں میں گھوم پھر کے وہ تمام لہجے اختیار کرے جو اسے یہاں کے لوگوں کی زبان بنا دے۔ منصور قیصر ان ادیبوں میں سے ہے جس نے یہ اجتہاد کیا اور پھر دیکھا دیکھی ریڈیو اور ٹی وی کے ڈراموں میں نہ صرف پنجابی اور دوسری علاقائی زبان کے الفاظ اور لہجے در آنے لگے کہ وہ اردو، پاکستانی بن گئی۔ اس زبان میں پاکستان کا تشخص اس قدر نمایاں ہے کہ جب دہلی کے تجارتی میلے میں ٹی وی کے بعض ڈرامے دکھائے گئے تو یو۔ پی والوں نے مجھ سے حیرت کا اظہار کیا کہ ان ڈراموں کی زبان تو بہت مختلف ہے۔ اسے آپ پنجابی کہیں گے یا اردو۔ میرا جواب یہی ہوتا تھا کہ اردو کو اب پنجابیوں نے چھین لیا ہے۔ اب 'اردو والے' ہم ہیں اور آپ صرف 'اہلِ زبان'۔ اردو کو ہم نے اب شلوار کرتہ پہنا دیا ہے۔

سو پیارے ناظرین! آج بھا منصور کی پچاسویں سالگرہ پر ہم اسے سب سے بڑا تحفہ اس اعتراف کی صورت میں دے رہے ہیں کہ وہ زبان کی "طہارتوں" اور "عصمتوں" کے کلیشیز (CLICHES) کے چکر میں نہیں پڑا اور اس نے اردو کو "مشرف بہ پاکستان" کرنے میں حسبِ استطاعت جدوجہد کی۔

منصور قیصر نے اردو کی بہت سی اصناف میں لکھا، سوائے شاعری کے۔ اس نے افسانے لکھے، ڈرامے لکھے، خاکے اور

رپورتاژ لکھے، مضامین کے انبار لگائے اور کالم نویسی کے تھانوں کے تھان تیار کیئے۔ اصناف کی رنگارنگی کے باوجود ایک قدرِ مشترک ان سب تحریروں میں موجود ہے کہ ان کے موضوعات اور کردار گلی کوچوں کے لوگ ہیں۔ کلیجے فروش، تیل مالش کرنے والے، کانوں کا میل نکالنے والے، ملائی کی برف بیچنے والے، دودھ دہی والے اور کبابوں کے شہنشاہ۔ بھا منصور نے انہی لوگوں کے درمیان آنکھ کھولی تھی اور انہی کرداروں سے اس نے انسانی خلوص کی صفت پائی تھی۔ اس نے ادب کو بھی خلوص بخش کر دراصل ادب میں اپنی ہی ذات کی توسیع کی ہے۔ اس کا لہجہ عوامی ہے مگر جملے زہر میں بجھے ہوئے۔ اُسے پڑھنے کے لیئے زور نہیں لگانا پڑتا بلکہ ایک موزوں طبع ادیب کی طرح وہ اپنے آپ کو پڑھواتا ہے۔ اُس نے اپنے سارے کردار اور موضوعات اپنے اردگرد کی زندگی سے لیئے ہیں۔ اُس نے اپنی کوئی کہانی زمین اور آسمان کے درمیان نہیں بُنی اور نہ ہی مُبہم استعاروں اور بے معنی علامتوں کا سہارا لیا کہ پڑھنے والا یہ فیصلہ ہی نہ کر پائے کہ "بھائی صاب! کہنا کیہ چاہندے نیں"۔

اس کی تمام تحریروں میں جزئیات کی ایسی تفصیل ملے گی کہ جو شے اس کی آنکھ کے "لینز" کے سامنے سے ایک مرتبہ گزر گئی وہ اپنے تمام رنگوں سمیت آپ کے سامنے آجائے گی۔ مجھے تو کبھی کبھی یہ بھی شک گزرتا ہے کہ اس کے اندر ایک ایکسرے پلانٹ لگا ہوا ہے اور وہ ظاہر کی تہوں سے گزر کر اندر خانے کے راز بھی باہر نکال لے آتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ ایک خطرناک ادیب ہے اور اپنے ہمعصروں کے لیئے خطرے کی علامت کہ وہ حادثات و واقعات کو کسی کونے میں ڈال کر پکنے نہیں دیتا بلکہ نہایت بے صبری کے عالم میں انہیں ایکسپوز کر دیتا ہے۔ اُس کی عجلت پسندی کا پنڈولم اس کی صحافت اور اس کے ادب کے درمیان ہمیشہ تیزی سے چلتا رہا ہے۔

آخر میں مَیں اگر اس شخص کا ذکر نہ کروں جو منصور کو پچاسویں برس تک گھسیٹ گھسیٹ کے لانے کا قصوروار ہے تو یہ داستان ادھوری رہ جائے گی۔ میری مراد کہکشاں ملک سے ہے۔ یوں تو ہر پنجابی شوہر کے نصیب میں یہ جُملہ بیویوں کی جانب سے لکھا ہوا ہے کہ "اسے میں ای ساں جیہنے تیرے نال گُزارا کر لیا، کوئی ہور ہوندی تے تینوں پتہ لگ جاندا"۔ لیکن بھا منصور کے بارے میں مَیں بڑے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر اُس کی زندگی میں کہکشاں کی بجائے "کوئی ہور ہوندی" تو بھا منصور ادیب ہونے کی بجائے آج کسی اکھاڑے کے باہر بیٹھ کے اپنے پٹھوں کو مونچھیں مروڑ مروڑ کے گھاگی گیری سکھلا رہا ہوتا۔ جب وہ ایک نوکری سے نکل جاتا تھا تو اس کے گھر میں چوہا روشن کہکشاں ہی رکھتی تھی اور اس نے ہر بُرے بھلے وقت میں اس آگ کو بجھنے نہ دیا اور ان کے ویہڑے میں خالص گھی کے تڑکے کی خوشبو آتی رہی اور صحن میں اُگے ہوئے درخت پر چڑیاں ہمیشہ چہچہاتی رہیں۔

اس کی پچاسویں سالگرہ پر مجھے اُمید ہے کہ وہ اپنی ذات کی طرح اپنی بکھری ہوئی تحریروں کو اکٹھا کرے گا اور انہیں کتابی شکل دے گا۔ ورنہ اُس کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوگا جو اپنی زندگی میں اپنی "دیگ" کو مُوہے چڑھائے بغیر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

تو اے بھا منصور! بالتحقیق آج سے تمہارا شمار بزرگوں میں ہوگا، مبارک ہو۔ یہ بزرگی تم نے منجی پہ لیٹ لیٹ کے حاصل نہیں کی بلکہ اپنی زندگی کے ایک ایک منٹ کا حساب اس دنیا کو دیا ہے۔ تم زندہ رہو اور لوہا کوٹتے رہو تا آنکہ تمہارے ہاتھ شل ہو جائیں، اور تمہارے بازوؤں میں طاقت نہ رہے۔ میں تمہیں ہزاروں برس جینے کی دُعا نہیں دیتا۔ میرے نزدیک اتنا جینا تو کسی بد دُعا کے نتیجے میں ہی ہو سکتا ہے۔ زندگی و موت تو اُسی کے ہاتھ میں ہے جو ان دونوں پر قادر ہے۔ مگر میری دُعا یہی ہے کہ جب تک جیو زندوں کی طرح جیو اور جب موت بھی آجائے تو لوگ یقین نہ کریں کہ یہ مر بھی سکتا تھا۔

...

فارغ بخاری

شہر لُٹتا رہا

ہم عذابوں کے منحوس چہروں سے
ناآشنا تو نہ تھے
بارہا یہ وبا ہم نے دیکھی
قضا ہم نے پائی
بلا ہم نے جھیلی
مگر سانحہ تھا عجب
وہ لمحے کہ جب
حیرتیں تھیں قیامت
جبینیں ندامت
وہ لمحے کہ جب
شہر لُٹتا رہا
خون بہتا رہا
اپنے رشتوں کی پہچان ہم بھُول بیٹھے
فتوحات کے جشن اور سب شکستوں کے غم بھول بیٹھے
وہ لمحے کہ جب
اپنے ہی زخموں کے ہم تماشائی تھے
اپنے ہاتھوں ہی سنگسار ہوتے رہے
ایسے دلدادۂ شوقِ رُسوائی تھے
ایک مہلک سا سناٹا تھا چارسُو
کس سے کہتے کہ ہم تیرے شیدائی تھے

تجزیہ

پھُول کا حُسن تو شاخ پر
جھُومنے، مُسکرانے میں ہے
لہلہانے میں ہے
توڑ کر شاخ سے
رنگ و بُو کا
زرِ گُل کا
لیبارٹری میں جو ہم تجزیہ کرنا چاہیں
تو کچھ بھی نہیں
رنگ اُڑ جائے گا
بُو بکھر جائے گی
اور زرِ گُل کفِ خاک بن جائے گا
خوابِ رفتہ کے مصداق بن جائے گا

اختر حسین جعفری

جہاں دریا اُترتا ہے

(۱)

سرِ نوکِ خوں، رُخِ مضموں پہ چلتا ہے تو اک رستہ
نکلتا ہے
ندی دریا پہ تھم جائے
لہو نقطے پہ جم جائے تو عنوانِ سفر ٹھہرے
اسی رستے پہ سرکش روشنی تاروں میں ڈھلتی ہے
اسی نقطے کی سُولی پر پیمبر بات کرتے ہیں
مجھے چلنا نہیں آتا
شبِ ساکن کی خانہ زاد تصویرو! گواہی دو
فصیلِ صبحِ ممکن پر مجھے چلنا نہیں آتا
مرے چشموں میں شورِ آب بیجا برشگالی ہے
ندی مقروض بادل کی
مرا دریا سوالی ہے
رگِ حرفِ زبوں میں جو چراغِ خوں سفر میں ہے
ابھی اُس نقطۂ آخر کے زینے تک نہیں آتا
جہاں جلّاد کا گھر ہے
جہاں دیوارِ صبحِ ذات کے رخنے سے نگہِ خشمگیں
بارُود کی چشمک ڈراتی ہے
جہاں سُولی کے منبر پر پیمبر بات کرتے ہیں

(۲)

اب ان باتوں کے سکّے جیب کے اندر کھنکتے ہیں کہ جن پر
قصرِ شاہی کے مناظر
اسلحہ خانوں سے جاری حکم کندہ ہیں
بھرے بازار میں طفلِ تہی کیسہ پریشاں ہے کہ اس کے پاؤں
ٹکسالوں کے رستے سے ابھی نا آشنا ہیں۔
اور اس کا باپ گونگا ہے۔
ندی رُک رُک کے چلتی ہے
تکلّم رہن رکھنے سے سفر آساں نہیں ہوتا
ہُوا پسپا جہاں پانی
جہاں موجوں نے زنجیرِ وفا پہنی، سپر گرداب کی رکھدی
عَلَم رکھے، قلم رکھے

خفا بادل نے جن پایاب دریاؤں سے منہ موڑا
جہاں تاراج ہے کھیتی
جہاں قریہ اُجڑتا ہے
طنابِ راہ کٹتی ہے کہیں خیمہ اُکھڑتا ہے
وہاں سے دُور ہے ندّی
وہاں سے دُور ہے بچّہ کہ اس کے پاؤں
دریاؤں کے رستے سے ابھی ناآشنا ہیں —
اور اس کا باپ گونگا ہے
اُسے چلنا نہیں آتا
فصیلِ صبحِ ممکن پر اسے چلنا نہیں آتا

(۳)

سحر کے پاس ہیں منسوخ شرطیں صلح نامے کی
صبا، درسِ زیاں آموز کی تفصیل رکھتی ہے
کسی تمثیل میں تم ہو
کسی اجمال میں، میں ہوں
کہیں قرطاسِ خالی کا وہ بے عنوان ساحل ہے
جہاں آشفتگانِ عدل نے ہتھیار ڈالے ہیں
بہت ذاتیں ہیں صدموں کی
کئی حصے ہیں سینے میں نفسِ گم کردہ لمحے کے
کئی طبقات ہیں دن کے
کسی صبحِ مکافاتِ سخن کے منطقے میں تم مقیّد ہو
کسی پچھلے پہر کے صلحنامے کی عدالت میں
کڑی شرطوں پر اپنے دستخط کے رُوبرو میں ہوں
سنو، قرطاسِ خالی کے پسِ انداز ساحل سے
ہوا کیا بات کہتی ہے
اُدھر، اُس دوسرے ساحل سے جو ملاّح آیا ہے
زمینیں بیچتی بستی سے کیا پیغام لایا ہے
کوئی تعزیر کی دھمکی؟
کوئی وعدہ رہائی کا؟
کوئی آنسو؟
کوئی چٹھی؟

اکتوبر ۱۹۸۲ء

احمد ظفر

حیاتِ ساکت کا ایک تاثر

ہوا تھم سی گئی ہے
سانس لینے کی تمنا جیسے سینے میں
مسافر جس طرح چپ کے سفینے میں
درختوں کے کفن پہنے ہوئے یادیں
صفیں باندھے ہوئے حدِ نظر تک ایستادہ ہیں
فصیلوں پر کبوتر، اُڑتے اُڑتے منجمد لمحے
فضا جم سی گئی ہے
اور فلک اپنے شگافوں کو رفو کرتا ہُوا
حیرت زدہ رہرو
ستارے زخم ہیں جس کے
زمیں کے سارے رشتے ٹوٹ جائیں تو
سرابوں کے سوا پلکوں پہ شاید کچھ نہیں رہتا

احسن علی خان

قلم نے کہا

قلم نے کہا
اب مجھے چھوڑ دو
اب تمہاری شہادت کی اُنگلی تو
سچائی لکھتے ہوئے کانپتی ہے
تمہارا لہو خوف سے منجمد ہو گیا ہے
وہ میری رگوں میں اُترتا نہیں ہے
میں کب تک
یہ بے رنگ، بے جان الفاظ لکھوں

قلم نے کہا
اب مجھے چھوڑ دو
خوف کا لمس مجھ کو گوارا نہیں

شہزاد احمد

اگر کہیں کوئی ہے تو بولے

بہت سے کاغذ سیاہ کرنے کی آرزو ہے
بہت سے لفظوں کی جستجو ہے
بہت سے لوگوں سے دُور رہنے کی زرد خواہش
— خزاں کا منظر بنی ہوئی ہے
حصارِ دل پر ہر ایک جانب سے
وحشتوں کی دبیز چادر تنی ہوئی ہے

میں آسماں کی بلندیوں سے ابھی گرا ہوں
ابھی تلک میرے ہاتھ میں ہیں خلا کے پتھر
نگاہ میں ہیں ہر ایک لحظہ بدلتے منظر
مگر مرا جسم ریزہ ریزہ بکھر چکا ہے
میں اپنے ہاتھوں کو ڈھونڈتا ہوں
کہ اس سفر کا علم وہی تھے

وہ قافلہ جس کے ساتھ میں تھا
— کہاں گیا ہے ؟
کہاں گئے رات کے فرشتے ؟
کہاں گئیں شام کے لہو میں نہانے والی سفید حوریں ؟

وہ رتھ کہاں ہے ؟
جو مجھ کو لے کر خلا کی جانب رواں ہوا تھا
میں آسماں کی بلندیوں سے کہاں گرا ہوں
یہاں نہ گھر ہیں ، نہ روشنی ہے
نہ سانس لیتی ہوئی ہوا ہے
یہ کیا ہوا ہے ؟

اگر کہیں کوئی ہے تو بولے
کوئی صدا خاک ہی سے آئے !
کسے بتاؤں کہ لوٹ آیا ہوں میں سفر سے
میں کس کی خاطر
بہت سے کاغذ سیاہ کرنے کی آرزو میں
بہت سے لفظوں کی جستجو میں
سمیٹ لوں ان بکھرتے ریزوں کو
جو مری خاک پر پڑے ہیں
— کہیں اگر کوئی ہے تو بولے

آفتاب اقبال شمیم

اجنبی

وہ لڑکا شاہزادہ سا
جسے بے نام خوشبوؤں کی آوازیں
تصوّر کی زمینوں میں سدا آوارہ رکھتی تھیں
جسے گھر سے گلی سے مدرسے تک
تربیت نے
قاعدے کی تال پر چلنا سکھایا تھا
وہ کنجِ خواب کا حُجلہ نشیں
خواہش کے روزن سے
سمندر کے اُفق پر
دیکھتا تھا خواب اُڑتے بادبانوں کے
تمسخر روشنی کا دن کے چہرے پر
وہ لڑکا شاہزادہ سا
جسے بے رشتہ رہنا تھا ہمیشہ
شہرِ اشیا کی ثقافت میں
کسے رعنائیاں اپنی دکھاتا
کس پہ کشفِ دلبری کرتا
کسے پہچانتا
کیسے جگاتا انگلیوں کے لمس سے
آواز کی خوشبو سے
اشیا میں
حرارت آشنائی کی
وہ لڑکا شاہزادہ سا
جبیں کی لوح پر کل کی جزائیں
لکھتا رہتا تھا
مقدر زخم کا
خفیہ پتے ممنوعہ رستوں کے
وہی ہر روز کے مضموں میں
لُکنت خالی جگہوں کی
تحیّر لفظ سے ٹوٹے ہوئے معنی کے رشتے کا
وہ لڑکا شاہزادہ تھا
کسی موعود نامولود دُنیا کا

نارسیدہ لمحے کا بلاوا

زیدا! یہ کیسے پھُول ہری آشاؤں کے
دن کے صحن میں کھلتے ہیں
نیم جنوں کی خوشبوئیں
سینے کی تختی پر لکھتی رہتی ہیں
بے مفہوم زباں میں حرفِ شکستہ سے
آ مکتب سے بھاگ چلیں
دیکھ! وہاں پر
ریت کا ٹھہرا دریا نیلی بینائی کی
وسعت سے جا ملتا ہے
سُنتا ہے تُو دل میں دُھوپ کی دھڑکن سی ؟
ایک تمنّا نامعلوم تعاقب کی
ہم سے آگے آہٹ آہٹ چلتی ہے
آدھے عرش کی دُوری سے
دیکھ! پتنگیں کٹ کر ڈولتی جاتی ہیں
پیچھے پیچھے
ریلے ہی ریلے ہیں اُٹھی باہوں کے
کیا معلوم ہوا کا پرچم کس خوش بخت کے ہاتھ آئے
آ ہم بھی یلغار کریں
پھر کیا
وہ ہم دونوں سے قد آور بھی ہیں، آگے بھی

ضمیر اظہر

فطرت کے آئینے میں

سرِ شاخِ گُل، آبجو کے کنارے
سحر کی شگفتہ شگفتہ، چمکتی دمکتی، چھلکتی لپکتی ہوئی روشنی میں
خوش آواز، خوش فام چڑیوں کے جُھرمٹ
وفورِ طرب میں چہکتے چہکتے، لہکتے لہکتے
پَروں کو سُروں کے تناسب سے پھیلا رہے ہیں
فسوں آفریں گیت برسا رہے ہیں

نکھرتے چلے جا رہے ہیں جو لمحہ بہ لمحہ فضاؤں کے عارض
یہ چڑیاں، یہ چڑیوں کے خورسند جُھرمٹ
کبھی ریشمِ شاخ پر جُھولتے ہیں
ملائم گلوں سے کبھی کھیلتے ہیں
اُتر کر کبھی شاخ سے آبجو کے کنارے
بدستور لذت کشِ آب ہو کر
بکھر جاتے ہیں ہر طرف شادماں زندگی کے
تقاضوں کی خاطر

یہ چڑیاں، یہ چڑیوں کے معصوم جُھرمٹ
اِسی رنگ میں روز انگورِ فرحت کا رس چُوستے ہیں
اِسی ڈھنگ سے روز رہتے ہیں شاداں
مقدّر پہ اپنے غزل خواں، غزل خواں

ہم انساں کہ مخلوق کے تاجور ہیں
عطا کی ہیں قدرت نے ہم کو فراست کی لاکھوں شعاعیں
معموں کو حل کرنے والی ضیائیں
غموں کے اندھیروں میں پھر کس لیے ہم
گناہوں کی صورت بھٹکتے ہیں پیہم
مشیت سے نالاں
پریشاں، پریشاں!

حسن اختر جلیل

بُلاوا

کچّی گلیاں ، کچّے آنگن
کچّے گھر ، کچّی دیوار پہ
کچّی عمروں کے وہ کومل خواب
کہاں ہیں
خوابوں جیسی مدھر ندی
جس کے پانی میں
گھُلی ہوئی مٹّی کی خوشبو
میرے بدن کا آئینہ تھی
تیرے جسم کی نرماہٹ تھی
گندھی ہوئی مٹّی کے پیڑے
جیسے وہ ہم سب کے دل ہوں
سب کی دھڑکن اک جیسی تھی
سب کے سہانے خواب وہی تھے
مٹیالی آنکھوں میں
اُٹھتے لہراتے گرداب وہی تھے
خاکِ منوّر کے شہزادے !
اب تو اُس پتھریلے زنداں میں رہتا ہوں
جہاں مہینوں تک مٹّی کی
سوندھی خوشبو تک نہیں آتی
دیواروں پر پچھلے لادے کی یکسانی سے اُکتاہٹ
فرشوں پر چلنے میں پھسلتے پاؤں کو
کانٹوں کی تمنّا
دل میں اک بیدار خلش
جو یہ زنجیریں توڑنے پر اُکساتی ہے
دیکھ تو پگلے !
ان خود ساختہ سنگیں محرابوں سے باہر تجھ کو
اُن گلیوں ، ان راہوں کی مہکار
بلاتی ہے

سجاد بابر

معراج

درد
پرانا جب نہ ہوا تھا
آنکھ
جب آنسو لے آتی تھی
لب
جب کانپنے لگ جاتے تھے
مَیں
اُن راتوں، جانے کیسے
لوگوں کو اچھا لگتا تھا!
لیکن اب تو
آنکھ نے
آنسو پی ڈالے ہیں
ہونٹ بہت
ٹھہرے ٹھہرے ہیں
درد نے
لذّت اپنا لی ہے
میں نے بھی
منزل پالی ہے
لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں!

(بحرین)

خراش

مکالمہ
جس کا وقت طے تھا
سدا کسی ثلث نیپے کی محتاط دسترس میں
سمٹ کے بیٹھا
ترا مرا
ظرف تولتا تھا ـــ،

مکالمہ
جس کا وقت آنا تھا
تیرے میرے لبوں سے پھسلا
تو اب تعلق کی ہر عمارت میں
زلزلے کی دراڑ جیسی نشانیاں
جھانکنے لگی ہیں ـــ،

(دوبئی)

لیث قریشی

اِسی کا نام دُنیا ہے

مرے کمرے کا دروازہ
جو اکثر بند رہتا ہے
اُسے میں کھول کر
جب صُبحدم باہر نکلتا ہوں
مری بیوی، مری بیٹی
مجھے کرتی ہیں رُخصت
اور کہتی ہیں، خدا حافظ!
یہ کلمہ خیر کا ہے
خیر سے دفتر پہنچتا ہوں
اور اپنا کام کرتا ہوں

مگر یہ کام کیا ہے؟
کس لیے ہے؟
کس کی خاطر ہے؟
یہ محنت، یہ مشقّت، یہ صعُوبت
کس لیے آخر؟

یہ سب کچھ ہے، فقط اِک مسئلے کا حل
مگر وہ مسئلہ کیا ہے
مداری کی زباں میں "ایک پاپی پیٹ کی خاطر"
میں کتنے پاپ کرتا ہوں!
میں رشوت تو نہیں لیتا
مگر دیتا تو ہُوں رشوت
میں اک برتر کی بیجا برتری کو
زندہ رکھتا ہوں، کہ مجھ کو زندہ رہنا ہے
اُدھر اک برتری زندہ
اِدھر اک کمتری زندہ
اور اس کا راز پوشیدہ ہے
صرف اک لفظ رشوت میں
وہ رشوت، نفس کو رشوت

میں اُس کے نفس کو رشوت بشکلِ زر نہیں دیتا
وہ ٹکسالی زباں کے سِکّہ ہائے لفظ ہوتے ہیں

جو خوش آہنگ ہوتے ہیں
بہت ہی خوبصورت
جاذبِ دل، دل نشیں سکّے
فقط الفاظ کے سکّے
مگر اُن کی کھنک، اُن کا چھناکا
سب نہیں سُنتے
وہ بس اِک فرد سُنتا ہے، انا آسودہ کرتا ہے
وہی اک فرد، جو ہے عصرِ حاضر کا نمائندہ
جو حق رکھتا ہے جینے کا
بزعمِ خویش ہے اپنی جگہ پائندہ و زندہ
کوئی سوچے!
یہ کیسا پاپ ہے؟
اور ہم کہیں پاپی کسے آخر؟
یہ پاپ اپنے لئے بھی
اور اپنوں کے لیے بھی ہے
یہ جتنا روز بڑھتا ہے
میں اُتنا روز گھٹتا ہوں
یہ گھٹنے کا عمل ——
ایسا عمل ہے، جو مسلسل ہے
سو میں بھی گھٹ رہا ہوں
اور اِن سکّوں کی قیمت بھی
بالآخر — دونوں ہی کھو دیں گے

اپنی قدر و قیمت کو
اور اک دن —
وقت کے پیکر سے
رُوحِ قدر اُٹھے گی
خدا حافظ کہیگی، میری بیوی اور بیٹی کو
اور اس کے بعد اسی کمرے سے باہر جانے والا
حسبِ معمول اپنے دفتر کو
ہمیشہ کے لیے
کمرے سے باہر جا چکا ہوگا
وہ پاپ اب کٹ چکا ہوگا
وہ پاپی، یعنی وہ اک مُرتشی
رشوت کا حامی مر چکا ہوگا
رہا وہ نفس کا راشی
کہ اُس کا نفس موٹا ہے
اُسے تو زندہ رہنا ہے
اُسے پائندہ رہنا ہے
اِسی کا نام دُنیا ہے — خدا ہی جس کا حافظ ہے

امجد اسلام امجد

خزاں کے آخری دن تھے

خزاں کے آخری دن تھے
بہار آئی نہ تھی لیکن
ہوا کے لمس میں اک بے صدا سی نغمگی محسوس ہوتی تھی
درختوں کے تحیّر میں کسی بے آسرا اُمید کی لَو تھرتھراتی تھی
گزرگاہوں میں اُڑتے خشک پتّے
اجنبی لوگوں کے قدموں سے لپٹتے اور اُلجھتے تھے
تو اِک بھولی ہوئی تصویر جیسے کوندجاتی تھی
ہر اک منظر کے چہرے پر
لرزتی بے کلی کی ریشمیں چادر کشیدہ تھی
نظر رستہ نہ پاتی تھی

کچھ ایسا ہی سماں تھا جب
وہ میرے بخت کے صحرا میں ساون کی طرح اُتری
مرے سانسوں میں مہکی تھی
نگاہوں کے ستارے آرزو کے استعارے تھے
تمناؤں کے سیلِ شوق میں بہنے لگی تھی وہ
مرے سینے پہ سر رکھ کر اچانک مسکرائی
اور کچھ کہنے لگی تھی وہ ـــــ

نہ جانے کیا تھا وہ جملہ
وہ اُس کا اَدھ کہا جملہ
جو غنچے کی طرح اُن کانپتے ہونٹوں پہ پھُوٹا تھا
اُسی لمحے ۔ کوئی کوئل بڑے ہی درد سے کوکی تھی
وہ جیسے ۔ اچانک نیند سے جاگی تھی
اور اُس نے بڑے دُکھ سے فلک کی سمت دیکھا تھا
وہ بولی تھی :
" ستارہ شام کا روشن ہُوا ہے، اب میں چلتی ہوں"

خزاں کے آخری دن ہیں
ہوا کے لمس میں اک بے صدا سی نغمگی محسوس ہوتی ہے
کوئی مانوس سی خوشبو مرے کانوں میں کہتی ہے
پھر اُس کے حُسن کا محرم
مرا دل ہونے والا ہے
وہ اُس کا اَدھ کہا جُملہ
مکمل ہونے والا ہے

پروین شاکر

فرزندِ زمیں سے

تیس پینتیس برس کا ساتھ رہنے کے بعد
جس گھر کی بنیادوں میں جذبے نے رکھا
میری ماں کا دوپٹہ، میرے باپ کی پگ
جس کی دیواروں پر میرے خواب تمام
چونے اور گچ کی صورت چن دیے گئے
اُس گھر کی چھت کا مالک مجھ سے کہتا ہے —

تم ہم میں سے نہیں ہو!
میں اُس فردِ جرم کے آگے
سر کو جھکائے کھڑی ہوئی ہوں
شرمندہ اور مہر بہ لب

سوچ رہی ہوں
کیا پامیر سے آنے والی ہوا کی سرگوشی سچ ہے
میرے آقاؐ
جن پر میرے اور تمہارے آبا و اجداد نثار
اُن کے اور یثرب کے بیچ
ایک صدا کا فاصلہ تھا
اس مٹی کی خوشبو میں بسنے کے لیے
مجھ کو ہیں درکار
کتنے دن اور کتنے برس اور کتنی صدیاں بھائی؟

معذرت

بہت دنوں کے بعد
کسی نے
سُرخ گلاب کا تحفہ میرے نام کیا
لیکن مجھ کو
نیک دعائیں بھیجنے والے دوست!
میرے آنگن میں ریت بھری ہے
میں اس پھول کو صرف کتاب میں رکھ سکتی ہوں
یہ خوش رنگ شگوفہ
مجھ میں کیسے جڑ پکڑے گا
گئی بہار کا قرض چکا دینے کے بعد
میرے پاس فقط آنسو ہی بچتے ہیں
اور آنسو سے پھول نہیں سینچے جاتے!

ناھید قاسمی

تمھاری نظمیں

ہیولیٰ

گھر میں گھرا سناٹا ہے
سب دروازے اور دریچے بند ہیں
ایسے میں تُو پیارا پیارا ایک ہیولیٰ بن کر
جانے کہاں سے آ کر میرے سامنے بیٹھ گیا ہے!

کوندا

میں نے کب تم کو آوازیں دی ہیں
یہ تو تُمھی ہو
جو میرے لمحے لمحے کو گن گن کر رکھتے ہو
اور اکیلے چپ لمحے میں
میرے گھر کے بند دروں کے شیشوں میں
تم اپنی جھلکی چھوڑ کے
چھپ جاتے ہو!

نویدِ صُبح

میرے شہر میں آج خلافِ موسم یہ رونق سی کیوں ہے؟
شاید آج کی صبح
تمھاری گاڑی
میرے شہر کے اسٹیشن سے گزرے گی

میں نہ سہی
پر میرے شہر کی سبز زمیں اور نیلا فلک
اور سونے جیسی دُھوپ لُٹاتا سورج
اور آنکھیں ملتے ہنستے گاتے پھولوں کی خوشبوئیں
اور اُتھری چہکتی پیاری چڑیاں
تم کو دیکھ سکیں گی!

غدار

میں نے اپنے آپ کو تم سے ہاتھ ملانے سے کیوں روکا ہے!
میں نے اپنی آنکھوں پر کیوں تم کو نہ تکنے کی پابندی
عائد کی ہے!

لیکن میری رُوح پہ میرا زور نہیں ہے
یہ کیوں میری قید میں آ نہیں جاتی
اور اب تک تم کو سوچے جاتی ہے

یہ تو نہیں ہونا چاہیے

میں تو اپنے آپ کو لاکھ بکھیڑوں میں اُلجھاؤں
تم سے بچھڑ کر
سُکھ کی دھوپ نہانا چاہوں
چین کی چاندنی پانا چاہوں
لیکن آج بھی تیرا گہرا سایہ
میرے سب آفاق پہ چھا جاتا ہے

کامیابی

"— اب تو میں نے تُم کو بُھلا دیا ہے!"
"اب تو میں نے تم کو بُھلا دیا ہے!! —"
سوتے جاگتے ہر ہر لمحہ، ہر ہر دن
میں ایک ہی جملہ دہراتی ہوں!

گرفت

آخر ایک طویل مسافت طے کر لی
تو وہ لمحہ میرے ہاتھ آیا
جس میں میرے دُشمن
[وہ سب لوگ
جنھوں نے تم پر ڈاکا ڈالا
اور تمھارے پیار کا زیور
جو میرا حق تھا
میرا حصّہ تھا
تم سے چھین لیا تھا
آج وہ میرے دشمن لیکن تم کو پیارے لگنے والے
وہ سب تیرے اپنے]
مجھ کو بھی اچھے ہی لگے ہیں!

ایوب خاور

زندگی اور موت کے درمیان ایک نظم

زندگی!

ہم تیری دہلیز پہ آبیٹھے ہیں
ہاتھ میں کاسۂ تدبیر ہے، آنکھوں میں کسی موسمِ گل رنگ کی خواہش ہے
لبوں پر ترے بے مہر زمانوں کے لیے شکوے ہیں

اِک ذرا دیکھ کہ ہم نرم مزاجوں کے لیے
کون سی رات ہے جس رات کے آنچل میں ہوا
خواب کو آئینۂ خواب میں سر کرتی ہے
کون سا دن ہے کہ جس دن کا ظہور
حرفِ دل کے لیے صحرائے تمنّا کا سفر کرتا ہے
اِک ترے لمس کی خاطر ہم نے
خیمۂ دل میں جلائے تیرے ہونے کے چراغ
ہاں مگر کوئی سراغ
تیری آہٹ، تیری آواز، قد و قامت و خوشبو کا سراغ
اک ذرا دیکھ، کہاں ہم ہیں، کہاں تیرے چراغ

زندگی!

ہم تیری دہلیز پہ آبیٹھے ہیں
ہاتھ میں کاسۂ تدبیر لیے
زندگی! —— ہم تیری دہلیز پہ آبیٹھے ہیں

ملال کی ایک رات

کچھ نہیں ہے
میرے آئینہ و مہتاب و سبُو خالی ہیں
صفحۂ دل کسی معتوب شہنشاہ کی مسند کی طرح
حرمتِ لفظ و معانی بھی گنوا بیٹھا ہے
خطۂ عمرِ معلّق ہے وجود
عالمِ ہجر میں زنجیر ہے یہ خلوتِ ذات
آئینہ —— بابِ ندامت ہے

اور اس بابِ ندامت سے گریزاں میرا عکسِ متردّد
عرصۂ وقت کے آنگن میں کوئی شاخِ سحر ہے نہ کوئی شامِ جمال
مگر اک رنگِ ملال

لوحِ مہتاب سے اُترے کوئی صبحِ تحریر
مگر اس دشتِ شبِ رزم کے سنّاٹے میں
وہ اندھیرا ہے کہ اِن ہاتھوں سے گرتے ہوئے لمحے نہیں روکے جاتے
چشمِ حیراں پہ برستے ہوئے نیزے نہیں روکے جاتے

ایک اندوہِ مسلسل کے سوا
برزخِ جاں میں کوئی سنگِ سزا ہے نہ کوئی ساعتِ اجر
سطرِ آئندہ! تجھے حرفِ ملامت سے کیا ہے آغاز

حمید یورش

رمق

یہ ایک حلقۂ آہن گرفت کیسا تھا؟
..... یہ ایک اور ہے .... ایک اور .....
..... ایک اور بھی ہے!

میں اپنے جسم کے اعضاء کو چھُو کے دیکھتا ہوں
یہ کیا عذاب ہے؟
... آکاش بیل؟
... اکٹوپس؟؟
مرے بدن کی توانا بہار سطحوں پر
فشارِ خون کی بُن دی ہے جس نے نیلاہٹ؟

اکڑ رہا ہے مرا جسم ایک ہی کروٹ
تو کیا ....؟ .... تو کیا؟؟
مرے دماغ میں اک خوف سنسناتا ہے
میں اپنے جسم کو دوبارہ چھُو کے دیکھتا ہوں

..... یہ معجزہ ہے
کہ اِک لہر منتقل جو ہوئی
مرے بدن سے مری انگلیوں کی پوروں میں
وہ زندگی کی رمق تھی، حرارتِ خوں تھی!

ثمینہ راجہ

مجھے فراقِ ماہ ہے

مرا وجود پھنک رہا ہے ایک زرد آگ میں
مجھے جلا رہا ہے سر سے پاؤں تک بخارِ دل
روایتوں کی میرے گرد خشمگیں سپاہ ہے
مجھے فراقِ ماہ ہے

وہ لب بہت ہی دور ہیں، مرے نصیب میں کہاں
وہ آستیں کہ جس میں آفتاب ہو چمک رہا
مرے خیال سے ورا وہ شبنمیں نگاہ ہے
مجھے فراقِ ماہ ہے

یہ دشتِ ہول کا سفر، یہ حبسِ باد، تشنگی
کہ زندگی کی چھانیاں تڑخ رہی ہیں درد سے
وہ کون دیس ہے جہاں پہ میرا کج کلاہ ہے
مجھے فراقِ ماہ ہے

زمان ملک

تیرے نام

تیرے نام میں
ساتوں سورج، ساتوں چاند اور
ساتوں رنگ
ساتوں نور بھرے افلاک
سات زمینیں، سات سمندر، ساتوں در، ساتوں اشجار
ساتوں سُر اور ساتوں خواب

میری تو اتنی آشا ہے
مجھے ملیں تو
ساتوں جیون
گزریں تیرے ساتھ

زمان ملک

نظم

مجھے اک کام کرنا ہے
بہت چھوٹا سا
معمولی سا کوئی کام

جاڑے کی سنہری دھوپ میں
کچھ دیر آنکھیں بند کر کے بیٹھنا ہے
سوچنا ہے
اور خالی ذہن ہونا ہے

کسی جنگل میں جا کر گھومنا
پاتال میں اس کے اُترنا ہے

کسی بادل میں آنکھیں ٹانک کر
کچھ دیر دُنیا دیکھنی ہے دُور سے
اور پھر سے خالی ذہن ہونا ہے

مگر یہ زندگی
ریکارڈ کے
اک اختتامی دائرے پر
گھِستی سوئی کی
اک آوازِ مسلسل ہے
بدلتا ہی نہیں منظر

اِسی ٹھہری ہوئی سوئی کے نیچے
دائرے کی ابتدا اور انتہا ہے
اور گزرنے والا سب کچھ بھی
مسلسل ہے

تسلسل سے نکلنے کا
بہت چھوٹا سا، معمولی سا
کوئی کام ہے مجھ کو

منصورہ احمد

بابا کے لیے ایک دُعا

وہ عکس تمثالِ آئنہ ہے
جو اس کی آنکھوں کی روشنی سے
مری بصارت میں تیرتا ہے
میں کالی راتوں کی ہوں مسافر
مگر کرن کی سفیر بھی ہوں
کہ میرے اندر کی تیرگی میں
وہ عکس، سورج کی طرح، مجھ پہ
شعاعوں کی روشنی بکھیرے
وجود سے میرے، نُور پھُوٹے
شعاعیں، جگنو، شہاب، تارے
اسی کرن کے ہیں استعارے

میں سوچتی ہوں کہ میرا سُورج
غروب ہوگا — تو مجھ کو اس کا
وہ لمسِ روشن کہاں ملے گا
جو خُون کو نُور میں بدل دے
شعاعیں، جگنو، شہاب، تارے
سیاہ پتھر میں ڈھل نہ جائیں
کہیں اندھیروں میں جل نہ جائیں
جب اس دہکتے سمے کا دریا
سیاہ لہروں کی لاش اُٹھائے
اجل سمندر میں جا گرے گا
تو سارے ساحل خموش ہوں گے
ہوا کے شانوں پہ آگ ہوگی

مرے خدایا! — مرے خُدایا!!
جہانِ روشن کی آرزو ہے
تُو میرے سورج کی روشنی کو
کرم سے اپنے دوام دے دے
سبھی طلوع و غروب تیرے
سبھی شمال و جنوب تیرے

حسن عباس رضا

بشارت اب سوا نیزے تک آ پہنچی

میں جس دن تیسویں دیوار تک پہنچا
تو یادوں کی طرح
پیچھے گزر جاتی ہر اک دیوار نے
مجھ کو صدا دی تھی

میں آج اکتیسویں دیوار پر ہوں
اور اب بھی
میرے کشکولِ سماعت میں صداؤں کے وہ سکّے گر رہے ہیں
جو کسی بازار یا دکّان پر چلتے نہیں ہیں
اور بہت پیچھے کو رہ جاتی
کسی دیوار سے اب بھی صدا آتی ہے
آجاؤ۔ حسن عباس! آجاؤ!!
کہ گلیوں اور بازاروں میں
کھینچے کھیلتی عمریں
تمھیں آواز دیتی ہیں —

تو میں اک جست میں اُن موسموں کو
اُن دنوں کو لوٹ جاتا ہوں
جہاں مجھ سے مرا چنچل سجیلا بچپنا
ایسے لپٹ جاتا ہے
جیسے مدّتوں کے بعد دو بچھڑے ہوئے محبوب ملتے ہیں

——— میں اُس سے پوچھتا ہوں
"خواب ہوتی ساعتوں کی کس گلی میں
میری خوشیوں کا خزینہ دفن ہے ؟"
تو، وہ
مری انگلی پکڑ کر
مجھ کو اک ایسی گلی کے موڑ پر لے کر پہنچتا ہے
جہاں سے دُور تک دکھلائی دیتی ساری گلیاں
ایک دُوجی سے جُڑی اس طرح لیٹی ہیں
کہ جیسے دو بدن پیوست لیٹے ہوں

میں اُن گلیوں میں آوازہ لگاتا ہوں کہ :
"کوئی ہے ——— ؟
اگر موجود ہے تو باہر آجائے
کہ ناموجود لمحوں سے گلے ملنے
حسن عباس آیا ہے
تمھارا دوست آیا ہے"

ابھی میری صدا
گلیوں کے اُجڑے بام و در کو چُوم کر واپس نہیں آتی
کہ ہر گھر کے شکستہ در سے
اُبلے مسکراتے، پھُول چہرے

مجھ سے ملنے کے لیے
گرتے، سنبھلتے، دوڑتے آتے ہیں
میں سب سے گلے ملتا ہوں
اُن کو چُوم لیتا ہوں
وہ مجھ سے
اور میں اُن سے بیت جانے والے ماہ و سال کا
احوال کہتا ہوں
میں جب اُن کو بتاتا ہوں
کہ میں شاعر ہوں
اور حرف و سخن کی بادیہ گردی مری تقدیر ٹھہری ہے
تو وہ ہنستے ہیں
اتنے زور سے ہنستے ہیں
جیسے شہر کے سارے کلیساؤں میں سوئی گھنٹیاں
اِک ساتھ بج اٹھیں - !

وہ کہتے ہیں
کہ تم جیسا کھلنڈرا اور لاپروا
بھلا کیوں شعر کہتا ہے
کہ اب تو شعر کہنا
اک عذابِ مستقل ہے
تم نے کیونکر اس عذابِ جاں ستاں کو
اپنے سینے سے لگایا ہے - "

تو میں اُن سب کی صورت دیکھتا رہتا ہوں
ان سے کچھ نہیں کہتا
نہیں کہتا
کہ لمبی چپ کی وا آغوش
مجھ کو اپنی باہوں میں جکڑ لیتی ہے
اور میں چپ کی بند آغوش میں سمٹا ہوا
خاموش رہتا ہوں
میں اُن سے کچھ نہیں کہتا
اور اُن کا ہاتھ تھامے
خواب ہوتے باغ کی اُس سمت لے چلتا ہوں
جس کی ہر روش پر
میری گزری ساعتوں کے نقش کندہ ہیں
جہیں یادوں کے سجرے باغ میں ہر سُو
گلاب و نرگس و نسرین کے پھولوں پہ بیٹھی تتلیاں
آہٹ اُبھرتے ہی
ہوا کے دوش پر اڑتی، مچلتی، لہرتے لیتی
ہمارے جال ہاتھوں سے پھسل جاتی ہیں
اور ہم مٹھیوں پر پھیل جاتے رنگ
آنکھوں سے لگا لیتے ہیں
اُن کو چُومتے ہیں
—— آنکھ بادل سے برستی بارشیں
میری ہتھیلی پر رکھے تتلی کے رنگوں سے گلے ملتی ہیں
اس باہم رفاقت سے
ہتھیلی پر مرے بچپن
مرے ہمزاد کی تصویر ابھرتی ہے
میں اس کو دیکھ کر روتا، سسکتا ہوں
—— اسی اثنا میں میرے یار سارے
تتلیوں کو قید کرنے کی مسلسل کوششوں سے تنگ آ کر
میری جانب لوٹ آتے ہیں
مجھے روتا، سسکتا دیکھ کر ہنستے ہیں
اتنے زور سے ہنستے ہیں
جیسے شہر کے سارے کلیساؤں میں سوئی گھنٹیاں
اک ساتھ بج اٹھیں -
وہ مجھ کو قہقہوں کے درمیاں
میداں کی جانب لے کے چلتے ہیں

یہاں سب پھول ہاتھوں میں
پتنگیں اور رنگلی چرخیاں ہیں
اور میں اُن میں گھرا
رنگیں پتنگوں کو
کھُلی روشن فضا میں پینچ لڑتے، اور کٹتے دیکھتا ہوں ——
—— میرے ہاتھوں میں بھی اب
مانجھا لگی اک ڈور کی چرخی ہے
اور میری پتنگ اڑتی
ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی دُوجی پتنگوں سے
گلے ملتی
فلک کی وسعتوں میں تیرتی ہے
دفعتاً اک پیچ لڑتا ہے ——
مری مانجھا لگی ڈور اب مرے ہاتھوں پہ
اتنی تیز رفتارانہ چلتی ہے
کہ جیسے ماؤں کی آغوش سے نکلے ہوئے بچے
بڑھاپے کے سمندر تک پہنچ جاتے ہیں ——
—— اور پھر دفعتاً انگشت میں یوں ڈور کھُبتی ہے
کہ جیسے اپنا خنجر
اپنے سینے میں اتر جائے ——
مرے پنڈے میں سسکاری ابھرتی ہے
میں سسکی لے کے چاروں سمت تکتا ہوں
وہاں کوئی نہیں ہے !!
اب نہ ہاتھوں میں پتنگیں ہیں
نہ پیاروں
اور یاروں کے شناسا پھول سے چہرے ——
—— میں اب تنہا کھڑا
خود کو جوانی سے گلے ملتا ہوا محسوس کرتا ہوں
مگر میں پھر بھی تنہا ہوں
بہت تنہا —— !!

اچانک خواب ہوتے پردۂ سیمیں پہ خواہش رنگ
تصویریں اُبھرتی ہیں ——
—— کسی کو چاہنے
اور چاہے جانے کی تمنّا
میرے دل آنگن میں
کلیوں اور غنچوں کی طرح
انگڑائی لیتی ہے، چٹکتی ہے ——

مری خوش قسمتی
میری ازل تنہائی کو یوں ڈھانپ دیتی ہے
کہ جیسے ماں کی ممتا
لاڈلے بچوں کے سب عیبوں پہ پردہ ڈال دیتی ہو ——
مجھے شہرِ جفا میں
چاہنے، اور چاہے جانے کی تمنا ہی نہیں رہتی
کہ مجھ سے اتنی بے پایاں محبت
اور چاہت آن ملتی ہے
کہ پھر کوئی تمنّا، کوئی خواہش ہی نہیں کھِلتی ——

گلابی عمر کی روشن جبیں شہزادیوں
کومل سجیلی لڑکیوں کی ہاتھ ریکھاؤں پہ
میرا نام روشن چاند کی صورت دمکتا ہے
دھنک کے رنگ میں ڈوبے ہوئے پیراہنوں کا شامیانہ
میری پیاسی آنکھ کے صحرا میں کھُلتا ہے
تمنّا، دُودھیا جسموں کی
صورت میرے آنگن میں اترتی ہے
مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ گویا میں مقدر کا سکندر ہوں
کہ جس دم بھی جسے چاہوں
اُسے زیرِ نگیں کر لوں ——

—— مگر ——
حیران کن خوشیوں کے ہوتے بھی
مری تنہائی مجھ پر غالب آتی ہے
مری بے چینیاں
میرا تجسس
ساحلِ امید کی جانب نگاہیں وا کیے
بُت کی طرح استادہ رہتا ہے ——

میں سنتا ہوں
کہ رس ٹپکاتی شہد آگیں صداؤں کی جگہ
اب شہر کی گلیوں میں
بازاروں ، محلوں میں
برستے تازیانوں کی کرخت ، اور خوف پھیلاتی صدا کی
حکمرانی ہے ——
سجل جسموں سے اب خوشبو نہیں اُگتی
کہ وحشت بال کھولے
کوچہ و بازار میں
دہشت ملی بارود کی بدبو اگلتی ہے ——

مرے یارو
مرے پیاروں کے نامے
شہرِ مسکن سے نہیں
زنداں سے آتے ہیں
کہ سارے قاصدوں نے
بیعتِ جبر و ستم کر لی ——
مری بے چینیوں
میرے تجسس کا سمندر
لمحہ لمحہ ایسے طوفانوں کی زد پر ہے
جو تم نے ڈالی ساعت کی سبھی طغیانیوں کے بعد

کالی رات کا
کالا مقدر ہیں —— !

مرا بچپن
جوانی کی سجل انگشتری میں وہ نگینہ ہے
وہ آئینہ ہے
جس میں اچھے موسم
چاند جیسے اُجلے منظر دیکھ لیتا ہوں
—— وگرنہ ——
ہاتھ کی ریکھاؤں میں
میرے مقدر کا سکندر
فاتحینِ وقت کے اُس فیصلے کا منتظر ہے
جس کے بعد
آواز کا روشن ، جگر سوز سورج
سیہ شب کی اندھیری گود میں گر جائے گا !! ——
لیکن
سیہ شب مختصر ہے ——
اُس کی کالی کوکھ سے
میری تمناؤں کا
وہ سورج بھی اُبھرے گا
جو میری
اور تمھاری آرزوؤں کے گلابوں کو
سجل رنگینیاں دے گا
وہ سورج تو بہت نزدیک ہے
اُس کی بشارت
اب سوا نیزے سے بھی نزدیک تر ہے
اور بھی نزدیک تر
نزدیک تر ——

ماہ طلعت زاہدی

خواب در خواب

دل کی دھڑکن میں اُتر کر
دھیان کی لہروں میں چل کر، رات دن
دیکھا کیے ہم خواب
خواب میں دیکھیں بہت دلدار شامیں
آرزو کے خون سے دہکی ہوئی
وصل سے مہکی ہوئی
دلدار شامیں، جنکی صبحیں
خواب میں بُنتی رہیں زرتار ریشم سے
جمالِ زندگی کے دائرے

زندگی کے دائرے میں
خواب کا آہنگ جس دن آ گیا
سوچتی ہوں
یہ طلسمِ نغمہ گر آفاق کی دھڑکن بنا
کون سی قوسِ قزح کی چھاؤں میں
مہکا کریں گے اُس گھڑی کے خواب

کس قدر سرشار ہوں گے
فصلِ آئندہ کی ٹہنی پر جھکی بدلی کے خواب
حلقۂ نورنگ میں آراستہ بستی کے خواب

بھری بہاریں

گھنے درختوں کے سائے
مہک شگوفوں کی
شباب رنگ نظارے
طلسمِ نور و جمال
اندھیری رات کے صحرا میں چاندنی کا بدن
ہمارے خواب
ہماری محبتوں کا وصال

یہیں پہ
دیدہ و دل کے اِسی جزیرے میں
پہاڑ ضبط کے انگڑائی لے کے جاگیں گے
ہمیں نکالیں گے اُن سے
غموں میں گونجتی نہر
پھر اُس کے بعد
بس اِک ضرب اور
سناٹا ——

کہانیاں یہ ہماری اور اگلے لوگوں کی
بھری بہار میں کوئل ہمیں سناتی ہے

افتخار بخاری

ایک دن

ا صل سی ان عمروں کا حاصل
ید کوئی دن اپنا بھی ہوگا
دابوں اور سرابوں کی بے انت
سافت تعبیروں کے چشمے پر
نہ دھوئے گی
کسی پرانی یاد میں آنکھ
بہت روئے گی
وہ دن تیرا ہوگا
صحراؤں صحراؤں بھٹکتی بے معنی
آوازیں
سبز رُتوں کے راگ میں ڈھل کر
گونجیں گی
کسی بھُولے بسرے گیت کو
ڈھونڈیں گی
وہ دن میرا ہوگا
بستی سے دُور افق پر تیرنے والے
سوچ کے بادل
منظر منظر سکھ کے سائے
لہرائیں گے
رنگوں والی بارش ہوگی
ہجر و وصال کی عادی آنکھیں
ایک نیا موسم دیکھیں گی
وہ دن تیرا میرا ہوگا

لاحاصل سی ان عمروں
کا حاصل شاید
کوئی دن ایسا بھی ہوگا
(عمان)

صفدر صدیقی رضی

نارسائی

کھجور کے اِک درخت سے
قطرہ قطرہ
کچی زمین میں
رس بھری کھجوروں کی میٹھی مہکار
جذب ہونے لگی
تو ننھے سے ایک بچے نے
سنگ اُٹھا کر
کھجور کی شاخ کو اچانک ہدف بنایا
وہ سنگ اس شاخ تک
پہنچنے سے پیشتر
اُس کی دسترس کی حدود میں
خود ہی لوٹ آیا
اسی طرح بار بار بچے نے اپنی وقعت کو آزمایا

کھجور کا پیڑ اپنی رفعت پہ ہنس رہا تھا
وہ بھولا بچہ بھی اس کے پہلو کی دھوپ میں
اپنی نارسائی کا زخم کھا کر
نہ جانے کس وقت سو گیا تھا

یہ نظم اس شعر سے ماخوذ ہے

چُو ٹھے دی اٹناتی ایویں جیویں رُکھ کھجور
دُھپ لگے تے چھاں نہ دیندا بھکھ لگے پھل دُور
(میاں محمد بخشؒ)

احمد لطیف

ٹوٹتے لمحوں کے ساتھی

چلو سورج نکل آیا تو دھوپیں
اپنی اپنی جیب میں بھر لیں
کہ سارے اُڑتے پانی گھاٹ میں ہیں
چلو کچھ خوشبوئیں ڈبیوں میں ہی رکھ لیں
کہ آنے والی نسلوں کو کوئی تحفہ تو دینا ہے
مگر آنسو
جو اپنے ٹوٹتے لمحوں کے ساتھی ہیں
انھیں بھی ساتھ لے لینا
مگر ان کا تعارف
آنے والی مہرباں آنکھیں
خود اپنے علم سے کر لیں
خود اپنے کشف سے کر لیں
تو اچھا ہے
ہمیں دو لفظ بھی مہنگے پڑیں گے

جھموں جھموں اک احساس

لال گلابی جسم نہ ہو جائیں "ٹھر"[1] کو نیلے
جنگل کی شاخوں سے حرارت کھوجنے نکلے
بستی کے سب گبھرو
لیکن اب کے سرمارُت نے
دستک دیے بغیر گھروں میں ڈیرے ڈالے
گلیوں گلیوں برف کے تودے
کمرہ کمرہ قیدی پنڈے
قیدی آنکھیں
کیسی سرد سزائیں کاٹتے عمر گنوائی
جھموں جھموں یہ احساس
کہ سرد زبانیں، اپنا "ہونا"
چاٹ نہ جائیں ــــ
لیکن جب اُمیدوں کی ریتوں پر
دھوپ بکھرتی ہے
تو یوں لگتا ہے
جیسے کسی گلابی موسم کے ساحل پر اُترا ہوں

[1] پنجابی۔ ٹھٹھر کر

خاور اعجاز

ہجرت

تُو زمیں ہے
مری صدیوں کی شناسا
مجھے انکار نہیں تھا اس سے
میں سمندر تھا
مگر تیرے ہی دامانِ محبت کی کشش سے قائم
لیکن اک چودھویں شب
تیرے پندارِ محبت نے وہ صدیوں کی کشش
ایک لمحہ کے لیے کم کی تھی
بس اُسی رات سے میں چاند میں آ بیٹھا ہوں

بے جہت لوگ

ہم سبھی
سڑکوں کے سنگِ میل بننا چاہتے ہیں
دوسرے پتھر سے تھوڑے فاصلے پر ایستادہ
اور اُس پتھر پہ لکھّے
چند ہندسوں سے اکائی میں زیادہ
پر کسی میں اتنی ہمّت ہی نہیں
جو زندگی کے دھوپ چوراہے پہ وہ پتھر بنے
جس پر ہماری سایہ افگن منزلوں کے نام اور دُوری لکھی ہو

جعفر رضا

وہ چند لمحے

وہ چند لمحے رفاقتوں کے، صداقتوں کے
جو تم نے بخشے، تمھیں مبارک
مرے لیے لکھ دیا گیا ہے فراق بستی میں
فاصلوں کا عذاب سہنا
مگر تمھیں دوش دوں تو کیسے
تُمھی نے تو آشنا کیا تھا مجھے خزاؤں کے رتجگوں سے
تُمھی تو ہو، پھول رُت میں جس نے وصالِ شبنم کی ساعتوں کا
وہ کیف بخشا کہ جس کے نغمے میں کھو چکا تھا
تُمھی نے شوریدہ سر وہ جذبے جگا دیے تھے
تھپک تھپک کر جنھیں سُلایا تھا کا دنوں سے
وہ سارے نغمے
وہ سارے جذبے
جو میں نے سینچے تھے آنسوؤں سے
تمھاری آنکھوں میں بس رہے ہیں
خیال رکھنا
کہ کھو نہ جائیں یہ آرزوئے جہانِ نَو کے گلاب جذبے

جاوید انور

تیسری جہت

میں فٹ پاتھوں کا پروردہ ہوں
میرے ہاتھ
گندی نالیوں میں سے بھی
"سکے" ڈھونڈ لاتے ہیں
میں تانبے کی چھتوں پر گرم دوپہروں کا پالا ہوں
پتنگیں لوٹنے والوں میں سے ہوں
اور
پتنگیں لوٹنے والوں کی نظریں تیز
لمبے ہاتھ ہوتے ہیں!

آفاق احمد

ہتھیار ڈالنے کی نظم

تمھیں خبر ہے
کہ رات بادل جو آسمانوں میں
میری اپنی گواہیوں کی عقوبتوں میں گھرا ہوا تھا
کئی اکیلی مسافتوں کا پیامبر تھا

وہ سایے رستے
جنھیں زمینوں کی بانجھ کوکھوں میں میں نے بویا تھا
(جن پہ تیرے لبوں کی نرمی نے
اک شجر کے رسیلے موسم کو پاس آنے کی رسم بخشی)
اُداس جنگل کی سوکھی خواہش پہ جا رُکے ہیں

یہ فاصلوں کا سراب دیکھو
کہ اِس نظر میں جو ایک پودا بسا ہوا تھا
وہ اِک تھکن تھا —
جو نارسائی کے سنگریزوں پر اپنی کائی کا علم بنا کر
تمام جنگوں میں سُرخرو تھا
وہ ایک لمحہ تلاش کر لوں
جو بند پلکوں — رُکے لبوں میں
میری سپر کو گرا گیا تھا
وہ ایک لمحہ خراج ہو گا شکستہ پائی کے اُس الم کا
جو دشمنی کی طویل چھاؤں کی نیلی رنگت میں میرے اندر
لہو کے کاندھے پہ ہاتھ رکھے
مجھے دلاسے کے خارزاروں میں زندگی کے کٹے لبوں سے
اُداس سانسیں کشید کرنے کی ہمتوں سے
نواز دے گا

صدیق منظر

جنگل کی رات

تُو میرا سُورج سپنا ہے
میں راتوں کی راکھ
تُو ہے تیز ہوا کی دستک
دھڑکن دھڑکن تیری دھاک
میں ڈوبی سانسوں کا ساحل
مجھ پر لحظہ لحظہ اُترے
سناٹوں کی چاپ
تُو صدیوں کی ایک صدا، میں خاموشی کی خاک
تیرے نام پہ کھُل جائے گا پھر سے صبح کا باب
تیرے نام لکھی جائے گی شہر کی روشن شام
میرے حصے میں آئے گی
پھر جنگل کی رات
کون سُنے گا میری بات!

ناہید ظفر

او، میری، گو!٭

میں ہوں ایک میری
وہ میری کہ اس نے جسے
آنے والے سبھی برف و باراں کے طوفاں سے آگاہ ہو کر
سوچی سمجھی ہوئی چال سے
کھیت میں چرنے والے سبھی جانور
لے کے آنے کو بھیجا تھا
میں برف میں، سخت سردی کے طوفان میں گھر گئی ہوں
مری ہڈیاں چالبازی کی یخ بستہ تہہ میں
چٹخ سی گئی ہیں
نہ جانے وہ کب زرد رو لالٹینیں لیے
میری ٹھٹھری ہوئی لاش کو ڈھونڈنے
اپنے گرم اور محفوظ کمرے سے نکلے
وہ نکلے، نہ نکلے
مجھے کیا پتہ
کل گجر دم
ہری جھیل کے نرم پانی پہ میرے سنہری چمکتے ہوئے بال
سورج کی کرنوں میں
دیکھیں، نہ دیکھیں
مگر یہ بھی ممکن ہے، وہ
پھر کسی اور میری سے بیزار ہو کر
اسے کھیت میں چرنے والے سبھی جانور لے کے آنے کو بھیجے -!

وزیر بی بی

پورے قد کی سوہنی جٹّی
کالی آنکھوں والی
پنکھڑیوں سے ہونٹوں والی
لمبے بالوں والی
ہات لگائے میلی ہووے
ایسا روپ سنگھار
پلکوں کی جھالر کے پیچھے
سپنوں کی یلغار
ہات میں شب بھر بجنے والی
چوڑی کی جھنکار
اُجلی اُجلی دھوپ میں جیسے
چڑیوں کی چہکار
ایسا روپ سنگھار
کیسے مٹی مٹی ہو گئی
جیسے گئی بہار!

٭ SANDS OF DEE سے متاثر ہو کر

نظمیں | اختر

داخلِ دفتر

کھُلی آنکھ دیکھا عجب شہر ہے
چار سُو کاغذی زرد چہروں کی دیوار ہے
کاغذی زرد چہرے!
رقم جن کی پیشانیوں پر
تہی دست کچلے ہوئے سرد ماضی کی تاریخ ہے

کہیں کاہشِ زخمِ بے سُود کی سسکیاں ہیں
کہیں شب گزیدہ بُجھے چاند تاروں کے مدفن بنے ہیں
کہیں ڈائنیں صف بہ صف
اپنے کشکول تھامے ہوئے چیختی ہیں
ہمیں خون کی بھیک دو
خون کی بھیک دو

میں ایک آئینہ تھا
مری رُوح شفاف پانی کی مانند بے داغ تھی
میں نے چاہا
جلے کاغذی زرد چہروں کی دیوار کو
زندگی بخش دوں
صف بہ صف چیختی ڈائنوں کے دہن چیر دوں
میں نے دیکھا
میرا جسم بھی کاغذی ہے
مرے زرد چہرے پہ کچلے ہوئے سرد ماضی کی تاریخ
مرقوم ہے
میں جلے کاغذی زرد چہروں کی دیوار کے سائے میں
کاغذوں کا کفن اوڑھ کر سوگیا

دھرتی کا زخم

یہ دھرتی
یہ ننگی دھرتی
میں نے جس کی اندھی کوکھ میں تارے بوئے
اور اندھیارے کاٹے ہیں
میرے لہو کو چاٹ رہی ہے

میں نے تو سوچا تھا
میری بیوی کا میلا آنچل
ایک سنہرے خواب کی صورت لہرائے گا
میری شریانوں سے رِستی
میری محنت کے حاصل سے
میرے ننھے بالک کو بھی دُودھ ملے گا
میرا گھر
جو میرا نہیں ہے
اک دن میرا ہوجائے گا

مجھ کو کیا معلوم تھا
میری آشاؤں کے جھل مل موتی
میرے خوابوں کا سرمایہ
گوداموں کی اندھی اور تاریک گپھا میں کھو جائے گا
میری بیوی کا میلا آنچل
کچھ اور بھی میلا ہوجائے گا
میرا ننھا مُنا بالک
روتے روتے سو جائے گا

سالگرہ

مسعود مفتی

آج میری سالگرہ ہے۔

بچپن میں سالگرہ کا تصور ہے پارٹی، تحفے، پھول اور غبارے۔

جوانی میں سالگرہ کا تصور ہے گھاتیں، ملاقاتیں، باتیں اور مرادیں۔

اس کے بعد سالگرہ زندگی کے سفر کی سنگ میل ہے جو وقفے وقفے کے بعد مسافر کو بتاتی ہے کہ زندگی کے سفر کا اتنا فاصلہ طے ہو چکا ہے۔ اگر انسان کی اوسط زندگی کو ساٹھ برس کا تصور کیا جائے تو میں آج قریباً تین چوتھائی سفر پورا کر چکا ہوں —— اور اب صرف ایک چوتھائی باقی رہ گیا ہے۔

کوئی بھی سفر ہو اس کی آخری چوتھائی کا مطلب ہے کہ سفر ختم ہونے کو ہے اور اختتامی مراحل کا آغاز ہو رہا ہے۔ مسافر کی ذہنی کیفیت بدلنے لگتی ہے۔ وہ اپنا بکھرا ہوا سامان سمیٹنے لگتا ہے۔ اگلی منزل کا تصور ابھرنے لگتا ہے۔ پچھلے سفر کی یادیں گویا سامان اور شخصیت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اس کا دامن سفر کے تجربوں سے بھر ہوتا ہے اور ذہن میں اتنا مواد ہوتا ہے کہ تجزیہ کر کے کوئی مجموعی نظریہ قائم کر سکے۔

اسی وجہ سے میں نے فیصلہ کیا کہ اس دفعہ سالگرہ لوگوں کے ہجوم میں نہیں مناؤں گا بلکہ سابقہ تجربوں کو یاد کر کے آئندہ زندگی کے متعلق کچھ سوچوں گا۔ چنانچہ بیوی بچوں کو میں نے عزیزوں کے ہاں بھیج دیا جہاں سے وہ رات کا کھانا کھا کر اور فلم کا آخری شو دیکھ کر لوٹیں گے۔ خود میں نے اپنے کمرے میں موسیقی کے بہت سے ریکارڈ اور ٹیپ رکھے۔ کافی، چائے اور دیگر مشروبات کا ذخیرہ رکھا۔ سارے اخبار، رسالے اور کتابیں کمرے سے نکال دیں کیونکہ میں پڑھنا نہیں چاہتا، صرف سوچنا چاہتا تھا —— اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

میرا کوئی خاص پروگرام نہ تھا۔ نہ ذہن میں کسی خاص چیز کو سوچنے کا پروگرام تھا۔ نہ کسی خاص یاد سے گلے لگنا تھا بلکہ ارادہ تنہائی اور محض تنہائی کا تھا۔ جس میں اپنی ذات کو چند گھنٹوں کے لئے اپنی ہی سنگت دینا تھا۔ اس سنگت سے چاہے خود کلامی نکلے، چاہے خود ملاقاتی، یا خود آرائی —— چاہے من میں ڈوبوں، چاہے خالی الذہن ہو کر بیٹھا رہوں —— یا پھر بور اور محض بور ہوتا رہوں —— اور اسی طرح اونگھ کر سو جاؤں۔

کھڑکیاں بند کر کے میں نے پردے کھینچ لئے —— کمرے میں نیم تاریکی چھا گئی —— صبح، دوپہر اور شام باہر ہی بند ہو گئے۔ اور اب دن بھر کمرے میں ایک ہی نیم تاریک وقت رہے گا —— ستار کا طویل ریکارڈ دھیمے سروں میں گونجنے لگا۔ میں سگریٹ نہیں پیتا مگر اکثر اپنے پاس رکھتا ہوں۔ اور جب کسی خاص ذہنی کیفیت میں ہوتا ہوں تو سگریٹ سلگا لیتا ہوں۔ چنانچہ ایک سگریٹ سلگا کر میں صوفے میں دھنس گیا۔

تھوڑی دیر تک تو مجھے کمرے کے باہر کی آوازوں کا احساس رہا جیسے کسی کار کا ہارن۔ کسی پرندے کی آواز —— کسی چیز کے گرنے کی آواز —— کوئی پُرشور سکوٹر —— مگر ہولے ہولے یہ سب کچھ غروب ہونے والے سورج کی طرح بے خبری کے اُفق کے پیچھے چھپنے لگا —— اب فقط میں تھا —— ستار کے سُر تھے —— سگریٹ کا دھواں تھا —— اور تھما ہوا وقت تھا۔

میری آنکھیں بند تھیں ــــ اور ذہن جیسے کسی دھند میں ڈوب رہا تھا ــــ اس کے خطوط دھندلا گئے تھے ــــ شعور، در تحت الشعور دھوئیں کے مرغولوں کی طرح گڈمڈ تھے۔ اور میری ساری حیات گویا خواب کے سے عالم میں رینگ رہی تھی۔

آہستہ ــــ بہت آہستہ ــــ ہولے ہولے ــــ کسی سائے کی طرح ایک یاد ایسے اُبھری جیسے بادل کا کونہ دھیرے سے سورج پر سے سرک جاتا ہے ــــ یا کھڑے تالاب کی سطح پر کوئی پتہ بہت ہی ہولے ہولے تیرتا ہوا آپ کے سامنے آجاتا ہے ــــ اسی ناقابل بیان غیر محسوس انداز میں جس میں یادیں ابھرا کرتی ہیں ــــ نہ ہم انھیں آواز دیتے ہیں۔ نہ کوئی اور انھیں دھکیل کر سامنے لاتا ہے۔ پھر بھی ہوا کے مدھم جھونکے کی طرح وہ خود بخود ہی لہرا جاتی ہیں۔

سفید، مہربان، معمر اور مشفق چہرہ جسے چند سال پہلے میں جاپان میں ملا تھا۔ گول تراشی ــــ چھوٹی آنکھیں ــــ چپٹی ناک ــــ منگول نقوش کا جاپانی چہرہ۔

جاپان میں ہمیں مختلف ادارے اور فیکٹریاں وغیرہ دکھا رہے تھے۔ پچاس سال پہلے ایک شخص نے ٹوٹی ہوئی دکان میں بلب بنانے کی چھوٹی سی فیکٹری بنائی۔ اور اب وہ کئی کمپنیوں کے اس گروپ کو چلاتا ہے جو ٹیلی ویژن اور الیکٹرانک آلات بناتی ہے ــــ دوسری بہت بڑی فرم جو پہلے ایک شخص کی چھوٹی سی دکان تھی۔ اور اب ترقی کرتے کرتے کئی ممالک میں پھیلی ہوئی کمپنی بن گئی ہے ــــ ایک معمولی سا اکاؤنٹنٹ جس نے اپنی ذہانت کا اچھا استعمال کیا اور اب ایک بڑے ادارے کا مالک ہے۔

وہ قدم قدم پر ہمیں ایسی مثالیں دکھا رہے تھے۔ جہاں ایک فردِ واحد کی ہمت اور لگن سے بڑے بڑے ادارے بن گئے۔ ہم بہت متاثر ہوئے تھے میں نے گائیڈ سے ویسے ہی سوال پوچھ کر آپ نے ہمیں صنعت کے میدان میں تو ایسی بہت سی مثالیں بتا دی ہیں جہاں فردِ واحد نے معجزے کئے۔ مگر کیا یہ دستور صرف انڈسٹری میں ہی ہے یا جاپان کی زندگی کے کسی اور پہلو میں بھی ہے؟

"مثلاً؟" وہ پوچھنے لگی۔

"مثلاً اخلاقی میدان میں۔"

"معاف کریں میں سمجھی نہیں۔"

"میرا مطلب ہے انسانی بھلائی کے لئے۔"

"جی ہاں ہمارے پاس کئی ادارے ہیں۔ میں سرکاری سرکاری طور پر تو آپ کو کئی دکھا سکتی ہوں لیکن اگر آپ واقعی ایک اچھی مثال دیکھنا چاہتے ہیں تو میں اپنے طور پر ــــ یعنی غیر سرکاری طور پر ــــ آپ کو ایسے ادارے میں لے جاؤں گی جس سے میں خود بھی تھوڑی سی وابستہ ہوں۔"

ہم راضی ہو گئے۔

جہاں وہ لے گئی۔ وہاں اُس پینسٹھ سالہ معمر جاپانی سے ملاقات ہوئی ــــ جس کا نام نشی موتو تھا۔ اور جو انتہائی عاجز اور منکسر المزاج انسان تھا۔ وہ ہمیں اس کے گھر لے گئی تھی۔

وہ باہر سے اچھے متمول آدمی کا گھر لگتا تھا۔ ہم گھر کے اندر تو نہیں گئے مگر اس کے باہر کی طرف ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے سامنے ایک بورڈ لگا تھا ــــ جاپانی ــــ مگر لڑکی نے بتایا کہ اس کا مطلب ہے "ادارۂ خدمتِ خلق"۔ اور پھر اس کے مالک سے ہمارا تعارف کرایا۔

اس نے پہلے مخصوص جاپانی انداز میں ہمیں جھک کر خوش آمدید کہا اور پھر ہمارے انداز میں ہم سے ہاتھ ملائے۔

ہم نے جوتے اتارے۔ لکڑی اور کاغذ کا دروازہ کھسک کر ایک طرف ہو گیا اور ہم ننگے پاؤں صاف ستھرے لکڑی کے فرش پر چل کر اندر گئے۔

چھوٹا کمرہ جس کے ایک طرف تتامی چٹائیاں بچھی تھیں۔ ان پر چھوٹا سا لکھنے کا ڈیسک۔ ایک کونے میں ویسے ہی ڈیسک پر ٹائپ رائٹر۔ اور

دیوار کے ساتھ فائیلیں رکھنے والے لوہے کے دراز۔

یہ اس دفتر کی پوری کائنات تھی۔ تمام چٹائیوں پر چند گدیاں پڑی تھیں ہم بھی ان پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ جاپان میں زیادہ تر فرشی نشست ہی ہوتی ہے۔

دھیرے دھیرے، رک رک کر، شرمیلے انداز میں اور مبالغہ آرائی سے پرہیز کرتے ہوئے ہمیں ادارے کے معمر مالک نے ادارے سے روشناس کرایا۔ ادارہ بیس سال سے کام کر رہا تھا۔ اس کی رُوحِ رواں فردِ واحد یعنی اس کا مالک تھا۔ مقصد لوگوں کی خدمت کرنا تھا — کیسی خدمت؟ — جو بھی ادارے کے بس میں ہو — کس قسم کی درخواست لے کر لوگ وہاں آ سکتے تھے؟؟ — جو بھی لوگ چاہیں — درخواست کی نوعیت پر کوئی بندش نہ تھی۔ فقط یہ دیکھنا ہوتا تھا کہ کیا کسی بشر کو کوئی پریشانی ہے اور کیا ادارہ اس کا حل نکال سکتا ہے۔

"بیس سال میں ہم نے سات ہزار پانچ سو چالیس لوگوں کی خدمت کی ہے — ایک ہزار درخواستیں ایسی تھیں جو ہمارے بس سے باہر تھیں۔ اس لئے وہ اس میں شامل نہیں۔"

"کس قسم کی خدمت کی ہے؟" ہم نے پوچھا

"ہر قسم کی۔"

"پھر بھی۔"

"طبی امداد بھی۔ قانونی امداد بھی تعلیمی بھی۔ شادیاں کرائی ہیں۔ شادیاں ٹوٹنے سے بچائی ہیں۔ لوگوں کو روزگار دلایا ہے۔ جھگڑوں میں تصفیے کرائے ہیں۔ گم شدہ لوگوں کو ڈھونڈا ہے۔"

"آپ کی فیس کیا ہوتی ہے؟"

اس نے بڑی انکساری سے نفی میں سر ہلایا۔ "ہماری کوئی فیس نہیں۔ یہ بالکل رضاکارانہ خدمت ہے۔"

"آپ کا بجٹ کتنا ہے۔ سالانہ خرچ اور آمدنی کیا ہے؟"

"ہمارا کوئی بجٹ نہیں۔ ہمیں زیادہ خرچ ہی نہیں کرنا پڑتا۔"

"مگر اس دفتر کو چلانے کے لئے؟"

ہمارے پاس رضاکاروں کی لمبی لسٹ ہے۔ وہ باری باری شام کو ایک گھنٹے کے لئے یہاں کام کرتے ہیں اور یہ ہمارے لئے کافی ہوتا ہے۔ جو تھوڑا بہت کاغذ فائیلوں، خط و کتابت اور فون وغیرہ کا خرچہ ہوتا ہے وہ میں اپنی جیب سے ادا کر دیتا ہوں۔"

"مگر آپ کام کس قسم کا کرتے ہیں؟"

"میں عرض کرتا ہوں —" اس نے حسبِ معمول انکساری سے کہا۔ "بیس سال میں نے مختلف انجمنوں کو ایک چٹھی تحریر کی۔ ڈاکٹروں کی انجمن کو۔ وکیلوں کی انجمن کو۔ تاجروں کی انجمن کو۔ مزدوروں کی انجمن کو۔ انڈسٹری والوں کی انجمن کو۔ غرض جو انجمن بھی میرے ذہن میں آئی میں نے ان کو چٹھی لکھ دی —" وہ خاموش ہو گیا۔

"اس چٹھی میں کیا تھا؟"

بڑی مہمل اور بے معنی سی چٹھی لگتی تھی وہ۔ میں نے لکھا تھا کہ میں خدمتِ خلق کرنا چاہتا ہوں۔ مگر ابھی تعین نہیں کر سکا کہ کس طرح کروں۔ اگر آپ بھی یہی جذبہ رکھتے ہیں تو آیئے مل کر کوئی حل ڈھونڈیں۔ فی الحال آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ جو بھی آپ کا پیشہ ہے، کیا اس کی سروس آپ کبھی کبھار کسی ضرورتمند کو بلا معاوضہ دے سکیں گے — میں کبھی کبھی کوئی ضرورت مند آپ کے پاس بھیج دیا کروں گا اور آپ اس کی بالکل اسی طرح خدمت کریں جیسے اپنی

پیشہ ورانہ آسامیوں کی کرتے ہیں ـــــ، وہ پھر خاموش ہو گیا۔

"پھر؟ ـــــ ردِعمل کیا تھا؟"

"ردِعمل میری توقع سے بہتر تھا ـــــ تقریباً ہر انجمن نے پانچ سات لوگوں کے نام دیئے جو رضاکارانہ مدد کر سکتے تھے۔"

"اس کے بعد؟"

اس کے بعد میں نے یہ بورڈ باہر لگا دیا ـــــ ادارہ خدمتِ خلق ـــــ اور سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ میرے پاس کوئی پروگرام نہ تھا۔ ذہن میں کوئی منصوبہ نہ تھا۔ میرے پاس اتنا روپیہ پیسہ نہ تھا کہ میں کوئی ہسپتال، کالج یا ایسا ادارہ بنا سکتا۔ فقط ایک جذبہ تھا اور تجسس تھا کہ لوگ کس قسم کی مدد چاہتے تھے۔"

"پھر؟"

"پھر ـــــ ایک دن ایک بوڑھی سی عورت نے دستک دی ـــــ ہماری پہلی اسامی ـــــ اس نے پوچھا، آپ کس قسم کی خدمت کرتے ہیں؟ ـــــ میں نے کہا جیسی آپ کو درکار ہے ـــــ وہ ہنسنے لگی ـــــ نہیں مجھے تو کوئی خدمت نہیں چاہیئے۔ میں تو ویسے ہی بورڈ پڑھ کر رک گئی تھی اور سوچا نیا ادارہ ہے۔ ذرا اس کے متعلق معلومات حاصل کروں ـــــ وہ جانے لگی تو میں نے اسے چائے کی پیش کش کی ـــــ وہ خوشی سے مان گئی اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگی ـــــ باتوں باتوں میں ذکر ہوا کہ اس کا خاوند مر چکا ہے اور صرف ایک لڑکا سکول میں ہے اور اسے سمجھ نہیں آتی کہ لڑکے کو کس شعبے میں تعلیم دلائے۔ میں نے اس فہرست پر نظر ڈالی جو انجمنوں کے جواب آنے کے بعد رضاکاروں نے بنائی تھی۔ تو اس میں ایک ماہرِ تعلیم کا نام نظر آیا۔ میں نے اس خاتون کو تعارفی خط دے دیا۔ اور وہ اس کے پاس مشورے کے لئے چلی گئی۔

"پھر؟"

"پھر یہ کہ ـــــ اب وہ لڑکا الیکٹرانک میں ڈاکٹریٹ کر چکا ہے۔"

ہم خاموش رہے۔ مگر وہ بولتا گیا "مگر اس خاتون نے مجھے راستہ دکھا دیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ یہ ادارہ اپنے آپ کو محدود نہ کرے بلکہ لامحدود رکھے۔ ہم یہ نہ کہیں کہ فلاں فلاں قسم کی مدد کریں گے۔ بلکہ لوگوں کی حوصلہ افزائی کریں کہ وہ اپنے مسئلے لے کر آئیں اور ہم اپنے رضاکاروں سے مل کر پوری کوشش کریں کہ کوئی نہ کوئی شافی حل نکل آئے۔ بالکل اسی انداز میں جس انداز میں والدین اپنے بچوں کے مسائل کا حل ڈھونڈتے ہیں۔"

"آپ نے اب تک کس قسم کے مسئلے حل کئے ہیں؟"

ہر قسم کے ـــــ میرے خیال میں کوئی موضوع ایسا نہیں جس سے متعلق مسئلہ ہمارے نہ آیا ہو ـــــ ہمارے ڈاکٹروں نے لوگوں کے علاج کئے ہیں یعنی ان طبی سہولیات کے علاوہ جو حکومت کی طرف سے تمام شہریوں کو حاصل ہیں ـــــ ہمارے وکیلوں نے لوگوں کے مقدمے جیتے ہیں ـــــ ایسے مقدمے جن میں سادہ لوح لوگوں کے ساتھ دھوکے ہوئے تھے ـــــ ہمارے تاجروں نے دامے، درمے اور سخنے لوگوں کی مدد کی ہے ـــــ لائبریریوں میں کتابیں رکھوائی ہیں ـــــ ہونہار لڑکوں کے لئے تعلیمی وظائف دیئے ہیں۔ آگ ـــــ یا ٹریفک یا ڈاکہ زنی یا دھوکہ دہی سے متاثر ہونے والوں کو کبھی مشورے دیئے، کبھی ان کی مدد کی ہے، کبھی ان کو انشورنس کمپنیوں سے حق دلوایا ہے ـــــ جن لوگوں کا کاروبار اچانک ٹھپ ہو گیا، اس میں انھیں مارکیٹ مہیا کی ہے ـــــ ہر قسم کے لوگوں کو قرضِ حسنہ دلائے ہیں ـــــ سینکڑوں میاں بیوی کے جھگڑے ختم کرا کر خاندان ٹوٹنے سے بچائے ہیں ـــــ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ایک دفعہ آپ پر لوگوں کو اعتماد ہو جائے تو وہ کیسے کیسے ذاتی اور نازک انسانی مسائل لاتے ہیں، اور ان کے مسئلے حل کر کے کتنی خوشی ہوتی ہے۔"

"یہ تو آپ بڑا کام کر رہے ہیں" میں نے کہا۔

"میں نہیں ۔۔۔ ہم ۔۔۔ میرا کام صرف اتنا ہے کہ رضا کاروں کی فہرست رکھوں اور ضرورت مندوں کو ان کے پاس بھجواتا رہوں باقی وہ کرتے ہیں۔"

"مگر آپ کے دفتر میں ریکارڈ کے انبار نہیں۔"

ہم ریکارڈ اپنے پاس نہیں رکھتے بلکہ سائل کو دے دیتے ہیں، اس ہدایت کے ساتھ کہ اگر آپ کو کسی مسئلے میں دوبارہ ضرورت پڑے تو آپ ساتھ لے آئیں ورنہ تلف کر دیں۔" اس نے فائلیں رکھنے والی دراز کھولی۔ اس میں درجن بھر پتلی پتلی فائلیں پڑی تھیں۔ چھ سات ہزار سائلوں سے ہمارے پاس یہی ریکارڈ ہے ۔۔۔ صرف تعداد کا ریکارڈ۔ ان کی ہسٹری وغیرہ نہیں۔

"مگر آپ رپورٹ کیسے مرتب کرتے ہیں؟"

اس نے سوالیہ انداز میں بھنویں سکوڑیں۔

"میرا مطلب ہے سالانہ رپورٹ؟"

وہ ہنسا "ہم کوئی رپورٹ نہیں لکھتے۔ ہماری رپورٹ ہماری اچھی شہرت ہے، وہ لوگ پھیلاتے ہیں ہم خود نہیں لکھتے۔"

"آخری سوال" میں نے پوچھا "آپ کو ایسا ادارہ شروع کرنے کا خیال کیسے آیا؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا ۔۔۔ خاصی لمبی خاموشی کے بعد بولا "ایک چھوٹا سا واقعہ۔ بالکل چھوٹا مگر انتہائی ذاتی ۔۔۔ میں بتانا پسند نہیں کروں گا کیونکہ بہت سے لوگ میری بات نہیں سمجھتے ۔۔۔ بس یوں سمجھ لیں کہ یہ میری طبیعت کی بات ہے کہ مجھے لوگوں کی خدمت کر کے سکون ملتا ہے۔

چلتے چلتے میں نے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو میں چند رضا کاروں کو بھی ملنا پسند کروں گا۔

"آپ کب تک ہیں یہاں؟"

"ایک ہفتہ اور۔"

اس اتوار کو شام پانچ بجے ہمارے چند رضا کاروں کی اس دفتر میں میٹنگ ہے۔ آپ بھی تشریف لے آئیں۔ چند منٹ باتیں کر لیں پھر ہم بعد میں کارروائی کرتے رہیں گے۔"

اتوار والے دن میں اکیلا گیا۔

نشی موتوسان (جاپان میں مسٹر کو سان کہتے ہیں) نے اپنی روایتی عاجزی کے ساتھ جھک کر آداب کیا اور اندر لے گیا۔ فرش پر بیٹھے ہوئے درجن بھر جاپانی کھڑے ہو گئے اور انھوں نے باجماعت جھک کر آداب کیا۔ میں بھی ہاتھ ہلانے کی بجائے ان کے انداز میں جھک گیا۔

بیٹھنے کے بعد مزاج پرسی، پر تکلف انداز میں ایک آدھ جملہ موسم کے متعلق، ایک دو فقرے جاپان کی تعریف میں اور چند ایک باتیں ادھر ادھر کی، اور پھر موضوع کی بات ادارے کی طرف آ گئی۔ شرکا میں ایک ڈاکٹر تھا، ایک پروفیسر تھا، ایک دو تاجر تھے، دو تین انڈسٹری سے تعلق رکھتے تھے اور دو چار سرکاری ملازم تھے۔ وہ مجھے ادارے کے متعلق بتاتے رہے اور پھر میں نے کہا۔

"نشی موتوسان، اس دن ہم لوگوں کا بڑا گروپ تھا۔ اس لیے میں تفصیل سے کوئی بات نہ کر سکا تھا۔ مگر آج عرض کروں گا کہ آپ نے جو چند ایک بہت مشکل مسئلے حل کیے ہوں مجھے ان کی تفصیلات بتائیں ۔۔۔ یعنی اصل کہانیاں۔"

وہ سب خاموش ہو گئے۔

"میرا مطلب ہے، سوالوں سے میں اصل حقیقت شاید نہ جان سکوں لیکن اگر آپ سے ایک دو اصل کہانیاں سن سکوں تو شاید ذرا سمجھ جاؤں

نشی موتو نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔ کوئی مسکرا دیا، کوئی خاموش رہا اور کسی نے نظریں جھکا دیں ۔۔۔ چند لمحے بے چین سی خاموشی

طاری رہی اور پھر نشی موتو کہنے لگا۔

دراصل ہم لوگ اس موضوع پر بات کرنے سے جھجکتے ہیں۔۔۔۔۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ کس نے کس کی کیا مدد کی ہے۔ میرا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ میں سائل کو متعلقہ آدمی کے پاس بھجوا دوں۔ اگر اس نے اس کا کام کر دیا تو وہ مجھے صرف اتنی اطلاع دیتا ہے کہ اس نے کام کر دیا ہے اگر نہیں کر سکا تو بھی بتا دیتا ہے کہ وہ نہیں کر سکا۔ اور یہ بھی صرف اس لئے بتاتا ہے کہ میں تعداد کا ریکارڈ رکھ سکوں۔ ورنہ تفصیلات نہ وہ مجھے بتاتا ہے اور نہ میں پوچھتا ہوں اور نہ ان میں سے کوئی اور دوسروں سے پوچھتا ہے۔"

مجھے ذرا خفت ہوئی۔ اور میں نے کہا "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اس معاملے میں اتنی احتیاط برتتے ہیں۔ اس لئے میں نے پوچھ لیا میرا مقصد محض آپ لوگوں کے کام سے واقفیت حاصل کرنا تھا۔ اگر اس سے آپ کا کوئی اصول مجروح ہوتا ہے۔ تو میں اصرار نہیں کرتا۔

"نہیں نہیں"، نشی موتو بولا "ہم آپ کی بات سمجھتے ہیں اور آپ کے خلوص کی قدر کرتے ہیں اور کوشش کریں گے کہ آپ کو مطمئن کر سکیں۔

پھر اس نے باری باری سب کی طرف دیکھا اور کہا "آپ میں سے جو مناسب سمجھیں اپنا کوئی کیس ان کو بتا دیں۔"

خاموشی ۔۔۔۔ زیادہ خاموشی ۔۔۔۔ جو جھجک کے دامن چھو لیتی ہے۔

میں سوچنے لگا۔ اب بات ختم کی جائے۔ مگر کیسے۔

اتنے میں ایک صاحب بولے "دراصل ..... قصہ یہ ہے" وہ کھانسے۔ کمرے کے سکوت کی غنودگی جیسے ٹوٹنے لگی۔ چند ایک نے پہلو بدلے اور سننے کے لئے مشتاق ہو گئے کیونکہ وہ قصہ صرف میرے لئے نیا نہ ہوتا بلکہ ان سب کے لئے نیا تھا۔ سوائے سنانے والے کے۔

قصہ یہ ہے۔۔۔۔ کہ کسی صحیح واقعہ کا چناؤ کرنا بڑا مشکل ہے۔ دراصل ... وہ پھر کھانسے "یہ سارے انسانی مسائل ہوتے ہیں۔ جن میں نازک رشتے بنتے بگڑتے اور الجھتے رہتے ہیں اور آپ جب تک ہمارا کلچر پوری طرح نہ سمجھتے ہوں ان حالات کی نزاکت کا احساس نہیں کر سکتے:

"جی بجا فرمایا آپ نے" میں نے جواب دیا "مگر پھر بھی کچھ اندازہ تو ہو جاتا ہے۔"

نشی موتو کہنے لگے "آپ نے ہمارے ہاں کی کونسی چیز زیادہ دیکھی ہے؟"

"میں نے تو زیادہ تر آپ کا کسان دیکھا ہے۔"

"آپ کو اس کی کونسی چیز زیادہ بہتر لگی ہے۔"

مجھے اس کی ہمت اور لگن بہت پسند آئی ہے۔ اتنے سرد موسم میں وہ پولی تھین کی دیواریں کھڑی کر لیتا ہے۔ اس میں مصنوعی حرارت سے گرم ملکوں جیسی سبزیاں، پھل اور پھول اگاتا ہے۔ ہمارے ملک میں کھیرے، ککڑی صرف گرمیوں کے دو تین مہینوں میں اُگتا ہے۔ یہاں کی برفباری والے موسم میں وہ آٹھ مہینے کھیرے اور ککڑی اگاتے ہیں۔ آپ کا کسان موسم کو شکست دے دیتا ہے۔ اور اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے اگاتا ہے۔

"تو ٹھیک ہے۔ آپ لوگوں میں سے کوئی صاحب ایسا کیس بتائیں جہاں کسی کسان کی مدد کی گئی، کیونکہ یہ جاپان کے کسان کی زندگی سے تھوڑے سے واقف ہیں۔"

حاضرین میں سے ایک صاحب کھانسے "میں آپ کو ایسا ہی قصہ بتاؤں گا جو اسی انداز میں کاشتکاری کے متعلق ہے جو آپ نے دیکھی ہے۔ یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہ تھا۔ ہم نے بہت بہت مشکل مسائل حل کئے ہیں اور اس لحاظ سے یہ معمولی نوعیت کا تھا۔ مگر یہ آپ کو ہمارے مخصوص طرزِ فکر کا اندازہ دے گا کہ ہم غیر روایتی انداز میں سوچتے ہیں اور ہر وہ چیز کرنے کو تیار ہیں جو عقل میں آسکتی ہے مگر قانون کے خلاف نہیں جاتی۔ اور نہ ہی ہم لوگ لالچ کرتے ہیں۔"

وہ نشی موتو سے مخاطب ہوا "نشی موتو سان۔ یہ قصہ ان تمام حاضرین میں سے کسی کو بھی پتہ نہیں ہے۔"

نشی موٹو نے مسکرا کر سر جھکایا۔ باقیوں نے بھی سر یا ہاتھ ہلا کر اپنی توجہ کا یقین دلایا۔ "یہ ایک نوجوان کا قصہ ہے جس کا باپ مر گیا اور تھوڑی سی زمین چھوڑ گیا۔ اس کا باپ اپنے انداز میں کاشتکاری کرتا تھا مگر نوجوان میں نہ صرف ہمت تھی بلکہ اس کی سوچ بھی جوان تھی اور وہ بڑی عقل اور سمجھ داری سے منصوبہ بنا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس زمین پر ایک دم بہت سا روپیہ لگا کر بھرپور انداز میں کاشتکاری کرے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسی زمین سے دو سال میں چار گنا زیادہ حاصل کر سکتا ہے، اگر وہ کچھ آلات اور دیگر چیزیں خرید سکے۔ مگر اس کے پاس پیسہ نہ تھا۔ بنک اتنا قرضہ نہ دیتے تھے۔ کیونکہ ضمانت کے لئے زمین بہت کم تھی۔ اور اگر وہ ہر چیز قرضے پر حاصل کرتا، اور اس کا تجربہ ناکام ہو جاتا تو اس کی زمین اور گھر سب کچھ نیلام ہو جاتا اور وہ بالکل قلاش ہو جاتا۔

میری ملاقات اس سے ایک ریستوران میں ہوئی تھی۔ وہ ایک کونے میں خاموش بیٹھا تھا۔ اور کوئی میز خالی نہ تھی تو میں بھی اتفاق سے وہاں جا بیٹھا۔ باتوں باتوں میں اس نے اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ دو سال سے پریشان ہے۔ اگر کوئی اسے قرضہ دے سکے تو وہ اپنی اسی زمین سے معجزے کر کے دکھا سکتا ہے۔

ہم باتیں کرتے رہے اور، پھر میری تجویز پر وہ مجھے اپنی زمین دکھانے لے گیا اور وہاں اپنا سارا منصوبہ بتایا ـــــ میں نے محسوس کیا کہ اس کا منصوبہ قابل عمل ہے۔ مگر کامیابی اور ناکامی کا خطرہ برابر برابر ہے۔ لڑکے میں خلوص، اور عزم صاف نظر آتا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں کوئی حل سوچوں گا۔

میں کئی دن سوچتا رہا۔ کئی لوگوں سے مشورہ بھی کیا مگر کوئی آدمی اتنی زیادہ رقم ایک موہوم منصوبے کے لئے نہ لگا سکتا تھا۔ مگر جو بندہ؟ یا بندہ۔ بالآخر چند لوگوں کے باہمی مشورے سے ہم نے ایک تجویز بنائی ـــــ تجویز یہ تھی کہ کوئی بیس لوگوں نے تھوڑی تھوڑی رقم ڈال کر اسے تین سال کے لئے قرضہ دیا۔ اس شرط پر کہ وہ تین سال بعد وہ واپس کر دے گا۔ اگر اس کا منصوبہ ناکام ہو گیا تو اتنی رقم واپس کر دے گا جتنی بچتی ہو گی۔ یعنی اصرار نہیں کریں گے کہ ہمیں پوری رقم دے اور یوں سمجھ لیں گے کہ ایک تجربہ ناکام ہو گیا لیکن اگر اس کا کام اچھا چل گیا وہ تین سال بعد ہمیں رقم واپس لوٹا دے گا یعنی اصل رقم۔ اس پر کوئی سود وغیرہ نہ ہو گا۔"

"پھر؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بہت خوش ہوا۔ ہم لوگوں نے رقم اکٹھی کی۔ اسے دے دی۔ بغیر کسی تحریری معاہدے کے۔ اور بھول گئے ـــــ"

"تین سال بعد وہ میرے پاس آیا۔ اور اس نے کہا کہ وہ ان بیس لوگوں کو اپنے فارم پر مدعو کرنا چاہتا ہے ـــــ ہم سب لوگ گئے اور اس کی ترقی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس نے واقعی وہ جگہ جنت بنا دی تھی ـــــ اس نے ہم سب لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر اپنے جملہ حسابات کا رجسٹر نکال لایا۔ اس میں سارے منافع کا تخمینہ دیا اور کہنے لگا کہ آپ اس منافع کے حصہ دار ہیں اور ہر شخص کو میں ڈیڑھ گنا رقم واپس کروں گا ـــــ"

کمرے میں خوشگوار مسکراہٹیں ابھریں۔

"مگر" وہ چند ے توقف کے بعد بولا "مگر ہم سب نے مشورے کے بعد انکار کر دیا۔ اور صرف اپنی اصل رقم واپس لینے پر آمادہ ہوئے:

اس پر کافی جھگڑا ہوا کیونکہ وہ اسے اپنی عزت کا معاملہ سمجھتا تھا ـــــ جب ہم نہ مانے تو اس نے بالآخر خود ہی ایک تجویز پیش کی کہ منافع کی جتنی رقم وہ ہم سب کو دینا چاہتا تھا وہ اس نے ایک بنک میں علیحدہ جمع کرا دی اور ہمیں اختیار دے دیا کہ جب بھی ہم کسی مستحق آدمی کو قرضِ حسنہ دینا چاہیں تو اس رقم کو استعمال کریں۔"

"پھر آپ نے وہ رقم استعمال کی؟"

"آپ حیران ہوں گے سن کر، ہم نے اسے دو تین مرتبہ استعمال کیا اور اب وہ رقم پہلے سے بھی زیادہ ہے۔"

کمرے میں موجود سب لوگ مطمئن سے ہو کر مسکرائے اور کسی نے کوئی سوال نہ پوچھا۔
"اگر میں چند دن اور یہاں ہوتا" میں نے کہا "تو جا کر اس جواں ہمت آدمی سے ملتا اور اس کا فارم دیکھتا۔
نشی موتوویے "شاید یہ ممکن نہ ہوتا۔ کیونکہ ہم لوگ اصولی طور پر کسی ایسے شخص کی شناخت نہیں بتاتے جس نے ہمارے ادارے سے استفادہ کیا ہو۔"
میں اس انتظار میں تھا کہ شاید ان میں سے کوئی اور بھی اپنا قصہ بتائے مگر ان کی عام جھجک دیکھ کر میں نے اصرار نہ کیا اور موضوع بدل دیا۔
جب میں وہاں سے واپس لوٹا۔ تو میرے وہم بھی نہ تھا کہ نشی موتو سے پھر ملاقات ہوگی۔ مگر تیسرے ہی دن شام کے وقت کیوٹو کے چوراہے میں اس سے ملاقات ہوگئی۔ وہاں وہ میری آخری شام تھی۔

وہ ایک عجیب چوراہا تھا۔ ویسے تو عجیب نہ تھا۔ بالکل روایتی انداز میں چار سڑکیں ملتی تھیں مگر مجھے عجیب لگا تھا۔ حالانکہ عام انداز میں دیکھنے والوں کو اس میں کوئی خاص بات نظر نہ آتی تھی۔
اس چوراہے میں عجیب بات یہ تھی کہ اس کی تین سڑکوں پر تین مختلف مذاہب کے عبادت گھر تھے۔ ایک سڑک پر چند قدم چلتے تو ایک بہت بڑا اور خوبصورت گرجا تھا جس کے باہر حضرت عیسیٰؑ اور صلیب کا ایک بہت بڑا بت تھا۔ اسی چوراہے سے دوسری سڑک پر چند قدم چلتے تو بدھ کا مندر تھا۔ باہر بہت خوبصورت لان۔ اندر لکڑی کی بہت بڑی عمارت اور اس کے اندر بڑے ہال میں مہاتما بدھ کا بیس پچیس فٹ اونچا بت تھا۔ گیان دھیان کے انداز میں۔ اسی چوراہے میں تیسری سڑک پر چند قدم چلتے تو شنتوازم (SHINTOISM) کا عبادت گھر تھا۔
عجیب بات یہ تھی کہ چوراہے کے درمیان میں جو چھوٹا سا پارک تھا۔ اس میں کھڑے ہوں تو تینوں عبادت گھر نظر آتے تھے۔ ان کے اندر باہر آنے جانے والے لوگ نظر آتے تھے گویا آپ ایک ہی وقت میں تین مذاہب کی عبادت کے روپ دیکھ سکتے تھے۔
گرجا میں عیسائی لوگ موسیقی کے ساتھ PSALMS گاتے ہیں۔ بائیبل کا درس سنتے ہیں۔ اور خدا یا یسوع مسیح سے دعا مانگتے ہیں۔
بدھ کے مندر میں آلتی پالتی مار کر من میں کھو جاتے ہیں۔ بدھا سے دھیان لگاتے ہیں اور بدھا سے دعا مانگتے ہیں۔
شنتو عبادت گھر میں تالی بجا کر دیوتاؤں کی SPIRIT کو متوجہ کرتے ہیں۔ اور پھر سر جھکا کر ان سے دعا مانگتے ہیں۔ یہ قدرت اور فطرت کا مذہب ہے۔ اس میں کھلی خوبصورت عمارت ہوتی ہے۔ اس پر بہت شوخ اور کھلتے ہوئے رنگ ہوتے ہیں۔ بڑی تعداد میں پھول اور پتے ہوتے ہیں۔ مگر کوئی بت نہیں ہوتا۔ اس لئے لوگ کسی خدا سے دعا نہیں مانگتے بلکہ ساری فطرت سے دعا مانگتے ہیں۔
دنیا بھر میں ایک سو کروڑ انسان گرجوں میں جا کر عبادت کرتے ہیں۔ سولہ کروڑ بدھ کے مندروں میں عبادت کرتے ہیں اور چھ کروڑ شنتو عبادت گھروں میں عبادت کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مذہب کو سچا سمجھتا ہے۔ اور اس کا ایمان ہے کہ جس انداز میں وہ عبادت کر رہا ہے وہی صحیح ہے اور صرف اسی طریقے سے خدا کو خوش کیا جا سکتا ہے اور اس سے رابطہ قائم کر کے دعا مانگی جا سکتی ہے۔
ان میں سے ہر ایک سمجھتا ہے کہ اگر خدا تک پہنچنا ہے تو یہی واحد طریقہ ہے
اس معمر اور خدا ترس جاپانی سے میری تیسری اور آخری ملاقات اسی چوراہے میں ہوئی تھی۔
اس چوراہے کے درمیان میں جو چھوٹا سا پارک یا لان تھا، اس میں فوارے کے پاس ایک بنچ پر نشی موتو بیٹھا تھا۔
علیک سلیک۔ چند ایک باتیں ادھر اُدھر کی —— اور پھر میں بھی اس کے پاس بنچ پر بیٹھ گیا۔

"کیوٹو تمہیں کیسا لگتا ہے؟" وہ پوچھنے لگا۔

"بہت اچھا ـــــ کافی صدیاں جاپان کا دارالخلافہ رہنے کی وجہ سے اس میں ثقافتی رنگ بہت جھلکتا ہے ـــ اس کا ایک مخصوص ماحول ہے۔"

"یہاں کی کون سی چیز تمہیں سب سے زیادہ پسند آئی؟"

"میں بتاؤں گا تو تم ہنسو گے، اس لئے نہیں بتاتا۔"

"پھر بھی؟" وہ اور بھی دلچسپی سے پوچھنے لگا۔

"مجھے یہ چوراہا بہت پسند آیا ـــ سب سے زیادہ پسند۔"

"واقعی؟" وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا "وہ کیوں؟"

"اسی ثقافتی ورثے کی وجہ سے ـــــ اس بنچ پر بیٹھ کر دیکھیں تو دائیں بائیں اور سامنے تین مذاہب کے معبد نظر آتے ہیں تین دستوں کے مظہر۔ ان میں سے بدھ مت قریباً اڑھائی ہزار سال پرانا ہے، شنتو مذہب اس سے بھی کہیں پرانا ہے اور عیسائیت۔ قریباً دو ہزار سال پرانی ہے۔ اور یہ تینوں عبادت گھر صدیوں سے ایک چوراہے میں واقع ہیں۔ اس کا مطلب ہے جاپانیوں کی قوت برداشت حیرت انگیز حد تک پختہ ہے۔"

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا "تم نے یہ بات کیسے سوچی؟"

"یہ کوئی خاص سوچ نہیں محض تضاد کی بات ہے۔ دراصل مذہب کے معاملے میں ہمارا اپنا معاشرہ بہت جابر ہے۔ دوسرے مذاہب کی تو بات چھوڑیں۔ خود اپنے مذہب کے متعلق کسی بھی قسم کی آزادانہ سوچ کو لوگ برداشت نہیں کرتے۔"

"قدامت پسند تو ہم بھی بہت ہیں، اتنے کہ تم لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے" وہ کہنے لگا "مگر اس قدامت پسندی میں ہم نے اتنی لچک رکھی ہے کہ موجودہ زمانے کی نئی سوچوں کی مفید چیزوں کو ہم حاصل کر لیتے ہیں۔ جاپان میں قدم قدم پر آپ کو قدیم اور جدید کا امتزاج نظر آئے گا۔"

میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا کیونکہ میں خود یہ دیکھ چکا تھا۔ اسی موضوع پر کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔

"آپ ان تینوں عبادت گھروں میں سے کس میں جاتے ہیں؟"

وہ پہلے چند سیکنڈ مسکراتا رہا پھر ہنسنے لگا۔

"بڑا مشکل سوال پوچھا تم نے ـــــ میرے پاس اس کا جواب نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ـــــ میرے پاس واقعی کوئی جواب نہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ـــ آخر آپ کبھی تو جاتے ہوں گے کسی میں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو کیا آپ لامذہب ہیں؟"

وہ خاموش رہا۔

"نئی نسل کے متعلق تو میں سوچ سکتا ہوں کہ وہ لامذہب ہوں گے۔ مگر آپ کی عمر کے لوگ تو مشرق میں کم ہی لامذہب ہوں گے" میں نے اسے بات کرنے پر اکسانے کے لئے کہا۔

"میری عمر اب ساٹھ برس سے اوپر ہو چکی ہے ـــ میں لامذہب نہیں بلکہ اپنے آپ کو بہت مذہبی سمجھتا ہوں۔"

"تو پھر تو آپ عبادت کرتے ہوں گے؟"

"عبادت؟" اس نے بنچ پر پہلو بدلا ــــ "کرنا تو چاہتا ہوں، مگر ــ کر نہیں سکتا۔"

میں نے اسے اوپر سے نیچے دیکھا۔ شاید وہ کسی بیماری کا ذکر کرے گا۔

وہ پھر بولا "کر نہیں سکتا۔"

"مگر کیوں؟"

"جو بات ــــ تم نے آج اس چوراہے کے متعلق سوچی ہے۔ وہ ــــ میں نے بھی سوچی تھی ــــ کوئی پچیس سال پہلے۔"

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"میں اسی بنچ پر بیٹھا تھا اور اس سامنے والے بنچ پر تین آدمی بیٹھ کر بحث کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک بدھ مت کا تھا، دوسرا شنتو تھا، اور تیسرا عیسائی۔ وہ کوئی دو گھنٹے بحث کرتے رہے۔ اور ان میں سے ہر ایک اپنے طریقۂ عبادت کو درست اور قابل قبول سمجھتا تھا ــــ وہ بحث کرتے رہے ــــ اور میں سنتا رہا ــــ پھر وہ چلے گئے۔ اور میں سوچتا رہا ــــ اس سے پہلے میں اس معبد میں جایا کرتا تھا (اس نے بدھ کے مندر کی طرف اشارہ کیا) ــــ مگر اس سے اگلے دن جب میں آیا۔ تو پھر سوچ میں پڑ گیا ــــ اسی بنچ پر بیٹھ گیا اور کئی گھنٹے سوچتا رہا ــــ"

وہ خاموش ہو گیا

"پھر؟" میں نے کافی دیر بعد پوچھا۔

"پھر کیا! ــــ اب میں پچیس برس سے سوچ رہا ہوں کہ عبادت کا کونسا طریقہ درست ہے ــــ مگر ــــ" اس نے بڑی بے بسی سے دونوں ہاتھ اور سر ہلائے ــــ "مگر ــــ مگر ..... کوئی جواب نہیں ملتا ــــ"

وہ کرب کی حالت میں سر ہلانے لگا۔

"میں پچھلے پچیس برس سے کسی عبادت گھر میں نہیں گیا ــــ جب زیادہ تنگ ہوتا ہوں۔ تو اس بنچ پر آ بیٹھتا ہوں۔ ان تینوں عمارتوں کو دیکھتا ہوں۔ اور سوچتا رہتا ہوں۔ بعض دفعہ کئی کئی گھنٹے ــــ اور پھر چلا جاتا ہوں ــــ یوں سمجھو یہی بنچ میرا عبادت گھر ہے۔"

"مگر تم سوچتے کیا ہو؟"

"بہت سی باتیں ــــ بلکہ خدا سے بھی سوال کرتا ہوں کہ وہ مجھے کسی طریقے سے سمجھا دے کہ اسے خوش کرنے کے لئے عبادت کا کونسا طریقہ درست ہے ــــ مگر کوئی جواب نہیں ملتا ــــ کوئی بھی جواب نہیں ملتا ــــ کوئی بھی نہیں۔" وہ جذباتی سا ہو کر مایوسی سے سر ہلانے لگا۔

"میں بڑا مذہبی آدمی ہوں ــــ" وہ چند لمحے توقف کے بعد پھر بولنے لگا "میرا خدا پر بہت تقوی ہے ــــ میں اپنی چھوٹی چھوٹی بات کے لئے بھی دعا مانگتا ہوں۔ مگر بس دل ہی دل میں ــــ کسی عبادت گھر میں نہیں۔ بلکہ اٹھتے بیٹھتے ــــ گھومتے پھرتے ــــ دن کو ــــ رات کو ــــ بلکہ جب میں شراب کے نشے میں ہوتا ہوں اس وقت بھی خدا سے دعا مانگتا رہتا ہوں ــــ اس کا شکر ادا کرتا رہتا ہوں کہ اس نے مجھے بہت کچھ دیا ــــ مگر وہ عبادت نہیں کرتا جو یہاں (اس نے ہاتھ سے تینوں عبادت گھروں کی طرف اشارہ کیا) ہوتی ہے ــــ"

"مگر کیوں؟"

"اس لئے کہ ــــ اس لئے کہ میں ــــ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ ان تینوں میں سے کس میں جاؤں تو خدا خوش ہو گا۔" اس نے اضطراری انداز میں اپنا ڈھیلا ڈھالا لباس درست کیا۔

"تو آپ تینوں میں چلے جایا کریں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "وہ عبادت نہیں ہوگی۔ وہ تو معمہ ہوگا ——— میں سوالیہ نشان بن کر اندر نہیں جانا چاہتا ——— عبادت تو سپردگی ہوتی ہے ——— حضوری ہوتی ہے ——— مکمل اور محض حضوری ——— اس میں سوالوں کی کھدبد سب کچھ تباہ کر دیتی ہے۔"

"کیا آپ کی اولاد بھی اس مسئلے سے اسی طرح پریشان ہے جس طرح آپ ہیں؟" میں نے پوچھا۔

نشی موڑ چند منٹ سوچتے رہے پھر بولے "نہیں ——— یہ ان کا مسئلہ نہیں ——— صرف میری ذات کا مسئلہ ہے ——— میرے دو لڑکے ہیں۔ ان میں سے ایک جو امریکہ کا تعلیم یافتہ ہے، بالکل لامذہب ہے ——— مگر دوسرے نے اپنے گھر کے ایک کمرے میں بدھا کی عبادت کا سامان رکھا ہے اور دوسرے کمرے میں شنتو عبادت کا ——— وہ صبح اُٹھتا ہے تو بعض دفعہ دونوں کی باری باری پوجا کرتا ہے اور بعض دنوں میں کسی ایک کی۔"

میں نے مسکرا کر کہا "تو آپ بھی اپنے مسئلے کا یہی حل کیوں نہیں نکال لیتے؟"

"اوں ہوں ——— یہ اس لڑکے نے نہیں نکالا۔ ہمارے ملک میں ہزاروں لاکھوں لوگ روزانہ ایسا کر رہے ہیں ——— مگر مجھے اس سے تسلی نہیں ہوتی ——— کیونکہ یہ میرے سوال کا جواب نہیں بلکہ ایک سیاسی انداز کا سمجھوتا ہے ——— آسانی کی خاطر ایک درمیانہ راستہ ہے ——— یہ حتمی حل نہیں ہے۔"

"تو آپ کے خیال میں اس کا کیا حل ہو سکتا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم" اس نے احتجاج کے انداز میں کہا "بالکل نہیں معلوم ——— اور وہی جاننے کے لئے میں پچیس سال سے اس بنچ پر بیٹھ کر سوچ رہا ہوں۔"

چوراہے کے اردگرد ٹریفک زور شور سے رواں تھی۔ کاریں، سائیکلیں، بسیں اور پیدل لوگ۔ ہر کوئی اپنی منزل کی دھن میں اڑا جا رہا تھا۔ کسی کو اندازہ ہی نہ تھا کہ چوراہے کے اندر ایک افسردہ فرد پریشانی کے عالم میں اپنی منزل ڈھونڈ رہا ہے۔ جس بنچ پر ہم بیٹھے تھے، اس کے نیچے سے گھاس کا فرش پھیلتا ہوا سیمنٹ کے گول دائرے کو چھو لیتا تھا۔ جس کے اندر چند پتھر، کچھ پودے، بہت سے پھول اور دھیرے دھیرے بہتا ہوا پانی ایک دھیمے اور نرم فوارے کو گھیرے ہوئے تھے جس کی دھار دو تین فٹ اوپر جا کر فضا میں بکھر کر ادھر اُدھر گر جاتی تھی جیسے اس کا ہر قطرہ اپنے بے مصرف سفر پہ پشیمان ہو کر زمین پر ڈھیر ہو جائے ——— جس طرح ہم اپنی زندگی کو بے مصرف اور بلا مقصد سمجھتے ہوئے کائنات کی وسعت میں تحلیل ہو جاتے ہیں ——— نہ اس قطرے کو اندازہ ہے کہ وہ پورے ماحول کی خوبصورتی میں کتنا اضافہ کر رہا ہے۔ نہ ہمیں اندازہ ہے کہ کائنات کی مجموعی سکیم میں ہم کیا مقصد پورا کر رہے ہیں ——— میں فوارے کو دیکھتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا کہ دھیرے سے نشی موڑ کی آواز ابھری۔

"اُس دفتر میں آپ نے ایک سوال پوچھا تھا کہ مجھے یہ ادارہ شروع کرنے کا خیال کیسے آیا تھا۔ اور میں نے ایک ذاتی واقعے کی طرف اشارہ کیا تھا مگر بتایا نہ تھا ——— آج آپ کو اس واقعے کا علم ہو گیا ہے۔"

میں نے چونک کر نشی موڑ کی طرف دیکھا۔

"وہ یہی واقعہ تھا جو ابھی میں نے آپ کو بتایا تھا ——— اس بنچ پر تین لوگوں کی بحث ——— ان کا اصرار کہ صرف ان ہی کی عبادت سے خدا کو خوش کیا جا سکتا ہے ——— اس دن کے بعد سے میرے قدم اس بنچ سے آگے نہیں بڑھے کہ میں ان عمارتوں میں سے کسی میں جا سکتا ——— میرے اندر ایک خلا پیدا ہو گیا ——— جیسے تکیے میں سے ساری روئی نکال کر اس میں صرف ہوا بھر دی جائے ——— میں دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک تھا مگر میرے اندر خلا تھا ——— اسے پُر کرنے کے لئے میں نے ضرورت مند انسانوں کی عبادت شروع کر دی۔ کہ شاید خدا اس سے خوش ہو جائے ——— مجھے پتہ نہیں کہ خدا خوش ہوا یا نہیں ——— مگر چند ضرورت مند انسان خوش ہیں ——— ان کی خوشی سے میں خوش ہوں ——— مگر ان تمام عمارتوں کے باسی ناخوش ہیں کیونکہ میں وہاں نہیں جاتا۔"

وہ سوچ میں پڑ گئے..... پھر وقفے بعد بولے "مجھے یوں لگتا ہے کہ خدا تک پہنچنے میں جو بڑی رکاوٹ حائل ہے۔ وہ مذہب کا روایتی تصور ہے۔"

وہ ناخوشی سے سر ہلاتے رہے ـــــ پھر بڑبڑائے۔

"مذہب ہمیں خدا سے دور رکھتا ہے ـــــ اور وہ بھی خدا کے نام پر"

میں تھوڑی دیر بیٹھا رہا ـــــ مگر ان کی خاموشی سے یوں لگتا تھا کہ اب گفتگو کا دوبارہ ابھرنا محال ہے ـــــ میں نے دھیرے سے اجازت چاہی، تو جھکے ہوئے سر نے ذرا سے خم سے مجھے الوداعی اشارہ کیا ـــــ اور میں ایسے احتیاط سے اٹھ آیا جیسے کوئی نمازیوں کی صف میں سے نکل کر باہر آتا ہے۔

ـــــ کمرے کی نیم تاریکی یکسانیت سے قائم تھی ـــــ ستار کے تار گویا دل کے تار بن گئے تھے ـــــ یا ذہن کا ارتعاش بن گئے تھے ـــــ جس میں یکے بعد دیگرے یادیں دھیرے دھیرے اُبھر رہی تھیں۔ ایک یاد سے دوسری کا سرا ملا ہوا ـــــ جیسے ایک کے بعد دوسری سیڑھی ـــــ یہ سیڑھی چڑھتے چڑھتے مجھے ایک بڑے ہال میں لے گئی۔ جہاں رونق تھی ـــــ موسیقی تھی ـــــ حرکت تھی ـــــ مسکراہٹوں کی چمک تھی اور قہقہوں کی کھنک تھی۔

آرکسٹرا خاموش ہوا تو جوڑے ڈانس فلور سے ہٹ کر اپنی اپنی جگہ واپس آنے لگے۔

عورتوں نے بیگ کھولے۔ لپ سٹک، ہیرپن (HAIR PIN) اور کنگھیاں کاریگر کے اوزاروں کی طرح مہارت سے استعمال ہونے لگیں۔ نرم رومالوں نے پسینہ سے بھرے ہوئے چہروں کو دُکھتے زخم کی طرح ہولے ہولے سہلا کر خشک کیا۔ مردوں نے از سرِنو جام بھرے اور دھیمی باتوں کی آواز سے لاؤنج میں مکھیاں سی بھنبھنانے لگیں۔

کسی بڑے ہوٹل کے لاؤنج میں کہیں بھی بیٹھے ہوں، اندازہ نہیں ہوتا کہ ہم دنیا کے کس حصے میں ہیں۔ ایئر پورٹ اور پانچ سٹار ہوٹل ہر جگہ ایک ہی جیسے ہیں۔ اس دم ہم ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ لیکن اگر اس کے نام کے ساتھ "بالی بیچ" (BALI BEACH) کا دم چھلا نہ لگا ہوتا تو ہمیں یوں احساس ہوتا کہ پاکستان ہی کے کسی بڑے ہوٹل میں ہیں۔ مگر یہ ہوٹل ڈین پسار میں تھا جو صوبہ بالی کا دارالحکومت ہے۔

بالی ـــــ انڈونیشیا کے ہزار جزیروں میں سے سب سے زیادہ پاپولر جزیرہ۔ سیاحوں کے لئے گویا حج کا درجہ۔ اشتہاروں میں حیران کن عنوانات سے بیان ہونے والا۔ دیوتاؤں کا جزیرہ۔ قدیم تہذیب اور روایات کا مسکن۔ زمین پر جنت۔ مسحور کن خوبصورت مناظر۔ حواس پر چھا جانے والی فضا۔ وغیرہ وغیرہ۔

مگر یہ سب کچھ ہوٹل کے باہر تھا۔ ہوٹل کا لاؤنج بین الاقوامی یکسانیت میں ڈوبا تھا۔ صوفے، قالین، روایتی فرنیچر، چھت پر لٹکے ہوئے بڑے بڑے فانوس اور قمقمے، پیانو، ڈانس فلور، بار، ایش ٹرے، ماڈرن آرام پسندوں کے سبھی تقاضوں کو ماڈرن انداز میں پورا کیا گیا تھا لاؤنج میں بہت سے ٹورسٹ بیٹھے تھے جن میں زیادہ تر آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے تھے جس میز پر زیادہ شور تھا وہاں امریکن تھے۔ جس میز پر اپنے اندر جھجک اور دوسروں پر کریدتی نظریں تھیں وہاں ہندوستانی، پاکستانی اور برِعظیم کے دوسرے لوگ بیٹھے تھے کہیں اپنی زندگی کا مزہ لینے والے سفید فام لوگ تھے اور کہیں زندگی کے مزے کے بارے میں گومگو کے مارے ہوئے ایشیائی تھے۔ وہ ہر لمحے سے اس کی پوری کشید کرنے والے۔ یہ رولیوں کی نکتہ چینی میں لمحے بلکہ صدیاں کھونے والے۔

میرے ساتھ پیٹر اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یہ آسٹریلیا سے ایک گروپ ٹور کے ساتھ آئے تھے اور گروپ کے باقی لوگ لاؤنج میں بکھرے بیٹھے تھے۔ بالی کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔

پیٹر کہنے لگا "تعجب یہ ہے کہ انڈونیشیا مسلمانوں کا ملک ہے، مگر یہ ایک جزیرہ اس ملک میں ابھی تک ہندو آبادی والا ہے۔"

پیٹر کی گرل فرینڈ روزمیری کالج میں تاریخ پڑھاتی تھی اور کئی دفعہ بالی آ چکی تھی۔ وہ کہنے لگی "مگر تھوڑا فرق ہے۔ یہ برعظیم والے ہندو نہیں ہیں بلکہ ان کا مذہب اب ایک ملغوبہ سا ہے، جس میں ہندوستان کا ہندومت اور مشرق بعید کا بدھ مت شامل ہے۔ یہ بہت سی قدیم رسموں کا مذہب ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"میرے خیال میں یہ من کے ہندو اور تن کے بدھ ہیں اور ان کی سوچ مسلمانوں جیسی ہے ـــــ سبھی اثرات ان میں شامل ہیں۔"

الیگزانڈر نے ناگواری سے بیئر کا مگ میز پر رکھا اور کہنے لگا "اگر آپ نے فلسفیانہ باتیں کرنی ہیں تو براہِ کرم ساتھ والے دوسرے لاؤنج میں چلے جائیں۔ آپ کیوں میوزک، ڈانس اور ڈرنک کی وائلڈ فضا کو خراب کرتے ہیں۔"

"آئی ایم سوری ایلیکس" روزمیری کہنے لگی "میں بھول گئی کہ تمہارا ساتواں جام ہے۔"

"پہلا ہو یا ساتواں ہو" ایلیگزنڈر کہنے لگا۔ "جام جام ہے اور اس کی اپنی تقدیس ہے۔ تم لوگوں نے بالی میں آ کر یہی نہیں دیکھا جہاں قدم قدم پر مندر ہیں اور ہر جگہ مقدس روایات کا چرچا ہے۔ گائیڈ ایک سانس میں پندرہ دفعہ مقدس روایات کا ذکر کرتا ہے۔ اس سے ہم یہ تو سیکھیں کہ جام کی بھی تقدیس ہے، اور اسے ہم سنجیدہ باتوں سے تباہ نہ کریں۔"

"توبہ توبہ۔ یہ گناہ تو اب سرزد ہو چکا ہے۔ اب ہم کیسے اس کا کفارہ ادا کر سکتے ہیں؟" روزمیری مصنوعی سنجیدگی سے بولی۔

"یہ بہت آسان ہے۔" پیٹر کہنے لگا "ذرا ایمان مضبوط کرو، گناہ سے توبہ کرو اور صدقِ دل سے ایک ڈانس کر لو۔"

"مگر آرکسٹرا تو خاموش ہے۔"

پیٹر کھڑا ہو گیا "تم چلو تو سہی۔ ہم خود فرمائش کر لیں گے۔"

"اوہ۔ مجھے یاد آیا" روزمیری ہنس کر بولی "میں ساری شام سوچتی رہی ہوں کہ ان سے اس دھن کی درخواست کروں مگر موقعہ ہی نہیں ملا۔ چلو اب فرمائش کرتے ہیں۔"

"کون سی میوزک؟" پیٹر نے پوچھا۔

"چلو تو" وہ اسے گھسیٹتی ہوئی بولی اور دونوں آرکسٹرا کے پاس پہنچ گئے۔

مگر یوں لگتا تھا کہ بینڈ والے ان کی دھن کو سمجھ نہیں رہے تھے۔ وہ کبھی وائلن پر ایک دو ہاتھ چلا کر نامکمل سی کوشش کرتے کبھی پیانو پر دو چار انگلیاں چلاتے کبھی بانسری پر ہلکی سی تان اٹھاتے۔ مگر روزمیری اور پیٹر ہر دفعہ نفی میں سر ہلا دیتے ہم نے مائیکروفون پر یہ بھی سنا کہ روزمیری نے ناک میں سے دھن گنگنائی مگر کوئی کامیابی ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ بالآخر روزمیری اکیلی بھاگ کر ڈانس فلور پر آ گئی اور ڈانس کے قدم چل کر دکھلانے لگی اور کہا کہ ان قدموں کے مطابق وہ جو بھی مناسب میوزک ہو، بجائیں۔

ڈانس کے قدم خوب تھے۔ روزمیری سپاہیوں کی طرح اکڑ کر سیدھی کھڑی تھی وہ دونوں بازو فضا میں لہراتی جیسے پرندہ اڑنے سے پہلے پر پھیلاتا ہے اور پھر بڑے خوبصورت انداز میں انہیں لہرا کر سامنے سے لاتی ہوئی سینے پر باندھ لیتی۔ پھر ہاتھ باندھے ہوئے ہی بگلے کی طرح پھونک پھونک تین قدم اٹھا کر آگے چلتی۔ پھر رک کر جھٹکے سے بازو سیدھے کر کے پہلو میں لٹکا لیتی اور پورا گھوم کر ایک چکر لیتی۔ بعد ازاں دو لمحے رک کر از سرِ نو بازو لہرا کر سینے پر باندھ کر قدم اٹھاتی۔ اسی طرح وہ ڈانس فلور پر دھیرے دھیرے آگے بڑھتی ہوئی چکر کاٹنے لگی۔

وہ سبک انداز میں چنگ کے ساتھ تحرک رہی تھی۔ گورے بدن پر اس نے گاڑھے نیلے رنگ کا بلاؤز پہنا تھا جس کی آستین کوئی نہ تھی اور نیچے اسی رنگ کی نیکر تھی جو گھٹنوں سے ذرا اوپر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ اس کی گوری بھری بھری پنڈلیاں اور گورے گداز بازو نیلے رنگ کی وجہ سے اور بھی چمک رہے تھے اور نیم سپاہیانہ مارچ اور نیم مجوبانہ رقص میں یوں لہرا رہے تھے جیسے شیشے کے ڈبے میں رنگدار مچھلی ٹھکیلیاں لیتی ہوئی تیرتی ہے۔

آرکسٹرا والے جلدی جلدی اُلٹے سیدھے ساز بجا کر اس کے قدموں کی سنگت کے لئے کوئی دھن ڈھونڈنے لگے۔

بے سرے اور بے ربط سازوں کی آواز پر ہال کے سارے لوگوں نے ادھر دیکھا تو فوراً ہی انھیں بات سمجھ میں آ گئی۔ ایک میز پر سے ایک جوان سا لڑکا اٹھا اور بھاگ کر بینڈ والوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے سازندے سے وائلن اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ہاتھ کے اشارے سے باقی سازندوں کو خاموش کرایا۔ اور وائلن پر ایسی دھن بجانے لگا جو بار بار بجتی ٹوٹتی تھی۔

"THAT IS IT" فلور سے روز میری چلائی اور میوزک کے دقفوں اور تان کے ساتھ اس کی حرکات میں شدت پیدا ہونے لگی۔

بینڈ والوں نے چند لمحے سنا۔ پھر ڈرم والے نے ہلکے سے ایک چوٹ لگائی۔ وقفے کے بعد غیر یقینی انداز میں دوسری۔ پھر ذرا اعتماد کے ساتھ تیسری۔ اور پھر وہ سُر میں چالو ہو گیا۔

بانسری نے بھی ایک دو اُلٹے سیدھے سانس لئے اور پھر اپنی دلنوازئے کے ساتھ شریک ہو گئی۔

باقیوں میں سے چند نے سر ہلائے، چند ہنسے، چند سمجھ کر اُچھلے اور چند ہی ثانیوں میں ایک مربوط سی دھن ہال میں گونجنے لگی۔ پیٹر بھاگ کر فلور پر آیا اور ڈانس میں شامل ہو گیا۔

مگر یوں لگتا تھا کہ روز میری نے جو ڈانس پسند کیا تھا، وہ بھی زیادہ معروف نہ تھا کیونکہ بہت سے لوگ اپنی اپنی کرسیوں سے اُٹھ کر آگے آ گئے اور دلچسپی سے پیٹر اور روز میری کے ڈانس کو دیکھنے لگے۔ جو ایک دوسرے کے آمنے سامنے آپس میں ایک ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ رکھتے ہوئے ڈانس کر رہے تھے۔ تماشائیوں میں سے ایک عورت فلور پر آئی اور ان کے قدم کے ساتھ قدم اُٹھا کر سیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ دو چار منٹ میں ہی وہ رواں ہو گئی۔ دیکھا دیکھی اور لوگ بھی آ گئے۔ اور پھر چند ہی منٹوں میں پورے فلور پر پندرہ بیس جوڑے ڈانس کر رہے تھے اور بینڈ والوں کی موسیقی پہاڑی جھرنے کی طرح متوازن انداز میں رُک رُک کر چل رہی تھی۔ جب وہ رکتی تو صرف ڈرم پر تین دفعہ تھاپ پڑتی جس کے ساتھ سب لوگ تین قدم آگے اُٹھاتے۔ پھر جب ایک دم بھرپور موسیقی شروع ہوتی تو وہ ہلکے جھٹکے سے ہاتھ سیدھے کرتے۔ گھوم کر پھیری لگاتے۔ سُر بدلتی تو وہ دونوں بازو لہرا کر سینے پر باندھ لیتے اور موسیقی بھی دم سادھ لیتی۔ ڈرم پکارتا۔ وہ تین قدم اُٹھاتے اور موسیقی کا فوارہ پھر سے اُبل پڑتا۔ ڈانس کے ساتھ نہ صرف موسیقی میں دلنواز تال تھی بلکہ حرکات اور جسمانی جنبش میں بھی ایک ایسا خوبصورت آہنگ تھا جو ناچنے والوں اور دیکھنے والوں کو یکساں طور پر مسحور کر دیتا تھا۔

ڈانس میں روانی آتی گئی۔ بینڈ والوں کا اعتماد بڑھتا گیا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ جو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے، تال سے تالی بجانے لگے۔ سب بیرے اور سٹیورڈ اپنی جگہ سے اُٹھ کر لاؤنج میں آ گئے ـــــ حتیٰ کہ مین کاؤنٹر والے بھی اپنی جگہ چھوڑ کر ایک کونے میں اکٹھے ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے لاؤنج کا ماحول بدل گیا۔ ڈم۔ ڈم۔ ڈم۔ تھاپ پڑتی تو ناچنے والوں کے سارے جسم ایک بڑے پیکر کی شکل میں تین قدم اٹھاتے پھر ہوا کے ایک جھونکے سے جیسے چمن کے سارے پھول ایک طرف جھوم جاتے ہیں، وہاں موسیقی کے ریلے سے کئی بازو لہرا کر سینوں سے چپک جاتے۔ سرمستی سے پھیری لی جاتی اور پھر ڈم۔ ڈم۔ ڈم!

روز میری اسی طرح ناچتی ناچتی فلور سے نیچے اُتری۔ ڈانس کے قدموں کو لبالب موسیقی میں ڈبوتی ہوئی دھیرے دھیرے بار کاؤنٹر کی طرف بڑھنے لگی۔ وہاں سے اس نے تین چار بوتلیں بیئر کی اُٹھائیں۔ بار مینڈ سے بوتل کھولنے والا مانگا اور فضا میں بوتلوں کو لہراتی ڈانس کرتی بینڈ والوں کے پاس پہنچ گئی۔ پھر جھومتے ہی جھومتے، اس نے گلاس پیانو پر رکھے۔ ان کو اشارے سے کھولنے کی اجازت دی، اور اسی طرح ڈانس کرتی کرتی فلور کی طرف مڑ گئی۔

ہال میں دیکھنے والے پاگل سے ہو کر تالیاں پیٹنے لگے۔

آرکسٹرا کو گویا نئی طاقت مل گئی۔

ناچنے والوں کے رگ و پے میں جیسے کسی نے بجلیاں بھر دیں۔

لوگ جھومے — ہال جھوما — فضا جھومی — اور کائنات جھومنے لگی۔

دلوں کی دھڑکن رک گئی۔ ذہنوں کی سوچ تھم گئی۔ آنکھوں کی حرکت منجمد ہو گئی۔ ہال میں ہر چیز ساکت تھی۔ سوائے چند جسموں کی لہروں کے جو سازوں کے زیر و بم سے یک جان ہو گئی تھیں

نہ معلوم ڈانس کتنی دیر چلتا رہا مگر جب ناچنے والے بے دم ہو کر پسینے سے شرابور ہو گئے۔ اور سازندوں کے ہاتھ شل ہونے لگے تو موسیقی تھم گئی۔ اور سب لوگ جیسے دوبارہ دنیا میں واپس آ گئے۔

لوگ اپنی اپنی جگہ پہنچے تو تھکاوٹ کے باوجود ان کے چہروں پر طمانیت کی چمک تھی جیسے ان کو دنیا میں اور کوئی خواہش باقی نہیں۔

بیرے اور سٹیورڈ لپک لپک کر ان کے گلاس بھرنے لگے۔ اور سازندوں کے مائکروفون سے روز میری کی آواز ابھری۔

"خواتین و حضرات! میں بہت مشکور ہوں کہ آپ نے اس ڈانس کو پسند کیا۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض کر دوں کہ یہ نیوزی لینڈ کے پہاڑی قبائل کا ڈانس ہے جو وہ انتہائی خوشی کے موقعوں پر کرتے ہیں اور جب فصلیں پکتی ہیں تو پوری کی پوری آبادی ساری ساری رات مل کر یہ ڈانس کرتی رہتی ہے اور کئی نسلوں سے یہ بہت دل پسند ڈانس ہے۔ شکریہ!"

لوگوں نے تالیاں بجا کر روز میری کا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر ایک لمبا تڑنگا ادھیڑ عمر کا مرد حاضرین میں سے اُٹھ کر مائکروفون کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"خواتین و حضرات! ہم اس نوجوان خاتون کے انتہائی مشکور ہیں جنہوں نے ہمیں اس خوبصورت ڈانس سے روشناس کرایا — اور میری تجویز ہے کہ آج رات اس ڈانس کے علاوہ اور کوئی ڈانس نہ کیا جائے۔"

تجویز کی بے حد مقبولیت کی وجہ سے ہال تالیوں سے پھٹ پڑا۔

اس کے بعد کافی رات گئے تک میں وہاں بیٹھ کر اس ڈانس اور موسیقی کا مزا لیتا رہا اور جب اپنے کمرے میں جانے کے لئے اٹھا تو لوگ ابھی ڈانس کے جوش میں بدحال تھے۔

اگلی صبح دین پسار کی سبز فضا میں نکھار اور تازگی تھی۔ انڈونیشیا میں دو ہی موسم ہوتے ہیں۔ مرطوب اور خشک۔ دسمبر سے مارچ تک سخت بارشیں ہوتی ہیں، اور اپریل سے اکتوبر تک خشک موسم۔ گو نمی کی ہمیشہ ہی بہتات ہوتی ہے اور موسم گرمی کی طرف مائل ہے، سوائے صبح اور شام کے جب ٹھنڈی ہوائیں اپنے نرم لمس سے لوگوں کو گدگداتی ہیں۔ اس نیم گرم اور نیم سرد موسم میں سال بھر بالی جزیرے کے مختلف شہروں میں پوجا کے تہوار ہوتے رہتے ہیں۔ ہر جگہ کی مقامی خوبصورتی یا مقامی روایتی مذہبی قصوں کو منانے کے لئے لوگ مندروں میں اکٹھے ہوتے رہتے ہیں۔ یا پوجا کرنے والوں کے جلوس بڑے بڑے بت اٹھائے بھجن گاتے، اور پوجا کے ڈانس کرتے شہر کی گلیوں کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ پوجا بالی کے رگ و پے میں رچی ہوئی ہے اور ہر طرف اونچے مندروں کے مینار اور کلس اس کے لئے مناسب فضا بناتے ہیں۔ شاید اسی لئے اسے دیوتاؤں کا جزیرہ کہتے ہیں۔

وہ اگست کی صبح تھی جب گرم موسم میں خنکی کی ایک خوشگوار لہر ڈین پسار میں گھوم جاتی ہے۔ ہوٹل کے باہر وسیع باغ میں اونچے اونچے درختوں کے درمیان گھومتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ آج کوٹا بیچ (KUTA BEACH) کا چکر لگایا جائے جو بالی کی سب سے معروف جگہ ہے۔ اور جس کے اشتہاروں سے اخبار اور پوسٹروں سے نوٹس بورڈ بھرے ہوتے ہیں۔ ہوٹل کے پورچ میں آسٹریلین سیاحوں سے لدی ہوئی بسیں آ رہی تھیں یا جا رہی تھیں۔ اور ہر طرف چہل پہل تھی۔

کوٹا بیچ شہر ڈین پسار سے کوئی دس کلومیٹر دور ہے۔ کوٹا شہر بھی بالکل بیچ کے اوپر واقع ہے۔ اور میں ٹیکسی سے شہر میں ہی اتر گیا تاکہ آہستہ آہستہ پیدل سیر کرتے ہوئے ساحل پر پہنچ جاؤں۔ کوٹا بالکل چھوٹے صوبائی شہروں کی طرح ہے۔ زیادہ تر ایک دو منزلہ عمارتیں، غیر کشادہ سڑکیں چھوٹی گلیاں اور ملے جلے سائز کی دکانیں جابجا بکھری ہوئی۔ چونکہ اس ساحل پر سیاحوں کی بہت زیادہ آمد و رفت ہے اس لئے جابجا ریستوراں ہیں اور مقامی مصنوعات کی دکانیں ہیں جن میں سیپ کے بنے ہوئے زیورات، ظروف اور زیبائشی چیزیں ہوتی ہیں یا پھر عمدہ لکڑی کے بت اور خوبصورت میناکاری کا کام ہوتا ہے جس کے لئے بالی بہت مشہور ہے۔ جیسے جیسے ساحل کی طرف بڑھتے جائیں ان کی دکانوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور خریداروں کا ہجوم بڑھتا جاتا ہے۔ جن میں سے کئی ایک تو ساحل سے چل کر آئے ہوتے ہیں اور نہانے کے لباس میں ہوتے ہیں۔ مرد جانگیہ پہنے ہوئے اور عورتیں بکنی میں۔ پاؤں ننگے اور سروں پر دھوپ سے بچنے کے لئے چھتریاں۔

شہر میں چلتے چلتے میں نے دیکھا کہ جابجا ناریل کے درختوں کے تنے کے گرد رنگین جھالریں اور پھول لگائے ہوئے ہیں۔ کسی سے پوچھا تو پتہ چلا کہ آج کسی دیوتا کی عبادت کا دن ہے۔ اس دن ناریل کے درخت سے کوئی پھل نہیں اتارتے، نہ ہی اسے کوئی گزند پہنچاتے ہیں بلکہ اسے پانی دیتے ہیں۔ اس کے ارد گرد جھاڑو لگا کر صفائی کرتے ہیں اور اسے سجاتے ہیں۔ ایک دکاندار نے یہ بھی بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر میں ادھر سے پوجا کا جلوس بھی گزرے گا جو سامنے والے مندر میں جائے گا:

"ہیلو!"

"ہائے!"

"آپ کدھر؟"

"بس ویسے ہی گھوم پھر رہے ہیں۔"

پیٹر، الیگزانڈر اور روزمیری ایک دکان سے نکلتے ہوئے مل گئے۔

"ہم تو سورج نکلنے سے پہلے ہی ہوٹل سے نکل آئے تھے۔" روزمیری بہت موڈ میں تھی۔ "ڈین پسار سے ہم نے موٹر سائیکلیں کرایے پر لیں اور دھوپ نکلنے سے پہلے یہاں پہنچ گئے —— بہت لطف آیا۔"

"یہاں کی خوبصورتی کا مزہ لینے کے لئے موٹر سائیکل سے بہتر اور کوئی سواری نہیں —— اور پھر یہ تازہ ہوا ——" الیگزانڈر بولا۔ اور منہ اوپر اٹھا کر زور سے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

"اب کیا ارادے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بس گھومتے ہوئے BEACH پر جا رہے ہیں۔ وہاں نہانے کا مزہ لیں گے۔"

"اگر تم کچھ اور دیکھنا چاہو تو ابھی پوجا کا جلوس ادھر سے گزرے گا اس لئے ذرا رُک جاؤ ——"

"ارے واقعی؟" الیگزانڈر اچھل کر بولا۔ "میں ذرا اپنے کیمروں میں فلمیں ڈال لوں۔"

اس نے کمر پر سے بیگ اتار کر رکھا اور اندر سے چیزیں نکالنے لگا۔ کیمرے، ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر، سبھی کچھ اس چھوٹے سے بقچے میں

سمایا ہوا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد جلوس نمودار ہوگیا۔ وہ ایک پہاڑی سے اُتر کر نیچے ہماری طرف آ رہے تھے، اور سڑک کے نشیب میں ہونے کی وجہ سے ہم انھیں ڈھلان سے اترتے ہوئے خوب واضح طور پر دیکھ سکتے تھے۔

وہ تقریباً سو لوگ تھے۔ مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے۔ کئی لوگوں نے دو لمبے بانسوں کو اپنے کندھوں پر تھام رکھا تھا۔ ان بانسوں کے اوپر مچان سی بنی تھی جس پر ایک دیوتا کی بہت بڑی مورتی رکھی تھی۔ مورتی کے سامنے چلنے والوں میں ڈھولک والے، بانسری والے اور دوسرے سازوں والے تھے۔ اور ان سے آگے چار لڑکیاں ہاتھوں میں ناریل کے پتے پکڑے ہوئے ڈانس کرتی ہوئی آ رہی تھیں۔ ارد گرد چلنے والوں میں اکثر نے یا تو ناریل کے پتے اُٹھائے ہوئے تھے یا دونوں ہاتھ سامنے جوڑے ہوئے تھے، جیسے ہندو نمستے کرتے ہیں۔ چند لوگ جن میں مرد، عورتیں اور بچے شامل تھے، بلند آواز میں بھجن گا رہے تھے۔ یہ سارا جلوس دھیرے دھیرے آگے بڑھتا ہماری طرف آ رہا تھا۔ اور جہاں ہم کھڑے تھے، وہاں سے دوسری سڑک پر مڑ کر مندر میں جانے والا تھا۔

ڈانس کرنے والی لڑکیوں کا لباس بہت دلکش تھا۔ اپنی کمر اور ٹانگوں کے گرد انھوں نے سبز رنگ کے ڈھیلے کپڑے لپیٹے تھے جن کی سلوٹیں ساڑھی کے انداز میں لٹکی تھیں۔ سبز رنگ پر سنہرے رنگ کی بھاری کشیدہ کاری تھی۔ کمر سے اوپر سنہری رنگ کی چولیاں یا بلاؤز تھے جن سے پیٹ اور سینہ بہت چست انداز میں ڈھکے تھے اور سنہری رنگ میں سرخ اور سبز رنگوں کی خوبصورت کشیدہ کاری تھی۔ کمر کے گرد عنابی رنگ کے ڈھیلے کمربند ایسے جھول رہے تھے جیسے ہمارے ہاں عورتیں گلے میں دوپٹہ پہنتی ہیں۔ ان کے سروں پر سنہری تاج تھے جن میں سرخ اور سبز رنگوں کے پتھر تھے اور تاجوں سے لٹکے ہوئے بڑے بڑے سرخ آویزے ان کے کانوں کو ڈھانپ رہے تھے۔ جب وہ ڈانس کرنے میں گھومتیں تو سارے لباس کے ڈھیلے حصے بڑے دلکش انداز میں لہرا کر خوبصورت قوسوں کی شکل میں پھیل جاتے، وہ ہر لڑکی فضا میں رنگ اور چمک کے دائرے بناتی موسیقی کے ساتھ نپے تلے قدم اٹھاتی گویا خشکی پر ہی تیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

راہ گیر رک گئے ـــــ دکانوں پر لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے ـــــ اُنھوں نے دونوں ہاتھ پرنام کے انداز میں جوڑے اور سر جھکا کر ماتھے تک لے گئے ـــــ عورتیں گم سم کھڑی ہوگئیں اور ان کے ہونٹ دعاؤں سے ہلنے لگے ـــــ ٹورسٹ لوگ اپنے اپنے کیمروں سے دھڑا دھڑ فوٹو لینے لگے ایگزانڈر بھی بھاگ بھاگ کر مختلف زاویوں سے اپنا کیمرہ چلا رہا تھا ـــــ اور بار بار کہہ رہا تھا: "FANTASTIC - FANTASTIC"

گلی میں مکمل سناٹا تھا۔ سوائے پوجا کی موسیقی کے کوئی آواز نہ تھی۔ جلوس کی بہتی ہوئی چال اور ناچنے والیوں کی سبک پھیریوں کے علاوہ اور کوئی حرکت نہ تھی اور پورا ماحول دم بخود ہو کر جلوس کے پیکر میں سما گیا تھا جس پر دیوتا کی مورتی خاموش خدائی کر رہی تھی ـــــ فقیر بھی گدائی چھوڑ کر ساکت ہو گئے۔

میری کہنی پر کسی نے دھیرے سے ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو روزمیری میرے کان میں سرگوشی سے کہنے لگی "تم نے غور کیا کچھ ـــــ ان کے سازوں کی دُھن تو بالکل ویسی ہی ہے جیسی رات والے ڈانس کی تھی ـــــ اس دُھن پر تو وہ ڈانس بہت اچھا ہو سکتا ہے"

میں نے تائید میں سر ہلایا تو وہ لپک کر ایگزانڈر کے پاس گئی۔ اسے بھی غالباً یہی کہا ہوگا۔ کیونکہ اس نے چند لمحے غور کیا۔ پھر لپک کر اپنے بیگ کے پاس آیا اور اس میں سے ٹیپ ریکارڈر نکال کر چالو کر دیا۔

جلوس قریب آگیا۔ دیوتا کا جمال اور بھجن کا طلسم سب تماشائیوں پر چھا گیا اور وہ خود بت سے بن گئے۔

ناچنے والی لڑکیوں کے بے خود جسم گویا ثواب کے پسینوں سے شرابور تھے۔ باقی ہر چہرے پر گہری عقیدت تھی۔ صرف دیوتا کی مورتی کا چہرہ بغیر کسی جذبات کے ایک ساکت معمہ تھا جس کا کسی کو اندازہ نہ تھا کہ اس کی سوچ یا جذبے کا کیا رنگ ہے ـ اور یہ ان چند لمحوں کا معمہ نہ تھا بلکہ قرن ہا قرن کا معمہ

تھا جسے صدیوں کی پوجا، ان گنت التجائیں اور لامحدود دعائیں بھی حل نہیں کر سکیں۔

جلوس گزر جانے کے بعد میں شہر میں اکیلا گھومتا رہا اور پھر چلتا چلتا ساحل پر پہنچ گیا۔

کوٹا بیچ (KUTA BEACH) ایک خوبصورت بیچ ہے۔ وسیع نصف دائرے کی شکل میں اپنی آغوش وا کئے یہ ہمکتی، چلبلاتی، اچھلتی کودتی لہروں کو اپنے سینے سے لگائے رہتی ہے گھنے درختوں کی لمبی قطار کے نیچے صاف شفاف بھوری ریت کی سپاٹ ڈھلوان کسی فلسفی کی سوچ کی طرح دھیرے دھیرے اترتی ہے اور سمندر کے نیچے گھس جاتی ہے جیسے کھلنڈری لہروں کو نیچے سے سہارا دے رہی ہو۔ سمندر کی طرف دیکھیں تو ایک لامحدود نیلا پیکر بدمست دیو کی طرح غصے میں پیچ و تاب کھاتا نظر آتا ہے۔ اس کے ماتھے کی سلوٹ ابھر کر بل کھاتی کھاتی ایک دیو پیکر لہر بن جاتی ہے جو حملہ آور فوج کی طرح یلغار کرتی ہماری طرف آتی ہے۔ اور جب ہیبت طاری ہونے ہی لگتی ہے تو غیر محسوس انداز میں نیچے گھسی ہوئی خشکی گویا اپنا سہارا واپس لے لیتی ہے یا اسے نیچے سے ہی ایسے پنکچر کر دیتی ہے جیسے مگرمچھ کے نرم پیٹ میں نیچے سے چاقو گھونپ دیا جائے۔ اور وہ دیو پیکر لہر ایک دم ہانپتی کانپتی دھڑام سے نیچے گر کر ادھر ادھر بکھر جاتی ہے۔ اور چند لمحوں بعد پھولے ہوئے بے جان جھاگ کے علاوہ کچھ بھی نہیں رہتا۔ چند لمحوں کے مختصر دور میں یہ لہر بڑے طریقے سے ہست و نیست کا فلسفہ سمجھا کر غائب ہو جاتی ہے۔

سمندر اور زمین کا یہ سنگم بہت ہی عجیب منظر پیش کرتا ہے۔ اک مسلسل حرکت، دوسرا بالکل جمود۔ اک مستقل دھاوا، دوسرا خاموش مدافعت — ایک تلاطم اور تلون، دوسرا سکون اور سکوت۔ لوگ زمین کے یکساں ٹھہراؤ سے بور ہو کر سمندر کے ہیجان کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور نظر کی لامحدود اڑان کا مزہ لیتے ہیں جو افق تک بغیر کسی روک ٹوک کے اڑتی جاتی ہے۔ درخت، عمارت، کھمبا یا پہاڑ کوئی بھی حائل نہیں ہوتا۔ جب نظر کی اڑان لامحدود ہو جائے تو سوچوں کی وسعت اور جذبات کی مچل ہی بڑھ جاتی ہے اور اسی وجہ سے اس بیچ پر لوگوں کا ہجوم تھا۔

وہ ساحل کے پایاب پانی سے آگے بڑھتے جاتے حتیٰ کہ کسی لہر کا پہاڑ چیختا چنگھاڑتا ان کو روند ڈالنے کے لئے لپکتا ہوا آتا۔ وہ غوطہ لگا جاتے اور پانی کا پہاڑ اپنی ہی رفتار کے ہاتھوں آگے آ کر فنا ہو جاتا۔ اور اس کا بظاہر حقیر شکار پانی میں سے ابھر کر اگلی لہر کی طرف چلنے لگتا جہاں پانی اور مٹی مل رہے تھے۔ وہاں نہانے والوں کا یہ کھیل جاری رہتا اور جہاں خشکی تھی وہاں نہانے والے تھک کر جا بجا لیٹے ہوئے تھے۔ کئی ایک بالی کی لڑکیوں سے مالش کروا رہے تھے جو وہاں جوق در جوق مالش کرنے کے لئے گھوم رہی ہوتی ہیں۔ کئی ایک محض سستا رہے تھے بعض چھتریوں کی اوٹ میں بیٹھے بیئر پی رہے تھے یا فروٹ کھا رہے تھے۔ جو سائیکلیں اور موٹر سائیکلیں کرایے پر ملتی تھیں جوان عمر کے لڑکے اور لڑکیاں ان کا مزہ لیتے ہوئے ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ سارے ساحل پر میلے کا سا سماں تھا۔ اور اگر کوئی چیز اس پُرمسرت ماحول کو خراب کرتی تھی تو فقیروں کی بڑی تعداد تھی جو بار بار آ کر بھیک لینے پر اصرار کرتے اور لوگ ناگواری سے ان کو جھڑک دیتے۔

سیاحوں میں اکثریت آسٹریلیا کے لوگوں کی تھی۔ کچھ ان کا کلچر آزادانہ ہے، کچھ بالی کی فضا میں برداشت کافی ہے۔ اس لئے اکثر عورتیں ٹاپ لیس تھیں (TOP-LESS) اور صرف جانگیے پہنے اور ننگی چھاتیاں لئے نہا رہی تھیں یا سستا رہی تھیں یا سیدھی لیٹی ہوئی مقامی لڑکیوں سے مالش کروا رہی تھیں۔

چھوٹے چھوٹے لڑکے مقامی مصنوعات اٹھائے سیاحوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ان سے مول تول کر رہے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ یہ چیزیں خرید لیں۔ ان میں لکڑی کے تراشے ہوئے بت تھے۔ سیپ اور گھونگوں سے بنے ہوئے زیور تھے، اور باتیک یا کشیدہ کاری والے کپڑے تھے — اگر ان سے خریدتے نہ تھے تو وہ پیٹ دکھا کر بھیک مانگنے لگتے تھے۔

میں اسی طرح گھوم رہا تھا اور فقیروں سے بچ بچ کر چل رہا تھا۔

ایک جگہ لوگوں کا ہجوم سا دیکھ کر ادھر گیا۔ لوگ ایک بڑے گول دائرے کی شکل میں کھڑے تھے اور اندر کچھ دیکھ رہے تھے۔ دائرے کے

اندر سے موسیقی کی آواز اُبھر رہی تھی۔ میں نے بھی لوگوں کے کندھوں کے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔

دائرے کے اندر چھوٹا ٹیپ ریکارڈر پڑا تھا اور روزمیری، پیٹر، اینگلز، اندرا اور چندا اور لوگ مل کر وہی ڈانس کر رہے تھے جو پچھلی رات ہوٹل میں ہوا تھا۔

ٹیپ پر موسیقی اسی بھجن کی تھی جو تھوڑی دیر پہلے پوجا کے جلوس کے ساتھ گایا جا رہا تھا

ناچنے والوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ارد گرد کھڑے ہوئے تماشائیوں میں سے بعض کے ہاتھوں میں بیئر کی بوتلیں تھیں، اور بعض تالی بجا کر تال دے رہے تھے بعض ویسے ہی اپنی اپنی جگہ کھڑے ہوئے ہولے ہولے تال سے ہل رہے تھے اور ناچنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔

ساحل پر اِدھر اُدھر سے اور لوگوں نے بھی ہجوم دیکھا تو وہ ہنستے ہوئے اور ٹہلتے ہوئے اِدھر آنے لگے۔

کچھ لوگ لہروں میں سے نہانا چھوڑ کر اِدھر آ گئے۔

ناچنے والے سرشار تھے۔ روزمیری تو گویا مست ہو رہی تھی۔ باقی لوگ بھی جھومتے ہوئے جنگ سے سبک انداز میں ڈانس کر رہے تھے۔

تھوڑے تھوڑے وقفے بعد تماشائیوں میں سے اور لوگ بھی آ کر ڈانس میں شریک ہوتے گئے۔۔۔۔ ان میں کافی ایسی عورتیں بھی تھیں جو بکنی پہنے تھیں اور کئی ایک TOP-LESS بھی تھیں۔

اب گروپ کافی بڑا ہو گیا تھا بھجن کے بول اور موسیقی فضا میں گونج رہے تھے۔ عورتوں کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور جو ٹاپ لیس تھیں ان کی ننگی چھاتیاں بے تحاشا ہل رہی تھیں۔

پیٹر بے دم ہو کر رُک گیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

میں نے دھیرے سے اسے ہاتھ سے پکڑا اور لوگوں کے ہجوم سے باہر لے گیا۔

"پیٹر یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو؟"

"ہم مزہ لے رہے ہیں" وہ لہرا کر بولا۔

"تمہیں احساس نہیں کہ یہ مذہبی بھجن ہے اور اس کے ساتھ نیم برہنہ عورتوں کا ڈانس یہاں کے مقامی لوگوں کو ناراض کر سکتا ہے:"

"میں نے ان کے مندروں میں پوجا کے نیم برہنہ رقص دیکھے ہیں اور ہم تو بیچ پر کر رہے ہیں۔"

"مندر میں پوجا کا رقص جب پجارن کرتی ہے تو وہ اور بات ہے۔ مگر یہاں اور بات ہے۔ بھجن ایک مقدس چیز ہے۔ اور اسے عام میوزک نہیں سمجھنا چاہیئے۔۔۔۔ تم دیکھ نہیں رہے، ان درختوں میں جو مقامی لوگ کھڑے ہیں۔ ان کے چہروں سے ناراضگی کا اندازہ ہوتا ہے۔"

"ڈیم اِٹ۔۔۔۔ ہم ان کے مندر میں کوئی بُری حرکت نہیں کر رہے۔۔۔۔ یہ مندر نہیں، بیچ ہے۔ اور یہاں ہر کوئی آزاد ہے۔ جیسے وہ چاہے، کرے۔"

وہ ناگواری سے مجھے وہیں کھڑا چھوڑ کر پھر سے ڈانس میں شامل ہو گیا۔

ڈانس اب بھی اسی شد و مد سے جاری تھا۔۔۔۔ بلکہ بعض جوڑے تو اب بغلگیر ہو کر ویسے ہی چکر کاٹ رہے تھے۔ ان میں اکثر ایسے تھے جن میں دونوں نے صرف جانگیہ پہنا ہوا تھا کیونکہ وہ سمندر سے نہاتے ہوئے باہر نکل آئے تھے۔۔۔۔ مگر اب ان لوگوں میں کسی کو نہانا یاد نہ تھا۔ بلکہ وہ سارے بے خودی کے انداز میں ڈانس میں گم تھے۔۔۔۔ اکثر بغلگیر ہو کر چوما چاٹی بھی کر رہے تھے۔ اور موسیقی کے ساتھ گھوم بھی رہے تھے۔

اچانک کوئی آواز بھدّ سے اُبھری اور ناچنے والوں کے عین درمیان کوئی چیز آ کر گری۔

میں نے دیکھا تو وہ بڑی سی اینٹ تھی۔

خوش قسمتی سے وہ کسی کو لگی نہیں ـــــ مگر ناچنے والوں میں سے بیشتر نے اسے نہیں دیکھا کیونکہ ریت پر آواز نہ اُبھری جن ایک دو جوڑوں نے دیکھا وہ رک کر بغیر کچھ سمجھے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

اتنے میں دو پتھر اور آئے۔ ایک ٹیپ ریکارڈر کے اوپر پڑا اور موسیقی ایک دم رُک گئی، اور دوسرا ایک عورت کے پاؤں پر پڑا اور موسیقی رُکتے ہی اس کی چیخ فضا میں اُبھری۔

موسیقی رُکنے سے ایک دم ڈانس رک گیا۔ لوگ گردنیں اُٹھا اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے مگر ان کو اندازہ نہ تھا کہ کیا ہوا۔

اتنے میں تین چار اور پتھر اندر آ کر گرے۔ ایک دو کو لگے۔ اور پھر جیسے لوگ نیند سے ہڑبڑا کر اُٹھے ہوں، اور ان کی بھیڑ تتر بتر ہونے لگی۔

میں نے دیکھا کہ درختوں کے جھنڈ کے نیچے کھڑے مقامی لوگ بہت غصے میں گالیاں دے رہے ہیں اور پتھر مار رہے ہیں۔

سیاحوں میں نوجوان بھی تھے، جوشیلے بھی تھے اور بعض نشے میں بھی تھے۔

ان میں سے چند درختوں کے جھنڈ کی طرف لپکے۔

اگلے لمحے لوگ گتھم گتھا تھے ـــــ اس جگہ ہڑبونگ سا مچ گیا۔

اِدھر اُدھر سے لوگ بھاگ کر آنے لگے۔

فضا میں پتھراؤ ہونے لگا۔

بازار سے لوگ بھاگے بھاگے ساحل پر آنے لگے۔

پولیس کی سیٹیاں گونجنے لگیں۔

سرکاری گاڑیاں اور جیپیں بھاگی آئیں۔

دسل ـــ گالیاں ـــ پتھر ـــ خون ـــ ہائے وائے۔

جس کا جدھر منہ اُٹھا بھاگا۔

میں ہوٹل میں پہنچا تو اعلان ہو رہا تھا کہ شہر میں کرفیو قسم کا کوئی آرڈر نافذ ہو گیا ہے اور کل شام تک کوئی شخص ہوٹل سے باہر نہیں جا سکتا۔

آدھے گھنٹے بعد اعلان ہوا کہ ڈین پسار کا ہوائی اڈہ بند کر دیا گیا ہے اور سیاحوں کا کوئی جہاز تا حکم ثانی وہاں نہیں اُترے گا۔

اس شام ہوٹل کے لاؤنج کا ماحول بہت مختلف تھا۔ بینڈ والے سازوں پر ڈانس کے دھن بجا رہے تھے مگر کوئی بھی ڈانس فلور پر نہیں آتا تھا اس کی بجائے سب ٹورسٹ چھوٹی چھوٹی پارٹیوں میں بٹے ہوئے دن کے واقعات پر تبصرے کر رہے تھے۔ تبصرے کیا تھے محض غصہ کا اظہار تھا۔ ان میں سے کوئی بھی یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ انھوں نے زیادتی کی ہے۔ سفید فام لوگوں کی مخصوص ذہنیت عیاں تھی کہ جہاں بھی دوسری رنگدار قوم کا مقابلہ ہو وہ ہمیشہ اپنے آپ کو صحیح اور رنگدار قوم کو غلط بتائیں گے۔ انھیں صرف اس بات کا رنج تھا کہ ان کی چھٹی خراب ہو گئی۔ بالی میں گھومنے کا ایک دن ضائع ہو گیا۔ ساتھ ساتھ افواہیں گھوم رہی تھیں۔ کوئی کہتا تھا پانچ آدمی زخمی ہوئے، کوئی کہتا تھا سو سے زیادہ زخمی ہیں۔ ایک آدمی کے بارے میں افواہ اُڑ گئی کہ وہ مر گیا ہے۔ مگر تھوڑی دیر بعد وہ اپنے کمرے سے اُتر کر آیا اور بیئر ہاتھ میں پکڑے لاؤنج میں گھومنے لگا۔

میں اکیلا بیٹھا تھا کہ پیٹر اور روزمیری میرے پاس آن بیٹھے۔

"اُف" پیٹر نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا "میرے خدا ـــ کتنا پاگل پن ہے۔"

"کون سا پاگل پن؟" میں نے پوچھا۔

پیٹر نے بڑی حیرت سے میری طرف دیکھا، "تمہیں کچھ نظر نہیں آیا آج؟"

"مجھے تو ہونے سے بھی پہلے نظر آگیا تھا۔ اور میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی ۔۔۔ مگر میں اسے پاگل پن نہیں کہوں گا۔"

"کمال ہے ۔۔۔ تمہاری سوچ بھی ان جنگلی لوگوں جیسی ہے۔"

"تم میری سوچ کی فکر نہ کرو ۔۔۔ ہر کلچر کی اپنی سوچ ہوتی ہے ۔۔۔ مگر یہ سوچ کی بات نہیں، رویوں کی بات ہے ۔۔۔ ضروری نہیں تم لوگوں کے سارے رویے درست ہی ہوں ۔۔۔ یا ہم انھیں ہر حال میں درست کہیں۔"

"مگر میری سمجھ سے تو بالاتر ہے کہ تم کس رویے کا ذکر کر رہے ہو۔" پیٹر بولا۔

کوئی خاص رویہ نہیں۔ بالکل عام سی بات ہے کہ جس چیز کو یہاں کے لوگ عبادت سمجھتے ہیں۔ تم لوگ اس کے ساتھ سر بازار فحش ڈانس کرو گے تو ان لوگوں کو دکھ پہنچے گا۔"

"مگر عبادت تو مندر میں ہوتی ہے۔ وہاں کون سی عبادت تھی؟"

"ان کا بھجن جہاں بھی ہو گا، وہ عبادت کی تقدیس چاہے گا۔"

"مگر یہ بتاؤ۔ یہ عبادت کیوں کرتے ہیں؟" روزمیری پوچھنے لگی۔

"جس چیز کے لئے تم کرتے ہو ۔۔۔ خدا کو خوش کرنے کے لئے۔" میں نے کہا۔

پیٹر بے صبری سے بولا "تمہارے خیال میں کیا خدا ان لوگوں سے خوش ہے؟"

"مجھے کیا پتہ۔ یہ تو خدا ہی جانے۔"

"خدا کیوں جانے۔ میں جانتا ہوں کہ خدا ان سے خوش نہیں ہے۔" وہ جوش سے بولا۔

"وہ کیسے؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"اتنی خوبصورت سرزمین، اتنی زرخیز مٹی، اتنا وافر پانی ۔۔۔ اور اس پر اتنی غربت ۔۔۔ اتنا افلاس ۔۔۔ ان کے کھیتوں میں بھوک اگتی ہے ۔۔۔ ان کی بارش میں مفلسی برستی ہے۔ ان کی نظروں سے محرومی ٹپکتی ہے ۔۔۔ اگر خدا ان سے خوش ہوتا تو ان کا یہ حال ہوتا ہم ۔۔۔ خدا کی خوشی دیکھنی ہے تو ہمارے ہاں آؤ ۔۔۔ خدا ہم سے خوش ہے ہماری زمینیں سونا اگلتی ہیں۔ ہمارے ہاں سونے کی بارش ہوتی ہے۔ ہمارا ہر شہری اپنی ہر ضرورت پوری کر سکتا ہے۔ ضرورت ہی نہیں بلکہ خواہش بھی ۔۔۔ جیسی زمین ان کی ہے ویسی ہی ہماری ہے۔ جیسا سمندر ان کا ہے ویسا ہی ہمارا ہے ۔۔۔ جیسا موسم ان کا ہے ویسا ہی ہمارا ہے ۔۔۔ مگر ہم نے دو تین سو برسوں میں خدا کو اتنا خوش کیا ہے کہ وہ ہم سب پر مہربان ہے۔ اور یہ لوگ صدیوں سے بھجن گا رہے ہیں اور ویسے کے ویسے ہیں ۔۔۔ روزمیری کتنی پرانی تہذیب ہے ان کی؟" پیٹر نے پوچھا۔

"دو تین ہزار سال پرانی ہے۔" روزمیری بولی۔

"یہ لوگ دو تین ہزار سال سے بھجن گا رہے ہیں مگر خدا کو خوش نہیں کر سکے ۔۔۔ اس لئے کہ خاک اور دریاؤں کی آغوش میں بے جان مناجاتوں اور مالا کے منکوں کی گنتی سے خدا خوش نہیں ہوتا ۔۔۔ وہ عمل کی عبادت مانگتا ہے۔"

"تم لوگوں نے کیسے خوش کیا خدا کو دو تین سو برسوں میں؟" میں نے پوچھا۔

"ہم نے بھی وہی عبادت سیکھ لی جو صحیح ہے ۔۔۔ اور واقعی خدا چاہتا ہے ۔۔۔ ہم نے فطرت کے رموز سائنس کے ذریعے دریافت کئے اور انھیں انسانیت کی بھلائی کے لئے استعمال کیا ۔۔۔ ہم نے دریاؤں کو گناہ دھونے کے لئے نہیں استعمال کیا بلکہ بجلی بنانے کے لئے استعمال کیا ۔۔۔ اور بجلی جس سے ساری انسانیت کو آرام ملا ۔۔۔ خدا ہم سے خوش ہے اسی لئے اپنی فطرت کے رموز ہم پر آشکار کرتا

ہے ــــ ان کی عبادت بھجن ہے۔ ہماری عبادت ٹیکنالوجی ہے ــــ ان کی عبادت اگلی دنیا کی جنت کے لئے ہے، چاہے یہ دنیا جہنم ہی بن جائے۔ مگر ہماری عبادت سے یہی دنیا جنت بن گئی ہے ــــ اب بتاؤ خدا کس سے زیادہ خوش ہے؟"

ایک دم شور اٹھا اور لوگ گردنیں، اٹھا اٹھا کر RECEPTION COUNTER کی طرف دیکھنے لگے اور پھر بھاگ بھاگ کر اُدھر جانے لگے۔

ہم بھی اُدھر لپکے ــــ

چار آدمی ایگزانڈر کی لاش اُٹھا کر اندر لا رہے تھے۔

شہر میں کرفیو تھا ــــ اور وہ شام کو ہوٹل کے وسیع باغ میں گھوم رہا تھا کہ کسی نے اندھیرے میں درخت کی اوٹ سے نکل کر چھرے سے چار پانچ زخم لگا دیئے۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا ــــ! کوئی آدھ دو گھنٹے بعد اُدھر سے گزرا تو اس کی لاش نظر پڑی۔

پتہ چلا شہر میں چھرا گھونپنے کی اور بھی وارداتیں ہوئی ہیں۔

اس رات شہر بھر کے مندروں سے زور زور سے بھجن گانے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ لوگ بھجن کی بے ادبی کا کفارہ ہر طریقے سے ادا کر رہے تھے۔ خون سے اور عبادت سے۔

کمرے میں نیم تاریکی گاڑھی ہوتی جا رہی تھی ــــ ستار کا ریکارڈ کبھی کا دم توڑ چکا تھا اور اب خاموش تاریک کمرے میں صرف میری یادوں کی گونج تھی۔ ان یادوں میں ایگزانڈر کا مردہ چہرہ اُبھرا جس کی زندگی ایک بھجن کی تقدیس کی نذر ہو گئی تھی اور پھر جلوس میں کئی لوگوں کے کندھوں پر سوار بھگوان کی مورتی کا چہرہ اُبھرا جس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا کہ آیا وہ خوش ہے یا ناخوش۔ اور میں نے سوچا کہ ایگزانڈر کی موت کے بعد بھی یہ چہرہ ایسا ہی ہو گا بغیر تاثر کے بغیر اظہار کے۔ گو مندر کے پجاری اور بانی کے تمام مذہبی لوگ مطمئن ہوں گے کہ انھوں نے بھگوان کو خوش کر دیا ہے۔ ایگزانڈر کے خون سے۔ کئی لوگوں کے خون سے ــــ اور صدیوں پار ہزاروں لاکھوں لوگوں کے خون سے۔ ان کنواری لڑکیوں کے خون سے جن کو دیوتاؤں کی قربانی کے لئے مار دیا جاتا تھا ــــ وہ خون جو عبادت کی عقیدت سے بہایا جاتا ہے ــــ وہ عبادت جو بھگوان کو خوش کرنے کے لئے کی جاتی ہے ــــ اور وہ بھگوان جو کبھی نہیں بتاتا کہ کیا وہ خوش ہوا ہے یا نہیں ــــ یہ تینوں مل کر ایک معمہ بناتے ہیں۔ جسے حل کرنا کتنا مشکل ہے۔ اور پادری اور پنڈت بھگوان کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اور پھر مجھے اسی معمے کی ایک اور کڑی یاد آئی۔

موپساں نے اپنی کسی کہانی میں لکھا ہے کہ ان ہواؤں میں نامعلوم اسرار ہیں جو عجیب انداز میں ہمارے موڈ بدلتے رہتے ہیں۔ ایک لمحے ہماری روح اور دل اندر ہی اندر چہک رہے ہوتے ہیں۔ اور اگلے لمحے وہی دل اور روح کسی ناقابل بیان مایوسی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ہر چیز جو ہمارے گردوپیش ہے وہ غیر محسوس طریقے سے ہمارے اعصاب کو متاثر کرتی رہتی ہے۔ یہ مخفی اسرار ہمارے فہم سے بالا ہے اور ہمارے حواس سے پرے ہے۔ ہمیں اس انجانی قوت کو جھوڑا سہنا پڑتا ہے۔

ایک شام اسی قوت نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ بلا وجہ۔ بغیر کسی سبب کے ــــ دل پژمردہ۔ طبیعت اچاٹ۔ ذہن ماؤف سا ــــ

میں بغیر کسی مقصد کے گھر سے باہر نکلا اور کسی منزل کا تعین کئے بغیر ایک طرف چل دیا۔

منیلا کی سڑکیں ٹریفک کا جنجال ہیں۔ لوگ پاگلانہ انداز میں گاڑیاں بغیر کسی ضابطے کے چلاتے ہیں۔ ایسی سڑک پر سیر کا تصور بھی نہیں بن سکتا۔ مگر میں شور شرابے سے بے خبر گاڑیوں کی لپٹ جھپٹ سے بچتا ہوا جا رہا تھا۔

رات ڈھل رہی تھی۔ میں نے اچانک محسوس کیا کہ یا شاید یہ اس علاقے میں پہنچ گیا ہوں جہاں دن سوتے ہیں اور راتیں جاگتی ہیں۔ ایک لڑکی نے میرا ہاتھ پکڑا۔

"آپ اندر نہیں آئیں گے؟"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو بورڈ نظر پڑا "کلب اور ریستوراں"۔

میں اندر چلا گیا۔

ایسے کلب صرف اسی علاقے کے لئے مخصوص نہیں بلکہ منیلا کی گلی گلی میں بکھرے ہیں۔ ساڑھے ستر لاکھ لوگوں کے اس شہر میں جہاں جنسی آزادی عام ہے، ایسے کلب ہر علاقے میں ایک معمولی تفریح کے طور پر مل جاتے ہیں۔ سٹیج پر دو لڑکیاں مختصر سی چولی اور اس سے بھی مختصر جانگیے میں ڈانس کر رہی تھیں اونچی موسیقی سے کمرہ لرز رہا تھا۔ روشنی انتہائی مدھم تھی۔ سوائے سٹیج کے جہاں بار بار رنگ بدل رہے تھے۔

میں ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا اور کلب کی ایک لڑکی میرے ساتھ آکر بیٹھ گئی۔

دو چار باتیں ہوئیں۔ پھر لڑکی نے پوچھا۔

"تم نے ڈرنک کا آرڈر نہیں دیا؟"

"نہیں!"

"کیوں؟"

"بس دل نہیں چاہ رہا!"

"تو پھر یہاں کیوں آئے ہو؟"

میں ہنس پڑا۔ "یہ مجھے بھی معلوم نہیں۔ بس بور ہو رہا تھا۔ تو ادھر آگیا!"

"تو اب ڈرنک کرنا چاہتے ہو یا بور ہونا چاہتے ہو؟"

"ڈرنک سے بھی بوریت بڑھے گی، کم نہ ہوگی!"

"اچھا تو تم نہ پیو ــــ مجھے ایک بیئر منگوا دو۔"

چند لمحوں بعد گلاس ہاتھ میں لئے وہ کہنے لگی "کتنی دیر بور ہونے کا ارادہ ہے؟"

"پتہ نہیں!"

"میری مانو تو مجھے رات کے لئے ساتھ لے چلو۔ تمہاری سب بوریت دور کر دوں گی!"

"واقعی؟ ــــ بہت اعتماد ہے تمہیں اپنے اوپر؟"

"کیوں نہ ہو ــــ یہ میرا پیشہ ہے۔"

"کب سے ہے؟"

"سال بھر ہو گیا ہے!"

میں نے دیکھا تو وہ شکل سے اٹھارہ بیس برس کی لگتی تھی۔

"کتنا عرصہ کرنے کا ارادہ ہے؟" میں نے طنزیہ پوچھا۔

"ایک سال اور۔"

"پھر؟"

"پھر یونیورسٹی میں میرا کورس ختم ہو جائے گا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ——" وہ بڑے اعتماد سے بولی "میں نے گریجویشن کر لیا ہے۔ اب ایم اے کے لئے پیسے نہیں تھے تو میں آج کل یہاں پیسے اکٹھے کر رہی ہوں۔"

"کمال ہے —— تم غیر معمولی قسم کی لڑکی لگتی ہو۔"

وہ ہنسنے لگی "اس میں غیر معمولی کی کیا بات ہے —— یہاں سب لڑکیاں یہی کرتی ہیں۔ وہ اُدھر جوزی اور میری بیٹھی ہیں۔ یہ میری کلاس میں تھیں۔ ہم تینوں نے اکٹھا پروگرام بنایا تھا۔ اور وہ جو ادھر موٹی سی بیٹھی ہے۔ وہ اپنے بڑے بھائی کو میڈیکل کالج میں پڑھا رہی ہے۔ اور یہاں سے پیسے کماتی ہے ——"

"یہ اسی کلب کی بات ہے یا باقی جگہوں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے؟"

وہ زور سے ہنسی "تم تو ایسے حیران ہو رہے ہو جیسے کوئی انوکھی بات سن رہے ہو۔ ہمارے ہاں تو اکثر لڑکیاں ایسا کرتی ہیں۔ کوئی اپنے بوڑھے والدین کو گاؤں میں زندہ رکھنے کے لئے ایسا کرتی ہے۔ کوئی اپنے بچوں یا بہن بھائیوں کو تعلیم دلانے کے لئے یہ کرتی ہے —— میں اپنی مزید تعلیم کے لئے یہ کر رہی ہوں۔"

"مگر اخلاقیات؟"

"کون سی اخلاقیات؟"

"میرا مطلب ہے —— دیکھو نا" مجھے سمجھ نہ آئی کہ اسے کیسے واضح کروں —— "اب ہمارے ملک میں تو یہ بہت بُری اور بداخلاقی کی بات سمجھی جاتی ہے۔"

"تمہارے ملک میں شاید ہو۔ مگر میں نے تو اپنی اخلاقی اقدار اپنے لوگوں سے سیکھی ہیں۔ جس ملک میں گلی گلی میں بن بیاہی مائیں ہوں وہ اسے کیسے بُرا سمجھ سکتے ہیں؟"

میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ چند منٹ بعد وہ کہنے لگی "تم خاموش کیوں ہو گئے؟"

"تم چرچ جاتی ہو؟"

"ہاں —— اکثر جاتی ہوں ——" وہ فخر سے بولی۔

"تو وہاں تمہیں خیال نہیں آتا —— کہ خدا تم سے ناراض ہو گا؟"

اس نے دو تین دفعہ آنکھیں جھپکیں —— پھر پلکیں جھکا لیں —— چند ثانیے کے بعد بیئر کا گلاس اٹھا کر دو تین بڑے بڑے گھونٹ لئے گلے سے نیچے اتارتے ہوئے اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولی "میں ذہین ہوں۔ باہوش ہوں —— خدا نے مجھے پیدائش میں بہت سی صلاحیتیں دی ہیں —— مگر بدقسمتی سے پیدائش میں مالی وسائل نہیں دیئے کیونکہ میرے والدین غریب تھے۔ اب میں اپنی صلاحیتوں کو ابھارنے

کے لئے زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کر رہی ہوں۔ کسی اور کام میں مجھے اتنے پیسے نہیں مل سکتے کہ میں دو تین سال میں بچت کر کے مناسب عمر میں ایم اے کر لوں ـــــ جب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر لوں گی تو خدا کی دی ہوئی شخصیت کی تکمیل ہو جائے گی۔ میں اپنے لئے مفید ہو جاؤں گی۔ ـــــ اپنے والدین کے لئے مفید ہو جاؤں گی ـــــ اپنے معاشرے اور دیگر لوگوں کے لئے مفید ہو جاؤں گی ـــــ تو کیا اس بات کے لئے خدا مجھ سے خوش نہیں ہوگا؟ ـــــ کیا میری ساری عمر کی افادیت دو تین سال کے بدلے قربان ہو جائے گی؟"

میں اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ پکڑا اور دھیرے سے پوچھنے لگی "بولو ـــــ خدا مجھ سے خوش نہیں ہوگا؟ اسے خوش ہونا چاہیئے نا؟"

میرے دماغ میں کھلبلی مچ گئی اور مجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اس لئے میں نے کندھے اچکا کر صرف اتنا کہا "مجھے نہیں معلوم"!

وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "یہ تو کسی کو بھی نہیں معلوم۔ ہر شخص اپنے قیاس دوڑاتا رہتا ہے ـــــ اس لئے میں اپنی زندگی دوسروں کے قیاس کے لئے کیوں ادھوری چھوڑ دوں ـــــ مجھے تو دوبارہ یہ زندگی نہیں ملنی نا ـــــ اور پھر جیسے ان کا قیاس ویسے میرا قیاس ـــــ اب یہ تو خدا ہی بتائے گا کہ کس کا قیاس درست ہے"

اس کے بعد میں دیر تک بیٹھ کر اس سے باتیں کرتا رہا۔

کئی دن گزر گئے۔

میں صبح کی سیر کا عادی ہوں۔ کافی سویرے نکل جاتا ہوں مگر ایک دن بہت جلدی آنکھ کھل گئی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے تنگ آ گیا تو اٹھ کر نماز ادا کی اور سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ عام دنوں کی نسبت اس دن کافی جلدی نکلا تھا۔

سیر کرتا کرتا کافی آگے نکل گیا۔ ایک جگہ موڑ پہ کافی بڑا اور خوبصورت چرچ تھا جس میں وہ سروس ختم ہو رہی تھی جو سورج نکلنے سے بہت پہلے صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب شروع ہوتی ہے۔ بڑی تعداد میں لوگ چرچ سے باہر آ رہے تھے جن میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔ چرچ کے باہر کار پارک میں بھی بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں اور اب ایک دم ان کے چلنے چلانے سے صبح کی فضا گویا کراہنے سی لگی میں حیران ہو رہا تھا کہ ایک طرف ان لوگوں میں خاصی جنسی آزادی ہے اور دوسری طرف ان کے چرچ ہر وقت بھرے ملتے ہیں۔ یہی سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ اچانک اس لڑکی پر نظر پڑی جو چند روز پہلے کلب میں ملی تھی۔ وہ میری ہی طرف آ رہی تھی۔ اور دور ہی سے مسکرا کر صبح بخیر کہتے ہوئے ہاتھ ہلانے لگی۔

"سیر پر نکلے ہیں؟"

"ہاں۔ میں تو روز ہی آتا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"اسی راستے پر آتے ہیں؟"

"ہاں۔ عموماً اسی پر"

"تعجب ہے۔ میں نے کبھی آپ کو دیکھا نہیں۔ حالانکہ میں اسی صبح والی سروس میں آتی ہوں"

"میں اکثر ذرا دیر سے آتا ہوں۔ میں نے بھی کبھی کسی کو گرجے سے باہر آتے نہیں دیکھا"

"اگر برا نہ مانیں تو میں بھی تھوڑی سیر کر لوں آپ کے ساتھ مجھے بھی اسی طرف جانا ہے جس طرف آپ جا رہے ہیں"

ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اس کے چہرے پر ایسی عقیدت اور سکون نظر آ رہے تھے جو پر خلوص عبادت کے فوراً بعد اکثر چہروں پر ہوتی ہے۔ اسے دیکھنے والا اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ لڑکی اس کلب کے نزدیک بھی جا سکتی ہے۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتی دھیمے انداز میں باتیں کرتی جا رہی تھی۔

"اس رات آپ کی باتوں سے میں بہت محظوظ ہوا" میں نے ویسے ہی بات کی۔

اس نے جیسے تڑپ کر میری طرف بڑی ہی زخمی نظروں سے دیکھا جیسے میں نے غلط مقام پر غلط وقت پر کتنی غلط بات کر دی میں دل ہی دل میں بڑا شرمندہ ہوا کیونکہ میں نے تو ویسے ہی گفتگو کی خاطر بات کی تھی۔

وہ رُک گئی۔

پشیمان سا ہو کر میں بھی رُک گیا۔

میری بات سے غالباً اُسے بہت تکلیف پہنچی تھی۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے سے ساری عقیدت غائب ہوگئی اور وہ ایک عام چہرہ بن گیا جو عام جذبات کے زیر اثر ہوتا ہے۔

وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی۔ اور پھر کہنے لگی "آپ بہت کھل کر بات کر دیتے ہیں ـــــ مجھے بھی اجازت دیں کہ آپ سے کھل کر ایک بات کروں"

"کہیے" میں نے دل ہی دل میں ڈرتے ہوئے کہا۔

"چلیے۔ ساتھ چلتے جاتے ہیں" اور ہم دونوں چلنے لگے۔

"دراصل میں نے آپ کے ساتھ سیر پر آنے کی جرات بھی یہی بات کرنے کے لئے کی تھی ـــــ مگر اچھا ہوا آپ نے خود ہی بات چھیڑ دی" وہ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

"بات کیا ہے؟"

"آج رات ہمارے ریستوراں میں آپ ضرور آئیے"

میں خاموش رہا۔

"اور صرف مجھ سے باتیں کر کے نہ بھاگ جائیں بلکہ مجھے خدمت کا موقع دیں"

میں کہے بغیر نہ رہ سکا "چرچ سے فوراً نکلنے کے بعد تم کس طرح ایسی بات اتنی معصومیت سے کر لیتی ہو..."

وہ بڑی سنجیدگی سے بولی "میں تو چرچ بھی اسی لئے آئی تھی"

"کیا مطلب؟"

"میں نے خدا سے بڑی عاجزی سے دعا مانگی تھی کیونکہ کل ہمارے امتحان کے داخلے کی آخری تاریخ ہے۔ اور اگر میں نہ دے سکوں گی تو میرا یہ سال ضائع جائے گا۔ میں اپنی نسوانی معذوری کی وجہ سے پچھلے پانچ دن کلب نہ گئی تھی۔ آج میں ٹھیک ہوں اور دعا مانگنے آئی تھی۔ کہ اللہ میاں آج ضرور گاہک بھیج دے"

میں خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔

اس نے چندے انتظار کیا۔ اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر رک گئی "بولو، آؤ گے نا؟"

"میں دراصل آج رات ایک سرکاری کھانے پر مصروف ہوں"

"تو کھانے کے بعد آ جانا۔ اگر مجھے کوئی اور نہ ملا تو میں تمہارا انتظار کروں گی"

"نہیں، مشکل لگتا ہے"

وہ چہرہ جو تھوڑی دیر پہلے عقیدت سے لبریز تھا اور بعد میں کاپی کے سادہ ورق کی طرح عام چہرہ بن گیا، اب اک دم کرب سے کمہلانے لگا۔ اس کی پلکیں کانپیں، ہونٹ لرزے اور عجیب پریشانی کے عالم میں اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور خاموشی سے مڑ کر میرے ساتھ چلنے لگی۔

چند منٹ تک ہم خاموشی سے چلتے رہے ــــ دونوں اپنی اپنی جگہ خفت سے لبریز تھے۔ وہ اس لئے کہ اس کی درخواست میں نے رد کردی تھی۔ اور میں ــــ نہ معلوم کس لئے۔ مگر مجھے بڑی خفت ہو رہی تھی۔ اس لئے تھوڑی ہی دور جاکر میں رک گیا۔
"بس میں یہیں تک آیا کرتا ہوں۔ اب میں واپس جاؤں گا" حالانکہ یہ جھوٹ تھا میں کافی آگے تک جایا کرتا تھا۔ مگر آج میں پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

"دکے" اس نے دھیرے سے کہا۔ اور پھر خاموش نظروں سے مجھے ایسا خدا حافظ کہا جس میں مایوسی ہی مایوسی تھی۔

میں مڑکر واپس چل دیا ــــ دو ایک لمبے لمبے سانس لے کر صبح کی "تازہ ہوا سے" اپنا موڈ درست کرنے کی کوشش کی ــــ ایک دو پتھروں کو خواہ مخواہ جوتے سے ٹھکا دیا ــــ اور قدم تیز سے تیز تر کردیئے۔

مگر پھر بھی ایک اضطراری سی کیفیت طاری تھی جس پر قابو پانے کے لئے میں نے دونوں ہاتھ اپنی پتلون کی جیبوں میں ڈال لئے ــــ اور ایک دم چونک پڑا۔

صبح اندھیرے میں غلطی سے میں نے وہ پتلون نہ پہنی تھی جو ہر روز سیر کے لئے پہنتا تھا بلکہ دوسری پہن آیا تھا اور اس کی جیب میں کچھ نقدی موجود تھی ــــ نوٹوں کی شکل میں۔

بغیر کچھ سوچے سمجھے میں مڑکر بھاگنے لگا اور چند منٹ میں اسے جالیا۔

اس نے بڑی حیرت سے مجھے دیکھا ــــ میں نے اسے بتایا کہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری جیب میں پیسے ہیں۔ اب پتہ چلا تو لوٹا ہوں۔
"میں آج تو نہیں آسکوں گا۔ مگر تم پیسے لے لو۔ اور فوراً اپنی فیس داخلہ ادا کردو۔ میں پھر کبھی چکر لگاؤں گا"

اس کا چہرہ کھل گیا۔

اور جب اس نے نوٹ میرے ہاتھ سے لئے تو اس کے ہاتھ لرز رہے تھے ــــ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں ــــ اس کے چہرے پر پھر وہی عقیدت برسنے لگی جو چرچ سے باہر آتے وقت تھی۔ اس نے اپنا چہرہ ہولے سے آسمان کی طرف اٹھایا اور زیر لب بولی "گاڈ از گریٹ" (GOD IS GREAT)

میں گم سم سا ہوکر اس چہرے کو دیکھ رہا تھا جو بالکل نیا چہرہ تھا ــــ عقیدت، تشکر اور وارفتگی میں ڈوبا ہوا۔

وہ چہرہ آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا، اور پھر اس کی بند پلکوں کے کونے سے ایک چھوٹا سا آنسو اس کے سارے اندرونی جذبات کی کشیدبن کر باہر نکلا۔

میں فوراً مڑکر واپس چل دیا۔

وہ دن گزر گیا۔

اگلا دن گزر گیا۔

کئی دن گزر گئے۔

کئی ماہ گزر گئے۔

مگر میں اس کلب اور ریستوران میں نہ جا سکا۔

ایک دن پھر فضا کے نامعلوم اسرار نے مجھے مضطرب کیا ہوا تھا اور میں اسی طرح گھومتا گھماتا وہیں پہنچ گیا ــــ وہ تو نظر نہ آئی مگر جوزی مل گئی۔ میں نے اس سے پوچھا تو وہ کہنے لگی کہ اس نے تو ایم اے پاس کرلیا ہے اور اب یہ کام چھوڑ کر فلاں دفتر میں ملازم ہو چکی ہے۔

امید ہے اسے جلد ہی امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کا وظیفہ مل جائے گا۔

سٹیج پر نیم برہنہ ڈانس جاری تھا ـــــ حسبِ سابق ـــــ جیسے درمیان میں کچھ ہوا ہی نہیں۔

میرے کمرے میں تاریکی تھی ـــــ وقت تھما ہوا تھا ـــــ فقط ماضی زندہ تھا اور میرا ذہن متحرک تھا جس نے غالباً پہلی دفعہ ماضی کے وسیع کینوس پر پھیلے ہوئے ہزاروں لاکھوں غیر متعلق واقعات میں سے چند ایک کو اچک کر سوچ سے مربوط کر لیا تھا ـــــ میں گھنٹوں سوچتا رہا کہ کشی موٹو ـــــ پیئر اور اس لڑکی کی باتیں درست تھیں یا غلط۔

ہم زندگی بھر واقعات کے اژدہام میں سے ایسے گزرتے جاتے ہیں جیسے کھچا کھچ بھرے ہوئے میلے میں گھوم رہے ہوں۔ مگر کبھی کسی مقام پر بیٹھ کر ان واقعات کے ہجوم کا تجزیہ کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ اس کھلاڑی کی طرح جو کسی مخصوص رنگ کی وردی پہن کر کھیل کے میدان میں کود جاتا ہے اور پھر سارا وقت اور ساری قوت اپنی وردی کی عزت کی خاطر گیند کے پیچھے بھاگنے میں صرف کر دیتا ہے ـــــ اسی طرح چند مخصوص نظریات اور رویوں کی وردی پہنے ہم بھی مسلسل زندگی کے گیند کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔

آج میری سالگرہ ہے ـــــ قریباً تین چوتھائی زندگی کے بعد کی سالگرہ ـــــ اس تین چوتھائی زندگی کے دوران میں قریباً نصف دنیا گھوم چکا ہوں اور دوسری کئی قوموں کی نظریاتی وردی دیکھ چکا ہوں ـــــ ہر ایک کا رنگ مختلف ـــــ تراش مختلف بلکہ متضاد کوئی ڈھیلی۔ کوئی چست۔ کوئی ناکافی۔ کوئی فالتو۔ کوئی آرائشی۔ کوئی عملی ـــــ اور ہر کسی کو یقین کہ اس کی وردی یا تو خدا نے بنائی ہے ـــــ یا اسے اتارنے پر خدا ناخوش ہو گا ـــــ نہ جانے سچ کیا ہے؟

میری سالگرہ چند گھنٹے پہلے شروع ہوئی تھی مگر نہ جانے کب ختم ہو۔ اسی کمرے کی تاریکی نے بصارت سے کر یہ بصیرت بخشائی کہ جب بہت سی وردیوں کا موازنہ کیا جائے تو ہر وردی عجیب و غریب اور بعض اوقات مضحکہ خیز لگتی ہے ـــــ پھر ہر وردی میں کافی چھید ہیں۔ پہننے والوں کو انھیں دیکھنے کی فرصت نہیں۔ مگر دوسرے دیکھنے والے صرف چھید ہی گنتے رہتے ہیں۔

یہ بہت ہی کربناک سالگرہ تھی ـــــ جب روایتی رویوں اور یقین میں چھید نظر آنے لگیں تو اپنے اندر یا تو خلا ہو جاتا ہے اور یا طوفان اٹھنے لگتے ہیں کہ سچ کیا ہے؟ ـــــ کون سا رویہ درست ہے؟ ـــــ یا کوئی درست ہے بھی یا نہیں ـــــ اور یہ سب کچھ محض قدرت کا ایک علاقائی مذاق ہے۔ مختلف علاقوں کے مختلف موسموں کی طرح ـــــ

تین چوتھائی آرام سے یقین کی چھاؤں میں گزری ـــــ اب ایک چوتھائی میں بے یقینی کی دھول اور شک کے کانٹے نظر آ رہے ہیں ـــــ زندگی کا باقی سفر بہت کٹھن ہو جائے گا ـــــ شاید ایک زندگی سچ جاننے کے لئے کافی نہیں۔ یہ اتنی مختصر ہے کہ ہم وسیع تر کائنات کی یہ سچائی جان ہی نہیں سکتے کہ خدا ہم سے کیا چاہتا ہے۔ خصوصاً جب ہم خود بھی مجرم ہیں اور اپنے یقین کی تنگ خود ساختہ پگڈنڈی کو چھوڑ کر سوچ کی کھلی شاہراہ پر جانے کی جرأت نہیں کرتے ـــــ اَفَلَا تَتَفَکَّرُوْنَ (یہ لوگ سوچتے کیوں نہیں۔ فکر کیوں نہیں کرتے)

میں نے سوچا۔ یہ سالگرہ تو اس کرب میں گزری۔ نہ جانے اگلی کیسے گزرے گی ـــــ اور اس سے اگلی ـــــ اگر ہوئی تو ـــــ شک اور بے یقینی کا کرب بہت ظالم ہوتا ہے ـــــ

بدل گیا

الطاف فاطمہ

آج گھر سے نکلی تو دل علامتوں، اشاروں، رمزوں اور تجریدگی کے موتیوں سے مالامال تھا۔ خیال تھا کہ واپس آتے ہی قلم پکڑ کر بیٹھ جاؤں گی اور ایسا افسانہ ــــــ اور ایسا گرماگرم افسانہ تخلیق کروں گی کہ جس کے انگ انگ اور تار تار میں شعور کے موتی پروئے گئے ہوں گے۔ ارادہ قطعی مستحکم اور اٹل تھا۔

لیکن وہ جو بوتراب تھا اس نے کہا تھا "میں نے اپنے خالق کو اپنے مستحکم ترین ارادوں کی شکست سے جانا۔"

سو میرا ارادہ جو قطعی مستحکم اور بالکل اٹل اور ناقابلِ شکست تھا، شکست ہوا، پارہ پارہ ہوا۔ دل کے صدف کا منہ کھلا اور موتی دانہ دانہ ہو کر راہ میں بکھر گئے۔ میں ان کو چننے سے اور دوبارہ صدف کے بطن میں چھپا دینے سے قاصر تھی کہ ابھی ابھی خبر ملی تھی کہ ــــــ وہ بدل گیا۔

اصحاب کہف اور رپ وان ونکل نے باری باری میری طرف حیرت سے دیکھا تھا اور میں وہاں کھڑی اپنی نیند کے ماہ و سال کا حساب لگا رہی تھی۔ ابھی گئے دنوں کی تو بات ہے کہ میں نے ان کو اس کی طرف اشارہ کر کے بتایا تھا کہ یہ جو آدمی ہے نا اس کو میں گذشتہ بیس سال سے اسی رنگ کی اور اسی وضع کی دھاری دار قمیص میں دیکھ رہی ہوں۔

تو مطلب یہ ہے کہ یہ شخص بیس برس سے یہی قمیص پہنے ہوئے ہے۔ یہ پھٹی بھی نہیں، اور اس کا رنگ بھی نہیں بدلا۔

ایک تو یہ جو لمبو ہے نا، اس کو یہ بری عادت پڑتی جارہی ہے کہ ہر بات میں بال کی کھال نکالتا ہے۔ ہونہہ! یہ مطلب، وہ مطلب میں دل ہی دل میں سوختہ ہوئی لیکن کہتے ہیں لڑکا جب پڑھ رہا ہو تو اس پر TEMPER LOOSE نہیں کرنا چاہیے۔

میں نے تحمل کیا اور نرمی سے وضاحت کی "نہیں یہ بات نہیں بلکہ وہ ایک ہی رنگ اور فاصلے کی دھاریوں کا کپڑا لینے کا عادی ہو گیا ہے۔"

"تو بیس سال سے اس کو ایک ہی ڈیزائن اور اسی کی دھاریوں والا کپڑا مسلسل ملتا چلا جا رہا ہے یا پھر اس نے اکٹھا بیس سال کے حساب سے کپڑا خرید کر ذخیرہ کر لیا ہے؟"

میں دیکھ رہی تھی وہ ظاہر ظہور منہ ترچھا کر کے ہنس رہا ہے۔ اس کے آگے تو کوئی بات کرنا ہی نہیں چاہیے۔ توبہ! یہ لمبو تو سارے راستے میں احتجاجاً خاموش رہی۔

مگر یہ تو کسی اور دن کی بات ہے۔ آج کی بات تو یہ ہے کہ وہ بدل گیا۔

کیٹگری (CATEGORY) کی بیگمات بے تحاشا اشیاے ضروری اور غیر ضروری کی خریداری میں منہمک نظر آتی ہیں۔ چنانچہ ان کی ادائیگی بڑی بڑی رقموں میں ہوتی ہے۔

ہاں تو حاجی صاحب رقم وصول کر کے بل پر ٹھاپ لگاتے لگاتے ہمارے آگے سر جھکاتے اور شکریہ ادا کرتے تو یوں لگتا گویا ہم

بڑی اونچی اور سیٹ کی شخصیت ہیں۔

پھر میں گلاب دین سے مخاطب ہوتی "گلاب دین ہماری بچی ٹکواؤ"

گلاب دین نذیرے کو آواز دیتا "نذیرے! اوے نذیرے چل بی بی کی بچی چک"

ایک پتلے اور تنگ سے سر پیرے سے دو یوں نکلتا جیسے چوہا بل میں سے نکلے۔

مجھے ہمیشہ یہ شک رہا کہ وہ آٹے اور چاول کے بوروں پر گھی کے ڈبوں، اچار اور مٹی کے تیل کے کنستروں کے درمیان کسی بوری پر سویا رہتا ہے اور آواز دینے پر اپنی نیم مچاتی آنکھیں ملتا ہوا نمودار ہوتا ہے۔ نیلی، سرمئی اور بھوری دھاریوں والے ڈوریئے کی، اس کے تن سے بہت بڑی قمیص کا گریبان کھلا، آستین اُٹی ہوئی، شلوار کا ایک پائنچہ تھوڑا سا اودھڑا ہوا، دبلا پتلا، صاف رنگت اور نکلتا ہوا قد لیکن وجود کے سارے پرزے ایک دم ڈھیلے

ایک تصویر کے مانند اس کی ہر ادا مقرر تھی۔

بچی ہاتھ میں، آٹے کا تھیلا کندھے پر، مجھے اپنے پیچھے پیچھے چلاتا وہ کمرشل بلڈنگ کے اسٹینڈ پر کھڑا ہوتا۔ لپک جھپک تانگہ پکڑتا —
(جی ہاں، ناظرین تانگہ! کہ والدہ صاحبہ کی سختی سے ہدایت تھی کہ دیکھو کبھی ٹیکسی پر اکیلی نہ بیٹھنا اور تانگہ! ہاں تانگہ کی کیا بات ہے یہ معتبر اور معزز سواری ہے۔ تانگے والے معتبر ہوتے ہیں، بالکل پرانے وقتوں کے کہاروں کی طرح ڈولی کندھے پر اٹھاتے اور سواری کے ہر طور نگہبان ہوتے)۔ تو جب اس معتبر اور معزز سواری میں بیٹھ چکنے کے بعد میں نذیر کو بچی چکوائی کے آٹھ آنے پکڑاتی تو اپنے خاص اسلوب میں ایک سلیوٹ مارتا۔

یہاں اس نقطے پر آکر اپنے پندار کا پارہ ایک ڈگری اوپر چڑھ جاتا۔ غرورِ نفس پھول کر بالکل ہی گیس بھرے غبارے کا انداز اختیار کر لیتا۔

پر گھر پہنچتے ہی غبارے کی ساری پھونک نکل جاتی۔ اس لئے کہ بڑی سخت چیکنگ بلکہ ایک طرح کی آڈیٹنگ ہوتی۔ مطلوبہ اشیائے ضرورت کی فہرست کی روشنی میں ساری تفصیلات بمعہ رقوم ملائی جاتیں۔ اسٹور سے باہر خریدی ہوئی چیزوں پر مناظرہ اور ردّ و کد ہوتی اور جواب دہی کرنا پڑتی۔ اتنی کہ ہم گڑبڑا کر بڑبڑ کرنے لگتے "صاحب آپ اتنی سخت چیکنگ کرتی ہیں کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آدمی مرچوں کی تھیلی یا گرم مصالحوں کی پڑیا دکان پر ہی بھول آئے یا دو چار پیسے اِدھر اُدھر ہو جائیں۔ آپ کو تو دراصل چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننا تھا۔
اور ناظرین! میں اب اس مرحلے پر آکر سوچتی ہوں کہ انھیں کیا کچھ بننا تھا۔ قانون داں، نفسیات داں یا فلسفی بنتے بنتے وہ ماں بن گئی تھیں۔

بہرحال ہماری بڑبڑ کا ٹھنڈے دل سے جواب ملتا۔ جز رسی بنیا، یہ تو شرافت اور دیانت کی جڑ ہے بلکہ تخم ہے۔ یہی تو انسان کی ذات کو استقامت دیتی ہے کہ وہ گھڑی گھڑی بدلا نہیں جاتا"

مختصر یہ کہ اس گفتگو میں نذیر اکہیں مذکور نہ ہوتا۔

وہ تانگے پر سامان کیا چڑھاتا کہ اس کا وجود ہی ذہن سے محو ہو جاتا، یہاں تک کہ اس کو بچی چکوائی کی اٹھنی دے کر بھی ذہن سے تلف ہو جاتی اور جب اٹھنی کے خرچ کی مد کی باری آتی تو یاد ہی نہ آتا کہ کہاں گئی۔ پھر میں گھپلا کر کے اسے کسی اور مد میں کھپا دیتی۔

یونیورسٹی کے دو سال پلک جھپکتے میں گذرتے ہیں سو گذر رہے اور اب ہیں اس اسٹور پر آتا یوں بھلا لگتا ہے کہ یہاں اپنے مختصر ماضی کے نقوش پا ابھی تازہ نظر آتے ہیں۔ مارکیٹ کے آگے والے دائرہ نما گول برآمدے میں کھڑے ہو کر سامنے نظر ڈالو تو یونیورسٹی میں اپنا ماضی ہنستا گاتا نظر آتا ہے جس کی نگہبانی یونیورسٹی کی دیوار کے ساتھ کھڑا وولنر کا مجسمہ کر رہا تھا اور کرتا رہے گا۔

جب ہم اس کے قریب سے گذرتے تو سیاہ گاؤن، سیاہ بوٹ، ہاتھ میں کتابیں اُٹھائے ... کو کھڑے دیکھ کر دل ہی دل میں کہتے ____ "کھڑے ہو! کھڑے رہو۔ بچو، ہم تو چند دن میں یہاں سے گذر جائیں گے تم یہاں کھڑے آتے جاتے کو گھورتے رہنا ____ اور اب ____ اب تو وولنز کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اجنبیوں کے جنگل میں کوئی اپنا قریبی رشتہ دار مل گیا ہو۔ جی چاہتا تھا (اور چاہتا ہے) کہ دوڑ کر گلے لگ جاؤ ____ ہلو ____ ہاؤ ڈو یو ڈو ڈیئر ڈارلنگ! ڈو یو مس می DO YOU MISS ME؟ جی ہاں میں بھی آپ یاد کرتی ہوں سر۔

تو ناظرین، خریداری کے لئے آنے جانے کا یہ دستور بعد میں بھی چلتا رہا مہینے کے مہینے ابتدائی تاریخوں میں نذیرا اپنے وجود کا احساس دلانے کے لئے اسی تنگ سرپیرے گو دام سے نکلتا۔ خریداروں کے سامان کی بھاری بھاری پیٹیاں چک چک کر کاروں، ٹیکسیوں اور تانگوں میں رکھتا۔ نہیں دوسرے گاہکوں نے بھی نذیرے کی بچی چکوائی کی شرح مقرر کی ہوئی تھی کہ نہیں۔ مگر یہی تو اٹھنی ہی خاصی معتبر اور معقول لگا کرتی تھی کہ نذیرا اُسے مٹھی میں دبا کر خاصا محظوظ نظر آتا۔

کبھی اس سے یہ پوچھنے کا خیال بھی نہ آیا کہ تم کو حاجی صاحب کیا دیتے ہیں۔ یعنی یہ بڑے بڑے بورے اور ٹین اتار اتار کر گودام میں رکھنے اور سردی گرمی وہاں سوئے پڑے رہنے کا کیا دیتے ہیں۔

ناظرین: پہلے وی سی آر کی ریل یہاں آ کر ٹوٹ جاتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے۔

دنیا جلد جلد بدل رہی ہے۔ سوئے ہوئے جن کی طرح جلد جلد کروٹیں بدل رہی ہے تاکہ نیند ٹوٹنے سے پہلے خواب کی تمام کیفیتوں کا پورا حظ اٹھا سکے۔

پہلے تانگوں کا مقابلہ پیلی پیلی چھتوں والی سیاہ رنگ ٹیکسیوں سے پڑا۔ ٹیکسیاں تو مدتوں ان کی شرافت و نجابت مشکوک رہی۔ شک و شبہ کا یہ عالم رہا کہ عجب نہیں کہ سواری کو ذبح کر کے پھینک دیں، لوٹ لیں، اور کچھ نہیں تو سواری کو لے بھاگیں۔ ضرور سواری گاڑی کی یہ جنس کسی سازش میں ملوث ہے۔ ابھی ان کی ہیبت کم نہ ہوئی تھی کہ سواری گاڑی کی ایک اور نوع نمودار ہوئی۔ دیکھتے دیکھتے برساتی پروانوں اور کیڑوں کی طرح رکشوں کا ایک آشوب سڑک سڑک پھیلا۔ اگرچہ ان کے خلاف وہ سنگین الزامات نہ تھے تاہم یہ سواری مخدوش بلکہ پیغامِ اجل کے طور پر لی گئی جو اس میں بیٹھا سمجھو اللہ کو پیارا ہوا۔ مقابلہ کی اس دوڑ میں تانگہ یوں ہارا کہ مال روڈ اور اونچے درجے کی شاہراہوں پر اس کا داخلہ بند ہوا۔

پہلی مرتبہ تانگے کی اگلی سیٹ پر چابک ہاتھ میں لئے بیٹھے کوچوان نے نذیرے کے کندھے اور ہاتھ میں چکے ہوئے سامان کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ مال پر تانگہ نہیں جا سکتا۔

"کیوں؟" میں نے دبنگ آواز میں سوال کیا۔ کیوں نہیں جاؤ گے؟"

تانگے والے نے دھیمی آواز میں جواب دیا "مال پر تانگے کا داخلہ بند کر دیا گیا ہے"۔

"بند کر دیا! بند ہو گیا!"

شام کے دھندلکے میں کمرشیل بلڈنگ کی بتیوں کی جوت جیسے مدھم سی پڑ گئی۔ چار سو ایک عجیب اداسی کا احساس پھیل رہا تھا۔

سب کچھ بدلا جا رہا ہے۔ سب کچھ بدل رہا ہے!

کہیں ____ کہیں ____ یہ تو نہیں بدل گیا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔

وہ آٹے کے تھیلے اور روز بروز سست پیٹیوں کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ وہی سرمئی نیلی اور بھوری دھاریوں کے ڈوریئے کی قمیص وہی شلوار کا اوپر اٹھا ہوا پائنچہ، وہی چاک گریبانی، چہرے کی وہی ویرانی "اب کون سی سواری پکڑوں جی؟"

وہ کم سخن تھا اور غن غن کر کے بولتا تھا۔

وہ بدل گیا! سنو لوگو! واقعی یہ لمحۂ فکر یہ ہے

کیوں بدل گیا؟ کیسے بدل گیا؟

"دراصل یہ ساری بات تو ایک طویل پس منظر کا تتمہ ہے جس میں ایک مدت وہ فریم میں جڑی ہوئی اس تصویر کے مانند فٹ رہا تھا جس کے رنگوں میں پھیکا پڑنے کی گنجائش موجود نہ ہو۔

بات یہ ہے کہ ہر انسان اپنی ذات سے ایک کیسٹ ہے جس میں پوری پوری وی سی آر فلمیں اسی طرح محفوظ رہتی ہیں جیسے لائبریریوں میں مائیکرو فلمیں محفوظ ہوتی ہیں۔

دیکھئے ناظرین آپ کو ہراساں ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ اس فلم کو تجارتی ادارے کے تعاون سے نہیں لیا جا رہا ہے اس لئے آپ کو قبل از فلم کی طویل اشتہاری ریل سے واسطہ پڑے گا نہ گھڑی آنے والے وقفوں میں کان پھوڑ جنگلوں والے اشتہاروں کی منک تھرک بور کرے گی۔

تو لیجئے وی سی آر نمبر ا

صبح صبح جلد بازی میں کئے ہوئے اُلٹے سیدھے ناشتے اور چائے کے بڑے بڑے گھونٹوں سے فارغ ہوتے ہی نوٹس کی فائل ہاتھ میں پکڑی ہے کہ والدہ صاحبہ نے اشیائے ضرورت کی فہرست کا مخصوص لمبا اور پتلا پرچہ تھما دیا ہے۔ "یونیورسٹی سے واپسی پر یہ سامان لیتی آنا"

او، چلو چھٹی ہوئی۔ تو یہ مہینے کی دوسری تیسری تاریخیں آیا ہی نہ کریں تو کیا خوب ہوتا۔ بہت بھاری پڑتی ہیں۔ یہ تاریخیں کہ زندگی کا آدھا دن غارت ہو جاتا ہے

"اور دیکھو وہاں اپنے خیالات میں گم نہ ہو جانا، ہر چیز دیکھ بھال کر رکھوانا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر بار رسید لے کر جاؤ اور بھولا ہوا سامان دوبارہ وصول کر کے لاؤ۔"

لیکچر، نوٹس اور لائبریری کے گرداب سے نکل کر ایک دم ہی چینی، اچار، مربوں، مرچ مصالحوں کے بھنور میں آدمی پھنس جائے تو پہلے پہلے تو دم گھٹتا ہے مگر دھیرے دھیرے ہر ماہ کی ابتدائی تاریخوں میں لمبے اور پتلے پرچے کی اندراجات کے مطابق خریداری کا شیڈول ایک دلچسپ تجربہ بن گیا ہے اور اب میں سب سے پہلے ایک جو جیب یا چاکلیٹ کلے میں دبا کر رسان رسان اسے چوستے چوستے چاروں طرف گھوم پھر کر مطلوبہ چیزیں اکٹھا کرواتی ہوں اور پھر بل پکڑ کر کاؤنٹر پہ جا کر رقم کی ادائیگی۔

ناظرین مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ فلم کی ریل ٹوٹ گئی ہے اس لئے اب بیانیہ کمنٹری پر اکتفا کرنا ہوگا۔

ہاں تو ساری مطلوبہ اشیا اکٹھی کروا کر کچھی میں رکھوانے کے بعد بل ہاتھ میں لے کر کاؤنٹر پر جا کر رقم کی ادائیگی کرتی عجیب سی تسکین اور لذت کا احساس کہ بھاری بھر کم اونچے لمبے حاجی صاحب رقم (خواہ کتنی ہی ہمیر کیوں نہ ہو ——— اور ناظرین آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا فلم کے دوران) اور یہی تو میں سوچ رہی ہوں۔ نذیرے اور اب مجھ پر یہ وقت آپڑا تھا کہ مجھے ٹیکسی اور رکشا کے درمیان انتخاب اور فیصلہ کرنا تھا۔

تبدیلی اور پھر تبدیلی۔

اب عادت بنتی جا رہی ہے۔

چھوٹی سی مقطع ڈاڑھی، بھلی مونچھیں، بھاری بھر کم اور اونچے لمبے قد والے، دھیمی آواز سے بولنے والے، ہر ادا میں شفقت مروت

اور خلق کا انداز لئے جو شخصیت بنتی ہے۔ وہ تھے بڑے حاجی صاحب۔ اس بڑے اسٹور کے کھونٹ کھونٹ کا ڈنٹر کا ڈنٹر ان ہی کے سے قد کاٹھ والے ان کے بیٹے اور ان کے بھائیوں کے بیٹے کھڑے نظر آتے تھے۔ ان سب میں جو سلیقہ اور خلق تھا وہ برطانیہ کے نوآبادیاتی دور کرتسی نہ تھی بلکہ وہ مشرقیت تھی جس میں لوگ باپوں کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور آنے والوں کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور آنے والوں کے ساتھ مروت و خوش خلقی سے پیش آتے ہیں۔

حاجی صاحب ان سب سفید براق شلوار کرتوں میں ملبوس اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو نظر بھر دیکھتے ڈرتے تھے۔

اور اب میں کھڑی سوچ رہی ہوں کہ آخر ان کے منظر سے غائب ہو جانے میں کیا تک ہے۔ قصہ تو یہ ہے کہ بیٹوں اور پوتوں کے عدد رجہ احترام اور مروت بھی کسی کو عمر ابد نہیں دلا سکتا۔ ابھی ابھی میں نے وہ سیاہ مشکی گھوڑوں والی گاڑی دیکھی ہے جس میں حاجی صاحب جمعرات کی جمعرات اپنے اسٹور کا سامان اور اپنے چھوٹے چھوٹے پوتے پوتیوں کو بھر کر لایا کرتے تھے۔ سفید براق سے شلوار کرتے میں ملبوس، چابک میں لئے، اگلی سیٹ پر براجمان۔ مشک رنگ گھوڑے کی باگیں تھامے   یوں لگتا کسی اولڈ ماسٹر کے موقلم سے نکلا ہوا کوئی دلچسپ اور دلکش مرقع سامنے ہو۔ اسٹور تو اب لڑکے ہی چلاتے تھے مگر خود اس پورے ماحول میں ایک مقدس "تبرک" کی حیثیت رکھتے تھے۔ ڈاڑھی مونچھوں والے بال بچوں دار بیٹے اور بھتیجے حاجی صاحب کا نام لیتے تو ان کی آنکھیں وفور احترام سے یوں جھکی ہوتیں جیسے کسی نے ان کے ہاتھ پر قرآن دھر دیا ہو۔

اور اب یہاں کھڑی میں یاد کر رہی ہوں کہ حاجی صاحب اس اسٹور کے قیام کی تاریخ ۱۸۸۵ء بتاتے تھے اور اس کے بانی ان کے دادا تھے۔ آج حاجی صاحب کی گھوڑا گاڑی کے بجائے سامان سوزوکی ویتوں پر آ رہا تھا۔

پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ میں اسٹور کے دروازے سے ہی پلٹ آئی۔ ہوا یوں کہ سامان کی فہرست کا کاغذ نکال کر نظر ڈالی تو ہر نام اور اندراج اتنا بے سود اور لاحاصل محسوس ہوا کہ جس کے کوئی معنی ہی نہ ہوں۔ اب کوئی سارے سامان اور خرچ کی ہوئی رقوم کا حساب لے گا نہ کسی آئیٹم کے دکان پر بھول آنے کی جواب دہی کرنا پڑے گی۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے جنھیں بڑی رازداری سے چھپاتی ہوئی ٹل گئی۔ ہاں ہر چیز لاحاصل اور بے سود ہی تو ہے۔

اس وقت تو اس کام کی اپنی ایک افادیت تھی۔ ایک اس کام پر ہی منحصر نہیں، زندگی لغزشوں تک میں ایک خزیوں کی سی گرمی اور حدت تھی۔ اپنی غلطیوں پر ڈکے جانے پر جز بز ہونے میں کیا لطف تھا کہ میں کبھی بیان نہ کر سکوں گی۔ وہ نرم نرم دھیمی آواز، وہ بھگت کبیر اور تلسی کے دوہے، سعدی کے مقولوں، رومی کے نکتوں اور میر و غالب کے حوالے سے کیا کچھ نہ جھولی میں ڈال دیتی تھیں۔

دراصل وہ ماؤں کی بڑی دلچسپ نوع تھی۔ نہ ملازمت اور جابس کی الجھنیں، نہ کیریئر اور پرموشن کے لئے بھاگ دوڑ، نہ ڈائرکٹریٹ اور اے جی آفس کے بکھیڑے، امزدوں میں گھر بیٹھی جز رسی سے کام لے رہی ہیں، مطالعہ وسیع ہو رہا ہے اور اس سب کے ساتھ زندگی کی چھوٹی چھوٹی دلچسپیاں بھی جاری ہیں۔ ساری باتیں سوچتی سوچتی میں اسٹور کے دروازے سے پلٹ رہی تھی اور اس وقت بھی اس کی موجودگی کا احساس میرے دھیان میں نہ تھا۔ میں وہاں سے چلتی چلتی میوزیم کے پاس سے گذرتی ہوئی دولنز کے مجسمے کے پاس ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ وہی اٹھتے ہوئے قدم، وہی چلتے میں اڑتے سے سیاہ گاؤن کا معصوم تقدس ——— کھڑے ہوئے ہو بچو! کھڑے رہو۔ تم بڑی پیاری شے ہو ڈیئر ڈارلنگ ادھر دیکھو تو اس گذرگاہ پر چلنے والے قدموں اور سواریوں کے پہیوں نے۔ اور وقت کے قدموں نے کتنی دھول تمہارے بوٹ پر اور گاؤن پر جمع کر دی ہے ———، بے اختیار میں نے بیگ سے ٹشو پیپر نکال کر اس کے بوٹ اور گاؤن پر جمی دھول کو بڑے پیار سے صاف کر دیا (میں جب بھی کبھی یہ حرکت کرتی ہوں تو بہت خوف زدہ ہو جاتی ہوں، کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے بھائی بہن۔)

انسان بے پناہ اور بے قید ہوتا ہے تو اس کے اندر ایک بنجارہ ڈیرے ڈال لیتا ہے۔ سو میرے اندر کا بنجارہ بھی میری سرگردانی کا باعث ہوا (نصیحتوں کی موجودگی کے باوجود کہ خریداری کے لئے ایک مقرر ٹھکانا بہتر ہوتا ہے) میں ہر مقرر ٹھکانے سے گریزپا ہوئی تو اسٹور کا جانا بھی چھٹا۔

پھر کسی کام سے ایک دن اولڈ کیمپس کی طرف جانا ہوا۔ ورنائن آرٹ کے شعبے کے قریب کھڑے کھڑے نظر سرخ کھپریل اور لکڑی کے سبز ستونوں والے برآمدے کی طرف اٹھی۔ یعنی اس اسٹور کی طرف جو ۱۸۸۵ء میں حاجی صاحب کے دادا قائم کیا تھا۔ سول لائنز میں فرنگی انڈین سول سروس والوں کی گھروالیوں یعنی میم صاحبان کی سہولیت کے خیال سے۔

جی کی وہی کیفیت ہوئی جو وولنر کے مجسمے پر نظر پڑنے کے ساتھ ہونے لگتی ہے "میں کتنی غلط کار اور فضول ہوں۔ میں اپنے آپ کو ملامت کرتی رہی۔ کوئی اپنے پچھلے ٹھکانوں کو یوں بھی چھوڑ دیا کرتا ہے۔ میں نے وہاں کھڑے ہو کر بہت کچھ یاد کیا حاجی صاحب کو یاد کیا، گلاب دین کا خیال کیا اور لیمن ڈراپس اور جوجیبس کو یاد کیا جنہیں اپنے کلے میں دبا کر چوس چوس میں چیزیں جمع کرتی تھی۔ البتہ نذیرا میرے دھیان میں نہ آیا۔

قدم آپ ہی آپ اٹھتے اٹھتے اسٹور کے اندر پہنچ گئے۔ اندر جاتے ہی میرے ذہن کو شدید دھچکا لگا۔ میرے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے۔ یہ میں کہاں آگئی۔ برف زار میں یا برف سے بنے ہوئے پتلوں کی بستی میں؟ یہ برف زار ہے یا بدلا ہوا وقت ہے۔ اور اب مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرا کتا جو صدیوں صدیوں تک میرے ساتھ غار میں صدیوں تک غار میں سوتا رہا تھا، آج بھی ابھی اس برف زار میں گم ہو گیا ہے۔ میں بھی اور رپ وان ونکل بھی ٹک ٹک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے ہیں اور اصحاب کہف نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ کہیں ایک کتا تو نہیں دیکھا ہے، وہ یہیں کہیں اس برف زار میں گم ہو گیا ہے۔ میں بھی سوال کرنے والے کو اور کبھی اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سکوں کو دیکھ رہی ہوں، اس لئے کہ مجھے وہم ہو رہا ہے کہ وہ سکہ جو میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا ہے رائج الوقت نہیں ہے۔

میں نے گھبرا کر ادھر سے ادھر دیکھا ہے۔ حاجی صاحب اپنی خوبصورت لاکھ کے کام سے سجی ہوئی گھوڑا گاڑی میں لدے ہوئے سامان اور بچوں کے ہجوم میں بیٹھے ہیں۔ مشک رنگ گھوڑوں کی باگوں پر مضبوطی سے ہاتھ رکھے کسی اولڈ ماسٹر کے مرقع کے مانند نظر آ رہے ہیں۔

مگر نہیں حاجی صاحب وقت پر کسی کا زور نہیں ہے۔ آپ اس کی باگیں مضبوطی سے تھامے اور یہ منہ زور شدید زراسوں اور باگوں تلے سے چپکے سے سرک جائے گا۔

حاجی صاحب نیچی نظر کئے مسکرائے جا رہے ہیں۔

اور یہاں مجھے ایک بھی مانوس چہرہ نہیں نظر آ رہا ہے۔ مانوس اور پرانے چہرے تو اب ایک موڈرن اور زرداروں کی آبادی کے پُررونق بازار میں ایک نیا اسٹور قائم کرنے چلے گئے ہیں۔ گویا خود کو بدل رہے ہیں اور یہ نئے چہرے سرد مہری سے ہمیں گھور رہے ہیں۔

اور یہاں اس پرانے اسٹور پر جنریشن گیپ کا نعرہ حقیقت میں ڈھل رہا ہے۔

میں کاؤنٹر کاؤنٹر پھرتی اور چہروں اور رویوں کو تاڑتی رہی۔ جی چاہ رہا تھا کہ جو کچھ خریدا ہے سب کچھ ان کے منہ پر مار کر نکل جاؤں رویوں کی بے طوری کے سبب۔ مگر میری مروت پرانی تھی۔

اور اسی آن میں نے دیکھا یا مجھے وہم ہوا جیسے آج پہلی مرتبہ حاجی صاحب سر جھکائے اس اسٹور سے نکل گئے ہوں۔

او کے، بائی بائی حاجی صاحب! سو لونگ ——!

میں نے بے خیالی میں الوداعی اشارہ کے طور پر ہاتھ ہلا دیا ہے

ایک شخص میرے قریب آیا ہے "کیا حال ہے بی بی، بہت دن پیچھے نظر آئی ہو؟"

"اوہ! گلاب دین! گلاب دین تم ہو؟" جیسے سرد پانی کے سمندر میں ایک گرم رَو سی آگئی ہو۔

"ہاں جی میں نئے اسٹور سے کچھ سامان لینے آیا ہوں۔"

"گلاب دین: آج یہاں اسٹور میں کتنی سرد ہوائیں چل رہی ہیں۔"

"ہاں جی موسم جو سرد ہوا!"

"مگر گلاب دین——!"

اب میں اس سے یہ تو کہنے سے رہی کہ موسم کی کیا بات ہے، یہاں تو برف باری کا سماں ہے۔ برف کے تودے ہی تودے۔ ہر کاؤنٹر پر ایک سنو مین...... گلاب دین میرا کتا جو صدیوں تک غار میں میرے ساتھ محو خواب رہا کہیں گم ہو گیا ہے اور اب میرے ہاتھ میں رائج الوقت سکے کے بجائے وہ سکے ہیں جنھیں یہاں سے نکل کر میں میوزیم میں رکھوا دوں گی۔ یہ بھی شکر ہے کہ میوزیم بھی ساتھ ہی ہے۔

مگر گلاب دین سے یہ سب کہہ کر میں اس کو افسردہ تو نہیں کر سکتی تھی۔ اتنی مدت بعد تو وہ نظر آیا تھا۔ میں نے فقط اتنا کہا "گلاب دین یہ ہمارا سامان......" میں نے ٹرالی میں بھرے سامان کی طرف اشارہ کیا (جی ہاں! اب ہم ترقی کر رہے ہیں اور یورپ والوں کی طرح ٹرالیاں پکڑ کر اس میں سامان رکھتے ہیں) ہمارا سامان کون چکے گا۔"

"جی میں بلاتا ہوں۔" سرد پانی کی تند لہروں کے درمیان ننھی سی تنہا گرم رَو کی حدت بڑی خوشگوار محسوس ہوئی۔

گلاب دین نے اسی پرانے انداز میں صدا لگائی "نذیرے...... اوے نذیرے، چل بی بی کا سامان چک۔"

گلاب دین! کیا تم نے میرے سر میں سفید بال نہیں دیکھے جو مجھے بی بی کہہ کر مخاطب کر رہے ہو؟ یہ میں اس سے نہ پوچھ سکی۔

البتہ چاولوں کے توڑوں، آٹے کے بوروں پر مٹی کے تیل کے کنستروں کے درمیان سوتا سوتا، وہ آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔ وہی حلیہ، اور وہی انداز۔

"نذیرے!" میں اس وقت خوشی کی ایک چیخ بھی نہ مار سکی کہ اجنبیوں کے جنگل میں کوئی عزیز نظر آنے پر انسان دم بخود ہی تو رہ جاتا ہے۔ "ارے تم ابھی ہو ہو —— وہی سامان چکنے والی ڈیوٹی؟"

"ہاں جی!"

"نذیرے، کیا تم کو اسٹور والوں نے کولڈ اسٹوریج میں رکھ چھوڑا ہے جو ذرہ برابر تبدیلی نہ آئی؟"

میں اس کو حیرت سے دیکھ رہی تھی وہی ڈوریئے کی قمیص، وہی شلوار کا ادھڑا ہوا پائنچہ۔

میری بات کا جواب کیا خاک دیتا۔ غن غن کر کے رہ گیا۔

اس کی موجودگی نے اسٹور میں آنے جانے کا حوصلہ بیدار رکھا ہوا تھا اور اس کا یہ حال کہ یقین کر لیجیے، آج بھی چکھی چکوائی کا مطالبہ نہ کرتا۔ سامان رکھا اور واپس چلنا شروع کیا۔

"ٹھیر تو، یہ پیسے تو پکڑ۔" میں نے از خود سامان چکوائی کی شرح بڑھا دی تھی جسے وہ اسی طرح مٹھی میں دبا کر چلتا بنتا۔

آج جب میں سامان کی خریداری سے فارغ ہوئی تو سامان چکنے کو ایک موٹا تازہ مسٹنڈا کھڑا ہوا تھا۔ میری نظروں کو تو وہ

لفنگا ہی سا لگا۔ "وہ کہاں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ نذیرا۔ نذیرے کو بلاؤ"۔ میں نے رعب سے کہا۔

"جی وہ چلا گیا۔ یہاں سے چلا گیا"۔

"تمام عمر گذار کر اب کیوں چلا گیا۔ میں نے حیرت سے دیکھا۔

سامنے ہی دال مصالحوں کے کاؤنٹر پر گلاب دین کڑچھی سنبھالے کھڑا تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی گلاب دین۔ نذیرا کہاں چلا گیا؟"

"جی وہ گودام کے مال کی چوری کرنے کرنے لگا تھا۔ چوری چوری بیچنے لگا تھا"۔

گلاب دین کی آواز دھیمی تھی اور سر جھکا ہوا تھا۔

"نذیرا چوری — ! گودام میں وہ اب چوری کر رہا تھا یا پہلے بھی کرتا رہا تھا۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کسی نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کیا یہ سچ ہے کہ وہ بدل گیا — بدل گیا — وہ بھی بدل گیا — وہ بھی بدل گیا۔

میں کاؤنٹر بہ کاؤنٹر بدلی ہوئی صورتوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھتی چلی گئی۔

مجھے اپنے سوال کی بازگشت میں جواب بھی سنائی دے رہا تھا۔

ہاں بدل گیا۔ سب کچھ بدل گیا۔

برف کی دھول سی چار سو اڑ رہی تھی جیسے اس دھول کے عقب میں حاجی صاحب پورے رعب و جمال کے ساتھ اپنے مشک رنگ گھوڑوں والی لاکھی کام کی گاڑی اڑائے لئے جا رہے تھے۔

سرد ہواؤں کے جھکڑوں کے خوف کے مارے میں آج وولنز کے مجسمے کے قریب سے نہ گزری کہیں یہ نہ ہوا ہو کہ وہاں جاؤں تو دیکھوں کہ وولنز نے اپنا معصوم اور مقدس لبادہ، وہ پیارا سا سیاہ گاؤن اتار پھینکا ہو اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب بیچ دی ہو۔

ساری رمزیں تجریدیں اور علامتیں روٹھ گئیں یا میں ان سے روٹھی — جو بھی ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ اب میں جدید، رائج الوقت اور فیشن کے مطابق اسلوب سے گریز کے اسی گھسے پٹے اور دقیانوسی اسلوب میں افسانہ لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔ میرا دل اس کتے کی تلاش میں سرگرداں ہے جو صدیوں میرے ساتھ غار میں محو خواب رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایسے سکے ہیں جنھیں خلق خدا رائج الوقت قرار نہیں دے گی۔

نیک پروین

رضیہ فصیح احمد

بات بڑی آسانی سے اُلجھتی چلی گئی۔

یہ قصہ ہے فرانسیس پروین کا جو میرے ہاں جمعدارنی تھی۔ وہ اپنے لاڈلے بیٹے ٹامس کو ٹھومس کہا کرتی تھی۔ ماں بیٹے خاصے بدشکل تھے اور غلیظ بھی۔ ماں کے چہرے پر کچھ جھرّیاں وقت نے، کچھ دھوپ، میل کچیل اور غلاظت نے ڈال دی تھیں۔ بیٹا فطری کاہل، کام چور نظر آتا تھا مگر ماں کا یقیناً راج دلارا تھا کہ وہ جب بھی ٹھومس کا ذکر کرتی اس کے چہرے پر کلیاں سی چٹکتی نظر آنے لگتی تھیں۔

پروین کا شوہر عرصہ دراز ہوا مر چکا تھا اور پروین اپنے دیور کی بائیکل کے پیچھے بیٹھ کر کام کرنے آتی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر اپنے کام پر چلا جاتا تھا اور واپسی پر سے لے لیتا تھا۔ کبھی وہ جلدی چلا آتا، تب وہ دونوں پچھلے باغ میں لگے ایک امرود کے درخت کے سائے میں بیٹھ کر سگرٹ پیتے، کیڑے بھرے لیکن زرد زرد امرود کھاتے جنھیں گلہریوں اور چڑیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں کھاتا تھا۔ اور پھر پروین جاتے جاتے یہ ضرور کہتی: "بیگم صاب میں جاری آں۔" یعنی روٹی، باسی سالن یا کوئی اور چیز دینا ہے تو دیدو۔ کبھی کبھی وہ لاڈلا ٹھومس بھی آن دھمکتا اور ماں امرودوں اور بچے کھچے ڈبل روٹی کے ٹکڑوں سے یوں اس کی تواضع کرتی جیسے وہ آج ہی کہیں دور سے مہمان آیا ہو۔

میری اور اس کی زیادہ بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ البتہ جب کبھی وہ ایڈوانس لینے کے موڈ میں ہوتی تو ادھر اُدھر کی بات شروع کر دیتی اور تان آخر میں اپنے مطلب پر توڑتی تھی۔ کبھی یہ پوچھتی کہ تم کیا پڑھتی رہتی ہو، کبھی اپنی بیماری آزاری سے بات شروع کرتی، و کبھی کسی نئی خبر یا شہر میں ہونے والے کسی حادثے سے۔ مگر ایک دن وہ بغیر کسی تمہید کے بولی: "بیگم صاب یہ جو میرا دیور ہے نا، تم نے دیکھا ہے؟"

"ہاں دیکھا ہے۔"

"کیسا ہے؟"

"اچھا خاصا ہے۔"

"میں اس سے شادی کر لوں؟"

میں متعجب ہوئی۔ دیور جوان گبھرو تھا۔ پروین اس کی ماں کے برابر لگتی تھی۔ حیرت شاید میری آنکھوں سے عیاں تھی۔ میرے جواب دینے سے پہلے وہ بولی: "وہ ہی جی میرے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ آج سے نہیں کئی برسوں سے۔ میں نے اسے ڈانٹا ڈپٹا بھی، سمجھایا بھی مگر وہ نہیں مانتا۔"

"اچھا!" اتنی دیر میں ایک لفظ بہ مشکل میری زبان سے نکلا۔

"ہاں جی ــــ میں نے اسے بڑی اچھی اچھی لڑکیاں دکھائیں مگر اس کی تو بس ایک ہی رٹ ہے کہ تو ہی مجھ سے شادی کر۔"

"پھر تم کیا کہتی ہو؟"

"میں یہی کہتی ہوں کہ میں بوڑھی ساڑھی ہوں، میرا تیرا میل نہیں ہے۔ میں تو اپنے ٹھومس کے لیے جیتی ہوں۔ پر بیگم صاب وہ بھی

شُومس سے بڑی محبت کرتا ہے۔ کہتا ہے۔ ایسا باپ بن کر دکھاؤں گا کہ کوئی نہ جانے گا کہ سگا باپ نہیں ہے۔"

"تمہاری برادری کے لوگ کیا کہتے ہیں؟"

وہ کہتے ہیں کہ اپنے دیور کی شادی کہیں اور کریا کھود کرلے، کیوں اسے بوڑھا کر رہی ہے۔ پر جی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں نے کل پھر ایک لڑکی اسے دکھائی ہے۔ بہت کھوبصورت ہے، دیکھو شاید مان جائے۔"

"پھر اب مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔؟" میں نے کہا۔

"ایسے ہی میں نے سوچا تم سے پوچھ کر دیکھوں۔ سارا محلہ کہتا ہے بیگم صاب بڑی اکل والی اور گریبوں کی ہمدرد ہے۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور اس واقعہ کو بھول بھال گئی۔ کئی ماہ گزر گئے تو ایک دن وہ پھر سر پر آن نازل ہوئی۔ "بیگم صاب ایک بات کہوں؟"

"کہو۔"

"جی، وہ میرے پاس کچھ رُپئے ہیں وہ تم اپنے پاس رکھ لو۔"

"کیوں؟ خیریت؟"

"میں شادی کر رہی ہوں نا جی۔"

"اچھا! کس سے؟"

"اسی سے جی، دیور سے۔" کہہ کر وہ کچھ لجا سی گئی۔ اس کے چہرے کی جھرّیوں میں ہلکی سی سرخی دوڑی۔ پھر ہمت باندھ کر وہ بولی۔ "آپ کو جی پتہ ہے میرے پاس جو کچھ ہے میں نے پیسہ پیسہ جوڑا ہے۔ کوئی اچھا جوڑا یا جوتا ملتا ہے تو اسے اونے پونے بیچ دیتی ہوں۔ یہ میرے شُومس کا حق ہے مگر بشیرے کو پتہ چل گیا تو وہ مانگے گا ضرور، حالانکہ اس کے بھائی کا ایک پیسہ بھی نہیں ہے میرے پاس۔ وہ تو سب اڑا دیتا تھا سگرٹوں میں، اور چرس میں۔ پھر بتاؤ بیگم صاب جو تم روپیہ رکھنے کی حامی بھرو تو میں شادی کے لیے ہاں کر لوں۔"

میں نے کچھ دیر سوچا۔ روپیہ رکھنے میں مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آئی۔ آخر پروین کو مجھ پر بھروسا ہے تبھی پیسہ رکھ رہی ہے۔ باقی رہا بشیرے کو دینا نہ دینا تو وہ جانے اور بشیرا جانے۔ میں نے پیسہ رکھنے کی حامی بھر لی اور پروین نے بشیرے سے شادی کر لی۔

اب بھی وہ اسی بشیرے کی سائیکل پر بیٹھ کر کام کرنے آتی۔ فرصت کے اوقات میں دونوں امرود کے سائے میں بیٹھ کر سگرٹ پیتے باتیں کرتے اور کیڑے بھرے لذیذ امرود کھاتے

ایک دن پروین نے مجھ سے کہا کہ اگر کبھی وہ بطور قرض کچھ روپئے بشیرے کے سامنے مانگے تو اس کے رکھے ہوئے پیسوں میں سے دیدیا کروں مگر بشیرے پر یہی ظاہر کروں کہ قرض دے رہی ہوں۔ میں نے اس کے لیے بھی حامی بھر لی۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ اب میں پروین کے رازوں کی اور اُس کے پیسوں کی امین تھی۔

کرسمس اور اپنی بہن کی شادی کے موقع پر پروین لاہور جانے لگی تو اس نے مجھ سے تین سو رُپئے قرض مانگے۔ رقم زیادہ تھی میں نے تھوڑی سی حیل وحجت کی کہ یکمشت اتنی رقم نکالنا میرے لیے مشکل ہے۔ بشیرا ساتھ تھا۔ پروین نے میری خوشامد کی کہ بیگم صاب موقع ہی ایسا ہے۔ کرایہ بھاڑا ہے، لینا دینا ہے کپڑے بنانے ہیں۔ آپ نہیں دیں گی تو کون دے گا۔ واپس آکر بشیرا اور میں دو ہی مہینوں میں آپ کا سارا قرض اتار دیں گے۔ پروین نے یقیناً مجھ سے بہتر ایکٹنگ کی اور میں نے اس کی جمع پونجی میں سے تین سو رُپئے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ وہ اپنی جگہ ایک عورت بھی رکھوا گئی، اور کہہ گئی کہ بشیرا پنجاب سے جلد واپس آجائے گا اور اُس کی واپسی تک وہ ہمارے گھر کا کام کرے گا۔

میری نئی جمعدارنی زیادہ باتونی تھی۔ وہ مجھے بتاتی کہ پروین کا سابقہ دیور اور حالیہ شوہر خاصا شرابی جواری تھا مگر بھاوج سے نکاح پڑھوانے کے بعد نہایت شریف بن گیا ہے۔"خدا جانے اس کالی، مریل، بوڑھی میں ایسے کیا گن ہیں کہ پہلا شوہر بھی اس کے نام کا کلمہ پڑھتا تھا اور یہ بھی اس کی مٹھی میں ہے۔"

"اس کی زبان میٹھی ہے۔"

"نہیں جی یہ بات نہیں ہے۔ کبھی غصے میں آجاتی ہے تو اتنا بکتی جھکتی ہے کہ آپ دیکھا کریں۔ مگر ویسے اس کے ہاتھ میں کوئی جادو ہے جو یہ مردوں کو رام کر لیتی ہے۔"

"ہوگا۔" میں مختصراً کہتی۔ اور ان نوسی عورتوں کے سامنے کیا کہا جاتا

کوئی ایک مہینے بعد بشیرا واپس آیا تو خاصا اُجڑا اور پریشان نظر آرہا تھا کہنے لگا "بیگم صاب پروین سخت بیمار ہے۔ ڈاکٹر نے بڑا آپریشن بتایا ہے۔ اس نے کہا ہے میں نے بیگم صاحبہ کے پاس جو روپے رکھوائے ہیں وہ لے کر فوراً آ۔ میں نے کہا بھی کہ منی آرڈر سے منگوا لیتے ہیں پر وہ نہ مانی کہ نہیں، یوں بیگم صاب نہ بھیجے گی۔ تو خود جا اور لے کر آ۔ بیگم صاب جلدی سے پیسے دیدو۔ آج ہی واپس جانا ہے۔ اگر آپریشن میں دیر ہوئی تو اس کی جان کا خطرہ ہے۔"

"کیا ہوا اسے۔؟" میں پوچھا۔

"جی وہ بچہ —— پیٹ میں مر گیا ہے۔ ڈاکٹر کہتی ہے آپریشن سے نکالنا پڑے گا۔ اور خون وغیرہ بھی دینا ہوگا۔" اس نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔

اوہ، اس عمر میں بچہ! مجھے ان لوگوں کی عقل پر ہنسی بھی آئی اور رونا بھی۔ پروین کے لیے تو ٹھوس ہی سب کچھ تھا۔ ظاہر ہے کہ بشیرے کو شوق چرایا ہوگا —— بہرحال۔ اس سے میں کیا کہتی۔ میں نے پیسے نکال کر دیدیئے اور وہ اسی وقت چلا گیا۔

کئی ماہ گزر گئے۔ میرے ہاں نئی جمعدارنی کام کرتی رہی کبھی میں اس سے پوچھتی کہ پروین اور بشیرا کب آئیں گے تو وہ گول مول جواب دیدیتی مجھے محسوس ہوتا جیسے وہ میرا کام چھوڑنا نہیں چاہتی۔ ہو سکتا ہے پروین اور بشیرا آ بھی گئے ہوں اور انھوں نے کوئی نیا ٹھکانہ سنبھال لیا ہو کیونکہ ان کے ہاں یہ بھی ایک عام سی بات ہے۔

پھر ایک دن اچانک پروین آگئی۔ وہ کمزور اور پریشان سی لگ رہی تھی۔ میں نے خیریت پوچھی تو رونے لگی۔ بولی "بیگم صاب، میں لاہور میں تھی اور بشیرا دوبئی بھاگ گیا۔ لاہور میں جی مجھ سے منت کر کے پیسے مانگتا تھا دوبئی جانے کے لیے۔ کبھی غصے میں مارتا تھا اور کہتا تھا ہو نہ ہو میرے پاس پیسہ ہے، ساری دنیا جانتی ہے۔ ایک دن میں نے غصے میں کہہ دیا کہ ہاں ہے مگر ٹھوس کے لیے ہے تو جان سے بھی مار دے تو میں نہیں دے سکتی۔ اس پر وہ ناراض ہو کر لاہور سے آگیا مجھے پتہ بھی نہ چلا۔ ابھی کراچی سے کوئی رشتے دار آیا تو پتہ چلا کہ وہ تو دوبئی چلا گیا —— لو جی بیگم صاب خواہ مخواہ میری بے عزتی ہوئی۔ دنیا مجھ پر ہنستی ہے۔ کہتی ہے تیرا دولہا کہاں ہے۔ میں کہتی ہوں دفعے کرو لالچی کو۔ اچھا ہوا چلا گیا، منہ کالا کیا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ٹھوس کا باپ بن کر اُس کا گلا کاٹنا چاہتا ہے۔ اب مجھے پتہ چلا کہ اس نے مجھ سے روپے کے لالچ میں شادی کی تھی۔ میں نے جو پائی پائی کر کے آپ کے پاس رقم جمع کرائی تھی اس لیے تو نہیں کہ اس بے ایمان کو دیدوں ——"

وہ بولے جا رہی تھی۔ اور میں گم چپ! —— اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ جسم کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ چہرے کی جھریوں میں پسینہ بہہ رہا تھا۔

"بیگم صاب میں اتنی بیمار پڑی، تب میں نے آپ سے پیسے نہ منگوائے۔ خدا بھلا کرے مشنری والوں کا، انھوں نے مفت میرا علاج کیا۔"

اب میں اس سے کیا کہتی کہ بشیر تو پیسے لے بھی گیا۔ یقیناً یہ وقت ایسی بات کہنے کا نہیں تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ کچھ دن آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ بات پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھی۔ پروین اس قدر کمزور تھی کہ اس نے میرے ہاں کا کام دوبارہ شروع نہ کیا مگر اپنے رکھوائے ہوئے پیسوں میں سے اب بھی وقتاً فوقتاً پیسے لینے آتی رہتی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ مناسب وقت دیکھ کر اسے حقیقت حال سے آگاہ کر دوں گی۔ میرے پاس سے دو چار سو روپے لینے کے بعد شاید یہ صدمہ اس کے لئے قابلِ برداشت ہو جائے۔

ایک دن پروین آئی اور آتے ہی اپنے باقی ماندہ پیسے مانگے۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ میں نے ٹالنے کے لیے کہا کہ آج میرے پاس پیسے نہیں ہیں پھر کسی دن دے دوں گی۔ میں چاہتی تھی تنہائی میں اسے ساری بات بتا کر جتنی مدد ہو سکے کر دوں۔ مگر وہ ایک دم اینٹھ گئی اور اس شخص کے سامنے بدتمیزی سے کہنے لگی: "بیگم صاب میں اپنے پیسے مانگ رہی ہوں کوئی خیرات نہیں مانگ رہی۔ جو تم نخرے دکھا رہی ہو۔"

یہ سنتے ہی مجھے طیش آ گیا اور میں نے وہ بات پتھر کی طرح اس کے سر پر دے ماری "کیسے پیسے؟ تمہارے پیسے تو کب کے بشیر لے بھی گیا۔ یہ جتنے پیسے اب تک دیئے ہیں سب اپنے پاس سے دے رہی ہوں۔" غصے میں دھڑ سے دروازہ بند کر کے میں نے چٹخنی لگا دی ــــــ اور اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

ذرا دیر بعد سڑک کی طرف سے چیخ پکار کی آواز سنی تو میں نے باورچی خانے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ پروین چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ گیٹ کے سامنے چوکیدار، خانساماں اور ڈرائیور اس کے گرد جمع تھے۔ کئی بیگمات بھی باہر نکل آئی تھیں۔ میں سمجھی بے چاری کے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا۔ لپک کر باہر نکلی تو وہ کہہ رہی تھی: "میرے پانچ ہزار کھا گئی یہ بیگم ــــــ جھوٹ بولتی ہے کہ بشیر لے گیا۔ ایک پائی ہضم نہیں ہو گی اسے۔ غریب کا پیسہ آسانی سے ہضم نہیں ہوتا۔ خون تھوکے گی ــــــ"

جی چاہا چوٹی پکڑ کر ایک لگاؤں مگر اپنی رہی سہی عزت بچا کر لوٹ آئی اور دروازہ بند کر لیا۔ خدا معلوم وہ کب تک بکتی جھکتی رہی۔ میں اپنی صفائی میں کہتی بھی کیا۔ میرے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ بشیر پروین کے پیسے لے گیا ہے اور نہ اس بات کا ثبوت تھا کہ پروین نے میرے پاس فقط ڈیڑھ ہزار روپے رکھوائے تھے۔

پُکار

ڈاکٹر سلیم اختر

بستی خوف کی مٹھی میں دبی تھی کہ زندگی بند مٹھی سے ریت کی مانند پھسلتی محسوس ہو رہی تھی۔ دن باعثِ تقویت تھا کہ وبا
رات کی پرچھائیں اوڑھے آتی تھی:

بستی سے دور، بیابان قصبے کے پچھواڑے، دلدلوں سے گزرتا کائی آلود راستہ جس قبرستان کی طرف لے جاتا ہے اس کی قدامت بوڑھوں کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی حکایات کے اسرار میں گم ہے۔ سانخوردہ بیلیں کسی پلید روح کے خشک بالوں کی طرح الجھی ہیں۔ ان بیلوں کے پیچھے سنگی دیوار میں گویا دروازہ کا نقش ہے جس کے بے تالہ کواڑ کسی سے بھی نہیں کھل سکتے۔ جب غیر مرئی ہاتھ سے دروازے کے پٹ زنگ آلودہ چولوں پر چرچراہٹ سے گھومتے تو چوبی زینہ پاتال میں اترتا نظر آتا اس کے گھن کھائے تختے کسی فانی وجود کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔ تازہ ہوا کا گذر نہیں کہ بیلیں راستہ نہیں دیتیں۔ صرف دائمی سیلن کی بو کا راج ہے۔ زینہ جس تہ خانے میں ختم ہوتا ہے وہاں ہڈیوں کا ڈھیر ہے جس سے ذرا فاصلے پر ایک کھوپڑی آنکھوں کے دو سوراخوں سے منظر پر پہرا دے رہی ہے۔ وہاں سرخ چیونٹوں کے سوراخ ہیں، دیمک کا ڈھیر ہے۔ مادہ بچھو سے اس کے بچے چمٹے ہیں اور سانپ کی بانبی ہے لیکن ہڈیوں کے دائرے کے قریب پھٹکنے کی مجال نہیں۔

جب رات کے وقت برگد میں رات برابر برابر تلتی ہے اور دور بستی میں کسی خوف زدہ کتے کی کپکپاتی آواز بند کواڑوں پر دستک دیتی ہے تو دائرے کے اندر نیند میں ڈوبی ہڈیاں بیدار ہو جاتی ہیں۔ بوڑھے جوڑ بل رہے ہیں۔ پاؤں، پنڈلیاں، رانیں، پسلیاں، بازو ہاتھ، گردن سب بے آواز جڑتے جاتے ہیں حتیٰ کہ جسم مکمل ہو جاتا ہے۔ تب یہ بے سر جسم کھوپڑی کے سامنے رکوع کے بل ہو جاتا ہے وہ کھوپڑی اچھل کر اپنے مقام پر متمکن ہو جاتی ہے۔ یہ جسم چلتا نہیں بلکہ ہوا کے جھونکوں کی مانند لہریا لیتا ہے۔ گھن لگا زینہ اس کے لئے سنگی زینہ بن جاتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے تو سمٹ کر بیلیں راستہ دیتی ہیں۔ دلدلوں کی مانگ میں کائی آلود راستے پر چلتے چلتے یہ فیصلہ کر لیا کہ آج کیا بننا ہے۔ بستی والے حصول غذا دشوار سے دشوار تر بناتے جا رہے تھے لیکن یہ رکاوٹیں غذا میں مصالحہ ثابت ہوتیں۔

نالی سے گھر میں داخل ہو کر چوہا گول گول آنکھوں سے تمام گھر کی تلاشی لے رہا تھا کہ ماں کے پہلو میں لیٹا کول وجود نظر آگیا۔ وہ رُک گیا مگر مونچھوں کے بال متحرک رہے۔ گول پتلیوں میں بچے کا وجود ساکت تھا۔ اس نے جست لگائی تو وہ چوہا تھا مگر بچہ منہ میں دبائے جس نے دیوار پھلانگی وہ سیاہ بھیڑیا تھا۔ بچے کی دردیلی چیخ حلق میں دم توڑ گئی۔ خون کے قطرے رونما تھے۔ خوف زدہ گلیوں میں خاموشی چوکیدار تھی۔ چوہا جب پر بچہ منہ سے نکلا تو پھیپھڑے ساکت تھے۔ بھیڑیئے نے انسان کی مانند دونوں پنجوں میں گردن دبا کر یوں مروڑی کہ وہ الگ ہو گئی۔ نرخرے سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا جسے اس کی زبان لپالپ پی رہی تھی۔ خون پینے کے بعد لمبے لمبے ناخنوں سے بچے کا ملائم پیٹ ادھیڑتا ہے وہ ایک ایک حصے کا نرم نرم گوشت مزے لے لے کر چبا رہا تھا۔ اس گوشت اور خون کی بو سونگھ کر کتے ایسے خوف زدہ ہوئے کہ ٹانگوں میں دم دبائے میاؤں میاؤں کرتے بھاگ نکلے:

صبح چوک میں بچے کے ناخن، بال، اور چیتھڑے۔ نفرت سے بستی کی ہر کھڑکی نے لہسن کے ہار پہن رکھے تھے کہ عام عقیدے کے موجب لہسن کی بو تک کے لئے
ناگوار تھی۔ ہر دروازے پر مقدس پانی چھڑکا جاتا اس توقع پر کہ شاید یہ مقدس قطرے انگاروں میں تبدیل ہو جائیں۔

خوابگاہ میں جاگنے والی بلا سے خوفزدہ نہ تھی کہ انتظارِ محبوب میں تھی۔ پیغام ملا تھا کہ وہ رات کو کسی نہ کسی طرح پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ دن کی روشنی دشمن تھی، اور رات پناہ گاہ۔ پردہ سرکایا۔ چاندنی میں نہایا راستہ خالی تھا۔ وہ کئی دن بعد ملنے والے تھے، چنانچہ یہ تصور ہی جسم میں لطیف ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ بستر پہ بے چینی سے کروٹ بدلی تو کھڑکی کے پاس سایہ لہرایا۔ فوراً اُٹھی۔ کھڑکی کے پٹ کھولے اور دلہن کے جال کو مکڑی کے جالے کی طرح اتار پھینکا۔ وہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ اندر چلا آیا۔ وہ جو کھڑکی کے باہر رقصاں ذرات کا ہیولیٰ تھا کمرے کے اندر مجسم ہو چکا تھا۔ خوف سے ٹانگیں گویا ہڈیوں کے گودے میں تبدیل ہو گئیں۔ وحشت سے پھٹی آنکھوں میں محبوب کی تصویر نہ تھی، دہشت سے منہ تو کھلا مگر چیخ زخمی پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ پیچھے ہٹنا چاہا مگر اب مانندِ تصویرِ بے جان آنکھوں کی پھیلی پتلیوں میں وہ قدم قدم اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے بھنور میں وہ ڈوبتی نیا تھی۔ اس کے چھونے کی ٹھنڈک نے سرد چھری بن کر اعصاب ذبح کر دیئے۔ وہ اس کے بازوؤں میں نڈھال تھی۔ اس نے نہایت نرمی اور پیار سے لبادے کے بند کھولے۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا یہ اسی کا وجود ہے یا اور کسی کا؟ اس کی گردن کے نیچے شہ رگ پر دانتوں نے سوراخ کیسے کیا؟ سرخ اور نرم ہونٹوں کے لمس اس پر سرشاری کی کپکپاہٹ کیوں طاری ہو رہی ہے اور یہ کیسی لذت ہے کہ جسم کے ایک ایک مسام کے خفیہ در وا کیے جا رہی ہے۔ اس نے بے قرار ہو کر دونوں بازو اس کی گردن میں حمائل کر کے اسے اپنی جانب کھینچا تو سوراخ پر رکھے ہونٹوں میں مزید گرم جوشی پیدا ہو گئی۔ رگوں میں گویا خون کا جوالا مکھی بیدار ہو گیا۔

یوں محسوس ہو رہا تھا گویا یہ سب اس کے ساتھ نہیں ہو رہا بلکہ وہ اپنے وجود سے الگ ہو کر اس عمل کا نظارہ کر رہی ہے۔ کیا یہ خواب ہے؟ دن بھر سوچتی رہی مگر انوکھی لذت خوابوں کا مقدر کہاں؟ یہ میٹھی میٹھی کسلمندی بھلا کس خواب کی تعبیر ہو سکتی ہے۔ کبھی کبھی بے خیالی میں ہاتھ اس ننھے سے سوراخ کو ٹٹول لیتا تو خواب کے حقیقت ہونے کا یقین آ جاتا۔ وہ مقناطیسی لہریں نمارتی کرتی آنکھیں، وہ اعصاب پر سرد چھری کا پہلا وار، وہ سرخ ہونٹوں کی نرماہٹ، وہ سرد دانتوں کا جلد کتر کر سوراخ کرنا ــــ سوراخ چھوتے ہی کپکپی سب یاد دلا دیتی۔ دن بھر وہ عجب بے چینی اور بے کلی میں مبتلا رہی کہ رگوں میں دوڑتے خون کی پکار نہ تھمی۔

بستی پر خوف کے گہرے ہوتے سائے لوگوں کے تعلقات بھی متاثر کر رہے تھے۔ ہر شخص دوسرے کو بلا سمجھ کر مورد الزام ٹھہراتا۔ خوشگوار تعلقات میں خوف کی پھانس اٹک چکی تھی۔ ہر ذہن شک کے کانٹوں کی فصل اگا رہا تھا۔

اس نے سوچا شاید یہ بھی میرا واہمہ ہو کہ وہ اب ملتفت نہ تھی مگر آنکھوں کو کیسے جھٹلاتا جنھوں نے اسے کسی اور ہی کے لئے اسے کھڑکی کھولتے دیکھا تھا۔

وہ روز بروز کمزور ہو رہی تھی۔ گالوں کے سیب چہرے کی سرسوں میں چھپ گئے۔ ہونٹوں کی کلیاں کملا گئیں۔ آنکھوں کے ستاروں کی روشنی ہوا سے بجھتے دیپ کی لو کی مانند تھرا اٹھتی۔ ادھر رگوں میں دوڑتے لہو کی پکار جیسے جنون میں تبدیل ہو گئی۔ وہ کسی سے بات نہ کرتی بس اپنی لذت کے حصار میں مقید لہو کی گنگناہٹ سنتی رہتی۔ دن بھر پژمردہ رہتی۔ رات آتی تو رات کی رانی بن کر لہو کی مہک دینے لگتی۔ کھڑکی کے پٹ دیوانے عاشق کے بازوؤں کی مانند کھلے رہتے۔

بستی کے خوف زدہ لوگ بلا سے نجات حاصل کرنے کی تدبیروں میں لگے تھے مگر عامل، ساحر، کاہن سب ناکام رہے تھے۔

بستی سے دو دن کے فاصلے پر ایسا بیابان تھا جہاں مارے خوف کے لوگ دن کو بھی جانے کی ہمت نہ کرتے تھے۔ درختوں کی شاخیں سانپ بن کر ڈستی محسوس ہوتیں۔ جھاڑیاں خبیث بونوں کا روپ دھار لیتیں۔ مسافر ستانے کے لئے بیٹھ جائے تو سیاہ چیونٹے جسم میں بل بنا کر قطار در قطار داخل ہونا شروع ہو جاتے ــــ اور اس بیابان سے وہ متوالا گزر رہا تھا۔ وہ خوف زدہ نہ تھا کیونکہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا خوف محبوب کی جان جانے کا تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ محبوبہ اب نادیدہ وجود کے قبضے میں ہے۔ اسے ہر قیمت پر حتیٰ کہ اپنی جان کی قیمت پر بھی بچا لینے کا سودا مہنگا نہ تھا۔ کبھی کبھی ماحول غلبہ پا کر اسے خوف زدہ کر بھی دیتا۔ تب وہ محبوبہ کا روشن چہرہ تصور میں

لاتا تو اس کی روشنی سے خوف چمگادڑ کی مانند اُڑ جاتا۔

اچانک اس نے خود کو جادوگرنی کے سامنے پایا جو جھاڑو پر اُڑتی تھی۔ وہ جب کچھوے پر سواری کرتی تھی اس کی پشت اونٹ کے کوہان سے بھی اونچی تھی۔ وہ چھپکلیوں کا ناشتہ کرتی تھی۔ سینہ کا شوربہ پیتی تھی۔ غصے میں آتی تو بال سانپ بن کر پھنکاریں مارتے۔ اپنا بال توڑ کر آگ میں ڈال دیتی تو اُڑتی چنگاریاں بونوں میں تبدیل ہو جاتیں —— ایسے بونے جن کے بھالے زہر میں بجھے ہوتے۔

وہ تو محبت میں سرشار تھا اور محبوبہ کا تصور دل میں بٹھائے تھا، بلا خوف جادوگرنی کی طرف بڑھتا چلا گیا جس کا گوشت ہڈیاں چھوڑ چکا تھا جس کے پلپلے منہ میں سیاہ دانت سنگریزوں کی مانند تھے مگر جھریوں کے بھنور میں جس کی انگارہ آنکھیں اس کی منتظر تھیں۔ بولی تو آواز میں صدیوں پرانے کنویں کی گونج تھی۔

"مجھے معلوم ہے تم کیوں آئے ہو!"

وہ قدموں پر گر پڑا۔

"اس بلا سے بچنا آسان نہیں۔ صدیوں پرانی ہے جسم بدل سکتی ہے، جون بدل سکتی ہے، وقت بدل سکتی ہے۔ ایک بستی چٹ کرلے تو دوسری کا رُخ کرتی ہے جس کا خون منہ کو لگ جائے اسے کبھی نہیں چھوڑتی جتنی کہ جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ یوں مرنے والا مر کر امر ہو جاتا ہے کہ وہ خود بھی خون پینا شروع کر دیتا ہے۔"

کان سن رہے تھے مگر ذہن الفاظ کے خوفناک معانی سمجھنے سے قاصر تھا کیا اس کی معصوم محبوبہ خون آشام بلا میں تبدیل ہو جائے گی؟ وہ خوبصورت ہونٹ جو صرف پیار کے لئے بنائے گئے ہیں، کیا دوسروں کا خون چوسیں گے؟

"میں جانتی ہوں تم کیا چاہتے ہو!"

وہ اس کا ہاتھ تھامے ایک غار میں لے آئی جہاں الاؤ کے بلند شعلوں پر لوہے کے برتن میں بلبلے دیوانہ وار رقص کر رہے تھے۔ وہ اس میں لوہے کی سلاخ ہلاتے ہوئے بولی "یہ زہر ہے۔"

وہ تھرا گیا۔

"یہ زہر اپنی عورت کو پلا دو۔ اس کے اثر سے اس کا خون زہریلا ہو جائے اور جب وہ بلا اس کا خون پیئے گی تو زہر اس کے جسم میں بھی داخل ہو جائے گا۔ تمہاری عورت کی موت میں، اس کی زندگی ہے۔"

کمرے میں داخل ہوا تو وہ بستر پر چت لیٹی تھی کس قدر کمزور ہو چکی ہے۔ چہرہ سیاہ اور ہونٹوں سے جیسے خون نچڑ چکا ہو۔ ہاتھ میں شیشی تھامے بستر کے قریب وہ بے یقینی کے عالم میں کھڑا تھا۔

اچانک اس کی بند آنکھیں کھلیں، آنکھیں چار ہوئیں تو وہ مسکرا دی۔ وہی دلفریب مسکراہٹ جس نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ بستر سے اُٹھی تو مسکراہٹ میں ایسی تبدیلی پیدا ہو گئی کہ اس کے جسم کو دہشت کی سرد لہر چھری کی مانند کاٹ گئی۔ وہ اس کی طرف قدم قدم بڑھ رہی تھی۔ اس نے بازو پھیلا رکھے تھے۔ وہ قدم قدم پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ تب اس نے زہر منہ میں انڈیلنے کو ہاتھ اٹھایا مگر ایک ہی ضرب سے شیشی فرش پر چکنا چور ہو گئی۔ زندگی بچانے والا زہر فرش میں جذب ہو گیا۔

اس کی محبوبہ کے کمزور جسم میں اب بلا کی توانائی تھی کہ اس کے بازوؤں میں وہ کسی بچے کی مانند مچل رہا تھا۔ پھر خوف سے پھیلی پتلیوں نے اس کے چہرے کو خود پر جھکتے دیکھا۔ باریک دانت شہ رگ پر سوراخ بنا چکے تھے اور جب وہ اس کے ساکت جسم سے بالآخر ہٹی تو گالوں سے زیادہ اس کے ہونٹوں کی سرخی دلفریب تھی۔

دُوسری کربلا

یونس جاوید

کنپٹی سے خون اس طرح پھوٹا تھا کہ آڑی ترچھی لکیریں اپنے دائروں میں مکمل ہو گئی تھیں۔ جیسے دنیا کے نقشے پر کسی نئی آزاد ہونے والی سرزمین کے گرد سرخ لکیروں سے نشان کر دیا جائے۔

"مسئلہ کیا تھا؟" سہارا دینے کے بجائے میں نے پوچھا۔

وہ زمین پر بیٹھ گئی — کھل کر پھیل کر — جیسے مسئلہ زمین ہو — مگر اس کا خون بہہ رہا تھا اور میں یہ جاننے کے لئے بیتاب تھا کہ یہ سب کیسے ہوا — کیوں ہوا؟

مجھ سے پہلے جو دوسرا نوجوان تجسس کی آگ میں جل رہا تھا، وہ بھی زمین پر بیٹھ گیا۔ اسے لڑکی کے ماتھے سے خون بہہ جانے کی پروا نہ تھی — وہ مسلسل لاٹھی مارنے والے کی مذمت کئے جا رہا تھا، حالانکہ اتنا ہٹا کٹا اور تنومند تھا کہ دبلی پتلی، ورنحیف و نزار لڑکی کو آسانی سے اُٹھا کر ہسپتال لے جا سکتا تھا۔

"اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔" ایک بڑے میاں نے چلتے چلتے مشورہ دیا اور یہ جا — وہ جا۔

"میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس ضرور لے جاتا — مگر تم لڑکی ہو۔" تنومند جوان اطمینان سے بولا۔ "ویسے تم بچ جاؤ گی۔"

"تو پھر؟" جھنجلا کر لڑکی نے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں ڈر کیوں نہیں لگتا فحاشی سے؟" نوجوان زور سے چلایا "اس سوچ نے میرے پاؤں جکڑ رکھے ہیں ورنہ —" وہ رک گیا اور آسمان پر اُڑتی چیل کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "پرندہ بھی زخمی ہو جائے تو میرا دل خون ہو ہو جاتا ہے —،"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ بپھری سی گئی تھی۔

"تم لڑکی ہو نا؟" نوجوان نے اپنی وضاحت پر اصرار کیا۔ مگر اس لڑکی نے کوئی جواب دیئے بغیر منہ پھیر لیا — اور یوں آسمان کی دیکھنے لگی جیسے وہاں سے کسی اچھی نوید کا ظہور ہونے والا ہو۔

خود میرے دل میں کیا کیا طوفان اُٹھے تھے، کتنا خون بہا تھا — کتنے آنسو میرا حلق نمکین کر چکے تھے۔ میں اندر سے سلگ رہا تھا — اور اب تک کتنا جل چکا تھا — لیکن ہر شخص کی طرح کس قدر بے بس تھا — پھر بھی تشدد کی مذمت کرنی چاہیئے اور اسی کے لیے میں پل کی پل رُکا تھا یہاں۔

لڑکی اب نیم بیہوش سی تھی — میں نے دیکھا، اس کے بازو پر بھی چوٹ تھی — پاؤں زخم زخم تھے — کنپٹی پر اس کا ہاتھ جم سا گیا تھا اور پور پور خون میں لتھڑی تھی۔

میں نے اسے چھوا — وہ برف ہو رہی تھی — آنکھیں تھیں جنہیں وقفے وقفے سے وہ کھولتی تھی — سارے جسم کی حرارت،

حدت آنکھوں میں جمع ہو گئی تھی ـــ اور ایک ایسی چمک بھی جو دل میں اُترنے والے یقین کے ساتھ آنکھوں میں اترا کرتی ہے ـ لمبا سانس لے کر میں چپ کھڑا رہا ـــ میں فساد سے بہت ڈرتا ہوں ـــ ہمیشہ دور رہتا ہوں ـــ دور سے دیکھتا ضرور ہوں ـــ ظاہر ہے میں اپنے معاشرے سے ـــ افراد سے کٹ کر تو نہیں رہ سکتا ـــ مجھے یہ جاننا ہوتا ہے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون ہے ـــ ظالم کی مذمت کرنی چاہیئے، یہی انصاف ہے ـــ یہی عدل ـــ یہی اخلاق ہے، یہی مذہب ہے ـــ اور میں کرتا ہوں ـــ دل سے مذمت کرتا ہوں۔ کئی لوگوں کو میں نے اپنے سامنے قتل ہوتے دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا۔ میں کسی کو وہ انجکشن لگتے بھی نہیں دیکھ سکتا جو اُس کی صحت یابی کے لیے ہوتا ہے میں قتل ہوتے کس طرح دیکھ سکتا ہوں البتہ یہ بتا سکتا ہوں ـــ کہ قاتل کون ہے۔

آج بھی میں نے دور سے ٹوہ لینے کی کوشش کی مگر کچھ پلّے نہ پڑا۔ ایک اکیلی لڑکی ـــ تھی بھی زندہ ـــ آس پاس ہجوم ہوتا تو شاید میرے لیے قریب آنا، پوچھ گچھ کرنا مشکل ہوتا ـــ حالانکہ یہ جاننا کتنا ضروری تھا کہ چوٹ کیسے لگی؟ کہاں لگی؟ اور کس نے لگائی؟

"تیرا ان سے کیا رشتہ تھا؟" نوجوان دیر سے خاموش تھا، پھٹ سا پڑا۔

"خون کا!" وہ بولی۔

"ضروری تو نہیں تھا ان کے لیے خون بہایا جائے؟" وہ مجھ سے زیادہ جانتا تھا اسی لیے بول رہا تھا۔

"خون کے لیے تو خون بہانا پڑتا ہے۔" لڑکی کی آواز کمزور ضرور تھی مگر اس میں کھنک سی پیدا ہو رہی تھی جو بعض اوقات جوش اور جذبے سے پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات دلیل اور یقین کے باعث:

"وہ ہیں کون؟" وہ پھر بولا "تم اسے جانتی ہو؟ کیوں تم نے ان کے لیئے لاٹھیاں کھائیں؟"

لڑکی نے جواب دینے کے بجائے چہرے سے دوپٹہ پھاڑا اور سر پر باندھ لیا۔

"پتہ نہیں وہ کون ہیں؟" ذرا بعد وہ کہنے لگی "پر شاہ رگ میں ان کا لہو دھڑکتا ہے۔"

اس نے زمین پر گرے ہیئر کو سمیٹ لیا جس پر خون کے دھبے تھے، جو تار تار تھا، کچھ ادھ جلے اخبار بھی زمین پر گرے تھے ـــ جن کے اندر باہر سیاہی تھی۔

"ان پر پانی بند ہے ـــ وہ پیاسے ہیں اور زخمی بھی ـــ" کچھ دیر وہ چرمر اخبارات کو اکٹھا کرتی رہی، پھر بولی "ہسپتال بھی محفوظ نہیں رہے ـــ زخمی ہسپتال میں جا کر زیادہ زخمی ہو جاتے ہیں۔ مر جاتے ہیں ـــ کیونکہ ہسپتالوں کے گرد توپیں نہیں رکھی جا سکتیں۔ یہ بد دیانتی، بد اخلاقی بلکہ مجسم بدی ہے ـــ ہے نا؟ ـــ" رُک کر وہ عالم سکرات میں آسمان کو تکتی رہی۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولی "پیاسے بچوں کی بلبلاہٹ میرا دل چیر رہی ہے۔"

"سر پر چوٹ لگی ہے نا ـــ بہک گئی ہے۔" نوجوان نے مجھ سے کہا۔

"تم پانچ روز تک پیاسے رہ سکتے ہو؟" وہ واقعی بہک رہی تھی۔ خون زیادہ بہہ جانے سے اس کا ذہنی توازن درست نہ رہا تھا۔

"شاید تمہیں پیاس لگی ہے؟" نوجوان دبے لہجے میں کہنے لگا "لیکن رمضان ہے اس لئے شاید ہی کچھ مل سکے۔"

"تم کہاں کے باسی ہو؟" لڑکی نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حیرت سے سوال کیا "کہاں سے آئے؟ ـــ کون ہو؟"

"یہ واقعی پاگل ہو رہی ہے ـــ کزن ہے میری ـــ پہچانتی نہیں مجھے"۔ لڑکا بولا۔

"پہچان ہی تو چکی ہوں!" بڑے اطمینان سے لڑکی نے کہا۔

"چوٹ نے اثر کرنا شروع کر دیا ہے!" نوجوان گھبرا گیا تھا ـــ "اسے سائے میں کر دینا چاہیئے۔"

آمنہ مینشن زیادہ دور نہ تھا۔ درمیان میں صرف ایک سڑک ہی تو تھی، پر سایہ اتنا گہرا تھا۔

ہم آمنہ مینشن کے سائے میں آ گئے ــــ یہاں تک آتے آتے ایک کراہ سی اس کے لبوں سے پھسل گئی تھی۔

"درد کہاں ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا

"دل میں" وہ بولی ــــ "خون کے ہر ہر خلیے میں ــــ روح میں ــــ" رک کر اس نے کہا۔ "پتہ نہیں کہاں کہاں ــــ"

"اوہ مائی گاڈ" نوجوان نے کہا۔ "یہ ہارٹ پیشنٹ بھی ہے!"

میں بھی پریشان ہو گیا تھا مگر اطمینان کی بات یہ تھی کہ ماتھے سے خون رِسنا بند ہو گیا تھا۔ سر پر بندھے سفید دوپٹے میں ایک لال سا پھول اُبھر آیا تھا ــــ تازہ، جیتے جیتے لہو کا رنگ کیسا خوبصورت ہوتا ہے ــــ میں نے سوچا ــــ وہ اس پھول سے سج سی گئی تھی حالانکہ چہرہ ہلدی ہو رہا تھا۔

"تمہیں کیا ضرورت تھی وکالت کرنے کی؟ ــــ تم ہو کیا؟ ــــ اپنی ذات پہچانو ــــ اپنی اوقات بھولو گی تو یہی ہو گا ــــ" نوجوان جلدی جلدی بول رہا تھا۔

"کہا نا ــــ پہچان گئی ہوں ــــ اپنی ذات بھی ــــ تمہاری بھی ــــ" رک کر اس نے بات بڑھائی۔ "تمہاری ذات جس کے پاس طاقت ہے ــــ وسائل ہیں ــــ مگر جرأت نہیں ضمیر کا سامنا کرنے کی ــــ" لمحہ بھر چپ رہ کر وہ چلائی "خون خون خون، چاروں طرف خون، پیاس، زخم، دھماکے، بیماریاں ــــ اس بربریت کے خلاف کچھ کہنا ــــ جرم ہے؟ ــــ بولو؟ ــــ بتاؤ مجھے؟؟" سانس لینے کو وہ رک گئی، پھر بولی۔ زمین سے رشتہ قائم رکھنے کا جذبہ کیا ہوتا ہے؟ اور اس کے لئے ــــ سب سے ٹکرا جانے کا حوصلہ کون دیتا ہے ــــ؟"

"یہ کیا کہہ رہی ہے؟" میں نے نوجوان سے پوچھا۔

"پتہ نہیں" وہ مردہ سی آواز میں بولا "پوچھ گچھ بیکار ہے اب ــــ" اس نے مجھ سے تصدیق چاہی "کیا نہیں؟"

"ہاں" میں نے کہا ــــ "دماغ کی چوٹ بری ہوتی ہے" ہم دونوں اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"وکیل کو فہ پہنچا ــــ تو اسے قتل کر دیا گیا ــــ میں تو زندہ ہوں ــــ" وہ پورے اعتماد و وثوق اور یقین سے بولی "اور رہوں گی بھی، زندہ ــــ زمین کی طرح ــــ اس کے رشتوں کی طرح ــــ جیتے لہو کی طرح ــــ جانتے ہو میں کون ہوں؟"

نوجوان مایوس ہو کر لرز سا گیا تھا۔ وہ جھک کر مجھ سے کہنے لگا "سب کچھ تلپٹ ہو گیا ہے۔" اس کے چہرے پر تاسف تھا، وہ بیٹھ گیا ــــ بالکل اس کے قریب ــــ اور اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر تقریباً چیخ پڑا "تم عورت ہو ــــ کمزور ــــ بے بس" ــــ رُک کر اس نے آہستہ بولنے کی کوشش کی "اسی لئے تم بچ گئیں ــــ اُٹھو ــــ آؤ ــــ تمہیں دوا کی ضرورت ہے ــــ" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ یوں نرم ہو گیا تھا جیسے اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہو ــــ "تمہیں نہیں جانا چاہیئے تھا ــــ کچھ فائدہ نہیں تھا ــــ ہوا کچھ؟"

"کچھ فائدہ نہیں ہوا" لڑکی اطمینان سے بولی۔ "میں پہلے خون دینے گئی تھی۔ ان کے لئے ــــ" لمحہ بھر کو وہ رُکی، پھر بولی "ایک جگہ ــــ پھر دوسری جگہ ــــ پھر تیسری ــــ"

"پھر؟" تجسس سے نوجوان نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ناکام لوٹی" وہ اسی اطمینان سے بولی۔

"میں نے کہا تھا تم عورت ہو ــــ"

"عورت ــــ عورت ــــ" چلا کر اس نے کہا ــــ پہلی مرتبہ وہ اس بری طرح چلائی تھی ــــ عورت ہوں ــــ طعنہ تو

نہیں ہوں۔"

وہ بڑی غضبناک لگ رہی تھی ـــــ "لیلیٰ بھی عورت تھی۔ پانچ ٹینک اس کے مورچے سے گزر گئے۔ لہو لہو کر گئے اسے ـــــ" وہ ہانپ رہی تھی۔ ذرا سے توقف سے اس نے پھولا ہوا سانس برابر کرنے کی کوشش کی۔ پھر بولی ـــــ "ایسا کہتے ہوئے شرم آنی چاہیئے تمہیں۔"

نوجوان شرمندہ ہونے کی بجائے بھڑک اُٹھا۔ "جاؤ نا ـــــ خون دوان کے لئے ـــــ سڑک پر جلوس لے کر نکل آئیں خواہ مخواہ۔"

وہی خون جو میں ان کے لئے دینے نکلی تھی ـــــ" وہ کہنے لگی ـــــ "سڑک پر بہہ گیا ـــــ ضائع ہو گیا سب ـــــ" وہ خاموش ہو گئی اور پھر یک لخت چلاّ کر بولی "کیا وہ ہمارے کچھ نہیں تھے؟ بولو، بتاؤ؟؟"

"صرف جذبات کی آنکھ سے دیکھتی ہو تم ـــــ" نوجوان ٹھنڈے لہجے سمجھانے لگا ـــــ "کچھ مصلحتیں ہوتی ہیں ـــــ کچھ سیاست ـــــ کچھ احتیاط ـــــ رموزِ سلطنت ہوتے ہیں کچھ ـــــ دنیا میں زندہ بھی رہنا ہے ہمیں ـــــ دوسروں کے لئے مر جائیں ہم؟"

"وہ ہمارے دشمنوں سے لڑ رہے ہیں ـــــ کیا وہ دوسرے ہوئے؟" اس کے لہجے میں التجا کی حد تک نرمی تھی۔

"ہاں" لڑکا مصر تھا ـــــ رُک کر اس نے کچھ دیر سوچا اور بولا ـــــ "ہوتے سوتے تماشا دیکھ رہے ـــــ تم نے بھی دیکھا ہوتا ـــــ"

اب لڑکی کی باری تھی ـــــ مگر وہ خاموش ہو گئی ـــــ اندر ہی اندر دکھ کی کوئی ٹیس تھی جو اسے بولنے نہ دے رہی تھی ـــــ اندر کا کرب چہرے کی سلوٹوں سے عیاں تھا ـــــ دیر بعد ـــــ یوں لگا جیسے اس نے اپنے آپ کو جمع کر لیا ہو ـــــ اس کا سارا اپنا آپ اس کے عجز، اس کے انکسار اور اس کی التجا میں تھا ـــــ لگتا تھا وہ نوجوان سے نہیں، دنیا کی کسی سُپر پاور سے بھی نہیں ـــــ پتہ نہیں کس سے ـــــ کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔ یہ کہنے کے لئے شاید اس نے اپنا ہی انتخاب کیا ـــــ وہ جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو "تیل ـــــ انسانی لہو سے زیادہ قیمتی ہے؟ ـــــ کیوں ہے؟" سوال تو اس نے اپنے آپ سے کئے تھے مگر اس نے لمحہ بھر کے لئے نظر اُٹھا کر پہلے نوجوان کو اور پھر مجھے دیکھا۔

"ہاں" نوجوان نے ہی اسے جواب دینا مناسب سمجھا ـــــ "وہ سب کچھ نہ سہی ـــــ مگر بہت کچھ انسان سے قیمتی ہے ـــــ"

"واقعی ـــــ" میرے لب ہلے ـــــ "اگر یہ بات نہ ہوتی تو کوئی نہ کوئی ہمیں لفٹ ضرور دیتا۔"

میرے پاس اسے قائل کرنے کے لئے یہی ایک جواز تھا ـــــ لہٰذا میں نے ہر گاڑی کو روکنے کی کوشش شروع کر دی ـــــ مگر کوئی گاڑی رک نہیں رہی تھی۔ لفٹ لینے کے اشارے کے جواب میں کچھ نے زور سے ہارن بجایا ـــــ بعض نے گھور کر میری طرف کم اور لڑکی کی طرف زیادہ دیکھا ـــــ اور کچھ نے دور سے معاملہ بھانپ کر دو گز پرے سے ہی گاڑی موڑ لی ـــــ حتیٰ کہ آمنہ مینشن کی چھاؤں بھی ہمارے سروں سے ڈھل گئی۔

اب ایک گاڑی آ رکی تھی ـــــ اچانک ـــــ خود بخود ـــــ ہم تینوں کو سوار کر لیا گیا ـــــ پھر وہ بینر بھی اُٹھا کر اندر رکھ لیا گیا جس پر لکھا تھا "اسرائیلی جارحیت اور بربریت کے خلاف عملی اقدامات کئے جائیں" کچھ ادھ جلے اخبار بھی

"یہ اخبار تم نے سڑک پر جلائے تھے؟" لڑکی سے سوال پوچھا گیا تھا

"جی ہاں" نگاہیں اُٹھا کر اس نے سوال کرنے والے کی طرف دیکھا اور بولی "افسوس ـــــ کہ کچھ حصے بچ گئے ـــــ"

بچے حصوں سے خبریں جھانک رہی تھیں۔

"زندہ یا ـــــ مردہ ـــــ گرفتار ـــــ"

"انخلا ..... اخراجات ہم برداشت کریں گے ـــــ"

پھر وہ تصویر تھی ــــ جس کے نیچے لکھا تھا ــــ "یاسر نے ایک پناہ حاصل کرنے والی لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا ہے ــــ "چھاپہ مار .... گوریلے .... فلسطینی ...."

"یہ کونسا اخبار ہے؟" میں جاننا چاہ رہا تھا۔

"یہ ہمارا اخبار ہے" نوجوان بولا۔

"کون سا اڈیشن" میں نے وضاحت چاہی۔

"تل ابیب اڈیشن" لڑکی اطمینان سے بولی۔

"تل ابیب!" گاڑی ایک جھٹکے سے چلی تو زبان میرے دانتوں میں کٹ گئی۔

"یہ بینر تم نے اٹھا رکھا تھا؟" سپاہی نے مجھ سے پوچھا ــــ اور میرے میاں نے سے پہلے مجھ پر گرج کر برس پڑا ــــ، اسے ہاتھ میں رکھو ــــ پکڑو اسے ــــ"

لڑکی نے سپاہی سے پوچھا "تم کہاں کے باسی ہو؟"

وہ کچھ نہ بولا تو اس نے مجھ سے پوچھا "ہم کہاں کے باسی ہیں؟"

"اپنے ملک کا نام کسے یاد نہیں ہوتا" نوجوان مجھے سمجھا رہا تھا ــــ "اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے"۔ مگر لڑکی پھر بول اٹھی "ہم کہاں کے باسی ہیں؟"

تھوڑا صبر کرو ــــ سب کچھ بتائیں گے" ــــ سپاہی نے منہ پھیر کر زرد شیشے میں سے باہر دیکھا۔

باہر سب کچھ زرد تھا ــــ خزاں تھی ــــ پت جھڑ تھی۔ شاخیں ننگی تھیں۔ کوئی نیا سبز پتہ ــــ کوئی کونپل ــــ کچھ نہ تھا ــــ البتہ گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی تھی!

برگد

میرزا ریاض

داخل ہوتے ہی سکھ لینڈ لارڈ نے اسے رکنے کے لئے کہا اور اپنے ساتھ ہی کمرے میں لے گیا، اور تار اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "پرسوں دا آیا ہویا اے ــــ تساں کمرے وچ نئیں سو۔"

"کوئی مندی خبر تے نئیں اے؟" سردار مہندر سنگھ نے فکرمندی سے پوچھا۔

"نہیں ــــ"، اور خموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد کہنے لگا ــــ "میری ماں ــــ مرگئی ......"

"رب دی رب اے"، مہندر سنگھ، سعد شیخ کے خالی خالی چہرے کی طرف دیکھنے لگا، جو نہ رویا تھا اور نہ چلایا تھا ــــ عجیب سا لگا مہندر سنگھ کو ــــ اَن نیچرل سا۔ اس نے سوچا، سگی ماں نہ ہوگی۔

وہ اس مکان میں سات آٹھ ماہ سے رہ رہا تھا، مگر آج تک آپس میں کوئی بات نہ ہوئی تھی۔

"تہاڈے اپنے ماتا ہوری سن؟" سردار مہندر سنگھ نے پوچھ ہی لیا۔ اس کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔

"ہاں ــــ"، سعد نے مختصر سا جواب دیا۔ مہندر سنگھ مطمئن نہ ہو سکا۔

"بیمار ہوں گے؟ اولڈ ایج؟"

"پچپن برس عمر ہوگی ان کی، اور بیماری؟ ــــ"، وہ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا، "دمے کے دورے پڑتے تھے، ASTHMA" سعد نے مہندر سنگھ کو سمجھانے کے لئے انگریزی میں بتایا ــــ مزید وضاحت کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "یہ جسمانی بیماری نہیں ہوتی ......"

"لگدا جیویں تہانوں دکھ نئیں ہویا اپنی ماں جی دے مرن دا" مہندر سنگھ نے بغیر کسی توقف کے اپنی کھدبد کا براہ راست اظہار کر دیا۔ سعد اس اچانک سوال پر چونک گیا، اور پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا جیسے جواب تیار کر رہا ہو ــــ پھر کہنے لگا "شاید اس لئے نہیں ہوا کہ وہ تو پہلے ہی آکسیجن ٹینٹ میں زندگی کے دن گزار رہی تھی، مرنے کے بعد شاید اس کی مسترد روح کو سکون مل گیا ہوگا، دوسرے جہان میں ــــ مگر سردار جی اس کے چلے جانے کے بعد میں ــــ سعد شیخ ــــ اکیلا رہ گیا ہوں۔ ادھورا اور محتاج!"

"تسی گلاں تے سوہنیاں کردے او، پر او کھیاں نیں، میں چٹا ان پڑھ جو ہویا۔ تساں پھلاسفی (فلاسفی) تے نئیں پڑھ دے؟"

"اکنامکس پڑھتا ہوں۔ فلسفہ پڑھنے والے تو ......"

"شودائی بندے نیں ــــ رب تہاڈا بھلا کرے۔" مہندر سنگھ نے بات کاٹ کر کہا "اچھا میں تہاڈے لئی ٹی بناناں آں ــــ"

کچن میں چائے بناتے ہوئے بھی اس نے تفتیش کا سلسلہ ٹوٹنے نہ دیا۔ "شیخ جی۔ ایہہ دسو، تہانوں پیار تو ہووے گا اپنی مدر نال؟"

بغیر کسی توقف کے اس نے جواب دیا "کسے نہیں ہوتا سردار جی، کسے نہیں ہوتا؟ آپ کو نہیں ہے کیا؟"

"میری گل چھڈ دیو ـــــ آپاں تے اپنی ماں نوں ویکھیا ای نئیں، اکھ کھولی تے ماں پرلوک سدھار چکی سی۔ بس فلماں وچ ای ماں دے انوکھے تے سہاونے روپ ویکھے ان۔ سچ نیں کہ جھوٹ۔ رب جانے" مہندر سنگھ نے بے لاگ تبصرہ کر دیا۔

ــــ "جب میں نے آنکھ کھولی تو میری ماں زندہ تھی، اُس گھر میں۔ جہاں زندہ رہنا بہت مشکل تھا۔ جوان ہوا تب بھی اسے زندہ پایا، اُس در و دیوار میں جہاں سانس لینا بھی دشوار تھا پر وہ بڑی سخت جان تھی۔ باشعور ہوا تو حیرت ہوئی کہ وہ کیسے زندہ ہے؟ ایک ایسے گھر میں جہاں اسے کوئی رتبہ نہ مل سکا تھا، حالانکہ وہ پانچ بچوں کی ماں تھی ـــــ مجھے اس پر ترس آنے لگا، پھر ایک وقت آیا کہ وہ بھی مجھ پر ترس کھانے لگی۔ بس یہی ایک رشتہ تھا ہمارے درمیان۔ خود رحمی کا ـــــ ترس کا ـــــ"

"لئو، ہور اک پیالی چاء دی" وہ بیزار سا لگنے لگا تھا۔ سعد کی گفتگو وہ سن تو رہا تھا، مگر سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ایسی عالمانہ گفتگو اس نے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ اس کے علم کے مطابق ماں باپ اور اولاد کے درمیان بس صرف ایک رشتہ ہو سکتا ہے۔ محبت اور پیار کا۔ مہندر سنگھ سوچنے لگا ـــــ دیپو ابھی نہیں آئی:

(۲)

دو برس پہلے سعد نے لندن سکول آف اکنامکس میں داخلہ لیا تھا۔ وہ ایک ہونہار اور ذہین طالب علم تھا۔ اس کا تعلیمی کیریئر نہایت شاندار تھا۔ میٹرک میں اس نے وظیفہ لیا تھا۔ انٹر کے امتحان میں نمایاں نمبر حاصل کئے تھے۔ اس کے باپ شیخ رفیع کی یہ خواہش تھی کہ سعد ڈاکٹر بنے کہ ڈاکٹر کی اس گھر میں کمی تھی۔ شیخ صاحب زندگی میں ہر اعتبار سے خوش بختی کے عروج پر تھے۔ دنیوی جاہ و حشمت کا حصول ان کا موٹو تھا۔ معاشرے میں بڑا نام، اونچا مقام پایا تھا۔ شہرت، عزت، دولت اور عظمت کی ایک نہ بجھنے والی پیاس میں، ایک نہ ختم ہونے والی دوڑ میں ـــــ اس گھرانے کے افراد نے جی جان کی بازی لگا رکھی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب وہ ان کے پیچھے بھاگتے تھے، اور ایک وقت ایسا آیا کہ دولت، اور شہرت ان کا تعاقب کرنے لگیں۔ شیخ رفیع مزدوری کیا کرتے تھے، اور اب وہ ملک کے مشہور صنعتکار تھے، ٹیکسٹائل انڈسٹری کے کنگ کہلاتے تھے۔ ایک اور کارخانے کی بنیادیں رکھ رہے تھے، اور یہ سب انھوں نے ناجائز ذریعوں سے نہیں ـــ اپنی محنت، زور بازو سے کمایا تھا۔ محنت ان کی زندگی کا اصول تھا، اور وہ ایک AMBITIOUS شخص تھے۔ جو کچھ ان کے پاس تھا اور بہت کچھ پاس تھا، اس سے وہ مطمئن نہ تھے۔ کیکڑے کی طرح وہ ہر طرف اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانا چاہتے تھے۔ قوت و اقتدار چاہتے تھے ـ وہ چاہتے تھے کہ ہر کوئی ان کا دست نگر رہے۔ ہر کوئی ان کے سامنے جھولی پھیلائے۔ وہ سب کچھ اپنی مرضی سے چلانا چاہتے تھے ـ گھر میں بھی، اور گھر سے باہر بھی! وہ دنیا کا نظام خود چلانا پسند کرتے تھے۔ کسی سائنس فکشن کے فرعون کی طرح۔ وہ لوگوں کو کٹھ پتلیاں بنا کر ان کے تحرک اور افعال کے تار اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے معاملاتِ زندگی میں وہ بڑے سخت گیر تھے۔ مراعات دیتے اور ان کا حساب لیتے۔ ان کی نگاہوں سے کچھ بھی اوجھل نہ رہتا۔ وہ سخت محتسب تھے۔ خطاؤں کو آسانی سے معاف نہ کرتے اور اپنی مرضی کے خلاف وزنی دلیل کو بھی رد کر دیتے۔ یہ رویہ ان کا گھر سے باہر بھی تھا اور گھر کے اندر بھی۔ وہ ایک باعمل، متحرک اور ان تھک انسان تھے۔ ان کی کامیابیاں بے شمار تھیں۔ اپنے نظریات کی عملی شکل انھوں نے اپنی اولاد میں بھی دیکھ لی تھی۔ ان کا بڑا بیٹا آرمی میں کرنل کے عہدے پر فائز تھا اور دوسرا بیٹا سی ایس پی بن گیا تھا۔ چوتھا بیٹا ہو بہو انہی کی عادات و صفات کا حامل تھا۔ تعلیم سے رغبت نہ تھی، اس لئے کم عمری ہی میں انھوں نے اسے اپنے دست راست کے طور پر اپنے ساتھ کاروبار میں شریک کر لیا تھا۔ وہ اسے زبردست ٹریننگ دے رہے تھے اور وہ ان کے اندازے اور اعتماد پر پورا اُتر رہا تھا۔ وہ اس کی کارکردگی سے بالکل مطمئن تھے بلکہ فخر کرتے تھے۔

تیسرا بیٹا سعد تھا جو بچپن ہی سے بڑی صلاحیتوں، اور ذہانتوں کا مالک تھا۔ شیخ رفیع کو اس کے بارے میں بڑی توقعات تھیں اور ان کے اندازے کبھی غلط نہ ہوتے تھے۔ کاروبار میں بھی اور کارکنوں کے بارے میں بھی۔ اسی لئے وہ سعد کے بارے میں پُریقین تھے کہ وہ ان کے منصوبے کے مطابق ڈاکٹر بنے گا ـــ مگر کبھی کبھار کئی موقعوں پر وہ متفکر نظر آنے لگتے۔ اپنی تمام تر قابلیتوں کے باوصف وہ ایسی حرکتیں کر جاتا جو سعادت مندی کے ایک طے شدہ معیار سے مطابقت نہ رکھتیں۔ سعد ان کے خیالات کی مخالفت اور ان کے فیصلوں کی نفی کر دیتا۔ پہلے پہل تو وہ محض اسے سمجھا دینے پر ہی اکتفا کرتے۔ سوچنا یقیناً ایک قابلِ قدر صفت ہے۔ مگر سوچ اور چیز ہے اور عمل اور ـــ زندگی محض سوچ نہیں حقیقت ہے۔ سوچنے والا شخص اگر کبھی ارسطو اور افلاطون بھی بن جائے تو بھی کامرانیاں حاصل نہیں کر سکتا۔ جب کوئی امیر زادہ یا شہزادہ سوچ کی لق و دق منزلوں پہ جا نکلتا ہے تو جلد یا بدیر پاگل خانے پہنچ جاتا ہے یا پھر جنگلوں کا رخ کرتا ہے۔ سوچ کی انتہا بہرحال دیوانگی ہے۔ وہ نتیجہ خیز منصوبوں کے قائل تھے، بے ثمر سوچوں کے نہیں۔

باپ کے دلائل میں اسے کوئی منطق نظر نہ آتی۔ ایک ہی سب سے بڑی مثال تھی ان کے پاس ـــ اور وہ تھی ان کی کامیاب زندگی ـــ مگر ـــ وہ سوچتا، یہ ظفریابیاں، یہ فتوحات مقدر کی دین بھی تو ہو سکتی ہیں۔ ابھی وہ چھوٹا ہی تھا جب اس نے ایک تعصب پیدا کر لیا تھا اپنے باپ کے بارے میں ـــ یہ بھی کیا کہ ایک شخص سب پر حکم چلائے۔ ان کی ہستیوں، ان کے وجودوں کو مہرے سمجھے ـــ ان کے خیالات، ان کے خوابوں پر پہرے بٹھائے، اپنے اختیارات میں نظر بند کر دے ـــ کسی کو ایسا کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

انہی خیالات کے ساتھ وہ اسی ماحول میں بڑا ہوتا گیا۔ اس کے خیالات سے گھر کا کوئی فرد بھی متفق نہ ہو سکا۔ ماں اسے گستاخ، بھائی احمق، اور باپ فاترالعقل قرار دیتے رہے ـــ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کا ساتھ دے سکے۔ اس نے جب یہ کہا کہ وہ میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں لے گا تو گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ یہ بات وہ اپنی ماں کی مدد سے کہنا چاہتا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اسے انسانی جسموں کی چیر پھاڑ سے نفرت ہے، اور وہ کسی کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، اور یہ کہ اسے روپے پیسے کی ہوس نہیں ہے۔

"پھر کیا بنو گے تم؟" اس کی ماں نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

وہ خوش ہو کر اسے بتانے لگا۔ "استاد بنوں گا۔ بچوں کو پڑھاؤں گا۔ کتابیں لکھوں گا علم و ادب کی۔"

ماں نے اس کی وکالت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس میں اتنی تاب کہاں تھی! وہ اس وقت بے بسی اور خود رحمی کی تصویر بنی کھڑی تھی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ سعد نے اپنی ماں کو ایسی حالت میں دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کبھی آزمائش کا وقت ہی نہیں آیا تھا۔

(۳)

مونا اس کے کمرے میں کبھی کبھی آ جایا کرتی تھی کتابیں لے کر۔ "اری مونا، ہم سے ٹیوشن پڑھنے آ جاتی ہو مفت میں ـــ پیسے تو دیتی نہیں ہو" وہ اسے مذاق میں کہتا۔

مونا، اکلوتی بہن تھی سب کی ـــ سب سے چھوٹی، بڑی معصوم سی، پیاری سی؛ نویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ بھائیوں میں سب سے زیادہ پیار اسے سعد سے تھا اور سعد کو بھی اس سے بہت پیار تھا۔

"جب ڈاکٹر بنوں گی تب پیسے دوں گی" وہ جواب دیتی۔

"نا بابا ـــ اُس وقت تو ہمارا علاج کر دینا مفت ـــ پیسے تم سے نہیں لیں گے۔ تمہارے بڑے بھائی جو ہوئے ـــ چھوٹی بہنوں سے پیسے تو نہیں لیتے ناں بڑے بھائی؟"

"آپ ڈاکٹر کیوں نہیں بنتے سعد بھائی؟ ڈاکٹر بننا بُری بات ہے کیا؟" میمونہ نے پوچھا۔

"تو بات اس تک بھی آپہنچی ہے!—" سعد نے پل بھر غور کیا، پھر کہنے لگا "ایک گھر میں دو ڈاکٹر کیا کریں گے بھلا؟"

"مل کر پریکٹس کریں گے!" میمونہ نے جواب دیا۔

"اچھا بتاؤ— استاد بننا بُری بات ہے کیا؟" سعد نے پوچھا۔

"تھوڑی سی تو تنخواہ ہوتی ہے۔" اس نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا— "اور بس ایسے ہی ہوتے ہیں۔ غریب سے—"

"بچی— کیا تُو جانتی ہے کہ میرے اور تمہارے دادا بھی استاد تھے، اپنے گاؤں کے ایک پرائمری سکول میں—"

"نہیں— یہ جھوٹ ہے—" میمونہ مان نہیں رہی تھی۔

"بالکل جھوٹ نہیں ہے— میں ایک دفعہ اپنے گاؤں گیا تھا۔ تم سے بھی چھوٹا تھا اُس وقت— مجھے یاد ہے— ہمارے دادا کھدر کا سفید تہمد اور کرتہ پہنتے تھے اور سر پر ململ کا سفید صافہ— اور مونا۔ جب وہ سکول میں ہوتے تھے تو روشنی ہوتی تھی ان کے گرد— گھر آتے تو یہ روشنی ان کے ساتھ ہی آجاتی تھی— اور پھر وہ جہاں کہیں بھی جاتے، روشنی ان کے ساتھ ساتھ سفر کرتی تھی۔"

"سچ سعد بھائی؟" میمونہ حیران ہو کر پوچھتی۔

"میں اپنی ننھی منی، چھوٹی سی، پیاری پیاری بہن سے جھوٹ تو نہیں بولوں گا ناں۔"

(۴)

اتنے دنوں سعد اپنے باپ سے چھپتا رہا تھا۔ وہ بھی کچھ زیادہ ہی مصروف رہے تھے اور سعد بھی ان کا سامنا کرنا نہ چاہتا تھا، مگر کب تک؟

کرنل فہد بیوی بچوں سمیت چھٹی گزارنے آگئے۔ وہ ایک خوش وضع اور خوش طبع انسان تھے۔ اپنی زندگی سے مطمئن اور حالاتِ کار سے خوش تھے۔ باپ کے گھر سے کم ہی سروکار رکھتے تھے۔ یہیں آکر پتہ چلا کہ سعد اور ڈیڈی کے درمیان ٹھن گئی ہے— "ایڈیٹ ہے سعدی۔" ان کا پہلا ردِّعمل تھا— پھر مذاق سے کہا "اس کا خیال ہے ڈیڈی کی گدی پر اسے ہونا چاہیئے— میں اسے سمجھاتا ہوں" اس نے ماں کو تسلی دی۔ ویسے کرنل صاحب کا مشورہ یہی تھا کہ سعدی کو ڈیڈی کا سامنا کرنا چاہیئے— یوں چھپتے نہیں رہنا چاہیئے۔

کرنل فہد کی سعدی سے الگ تو ملاقات نہ ہو سکی البتہ کھانے کی میز پر سب افرادِ خانہ اکٹھے ہوئے۔ شیخ صاحب بھرے بیٹھے تھے کسی بھی رسمی بات چیت کے بغیر اسی موضوع پر شروع ہو گئے— "کہتا ہے اسے روپے پیسے کی ہوس نہیں ہے۔ مطلب اس کا یہ تھا کہ اس کے باپ کو روپے پیسے کی ہوس ہے۔ اس قلندر سے پوچھو۔ ایرکنڈیشنڈ محل میں رہتا ہے— چار لاکھ روپے کی گاڑی میں سفر کرتا ہے۔ قیمتی لباس پہنتا ہے۔ شاہانہ زندگی گزارتا ہے— کس لئے؟ کیسے؟ باپ کے پیسے سے— یہ دوغلی کیوں؟"

سب لوگ خاموش رہے— کھانے کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھ رہے تھے۔ "ڈاکٹر بنے گا۔ دولت کمائے گا— اپنے لئے— مجھے اس کے پیسے سے کیا غرض۔ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے— استاد بننے کا بھوت سوار ہے۔ ضرور بنو— بھوک اور افلاس کو ہی اپنا مقدر رہنا ہے تو میں کیسے باز رکھ سکتا ہوں— نیک کام ہوگا— مگر استاد کی نہ معاشرے میں عزت اور نہ اپنے گھر ہی میں—"

"ہمارے دادا بھی تو مدرس تھے۔" مونا بیچ میں بول اُٹھی۔

شیخ جی برانگیختہ ہو کر چلائے "اور میں ہی جانتا ہوں، کتنی تنگدستی میں عمر گزاری ان کے پاس ـــــ دو وقت کا کھانا بھی میسر نہیں آتا تھا۔ ہم چھ بہن بھائیوں کو .... اور یہ ہمارے شیخ سعدی جو درویش ہونے کے دعویدار ہیں۔ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ عجیب سرپھروں کا سا شوق ہے!"

"ڈیڈی۔ سنا ہے دادا کے اردگرد روشنی رہتی تھی۔ جہاں کہیں وہ جاتے تھے روشنی ان کے ....."

"ایسی بے سروپا باتیں اسی عالم فاضل نے تمہیں سنائی ہوں گی ـــــ جس گھر کا مقدر ہی تاریکی تھی۔ وہاں پر روشنی کا گزر کیسے ہو سکتا تھا؟" وہ غصے میں بولے۔

کھانا شروع ہو چکا تھا۔ شیخ صاحب بے تکان بولے جا رہے تھے مگر سب خاموش تھے۔ کرنل، ان کی بیگم، اور ماں ـــــ گویا سانپ سونگھ گیا ہو۔ کرنل اور ان کی بیگم کی ساری دلچسپی مختلف ڈشز میں تھی۔ ماں ـــــ بظاہر تو کھانے کے عمل میں مصروف تھی۔ مگر صاف لگتا تھا کہ نوالہ اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا ـــــ سعد نے اپنے سامنے رکھی ہوئی پلیٹ پر نظریں گاڑ رکھی تھیں۔ وہ اِدھر اُدھر کسی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر بھی اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی ماں سہم کے بیٹھی ہو۔

مونا نے بھائی کی پلیٹ میں پہلے تو پلاؤ ڈال دیا تھا۔ اب شامی کباب بھی رکھ دیئے تھے۔

"جب تک میرے گھر میں رہتے ہو، کان کھول کر سن لو تمہیں اپنی بات کہنے، اپنی مرضی کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔" وہ پھر گرجنے لگے۔ ان کا لہجہ اب طنزیہ اور ناصحانہ نہیں تھا، بلکہ تحکمانہ تھا۔ اور پھر انہوں نے فرمان جاری کر دیا "تم وہی کرو گے جو میں چاہوں گا۔ چون وچرا کی تو گھر سے نکال دیئے جاؤ گے! سرکشی اور خودسری مجھے بالکل پسند نہیں۔"

ماں نے پہلے ایک نظر اپنے چھوٹے بیٹے مسعود کی طرف دیکھا جو بت بنا بیٹھا تھا۔ پھر ملتجیانہ نگاہوں سے کرنل بیٹے کو دیکھا۔ جو کھانے میں مصروف تھا۔ پھر اس نے سعد کی طرف دیکھا جو سہم سا گیا تھا۔ ماں بیٹے کی نظریں ایک لحظے کے لئے چار ہوئیں اور بے بسی و مجبوری کی کہانیاں کہہ گئیں۔

اس وقت اسے اپنی ماں پر پہلے سے بھی زیادہ ترس آیا ـــــ ماں جو اپنے شوہر کی شان میں از بر قصیدے تو کہہ سکتی تھی مگر اپنی اولاد کی حمایت میں ایک فقرہ حق گوئی کا نہیں ادا کر سکتی تھی

باپ جا چکا تھا۔ ماں نے بڑھ کر بے اختیار اسے سینے سے لگانا چاہا مگر سعد نے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ کرنل کی بیگم الگ کھڑی تھی۔ کرنل نے سعد کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے صرف اتنا کہا تھا "ڈیڈی ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔"

پھر قریب ہی سے مونا کی آواز آئی "سعد بھائی ڈاکٹر بننا بری بات ہے کیا؟"

اور سعد اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے ڈائننگ روم سے باہر نکل گیا۔

(۵)

کلاس سے باہر نکلتے ہی وہ ٹیرس کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا ـــــ تھکا ماندہ ـــــ "ہوا آنے دو" لمبا سانس لیتے ہوئے اس نے اطہر سے کہا ـــــ اطہر اس کا اکلوتا دوست تھا۔ ہنس مکھ، حقیقت پسند، زندہ دل، قدرے بے باک اور بے ریا۔

"ہوا کو میں نے روک رکھا ہے؟ تمہاری چمڑی ہی اتنی بے حس ہو چکی ہے کہ آندھی کے فراٹے بھی اسے چھوئے بغیر گزر جاتے ہیں۔" اطہر انگریزی ادب کا طالب علم تھا۔

"ادب کے طالب علم باتیں خوبصورت کر لیتے ہیں۔" سعد نے کہا اور ایک آہ سرد بھری ـــــ اس کی بڑی آرزو تھی، ادب میں

ایم۔اے کرنے کی۔

کیا گپ شپ ہو رہی ہے؟" زرینہ نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

"وہی ــ حبس کی شکایت ــــ بلکہ حبسِ دوام کی دوامی شکایت ......"

"زکام ہو تو خوشبو کہاں آتی ہے۔ حالانکہ موجود ہوتی ہے فضا میں ــــ حضرت سعدی کی حیاتِ نظر بند میں کبھی بہار آئی ہو، پھول کھلے ہوں، پات اُگے ہوں تو انہیں صبا کے چلنے کا احساس بھی ہو ــــ دریچے تو سب بند کر رکھے ہیں ان جناب نے ــــ میر تقی میر کی طرح ــــ" زرینہ غنچہ دہن اور خوش لحن لڑکی تھی۔

"ارے ــــ تم کب سے ایسی شاعرانہ باتیں کرنے لگی ہو؟" سعد نے حیرت سے پوچھا۔

"جب سے تم نے کلاسوں کا بائیکاٹ کر رکھا ہے ــــ تمہارے فراق نے اسے ...... اب کیا کہوں ــ کیا بنا رکھا ہے ــ مس زرینہ شاید مائنڈ کریں۔" اطہر نے کہا۔

"پہلے یہ بتاؤ، اتنے عرصے سے کلاس میں کیوں نہیں آئے۔ میں تو خود آنے والی تھی تمہارے ہوسٹل، تمہیں پوچھنے۔"

"میاں تم اپنی صحت کا بلیٹن ہر روز جاری کیا کرو۔" اطہر نے طنزاً کہا

"یہ بیمار تھے؟ اور بتایا تک نہیں اطہر تم نے۔ اچھے دوست ہو ہمارے!" زرینہ ایک دم پریشان ہوتی چلی گئی۔

"کوئی بیماری ہوتی تو عرض کرتا ــــ وہی ماندگی کا رونا، تھکن کی زاری ــــ"

"اور اب اضافہ ہو گیا ہے ــــ" سعد نے گرہ لگائی ــــ "پڑھائی سے بیزاری۔"

"یہ تو کوئی نیا انکشاف نہیں ــ آپ کی انفرمیشن کے لئے عرض ہے محترمہ کہ بزرگوارم ففتھ ایئر میں تھے جب میں تھرڈ ایئر میں داخل ہوا۔ اب میں سکستھ ایئر کا امتحان دینے والا ہوں اور آپ ففتھ ایئر میں پوری استقامت کے ساتھ وفاداری نبھا رہے ہیں۔ اگر حال یہی رہا تو امید ہے میرے بیٹے کے ساتھ ایم۔اے کر لیں گے۔" اطہر بے دھڑک بول رہا تھا۔

"تم مجھے ایک خاتون کے سامنے بے عزت کر رہے ہو" سعد نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے تم زندگی برق رفتاری سے گزار رہے ہو کہ تمہیں کچھ بننا ہے۔ میری زندگی کا ٹیمپو بہت SLOW ہے، میں اسے انجوائے کر رہا ہوں ــــ اس لئے کہ مجھے کچھ بننا نہیں ہے"

"واہ واہ، کیا تقریرِ دلپذیر ہے؟" زرینہ نے داد دیتے ہوئے کہا۔ "چلو اس خوشی میں آپ حضرات کو چائے پلواتی ہوں۔"

"میں ایک خاتون سے چائے نہیں پیوں گا ــــ یہ میری انا کی توہین ہو گی۔"

"تو بل تم ادا کر دینا ــــ یہ میری انا کی تسکین ہو گی۔" زرینہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اُبے اف ــــ امیر کبیر زادے ــــ تم ہی اس جھگڑے کو نبٹاؤ ــــ گولڈن سائیلنس کیوں اختیار کر رکھی ہے؟" اطہر نے اسے اکسانے کی کوشش کی

"میں تو تھکا ہوا ہوں ــ یارو مجھے تو معاف کرو ــ کمرے میں جا کر آرام کروں گا، کنجِ عافیت میں۔"

"تیشہ چلاتے رہے ہو کلاس میں؟ پہاڑ کاٹتے رہے ہو؟" اطہر نے طنزیہ کہا۔

"اطہر فرہاد کو رسوا نہ کر ــــ وہ مریضِ عشق تھا، تھکنا نہ جانتا تھا۔"

"بہرحال ــــ مسٹر مائنڈر، ہم تمہیں آج SPARE نہیں کریں گے۔ تم ہمارے ساتھ چلو گے ــــ چائے کا آرڈر دو گے ــــ

اور بل ادا کرو گے ــــ یہ دو افراد پر مشتمل پوری قوم کا متفقہ فیصلہ ہے" ـــ اطہر نے دو ٹوک اعلان کر دیا اور اسے دھکیلنے لگا۔

"میری بات تو سنو" اس نے اپنے آپ کو ان کے پنجہ استبداد سے چھڑاتے ہوئے کہا "ایک شرط ہے ــــ ایک تو کھلی ہوا میں بیٹھیں گے!"

"منظور" دونوں نے جواب دیا۔

"اور دوسرے میرے گھر کے موضوع پر کوئی بات نہ ہو گی"

"تمہارا گھر ہے کونسا؟ وہ تو تمہارے ابا حضور کا ہے، بہر حال یہ بھی منظور رہے" اور تینوں ہنستے کھیلتے کینٹن کی طرف چل دیئے۔

لاہور کے اس بڑے کالج میں داخل ہوئے اسے اب تین سال سے زیادہ ہو گئے تھے، اور اس نے ابھی تک سال پنجم کا امتحان نہیں دیا تھا، اپنے شہر میں بی۔اے کرنے کے بعد وہ یہیں داخل ہونے پر بضد ہوا تھا۔ اس کے باپ نے اس کی یہ ضد بھی پوری کر دی تھی بلکہ ایک حد تک وہ سعد کے معاملات سے بے تعلق ہو گیا تھا اور اپنی جگہ اپنے سی ایس پی بیٹے عادل شیخ کو سب اختیارات دے دیئے تھے، اس کا شیخ رفیع کو بڑا قلق تھا اور وہ اب بھی عادل سے مل کر اسے ایک کار آمد شخص بنانے کے بارے میں فکر مند رہتا تھا۔ سعد باپ کے حکم اور نافرمانی کے نتیجہ میں سزا کے خوف سے ڈر کر میڈیکل کالج میں داخل تو ہو گیا تھا ــــ مگر چار سال تک فرسٹ پروفیشنل بھی کلیر نہ کر سکا تھا۔ ظاہر ہے اس کی وجہ علمی اور ذہنی کم مائگی نہ تھی، نہ ہی سعد کی ضد تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی تھی کہ زندگی کے بڑے پروگراموں سے لے کر منہ میں نوالہ ڈالنے تک کے لئے آخر اسے اجازت کی ضرورت کیوں ہو؟

شیخ صاحب نے جب اس کی تعلیم پر اخراجات کا حساب کیا تو انھیں INVESTMENT کا کھاتہ بھاری نظر آیا۔ اگر سعد ڈاکٹر بن بھی جاتا تو RETURN کا کھاتہ متوازن نہ رہتا۔ اس عیاشی کے وہ متحمل نہ تھے۔ بہر حال سب سے بڑا دکھ ان کے لئے یہ تھا کہ ان کا ایک 'پروجیکٹ' ناکام ہو رہا تھا۔ اس سارے خلفشار میں ایک اطمینان شیخ صاحب کو نصیب ہو گیا اور وہ یہ کہ شیخ صاحب، عادل شیخ اور سعد شیخ کے درمیان یہ معاہدہ طے پا گیا تھا کہ اگر سعد کی اپنی مرضی کے مطابق تعلیم جاری رکھنے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کی گئی تو وہ انھیں مایوس نہیں کرے گا۔

سعد نے بڑے مضبوط ارادوں سے داخلہ لیا تھا مگر تھوڑے ہی عرصے بعد اسے محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں کہیں دم توڑ دے گا ــــ پڑھائی سے اس کا دل اچاٹ رہنے لگا۔ نہ فہم اس کا ساتھ دے رہا تھا اور نہ یکسوئی رہی تھی۔ کتاب کے صفحات پر لکھے ہوئے الفاظ اسے ٹیڑھے میڑھے نظر آتے ــــ معانی و مفہوم تک پہنچنا اس کے لئے مشکل ہو گیا تھا اس کے سامنے کئی رکاوٹیں کھڑی ہو جاتیں ــــ اندر سے نکل نکل کر ــــ ایک تو عمر کے جس حصے میں داخل ہوا تھا، اس عمر میں طالب علم ایم۔اے کر کے زندگی میں کہیں SETTLE ہو رہے ہوتے ہیں۔ اگرچہ اسے SETTLE ہونے کی جلدی نہ تھی پھر بھی چار برس کے زیاں کا اسے افسوس تھا۔ اور پھر اس مریضانہ احساس سے وہ اپنا پیچھا نہ چھڑا سکا تھا کہ اس کی حیثیت اب بھی شطرنج کے مہرے کی ہی ہے ــــ میڈیکل تو اس نے چھوڑ دیا تھا مگر ایک پروگرام کے مطابق اکنامکس میں ایم۔اے کر رہا تھا جس کے بعد اسے لندن جانا تھا۔ اسی شعبے میں تعلیم مکمل کرنے، تاکہ واپس آ کر

باپ کے ماتحت اس کے کاروباری مددگار کی حیثیت سے کام کر سکے۔

سعد بظاہر ایک خوشگوار انسان تھا۔ وہ تنہائی پسند تھا اور نہ خود پسند، وہ الگ تھلگ رہتا تھا۔ ساری زندگی الگ تھلگ رہا تھا۔ یہ اس کی طبیعت کا حصہ نہ تھی، مجبوری تھی جس نے ایک خود ساختہ بیماری کی صورت اختیار کر لی تھی۔ یوں وہ ایک پختہ ذہن رکھنے والا شخص تھا، گھر میں بھی اور گھر سے باہر بھی ـــــ وہ ایک SECLUDED انسان تھا ـــــ رشتوں کی اہمیت اور افادیت کو وہ پورے طور پر جانتا تھا، مگر ان کی لذتوں اور خوشیوں سے محروم تھا۔ زرینہ اور اطہر بڑی کوششوں کے باوجود ـــــ اس کے اس "خود ساختہ عفریت" کو قلب و ذہن سے نہ نکال سکے۔ ان کا خیال تھا کہ اس نے اپنی شخصیت کو سحر انگیز بنانے کے لئے ایک "رومانٹک ٹریجڈی" اپنے اردگرد تخلیق کر رکھی تھی۔ دوسروں کی ہمدردی، توجہ اور محبت حاصل کرنے کے لئے۔

مگر ایک دن اطہر جان گیا کہ ٹیڑھا پن محض سعد ہی کی شخصیت میں نہیں ہے۔ ہوسٹل میں سعد کے بے ترتیب اور بے ربط کمرے میں، جسے وہ کباڑ خانہ کہا کرتا تھا، اطہر اسے بتا رہا تھا کہ زرینہ اس کے بارے میں SERIOUS ہو گئی ہے۔ اس کے جذبات اس کی سوچیں ـــــ اس کے خواب!

"زرینہ اچھی لڑکی ہے۔" سعد اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا ـــــ "اور اچھی لڑکیاں معصوم لڑکیاں ہوتی ہیں۔ وہ خوش شکل ضرور ہے مگر کم عقل بھی ہے۔ ایسی لڑکیاں اپنے ہی خوابوں کے طلسم اور خود ساختہ امیدوں کے فریب کھانے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتی ہیں ـــــ جہاں تک میرا تعلق ہے مائی ڈیر اطہر ـــــ میں نارمل شخص نہیں ہوں ـــــ میرے کرنل بھائی کے بقول ـــــ جو کہا کرتے ہیں "HE IS A SICK MAN" اور وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ سو جناب زرینہ کو بتانا تمہارا فرض ہے۔ اس سے پہلے کہ کہیں وہ اتنی دور نہ نکل جائے ـــــ جہاں سے واپس آنا ممکن نہ رہے ـــــ کہ میں تو ایک اندھا کنواں ہوں کسی کی پیاس کیا بجھاؤں گا۔ مجھے تو نہ رفاقت کی ضرورت ہے اور نہ محبت کی ـــــ محبت کے سوتوں سے میں کبھی سیراب ہی نہ ہوا ـــــ مجھ تک کبھی پہنچ ہی نہ سکی ان چشموں کی پھوار ـــــ .... ان کی ٹھنڈک ......"

وہ اپنی بات جاری نہ رکھ سکا ـــــ دروازے پر دستک کے ساتھ ہی اس کے بڑے بھائی کمرے میں داخل ہو گئے ـــــ اطہر نے انہیں پہچان لیا۔ وہ اس کے ضلع کے ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے ـــــ کمرے میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے انھوں نے کہا "یہ ہمارا نام روشن کر رہے ہو۔ معلوم ہوتا ہے جیسے فقیروں کی اولاد ہو۔" وہ تو گویا بپھرے ہوئے تھے۔

"سنا ہے تم اس سال بھی امتحان دینے کا ارادہ نہیں رکھتے ہو؟"

سعد نے کوئی جواب نہ دیا۔

"تم ایک ناکام انسان ہو ـــــ ہمارے خاندان کی پیشانی پر ایک سیاہ داغ۔"

اطہر باہر نکل جانے کے لئے راہ تلاش کر رہا تھا، مگر اسے لگ رہا تھا جیسے اس میں اتنی قوت نہیں۔

لوٹوں کا پلندہ اس کی طرف پھینکتے ہوئے انھوں نے پھر اپنے مخصوص افسرانہ لہجے میں کہا "ڈیڈی سخت ناراض ہیں، اور میں ان سے شرمندہ! وہ تمہارے فیصلے کے انتظار میں ہیں۔ وہ تمہیں اپنی جائداد سے عاق بھی کر سکتے ہیں! تمہاری جگہ میں ہوتا تو بھکاریوں جیسی زندگی پر، جو تم گزار رہے ہو، موت کو ترجیح دیتا ـــــ خودکشی کر لیتا۔"

یہ سن کر اطہر کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ـــــ مگر سعد چارپائی پر بے حس و حرکت پڑا رہا ـــــ جاتے ہوئے وہ فرمانے لگے۔ "پندرہ نومبر کو مونا کی شادی کر رہے ہیں۔ شریک ہونا چاہو تو آ جانا اور وہیں ڈیڈی کو اپنے ارادوں کے بارے میں بتا دینا۔"

اطہر نے محسوس کیا جیسے اس کا یار اس ملاقات کے بعد آدھا رہ گیا ہو، جیسے گرم توے پر روٹی سکڑ کے آدھی رہ جاتی ہے۔ لحظہ بھر کے لئے تو یوں لگا جیسے سعد کے جسم کا سارا خون نچڑ گیا ہو۔

اطہر کے چہرے پر جو سوال تھا اس کا جواب دیتے ہوئے سعد نے کہا "ایسی ذلت آمیز گفتگو کا انہیں پورا حق پہنچتا ہے ——— حیران کیوں ہوتے ہو ——؟ یہ گفتگو بڑے بھائی کی چھوٹے بھائی سے نہیں تھی۔ ایک بہت بڑے افسر کی ایک بہت چھوٹے ماتحت سے تھی ——— جو اُن کے خزانے سے ہر ماہ تنخواہ پاتا ہے ———"

"مگر دوست ——— کچھ تو تقاضے ہوتے ہیں اخلاقیات کے ——— ادب آداب ہوتے ہیں زندگی کے، گفتگو کے۔ وہ تو جیسے لٹھ مارنے آئے تھے ——— تمہاری جگہ میں ہوتا تو خدا کی قسم سر پھاڑ دیتا......" اطہر غصے میں بھرا ہوا تھا۔

"میں تو ایسے سلوک کا عادی ہو چکا ہوں ——— مگر کیا کروں؟ کوئی راستہ بھی تو دکھائی نہیں دیتا ———"

"راستہ؟ کیوں دکھائی نہیں دیتا؟ تم ان کی جائز اولاد ہو ——— اس گھر کے فرزند ہو۔ وہاں کی ہر شے پر تمہارا پورا حق ہے...... صرف جرأت کی ضرورت ہے۔ اگر جرأت سے محروم رہے تو مٹ جاؤ گے ———"

"مٹ ہی تو رہا ہوں میرے دوست ——— اپنی باری کا انتظار کر رہا ہوں ——— ابھی تو میری ماں تختۂ دار پہ کھڑی ہے"

"چھوڑو یار ——— تم بات بات پر مکالمے بولنے لگتے ہو۔ میں تم سے خوش نہیں ہوں ———" اطہر واقعی ناراض تھا ——— اپنے دوست کی تذلیل پر اسے سخت دکھ ہوا تھا ——— جس ذہنی اذیت اور روحانی کرب سے سعد اب تک گزرتا رہا تھا، اس عذاب کی حقیقت کا آج اُسے پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا۔

(۶)

مونا کی شادی ہو رہی تھی۔ اس محبوس گھر میں مونا ہوا کا ایک جھونکا تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ سعدی اور ڈیڈی کے درمیان منافرت اور اجنبیت کی کیا نفسیاتی جنگ چھڑی ہوئی ہے ——— مگر وہ ہمیشہ بھائی کا ساتھ دیتی تھی۔ سعدی جب کبھی پریشان ہوتا، جب کوئی بوجھ اس کے دل پر ہوتا ——— وہ بھاگ کر مونا کے پاس آ جاتا اور قرار پاتا۔ امان ملتی اسے ——— امان جو اسے اپنی ماں کے پاس بھی نہ ملتی تھی۔

اسی لئے ——— چند دن پہلے بڑے بھائی کے ہاتھوں سعد شیخ نے جو ذلت اُٹھائی تھی تو اطہر نے جاننا چاہا تھا کہ کیا وہ شادی میں شریک ہو گا؟ ——— اور سعد نے جواب دیا تھا کہ اتنی بڑی خوشی سے وہ اپنے آپ کو محروم نہیں رکھ سکتا۔

باہر شادی کا بڑا زبردست ہنگامہ تھا اور اپنے کمرے میں میمونہ اپنے سب سے پیارے بھائی کے سینے سے لپٹ کر آنسو بہا رہی تھی ——— سعد کے ہاتھ میں ایک معمر اور بدہیئت آدمی کی تصویر تھی، جس کے ساتھ مونا کی شادی کر رہے تھے۔ یہ شخص ڈیڈی کے تیسرے کارخانے میں ان کا شراکت دار تھا۔

"تم نے امی سے بات کی؟" اس نے پوچھا۔

"کی تھی ———" اس نے جواب دیا ——— "مگر کیا کر سکتی ہیں وہ۔ کبھی کچھ کر سکی ہیں اپنی مرضی سے؟ ڈیڈی کی مرضی کے خلاف ———؟ وہ تو ایک "مسمرائزڈ کردار" ہیں۔ ایک 'معمول' کی حیثیت ہے ان کی۔ عامل کی آواز کی گونج!"

"اور بھائی ———؟"

"کون پر مار سکتا ہے ڈیڈی کے سامنے؟ کوئی بھی عاق نہیں ہونا چاہتا!" روتے ہوئے مونا کہہ رہی تھی۔

"سچ کہتی ہو — مونا — تم اس گھر میں جبر کا تیسرا نشانہ ہو۔ ماں — میں اور اب تم۔"

"کچھ بھی نہیں کر سکتے ہم، اتنی طاقت کہاں سے لائیں — ؟ ہم جو ناتواں ہیں، کمزور ہیں، تم بھی سرنگوں ہو جاؤ وقت کے فرعون کے سامنے!"

"مگر بھیا مجھے تو ڈاکٹر بننا تھا —"

"ہونہہ۔ ڈاکٹر — ؟" سعد نے کہا — اس کے چہرے پر ایک عجیب ملا جلا سا تاثر تھا غم کا اور غصے اور نفرت کا۔

گھر میں ڈھولک بج رہی تھی۔ شہنائیاں چیخ رہی تھیں۔ سب لوگ خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے — اور کمرے کے اندر بہن بھائی ایک شدید غم سے ہمکنار تھے۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی، رسومات کے ہنگامے میں کسی کو سعدی کا خیال تک نہ آیا — کسی نے اس کی کمی اور ضرورت تک محسوس نہ کی تھی — البتہ رخصتی کے وقت مونا کی پرنم آنکھیں ہجوم میں اپنے بھائی کو تلاش کرتی رہیں — جو ہوسٹل میں اپنے کباڑ خانے میں نیم جاں پڑا تھا۔

(۷)

لندن سکول آف اکنامکس میں داخلہ تو اس نے لے لیا تھا مگر پڑھائی کے معاملے میں اس کا رویہ نہ بدلا تھا۔ کئی کئی دن سکول نہ جاتا۔ بس گھومتا رہتا — لائبریریوں میں پرانے مسودات کی کھوج میں رہتا، عجائب گھروں میں زیادہ وقت گزارتا، آثار قدیمہ، نوادرات کی تلاش اور مٹی ہوئی تہذیبوں کے مطالعے میں مگن رہتا پر کہیں سکون نہ ملتا۔

تار آئے ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔ اس کا دروازہ بند تھا اور آج اسے سردار مہندر سنگھ نے پکڑ ہی لیا تھا — ان کی یہ پہلی ملاقات بھی جو طویل ہو گئی تھی — سعد کو بہت عرصے بعد کوئی ہمدرد ملا تھا، اور مہندر سنگھ ثواب سمجھ کر اس کی دلجوئی کر رہا تھا۔ دونوں جانتے تھے کہ یہ ایک عارضی سی ملاقات ہے، ایک ہنگامی جذبے کے باعث وہ ایک دوسرے کے قریب آئے ہیں۔ اور دیپو اور اس کی بھابھو کے آ جانے کے بعد وہ پھر سے بہت دور چلے جائیں گے۔

"اپنے فادر نال تہاڈا ڈفرنس میری عقل مت وچ تاں نئیں آوندا" گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے سردار جی نے کہا۔

"ڈفرنس نہیں — پروٹسیٹ — میں انھیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ میری اپنی بھی کوئی ہستی ہے — میں گائے بھینس نہیں کہ جدھر چاہا دھکیل دیا جاؤں نکیل ڈال دی جائے مجھے۔"

یہ سارا قصہ ہی سردار جی کی سمجھ سے باہر تھا۔ اپنی زندگی سے موازنہ کیا تو لگا جیسے ان کی زندگی کی کہانی تو بہت ہی سپاٹ، بہت ہی سادہ ہے۔ امرتسر میں جنم لیا۔ آنکھ کھولی اس دنیا تو ماں نہ تھی۔ ایک زمینی جھگڑے میں باپ قتل ہو گیا۔ عمر ابھی پچیس برس بھی نہ ہوئی تھی، تو ولایت چلا آیا۔ پھر ایک دفعہ واپس گیا، شادی کرنے کے لئے — بلونت کور اس کے بچپن کی منگ تھی — آٹھ جماعتیں پڑھی تھی — ابجے کے رشتے دار تھے ان کے — دور کے رشتے دار! پھر کئی سالوں بعد دیپو ہوئی۔ آل گیٹ ایسٹ کا یہ مکان اس کا اپنا ہے، اس کی بیوی بڑی وفا شعار ہے۔ بس — اتنی سی — کہانی نہ کوئی جھگڑا نہ بکھیڑا —

گھنٹی ہوئی تو وہ اچھل پڑا — "لو، اپنی دیپو آ گئی جے" اور دروازے کی طرف بڑھا — سعد نے محسوس کیا تھا کہ سردار جی نے اپنی ہر دوسری بات میں کلدیپ کور کا ذکر کیا تھا۔ کسی نہ کسی حوالے۔ کسی نہ کسی بہانے!

"ایہہ ساڈے ٹینٹ (TENENT) نیں —" سردار جی نے تعارف کراتے ہوئے کہا — اور بیوی اور بیٹی کے چہروں کا استفا

دیکھتے ہوئے مزید کہا "اینہداں ٹیلیگرام سی — اینہاں دے مدر — مر گئے نیں"۔

بلونت کور ایک فوری جذبے کے تحت بے اختیار ہو کر اس کی طرف بڑھی اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"ماواں تے ٹھنڈیاں چھاواں ہوندیاں نیں"۔ اس نے کہا۔

وہ ایک ادھیڑ عمر، دراز قد، بھاری بھرکم عورت تھی۔ اس کے سینے سے لگ کر اسے واقعی یوں لگا جیسے کسی برگد کے درخت کے سائے میں محفوظ و مامون بیٹھا ہو — اسے اپنے اندر ایک قوت کا احساس ہوا — قوت جو امن و سلامتی سے جنم لیتی ہے — بالکل لاشعوری طور پر کلدیپ کور بھی ان کے قریب کھسک آتی تھی۔

"لکھاں پتی جیو دا پتر ہے — محل محلے چھڈ کے آیا اے"۔ مہندر سنگھ اس کی دولت سے خاصا مرعوب تھا۔

"ہاتھوں کی میل ہوتی ہے سردار جی — دولت —"، سعد نے کہا۔

اپنے سینے سے سعد کو الگ کرتے ہوئے بلونت کور نے سردار جی سے کہا "اپنا بلبیر جیوندا ہوندا تے ایڈا ای جوان ہوندا — سوہنا تے نویکھرا!"

سردار جی نے اسے بتایا کہ بلبیر ان کا بیٹا تھا۔ گیارہ بارہ سال کا ہوگا۔ سکول جا رہا تھا کہ راستے میں بس سے ٹکرا گیا۔

"دکھ ہوا سن کر —"، سعد نے کہا — "بہت افسوس ہوا"۔

"او، چلو جی، ہن رب نال آڈہ کون لا دے"۔ مہندر سنگھ نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"تہاڈے ماتا جی دی عمر کیہہ ہووے گی؟" کلدیپ نے بڑے تجسس سے پوچھا

جتنی تمہاری ماتا جی کی ہے —"

"بیمار سن؟ کیہہ بیماری سی؟" کلدیپ نے بڑے تجسس سے پوچھا۔

"او — نیک بختو، میں تاں ساری تفتیش کر چکا آں — تسی فیر او ہنوں —"

"ہائے، ہائے، پوچھن تاں دیو —"، بلونت کور نے کہا۔

"دمہ تھا انہیں — ASTHMA"

"ایہہ تاں کوئی کھاس بیماری نئیں ہوندی —"، بلونت کور نے ایک ماہر ڈاکٹر کی طرح کہا۔

"ہاں — مہلک بیماری نہیں ہے یہ — مگر تکلیف دہ ضرور ہے۔ سانس رک رک کر آتا ہے — بعض دفعہ تو سانس، گھنٹوں، پہروں اور دنوں تک رکا رہتا ہے، اور کبھی اکھڑ اکھڑ جاتا ہے — لگتا ہے جیسے آخری سانس لے رہا ہو مریض — مگر وہ زندہ رہتا ہے بچ نکلتا ہے اس جان لیوا دورے سے — مگر پتہ نہیں چلتا کہ وہ زندہ ہے یا مردہ — مردہ ہے یا زندہ! مرتا نہیں پر زندہ بھی نہیں ہوتا۔ اور زندگی بھر مسلسل موت کے کربناک عمل سے آہستہ آہستہ گزرتا رہتا ہے — دم گھٹنے کا عمل بڑا اذیت ناک ہوتا ہے، سردارنی جی! — میرے باپ کے پاس کئی طریقے تھے، مارنے کے! کسی کو وہ SLOW POISINING سے مارتا تھا اور کسی کو ایک ہی جھٹکے سے"۔

"ایک ہی جھٹکے سے؟" سردار جی، بہت محظوظ ہوئے۔

"تہاڈے ہور دی بہن بھرا ہے نیں؟" دیپو نے سوال کیا۔

سعد کو مونا کا خیال آیا — جانے کس حال میں ہوگی؟ اس نے سوچا۔

"تم پڑھنے جاتی ہو؟" اس نے دیپو کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"مینوں تے داخل ای نئیں کرایا بھابو نیں۔"

"اسی تے بلیریت دی موت تو ڈر ای گئے آں" مہندر نے جواب دیا۔

بلونت کور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے — "میں تہاڈے لئے بھوجن تیار کر دی آں۔" آنسوؤں کو چھپاتے ہوئے وہ کچن میں چلی گئی۔

"جانتی ہو — تمہارے نام کا مطلب ہماری زبان میں کیا ہے؟" — پھر خود ہی بتانے لگا — "چراغ — روشنی —"

اچانک اسے اپنے دادا کا خیال آیا اور وہ سوگوار ہو گیا، یہ سوچ کر کہ وہ ان کا مشن جاری رکھنے میں ناکام ہو گیا تھا۔

کلدیپ کور سے مخاطب ہو کر بالکل لاشعوری طور پر وہ کہنے لگا "علم ایک خزانہ ہے جو کبھی کم نہیں ہوتا — ایک ایسا چراغ ہے جس کی لو کبھی مدھم نہیں ہوتی — ایک نور ہے جو زندگی کے اندھیروں میں راستہ دکھاتا ہے۔"

کلدیپ کور اس کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی!

گرم گرم چائے کی چوتھی پیالی ختم کرتے ہوئے، مہندر اچانک بول اٹھا۔ "عزت تے پتر جی ایتھے وی نئیں — پیسہ ضرور اے — پر سنیا نئیں جے، پردیس دے دکھ ڈاڈھے، سیانے کہندے نیں۔ اپنے دیس دی گل ای کجھ ہور ہوندی اے — اپنے بھناں بھراواں دی گل ای کجھ ہور ای ہوندی اے — رب دا ناں لے کے دسو، تہانوں ایتھے کیہ سکھ ملیا؟"

"بڑا سکھ ملا — یہاں سانس تو لے سکتا ہوں میں — میرے باپ کے گھر میں زندہ رہنے والی ہر نعمت فراواں ہے — صرف ایک چیز کی کمی ہے — آکسیجن کی! کوٹھی کے بیس ایئر کنڈیشنڈ فرنشڈ کمرے — کال کوٹھریوں سے کم نہیں ہیں" سعد نے کہا۔

مگر سردار مہندر سنگھ اپنا ہی راگ الاپ رہا تھا۔ "میں تے اجے وی آکھاں گا کہ واپس مڑ جاؤ — وطناں نوں!"

بڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد سعد نے دیپو کی طرف دیکھا — اور جیسے اس کا رکا ہوا تنفس جاری ہو گیا — "جے میں چلا گیا سردار جی — تے میری نکی جئی بھنا چراغ بی بی نوں فیر پڑھائے گا کون؟" سعد نے ٹھیٹھ پنجابی زبان میں کہا۔

سردار جی تھوڑی دیر تک خاموش رہے، پھر کندھے جھٹک کر کہنے لگے "گل تے ایہہ وی سوہنی اے۔" اور پھر آواز کی پوری قوت سے پکارے — "سردارنی کھانا تیار ہو گیا ہے؟"

شہرِ کوفے کا محض ایک آدمی

اسد محمد خاں

ایک ایسے آدمی کا تصور کیجیے جس نے کوفے سے امامؑ کو خط لکھا ہو کہ میرے ماں باپ فدا ہوں، آپ دارالحکومت میں ورود فرمائیے حق کا ساتھ دینے والے آپ کے ساتھ ہیں۔ اور وہ آدمی اپنے وجود کی پوری سچائی کے ساتھ اس بات پر ایمان بھی رکھتا ہو، مگر خط لکھنے کے بعد گھر جاکر سو گیا ہو۔

جیم الف ایسا ہی ایک آدمی ہے (بلکہ شاید یہ وہی آدمی ہے) جسے مسلم بن عقیل کے واقعے کی خبر ملی تو اس نے زانو پیٹ لیے، گریباں چاک کیا۔ بہت دیر تک روتا رہا —— پھر اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور سو گیا

اُدھر گواہی دینے والے آسمان حشم بچوں نے نہرِ فرات کے کنارے خیمے گاڑے اور صبر کی تاریخ شروع ہوئی۔

جب دس ہزار دینار زادوں نے امامؑ کے مقابل صف بندی کی تو یہ آدمی زیتون کے روغن میں اپنی روٹی چور چور کر کھا رہا تھا۔ پاس ہی دودھ بھرے پیالے میں حلب کے خرمے پڑے بھیگتے تھے اور شیشے کے ایک ظرف میں کوئی عرق تھا اور یہ ظرف یخ سے زیادہ سرد ہو رہا تھا۔

خبر ملی کہ اشرار آمادۂ فساد ہیں تو اس آدمی نے روغن میں سنے ہوئے دونوں ہاتھ طمانیت کے ساتھ اپنے چہرے پر مَلے اور کہنے لگا: "امامؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق غالب آنے والا ہے" پھر اس نے ڈکار لی، امامؑ کو یاد کیا اور اُن کے لیے اور اُن کی حمایت کے لیے اللہ کی نصرت طلب کی اور دسترخوان کے برابر پڑے تکیے سے ٹیک لگالی، پھر وہیں کروٹ لے کر سو گیا۔

جب خبر آئی کہ بچوں پر پانی بند کر دیا گیا ہے تو روتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ کی ایک ضرب سے عرق کے ظروف اوندھا دیئے اور پکار کر کہنے لگا کہ وائے افسوس! سگِ دنیا ابنِ زیاد نے اور اُس کے زر خرید کتوں نے اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ اس بار وہ بہت دیر تک رویا اور کرب و انتشار میں جاگتا رہا کہیں صبح ہوتے ہوتے اسے نیند آئی۔

پھر پتا چلا کہ ایک پاکیزہ خصلت جوان بچوں اور بیماروں کے لیے بھرا ہوا مشکیزہ لاتا تھا کہ بدخصالوں کے ہاتھوں شہید ہوا، یہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب کے اس نے ایک پہر نالہ و شیون کیا اور سینہ زنی کی اور اب کے بھوک اور پیاس اور نیند اس سے رخصت ہو گئے۔

اور یہ سوچتا رہا کہ کچھ کرے، اس لیے کہ ان صادقوں کے لیے اس کا دل خون روتا تھا۔

سو اس نے کچھ اور نہ کیا بس گڑگڑا کر دعا کی کہ بارالٰہا! تیرے محبوبؐ کی آل اپنے گھروں سے نکلی ہے اور تو جانتا ہے کہ یہ لوگ حق پر ہیں اور تو ہی ان کا حامی و ناصر ہے —— پھر کیوں کہ اس تمام کاوش سے یہ کسلمند ہو گیا تھا اس لیے روتے روتے اس نے کچھ دیر کو آرام کیا اور دیوار سے ٹکے ٹکے سو گیا۔

پھر کسی نے پکار کر کہا کہ سگِ دنیا شمر ذوالجوشن نے کسی بھیانک جرم کے ارادے سے امامؑ کی طرف گھوڑا بڑھا دیا ہے۔ تب اور

تب ہی یہ چیخ مار کر اٹھا ـــــ یہ بالآخر اٹھا اور اس نے عجیب کام کیا کہ اپنے چھپر کو سہارنے والی تھونی جھٹکے سے اکھاڑلی اُسے گرز کی مانند گردش دیتا ہوا نہر فرات کی طرف بڑھا اور حق تو یہ ہے کہ لمحے بھر کو اس نے یہ نہ سوچا کہ اس چھپر کے نیچے اس کی عورت اور اس کے بچے بیٹھے ہیں۔

بلاشبہ امامؑ کے لیے اس کی محبت حد درجے کی تھی۔

یہ چھپر کی تھونی اٹھائے دوڑا جاتا تھا اور شریروں، بدخصالوں، قاتلوں کے لیے اس کے پاس کلمات نا ملائم تھے اور کبھی کبھی یہ فحش کلامی بھی کرتا تھا اس لیے کہ سخت آزردہ تھا اور لگتا تھا کہ اُن ہزاروں سگانِ دنیا کو، کہ جو بیچوں، گواہی دینے والوں کو قتل کرنے آئے تھے، یہ اپنی مغلظات سے پارہ پارہ کر دے گا۔ اس کی فحش کلامی کچھ عرصے تک جاری رہی پھر بند ہو گئی کس لیے کہ آگے مقامِ ادب تھا۔ آگے وہ مطہر سماعتیں تھیں جنھوں نے مقدس رسولؐ کو کلام فرماتے سنا تھا۔

تو بس ایک لمحے میں اس کی وابستگی اور اس کے باطن کی سچائی نے ظہور کیا اور اس ایک لمحے میں کہ شمرِ نجس کا وار امامؑ پر ہوتا اور انسانی تاریخ کا سب سے بھیانک جرم سرزد ہو جاتا، اس ایک لمحے میں یہ شخص امام اور قاتل کے درمیان کھڑا تھا....... پھر اس نے ایک دل دہلا دینے والا نعرہ سر کیا اور اپنی ٹیڑھی میڑھی لاٹھی سے ایسی ایک ضرب لگائی کہ شمر ذوالجوشن اپنے خود کی نجس چوٹی سے اپنے مرکب کے زنگ آلود نعلوں تک ہل کر رہ گیا اور لکڑی ٹوٹ گئی۔

تب شمر نے گھوڑے کو مہمیز کیا اور اسے، جو بہت تاخیر سے اور نہتا ہی اپنے ذی حشم مہمان کی سپر بننے آنکلا تھا ـــــ اسے روندتا مسلتا ہوا اپنے آخری جرم کی طرف بڑھ گیا۔ یہ شخص گرا ـــــ دودھ، پنیر، شہد اور روغنِ زیتون اور تازہ خرمے سے پلا ہوا اس کا بدن امامؑ کے تصدق ہو گیا۔

اور پھر وہ آخری جرم سرزد ہوا جس نے ترائی پر چمکنے والے سورج کو سیاہ کر دیا ـــــ اور رات آگئی۔ اور رات میں کسی وقت بلند قامت گھوڑوں پر سوار حُر بن ریاحی کے قبیلے والے آئے اور صرف اپنے آدمی کا لاشہ اٹھا لے گئے۔

اور پھر زمرد اور یاقوت اور مشک اور عنبر کے بہتر تابوت لے کر تاریخ آئی جس نے بہتر آسمان شکوہ لاشے سنبھالے۔ اُن میں ایک سر بریدہ لاشہ صبر و رضا والے، کہ استقامت والے امامؑ کا تھا کہ جن کا قدیم بلندی پر تھا سو انھیں بادلوں پر جگہ ملی۔

پھر سگانِ دنیا کے ورثا، اپنے مسخ شدہ حرام مردے کھینچ لے گئے اور میدان خالی ہو گیا۔

مگر یہ آدمی (کہ جس کی کہانی میں نے سنانی شروع کی ہے) یہ وہیں پڑا رہا۔ شمر کے گھوڑے کی لید میں سنے ہوئے اس کے سری پائے، بھیجہ اور قیمہ وہیں پڑا رہ گیا جسے صبحدم چیونٹیوں کی پہلی قطار نے دریافت کیا اور آہستہ آہستہ منہدم کرنا شروع کر دیا ـــــ اور یہ انہدام تا دیر جاری رہا

تو ایک ایسے آدمی کا تصور کیجیے جس نے امامؑ کو خط لکھا ہو اور خط لکھنے کے بعد گھر جا کر سو گیا ہو۔ مگر ایک آخری لمحے میں اپنے باطن کی سچائی اور اپنی وابستگی کا اظہار کرے اور عجیب طرح سے مقبولِ بارگاہ ہو۔ ایک ایسے آدمی کا تصور کیجیے ـــــ یہ آدمی جیم آلف ہوگا (جس کی کہانی میں اس وقت سنا رہا ہوں۔)

مگر جیسے یہ چند سطریں لکھ کر میں نے سب سے پہلے سنائیں وہ جیم آلف تو ایک چھوٹے سے ملک کے چھوٹے سے گھر میں لکھ لکھا کر اپنے چھوٹے سے کنبے کو پال رہا ہے۔ وہ تو چھوٹی چھوٹی سبک باتوں سے گاتی گنگناتی دُکھ سہتی ہوئی غزلیں بناتا ہے، اور ایک چھوٹی زبان کے چھوٹی

چھوٹی اشاعتوں والے جریدوں میں چھپوا دیتا ہے۔ پکی روشنائی میں اپنا نام چھپا ہوا دیکھ کر خوش ہو لیتا ہے۔ مشاعروں میں گا بجا لیتا ہے۔ نہ کبھی اس سے بڑے گناہ سرزد ہوئے نہ اس نے خیر کا کوئی بڑا کام کیا۔ چھوٹی موٹی نیکیوں پر اور ہلکی پھلکی معصیتوں پر اس کا گزارہ ہے۔ میں نے سید الشہداؑ کے نامِ نامی کے ساتھ اس آدمی کا تذکرہ کرنے کی جسارت اس لیے کی کہ میں اس کی وابستگیاں بتا دینا چاہتا ہوں۔

تو سنیئے بات کوئی پرانی نہیں ہے۔ یہ آدمی ایک بار کسی مشاعرے میں بلوایا گیا تو میزبانوں سے کہنے لگا "مجھے پیسے نہ دو۔ یہاں سے بیت اللہ قریب ہے، مجھے عمرہ کرا دو۔ تمہارا کوئی زیادہ خرچ بھی نہ ہوگا۔" پھر عمرہ کرنے گیا تو طواف کرتے ہوئے بے ڈھنگے پن سے دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ سمجھو تو اتنی عمر میں اس سے یہی ایک نیکی صادر ہوئی ہے ـــــ یا اسے اس کی بے بسی کہہ لو۔ کہہ رہا تھا: "میں نے حرم شریف میں دنیا کے پہلے مظلوم اور مستقیم آدمی سے لے کر فلسطینیوں تک سب کے لیے دعا کی اور رونا مجھے اپنی ضلالت اور بے بسی پر آتا تھا کہ میں اگر کربلا کے سن ہجری میں ہوتا تو اپنے گھر میں پڑا کلپتا رہتا۔ مجھ میں اتنی استقامت بھی نہ ہوتی کہ جلانے کی لکڑی کھینچ کر ہی ظالموں کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور گھوڑوں تلے روند دیا جاتا۔ کہنے لگا "دیکھ لو میں یاسر عرفات کے سن ہجری میں ہوں اور سوائے گالیاں بکنے اور دعائیں مانگنے کے کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تو کسی جارح ٹینک کے سامنے جا کھڑا ہونے کی ہمت نہیں رکھتا۔ مجھے گھڑگھڑاتی ہوئی لوہے کی اس پٹی سے خوف آتا ہے جو لمحے بھر میں قیمہ بنا دیتی ہے...... مگر میں ضمیر کی اس گھڑگھڑاتی ہوئی آواز سے بھی قیمہ ہوا جاتا ہوں جو ہم میں سے اکثر کو سنائی دے رہی ہے۔" اور آخری بات اس نے مجھ سے یہ کہی کہ بھائی میں بھی اور تم بھی اور ہم سب اصل میں اپنی مصلحت اور منافقت کے کوفے میں آباد ہیں اور حق کے لیے جنگ کرنے والی کسی مستقیم ENTITY سے آنکھ نہیں ملا سکتے۔ خواہ وہ استقامت کی سب سے بڑی علامت حسینؑ ہوں یا ہمعصر تاریخ کے فلسطینی۔

میں اس کا شانہ قلم سے چھوتا ہوں۔ یہ نائٹ بنانے کی رسم ہے۔ پہلے اس موقعے پر قلم کی جگہ تلوار استعمال کی جاتی تھی۔ تو میں اسے مایوسی اور بے بسی کا نائٹ مقرر کرتا ہوں اور اس سے کہتا ہوں کہ پیارے جیم الف! ہمیں ہمارے پنیر اور روغنِ زیتون اور خرمے کھا گئے۔ اور پیارے جیم الف! چیونٹیوں کی پہلی قطار ہمیں دریافت کر چکی ہے کہ ہمارا انہدام کبھی کا شروع بھی ہو چکا۔

سو اب اپنے گھر جاؤ اور کھانا کھا کر آرام کرو۔

فضا میں لٹکتی ہوئی لاش

ظہیر بابر

بات تو بس اتنی سی تھی کہ مجرم کو ایسی جگہ پھانسی دی جائے کہ سارا شہر دیکھے اور عبرت پکڑے مگر یہ چھوٹی سی بات اتنی بڑھ گئی کہ ایک بہت بڑی مصیبت بن گئی۔

منصف نے یہ جملہ سینکڑوں بار لکھا تھا کہ ملزم کو تادمِ مرگ سولی پر لٹکتے رہنے دیا جائے۔ اُسے یہ جملہ اتنا ہی رسمی لگتا تھا جتنا عدالت کے صدر دروازے پر کھڑے ہوئے گن مین کے سلیوٹ کا جواب دینا۔ ابھی سلیوٹ مکمل نہیں ہوتا تھا اور اس کی کار گن مین کو پیچھے چھوڑ چکی ہوتی تھی مگر اس مرتبہ فیصلے کا آخری جملہ لکھتے وقت اس کا قلم ذرا دیر کو ٹھٹکا تھا، شاید اس لئے کہ اس نے سرکاری وکیل کی یہ استدعا بھی فیصلے میں شامل کر لی تھی کہ پھانسی ایسی جگہ دی جائے کہ ملزم کے ساتھی اس کا انجام دیکھ سکیں۔ سزائے موت سنانا ایک بات تھی اور لوگوں کو دعوتِ نظارہ دینا دوسری! غالباً اسی وجہ سے یہ خیال بھی اس کے دماغ میں بار بار سر اُٹھا رہا تھا کہ وہ عدالت کے مانوس کمرے میں نہیں بلکہ سارے شہر کے سامنے فیصلہ سنانے جا رہا ہے۔

منصف نے خلافِ معمول ایک دن کی تاخیر سے فیصلہ سنا دیا۔ عدالتی فیصلوں پر عدالت کی ہدایت اور منشا کے مطابق عمل کرنا انتظامیہ کا فرض ہوتا ہے۔ تمام فیصلے محکمہ داخلہ کا محض طواف کر کے جیل والوں کے پاس پہنچ جایا کرتے ہیں۔ انھیں اپنی ذمہ داریاں خوب معلوم ہیں لیکن تازہ فیصلہ ذرا ٹیڑھا تھا۔ اس کی وجہ سے امن و امان برقرار رکھنے کا سوال بھی پیدا ہوا اور تماشائیوں کی نشستوں کا انتظام کرنے کا بھی، اس لئے جیلر کی سرکردگی میں ایک کمیٹی قائم کر دی گئی۔ جسے محض پہچان کی خاطر "پھانسی کمیٹی" کا نام ملا۔ کمیٹی کو سب سے پہلے مناسب جگہ کا انتخاب کرنا تھا۔

شہر کا مرکزی چوک موزوں مقام تھا۔ اس کے اردگرد اونچی اونچی عمارتیں تھیں جن کی چھتوں پر محافظ دستے مقرر کئے جا سکتے تھے۔ اکثر عمارات کی دوسری منزل میں دفاتر تھے، انھیں خالی کرایا جا سکتا تھا۔ ان کی کھڑکیوں میں سے بندوقیں ہر زاویے سے چاروں طرف گھوم سکتی تھیں چوک میں بیس تیس ہزار تماشائی سما سکتے تھے۔ اس انتخاب پر شروع میں سب لوگ متفق نظر آتے تھے۔ انھوں نے ایک معترض کی یہ دلیل بھی مسترد کر دی کہ تماشائیوں کی تعداد کم ہوئی تو پھانسی کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ دوسرے افسر نے کئی لوگوں کے منہ کی یہ بات چھین لی کہ تماشائیوں کی فکر نہ کیجیے، وہ گنجائش سے زیادہ ہوں گے۔ ایسے مناظر تو لوگوں کو اب فلموں میں بھی دیکھنے کو نہیں ملتے، اور پھر انسان کے اندر ایک درندہ بھی پنجے مار رہا ہوتا ہے۔ اُسے بھی نہ بھولیئے!"

بات وزنی تھی مگر ایک سینئر افسر کو بُری لگی۔ اس نے کہا: "عدالت کا یہ منشا نہیں ہے کہ انسان کے اندر کا درندہ جگایا جائے اور وحشت و بربریت کے جذبات اُبھارے جائیں اس کے فیصلے سے واضح ہے کہ وہ صرف عبرت دلانا چاہتی ہے اور اندر کے درندے کو سہمانا چاہتی ہے۔ آپ یہ بھی نہ بھولیئے کہ بکرے کو ذبح ہوتے دیکھ کر اونٹ ہر شئے کو روندتا ہوا اس طرح بھاگتا ہے جیسے دوسری چھری اس کی گردن

پر ہوگی۔ اگر اتنے بڑے ہجوم میں چند لوگ بھی خوفزدہ ہو کر بھاگے تو بھگدڑ مچ جائے گی اور تماشائی تماشائیوں کو روند ڈالیں گے، انہیں چوک سے بھاگ نکلنے کا راستہ ہی نہیں ملے گا۔"

سینئیر افسر کی ہاں میں ہاں ملانا تو ملازمت کے آداب میں شامل ہے اور پھر ان کی دلیل بھی صحیح تھی۔ اس سے حوصلہ پا کر تیسرے رکن نے وہ بات کہہ دی، جو سب کے دل میں تھی مگر جسے زبان پر لا کر کوئی بھی نااہل اور بزدل نہیں کہلوانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا "زمانہ ویسے بھی نازک ہے، مجرم کے چند ساتھی شہر میں دندناتے پھرتے ہیں۔ وہ ظالم اور سنگدل ہیں۔ وہ ہجوم میں شامل ہو کر ہنگامہ بھی برپا کر سکتے ہیں اور اس ہنگامے میں ہم لوگوں کی جانیں بھی جا سکتی ہیں۔ اس لئے کوئی ایسی ترکیب سوچئے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

ان خیالات کی سب سے زیادہ تائید کمیٹی کے اُن ارکان نے بہت زور شور سے کی جنہیں قاعدے کی رو سے پھانسی کی ٹکٹکی کے پاس موجود رہنا ہوتا ہے۔ سب سوچ میں ڈوب گئے۔ ان کے ذہنوں میں مختلف مقامات کی تصویریں گھومیں مگر ہر جگہ انہیں قتل و خون اور بھگدڑ کے مناظر کے علاوہ اپنے لئے خطرہ بھی نظر آیا چنانچہ ان میں سے ہر ایک نے خود ہی ایک کے بعد دوسرا مقام سنسر کر دیا۔ کمیٹی کی کارروائی کا آغاز ہی غلط ہوا تھا۔ سب کی سوچ خوف کی پٹری پر چڑھ گئی تھی۔ جو کوئی جتنا سوچتا اُتنا ہی خوفزدہ ہوتا۔ خاموشی اتنی گہری ہوتی جا رہی تھی کہ جیلر کی کرسی چرچرائی تو یوں لگا جیسے سورج کا کوئی تیر دُھند کا پردہ چاک کر گیا ہے۔ جیلر کے چہرے پر سختی گُنا بن کے چھائی ہوئی تھی۔ وہ اگر آدمی نہ ہوتا تو ضرور پتھر ہوتا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ بہت سی نظریں اس کے چہرے سے ٹکرا کے لوٹ رہی تھیں۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "ہماری جیل بھی شہر کے وسط میں ہے۔" سب کو اچانک احساس ہوا کہ شہر تو سیلاب کی طرح جیل کے گرد گھوم کر بہت آگے نکل گیا ہے۔ اب انگریزی کی اصطلاح میں جیل تو شہر کا دل بن گئی ہے۔ جیلر کے سیاہی مائل ہونٹوں پر مسکراہٹ لوٹ رہی تھی۔ اس نے بات بڑھائی "آپ لوگوں نے وہ کرین تو دیکھے ہوں گے جو شہر کے باہر کھڑے ہیں؟"

اس بے جوڑ بات پر کئی بتیسیاں کھلیں مگر جیلر کا چہرہ دیکھ کر قہقہے گلے کے نیچے اِدھر اُدھر کہیں چھپ گئے۔ جیل کے نو عمر افسر نے فوراً تائید کی "جی ہاں جناب! وہ کیا کہتے ہیں، خودکار، خودکفیل کمپیوٹر سے چلنے والے کرین خوب دیکھے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ آئے تھے تو ہمارے کالج میں بھی مباحثہ ہوا تھا۔ موضوع تھا 'جدید ترین ٹیکنالوجی پر تیسری دنیا کا بھی حق ہے۔' میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے اس مفروضے کے حق میں بولنے کو کہا گیا۔ مہمان خصوصی حزب اختلاف کے ایک لڑکے کی تقریر پر آگ بگولا ہو گئے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ ہمارے حکام تو ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ لیتے ہیں۔ ہمیں صرف وہی ٹیکنالوجی ملتی ہے جو ہمارے گلے کا طوق اور ہمارے حلق کی پھانس بن جاتی ہے۔' مہمان خصوصی نے مقررین کی فہرست میں اس لڑکے کے نام کے گرد ایک دائرہ کھینچ دیا تھا۔ اس مباحثے کے بعد ہم نے اس لڑکے کو کبھی نہیں دیکھا......!

"خاموش رہو، ورنہ تمہیں بھی کوئی نہیں دیکھے گا!" جیلر نے مونچھیں جھاڑتے ہوئے درشتی سے کہا۔

نوجوان افسر گھبرا کے تیز تیز بولنے لگا "میں تو سابق حکومت کی بات کر رہا ہوں۔ آپ سب کو یاد ہو گا۔ ان کرینوں کے بازو بجلی کے جلتے بجھتے قمقموں سے سجائے گئے تھے۔ رات کو یوں لگتا تھا جیسے وہ بھاگ کر ستاروں میں شامل ہو جائیں گے؟ وہ کس قدر دھوکا تھا یہ سب کچھ! لوہے کے ان زرافوں کے استعمال کے لئے کوئی منصوبہ ہی نہ بن سکا، وہ چار سال سے پڑے زنگ کھا رہے ہیں۔"

نوجوان افسر کی گفتگو سے حاضرین محظوظ ہو رہے تھے۔ انہیں ذرا سانس لینے کا موقع ملا تھا مگر جیلر پہلو بدل بدل کر اپنی برہمی کا اظہار کر رہا تھا۔ آخر کمرے میں اس کی دھاڑ گونجی "تم خاموش رہو گے یا تمہیں کمرے سے نکالنا پڑے گا۔" نوجوان نے اپنا سر جھٹکا اور خاموش ہو گیا، حاضرین نے جیلر کی نرم آواز سُنی "یہ کرین آخر کس دن کام آئیں گے؟ ہم مجرم کو کرین پر چڑھا کر پھانسی دیں گے نیچے کی طرف نہیں اوپر کی طرف!"

جیلر کی پہیلی کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ سب حیرت کے باوجود خاموش رہے۔ نائب جیلر سے استفسار نہ ہو سکا، اس نے پوچھا "یہ کس طرح؟"
"ہم کرین کی ہک سے رسہ باندھ کر مجرم کے گلے میں پھندا ڈال دیں گے۔ کرین کا بازو اوپر اٹھے گا اور گھرچ!" جیلر نے آخری جملہ یوں ادا کیا جیسے پاپڑ چبا رہا ہو!

"مگر وہ سارے شہر کو دکھانے کا حکم؟"

"آپ کے بال سفید ہو گئے نائب جیلر صاحب، مگر نہ کبھی جیل سے اوپر اٹھ سکے نہ جیل کی دنیا سے باہر ہی نکل سکے۔" جیلر کے ہونٹ اس کی مونچھوں میں چھپ کر مسکرا رہے تھے۔ "آپ کے سامنے تو پورا نقشہ بنانا پڑے گا۔ دیکھیے جیل کی دیوار اٹھارہ فٹ اونچی ہے اور مجھے یاد ہے کہ کرین کا بازو ڈیڑھ سو فٹ سے بھی زیادہ اونچا اٹھتا ہے۔ ملزم جیل کی دیوار سے تقریباً ایک سو تیس فٹ اونچا لٹکے گا۔ اتنی بلندی پر اسے کل عالم دیکھ سکے گا۔"

"واہ!" حاضرین میں سے کسی کے ہونٹ بے ساختہ کھلے۔ جیلر کے دیدے ان کی تلاش میں گھومے مگر اس وقت کئی ہاتھ اپنی مطمئن "واہ واہ" کا تعاقب کر رہے تھے۔

یہ مشکل بھی جیلر نے چٹکی بجاتے میں حل کر دی کہ فولادی زرافے کو جیل میں کیسے لایا جائے؟ جیل کی دیوار ایک جگہ سے گرا کر راستہ بنا لیا جائے۔ کرین گذر جائے گی تو قیدی لگا کر اسی وقت شگاف میں اینٹیں چنوا دی جائیں۔ "کمبخت مفت کی روٹیاں توڑتے ہیں، کیا اپنے جیل کی دیوار کی مرمت بھی نہیں کر سکتے۔" جیلر نے فاتحانہ انداز میں سب کی طرف دیکھا اور ہر ایک کو متفق پایا۔

اب کرین کو لانے اور چلانے کا مسئلہ تھا۔ کرینوں کے ساتھ ولائتی ڈرائیور اور دوسرے ماہر بھی آئے تھے۔ انھوں نے دس بارہ مقامیوں کو کرینوں کا سسٹم سمجھایا تھا اور تربیت دی تھی۔ ان کا سسٹم خاصا پر پیچ تھا۔ انھیں چلانے والے کے لئے ضروری تھا کہ ڈرائیور الیکٹرانکس بارے میں بھی جانتا ہو، ٹیلی سکوپس کے بارے میں بھی، اس "کمپیوٹرنگ پروگرامنگ" سے آگاہ ہو اور ہیوی ڈیوٹی ڈرائیور بھی ہو۔ کرین کے ایئر کنڈیشنڈ کیبن میں صرف ایک سیٹ تھی، ایک ہی آدمی کو سارا کام کرنا تھا۔ یہ کرین بالکل نئی ایجاد تھے۔ ابھی ان کی آزمائش بھی مکمل نہیں ہوئی تھی کمپنی کے کسی افسر نے دیسی تجارتی وفد کو محض مرعوب کرنے کے لئے انھیں بھی دکھا دیا۔ وفد کے لیڈر کو یہ عجیب و غریب کرین اتنے پسند آئے کہ وہیں مچل گیا کہ انھیں بھی خریداری کی فہرست میں شامل کر دو۔ ان میں نہ کوئی فولادی رسا تھا اور نہ کوئی لیور پھر بھی ان کے بوم چاروں طرف گھومتے اور ڈرائیور جب چاہتا ایک ترتیب سے کبھی انھیں انگشت شہادت بنا دیتا، کبھی انھیں مکڑی کی ٹانگوں کی طرح پھیلا دیتا، کبھی ہاتھی کی سونڈ کی طرح لپیٹ لیتا اور جب بند کرتا تو وہ خوفزدہ کتے کی دم کی طرح غائب ہو جاتے وہ ٹینک تک یوں اٹھا لیتے جیسے ماں معصوم بچے کو گود میں لے لیتی ہے۔ وفد کے لیڈر تو ان کرینوں پر فدا ہو گئے۔ اگرچہ کمپنی نے ان کی بڑی خاطر تواضع کی تھی، ان کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھا تھا، مگر اس نے کرین بیچنے سے انکار کیا تو وہ ناراض ہو کر وطن آ گئے۔ ایئرپورٹ پر ایک زوردار بیان دیا کہ نقد قیمت ادا کرنے کے باوجود ہمیں جدید ٹیکنالوجی سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ سارے ملک میں جیسے آگ لگ گئی۔ ہر طرف بحث مباحثے ہونے لگے اور یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ ہمیں اب پہلی کی بجائے دوسری دنیا کی طرف دیکھنا چاہیے۔ تلخی بڑھی تو ولائتی حکومت مجبور ہو گئی کہ دیسی حکومت سے مذاکرات کرنے کے لئے اپنا وزیر تجارت بھیجے۔ دیسی حکومت اگرچہ عوام کو کچھ ایسی گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ مگر ایسے معاملے میں وہ رائے عامہ کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ یہ قوم کی ناک کا مسئلہ تھا اور اس کی ناک کی ہڈی سابق حکمراں کی ناک کی گھوڑی کی طرح اتنی اٹھی ہوئی تھی کہ اس پر مکھی بیٹھتے ہی پھسل جاتی تھی۔ دراصل آرڈر بہت بڑا تھا۔ بہت سے ہائیڈرالک ہیمر، ایکلے ویٹر، لوڈر، کمپریسر اور ٹریک ڈرلز سے لے کر مشینوں تک کروڑوں کا سامان نکل رہا تھا۔ امیر ملکوں کو بھی زر مبادلہ کی ضرورت ہوتی

ہے۔ ولایتی حکومت کو بادل نخواستہ کرین بیچنا پڑے۔ البتہ اس نے معاہدے میں اضافی سامان اور گیجیٹوں کا ذکر ہی نہ کیا۔ ننگے بچے کرین فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ دیسی حکومت کے ماہرین کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کرینوں کے ساتھ بھی کچھ ہوتا ہے، اس نے یہی کافی تھا کہ سفارتی میدان مار لیا۔ اور قوم کا سر کرین کے بازو سے بھی زیادہ بلند کر دیا۔ کرین درآمد ہوئے تو ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ انھوں نے بھی ہاتھی کی طرح چنگھاڑ کر اور سونڈ اٹھا اٹھا کر جواب دیا۔ انھیں ملک بھر کی سیر کرائی گئی۔ انھوں نے بوجھ اٹھانے کے کرتب دکھا کر لوگوں کا جی خوش کیا۔ پھر ان کے استعمال کے لئے منصوبے مرتب کرنے تک شہر کے باہر کھڑا کر دیا گیا وہیں مقامی ڈرائیوروں نے تربیت پائی مگر تربیت کی تکمیل پر کوئی تقریب بھی نہ ہوئی۔ ولایتی ماہرین چپ چاپ واپس چلے گئے۔ مقامی ڈرائیور کچھ عرصہ کرینوں کی مزاج پرسی اور جھاڑ پونچھ کے لئے آتے رہے۔ پھر وہ بھی گھر بیٹھے تنخواہ وصول کرنے لگے اس عرصے میں حکمراں کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کی جگہ دوسری ناک نے لے لی۔ اب ستواں ناک قوم کی عزت بن گئی۔ پکڑ دھکڑ اور جواب طلبی شروع ہوئی تو کرین ڈرائیور اس خوف سے اِدھر اُدھر ہو گئے کہ کہیں ان سے مفت کی تنخواہ کا حساب نہ مانگ لیا جائے۔ صاحب کرین یاد آئے تو ان کے ڈرائیوروں کی ڈھنڈیا پڑی۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ایک ڈرائیور پولیس کے ہاتھ لگا۔ اس نے تو بہت ہاتھ پاؤں جوڑے مگر سپاہیوں نے ایک نہ سنی پکڑ کر پھانسی کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا۔

کمیٹی جب ڈرائیور کو لے کر موقع پر پہنچی تو وہاں چھ کی بجائے پانچ کرین پڑے تھے۔ ایک کرین شاید شرم سے زمین میں گڑ گیا تھا یا رنگ بن کر اپنے ملک کو واپس سدھار گیا تھا۔ بہرحال کمیٹی کو صرف ایک کرین درکار تھا۔ تعداد سے اسے کیا غرض تھی۔ یہ کسی اور کا کام تھا۔ ڈرائیور نے مختلف کرین جانچے۔ چار تو بس زمین کا بوجھ تھے۔ ایک کا پورا انجن غائب تھا۔ دوسرے کا پورا پہیہ۔ دو میں سامان تو پورا معلوم ہوتا تھا مگر زندگی کی کوئی رمق نہ تھی۔ جیلر کو اپنی تجویز طوفان میں ڈوبتی ہوئی نظر آئی۔ اس کا پارہ ابھی چڑھ رہا تھا کہ پانچواں کرین ایسے گڑگڑایا جیسے پہاڑ کے پیٹ میں لاوا ابلنے لگا ہو۔ کمیٹی کے ارکان الٹے قدموں پیچھے ہٹ گئے صرف جیلر اپنی جگہ پر جما رہا۔ اس کی مونچھوں کی آڑ میں اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے

پھانسی دینے کا دن مقرر ہوا۔ اس کی اور اس کے ساتھ کرین کی خوب تشہیر ہوئی۔ اخبار والوں نے ہر زاویے سے کرین کی تصویریں چھاپیں۔ ان کے آرٹسٹوں نے پھانسی کے اس انوکھے طریقے کے خیالی خاکے اور نقشے بنائے اور رپورٹروں نے انٹرویو کئے۔ ایڈیٹروں نے ان پر سنسنی خیز سرخیاں جمائیں اور نہایت مدلل مقالے لکھے۔ مقررہ دن جوں جوں قریب آیا، آس پاس کے علاقوں سے بھی لوگ شہر میں جمع ہونے لگے۔ سارے دکانداروں کی بکری بڑھ گئی لیکن دوربینیں بیچنے والوں کی تو چاندی ہو گئی۔ انھوں نے ایک کے دس اور پھر بیس وصول کئے۔ پھر بھی گاہک تھے کہ ٹوٹے پڑتے تھے۔ دوربینوں کی خوب خوب بلیک ہوئی۔ اخبارات میں لوگوں کے جوش و خروش اور غیر معمولی دلچسپی کے قصے پڑھ کر منصف نے سرکاری وکیل کی یہ استدعا بھی منظور کر لی کہ خوب دن چڑھ جائے تو مجرم کو پھانسی دی جائے اور پھانسی دینے سے پہلے اسے کالی ٹوپی بھی نہ اوڑھائی جائے، کہیں لوگ اس شبہے میں نہ پڑ جائیں کہ آدمی کی بجائے اس کا پتلا لٹکا دیا گیا ہے۔ لوگ عموماً کانوں کے کچے ہوتے ہیں اس لئے احتیاط مقدم ہے۔ سرکاری وکیل یوں تو دور کی کوڑی لانے والا اور معاوضے کا حق ادا کرنے والا مشہور تھا مگر یہ نکتہ اس کے ذہن سے اتر گیا کہ مجرم کے پاؤں بھی نہ باندھے جائیں تاکہ تماشائی اسے ہوا میں ٹانگیں اچھالتے اور پھر ساکت ہوتے بھی دیکھیں۔

مقررہ وقت پر مکانوں کی چھتیں انسانوں سے لد گئیں۔ شہر میں کوئی اونچی جگہ ایسی نہ تھی جسے تماشائیوں نے گھیر نہ لیا ہو۔ مجرم کے آنے سے پہلے کرین ڈرائیور خوش تھا کہ اس نے کرین کے رگر زمین پر خوب جما دیئے ہیں۔ پینل روشن ہے اور پروگرامنگ مکمل ہے اس کے دل میں بس ایک ہی خواہش تھی کہ کام ختم ہو اور وہ اس اونٹ کو چلا کر جیل سے باہر جائے۔ مجرم کو لایا گیا تو کمیٹی کے ارکان نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ ایک دبلا پتلا اور لاغر انسان تھا۔ ایسا لگتا تھا، اس کا جسم جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا ہے مگر اس کے چہرے پر نہ تشویش کی کوئی جھلک تھی، نہ تفتیش کا کوئی نشان تھا۔ وہ چل کے آیا تھا اس لئے زندہ تھا پھر بھی قانون کی تشفی کے لئے ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا۔

مجسٹریٹ نے اس سے ایک دو سوال کیے مگر اس نے حقارت سے منہ پھیر لیا۔ مجسٹریٹ پیچھے ہٹا تو جلاد نے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ دیے اور اس کے پاؤں جوڑ کر ان کے گرد رسی لپیٹی، اس نے مجرم کا سر اور منہ ڈھانپنے کے لئے کالی ٹوپی اٹھائی تو جیلر نے اشارے سے روک دیا۔ اس نے پھانسی کا پھندا جانچا اور نظروں نظروں میں مجرم کی گردن اس طرح ناپی جس طرح مصور اپنے ماڈل کے خطوط کا جائزہ لیتا ہے۔ آخری حکم کے انتظار میں وہ پھندے کو اپنے ہاتھ پر رکھ کر تولنے لگا۔

موقع پر موجود حکام نے اپنی گھڑیاں دیکھیں۔ آپس میں سرگوشی کی اور جلاد کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا، مجرم کا سنسان چہرہ دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکا۔ اب تک اس نے صرف کالے ٹوپوں کو پھندے پہنائے تھے۔ پھندے میں جیتا جاگتا چہرہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھندا ڈال کر وہ آخری جانچ کیے بغیر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ کرین ڈرائیور کو اشارہ ملا تو اس کے ہاتھ پاؤں جیسے من من بھر کے ہو گئے۔ اس نے کرینوں سے سڑک کوٹنے والے انجن تک اٹھائے تھے مگر کسی انسان کو پھانسی پر نہیں چڑھایا تھا۔ اس نے سر نیچا کر کے انگلیاں چلائیں۔ بوم ایک دو تین کر کے انگشت شہادت کی طرح اٹھ گئے ــــ ڈیڑھ سو فٹ لمبی انگشت شہادت، جس کا زاویہ نوے ڈگری کے لگ بھگ تھا۔ اس نے چور نظروں سے اوپر دیکھا مگر چینل کی وارننگ لائٹ نے اس کی توجہ جذب کر لی۔ اس نے کرین کے بازو کو ہلانے اور ذرا جھکانے کی کوشش کی تو سرخ بتی کے جلنے بجھنے کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ جیل کی مختلف چھتوں پر مسلح سپاہی کھڑے تھے۔ احاطوں میں بند قیدیوں کی آوازیں عجیب سی گونج پیدا کر رہی تھیں۔ ایر کنڈیشنر بند ہو گیا تھا۔ اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس نے کئی بٹن چھیڑے مگر وہ تو سارے سبق بھول گیا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ دریا کی لہریں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے اس کے سامنے جیل کا دالان پانی میں ڈوب رہا تھا۔

کرین کا بازو جب جیل کی دیوار سے اوپر اٹھا تو ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ کئی لوگوں نے نعرے لگائے بعض دعائیں بڑبڑانے لگے۔ کچھ منتر الاپنے لگے۔ کچھ ایسے بھی تھے، جو اپنے سینوں پر صلیب کے نشان تان رہے تھے۔ جن کے پاس دوربینیں تھیں وہ آس پاس کے لوگوں کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے رواں تبصرہ کرنے لگے۔ وہ مبالغے سے بھی کام لے رہے تھے۔ پھر بھی ان کے پاس کہنے کو بہت کم تھا۔ وہ اپنی دہرائی ہوئی باتیں ہی دہرا رہے تھے۔ ایک صاحب سخت پریشان تھے۔ ان کے بچے کو شاید عینک کی ضرورت تھی۔ سات کرین پر لٹکا ہوا آدمی دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا اور وہ اشارے کر کر کے اسے آدمی دکھانے کی اس طرح کوشش کر رہے تھے، جس طرح ہلال عید کی نشان دہی کر رہے ہوں۔ لوگ شاید وہی کچھ بن جاتے ہیں جو انھیں کھلایا پلایا جاتا ہے!

شہر میں صرف ایک جگہ ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ کسی گرہ کٹ نے تماشائیوں کی محویت سے فائدہ اٹھایا اور کئی جیبیں تراش کر رفوچکر ہو گیا۔ ایک شخص نے رومال نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ بلا روک ٹوک باہر نکل گیا۔ وہ چیخا: "میری جیب!" یہ سنتے ہی آس پاس کے سارے ہاتھ جیبوں میں اترے اور بہت سی زبانیں پکاریں "میری جیب!" "میں لٹ گیا!" "دوڑو، پکڑو!" جن کی جیب بچ گئی تھی، وہ ایک طرف ہٹ گئے جن کی کٹ گئی، وہ جس طرف منہ تھا اس طرف چند قدم بھاگے۔ پھر پلٹ کر اس جگہ پر آئے جہاں کھڑے تھے اور پھر دوسری جانب بھاگے۔ ذرا دور سے لوگوں کو بہت سے سر ٹکراتے نظر آئے، تو ان کے لئے فضا میں معلق شخص سیمنٹ کی بوری بن گیا۔

اس علاقے میں اکثر لوگ نیا تماشا دیکھنے کے لئے بھاگے۔ دھکم پیل میں دو آدمی آپس میں الجھ پڑے۔ دو سے چار ہوئے اور چار سے بے شمار! ہنگامے اور ہائے وائے کے شور نے پولیس کو متوجہ کیا۔ اس کے سپاہی گالیاں بکتے، ڈنڈے سونتے تماشائیوں کی طرف اس طرح لپکے جیسے کسان اپنے ہرے بھرے کھیتوں سے پرائے گدھے بھگانے آتا ہے۔ پولیس کی کارروائی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ لوگ ایک دوسرے کو بھول کر پولیس کے سپاہیوں پر پل پڑے۔ افسروں نے جب دیکھا کہ اب ڈنڈے پولیس والوں کی بجائے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں تو انھوں نے آنسو گیس کے چند گولے چلانے کا حکم دیا۔ بیشتر لوگ آنکھیں ملتے، کھانستے کھنکارتے گیس کے غبار میں سے بھاگ

گئے جو بھاگ نہ سکے وہ آنسو بہاتے پکڑے گئے اور جو زخمی ہوگئے، وہ ایمبولنسوں کے ذریعے ہسپتالوں میں پھنکوا دیئے گئے۔ افراتفری میں کسی نے یہ بھی نہ دیکھا کہ ایک بچہ تیسری منزل سے گر کر خون میں لت پت پڑا ہے۔ اُس نے چھوٹے بھائی کو گردن سے پکڑ کر اُسی طرح اُٹھانے کی کوشش کی تھی جس طرح کرین نے آدمی کو اُٹھایا تھا۔ چھوٹے نے تڑپ کر اپنی گردن چھڑائی اور بڑے کو دھکا دیا۔ وہ اس اچانک تیزے کیلئے تیار نہیں تھا۔ اس کا پاؤں پھسلا اور منڈیر کو پکڑتے پکڑتے نیچے لڑھک گیا۔ ایک نحیف سی چیخ اس کے ساتھ گئی مگر اُس کے سر اور منہ سے ابلتا ہوا خون دیکھ کر وحشت زدہ ہوگئی!

یہ تو باہر کے معاملات تھے، اصل مسئلہ تو جیل کے اندر اٹکا ہوا تھا۔ آدھا گھنٹہ گذر جانے کے باوجود ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر بھی مجرم زندہ تھا۔ نہ اس کی گردن ٹوٹی تھی اور نہ اس کا دم ہی گھٹا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی نہیں اور وہ وقفے وقفے سے انھیں جھپک کر اپنی زندگی کا اعلان کر رہا تھا۔ دوربین سے جو افسر اس کا چہرہ دیکھتا گھبرا کر اپنی آنکھوں سے دوربین جھٹک دیتا۔ جیلر پہلے سخت حیران ہوا، پھر پریشان ہوا اور پھر قہر آلود نظروں سے بوڑھے جلاد کو جھنجھوڑنے لگا۔ کچھ وقت اور گذرا تو اس نے ساری صورت حال کا جائزہ لیا اور بھوکے بھیڑیئے کی طرح جلاد پر ٹوٹ پڑا "تمہاری عمر گذر گئی حرامزادے پھانسی کے پھندے بناتے پھر بھی صحیح گانٹھ لگانی نہ آئی"۔ دو گھونسے برسے تو بوڑھا جلاد ہاتھ جوڑ کر زرد پتے کی طرح کانپنے لگا۔ مجسٹریٹ اور جیل کا نوجوان افسر جیلر کو بازوؤں میں تھام کر ایک طرف لے گئے۔ سمجھا بجھا کر اُسے ذرا نرم کیا۔

اصل مشکل تو جوں کی توں تھی مجرم کسی طرح مر ہی نہیں رہا تھا۔ کسی نے تجویز پیش کی کہ اسے نیچے اتار کر سیدھے سیدھے پھانسی گھر لے چلو۔ مجسٹریٹ نے یہ کہہ کر تجویز کاٹ دی کہ جیل کا سارا عملہ اور قیدی اور جیل کے باہر پورا شہر دیکھ رہا ہے۔ بات کھل گئی تو ہماری خیر نہیں۔ کسی کو دوبارہ پھانسی نہیں دی جا سکتی! سب نے سر اُٹھا کر پھر مجرم کی طرف دیکھا۔ وہ چیل کی طرح گردن جھکائے سب کو دیکھ رہا تھا سارے شہر میں شاید وہی ایک تماشائی تھا، باقی سب لوگ تماشا تھے:

نوجوان افسر پھر جیلر کی مدد کو پہنچا "کرین ڈرائیور سے کہئے دو چار جھٹکے دے مجرم کی گردن کا منکا ڈھلک جائے گا"۔ جیلر نے پلٹ کر اُسے حیرت سے دیکھا اور بھاگ کر ڈرائیونگ باکس تک اتنی تیزی سے پہنچ گیا جیسے اس کے دھڑ میں بندر کے ہاتھ پاؤں لگ گئے ہوں۔ کرین ڈرائیور کی حالت پہلے ہی غیر تھی۔ جیلر کو یوں اُچھلتے پھاندتے دیکھ کر اس کی ہتھیلیاں بھی پسینے سے دھل گئیں جیلر نے کیبن کا شیشہ کھٹکھٹایا۔ ڈرائیور نے نصف شیشہ اتارا۔ اس نے ڈرائیور کا کندھا تھپکا تو ایک جسم کی کپکپی دوسرے جسم میں سرائیت کر گئی۔ جیلر نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا اور ذرا سنبھل کر کہا "بیٹے بس دو چار منٹ کی بات ہے، تم کرین کے بازو کو دو تین جھٹکے دو اور پھر ہمارے ساتھ چل کے دفتر میں چائے پیو!"

ڈرائیور جواب میں منمنایا "کرین تو مر گیا ہے"۔

جیلر نے اُسے یقین دلایا "کہاں بیٹے! کمبخت ابھی تک نہیں مرا"۔ اس کے ذہن میں جھٹکا سا لگا، ڈرائیور نے تو کچھ اور کہا تھا "کیا کہا؟"

"کرین کا بازو جام ہوگیا ہے۔ اس کا کمپیوٹر جل گیا ہے، اس کا انجن بیٹھ گیا ہے، اس کے رگ زہ پھنس گئے ہیں۔ اسے تو گھسیٹ کر بھی جیل سے باہر لے جانا مشکل ہے!"

"کیا بک رہے ہو، کچھ کرو"۔ جیلر ہنکارا۔

"میں گھنٹہ بھر سب کچھ کر چکا ہوں، کچھ نہیں ہو سکتا"۔ ڈرائیور نے جیلر کے تیور دیکھ کر شیشہ چڑھا لیا۔

"کچھ نہیں ہو سکتا کے بچے"۔ جیلر نے جھٹکا دے کر دروازہ کھولا۔ کیبن اتنا چھوٹا تھا کہ تھپڑ بھی نہیں مارا جا سکتا تھا۔ صرف دانتوں سے کاٹا جا سکتا تھا۔ جیلر دانت کچکچا کر کیبن میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے دوسرا دروازہ کھولا اور دہشت زدہ ہرن کی طرح چھلانگ

لگا دی۔ کیبن کے دونوں دروازے بند ہو گئے۔ ڈرائیور نے دیکھا کہ جیلر نے انھیں کھولنے کے لئے "ناب" سے لڑ رہا ہے۔ اس نے نیچے کھڑے ہوئے افسروں کو سلام کر کے کہا "ابھی بلا کے لاتا ہوں" اور بھاگتا ہوا ڈیوڑھی میں پہنچ گیا۔ سارے افسر کیبن میں محبوس جیلر کی حرکتیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے ڈرائیور کو صرف اترتے ہوئے دیکھا تھا۔

جیلر نے بڑی جد و جہد کے بعد دروازہ کھولا۔ کیبن میں تو اس کی سانس ہی بند ہو چلی تھی، وہ آہستہ آہستہ نیچے اتر کر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا۔ یہ چند لمحے اس کے چہرے پر برسوں کی راکھ جھاڑ گئے تھے۔ "کرین مر گیا ہے!" اُس کی آواز اُس کے حلق میں جم گئی تھی۔

سب کو حقیقت معلوم ہوئی تو وہ جیلر کے دفتر میں جمع ہوئے۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ ایکا ایکی نا سمجھ ہو گئے تھے صرف نائب جیلر کچھ ایسا پریشان نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے اکتا کر بات چھیڑی۔ "جب کرین کا بازو اُٹھ رہا تھا تو مجھے اُسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ نہ پھندا ٹھیک لگا ہے اور نہ گانٹھ، تختہ کھلتے ہی جب مجرم پھانسی گھر میں گرتے ہیں تو چھپکلی کی کٹی ہوئی دم کی طرح تڑپتے پھڑکتے اور گیلے پلٹتے ہیں۔ وہ تو اس طرح سکون سے اوپر چڑھ گیا جیسے معائنہ کرنے جا رہا ہو۔ یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار انسان دیکھے ہوں۔"

"ممکن ہے زمین پر ہی دہشت سے مر گیا ہو۔" نوجوان افسر نے جیلر کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔

"وہ کمبخت تو اس وقت بھی زندہ ہے۔ کھڑکی میں سے جھانک کے دیکھ لو نا" نائب جیلر نے اطمینان سے جیلر کے سر پر ٹھنڈے پانی کی ایک اور بالٹی انڈیل دی۔

"ایک ترکیب ہے، اسے کیوں نہ گولی مار دی جائے۔" نوجوان افسر کو رہ رہ کر جیلر پر ترس آ رہا تھا۔

"اُسے گولی مارو یا توپ سے اڑا دو۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ مجرم کو اس لاٹھ سے نیچے کیسے اتارا جائے؟" نائب جیلر کی گفتگو بڑی ہموار تھی۔

سب لوگ ان دونوں کی باتیں سُن بھی رہے تھے اور نہیں بھی سُن رہے تھے۔

"اس وقت اگر آندھی آ جائے تو مجرم کو دو چار جھٹکے لگیں گے اور وہ جھول کر ہی مر جائے گا" سب نے نوجوان افسر کی خواہش کی تلاش میں کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اُفق چمک رہا تھا۔ گرد کا کہیں نشان نہیں تھا۔ ہوا مزے سے ٹہل رہی تھی۔ مجرم سے کچھ فاصلے پر کچھ پرندے ہوا میں تیر رہے تھے۔ وہ شاید یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ آدمی ان کے محفوظ علاقے میں کیسے پہنچ گیا؟ اتنی دیر کھڑا کیا کر رہا ہے؟ وہ اتنا بے مزہ کیوں ہے؟ وہ اس میں بھی کوئی دھوکا دیکھتے تھے۔ دور ہی سے پر مار کر رُخ بدل لیتے تھے۔ مختلف احاطوں میں بند قیدیوں کے نعرے بلند ہوتے جا رہے تھے "لاش کو نیچے اتارو" کرین کا سایہ گھٹ کر کھلونا بن گیا تھا۔

اگر لوگوں کو پتہ چل گیا تو مجرم دو ڈھائی گھنٹے سے ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر گلے میں پھندا ڈالے زندہ ہے تو اُسے ایک کرامت کہیں گے اور اُسے پیر فقیر مان لیں گے پھر ہم لوگوں کی خیر نہیں ہوگی۔" نائب جیلر نے خاموش کمرے میں ایک اور شوشہ چھوڑا۔ اس مرتبہ صرف جیلر نے زخمی کبوتر کی نظروں سے نہیں دیکھا، کئی غراتی ہوتی آنکھیں بھی اس پر حملہ آور ہوئیں اور وہ کرسی کے بازوؤں میں سمٹ گیا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ کمرے میں افسر یوں اُچھلے جیسے کرین چل پڑا ہو۔ ان کے اندر کے سارے اسپرنگ ایک ساتھ کھل گئے۔ جواب کا انتظار کئے بغیر سرکاری وکیل اپنے نائب کے ساتھ ہوا کا جھونکا بنے کر اندر داخل ہوا۔ اس کی خاطر ساری کرسیاں خالی ہو گئیں۔ وہ اپنی پریشانی چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ "یہ لوگ بھی عجیب ہیں تھوڑی دیر پہلے جس آدمی کے سولی پر لٹکنے کا تماشا دیکھ رہے تھے، اب اس کی لاش کی عزت کے نام پر بپھر رہے ہیں۔ کہتے ہیں لاش خدا اور زمین کی امانت ہوتی ہے اسے اُتارو۔ جیل سے دو تین فرلانگ پر بھی چار سو آدمی جمع ہیں۔ پولیس نے انھیں گھیرے میں لے رکھا ہے، میں نے تو انھیں دیکھتے ہی کوٹ اُتار کر نیچے ڈال دیا تھا۔ بھائی گیا خبر وہ

کا کوٹ دیکھ کر مجھے منصف سمجھ لیتے اور پتھر مارتے۔" وکیل نے کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے اپنا ذہن ہلکا کر لیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ تمام کرسیوں کی گود خالی تھی۔ حاضرین کرین کے بازو کی طرح اکڑے کھڑے تھے۔ اس نے کہا: "آپ لوگ بیٹھتے کیوں نہیں؟" سب نے بڑھ کر کرسیاں یوں پکڑیں جیسے ابھی بھاگ کھڑی ہوں گی۔ سرکاری وکیل کو جانے پہچانے چہرے اجنبی اجنبی سے لگ رہے تھے۔

"وزیرِ داخلہ اور دوسرے تمام افسر اور منصف صاحب آپ لوگوں سے بہت خوش ہیں۔" سرکاری وکیل نے کمرے کا ماحول تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ "انھوں نے مجھے آپ سب کو مبارکباد کہنے کو بھیجا ہے، ساتھ ہی حکم دیا ہے کہ اب لاش اُتار لی جائے۔"

جیلر تو اندر ہی اندر پگھلا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن کے پردوں پر کبھی وزیرِ داخلہ کا چہرہ اور اس میں جڑی ہوئی پتھرائی آنکھیں گھومتیں اور کبھی فرغل میں لپٹے ہوئے منصف کا ڈراؤنا ہیولا؛ کبھی دونوں تصویریں آپس میں گڈمڈ ہو جاتیں کہ ایک کے چار ہاتھ لگتے جو اُسے گرفت میں لینے کے لیے پھیل رہے ہیں۔ دوسرے افسروں کے حلق بھی خشک اور زبانیں جیسے اکڑ گئی تھیں۔ سرکاری وکیل نے سب کی صورتوں کا بغور مطالعہ کیا۔ "آپ لوگ بھی شاید یہ انوکھی پھانسی دیکھ کر پریشان ہو گئے۔" سرکاری وکیل کا گلا اب صاف ہو چکا تھا۔ "واقعی ڈراؤنا منظر تھا! سنا ہے بے شمار عورتیں چیخیں مار کر بے ہوش ہو گئیں، کئی کمزور دل مرد بھی زرد پڑ کے گر گئے۔ ہم نے پہلے ہی سے شہر بھر میں ایمبولینس پھیلا دی تھیں۔ ہمارا مقصد پورا ہو گیا۔ یہ لوگ ڈنڈے کے مرید ہیں، اسی طرح ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ اب کچھ روز آرام رہے گا۔ آپ لاش اتارنے کا حکم دیں۔"

نوجوان افسر نے ذرا سی جرأت دکھائی، اور ہکلاتے ہوئے کہا "وہ لاش نہیں ہے۔ مجرم ابھی زندہ ہے۔"

"کیا عجیب بات کرتے ہو؟ ڈاکٹر نے لاش کا معائنہ کیا ہے؟"

"ڈاکٹر کو مجرم تک کیسے پہنچایا جائے؟"

"لاش کو نیچے اتار کر۔"

"مگر کرین تو مر گیا ہے یعنی بیل گیا ہے۔ اس کا بازو جام ہو گیا ہے۔"

"ڈرائیور کو بلاؤ۔"

"وہ بھاگ گیا ہے۔"

"جیل سے بھاگ گیا ہے۔"

"وہ کسی ماہر کو بلانے کے بہانے چلا گیا۔"

"تم نے کسی ولائتی ماہر کا پتہ چلایا؟"

"وہ سب شیطان تو پہلے ہی فرار ہو گئے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ ہمارے ہاتھ کیا کوڑا کرکٹ بیچتے رہے ہیں، دیکھئے نا ان کا جدید ترین کرین ایک مریل سے آدمی کو پھانسی دینے کے کام بھی نہیں آ سکا۔" سرکاری وکیل کو اچانک اندازہ ہوا کہ معاملہ کس قدر نازک ہے۔ "پھر یہ لاش کب تک فضا میں جھنڈا بنی رہے گی؟ کچھ سوچو!"

"سوچتے سوچتے ہمارے دماغ تو ماؤف ہو گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے سب کچھ غلط تھا، سب کچھ غلط ہو گیا۔" نوجوان افسر خود ہی اپنے سینیئر افسروں کا ترجمان بن گیا۔

سرکاری وکیل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اُسے حسبِ ضرورت اپنے چہرے کا رنگ اور اپنے تیور تبدیل کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ "مجھے تو یہ سب سازش معلوم ہوتی ہے تم لوگ یا تم میں سے کچھ لوگ مجرموں کے ساتھی معلوم ہوتے ہو ورنہ ایسی حرکت نہیں ہو سکتی تھی۔" اُس نے سانپ کی طرح اچھل کر وار کیا۔ سب نے تھوڑی دیر کو یوں محسوس کیا جیسے ان کے جسم نیلے پڑ گئے ہیں۔

"کرین ہم نے تو نہیں بنائی" جیلر کا ساؤنڈ باکس بھی پسینے میں بھیگ چکا تھا۔

نوجوان افسر کو اس کی حالت پر ترس آ رہا تھا، وہ چمک کر بولا "کرین سے پھانسی دینے اور جیل کے قواعد بدلنے کی اجازت تو آپ نے دے دی ہے جناب! آپ بھی اس سازش میں شریک ہیں۔"

"بکو مت" ایک چھوکرے کا یوں منہ آنا سرکاری وکیل کو بہت بُرا لگا۔ "تم ہو کیا چیز؟"

"میں بھی اس جیل کا افسر ہوں مگر جونیر سا! اور دوسروں کی طرح اس سازش میں شریک ہوں!"

سب کو نوجوان افسر کی جرأت پر رشک آ رہا تھا، ان کے اعصاب بھی ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔ ان کی ذمہ داری بٹتی جا رہی تھی اب وہ تنہا اس مصیبت میں مبتلا نہیں تھے۔ سرکاری وکیل نے نوجوان افسر کو گھورا مگر جب اس نے آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں تو وکیل نے طرح دے جانا ہی مناسب جانا۔ کرسی سے اُٹھا اور کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ کھڑکی اور سورج کے درمیان کرین کی سونڈ تھی اور اس کے ساتھ چپکا ہوا مقناطیسی آدمی!

سورج کی تیز کرنیں اس کی آنکھیں چیرنے لگیں تو اس کی پلکیں خود بخود جھک گئیں۔ بند آنکھوں میں رنگوں کا غبار بھر گیا۔ اس میں افق تا افق رنگ برنگے کرین بازو اٹھائے کھڑے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک ایک آدمی چپکا ہوا تھا۔ جو آہستہ آہستہ کھل کر جھنڈا بنتا جا رہا تھا۔ جھنڈوں کی قطار لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ہلکی ہوا میں سرسرانے لگ گئے تھے۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا" اس نے پہلی بار کوئی جملہ بلا سوچے سمجھے کہا تھا اور اس کے ساتھ ہی گھبرا کر آنکھیں کھول دیں سورج کی کرنوں نے پھر وار کیا تو اس نے منہ پھیر کر کھڑکی کے پٹ بھیڑ دیئے۔

"کچھ کرو، کچھ سوچو۔ حکومت تو بعد میں کوئی کارروائی کرے گی۔ لوگ لاش کی عزت کی خاطر پہلے ہی ہماری تکہ بوٹی کر دیں گے، سن نہیں رہے؟ ہجوم کے نعروں میں نئی نئی آوازیں تیزی سے شامل ہو رہی ہیں۔ قیدی بھی جنگلے توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جلدی کچھ کرو" سرکاری وکیل کی آواز میں اب التجا تھی۔

"ہم تو سب کچھ کر چکے، آپ ہی کچھ بتایئے"، بڑی دیر بعد جیلر کی صاف آواز سنائی دی۔ شاید اُسے سرکاری وکیل بھی اپنا قیدی معلوم ہو رہا تھا۔

"کرین کا بازو کاٹ دو" سرکاری وکیل کے چہرے پر ذرا سی رونق آئی۔

"مگر اس میں تو وقت لگے گا" حاضرین کا حوصلہ بڑھ رہا تھا

"میں ایک گھنٹے کی مہلت دے دوں گا"

"مگر کرین کا بازو تو منوں وزنی ہے۔ وہ کٹے گا تو قیدیوں کے احاطے اور جیل کی دیواریں توڑ ڈالے گا" نوجوان افسر نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ٹوٹنے دو"

"کئی قیدی مر جائیں گے، بہت سے فرار ہو جائیں گے" جیلر نے تشویش ظاہر کی۔

"مرنے دو، فرار ہونے دو"

"کرین کا بازو نہ کٹا تو؟"

"پورا کرین توڑ دو۔ سارا جیل ڈھا دو، مگر یہ جھنڈا گراؤ۔ سن لیا تم نے؟ یہ کہتے ہوئے سرکاری وکیل کرسی سے ٹکرایا، کرسی لڑھک گئی۔ اس کے نائب نے ٹھوکر سے کرسی ہٹائی اور دروازہ کھولا۔ وہ سب کو حیرت میں ڈوبتا چھوڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

خوف کا خشک سمندر

ظہیر بابر

وہ دفتر سے نکلا تو شام کا رنگ گہرا ہو چکا تھا۔ کچے راستے پر تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اُسے قدموں کی چاپ سنائی دی جو اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس کے جسم میں سرد لہریں چلنے لگیں۔ اس کے قدم تیز ہو گئے اور وہ اپنی پھولتی ہوئی سانس کے ساتھ اپنے ہی قدموں سے اڑنے والی دھول پینے لگا۔

نہ جانے محکمے والوں نے کیا سوچا کہ ایسے ویرانے میں دفتر کھول لیا۔ آبادی کا دور دور تک نشان نہیں ہے۔ سڑک بننے میں بھی برس ڈیڑھ برس لگ جائے گا۔ اگر افسر لوگوں کو بھی کچے راستے پر چلنا پڑتا اور دھول پھانکنا ہوتی تو پھر دیکھتا کہ اس جگہ دفتر کیسے بنتا؟ ان کے پاس تو مفت کی کاریں ہیں۔ شیشے چڑھا کر زن سے نکل جاتے ہیں۔ پرانے ملازموں کے پاس بھی موٹر سائیکلیں ہیں۔ وہ بھی بچ بچا کر دھول کا یہ دریا عبور کر جاتے ہیں۔ تنہا وہی ایک ہے جو قدم قدم چل کر ڈیڑھ میل کا کچا راستہ دن میں دو بار طے کرتا ہے مگر وہ بھی مجبور ہے۔ سرکاری نوکری کے پہلے پانچ مہینوں میں کوئی ملازم سائیکل تو کیا جوتی بھی نہیں خرید سکتا۔

شروع شروع میں ایک دن اس نے سب کے ساتھ چھٹی کر لی تھی۔ پکی سڑک تک پہنچتے پہنچتے بھوت بن گیا تھا۔ بس میں بیٹھا تو کئی مسافر اس کی صورت دیکھ کر مسکرا دیئے۔ اس نے آستین سے چہرہ پونچھنے کی کوشش کی مگر دھول تو جیسے اس کے مساموں میں جڑ گئی تھی۔ گھر پہنچا تو آئینے میں بھی اپنی صورت نہ پہچان سکا۔ انسان کو ویسے بھی اپنا چہرہ کبھی یاد نہیں رہتا۔ آنکھیں بند کر کے ہزار سوچو دوسروں کے چہرے ذہن میں گھوم جائیں گے مگر اپنی صورت کے خد و خال نمایاں نہیں ہوں گے۔ مصور بھی آئینہ سامنے رکھے بغیر اپنی تصویر نہیں بنا سکتا مگر یہ کیا کہ آئینے میں بھی اپنی صورت نہ پہچانی جائے!

وہ دن اور آج کا دن، اس نے دھول سے بھڑنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ آج معمول سے زیادہ دیر ہو گئی تھی۔ تنخواہ کا دن تھا اور ساڑھے تین بجے تک کیشیر بینک سے نہیں لوٹا تھا۔ دفتر میں سب لوگ پریشان ہو گئے تھے۔ تین بجے تو وہ کام کاج چھوڑ کر اس کی راہ دیکھنے لگے۔ پریشانی بڑھی تو انتظار نے اندیشوں کا روپ دھار لیا۔

آج کل تو آدمی ٹکے سیر بکتا ہے۔ ڈاکو دن دیہاڑے بینک لوٹ لیتے ہیں۔

"بے چارہ کیشیر تو ویسے بھی مریل سا ہے۔ پستول دیکھ کر کپڑے بھی اتار دے گا۔"

"صاحب نے بینک سے معلوم کیا ہے۔ وہاں سے ساڑھے بارہ بجے نکل آیا تھا۔"

"نہ جانے کس سالے نے اسے کیشیر مقرر کیا تھا۔ ضرور سفارشی ہوگا۔"

"آج کل سفارش کون سنتا ہے، کسی کی مٹھی گرم کی ہوگی۔"

"یوں نہ کہو۔ ابھی اتنی مروت باقی ہے کہ کرسی کرسی کی سفارش سن لیتی ہے۔"

گھڑی کی سوئیاں کولہو کے بیل کی طرح اپنے چکر میں آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ کمرے میں جیسے دھول بھر رہی تھی اور کیشیر کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ ساڑھے تین بجے وسوسوں اور اندیشوں نے محمود و ایاز کو یکجا کر دیا۔ افسر بھی اپنے کمروں سے نکل کر ماتحتوں میں مل گئے۔ کچے راستے پر گرد کی چادر تنتی تو افسر اور ماتحت ایک ساتھ آنکھیں پھاڑ کر اس میں جھانکنے کی کوشش کرتے اور جب کیشیر کی بجائے کوئی اور شخص برآمد ہوتا تو وہ ایک دوسرے کو یوں دیکھتے جس طرح زلزلے کے پہلے جھٹکے پر ہر شخص دوسرے کو سوال بن کے تکتا ہے۔

کیشیر آیا تو بہت سی آوازیں ایک ساتھ حملہ آور ہوگئیں۔ اس کے نام کے ساتھ کچھ گالیاں بھی گھل مل جاتیں مگر محمود کی موجودگی میں ایاز کی زبان کتنی کھل سکتی ہے؟ کیشیر کا تھیلا صحیح سالم دیکھ کر صفیں بکھر گئیں اور افسر کیشیر کو گھور کر اپنے کمروں میں چلے گئے اور ماتحت اس یقین کے ساتھ اپنی اپنی میز کے سامنے ورج ہوگئے کہ آج تنخواہ ضرور بٹے گی —— زندگی کے ایک کبھی واپس نہ آنے والے مہینے کا معاوضہ —— موت کے کنوئیں میں ایک اور ماہ زندہ رہنے کی سبیل!

کیشیر نے نہ تو افسروں کے گھورنے کا نوٹس لیا اور نہ ماتحتوں کی بے چینی کا۔ اس نے گرد جھاڑتے ہوئے ایک ہی جواب دیا۔ "راستے میں گاڑی خراب ہوگئی تھی اسے ٹھیک کرانے میں دیر ہوگئی۔" کیشیر کو تنخواہ کی طاقت اور اہمیت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ شاید اس لئے کہ تنخواہ اس کے تھیلے میں تھی اور تھیلا اس کے ہاتھ میں تھا۔

فہرست میں اس کا نام سب سے نیچے تھا۔ کیشیر نے اس کے دستخط لے کر نوٹ گنے اور اس کی طرف یوں پھینکے جیسے خیرات دے رہا ہو۔ اگر تنخواہ نہ ہوتی تو وہ کاغذ کے یہ نوٹ کیا، سونے کی ڈلی بھی پلٹ کر اس کے منہ پر دے مارتا مگر یہ تو تنخواہ کی رقم تھی، وہ غصے کے ساتھ اپنی اہانت بھی پی گیا۔ کیشیر بھی اب عجلت میں تھا۔ اس نے اپنا موٹر سائیکل سٹارٹ کیا اور یہ جا وہ جا۔ اندھیرا اترتے دیکھ کر شاید وہ بھی پریشان ہوگیا تھا۔ اب تو صرف اس کی اپنی تنخواہ اس کے پاس تھی۔

سردیوں کی شام میں سناٹا رچا بسا ہوتا ہے اور جب شام اور رات ایک ہونے لگیں تو خاموشی کی ہیبت دہلانے لگتی ہے۔ آج تو وہ مزدور بھی جا چکے تھے، جو سیوریج کے لئے نالہ کھودتے اور پائپ بچھاتے تھے۔ آج ان کی بھی تنخواہ کا دن تھا اور وہ مہینے کا خرچ پہنچانے کے لئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ ان کے لئے بھی تو یہ بڑا دن ہے۔ راستے کے آس پاس بڑے بڑے پائپ مگرمچھوں کی طرح منہ پھاڑے پڑے تھے "ہر پائپ میں ایک دو لٹیرے مورچہ بند ہوسکتے ہیں۔" یہ سوچ کر اس نے جھرجھری لی اور ان چور قدموں کی چاپ اونچی ہوگئی، جو اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ اس نے ایک دو بار پلٹ کر دیکھنے کا ارادہ کیا مگر اس کی گردن اپنی جگہ اکڑی رہی، مڑ کر دیکھنے میں رفتار خود بخود سست پڑ جاتی ہے اور اسے تو چور قدموں سے پہلے پکی سڑک پر چڑھنا تھا۔ "ریس میں جیتنا ہے تو یاد رکھو، آگے بھاگتے چلے جاؤ۔ پلٹ کر دیکھو گے تو پتھر کے ہو جاؤ گے، سب سے پیچھے رہ جاؤ گے، کامیابی صرف آگے ہوتی ہے، پیچھے تو صرف کہانیاں ہی کہانیاں رہ جاتی ہیں۔" اسے ڈرل انسٹرکٹر کا لیکچر بہت دنوں بعد یاد آیا تھا۔ وہ قصے کہانیوں کا سخت مخالف تھا۔ جب کبھی اسے بیزاری کا اظہار کرنا ہوتا تو مزور کہتا "چھوڑو یار قصے کہانیاں، کوئی کام کی بھی بات کرو!" اس وقت سچ یہ تھا کہ وہ دوڑ نہیں سکتا تھا۔ اس کی ٹانگوں میں جیسے سیسہ بھر گیا تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ ٹانگوں کا تصور نہیں ہے۔ بھاگنے کے لئے تو دونوں ہاتھوں سے ہوا میں چپو چلانا ہوتا ہے اور اس کے دونوں ہاتھ جیب پر جمے ہوئے ہیں۔

ایک پائپ میں کوئی چیز سرسرائی۔ وہ یوں اچھلا جیسے سانپ پر پاؤں پڑ گیا ہو۔ اچھلا، سمٹا اور پسینے پسینے ہوگیا۔ اسے چند قدم پر بیمار کتے کا سایہ دکھائی دیا۔ وہ اسے ہر روز پائپوں کے آس پاس رینگتے دیکھتا تھا اور پاس پڑوس کے کتے اسے دیکھ کر بھونکتے تو وہ گھٹ کر قریب کے پائپ میں گھس جاتا، مگر آج اس کمزور کتے نے بھی حیران ہو کر دیکھا جیسے سوچ رہا ہو "اچھا تو، ہم سے بھی کوئی ڈر سکتا ہے!" اس نے شاید

انگڑائی لینے کی کوشش بھی کی اور کچھ بھونکا بھی مگر نقاہت کے مارے اس کی بھونک رقیق ہو گئی۔" وہ مجھ پر بھونکا کیسے؟ اسے اتنی جرأت کیسے ہوئی؟ میرے جسم نے ہی چغلی کھائی ہوگی۔" اس نے کہیں پڑھا تھا کہ کتا جب انسان کے جسم سے ابلنے والی خوف کی بو سونگھ لیتا ہے تو شیر ہو جاتا ہے۔ اس نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے سوچا "انسان کا جسم بھی کیا بے حیا چیز ہے۔ کتنا ڈھانپو اور چھپاؤ، پھر بھی اپنے آپ کو ظاہر کرنے سے باز نہیں آتا۔ اور کچھ بن نہیں پڑا تو خوف کی بو اڑا کر اس مار کھانے کی نشانی کو شیر کر دیا۔

"نہ جانے سردیوں میں لوگ کہاں دبک جاتے ہیں۔ نومولود بچوں کی طرح کمبلوں میں لپٹے ہوئے بدن۔ مگر انہیں لپیٹتا کون ہے۔ خیر یہ چند قدم دور تو آبادی ہے۔ اب گھبرانے کی کیا بات ہے؟" اس نے اپنی ہمت بڑھائی اور موڑ کاٹتے ہی رونق جیسے زمین سے اگنے لگی۔ ایک چھوٹے سے ریستوراں میں بچوں کا کورس گونج رہا تھا "میں بھی پاکستان ہوں تو بھی پاکستان ہے۔" بس سٹاپ البتہ ویران تھا۔ بس غالباً ابھی ابھی گذری تھی۔ وہ راستہ بدل کر ایک سینما گھر کے احاطے میں پہنچ گیا جہاں بہت سے لوگ تھے۔ چند لمحوں کی تنہائی نے اسے ہم جنسوں کے لئے کتنا ترسا دیا تھا۔ ٹکٹ کی کھڑکی کے سامنے بندھی ہوئی قطار میں شامل ہو کر اسے بڑا سکون ملا تھا۔ وہ کھڑکی کے سامنے پہنچا تو ذرا ٹھٹکا۔ مگر نیلے شیشے میں سے ٹکٹ کلرک کے نصف چہرے کو گھورتا دیکھ کر اس نے کہا "ایک ٹکٹ" کلرک کا چہرہ تصویر کی طرح ساکت رہا۔ اس نے گھبرا کر بٹوا نکالا، تو ایک سائے نے اس میں گھسنے کی کوشش کی۔ اس نے جلدی سے ایک نوٹ گھسیٹا، بٹوا جیب میں رکھا، اس پر بائیں ہاتھ کا پہرہ بٹھایا، اور دایاں ہاتھ کھڑکی میں ڈال دیا۔ بڑا نوٹ غائب ہو گیا اور ٹکٹ کے ساتھ تین چھوٹے نوٹ اور کچھ ریزگاری لے کر دایاں ہاتھ واپس لوٹا۔

اسے دروازے کے قریب ہی سیٹ مل گئی، اور اس میں وہ کپڑوں کی گٹھڑی کی طرح گر گیا۔ وہ اتنا بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ اس جگہ کیسے اور کیوں آیا ہے؟ ہال کی بتیاں گل ہوئیں اور اسکرین روشن ہوئی تو اس نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ایک سایہ اچانک اس کے اوپر جھکا۔ شاید یہ وہی سایہ تھا جس نے اس کے بٹوے میں گھسنے کی کوشش کی تھی، یا جس کے قدموں کی چاپ اس کا خون خشک کرتی رہی تھی۔ وہ پھر سے تن کر بیٹھ گیا۔ اس نے کوٹ کی جیب پر بائیں ہاتھ کا پہرا سخت کر دیا اور دائیں ہاتھ کی مٹھی بھینچ کر پتلون کی جیب میں بند کر دی۔ پردے پر رنگ رنگ کے سائے کوئی کہانی سنا رہے تھے مگر وہ سوچ رہا تھا کہ جس سائے نے اس کے بٹوے میں گھسنے کی کوشش کی تھی، وہ اس کے پیچھے تھا اسے تو برابر والی سیٹ پر ہونا چاہئے تھا۔ وہ پچھلی قطار میں کیسے پہنچ گیا؟

انٹرول کی بتیاں روشن ہوتے ہی اس نے پلٹ کر دیکھا، پچھلی قطار ایک سرے سے دوسرے سرے تک خالی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو کسی چیز کا ہوتا ہے اور اس نے سایہ خود دیکھا ہے۔ وہ بے یقینی کی حالت میں باہر نکلا۔ پھیپھڑوں میں تازہ ہوا پہنچی تو اسے احساس ہوا کہ خوراک کی تلاش میں اس کا معدہ اپنے آپ کو کھرچ رہا ہے۔ "جب تک فلم ختم ہوگی تنور ٹھنڈا ہو چکا ہوگا۔ دو روٹیوں اور ایک پلیٹ سالن کے خریدار کے لئے اس سردی میں کون سکڑتا ہے؟ اس شہر میں اس کا انتظار کرنے والا ہے بھی کون؟ شکنوں بھرا بستر، میلا سا کمرہ اور ایک آئینہ۔" تنہائی کے احساس نے اس کی بھوک اور چمکا دی۔ بلبلاتی آنتوں نے اس کے قدموں کا رخ خوانچوں کی طرف موڑ دیا۔ مختلف تلی بھنتی چیزوں کی خوشبو سونگھتے ہوئے وہ ایک خوانچے کے سامنے رکا۔ دائیں ہاتھ کی مٹھی میں بند بھیگے ہوئے نوٹ خوانچے والے کے حوالے کئے۔ بائیں ہاتھ سے آلو کی ٹکیاں اور نان لئے اور ایک طرف ہٹ کر دائیں ہاتھ سے نوالے توڑنے لگا۔

نان کا ایک حصہ ابھی اس کے ہاتھ میں تھا کہ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کئی سائے اس کے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ ان میں شاید وہ سایہ بھی تھا جس نے اس کے بٹوے میں گھسنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے پہچاننے کی کوشش کی مگر سائے تو بھوتوں کی طرح گھٹتے بڑھتے اور صورتیں بدلتے رہتے ہیں۔ چہرہ ابھی گول تھا اور ابھی لمبوترا ہو گیا۔ ناک غائب تھی اور پل بھر میں پل کی طرح تن گئی۔ ہاتھ کہیں نہیں تھے اور نکلے تو آندھی میں گھرے

ہوئے درخت کی شاخوں کی طرح اُچھلنے کودنے لگے۔ سایوں کو دیکھتے دیکھتے اُسے اُبکائی آئی۔ اس نے بچا ہوا نان، احتیاط سے ایک کونے میں رکھ دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہال کی طرف بڑھ گیا۔ بے خیالی میں اس نے ایک بار مڑ کر دیکھا تو اس کے نان کے ٹکڑے پر دو بلّیاں جھپٹ رہی تھیں مگر ان کے پنجے ایک دوسرے پر اُٹھے ہوئے تھے!

فلم دوبارہ شروع ہونے میں دیر تھی۔ وہ لابی میں آنے والی فلموں کے تصویری مناظر دیکھنے لگا۔ ایک کوارٹر کی تصویر دیکھتے ہی اُسے خیال آیا کہ آج وہ کرایہ بھی وقت پر ادا نہیں کر سکے گا۔ کچی بستی پر تو سورج ڈوبتے ہی رات ٹوٹ پڑتی ہے۔ اس کے کوارٹر کی بیوہ مالکن بھی سو گئی ہوگی۔ وہ پانچ ماہ سے ایک کوارٹر کے نصف کمرے میں رہ رہا تھا۔ کوارٹر کے دو تہائی حصے میں مالکن کا گھر تھا۔ بڑے کمرے میں ایک اینٹ کی دیوار اُٹھا کر اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ کوارٹر پختہ تھا اور نصف کمرہ اس کی ضرورت کے لئے کافی تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کمرے میں پانی کا نل بھی تھا اور بجلی کا بلب بھی۔ بوڑھی مالکن کی عنایت تھی کہ پیشگی لئے بغیر اسے اپنا کرایہ دار بنا لیا تھا۔ وہ کئی مالکوں کے دروازے کھٹکھٹا کر اس کوارٹر کی مالکن کے سامنے پیش ہوا تھا۔ پہلے تو وہ مالکن کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ اس کے چہرے کی جھریاں سوکھی ندیوں کی طرح تھیں جن کے کنارے پتھر بکھرے ہوئے ہوں مگر دوسرے ہی لمحے اُسے احساس ہوا کہ دکھوں اور پریشانیوں نے اس کے چہرے کو سنگسار اور اُسے عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا کر دیا ہے۔ وہ اگر انکار بھی کر دیتی تو شاید اسے بُرا نہ لگتا۔ مجبوری انسان کو حد سے زیادہ محتاط کر دیتی ہے۔ مگر مالکن کی آنکھوں میں شفقت تھی، اُس نے نظر بھر کر اُسے دیکھا اور کمرے کی چابی اُس کے حوالے کر دی۔ اس کے بعد مالکن کی صورت اس نے کبھی نہیں دیکھی۔ تنخواہ لے کر اپنے کمرے میں جانے کی بجائے وہ پہلے مالکن کے دروازے پر دستک دیتا۔ ہر مرتبہ مالکن کی بیٹی دروازہ کھولتی۔ وہ شاید دروازے سے لگ کر کرائے کا انتظار کر رہی ہوتی۔ دروازے کی اوٹ سے وہ مسکرا کر پوچھتی "بابو صاحب! کرایہ دینے آئے ہیں؟" ہر بار اُس کا ایک ہی جواب ہوتا "جی ہاں"۔ وہ کواڑ چھوڑ دیتی اور اُس کے سفید بازو کی سُرخ ہتھیلی اُس کے سامنے پھیل جاتی۔ وہ روپے گن کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ دونوں کے ہاتھ ذرا سے چھوتے مگر چھونے کی حرکت لڑکی کا ہاتھ کرتا۔ نوٹ جھپٹ لینے کی بے تابی میں یا اس کا ہاتھ چھونے کی خاطر؟ وہ یہ سوال ابھی تک حل نہیں کر سکا تھا۔ دروازہ بند ہونے سے پہلے وہ چور نظروں سے لڑکی کو دیکھتا۔ وہ نوٹ گنتے وقت اپنے نچلے ہونٹ کے کونے کو دانتوں سے سہلاتی رہتی۔ اس کی نوٹ شماری کا منظر اس کے ذہن میں اور اس کے ہاتھ کا لمس اس کے جسم میں کئی دن گردش کرتا رہتا مگر کرایہ وصول کرنے کے بعد لڑکی بھی اُسی طرح غائب ہو جاتی جس طرح اس کی ماں۔ مہینہ بھر اس کی صورت نظر نہ آتی۔ زیادہ سے زیادہ کبھی کبھار ماں بیٹی کی مدھم سی گفتگو دیوار میں سے چھن کر اس کے کانوں تک پہنچتی مگر لفظوں کو پکڑنے کی کوشش میں وہ ہمیشہ ناکام رہتا۔ ایک دو مرتبہ اس نے دیوار سے کان لگا کر ان کی باتیں سمجھنا چاہیں تو اُسے یوں لگا جیسے اس کے کان بڑے ہو گئے ہیں اور اگر اس نے یہ کوشش جاری رکھی تو وہ ہاتھی کے کانوں کے برابر ہو جائیں گے۔ یوں بھی یہ کوئی اچھی حرکت نہیں تھی کہ کسی کے گھر کی باتیں چرائی جائیں اور وہ بھی اپنے ہی لوگوں کے گھر کی!

فلم کا دوسرا حصہ شروع ہونے کی گھنٹی بجی تو وہ ہال میں اپنی نشست پر جم کر بیٹھ گیا۔ اس کا بایاں ہاتھ چپ چاپ کوٹ کی جیب پر پہرا دے رہا تھا مگر دایاں ہاتھ سارے نوٹ خرچ کرنے کے بعد عجیب مضحکہ خیز حرکتیں کر رہا تھا۔ اس نے بچی کھچی ریزگاری دائیں مٹھی میں بند کر دی اور یکسوئی سے فلم دیکھنے لگا۔ ہال کی بتیاں روشن ہونے سے پہلے اس نے پوری کہانی ڈھونڈ لی تھی۔ وہ اس احساس کے ساتھ باہر نکلا کہ اس نے فلم کے دونوں حصے دیکھے ہیں۔ اب نہ کوئی سایہ اس کے تعاقب میں تھا اور نہ چور قدموں کی کوئی چاپ! دو نوالے پیٹ میں کیا گئے، خوف کافور ہو گیا۔ "بھوک بھی کیا چیز ہے، دم بھر میں آدمی کو بدل کر رکھ دیتی ہے!" اس نے بس شاپ کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا۔ ہو سکتا ہے تنہائی کے احساس نے اُسے پژمردہ کر دیا ہو۔ لوگوں میں آ کر اس کی طبیعت آخر سنبھل ہی گئی تھی۔ تنہا آدمی بھی پیپل کے زرد پتے کی طرح ہوتا ہے جو گلاب کے

ہرے بھرے پودے کے کانٹوں میں اُلجھ کر سوکھ رہا ہو۔ ہوا کا ہر جھونکا اُسے زخمی کرتا رہتا ہے۔ وہ اُسی جھونکے سے ڈرتا ہے جس سے مست ہو کر گلاب کا پودا جھومتا ہے۔

بس سٹاپ پر منتظر مسافروں میں مل کر اس کے خیال کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ بس آئی تو اس کا منہ مینڈک کے دہانے کی طرح کھلا اور اس نے سارے مچھر جھپٹ لیے۔ ان میں وہ بھی شامل تھا۔ اس نے دائیں ہتھیلی سے ریز گاری کھرچ کر کنڈکٹر کے حوالے کی اور کھڑکی کے بجتے ہوئے شیشے میں سے دوڑتی ہوئی سڑک، چلتے ہوئے درخت اور رینگتے ہوئے مکان دیکھنے لگا۔ پوری بس بول رہی تھی۔ انجن اور باڈی سے لے کر مسافروں تک! مگر اس کے ذہن کی رفتار بس سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ وہ اپنے خیال کی لہروں پر دوڑا چلا جا رہا تھا بہت دور! لیکن ابھی کسی منزل پر نہیں پہنچا تھا کہ کنڈکٹر نے کچی بستی کا نام لے کر اُسے چونکا دیا۔

بس آگے بڑھ گئی تو اس نے سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر اجنبی نظروں سے بستی کو دیکھا، چاند اس کے عین مقابل چمک رہا تھا۔ بستی نشیب میں تھی اور چاندنی میں ڈوبے ہوئے مکان دریا کی لہروں کی طرح بے ترتیبی سے اُبھر اور پھیل رہے تھے۔ اُسے یہ نظارہ اچھا لگا۔ اس کا جی چاہا کہ خیالوں کی اُسی لہر پر تھوڑی دیر چہل قدمی کرے جو بس سے بھی آگے نکل گئی تھی مگر تنخواہ کا بوجھ اس کے قدم روک رہا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ بڑی مستعدی سے جیب پر پہرا دے رہا تھا۔ وہ سڑک سے اُتر کر بستی میں داخل ہوا، اور نیم روشن گلیوں میں ٹھوکر کھائے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

مالکن کے دروازے کے قریب پہنچا تو اندر جانی پہچانی آواز گونجی "امی بابو صاحب آ گئے ہیں"۔ اس جملے نے اس کے قدموں کے ساتھ اس کی روح کو بھی تھام لیا۔ وہ دن میں پہلی بار مسکرایا ——— کوئی ایسا بھی ہے، جو اس کے قدموں کی چاپ پہچانتا ہے اور اتنی رات گئے تک اس کا انتظار کر سکتا ہے ——— "بابو صاحب! امی بہت پریشان تھیں۔ آج آپ بہت دیر سے آئے"۔ مالکن کی لڑکی دروازے سے لگ کر کھڑی تھی وہ محسوس کر سکتا تھا کہ اس کی آواز میں سے اطمینان بوند بوند بن کر ٹپک رہا ہے۔ اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا "آج دفتر میں کام بہت زیادہ تھا" نہ جانے وہ کیوں جھوٹ بولا تھا۔ حالانکہ اس آواز نے اس کی دن بھر کی تھکن اور ساری شام کی کوفت دور کر دی تھی۔ وہ ہلکا پھلکا ہو گیا تھا اور پہروں باتیں کر سکتا تھا۔ مگر وہ ایک شریف نوجوان تھا۔ اس وقت بیوہ مالکن کی جوان بیٹی سے کیسے مخاطب ہو سکتا تھا۔ اس نے دروازے کی چٹخنی اُترنے کی آواز بھی سنی مگر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ صرف اتنا ہی سوچ سکتا تھا کہ ابھی کُل ستر اسی روپے ہی جمع ہوئے ہیں اتنی رقم میں ماں کو شہر بلا کر رشتے کی بات بھی نہیں چھیڑی جا سکتی!

کمرے کا دروازہ کھولا تو چاندنی اس کے سائے کے ساتھ اندر گھس گئی۔ اس نے سوئچ آن کر کے کمرے کو روشن کیا۔ دروازہ بند کر کے احتیاطاً سے چٹخنی چڑھائی اور کنڈے میں تالا لٹکا کر لمبا سانس لیا۔ بستر پر بیٹھ کر زمین پر پاؤں پھیلا دیئے۔ بٹوا نکالا اور روپے گننے لگا۔ پورے دس کم تھے۔ اس نے حیران ہو کر ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر دائیں ہاتھ کو گھورا۔ اس کی ہتھیلی پر سے ریز گاری کے نشان بھی مٹ چکے تھے۔ تھوڑی دیر اسے گھورتا رہا پھر اسی کے بازو کے زور سے ہاتھ کو چارپائی کے پائے پر مار کر چیخا "کم بخت چور کہیں کا"!

فاروق خالد کا نیا ناول

اپنی دُعاؤں کے اسیر

(زیر طبع)

گجر

خالدہ حسین

وہ گھر عجب تھے۔

بنانے والوں نے انھیں عجب ڈھنگ سے بنایا۔ سڑکوں سڑکوں سیدھے راستے سے جاؤ تو ان گھروں کے صدر دروازے ایک دوسرے سے بڑے بڑے فاصلوں پر تھے مگر عقب میں پھیلے کشادہ صحنوں کی سمت سے دور دراز کی سڑکوں پر بنے مکانوں کی سرحدیں ایک دوسرے میں پیوست ہوتی چلی جاتیں۔ اس طرح کہ ایک گھر کی دیواریں دوسرے چار گھروں سے جا ملتیں۔ اور پھر ان چار گھروں کی دیواریں دوسرے چار چار گھروں سے باہم ہوتیں اور پھر یہ سلسلہ پھیلتا چلا جاتا۔

وہ کوارٹروں کی کچی چھت پر کھڑے ہو کر دیکھتی تو دور تک گھروں کی دیواریں ایک دوسرے میں اترتی وہ چوکور خانوں والا کھیل بناتی چلی جاتیں جو وہ اسکول میں سب کے ساتھ مل کر کھیلتی۔ خانے بنانے کا کھیل۔ ایک بساط کے اوپر محض نقطے ہی نقطے پھیلے ہوتے۔ پھر کھیلنے والے اپنی اپنی باری پر ان نقطوں کو سیدھی لکیروں سے ملاتے۔ یہاں تک کہ چار دیواریاں بنتی چلی جاتیں اور رفتہ رفتہ الگ الگ نقطے ختم ہوتے چلے جاتے۔ لکیریں وجود میں آتیں پھر لکیریں چار دیواریاں بن جاتیں، باہم پیوست اور ان میں کھیلنے والا اپنا نام یا نشان بھرتا چلا جاتا۔ جو کوئی بھی تین لکیروں کے ساتھ چوتھی لکیر کھینچ کر ایک احاطہ بنا لیتا، خانہ اسی کا ہوتا۔ اور پھر جس کے نام کے خانے زیادہ ہوتے وہ جیت جاتا۔ اور آخر میں وہ خالی چوکور خانوں اور ان میں بھرے ناموں کا ایک گنجان نقشہ بن جاتی۔

تو جب وہ کوارٹروں کی چھت پر چڑھ کر دیکھتی تو اُسے حیرت ہوتی کہ خاموش سڑکوں کے دو رویہ پھیلے یہ سب کے سب گھر اپنے صدر دروازوں کے راستے ایک دوسرے سے کس قدر دور مگر صحنوں کے راستے کتنے نزدیک ہیں کہ ایک کی دیوار دوسرے میں پیوست ہوتی ہے۔ اور ایک کی آوازیں دوسرے کے احاطے میں وارد ہوتی پھیلتی، جذب ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہ گھر بھی شاید پہلے خالی بساط پر پھیلے نقطے تھے۔ پھر کھیلنے والوں نے بیٹھ کر ان نقطوں کو ملا کے دیواریں اور پھر چار دیواریاں کھینچیں۔ اور ہر ایک خانے میں اپنا اپنا نام بھر دیا پھر جس کے خانے سب سے زیادہ ہو گئے وہ جیت گیا۔ اور پھر یہ بساط اسی طرح زمین پر دھری کی دھری رہ گئی اور زمین میں جڑیں پکڑ گئی۔ برگد کے اس درخت کی طرح جو اس کے دروازے پر پھیلتے پھیلتے اب برابر والوں کے صحن میں جھانکتا تھا اور جس کی جٹا دھاری جڑیں ان کے کچے صحن کی مٹی تک جا پہنچی تھیں۔

چھٹی کے روز اماں کی گرفت سے بچنے کا تیر بہدف نسخہ یہی تھا کہ دھوپ نکلتے ہی ڈرائیور کی بیوی کے پاس جا بیٹھو جو سویرے سویرے اپنے کواٹر کو موٹی تیلیوں کے جھاڑو سے صاف کرتی۔ اس کے پھرتیلے ہاتھ سرخ اینٹوں کی ریکھوں میں سے مٹی نکال نکال کر سمیٹتے چلے جاتے۔ دایاں ہاتھ تھک جاتا تو جھاڑو اسی مہارت کے ساتھ بائیں میں چلی جاتی۔ کبھی ایک آدھ تیلی ٹوٹ کر موٹھ سے نکل جاتی تو بڑے انہماک سے اس تیلی کو موٹھ کی گرفت میں ڈال دیتی۔

پھر سمیٹ کر وہ کاغذ پر ڈالتی اور احاطے کی دیوار سے باہر ڈال دیتی۔ اب وہ گوری مٹی اور بھوسی ملے لیپ کی کنالی دائیں ہاتھ کے پنجے پر اٹھاتی اور بائیں ہاتھ سے بانس کی سیڑھی کے ڈانڈے پکڑ کر اوپر چڑھتی چلی جاتی۔ اب اُسے اُس کے پاؤں کی مہارت پر حیرت ہوتی جو پتلے پتلے ڈانڈوں پر عین بیچوں بیچ مضبوطی کے ساتھ جمتے چلے جاتے اور پل کی پل میں وہ اوپر بنا منڈیروں کی چھت پر ہوتی وہ اس کے پیچھے دونوں ہاتھوں سے ڈانڈے تھام تھام کر لڑکھڑاتے پاؤں کے ساتھ آخری سیڑھی تک پہنچتی۔ اور اب چھت پر قدم رکھتے ہوئے اس کا دل دھڑ دھڑ کرتا گلے میں آن پھنستا۔ کھلی بنا منڈیروں کی چھت پر تنِ تنہا کھڑا ہوا ایک عجیب تجربہ تھا۔ آسمان ایک دم اتنا قریب آ جا۔ درختوں کی ٹہنیاں ہاتھ بھر کے فاصلے پر اُسے گھورے چلی جاتیں۔ جاندار آنکھوں کی طرح۔ دور دور تک، دائیں بائیں آگے پیچھے پھیلے رنگ برنگ مکانوں کے صحن۔ اور صحن کی جانب کھلنے والے بند کمروں کے بند دروازے۔ اور گھروں کی نچی آوازیں۔ سب کچھ اس کے روبرو ہوتا اور وہ چار نقطوں سے بننے والے چوکور خانوں سے باہر ہوتی جس میں خود اس کا اپنا نام بھرا ہوتا۔ وہ خانہ بہت نیچے بہت دور رہ جاتا۔ اور اس کی خوشبوئیں اور آوازیں اور صحن میں کھلنے والے بند دروازے بھی دوسرے گھروں ایسے ہوتے۔ اور اسے اس بات پر بہت اچنبھا ہوتا کہ کس طرح دور اور سامنے کی چیزیں بالکل ایک سی نظر آ سکتی ہیں۔

چھت پر پہلا قدم رکھتے ہی چنبیلی کی مہک اُسے آ لیتی اور یہ مہک ایسی تھی کہ اُسے بڑی اماں کا وہ چہرہ یاد آ جاتا جو ساکت — بالکل ساکت سفید کورے کپڑے میں سے جھانکتا تھا اور زرد اور ساکت چہرے کی پیشانی پر ایک رگ نیلی سی ابھی تک اُبھری تھی۔ اور بڑے ابا لوگوں کے ہجوم میں چنبیلی، موتیا اور گلاب سے بھرے اس پلنگ کے سرہانے کھڑے کہتے تھے " زینب میں نے تجھے بخشا۔ بخشا۔ بخشا۔ جتنی خدمت تو نے میری کی ہے، کوئی نہیں کر سکتا۔ کوئی نہیں۔" اور اس وقت بھی اُسے حیرت ہوئی تھی کہ اتنے ہجوم، اتنی آوازوں، ہنگامے اور حرکت میں وہ چہرہ اتنا ساکت کیوں کر رہ سکتا ہے یا یہ کہ اتنے ساکت چہرے کے گرد اتنی آوازیں۔ اتنا ہنگامہ۔ اتنی حرکت کیوں کر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ ساکت چہرہ اور متحرک آوازیں اور ہنگامہ اور اس کے ساتھ پھولوں کی مہک وقت بے وقت اُسے گھیر لیتیں۔

چھت پر آتے ہی پارسی کے گھر کی سرخ دیواروں کی جانب سے یہ مہک لپکتی۔ ایک سرخ دیوار وہ گیٹ سے شروع ہو کر گوار ٹر کے ساتھ آن ملتی۔ اس کی چھت سے بس قدم بھر نیچے۔ کہ انسان بڑی آسانی سے نیچے اتر سکتا تھا۔ یہ دیوار خاصی چوڑی تھی۔ اکثر سنسان دوپہروں میں ڈرائیور کے بچے اس پر دوڑتے پھرتے اور وہ سوچتی رہ جاتی کہ اس دیوار پر اترے اور ان کے پیچھے پیچھے دوڑتی جائے آخری سرے تک۔ جہاں دیوار لوہے کے بڑے گیٹ کے ساتھ جا ملتی ہے۔ اور وہ لمبی کشادہ سڑک، صاف ستھری کولتار سے چمکتی پڑی دھوپ میں ستاتی ہے۔ اور اس کی دوسری جانب وہ پولیس والوں کا لال قلعہ کھڑا ہے جس کے لوہے کے بہت بڑے بھاری دروازے کے اندر ایک انجانی دنیا پھیلی ہے۔ اور باہر ہر دم باوردی سپاہی بندوقیں تھامے پہرے پر کھڑے رہتے ہیں۔ اور قلعہ کی اونچی دیواریں دوسری جانب جا کر نہ معلوم کس سڑک کس عمارت سے جا ملتی ہیں۔

یہ عجیب بات تھی کہ تب ہر دیوار کسی اور دیوار کے ساتھ جا ملتی تھی اور دیواروں دیواروں چل کر جانا چاہیں تو ہر گھر، ہر مکان، ہر عمارت تک رسائی ہو سکتی تھی مگر دروازوں کے راستے تو کہیں بھی پہنچ نہ سکتے تھے۔ دروازوں کے سامنے جا کر اجازت لینا پڑتی ہے جبکہ دیواریں اور منڈیریں کھلی ہیں۔

اس گھر میں دو طرح کی چھتیں تھیں۔ ایک دو منزل در منزل چھت جو گھر کے کمروں کے اوپر بنی تھی اور ایک پختہ زینہ اوپر کو جاتا تھا۔ یہ وہ چھت تھی جو عام طور پر بڑے، چھوٹے بھیا اور امّی کے قبضے میں رہتی۔ خاص طور پر سردیوں کی دھوپ بھری چمکتی دوپہروں میں جب امّی رنگ برنگی پتنگیں اُڑاتا اور پھر اس کے دوست بھی آن دھمکتے۔

اس کے دوستوں کا عجب عالم تھا۔ سامنے کے گھر میں اپنی چھت پر چڑھتے انتہائی نامناسب انگریزی میں آوازے لگاتے اور پتنگیں اڑاتے رہتے اور پھر کچھ دیر میں مانجا پتنگیں سنبھالے آن وارد ہوتے۔ چھٹیوں میں دن دن بھر پتنگیں اُڑتیں۔ آسمان رنگ برنگ، ہزار صورت پتنگوں سے اَٹ جاتا۔ یہاں تک کہ چیل کوّوں کا اندازہ بھی مشکل ہو جاتا۔

بسنت پر باجی بسنتی دوپٹے رنگتیں اور ان کے لمبے بالوں والی دوست کانوں میں چاندی کی بڑی بڑی بالیاں پہنے، بسنتی دوپٹہ اوڑھے، سائیکل پر سوار ٹن ٹن گھنٹی بجاتی آن پہنچتی۔ جبکہ وہ ڈرائیور کی بیوی کے ساتھ کوارٹروں کی چھت پر چڑھی للچاتی نظروں سے گوری مٹی اور بھوسی کے لیپ بھری کنالی کو دیکھتی رہتی جس میں ہاتھ بھر بھر کے ڈرائیور کی بیوی تمام چھت پر لیپ کرتی ـــ اتنی ہی نفاست کے ساتھ جتنی کہ تصویر میں رنگ بھرتے ہوئے باجی کے برش میں ہوتی۔ اور دوسری چھت سے اِمّتی اور اس کے ساتھی دیوانہ وار چلاتے۔

"ہائی بو۔ ہائی بو کاٹا" اور پتنگیں کٹ کٹ کر، ڈولتی، سوئی سوئی رفتار میں، سمت سے بے خبر، نہ معلوم کہاں کہاں گرنے کو نیچے ہی نیچے آنے لگتیں اور سڑکوں پر لڑکے ننگے پاؤں اونچے اونچے بانس اور کانٹے دار جھاڑ لئے بھاگتے پھرتے۔

اِمّتی ہیپ کیپ پہنے اتنی سنجیدگی کے ساتھ پیچ لڑاتا کہ وہ اس کے قریب مانجھے کی چرخی پکڑے پکڑے دم سادھ لیتی۔ پہلے تو اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا کہ کن دو پتنگوں کے آپس میں پیچ پڑے ہیں، جبکہ باقی سب اس کارروائی پر رواں تبصرہ دے رہے ہوتے۔

"ڈھیل دو۔ ڈھیل دو۔ یار، مانجھا چھوڑو۔" اِمّتی کی انگلی پر سے کھسر کھسر ڈور کھسکتی۔ بہتی چلی جاتی اور اس کے ہاتھ میں پکڑی چرخی خالی ہونے لگتی۔

"ارے اس کی موت آئی ہے۔" امّتی کا دوست رائے جوشوا دانت بھینچ کر کہتا۔ کیونکہ ایک تیسری پتنگ بھی اس بیچ میں آن پڑتی اور ایسی حرکت اکثر بوگن بیلا سے ڈھکی دیو، ردل والی پیلی کوٹھی کی سمت سے ہوتی۔ رائے اپنی ٹوپی جھجّا آنکھوں پر گرا کر اس کی سمت گھورتا "ارے وہی ہے۔ وہی۔ جگی"

وہ غور سے دیکھنے کی کوشش کرتی۔ سرخ سوئٹر پر بڑی نفاست کے ساتھ کانوں کے دونوں جانب کسی کسی چوٹیاں بندھی ہوتیں۔ "ابے جگجیت۔ بلی کھائیں گا" رائے جوشوا زور سے پکارتا۔ اور اُدھر سے ڈور کی ڈھیل زیادہ ہو جاتی۔ اسے معلوم ہوتا کہ کچھ دیر میں اِدھر سے سب دہاڑیں گے "ہائی بو کاٹا۔ بو کاٹا" اور سامنے کی چھت سے جگّی اپنی بالشت پر ڈور لپیٹتا، آسمان کو تکتا آہستگی سے نیچے اتر جائے گا۔ جب کہ رائے جوشوا اس کو جاتے دیکھ کر پھر پکارے گا۔ "ابے جگجیت بلی کھائیں گا۔"

اس فقرے کی تاریخ اور حوالے سے وہ قطعی بے خبر تھی۔ مگر اتنی بات طے تھی کہ اس پر دوسری جانب سے کوئی شدید قسم کا ردعمل ہوتا۔ کبھی کبھار کوئی چھوٹا موٹا پتھر چھت تک آتے آتے راستے ہی میں رہ جاتا۔

جب سامنے کی چھت سے جگّی اپنی دونوں نفیس چوٹیوں سمیت سر جھکائے تنہا نیچے اتر جاتا تو وہ اس کی تنہائی پر حیران ہونے لگتی وہ چھت پر ہمیشہ اکیلا ہی آتا۔ یہاں تک کہ کوئی اس کو نیچے صحن میں سے بار بار پکارتا تک نہ تھا۔ سردی کی ان دوپہروں میں ایک گھر کی آوازیں نہایت آسانی سے دوسرے صحن اور چھت پر آ جاتی تھیں۔ اپنے گھر میں تو اماں لگاتار آوازیں لگاتی رہتیں۔

"تجی۔ او تجی کے بچے۔ رنگ کالا چوانتی ہو گیا۔ بس کر۔ مت خوار ہو دھوپ میں۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

اُدھر سے رائے جوشوا کے گھر سے اس کی گوری۔ سنہری آنکھوں اور بالوں والی ممی اپنی لہکتی آواز میں پکار لگاتی تھی۔ "روفی۔ ڈوفی۔ رائے۔"

جبکہ سامنے گلی کے پار والے گھر میں ایک دم مرغیاں جی توڑ کے کٹ کٹ کٹاک کرتی چلی جاتیں۔ ایسے میں اکثر بے تحاشا گھنے

درختوں اور طرح طرح کی بیلوں سے ڈھکے گھر میں سے چھوٹی سی کالی گاڑی نکلتی۔ وہ باوجود کوشش کے آج تک ٹھیک سے دیکھ نہ پائی تھی کہ اگلی سیٹ پر جو لوگ بیٹھتے تھے ان کی شکل و شباہت تفصیلاً کیا ہے۔ مگر بڑے بھیا اس گاڑی کو دیکھ کر ایک دم دانت پیسنے لگتے۔ اور باجی بھی کھانے کے کمرے میں دروازے کی جالی کے ساتھ ناک چپکا دیتیں۔

گاڑی کے نکلتے ہی بیگم سراج کا کھچڑی بالوں بھرا سر باڑ کے اوپر سے نمودار ہوتا۔ وہ بالا دُزا اور بیٹی کوٹ پہنے ہاتھ میں چمکتا تھال لیے مرغیوں کو دانہ ڈالنے لگتیں۔ اور تیز دھوپ کے رخ۔ باجی اور بھیا کے ساتھ ساتھ وہ بھی دیکھتی کہ ان کا پیٹی کوٹ انتہائی نامناسب ہلکے رنگ اور باریک کپڑے کا ہے۔ باجی بہت کم اپنی ہنسی روکتی تھیں جبکہ وہ اکثر اپنی ہنسی اور آنسو دونوں نہایت صفائی کے ساتھ پی جاتی تھی۔

کولتار سے تپتی سڑک کے پار لال قلعہ میں گجر بجتا۔ رات دن چوبیس گھنٹے یہ گجر بجتا رہتا۔ ہر ہر گھنٹے کے بعد۔ اُسے بڑی حیرت ہوتی کہ بھلا رات گئے جب سب سو جاتے ہیں۔ کون گجر بجاتا ہوگا۔ پھر وہ سوچتی آج رات بھر جاگ کر یہ سارے کے سارے گجر سُنے گی مگر پھر نہ معلوم کب نیند آگھیرتی اور صبح گلی کی نکڑ پر اسکول بس میں سوار ہوتے ہوئے وہ دیکھتی کہ قلعہ کے باہر دو سپاہی اسی طرح مستعد بندوقیں کاندھے پر دھرے پہرہ دے رہے ہیں۔ ادھ کھلے گیٹ سے اس کو ایک جانب سیاہ رنگ کی کوٹھری نما چوکی بنی نظر آتی۔ گجر یہاں لٹکا ہے۔ پیتل کا بہت بڑا چمکتا سورج۔ جو گھپ اندھیری راتوں اور سنسان دوپہر اور اکیلی صبحوں میں بھی بجنا نہیں بھولتا۔ پل پل۔ دم دم۔ کوئی سنے نہ سنے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اُسے ڈھونڈتی مگر بس آگے نکل جاتی اور قلعہ بہت پیچھے رہ جاتا۔

بس میں بیٹھے بیٹھے وہ اندازہ لگاتی کہ کونسا گیٹ کس گھر کا ہو سکتا ہے۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ وہ اردگرد پھیلے گھروں کو اندر سے جانتی تھی۔ مگر ان گھروں کے دروازے کوشش پر بھی نہ پہچان پائی تھی۔ نہ معلوم کونسا دروازہ کس گھر تک لے جاتا تھا۔

اس دوپہر بھی وہ کوارٹر کی چھت پر مٹی کا لیپ دیکھنے میں مصروف تھی کہ بیگم سراج کے گھر سے عجب چیخ پکار اُٹھی۔ اب بن بانس کی سیڑھی سے اترنا کچھ ایسا سیدھا کام بھی نہیں تھا۔ بالآخر جب وہ اپنے گیٹ تک پہنچی تو بیگم سراج کی بیٹی نسیم سلوٹوں بھری ریشمی ساڑی میں ننگے پاؤں بھاگی چلی آتی تھیں اور ڈرائیور چپل گھسیٹتا اپنے کمرے سے نکل رہا تھا۔

"خدا کے لئے جلدی کرو۔ یہ لو چابی۔" ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"مگر بی بی، ہسپتال تک پہنچا کر چلا آؤں گا۔ آپ جانیں یہ پولیس کیس۔ میں غریب ملازم آدمی ہوں۔ خواہ مخواہ۔"

"ہاں۔ ہاں۔" وہ بھاگی بھاگی اندر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر چھوٹی کالی گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا اور پچھلی سیٹ پر نسیم سراج کسی کا سر گود میں رکھے، اپنے خوبصورت ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپے ہوئے تھیں۔

"بہت اچھا ہوا۔" بھیا بہت مطمئن تھے۔ اگلے روز وہ باجی کو اخبار میں سے خبر پڑھ کر سنا رہے تھے۔ "ویر بھان۔ مس سراج کی خواب گاہ میں زخمی حالت میں پائے گئے۔ قاتل فرار۔"

اس نے حیران ہو کر گھنے درختوں میں چھپی اس کوٹھی کی طرف دیکھا۔ بیگم سراج روز کی طرح چمکتا تھال لئے مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھیں اور دھوپ کے رُخ ان کے پیٹی کوٹ کا رنگ۔

اس نے پلٹ کر پیلی کوٹھی کو دیکھا۔ چھت پر جگی اکیلا کھڑا پتنگ بڑھا رہا تھا۔ اس کی دو نفیس چٹیاں کانوں پر لٹکی جھولتی تھیں اور اونچے گلے کا فیروزی سوئیٹر تیز دھوپ میں چمکتا تھا۔ لال قلعہ میں کسی گھنٹے کا گجر بج رہا تھا۔ اس نے گننا شروع کیا مگر آدھ بیچ میں بھول گئی۔

کیونکہ اسی وقت سامان اور سواریوں سے لدا ایک تانگہ گیٹ پر آن رکا تھا۔ لوہے کے بڑے بڑے کالے صندوق اور موٹے موٹے بستر بند اور تانبے کے دیگچوں کے اندر تہہ در تہہ دھرے دیگچے۔ اور حقہ اور گنتوں کے گٹھے۔ ڈرائیور لپک لپک کر سامان اتروا رہا

تھا۔ وہ ابا تانگے کے برابر کھڑے تھے۔ پھر سواریاں اُتر کر برآمدے کی طرف بڑھ گئیں۔

ابا کی ماسی جی کے کنبے کو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ماسٹر جی کا رنگ بے حد سرخ اور سفید اور ڈاڑھی بھی سفید تھی۔ اور وہ سُڑکے مار مار کے چائے پیتے تھے۔ جبکہ ماسی جی کھانا کھاتے ہوئے ہر نوالے پر ناک سکیڑتی تھیں اور ان کا تیل چپڑے بالوں والا بیٹا رزاق ہر وقت گنّے چوس چوس کر چھلکے صحن میں پھیلاتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار وہ بانس کی سیڑھی سے چھت پر آجاتا اور ادھر اُدھر پتھر ڈھونڈتا پھرتا کہ سامنے پارسی کے گھر میں آڑو کے پیڑ پر مارے۔ اس کے پاس سے دہی کی عجب کھٹی سی بو آتی تھی اور گلے میں کالے ڈورے والا سونے کا تعویذ چپکا رہتا تھا جو وہ نہانے میں بھی نہیں اتارتا تھا۔ اور یہ اُسے اس طرح معلوم تھا کہ اس کے نہانے کا طریقہ انتہائی نامناسب تھا۔ ماسی جی اُسے غسل خانے کی بجائے برآمدے کے کنارے دھوپ میں ایک چوکی پر بٹھا دیتیں اور گرم پانی کی بالٹی قریب رکھ کے ڈونگے کے ساتھ اس پر پانی ڈالے جاتیں جبکہ اس نے نہایت ناکافی جانگیہ پہن رکھا ہوتا۔ اور سُو سُو کرکے اچھل اچھل کر نہاتا۔ صابن کا جھاگ بہہ بہہ کر صحن میں نشیب کے رُخ چلا جاتا اور آخر کیاری میں جا گرتا جبکہ اماں اُسے بے شمار مرتبہ کیاری میں وہ صابن بھرا پانی گرانے پر مار چکی تھیں جس سے وہ چلتے پھرتے بلبلے بنایا کرتی تھی۔

ماسی جی کے آتے ہی ان کے لئے گھر کی تلاش شروع ہو گئی۔ وہ اپنے پیچھے بے شمار جائداد چھوڑ کر آئی تھیں اور آس پاس کی بڑی بڑی کوٹھیاں ان کی آنکھوں میں نہ جچتی تھیں۔

اب سردی کم ہو چکی تھی بسنت کب کا گذر چکا تھا۔ بسنت پالا اڑنت۔ بڑے ابا ہر سال سردیوں کو یہی کہہ کر رخصت کرتے تھے تین چار مرتبہ ہولیں بھون کر کھائی جا چکی تھیں کبھی کوئی اکا دکا پتنگ آسمان پر دکھائی دے جاتی تھی۔ رائے جوشوا اور راہتی آج کل کیرم کھیلتے تھے اور ایک مدت سے جگّی رنگ برنگ سویٹر پہنے چھت پر نظر نہ آیا تھا۔

بڑے ابا ماسٹر جی سے کلانور کی جائداد کی تفصیلات، اور قرآنی آیات اور حدیث سننے میں مصروف رہتے جبکہ ماسٹر جی چائے کے دوران پہلے سے زیادہ سُڑکے مارنے لگے تھے اور ان سب کے جواب میں بڑے ابا کی بس ایک لمبی ہوں ہوتی۔

رزاق دیواروں پر نہایت تیزی کے ساتھ دوڑتا تھا اور پارسی کی کوٹھی میں لگنے والے آڑو نہایت صفائی کے ساتھ گراتا تھا۔ اس کے باوجود اُسے اس بات پر حیرت تھی کہ اس نے ہزار کوشش پر بھی تین کا پہاڑہ یاد کر کے نہ دیا جبکہ وہ ماسی جی کی حسب ہدایت صحن کی مٹی میں انگلیوں سے لکھ لکھ کر کھیل ہی کھیل میں اس کو حساب پڑھانے کی جان توڑ کوشش کرتی رہی جو اسے خود بھی نہ آتا تھا۔

ایک دوپہر وہ بانس کی سیڑھی بغیر ہاتھ لگائے دگڑ دگڑ چڑھ کر اوپر آیا۔ وہ پہلے سے چھت پر کھڑی، پارسی کے گھر میں راہداری پر بنے وہ عجیب و غریب رنگین نقش دیکھ رہی تھی جو اکثر موسم بدلنے پر صبح سویرے آنکھ کھلتے ہی وہاں پر بنے نظر آتے۔

"آج پھر ان کا دن ہے" ڈرائیور کی بیوی ان نقشوں کو دیکھ کر، دانتوں میں چاندی کا خلال کرتے ہوئے کہتی۔

رزاق تاک تاک کر ان رنگین خاکوں پر پتھر مار رہا تھا اور دھوپ میں اس کا تیل چپڑا سر خوب چمک رہا تھا۔ اچانک اس نے ہاتھ روک لیا اور غور سے بیلوں ڈھکی پیلی کوٹھی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"وہ گھر خالی ہے۔ چلو دیکھ کر آئیں۔"

"خالی۔؟" وہ ایک دم ساکت رہ گئی۔ "مجھے راستہ معلوم نہیں اور پھر ابا ڈانٹیں گے۔" بالآخر اس نے جواب دیا۔

"اوپر اوپر سے چلتے ہیں۔ دیکھو۔ یہ دیوار وہاں تک جاتی ہے۔" وہ بلی کی طرح برابر والی دیوار پر کود گیا۔ وہ کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر آہستہ سے دیوار پر اتر گئی۔

دیواریں ایک دوسرے کے ساتھ مل مل کر چوکور نقشے بنا رہی تھیں۔ ایک احاطہ ختم نہ ہونے پاتا کہ دوسرا شروع ہو جاتا۔ رزاق دیواریں

پھلانگتا پہلی کوٹھی کی چھت پر پہنچ چکا تھا۔ وہ دھڑ دھڑ دھڑکتے دل کے ساتھ اس چھت پر اتری۔

خلافِ معمول یہ چھت پکے سیمنٹ کی تھی۔ اِدھر اُدھر چھوٹے چھوٹے پتھر پڑے تھے۔ ایک جانب لوہے کی ٹوٹی کرسی پر مٹی کے پیالے میں پانی پڑا تھا جو سوکھ سوکھ کر تلے تک آ گیا تھا۔ دائیں ہاتھ کو زینہ نیچے جاتا تھا۔

رزاق نیچے برآمدے میں پہنچ کر اب کمروں کے چکر کاٹ رہا تھا۔ تمام دروازے کھلے تھے۔ جالی کے دروازوں کے اسپرنگ ٹوٹ چکے تھے اور وہ ادھ کھلی حالت میں تھے جبکہ تیز ہواؤں کے ساتھ خشک پتے اُڑ اُڑ کے اندر آ رہے تھے۔

خالی کمروں کی ساکت کھڑکیوں میں جالی کے سفید مٹی بھرے پردے لٹکتے تھے۔ ذرا سا پاؤں رگڑنے پر کمروں کے سرخ پتھر کے فرش چمکتے نظر آنے لگے۔ فرش کے بیچوں بیچ گول دائروں میں طرح طرح کے رنگین خاکے بنے تھے۔ بہت سے زاویے اور قوسیں ایک دوسرے کو کاٹتی ایک دوسرے میں اترتی پل پل شکلیں بدلتی تھیں۔ وہ دیر تک ان شکلیں بدلتی لکیروں کو دیکھتی رہی۔ ہر بار ایک نئی صورت اُبھرتی اور غائب ہو جاتی۔ جو نقش جس طرح ایک بار نظر آتا دوبارہ نہ آتا۔ وہ اپنی آنکھیں ملتی گئی۔ اس دائرے نے اس کی نظریں جکڑ لی تھیں۔ جیسے خواب میں آدمی ایک جگہ جڑ پکڑ لے۔ اس نے بمشکل اس قوس بھرے دائرے سے نگاہ چھڑائی۔ شاید رزاق جا چکا تھا۔ سارے میں سوندھی مٹی اور صندل کی خوشبو پھیلی تھی۔ باہر نکلنے کا راستہ کہاں تھا۔ اس نے چاروں سمت دیکھا، وہ بھول چکی تھی کہ کس سمت سے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگنے لگیں۔ اچانک اس نے کھڑکی کے دھندلے شیشے سے باہر دیکھا۔ سامنے بڑا گیٹ سڑک پر نکلتا تھا۔ اس نے اندازہ کرنا چاہا وہ کونسی گلی، کیا سڑک تھی۔ مگر ایک دروازے سے نکلتے ہی وہ ایک اور کمرے میں پہنچ گئی۔ اس دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اندر بہت اندھیرا تھا۔ تھوڑی دیر میں اس نے آنکھیں جھپک کر دیکھا۔ ہلکی ہلکی لکیریں ابھرنے لگیں۔ بند کھڑکیوں میں جالے جھول رہے تھے اور دیواروں پر مکڑیاں چل رہی تھیں۔ کھڑکی کے قریب ایک کرسی پڑی تھی۔ مٹی کی تہیں جم جم کر اس کی شکل تبدیل ہو چکی تھی۔ پھر اس نے غور سے دیکھا کرسی کی نشست کے ساتھ ساتھ ایک پتنگ کے خطوط اُبھرے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹٹولا۔ نرم مٹی تلے بسنتی رنگ کی پتنگ اور اس پر ڈور کی بالشت بھی دھری تھی۔ یکایک اس کے ہاتھ پر سرسراہٹ ہوئی۔ ایک مکڑی اپنی ٹانگیں پھیلائے کلائی پر رینگتی جا رہی تھی۔ ہڑبڑا کر اس نے ہاتھ جھٹکا اور دروازے کی طرف بھاگی۔

مگر جس دروازے سے وہ داخل ہوئی تھی وہ وہاں نہ تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا کرسی پر بڑی اماں کا ساکت زرد چہرہ کھلا تھا۔ اس نے لرز کر پلکیں جھپکیں۔ پتنگ کی کمان کرسی کی نشست کے ساتھ چپک گئی۔ سامنے ایک اور دروازہ تھا۔ وہ لپک کر بڑھی۔ مگر یہ تو شاید غسلخانہ تھا۔ نل سے ٹپ ٹپ، قطرہ قطرہ پانی بہہ رہا تھا۔ نجانے کب سے کر نیچے پڑا ٹب لبریز ہو چکا تھا اور پانی کناروں سے باہر پھسل رہا تھا۔ بیسن کے اوپر مٹی کی خاکی تہہ جمی تھی۔ اس نے انگلی کے ساتھ دیوار میں لگے آئینہ پر لکیر کھینچی

مگر اچانک اس کی نظر سامنے پڑی ایک چیز پر رک گئی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ مٹی میں اٹی گہرے سرخ رنگ کی کنگھی! اس نے اٹھانے کو ہاتھ بڑھایا مگر ٹھٹھک گئی۔ کنگھی میں تازہ بال اُلجھے تھے۔

ہول کر وہ واپس جانے کو گھومی۔ وہ کس رُخ، کس دروازے سے آئی تھی۔ اس نے سوچنا چاہا مگر سامنے کمرے ہی کمرے پھیلے تھے۔ اور دروازے کہ ایک کمرے سے دوسرے میں لے جا کر — پھر اسی جگہ پر پہنچا دیتے تھے۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دور بڑا گیٹ سڑک پر نکلتا تھا مگر اس میں بہت بڑا زنگ آلود تالا پڑا تھا۔ اور تیز ہوائیں خشک ٹہنیوں سے زرد پتے اُڑا اُڑا کے لئے جا رہی تھیں اور قلعہ کا گجر کوئی گھنٹہ بجا رہا تھا۔ اس نے گننا چاہا مگر ادھ بیچ میں بھول گئی۔

رائب

محمد منشا یاد

اسے یاد نہیں کہ پہلی بار اس کے دل میں اس سوال نے کب پر پھڑپھڑائے کہ وہ ـــــ اصل میں وہ نہیں کوئی اور ہے۔ شاید ماں باپ کی سرد مہریوں نے آہستہ آہستہ اُسے اس جان لیوا سوال کی بھٹی میں جھونکا یا شاید اپنے ہم عمروں کو اپنے اپنے والدین کے لاڈ پیار کی پینگیں جھولتے اور محبتیں ہنڈاتے دیکھ کر اس کے اندر محرومی کا کوئی سوما پھوٹا ـــــ لیکن اسے یاد پڑتا ہے کہ بچپن میں پڑوس والی مائی حمیداں سے جو کہانی اس نے ایک بار سُنی تھی شاید وہ اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئی ہے۔ اس کہانی میں ایک عورت اور بچے کا ذکر تھا۔ عورت صبح سویرے کھیتوں کی طرف جا رہی تھی کہ اس نے نہر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر ایک نوزائیدہ بے لباس بچے کو دیکھا جو گھاس پر بے حس و حرکت پڑا تھا اور اسے چیونٹے کھا رہے تھے۔ اس نے چھو کر دیکھا تو وہ زندہ تھا مگر اس قدر نحیف کہ چیونٹوں کے کاٹنے کی تکلیف پر اس کے منہ سے رونے کی آواز تک نہیں نکل رہی تھی، نہ ہی وہ حرکت کرنے کی سکت تھی۔ وہ کچھ دیر اسے خوف، حیرت اور پریشانی سے دیکھتی رہی پھر اسے اٹھا کر گھر لے آئی۔ گھر میں اس نے کبوتر، مرغیاں اور خرگوش پال رکھے تھے، وہ اسے بھی پالنے لگی۔

اس نے مائی حمیداں سے کئی بار دریافت کیا کہ پھر کیا ہوا مگر وہ کہتی کہ کہانی اتنی ہی تھی اور اگر اور تھی بھی تو اسے یاد نہیں تھی۔

جب اس نے ذرا ہوش سنبھالا تو اپنے گھر کے حالات دیکھ کر اُسے خود ہی خیال آیا کہ کہانی میں جس بچے کا ذکر تھا وہ بچہ وہ خود ہے اور وہ عورت اس کی ماں تھی۔ اگر ایسا تھا تو اس کی ماں، اس کی اصلی ماں نہیں تھی اور وہ، وہ نہیں تھا۔ پھر کون تھا؟ اس سوال کے آگے برسوں لمبی چپ اور تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور اگرچہ اسے اس سوال کا جواب کبھی نہ مل سکا تاہم اس کے اندر ایک تجسس موجود رہا اور وہ چپکے چپکے اپنے اور اپنے والدین کی اصلیت کے بارے میں ٹوہ لگاتا رہا۔

پھر جب اسے پتہ چلا کہ وہ تین چار برس کا تھا تو اس کے والدین کسی دوسری جگہ سے آکر اس گاؤں میں آباد ہوئے تھے تو اسے بالکل یقین ہو گیا کہ وہ اُس کے اصلی ماں باپ نہیں تھے۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ اسے پتہ چل سکے کہ وہ کہاں سے اور کن حالات میں ہجرت کر کے آئے تھے۔ مگر وہ کسی کو ٹھیک طرح سے نہیں بتاتے تھے۔

پھر جب اس کا باپ باؤلے کتے کے کاٹنے کی وجہ سے باؤلا ہو گیا اور گاؤں والوں نے اسے اس کے گھر کے اندر ستون سے باندھ دیا، اور وہ تماشائی لوگوں کو گالیاں دیتا اور رسیاں تڑوا کر ان پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا تو اس کے دل میں امید کا جگنو چمکا کہ شاید اب وہ اس کے اصلی ماں باپ کا نام اور پتہ بھی بتا دے مگر وہ اُسے حرامی کہنے پر اکتفا کرتا۔

پھر جب اس کا باپ ستون سے ٹکریں مار مار کر اور رسیوں سے الجھ الجھ کر مر گیا تو اس کے ذہن میں امید کا ایک اور پھول کھلا کہ شاید گالیاں بکتی، کوسنے دیتی ماں کسی وقت غصے میں آکر اس کے اصلی ماں باپ یا اگر وہ حرامی تھا تو اس کے اصلی ماں باپ کا نام بتا دے گی مگر وہ کئی برسوں تک یونہی بکتی جھکتی رہی اور ایک بخار یا غصے میں بھنکتی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ تاہم اب بھی وہ ناامید نہیں ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اڑوس پڑوس اور گاؤں

کے دوسرے لوگ جو شاید اس کے جھگڑالو ماں باپ کی وجہ سے اب تک خاموش تھے اب اُسے ضرور بتا دیں گے کہ وہ اُسے کہاں اور کیسے اٹھا لائے تھے اور اصل میں وہ کس گھر کا چراغ تھا۔ مگر اسے یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ ماں کے چالیسویں کے بعد بھی کسی نے اُسے اس قسم کی کوئی اطلاع فراہم نہ کی۔ بلکہ اس کے بے سہارا ہو جانے پر اظہارِ ہمدردی کرنے لگے۔ ہاں چودھرانی کا رویّہ اور بہتر ہو گیا۔

وہ اور اُس کی ماں حویلی میں کام کرتے تھے۔ اس کا باپ ہمیشہ سے بیمار اور بیکار تھا اور زیادہ تر وقت چارپائی پر پڑا اونگھتا رہتا تھا۔ لوگوں سے کم ملتا تھا۔ لوگ بھی اس سے ملنے سے کتراتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ نشہ کرتا ہے۔ کیا پتہ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہوں۔

چودھرانی کی خواہش تھی کہ وہ بھی گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتا رہے مگر چودھری نے اسے مویشی چرانے پر مامور کر دیا——— اور اس کا سارا وقت چراگاہ میں گزر جاتا۔ ماں حویلی میں کام کر کے جلد گھر پہنچ جاتی مگر وہ چراگاہ سے مویشی لانے اور حویلی میں کھانا کھانے کے بعد چراغ جلے گھر پہنچتا——— اور ماں باپ کے باہمی جھگڑوں اور لڑائیوں سے بے نیاز ہو کر رات بسر کر کے صبح سویرے ایک ساتھ ناشتہ کرنے اور کھانا کھانے کیلئے حویلی کا رخ کرتا۔ اپنے گھر میں اس کی حیثیت مسجد میں رات بسر کر کے اپنی راہ لینے والے مسافر کی تھی۔

جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اس نے اپنے گھر آنے اور رات بسر کرنے کا سلسلہ کم کر دیا۔ ویسے بھی وہ اتنا تھکا ماندہ ہوتا کہ کھانا کھانے کے بعد اس کے لئے گاؤں کے دوسرے سرے پر واقع اپنے گھر تک چل کر جانے کی ہمت نہ ہوتی۔ کئی بار وہ اپنے گھر کے قریب آ کر ماں باپ کے باہم لڑنے کی آوازیں سن کر پلٹ جاتا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ وہ ان سے ہر وقت آپس میں لڑنے کی وجہ دریافت کرے مگر اسے ہمت نہ ہوئی۔ اس کا باپ مسلسل بیمار رہ کر بہت کمزور ہو چکا تھا مگر جب کبھی اس کی پٹائی کرنے پر آتا تو اس میں پتہ نہیں اتنا زور کہاں سے آ جاتا تھا اور ماں لڑائی جھگڑے کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ بعض اوقات سوتے میں بھی کسی نہ کسی کو گالیاں اور بددعائیں دیتی رہتی۔

اُسے ماں باپ کے مرنے کا کچھ زیادہ افسوس نہیں تھا۔ وہ زندہ رہتے تو کیا ہو جاتا؟ ہاں ماں آخری دنوں میں اس کے بیاہ کا ذکر لے بیٹھتی تھی۔ اگر کچھ عرصہ اور زندہ رہتی تو کوئی اپنے جیسی عورت اس کے پلے باندھ دیتی اور وہ بھی اپنے باپ کی طرح اس سے لڑتا جھگڑتا رہتا اور کسی دن باؤلا ہو کر گھر کے ستون سے ٹکریں مارتے مارتے مر جاتا۔

اسے اپنے باپ پر ترس ضرور آتا تھا لیکن اس خیال سے اُسے اطمینان ہو جاتا کہ مر کر اس کی جان بہت سی پریشانیوں اور جھگڑوں سے چھوٹ گئی تھی۔

وہ رُوح اور جسم کے تعلق کے بارے میں باریک باتیں نہیں جانتا تھا اور اس سلسلے میں اس کی معلومات وہی تھیں جو اس کی مرحومہ ماں کی تھیں یا پھر گاؤں کی مسجد کے امام سے جو باتیں وقتاً فوقتاً اس نے لاؤڈ سپیکر پر سنی تھیں۔ تاہم اس نے بہت سی باتیں از خود سوچ لی تھیں بلکہ طے کر لی تھیں۔ مثلاً اسے معلوم تھا کہ بعض لوگ جو بظاہر بُرے اور حقیر نظر آتے تھے (جیسے وہ خود تھا) اندر سے بہت اچھے تھے اور بعض اچھے نظر آنے والے لوگ اندر سے مکروہ تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ بعض اچھے جسموں میں بُری اور بعض بُرے جسموں میں اچھی روحیں قید ہو گئی تھیں۔ اسے شک تھا کہ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی گھپلا ہوا تھا۔ کیا پتہ اس کی رُوح چودھری کے لڑکے کے ساتھ بدل گئی ہو جیسے ایک دفعہ مسجد میں اس کی جوتیاں رحمو نائی کی جوتیوں سے تبدیل ہو گئی تھیں۔ وہ ایسی باتیں اکثر سوچتا اور جس قدر سوچتا اس کا شک اور پختہ ہونے لگتا۔ ویسے بھی سرخ و سفید اور بھرے بھرے جسم والی چودھرانی اتنی اچھی اور خوبصورت تھی کہ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ ماں کہنے کو جی چاہنے لگتا۔ بعض اوقات اُسے لگتا جیسے اس نے پیدا ہونے سے پہلے بھی اسے دیکھا ہو اور اُس کے بطن سے جنم لینے کی خواہش کی ہو۔

حویلی میں دو وقت کا کھانا کھانے سے اس کے شبہ کو اور تقویت پہنچتی۔ اس نے سُنا تھا کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔ چونکہ یہ حویلی اصل میں اس کا اپنا گھر تھی اس لئے خدا نے اسے یہاں ملازمت دلوا کر اس کے حصے کی چوگ فراہم کرنے کی صورت پیدا کر دی تھی۔

اور وہ، جسے وہ اپنا بیٹا سمجھتے تھے، اس کے حصے میں شہر کا دانہ پانی تھا۔

ماں باپ کے مرنے کے بعد اس نے اپنے گھر آنا جانا تقریباً ترک کر دیا تھا۔ چند پرانے صندوقوں، برتنوں، میلے کچیلے بستروں کے سوا وہاں رکھا بھی کیا تھا جس کی حفاظت کرنے کی ضرورت ہو ـــــ اور پھر حویلی تو دراصل اس کا وہ گھر تھی جہاں اسے پیدا ہونا چاہیے تھا ـــــ اسے اس کے در و دیوار سے ویسے ہی محبت تھی جیسی اپنے گھر سے ہوتی ہے اور اگرچہ چودھرانی نہیں جانتی تھی کہ وہ اصل میں اس کی ماں ہے لیکن وہ اسے کسی نہ کسی بہانے زیادہ سے زیادہ وقت اپنے پاس روکے رکھتی تھی۔ کبھی چارپائیوں کی ادوائنیں کھینچنے، کبھی چودھری کے حقے کی چلم تازہ کرنے اور کبھی یونہی ادھر کی چیزیں اٹھا کر ادھر رکھنے کے بہانے ـــــ خود کو مصروف رکھنے اور گھر میں زیادہ دیر ٹکنے کے لئے وہ خود بھی کئی کام نکال لیتا۔ چودھرانی جب کبھی اسے بیٹا کہہ کر پکارتی تو وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا کہ کس طرح وہ غلط گھر میں پیدا ہونے کے باوجود وہ اپنے اصل والدین اور اپنے اصلی گھر میں مزے سے رہتا ہے۔

کئی بار اس کے جی میں آئی کہ وہ چودھرانی کو بتا دے کہ وہ اس کا اصلی بیٹا ہے اور وہ جو شہر میں پڑھتا ہے دراصل غریب میاں بیوی کا بیٹا ہے جو شاید اس کی جدائی کی وجہ سے ناخوش رہتے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے اور اسی اندرونی دکھ کی وجہ سے گھل گھل کر مر گئے۔ مگر پھر اسے خوف آتا۔ اگر چودھرانی نے اس کی بات پر یقین نہ کیا تو وہ اسے اپنے بیٹے کا دشمن اور حاسد سمجھنے لگے گی۔ کیا پتہ گھر سے ہی نکال دے۔

جہاں تک چودھری کا تعلق تھا وہ اس پر مہربان ضرور تھا شاید اس کے کام کاج کی وجہ سے ـــــ مگر اس کا مزاج بدلتے دیر نہیں لگتی تھی اور اسے ہر بات میں مین میخ نکالنے اور جرح کرنے کی عادت تھی۔ اس کے پاس اپنی ثابت کرنے کے لئے کوئی ثبوت موجود نہیں تھا۔ یہ مسئلہ کو محسوس کرنے اور یقین کرنے کا تھا اور چودھری ان دیکھی باتوں پر آسانی سے یقین کرنے کا قائل نہیں تھا۔

ایک روز اسے نہایت دور کی سوجھی۔ کیا معلوم چودھری سے شادی کرنے سے پہلے چودھرانی اپنے میکے میں اس کی ماں بن گئی ہو؟ اور بدنامی کے خوف سے اس نے خود یا اپنے آشنا کے ذریعے اسے کہیں دور پھنکوا دیا ہو جہاں وہ اس عورت کے ہاتھ لگ گیا جس نے کبوتروں، مرغیوں اور خرگوشوں کے ساتھ ساتھ اس کی بھی پرورش کی۔ اس نئی سوچ سے اس ادھوری کہانی کی بہت سی گمشدہ کڑیاں بھی خود بخود مل گئیں جو اس نے بچپن میں سنی تھی۔ چودھرانی کو چند سال بعد جب معلوم ہوا ہو گا کہ وہ زندہ اور سلامت ہے تو اس کی سوئی ہوئی ممتا جاگ اٹھی ہو گی اور اس نے کسی نہ کسی طرح ان غریب میاں بیوی کو اپنے پاس بلا لیا ہو گا تاکہ اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھ سکے۔

اپنے اس مفروضے کو حقیقت سمجھ لینے کے بعد اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ اب وہ چودھرانی سے نفرت کرے یا محبت۔ اس کی نظروں کے سامنے رہ کر اس کی ممتا کو ٹھنڈک پہنچاتا رہے یا اسے جدائی کا دکھ دے کر اپنی محرومیوں کا انتقام لے۔ کبھی کبھی اسے اپنے ان دیکھے باپ کا خیال آتا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ اسے مل جائے تو وہ اس کے سینے سے لگ جائے گا یا اسے قتل کر دے گا۔

ایک بار اس نے یہ بھی سوچا کہ وہ چودھرانی کے قانونی بیٹے کو ٹھکانے لگا دے اور اس کے تڑپنے کا تماشا دیکھے۔ ہاں۔ چودھرانی اگر ہمت سے کام لے اور اسے سب کچھ سچ سچ بتا دے تو وہ اسے معاف کر سکتا ہے۔ مگر اسے یقین تھا کہ وہ کچھ نہیں بتائے گی۔ وہ اپنا بنتا بستا گھر، ٹھاٹ باٹھ کی زندگی اور اپنے قانونی بیٹے کا مستقبل کیسے داؤ پر لگا سکتی تھی۔ یہ معمہ اسے خود ہی حل کرنا ہو گا اور اس کے لئے اسے چودھرانی کے میکے کے گاؤں جانا ہو گا۔ اور وہاں کچھ عرصہ رہ کر گڑے مردے اکھاڑنا ہوں گے۔

اس نے طے کر لیا کہ وہ اس بزدل اور گنہگار عورت کی چاکری چھوڑ دے گا اور یہاں سے چلا جائے گا اور جب تک اسے تمام حالات ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں ہو جاتے واپس نہیں آئے گا۔

پھر ایک صبح اس نے حویلی کی چاکری کا طوق گلے سے اتار پھینکا۔ اس نے اپنے حصے کا کھانا حویلی کے کتوں میں تقسیم کر دیا، اور بغیر کسی کو بتلائے گاؤں سے نکل آیا۔

کوئی ایک کوس دور جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا اور حیران ہوا۔

حویلی کا ایک پلا اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اتنا چھوٹا اور کمزور سا پلا اس کے پیچھے اتنی دور تک چلا آیا تھا۔ اسے عجیب مسرت آمیز حیرت ہوئی۔ وہ تھکا تھکا سا چلا آ رہا تھا۔ ایک ٹیلے پر بیٹھ کر وہ اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔

پلے نے اپنی فاختائی دم ہلاتے ہوئے اس کے پاؤں چاٹے تو اسے عجیب سی لذت کا احساس ہوا ___ اس نے بڑھ کر اسے اُٹھا لیا اور اُس کے جسم پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر اسے نیچے رکھ کر اور اس کا منہ گاؤں کی طرف کر کے بولا "مجھے بہت دور جانا ہے۔ تم میرا ساتھ نہ دے سکو گے واپس چلے جاؤ۔" پلے نے جواب میں اس کی پنڈلی سے اپنی تھوتھنی رگڑ دی۔ پھر اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا کرے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا کہ آتی بار وہ صدر دروازہ اچھی طرح سے بند کر کے نہیں آیا تھا۔ اس چھوٹے سے پلے کو دھوپ اور سفر میں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا اور وہ واپس جانے پر رضامند نہیں تھا۔ ویسے بھی اس کا سلامتی سے واپس پہنچ جانا نہایت مشکل تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

آخر وہ کون سی بات تھی جس کی وجہ سے پلا اپنی ماں کی محبت چھوڑ کر اس کے پیچھے چلا آیا تھا؟ یہی نا کہ وہ اُسے روٹی ڈالتا تھا۔

اچانک اسے ایسا لگا جیسے اس کے ذہن کے اندھیرے میں بجلی سی کوندی ہو۔

پلے کی ماں سے اسے اپنی ماں اور پھر باپ یاد آیا۔ جب وہ چھوٹا تھا ماں اور باپ دونوں اسے اپنے اپنے پاس سلانے کے لئے اصرار کرتے۔ اکثر وہ ایک کے پاس سو جاتا تو دوسرا اُسے سوتے میں اُٹھا کر اپنے پاس لے جاتا۔ اگر کبھی وہ بیمار پڑ جاتا تو ماں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے اور اس کا بیمار باپ اپنی بیماری کو بھول کر حکیم کی دکان کے چکر لگاتا۔ اسے یاد آیا وہ حویلی سے رات گئے لوٹتا تھا تو اس کا باپ اس پر برس پڑتا تھا ___ شاید وہ اس کے انتظار کی گھڑیاں گن گن کر تھک گیا ہوتا تھا۔

اُسے زندگی میں پہلی بار اپنے ماں باپ کی شفقتیں اور محبتیں بھی یاد آئیں۔ پلے نے جیسے اس کے اندر لگے کسی بٹن کو چھو لیا تھا کہ آپ ہی آپ اس کے اندر روشنی ہوتی چلی گئی اور اس نے ان بہت سی باتوں کی طرح جو اس نے بیس برسوں میں خود ہی سوچ ڈالی تھیں ایک بات اور سوچی کہ حویلی اور اس کے راتب کی غلامی نے اس کے دل میں اپنوں کے بارے میں شکوک پیدا کئے اور اس سے سارا اعتماد چھین لیا اور وہ اپنی جڑوں کو بھول کر راتب ڈالنے والوں کے سامنے دم ہلانے لگا تھا۔

مُکتی

نشاط فاطمہ

چشمے کے شفاف پانی میں وہ جھک کر دیکھتا رہا۔ اس کا دل امن کا متلاشی تھا۔ تب آپ ہی آپ یہ الفاظ اس کے لبوں سے نکلتے رہے جیسے وہ خود نہ بول رہا ہو بلکہ الفاظ خود ہی ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھ رہے ہوں: "امن اس دکھ میں ہے جو جدائی سے وجود میں آتا ہے اس پھول میں ہے جو ذرا سی گرمی سے کملا جاتا ہے۔ بچے کی اس مسکراہٹ میں ہے جو سنِ بلوغت میں قدم رکھتے ہی غائب ہو جاتی ہے۔ ان نغموں میں ہے جو سنجیدگی اور خاموشی میں سُنے جاتے ہیں۔ تنہائی اور قناعت میں ہے۔ سردیوں کی خوبصورت نیم گرم سنہری دوپہروں میں ہے جن میں گھر کے دالانوں اور آنگنوں میں ننھے بچے کھیلتے ہیں۔ بوڑھیاں گپ شپ کرتی ہیں اور باورچی خانے میں سبزیاں جھونکی جاتی ہیں۔ امن پھولوں کی کیاریوں میں جہاں مالی نے ابھی پانی دیا تھا کہ اس میں سے اٹھتی ہوئی مٹی کی تازی تازی سوندھی خوشبو میں چمیلی کی اس جھاڑی تلے جہاں گھر کی مرغی سب سے چھپ کر انڈا دیتی ہے۔ انسان جو ازل سے بدقسمت ہے اس کی تلاش میں سرگرداں ہے اور یہ نہیں جانتا کہ وہ اس سے ہر دم بہت قریب ہے۔ انسان جو قدرت کی طرح فراخ اور وسیع ہے، وہ مادیت سے اُٹھے ہوئے معمولی تنازعوں کی بنا پر اسے کھو دیتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ مادیت اور زر کا دکھاوا ہر تنازعہ کی جڑ ہے۔ یہاں خدا اور انسان کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ خدا اسی طرح بلند و بالا اور عظیم تر رہتا ہے۔ انسان سکڑ کر بہت چھوٹا اور بہت ہی چھوٹا رہ جاتا ہے۔ خدا مسکراتا ہے اور اسے بلند ترین استھان سے بہت نیچے کیڑے مکوڑوں کی طرح زمین کے ذرے ذرے کے لیے لڑتا جھگڑتا دیکھتا رہتا ہے:

مگر شمس العارفین نے سوچا "امن اگر کہیں ہے تو کرۂ ارض کے اس ٹکڑے پر جہاں وہ پیدا ہوا۔ میری مکتی میرے وطن میں ہے!"

اس کی زندگی امید و بیم ہنگاموں اور خطرات میں اس طرح ڈولتی رہی کہ جیسے دریائے کرنافلی میں ننھا سا سمپان ڈولتا چلا جائے۔ اسے وہ سب یاد آنے لگا جب بہت چھوٹی چھوٹی باتیں اہمیت رکھتی تھیں۔ اب کسی بات کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی بڑے ہو کر معلوم ہوا کہ سب نری بکواس اور دھوکا دھڑی تھی —— زندگی کی کھال خار دار تھی جدھر انگلی لگاؤ ایک تیز نوکیلا کانٹا چبھ جاتا تھا اور جب تو کانٹے چبھتے ہی رہتے تھے۔ وہ دکھلائی بھی دیتے تھے اور نکل بھی جاتے تھے۔ یہ نہ دکھلائی دیتے نہ نکلتے۔

کلکتے میں قتلِ عام ہوا۔ خون کے ندی نالے بہہ گئے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں جو اندھیاروں کی طرح کالی تھیں۔ بڑی اچھی اچھی باتیں اسکول میں اور گھر میں سکھلائی جاتیں۔ سب پر سے اعتقاد اُٹھ گیا تھا۔

پردیس میں اس رات پہلی بار اسے نجانے کیا کیا یاد آتا رہا۔ سکول، دوست، گاؤں اور کلکتہ میں اپنا گھر، اور گھر میں دادا جان کی لمبی چوڑی لائبریری جس میں بیٹھ کر وہ بڑی بڑی باتیں کرتے۔ اس وقت وہ سوچا کرتا، جب وہ بڑا ہوگا تو یہ کتابیں پڑھنا شروع کرے گا اور دادا جان کی طرح بڑی بڑی باتیں کرے گا۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس، لیگ آف نیشنز، سائمن کمیشن، مسٹر کرپس، مسلم لیگ، زمینوں اور ان پر لگی ہوئی فصلوں کی باتیں پٹ سن کے نرخ اور سب سے بڑھ کر کہ دادا جان جج تھے۔ قانون کی باتیں ان کے کتب خانے میں بسی ہوئی اعلیٰ ترین تمباکو کی خوشبو اور اس

چمڑے کی مانوس مہک جو اس میں بچھے ہوئے صوفے پر چڑھا تھا، وہ سب بھی ذہن میں محفوظ تھی۔ اکثر اسے یہ خیال بڑا پریشان کرتا رہا کہ ان کتابوں کا کیا ہوا ہوگا۔ شکر کہ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کی آیا کی اینگلو انڈین بہو ازابل نے ردی کے طور پر ترازو میں تول تول کر شیکسپیئر اور برنارڈ شا کو بیچ دیا تھا۔

وہاں کلکتے میں اس کے گھر میں بھی امن تھا۔ اس سارے منظر میں بڑا راحت بخش سکون تھا۔ گھر کے کمرے بڑے بڑے اور ٹھنڈے تھے۔ جن کی بہت اونچی منقش چھتیں تھیں اور ان کے فرشوں پر دبیز قالین بچھے تھے۔ باہر دور تک ڈرائیو کے ساتھ باغ لہلہا رہا تھا مگر پھر جانے کیسے اس سارے منظر پر خون آلود گرد چڑھ گئی جیسے کوئی آندھی چلی ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس وقت کا حسن غائب ہو گیا۔ زندگی کی اپنی رفتار تھی اپنا نغمہ تھا جس پر وہ بہہ رہی تھی جیسے کسی نے یکلخت تان پورہ چھپا دیا ہو۔ اسے خیال آیا جگن جب باغ میں پودے لگاتا تو بڑی احتیاط برتتا۔ جب پودا سوکھ جاتا تو وہ بڑے رنج سے سر ہلاتا۔ وہ کہتا ”جڑ بٹھانا بڑا مشکل کام ہوتا ہے بابو۔ مگر جب چاہو جڑ اکھاڑ لو۔“ شاید جگن اب بھی ایسا ہی کرتا ہو۔ شاید کسی نے اس کے پودوں کی جڑیں اکھاڑ دی ہوں اور باغ اجڑ گیا ہو۔ شاید جگن مایوس ہو کر چلا گیا ہو——

وہ سیدھا سیدھا لیٹا سوچتا رہا۔

کلکتہ سے جب وہ لوگ ڈھاکہ آئے تو دادا جان کو میلا میں رہنے لگے۔ یہاں ان کی پہلے سے تھوڑی سی جائداد تھی اور اب یہاں فرصت تھی مگر اس فرصت سے وہ پژمردہ سے ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کی وہ شخصیت جو اُن کی لائبریری میں ہوا کرتی تھی یا جب وہ اپنے کسی ساتھی کے ساتھ پیچھے ہاتھ باندھ کر باغ میں گرے (GREY) یا فاختائی سوٹ پہن کر جس کے کاج میں گلاب کی ادھ کھلی کلی یا کارنیشن سجا ہوتا ٹہلتے ہوئے کتنے شاندار لگتے۔ وہ شخصیت یہاں کو میلا میں غائب ہو گئی تھی۔ یہاں تو اپنے کاٹج ہاؤس میں چارخانے کی تہبند باندھے وہ محض ایک بوڑھے رہ گئے تھے۔ یہ شخصیت اس شخصیت سے بالکل مختلف تھی۔

کیا شخصیتیں ایک خاص ماحول میں بنتی ہیں۔ اس نے حیرت سے سوچا تھا۔ وہ تمام لوگ جو اُن سے ان کی لائبریری میں بیٹھ کر بڑی بڑی باتیں کرتے ان میں سے کچھ مر گئے تھے، اکثر بچھڑ گئے تھے۔ انکل برنارڈ جو عرف عام میں کمشنر صاحب کہلاتے تھے اور جن کی مونچھیں سرخ تھیں، سنا تھا کہ لندن میں سخت تنہائی اور بیزاری کی زندگی گزار رہے تھے۔ اگر کوئی اتفاق سے مل جاتا تو وہ بیئر کے ایک مگ اور تاج محل اور شالیمار کے ذکر پر اکتفا کرتے ایسا لگتا تھا وقت جیسے چکی کا ایک تیز رفتار پہیہ ہو۔ ایک جگ بیت گیا اسی مشرقی بنگال میں وہ ایک دبلے لڑکے سے ایک بھاری بھرکم مرد بن گیا۔ یہیں اس کی ملاقات نیلم سے ہوئی۔

”نیلم“ یہ لفظ بڑا جانا پہچانا اور مانوس تھا۔ یہ لفظ آج بھی زندہ تھا اور اپنی حیات جاوداں کے باوجود کھو گیا تھا اس نے مسکرا کے سوچا ”اس وقت وہ کہاں ہوگی؟“

اماں نے عفیفہ بانو سے اس کی شادی ٹھہرائی اور اس نے سر جھکا کے کر لی۔ پل پل وقت گزرتا رہا۔ یہاں بھی تھک کر زندگی نے اپنا ایک ڈھب اختیار کر لیا۔ اس کا بھی اپنا ایک نغمہ اور اپنا سلسلہ تھا جس کا بظاہر پچھلی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

دادا جان کی دنیا بہت دور تھی لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ اپنی قدامت کے باوجود ان کی دنیا نہایت مضبوط تھی۔ اتنی مضبوط جتنی ان کے کھانے کے کمرے میں بچھی ہوئی مہوگنی کی میز تھی۔ اسے دیکھ کر پائیداری کا احساس ہوتا تھا۔ دادا جان کی دنیا دراصل اس کی دنیا کی بنیاد تھی۔ اس میں وہ اپنی حفاظت محسوس کرتا تھا اور یہ اسے یہاں لندن آ کے معلوم ہوا۔ یہیں ڈھاکہ میں نورالعین پھپو کی شادی سعداللہ افغانی سے ہوئی۔ ان معاملات میں دادا جان بہت لبرل تھے۔ اور جب وہ لوگ ان کے پاس ایک بار افغانستان گئے تو اس وقت دادا جان فوت ہو چکے تھے۔ کابل بڑی خاموش اور پرسکون جگہ تھی خیبر ریسٹوراں میں خوب گہما گہمی رہتی۔ طرح طرح کے ٹورسٹ بھرے رہتے۔ دنیا جہاں کا مال آ کر بکتا۔ دکانیں باہر کے سامان سے

پنی بڑی ہوتیں خصوصیت سے باہر کے صابنوں کا بڑا رواج تھا۔ دادی جان کو اس بات پر بڑی حیرت تھی کہ گھر میں کام کاج کرنے والی عورتیں بھی خانم کہلاتیں لمبی لمبی مخمل کی بوسیدہ فراکیں پہنے ہوتیں اور سر ریشمی رومالوں سے ڈھانپے رہتیں، اور اس پر سونے پر سہاگہ کہ فر فر فارسی بولتیں فارسی اور عربی تو عالموں کی زبان تھی۔ دادی جان اس دنیا کی نمائندہ تھیں جہاں فارسی عربی بولنے والے ہی پڑھے لکھے سمجھے جاتے تھے، وہ افغانستان والوں سے بہت مرعوب تھیں اور انھیں دادا جان یہاں بہت یاد آتے رہے کیونکہ وہ فارسی خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ ویسے بھی دادا جان نے انھیں تاریخ کا بہت شعور دلا دیا تھا۔

یہی کہ اسی کے راستے سکندرِ اعظم آیا اور وہ کوئی ایسا ویسا تو تھا نہیں فاتح اعظم کہلایا۔ سکندرِ اعظم اس جگہ کا رہنے والا تھا جہاں سے ساری حکمت و دانائی آئی۔

اور یہی وجہ غزنی تھی جس کا رہنے والا بادشاہ محمود غزنوی تھا جس نے سومنات کا قلعہ فتح کیا تھا۔ پھر ادھر فرغانہ میں بابر دفن تھا افغانستان کا چپہ چپہ تواریخ سے بھرپور تھا۔ افغانیوں کو دیکھ کر دادی جان کا جی ہاتھ بھر کا ہو جاتا۔ وہ کہتیں "نہیں وہ دن میں غیور افغانیوں نے فرنگیوں کو شکست دی تھی" ویسے بھی ان کو یہ تمام جگہیں جی جان سے پسند آئیں "زندگی رہی تو دوبارہ آنے کا وعدہ کر گئیں۔ مگر سب کچھ گڈمڈ ہو گیا۔

مشرقی بنگال میں بغاوت ہو گئی۔ سڑکوں پر خاک اڑنے لگی۔ ایک بار پھر زندگی نوکے کی طرح ہنگامہ خیز وقت کی لہروں پر ڈولنے لگی۔ دادا جان کو تین برس ہو چکے تھے فوت ہوئے اور دادی جان ان کی برسی کی تیاریاں کر رہی تھیں کہ یکایک سمے بدل گیا تھا اور انھوں نے تسبیح ایک طرف رکھ کے سوچا تھا "عجب وقت آن لگا ہے کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ اپنے آپ سے بھی واقف نہیں۔ لا الٰہ الا انت سبحانک"

دنیا ایک انوکھی ڈگر پر تھی اور وہ خود اس دنیا کے لئے اجنبی تھیں۔ اور جب بربریت یہاں پوری طرح انسانیت پر قابو پا گئی اور تمام اقدار اور خوبصورت نظریات ٹوٹ پھوٹ گئے تو ایک بار پھر بابا اپنے چھوٹے سے کنبے کو سمیٹ کر نکل کھڑے ہوئے۔ اب کی ان کی منزل غیر یقینی تھی۔ وہ کچھ عرصے کو لندن چلے آئے۔ لیکن یہاں اماں اور دادی جان نہایت بے آرام رہیں چنانچہ وہ کراچی آ گئے۔ وہ یہاں عفیفہ اور بچے سمیت ٹھہرا رہا۔

شمس العارفین نے پکاڈلی سٹریٹ میں کھڑے ہو کر سوچا "یہ لندن بھی عجیب جگہ ہے۔ پکاڈلی میں دن رات اودھم مچا رہتا۔ دکانوں میں ماڈل لڑکیاں تھرکتی رہتیں۔ اہلِ لندن اس طرح دوڑ بھاگ میں مصروف رہتے جیسے ابھی ابھی جنگ کا سائرن بجا ہو اور وہ خندقوں میں پناہ لینے جا رہے ہوں یا سب کو ریل پکڑنی ہو۔ شاید دوسری جنگِ عظیم میں گھڑی گھڑی سائرن بجتے رہنے سے انھیں عادت ہو گئی تھی اس طرح دوڑنے کی۔ ٹھٹھری سمٹی بڑھیاں پھٹے پرانے کوٹوں میں ملبوس بسوں کے انتظار میں ہر اجنبی پردیسی کو دیکھ کر اخلاق سے دانت نکالتیں۔ بڑے شوق سے گفتگو کرتیں لیکن اگر ان کو گھر آنے کی دعوت دی جاتی تو وہ فوراً گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ کر کہتیں "او نو تھینک یو ڈیئر۔ دی آر اونلی سٹریٹ فرینڈز" یہ عدم اعتماد غالباً ان میں دوسری عظیم کے بعد پیدا ہوا ہوگا۔ کیونکہ برطانیہ اقتصادی مات کھا چکا تھا۔ غریب غربا سگرٹوں کے ٹکڑے سڑکوں پر سے چنتے پھرتے تھے۔ کرسمس میں لونڈے لپاڑی کز گرکٹھتے جاڑوں میں شراب میں وحشت ہو کر ٹرافلگر سکوائر میں غوطے لگاتے اور دھن بجاتے۔ خوب لوگ تھے۔ انھیں نہ سردی کی پرواہ تھی اور نہ دنیا کی۔ یہ لوگ اور ان کی یہ دنیا اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

عثمان کی چھٹیاں تھیں۔ عفیفہ اسے لے کر کراچی گئی ہوئی تھی۔ وہ اپنی چھٹی گزارنے یونان چلا آیا کبھی یہ دانشوروں کا دیس تھا۔ یہاں پرانے ایتھنز میں جو اتھینیا بھی کہلاتا تھا، وہ چوڑے سے فٹ پاتھ پھیلے ہوئے ریستورانوں میں سے ایک گول میز کے گرد لپے کی کرسی پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ پیچھے ذرا پرے "اکراپولس" کے کھنڈر تھے۔ ذرا دیر پہلے اس نے ہالینڈ کی اس سیاح لڑکی کو اس کے متعلق بتایا تھا جو پہلی بار گھر سے باہر پائی پائی جمع کر کے یہ تاریخی مقام دیکھنے آئی تھی۔ اس نے کہا تھا "اسے صخرۂ مقدس بھی کہتے ہیں۔ یہ بہت پرانا مقام ہے۔ آج سے پانچویں صدی قبل مسیح ایتھنز کے سیاست داں پیریکلیز نے شروع کرایا تھا اور پارتھینون وسط میں ایک بہت بڑی مستطیل عمارت ہے" اس کی ملاقات اس لڑکی سے انھیں کھنڈروں

میں ہوئی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت نہیں تھی جتنی ہشاش بشاش تھی۔ اس کی رنگت گلاب کے پھولوں ایسی اور رخسار سرخ سیبوں کی طرح تھے۔ موسم شفاف تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ درختوں سے چھن کر اس کے رخساروں پر سے پھسل رہی تھی۔ اس ملی جلی تمازت سے ماحول بہت صحت بخش معلوم دے رہا تھا۔ وہ کاہلی سے بیٹھا گھونٹ گھونٹ چائے پیتا رہا۔ اطمینان اور مسرت کی ایک لہر اس کے اندر دوڑ گئی۔ وہ کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ ایک ناتجربہ کار کم عمر لڑکی کو "اکراپولس" کی تاریخ کے متعلق بتانا اسے بہت اچھا لگتا تھا "اس سے اعتماد تقویت پاتا ہے"۔ اس نے مسکرا کے سوچا تھا اور ایک مشفقانہ نظر اس پر ڈالی۔ پھر وہ سگریٹ کا ایک گہرا کش کھینچ کر کہنے لگا "اور ایتھنز! یوں سمجھ لو یہ تمام یونان کی تہذیب و ثقافت کا مرکز تھا۔ یہاں ارسطو نے رہائش اختیار کی، اور اسی ایتھنز میں افلاطون کی 'فلسفہ اکیڈمی' اپنے عروج پر تھی اور یہیں ارسطو نے اپنا دوسرا مکتب "لائی سیم" قائم کیا۔ ایتھنز شہروں کا بادشاہ ہے۔ یہاں آتے ہی کچھ عجیب سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ اپنے آپ ہی اس شہر کا ادب کرنے کو جی چاہتا ہے۔" سترہ سالہ سادہ لڑکی بڑے غور سے سن رہی تھی۔

چاروں طرف سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ بڑی طمانیت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مسلسل اور گمبھیر آواز میں کہنے لگا ــــ "ایتھنز بڑا پرامن شہر رہا ہے۔ یہاں سکون اور سلامتی کا احساس رگ و پے میں سما جاتا ہے۔ ایک وقت تھا۔ شاعر ڈائیونی سس کی تماشگاہ میں امن کا جشن منایا کرتے تھے۔" وہ تھما۔

تمازتِ آفتاب سے لڑکی کے رخسار تمتما رہے تھے۔

اسے یونان میں لگے ان شگوفوں کا خیال آیا جو اس موسم میں کھلتے تھے جب وہ افغانستان گیا تھا۔ افغانستان کا خیال آتے ہی دل کئی سیڑھیاں اُترتا چلا گیا۔ وہاں روس نے چڑھائی کر دی تھی۔

چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کلکتہ اور ڈھاکے کے خونی مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے آنے جانے لگے جیسے وہ کوئی ڈرامہ دیکھ رہا ہو ہر شے بے معنی تھی۔ دھوپ کا ڈھلنا، تاریکی پھیلنا، صبح کا ہونا سب کچھ مکینکل تھا۔ کسی چیز کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ تب اس نے جیسے اپنے آپ سے دھیمی آواز میں کہا، مگر وہ اس کی آواز پر کان لگائے رہی۔ اس نے کہا "کہتے ہیں کہ ایفروڈائٹ اپنا پیالہ دل کش سفی سس کے صاف چشمے میں ڈبوتی ہے۔ وہی جو اس سرزمین پر شہد بھری نرم ہواؤں کا نفس عام کرتی ہے اور محبتوں کو علم کے پہلو بہ پہلو تخت نشین کرتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہر فن میں تخلیقِ فضیلت کرتی ہے تو پھر ایسا شہر جو مقدس دریاؤں سے سیراب ہوتا ہے۔ ایتھنز کس طرح تیرا خیر مقدم کر سکتا ہے بچوں کی قاتل! اس خون کو ذرا تول جو تو اپنے سر لیتی ہے۔ میڈیا! تیرے قدموں کی قسم! ہر عہد یا ہر درخواست کی قسم جو ہم تجھ سے کرتے ہیں۔ اپنے بچوں کو قتل نہ کر۔"

پھر وہ سوچنے لگا "لیکن کلکتہ ہو ڈھاکہ یا کابل، ہر شہر مقدس دریاؤں سے سیراب ہوتا ہے"۔ وہ اپنی سوچ میں گم ہو کر اس لڑکی سے قطعی بیگانہ ہو گیا۔ اور یہ منظر جو ابھی چند لمحوں پہلے اتنا پُرسکون اور فرحت بخش تھا۔ غائب ہو چکا تھا۔ اس کے تمام رنگ پھیکے پڑ چکے تھے۔ ماحول پر انتشار کی گرفت تھی۔

"کیا تم میرے ساتھ کل اولمپیا کا مندر دیکھنے چلو گے؟" اس لڑکی نے پوچھا۔

"میں ہیں روم جا رہا ہوں۔" یہ سوچ کر کہ افغانیوں کے خاندان کھلے آسمان کے نیچے چھولداریوں میں پڑے ہیں اس کا جی اچاٹ ہو رہا تھا۔ وہ اس کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے کہنے لگا "کیا تمہیں علم ہے کہ اولمپیا کے مندر پر ایتھنز کے مالِ غنیمت سے ایک سونے کی ڈھال اس کے فاتحین نے نصب کر دی تھی۔"

لڑکی ایک بار پھر شوق سے سننے لگی۔ وہ اتنا چاہ رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ چلے کہ وہ یونان کے چپے چپے سے واقف تھا۔

مگر اس کا تو دل شاہراہِ نو جلال آباد، مزار شریف، پغمان اور ہرات میں بھٹک رہا تھا۔ وہ افغانستان کی باتیں کرنے لگا۔

لڑکی کہنے لگی "بین الاقوامی برادری سے بات پر نالاں ہے کہ روس کو اس طرح افغانستان پر چڑھائی نہیں کرنی چاہیئے خصوصیت سے امریکہ تو روس کی جارحیت کے خلاف بہت غل غپاڑہ کر رہا ہے۔ تمام یورپ بھی روس کو بہت بُرا بھلا کہہ رہا ہے۔"

وہ خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ اس سے بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ کیا روسی بین الاقوامی برادری کے نالاں ہونے سے فوجیں واپس بلا لیں گے۔ ساری بات یہ ہے کہ ایشیا میں خطرہ بڑھتا جا رہا ہے غالباً تیسری عالمی جنگ ہماری زمین پر لڑنا قرار دی گئی ہے۔ دل ویران ہوتا چلا گیا اس لئے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنے ہوٹل کے پیچھے ایتھنز کی گلیوں میں ٹہلتا رہا۔

بیچاری نور العین پھپو وزیرستان میں اپنے شوہر اور بچوں سمیت پناہ گزیں تھیں۔

وہ لڑکی اپنا تھیلا کندھے پر لٹکا کے نکل کھڑی ہوئی۔

وہ سوچنے لگا "امریکہ اور یورپ کی بھلی چلائی۔ ان کو تو ایک ہی فکر کھائے جا رہی ہے کہ اگر بڑھتے بڑھتے روس نے گلف کو کھا لیا تو اس کے ہاتھ تیل کے کنوئیں آ جائیں گے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ سارے امریکہ اور خصوصیت سے تمام یورپ کی اقتصاد مجہول ہو کر رہ جائے گی ورنہ ان کی بلا سے افغانی ہمیشہ خیموں میں پڑے رہیں۔"

آرتھوڈکس چرچ میں ایک لڑکی نے قربان گاہ پر شمع جلائی اور دیر تک وہ اس اکیلی شمع کے آگے بیٹھی زار و قطار روتی رہی نجانے اس لڑکی کیا غم ہے" اس نے گلی کے اس چھوٹے سے اندھیرے گرجا میں جھانک کر سوچا۔

وہ سیاح لڑکی تنہا ہی اولمپیا چلی گئی۔

یونان سے وہ روم آ گیا۔

پرانا روم نئے روم سے بہت خوبصورت تھا۔ قدیم اب بھی کہیں چھپا ہوا ان گلی کوچوں میں سرگوشیاں کر رہا ہے نئے روم کے مقابلے میں پرانے روم پر بڑی عظمت و شان تھی۔ ان گلیوں میں بنے ہوئے پرانے گھروں کی تعمیر میں جو سخاوت اور حسن تھا وہ اس وقت کی خوشحالی اور امن کی گواہی دیتا تھا۔

"امن تو جب بھی نہ تھا جنگیں تو اس وقت بھی ہوتی تھیں۔ اندازِ حرب اور ہتھیار مختلف تھے، البتہ وقت کی رفتار دھیمی تھی" اس نے سوچا۔

بہت اوپر آفتاب، جدید اور قدیم روم پر سونا بکھیر رہا تھا۔

"وہ عیسیٰ کا آخری کھانا" (LAST SUPPER) دیکھنے گیا جس میں عیسیٰ اور ان کے حواری موم سے بنائے گئے تھے حسین اور شاندار روم ہر سو پھیلا ہوا تھا مگر یونان میں خصوصیت سے ایتھنز میں اس نے امن اور سلامتی زیادہ محسوس کی تھی۔ اس سب کے باوجود وہ ایک نامعلوم سا خوف محسوس کر رہا تھا۔ اس کی وجہ معاشرہ میں بڑھتا ہوا غصہ، حسد، تعصب اور نفرت تھی۔ کلکتہ مشرقی بنگال، افغانستان اور ایران میں ایک پُل قائم ہو گیا تھا اور یہ پُل لمبا ہو رہا تھا۔ دل پر ایک نامعلوم سا غم چھاتا جا رہا تھا اور اس دل کی مشابہت میز پر رکھے ہوئے ٹائم پیس سے تھی۔ کھٹ کھٹ مشین کے پرزے کی طرح چلے جا رہا تھا جی چاہ رہا تھا کہ یہ تھوڑی دیر کو تھم جائے۔ گلی میں چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ کام پر سے لوگ واپس آ کر خرید و فروخت اور سڑک کنارے ہوٹلوں میں کیانتی اور بیئر پی رہے تھے۔

وہ کافی کی پیالی پر اکیلا بیٹھا سوچ رہا تھا کہ "DEVELOPING NATIONS" کا کوئی مستقبل نہ تھا اور نہ اُن کے یہاں ابھی تک کوئی سیاسی اور اقتصادی استحکام وجود میں آیا تھا۔ ان قوموں میں ایک ہی چیز مستحکم تھی یعنی اقدار، وہ بھی اب متزلزل تھیں۔ پھر وہ اُٹھ کر اپنے ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھ گیا اور بے خیالی میں سامنے دیکھنے لگا۔ مقابل کے پرانے گھر کی بالکونی میں اس گھر کی ایک عمر رسیدہ خاتون بیٹھی تھی جس کا ذریعہ

آمدنی سیاحوں کو کرائے پر رکھنا اور دنیا جہان کے نوعمر لڑکوں سے آنکھیں لڑاتا تھا وہ اسے بھی گھورنے لگی۔ اسے کوفت ہونے لگی وہ کرسی ترچھی کرکے بیٹھ گیا۔ ادھیڑ عمر کی خاتون منہ ہی منہ میں اسے بُرا کہتی رہی۔

نیچے گلی میں کسی نے اپنی زیتون کی رنگت کی خوبصورت بچی کو پکارا! "مریا" مریا چھپ سے نکل گئی۔ وقت چلتا رہا۔ اوپر آگ کا گولا ٹھنڈا پڑ گیا۔ روشنیاں جل اُٹھیں۔ سارا روم جھلملا رہا تھا۔ سیاحوں کی ٹولیاں اِدھر سے اُدھر ماری پھر رہی تھیں۔ سیزر کے مجسمے کے نیچے سے ایک لڑکی گرجا کی سمت بڑھ گئی۔ اسے آرتھوڈکس لڑکی کا خیال آیا جو اپنی جلائی ہوئی شمع کے آگے جانے کب سے بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔ "اسے نجانے کیا دکھ تھا!" اس نے رنج سے سوچا۔

کچھ بچے اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھلتے کودتے گزر گئے۔ بظاہر دنیا کتنی مطمئن اور بے ضرر مشاغل میں مصروف تھی۔ "لمحہ لمحہ قطرہ قطرہ وقت انتہائی سکون سے گزر رہا تھا۔" اس نے سوچا "مگر انہی لمحوں میں، اسی سکون میں نجانے کہاں نفرت، تعصب اور انتشار چھپا ہوتا ہے جسے ذرا سی ٹھیس کی ضرورت ہوتی ہے!" ہر جگہ بے چینی بڑھ رہی تھی۔ ہر جگہ خوف تھا۔ نیوکلر ہتھیاروں اور بڑی قوتوں کی جارحیت کا۔ افریقہ کے باشندوں کو شکایت تھی کہ سفید فام ان سے نفرت کرتے تھے اور بہت ظلم ڈھا رہے تھے۔ نسلی امتیاز گھٹنے کے بجائے بڑھ رہا تھا۔ یہ افریقی لڑکا جو ابھی سڑک کنارے چائے خانے میں بیٹھا ہوا اپنی قوم کی صورت حال بڑے جوش و خروش سے سنا رہا تھا۔ وہ نمیبیا کا رہنے والا تھا۔ وہ چھچہ اپنے ہاتھ میں تھامے کہہ رہا تھا "نمیبیا جرمنی کی نوآبادی رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جرمن بڑی ظالم قوم ہے۔ اس نے بڑی سفاکی کا مظاہرہ کیا۔ عورتوں اور بچوں کا صفایا کر دیا تھا۔ افریقی مردوں کو بھاری تعداد میں غلام بنایا گیا۔ مجھے نفرت ہے سفید قوموں سے۔ یہ اپنے کو کیا سمجھتی ہیں۔ برلن کانفرنس میں، افریقہ کے حصے ہونا قرار دیا گیا۔ ایک بار نما قبیلے نے حکومت کے خلاف بغاوت یا جنگ آزادی لڑنا چاہی تو حکومت نے عورتوں اور بچوں پر بمباری کی

"OH! I HATE WHITE NATIONS AND ESPECIALLY, THE GERMANS

ہماری تواریخ سفید فام قوموں کے مظالم سے بھری پڑی ہے مگر ہم صرف محسوس کر سکتے ہیں اور کچھ بھی نہیں کر سکتے۔"

ایک خوبرو اطالوی لڑکا اپنی چھوٹی سی فراری میں تیز رفتاری سے فٹ پاتھ کے قریب سے گزر گیا۔

"ہم اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک کہ ہم سفید اقوام کا تسلط پوری طرح ختم نہیں کر لیتے" اس نے کہا، یہ آواز — شمس العارفین کو لگا کہ — بہت دور سے آئی ہو۔ یکلخت اس کا دل چاہا کہ وہ اپنے وطن کو واپس لوٹ جائے — "کہ میری مکتی لوٹ جانے ہی میں ہے مگر کہاں! پورے بنگال کے دروازے مجھ پر بند ہیں۔ رام کو چودہ برس کا بن باس ملا تھا، مجھے تمام عمر کا۔ میں کہاں جاؤں؟ میرا کوئی وطن نہیں۔" اس نے محسوس کیا کہ ماضی، حال، مستقبل سب گڈمڈ ہو چکا تھا۔ "معلوم نہیں وقت ظالم تھا یا انسان یا خدا" اس نے دل میں کہا۔

وہ ٹہلتا ہوا مریا کے پاس کھڑا ہو کر باتیں کرنے لگا۔ مریا دن میں سکول جاتی تھی اور شام کو تنکوں کی خوبصورت ٹوکریوں میں پھول بیچتی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی۔ اس کی ہنسی میں معصومیت اور بے پروائی تھی۔ اس نے دل میں کہا تھا "مریا تم کتنی خوش نصیب ہو۔ یوں بے پروائی سے ہنس سکتی ہو، کیونکہ تمہاری عمر ہی ایسی ہے۔ کاش تم اپنی ہنسی کی یہ شگفتگی اور معصومیت دنیا کو بانٹ دو۔" بارہ تیرہ برس کی مریا دنیا میں بڑھتی ہوئی نفرت اور انتشار سے بے خبر تھی۔

"تم اتنے اداس کیوں ہو۔ تمہیں کیا پریشانی ہے۔ کیا تمہارے پیسے ختم ہو گئے ہیں؟" مریا نے پوچھا اور اطمینان سے کھڑی چیونگم کھاتی رہی۔

وہ سوچنے لگا "واقعی میں اتنا رنجیدہ کیوں ہوں۔ کتنی بے تکی سی بات ہے کہ میں اس لئے رنجیدہ ہوں کہ دنیا میں عالمی جنگ کے حالات پرورش پا رہے ہیں، افغانیوں پر ظلم ہو رہا ہے فلسطینیوں سے ان کی زمین چھین لی گئی اور ایران خون میں نہا رہا ہے۔ بچارے اریٹرین آزادی کے لئے سر کٹوا رہے ہیں، اپنی جان دیئے دے رہے ہیں۔ خانماں برباد افغانی وزیرستان، ایبٹ آباد اور پشاور میں خیمہ زن ہیں۔" چنانچہ اس نے مریا سے

کہا۔ میں DEVELOPING NATIONS کے مستقبل اور تیسری جنگ عظیم جس کے ڈول ایشیا میں پڑ رہے ہیں اس کے لئے اداس ہوں۔

مریا ہنسنے لگی "یہ ٹورسٹ بھی کتنے خبطی ہوتے ہیں" مریا نے سوچا۔

اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنی ٹوکریاں سمیٹ کر اپنے گھر کی سمت چل پڑی — جو گلی کے نکڑ پر تھا جس جگہ وہ کھڑی تھی اس جگہ سناٹا ہو گیا۔ وہ بھی واپس اپنے ہوٹل چلا گیا، اور سوچنے لگا "شاید آج کا لطیفہ وہ اپنے والدین کو سنائے۔ مس لے جھونے سے گھر میں ایک ڈھب اور ایک تنظیم ہو گی۔ اس میں گھریلو سکون اور مسرت چھپی ہو گی۔ مسرت جو چھوٹی چھوٹی چیزوں سے حاصل ہوتی ہے، ایک اچھا چائے کا سیٹ خرید لینے سے۔ جس کی شدت تھی اور جس کے لئے کئی ہفتوں کی تنخواہ جمع کی جا رہی تھی لیکن ننھی مریا کو کیا معلوم کہ عالمی برادری کے سرمایہ دار اژدہے جو عالمی برادری کی منڈیوں کے اجارہ دار بنے ہوئے ہیں۔ وہ اس کے جیسے بے شمار گھروں کا سکون درہم برہم کرنے کے درپے ہیں۔ اسے اپنے بچپن اور اپنے گھر کا خیال آنے لگا۔

ایک بار کلکتہ میں دادی جان کی ملازمہ سکینہ نے اُن سے کہا تھا "تو بڑی ماں، بہو کی نوکرانی اس لئے چلی گئی بلکہ بہو نے اسے نکال دیا تھا کہ بہو کے بٹوے سے اس نے پچاس روپے نکال لئے تھے"۔

وہ دادی جان کے پیر دبا رہی تھی۔ جاڑے کی سہ پہر تھی۔ کھڑکی کے باہر اس نے دیکھا تھا تالاب میں گلابی کنول کھلتے تھے۔ ایک گلہری دونوں پنجوں میں باورچی خانے سے چرائے ہوئے چاول کے دانے تھامے تھر تھر کانپ رہی تھی اور ناریل کے درختوں کے پرے بادل کے ٹکڑے اکٹھا ہو رہے تھے۔ سکینہ کے چہرے پر اس وقت بڑی اہمیت اور طمانیت تھی۔ اس کی پوزیشن اس نئی ملازمہ کی چوری کی وجہ سے بہت اونچی ہو گئی تھی۔ ویسے بھی وہ اس گھر کی سب سے پرانی خادمہ تھی۔

اس وقت اس نے محسوس کیا، تب سارے ماحول پر کتنا سکون تھا۔ کوئی انتشار یا نفرت نہ تھی مگر کہیں تھی ضرور۔ ذرا سی پروائی سے سارا ماحول خون میں نہا گیا۔ شاید انتشار اور نفرت، بیماری کے کیڑوں کی طرح ماحول میں چھپے ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے۔ وہ صرف MAGNIFYING GLASS یا خوردبین سے ہی نظر آتے ہیں۔ مگر اس وقت برسوں پہلے وہ بھی مریا کی طرح بے پروا تھا۔ "پیاری مریا خدا کرے تمہارے گھر کا امن برقرار رہے اور تم اسی طرح اپنے گھر میں پنیر، زیتون اور PIZZA کھاتی رہو اور تم اس المیے سے کبھی دوچار نہ ہونا جس سے میں ہوا۔"

روم کی یہ رات قدرے سرد تھی۔ اوپر چاند ٹھٹھرا سہما کر زرد سا ٹمٹما رہا تھا۔ بار بار اس پر بادل کا دھواں سا آ جاتا جیسے وہ خود اس سے چھپنا چاہ رہا ہو۔ انسان اس پر چھاپے جو مار رہا تھا۔ وہ کوئی چرس کا بیوپاری تو تھا نہیں۔

اسے اپنے بہت دور دیس کا خیال آتا رہا، جہاں گہرے پانیوں میں مانجھی نو کے کھیتے تھے جہاں تاڑ کے درختوں سے پرے چاند بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتا تھا اور فضا میں دھان کی خوشبو پھیلی ہوتی۔ ٹھوڑی تک اس نے کمبل کھینچا اور چپکے سے کہنے لگا۔ "اے خدا تو پانیوں پر کشتیوں کو کھینے والوں کی اور اس سرزمین پر تمام رہنے والوں کی حفاظت کر اور لازوال مسرتیں ان کی راہوں میں بکھیر دے۔"

آپ ہی آپ اپنی جلاوطنی کا خیال کر کے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ دل نے کہا: "خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو اپنی زمین پر رہنا میسر آیا۔"

مدت بعد اسے اپنے بے وطن ہونے کا شدید احساس ہوا۔ پچھلے پہر اس کی آنکھ کھل گئی۔ دماغ کے نجانے کن حصوں میں جانے پہچانے راگ بکھرتے رہے۔ "آ۔ آ۔ سا رے گا ما پا دھا نی۔ آ۔ آ" صبح صبح فریدالاسلام ریاض کرتے، پھر نہا دھو کر دفتر جاتے۔ رات کلب میں اس کے ساتھ بلیرڈ اور برج کھیلتے۔ ڈھاکہ کلب سے گھر تک گل مہر کے سرخ پھولوں کا بچھونا ہوتا۔ موڑان پر سے گزرنا اچھا نہ لگتا۔

اس طرح ایک رات ختم ہوئی اور دن آن لگا۔ چھٹی ختم ہو رہی تھی۔ وہ اپنا سامان سمیٹنے لگا۔

پھر بھی ـــــ اس نے سوچا شکر ہے میں ہندوستان میں نہ جلا وطن ہوا جہاں بہانے بہانے مسلم اقلیت کا قتل عام ہوتا رہتا ہے اور اس عالمی سیاست میں تو سوائے حیلہ سازی اور دروغ بافی کے کچھ نہ تھا۔ کچھ دن کی بات ہے کہ چین امریکہ کی ذرا نہ بنتی تھی اور اس قسم کی خبریں عام تھیں "چواین لائی کا اعلان ہے کہ فارموسا (FORMOSA) کو امریکی جارحیت سے آزاد کرا دیں گے، ادھر تبت کو بھی امریکی پنجہ سے چھڑا لیں گے ـــــ" لیکن آج چین امریکہ ایک دوسرے کا دم بھر رہے تھے۔ چین اسی عزیز دوست کی وجہ سے یو۔این۔او میں نہ بیٹھتا تھا۔ ادھر روس اور امریکہ ایشیا میں ہتھیاروں کی دوڑ کروا رہے ہیں جیسے کوئی مرغے یا کتے لڑائے۔

"OH! HELL" اس نے کہا۔

اور امریکہ کے یہودی اس ARM RACE ہتھیار دوڑ سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔

قدیم روم اس کے سامنے تھا اور یونان وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ ارسطو، افلاطون اور ارشمیدس جیسے داناؤں کا ملک۔ مگر تاریخ پلٹا کھاتی ہے اور بڑی بڑی سلطنتیں ایک وقت پر آکر اپولس کی طرح کھنڈروں کی صورت میں رہ جاتی ہیں۔ تمام عظمت، جلال، شان و شوکت، یونان اور روما کے دل ہلا دینے والے دربار، نوشیرواں کا تخت، سب کھنڈر بن جاتے ہیں۔ وقت کی چکی میں باریک پس جاتے ہیں اور کبھی کبھی موہن جودڑو کی طرح لوگ ان کھنڈروں میں تہذیب و ثقافت کے نشانات، اور کبھی زندگی ہونے کے ثبوت ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

پومپیائی کے کھنڈروں پر اس نے ایک نظر ڈالی اور سوچنے لگا "تو تاریخیں اسی طرح بنتی اور مٹتی ہیں"

بلائنڈ

کرامت اللہ غوری

وہ لڑکی عمر کے اُس حصہ میں تھی جب اُس عمر کی بچی کو لڑکی کہنے کے لئے ذہن کو باقاعدہ آمادہ کرنا پڑتا ہے اس لئے کہ ذہن اُسے پوری لڑکی ماننے سے اس طرح جھجکتا ہے جس طرح میٹھی نیند کی آغوش میں سویا ہوا بچہ صبح تڑکے ہی جھنجوڑ کر اُٹھائے جانے پر بند آنکھوں میں ذرا سا روزن کر کے صبح کے اُجالے کو دیکھتا اور پھر آنکھیں جھپک لیتا ہے۔۔۔ اُس کا ذہن اس بات کے لئے آمادہ نہیں ہوتا کہ صبح ہو چکی ہے اور اُسے اسکول جانا ہے۔ یا جیسے ادھیڑ عمر کی عورت آئینے میں پہلی بار سر کے بالوں میں سفید تار دیکھ کر آئینے سے آنکھیں چرا لیتی ہے!

میں اگر شاعر ہوتا تو یہ کہتا کہ وہ اُس کچی کلی کی طرح تھی جس کی نرم و نازک کنواری پتیوں کو شباب کی پہلی پہلی کرنیں ہولے سے چھو کر آہستہ آہستہ کھول رہی تھیں۔ ہر پتی کے کھلنے کے ساتھ کلی کی شادابی نکھرتی آ رہی تھی لیکن میں شاعر نہیں تھا۔ میں تو زندگی کی مجنونانہ دوڑ میں ہمہ تن مصروف ایک ایسا کاروباری انسان تھا جسے خود اپنی ذات کا عرفان نہیں تھا جسے مصروفیت کی پگھلا دینے والی دھوپ میں یہ احساس بھی نہیں تھا کہ اُس کے شباب کا سورج نصف النہار پر پہنچ کر بس اب ڈھلنے کی تکلیف دہ حدود میں داخل ہونے کو تھا! میں آج کل کی مشینی زندگی کا ایک ایسا پرزہ تھا جو اپنے خانہ میں فٹ گرد و پیش کی دوسری کلوں سے رستے ہوئے تیل میں چکٹ ہو کر اپنی مخصوص ڈگر پر چلا جا رہا تھا۔۔۔! پھر بھلا میں اُس شفاف اور شاداب لڑکی کے لئے وقت، فرصت اور احساس کہاں سے لاتا جو بچپن کے گھنیرے سایوں سے نکل کر پہلی بار شباب کی گداز دھوپ میں قدم رکھ رہی تھی اور جس کے خیالات و احساسات میں سردیوں کی ملائم دوپہر کی سی تازگی اور شگفتگی تھی!

وہ ایک بے انتہا ذہین اور حساس لڑکی تھی اور بے حد پیاری گفتگو کرتی تھی۔ اُس کی باتیں سُن کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ نوخیز کلی جو ابھی کھلنے کے بالکل ابتدائی دور میں تھی اتنی پُر مغز اور ذہانت سے لبریز باتیں سوچ اور سمجھ سکتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے قدرت نے معصومیت اور دلکشی کے ساتھ ساتھ اسے عقل و خرد کا سرمایہ بھی کثیر اور بے حساب عطا کیا ہو!

میرے پاس وہ جب بھی آتی۔۔۔ اور اکثر یہ ہوتا کہ شام کو جب میں دن بھر کا تھکا ہارا اور ٹوٹا ہوا گھر لوٹتا تو وہ میرے تھکے ہوئے اعصاب کو اپنی دلچسپ باتوں اور شگفتہ گفتگو سے تسکین پہنچانے کے لئے آ جاتی۔۔۔ تو مجھ سے گھنٹوں زندگی اور اُس کے رموز کے متعلق باتیں کرتی رہتی۔۔۔ اُس کی باتیں سُن کر جہاں ایک طرف میں اپنی تھکن اور دن بھر کی بوریت سے ہلکا ہو جاتا وہاں دوسری طرف وہ مجھے ذہنی کاوش اور آزمائش کے ایسے گرداب میں کھینچ لے جاتی کہ اکثر مجھے اُس نوشگفتہ بہار کے سامنے اپنی بے بسی اور کم مائیگی کے کانٹے چننے پڑتے۔۔۔ اور جب میں پوری بے بسی کے ساتھ اُس کے مقابلے میں کلین بولڈ ہو جایا کرتا تو زچ ہو کر اپنی شرم اور شکست چھپانے کو اسے ڈانٹ کر بھگا دیتا۔۔۔! وہ اس پر بُرا نہیں مانتی تھی بلکہ شرارت سے دیکھتی اور منہ چڑاتی ہوئی بھاگ جایا کرتی تھی۔! جاتے جاتے بھی اُس کی نظروں میں ایک سوال ہوتا جیسے مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ میں اپنے کاروباری ذہن کی مائل بہ انحطاط بنیادوں کو مزید شکست و ریخت سے بچانے کے لئے اس کی سطح تک بلند ہو سکوں؟

میں اسے بھگا تو دیتا لیکن اُس کے جانے کے بعد بھی میں اکثر گھنٹوں اُس کے متعلق سوچتا رہتا۔ اُس کی ذہانت، اور حاضر جوابی پر دل ہی دل میں عش عش کرتا۔ اسے بے تحاشا داد دیتا۔ اور پھر اچانک مجھے خیال آتا کہ کاش اُس کی عمر پانچ سات سال زیادہ ہوتی تو وہ میرے لئے کیسی آئیڈیل جیون ساتھی بن سکتی تھی۔ اِ نہ جانے کیوں مجھے ہمیشہ یہ وہم رہتا کہ میری اور اُس کی عمروں میں بہت فرق تھا اور عمروں کا یہ فرق مجھے ایک ایسی خلیج کی طرح وسیع اور ناقابلِ عبور معلوم ہوتا تھا کہ اُس کو پاٹنے کے تصوّر ہی سے میرے ذہن کی طنابیں ٹوٹنے لگتی تھیں اور تنگ آ کر میں اس بچگانہ خیال ہی کو اپنے ذہن سے جھٹک دیتا۔ میں سوچتا ——— لاحول ولا قوۃ کیا بیہودہ فکر ہے میری بھی ——— وہ تو ابھی بچی ہے۔ بالکل الھڑ اور معصوم ابھی تو اُس کی گڑیاں کھیلنے اور گڑیوں کا بیاہ رچانے کی عمر ہے۔ پھر میں کیسے اُسے اپنا زندگی بھر کا ساتھی بنانے کا تصوّر کر سکتا ہوں۔!

ایک دن میں نہ جانے کس موڈ میں، کس ترنگ میں اُس سے پوچھ بیٹھا "اچھا بتاؤ تمہیں کیسے مرد اچھے لگتے ہیں؟"

"آپ جیسے ———" اُس نے ایک لمحہ سوچے بغیر بے ساختگی سے جواب دیا۔

"اور جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو کیسے آدمی سے شادی کرو گی ———؟" میں نے مزید پوچھا۔

"بالکل آپ جیسے سے" وہ بہت اطمینان اور اعتماد سے بولی۔

میں ہنس پڑا ——— اور میں نے اسے چھیڑنے کو کہا ——— "لیکن پھر تو تمہارا شوہر بوڑھا ہو گا"

"تو کیا ہوا ——— ذہین اور سمجھدار تو ہو گا۔ اور چھوٹی عمر کے مرد مجھے اچھے لگتے بھی نہیں۔ بالکل لونڈے لگتے ہیں گلّی ڈنڈا کھیلنے والے" اُس کی آواز اور لہجے میں بلا کی خود اعتمادی اور یقین تھا۔

ایک لمحہ کو مجھے اس کی بات عجیب سی لگی اور پھر میں ہنس کر ٹال گیا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد میں دیر تک سوچتا رہا کہ آخر اسے میری عمر کے مرد کیوں پسند تھے ——— کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں تھی کہ اس کے باپ کا اُس وقت انتقال ہو گیا تھا جب وہ بمشکل پانچ برس کی تھی اور اُس کے ذہن کا وہ خانہ جس میں مرد کا آئیڈیل تصوّر باپ کے پیکر میں ڈھل کر لڑکی کے شعور میں جاگتا ہے آج تک خالی تھا۔

کچھ ہی عرصہ بعد میرے گھر والوں کو اچانک یاد آیا کہ ابھی میری شادی ہونا باقی تھی اور بہت چھان بین کے بعد اُنھوں نے دور پرے کے رشتے داروں میں ایک مناسب لڑکی تلاش کر کے میرے رشتے کی بات پکی کر دی: میں نے اُس لڑکی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی مجھے ایسی کھوج تھی کہ میں اُسے دیکھنے یا اُس کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش کرتا۔ شادی میرے نزدیک، اس مرحلہ پر ایسے ہی ایک فریضہ تھی جیسے زندگی کے دوسرے کاروبار، جھمیلے اور ضرورتیں۔ ہر مرد ایک نہ ایک دن کسی عورت سے شادی کرتا ہے ——— کچھ جبلتوں سے مجبور ہو کر ——— کچھ فطری تقاضے اور ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ——— اور میں عام مردوں سے مختلف نہیں تھا!

میری منگنی میں اُس نے بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ہر بات میں پیش پیش رہی اور ڈھولک پر سب سے زیادہ گیت بھی اُس نے گائے تھے ——— یوں لگتا تھا جیسے میرے کھونٹے سے بندھ جانے پر سب سے زیادہ خوشی اُسی کو ہوئی تھی ——— لیکن جب منگنی کا ہنگامہ سرد پڑ گیا تو ایک شام وہ میرے پاس آئی اور آتے ہی کہنے لگی "تو آپ شادی کر رہے ہیں!؟"

"ہاں ———" میں نے کچھ متعجب ہو کے کہا ——— "کیا تمہیں معلوم نہیں؟"

"معلوم تو ہے ——— لیکن مجھے تعجب یہ ہے کہ آپ اچھے خاصے سمجھ دار ہوتے ہوئے بھی اس معاملے میں اتنے سخت دقیانوسی کیوں ہو گئے ہیں ———" اُس نے اس طرح کہا جیسے وہ بڑی عمر رسیدہ اور سمجھ دار بوڑھی ہو اور مجھ سے میری نادانی پر باز پرس کر رہی ہو۔

مجھے ہنسی آ گئی لیکن اُس دن میرے ہنسنے پر خلافِ معمول وہ بھی کھلکھلا کے ہنسی نہیں بلکہ اس طرح تعجب سے میری طرف دیکھتی رہی جیسے ہنس کر میں اور زیادہ اپنی دیوانگی کا ثبوت دے رہا ہوں۔ اس کو اس طرح سنجیدہ دیکھ کر میں بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"دیکھو لڑکی، ابھی تم نہیں سمجھو گی کہ میں کیوں تاش کا پتہ دیکھے بغیر چال چل رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ جب کھیل میں دلچسپی نہ ہو تو پتہ دیکھنا نہ دیکھنا برابر ہے ۔۔۔ میں بلائنڈ میں جوا کھیل رہا ہوں۔ ممکن ہے جیت جاؤں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بازی بالکل الٹ جائے ۔۔۔ لیکن مجھے اس سے بالکل غرض نہیں کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ جہاں اور کاروبار میں نفع نقصان اٹھاتا رہتا ہوں وہاں اس میں بھی مندے کا سودا سہی۔"

لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری غیر جذباتی اور غیر منطقی گفتگو اسے اچھی نہیں لگی تھی ۔۔۔ جب سے میں نے اسے دیکھا اور جانا تھا پہلی بار مجھے اس کی آنکھوں میں کرب کی شدید اور گہری جھلکیاں نظر آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے میں نے اس کے ضبط کے بند دریچوں پر پتھر مار کر شیشہ چکنا چور کر دیا ہو اور بے شمار ریزے اور کرچیاں اس کے ہاتھوں میں چبھ کر رہ گئے ہوں۔ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ اور پھر کچھ کہے بغیر وہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔۔۔ جاتے جاتے وہ دروازے کے پاس پہنچ کر رکی اور میری طرف پلٹ کر مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ۔۔۔ "تم اتنے نادان ہو سکتے ہو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی ۔۔۔" اور پھر رخصت ہونے سے پہلے رندھے گلے کے ساتھ بولی "سنیئے اچھا جواری وہ ہوتا ہے جو صرف اپنے پتوں پر ہی نظر نہیں رکھتا۔ دوسرے کھلاڑی کے پتوں کے متعلق بھی سوچتا اور غور کرتا ہے ۔۔۔" اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر تیزی سے باہر نکل گئی۔

میں سوچتا ہی رہ گیا کہ اس نے وہ جملہ کیوں کہا تھا۔ اور اس سے اس کا مطلب کیا تھا ۔۔۔ لیکن مطلب اور مفہوم اس وقت میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ شاید میرا ذہن "دو جمع دو، چار" کرتے کرتے زندگی کے زیادہ جذباتی اور حساس مسائل کو گرفت میں لانے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔

پھر میری شادی ہوئی اور وہ نہیں آئی ۔۔۔ شادی سے ہفتہ بھر پہلے وہ شہر چھوڑ کر اپنی کسی رشتہ کی بہن کے پاس دور چلی گئی تھی ۔۔۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہاں جا کر وہ بہت بیمار پڑ گئی تھی اور دونوں ہسپتال میں رہی تھی۔ میری شادی کے دن البتہ اس کا تار ملا جس میں اس نے مجھے مبارکباد دی تھی اور میں سوچتا ہی رہ گیا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ عین میری شادی کے موقع پر وہ کیوں دور چلی گئی اور پھر گئی تھی تو وہاں سے ایسا کاروباری قسم کا مبارکباد کا تار کیوں بھیجا تھا جیسے میری اور اس کی بس واجبی سی جان پہچان رہی ہو اور تار بھیج کر اس نے پبلک ریلیشنز کا ایک ضروری اور پر تکلف فریضہ ادا کیا ہو!

شادی کے بعد میں نے مکان بدل لیا تھا اور پھر ایک طویل عرصہ تک میرا اور اس کا سامنا بھی نہ ہو سکا۔ البتہ گاہے گاہے مختلف ذرائع سے مجھے اس کے متعلق اطلاعات ملتی رہتی تھیں کہ اس نے میٹرک کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور کالج کے سماجی مشاغل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ بچپن ہی سے اسے تقریریں کرنے کا شوق تھا اور مباحثوں میں وہ ہمیشہ اعزاز حاصل کرتی رہی تھی۔ اس کی کہانیاں بھی میں اکثر رسالوں میں پڑھتا تھا۔ یہ شوق بھی اسے کم عمری سے تھا اور عمر کے ساتھ ساتھ اس کی تحریروں میں پختگی اور گہرائی آتی جا رہی تھی!

میری اپنی زندگی ویسے ہی سپاٹ اور غیر ہیجانی گذر رہی تھی جیسے دوسرے عام بیاہتا جوڑوں کی! چار سال میں دو بچے ہو گئے تھے اور میری بیوی جو پہلے ہی بہت گھریلو تھی اب اور زیادہ اپنے خانگی خول میں سمٹتی جا رہی تھی۔ مجھ سے اس کا ذہنی تعلق بس اتنا سا تھا کہ "آج دیر سے کیوں آئے ہیں" "اتنا کام کیوں کرتے ہیں" "آپ کے کپڑے نکال دیئے ہیں" "کھانا کھا لیجئے" "جلدی سو جایا کیجئے" وغیرہ وغیرہ۔ اسے دنیا کے کسی اور مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔۔۔ نہ ادب سے نہ آرٹ سے ۔۔۔ بلکہ فنونِ لطیفہ کا تو سایہ بھی اسے چھو کر نہیں گذرا تھا ۔۔۔ اور اس کا سپاٹ پن مجھے اور زیادہ زنگ آلود کئے دے رہا تھا ۔۔۔ جتنا جتنا وقت گذرتا جا رہا تھا مجھ میں یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ میری زندگی میں ایک ایسا خلا ہے جو صرف لطیف ذہنی قرب سے ہی پر ہو سکتا تھا! ہر شام جب میں دفتر سے گھر لوٹتا تو میرا جی چاہتا کہ کوئی مجھ سے صرف کپڑوں، کھانے، بچوں یا ان کی بیماری کی بات کرنے کے بجائے کوئی ایسی میٹھی، خوشگوار اور انوکھی بات کرے جو میرے ذہن کے زنگ آلود دریچوں کو یوں کھول دے جیسے بہار کی ہوا کا جھونکا بند کلیوں کو کھول دیتا ہے ۔۔۔! کوئی مجھ سے ادب کی بات کرے۔ موسیقی کی بات کرے۔ میرے ذہن کو گدگدائے۔ مجھے ادراک کی وادیوں میں لے جائے جہاں

وجود کی غیر مرئی اور خفتہ حقیقتیں یوں جاگتی ہیں جیسے جنگل میں ایک گولی کی آواز سے درختوں پر سوئے ہوئے سینکڑوں ہزاروں پرندے پر پھڑپھڑاتے ہوئے غول در غول اڑنے لگتے ہیں !! اور پھر مجھے وہ چھوٹی سی لڑکی بے تحاشا یاد آتی جس کی ذہنی عمر اس کی طبعی عمر سے بہت زیادہ بلکہ شاید میری عمر سے بھی زیادہ تھی۔ میں سوچنے لگتا کہ اگر وہ میری زندگی کی رفیق بن کر میرے ساتھ رہتی ہوتی تو میری زندگی کتنی مختلف ہوتی — کتنی جاذبیت، کیسی پرکاری ہوتی میری دنیا میں!! اس میں رنگ ہوتے — فن اور ادب کے گہرے خنک سائے ہوتے۔ ہر نیا دن ایک نئی دھج لے کر نکلتا — ہر شام تنوع لے کر آتی — اور مجھے زندگی گذارنے کا وہ اچھوتا شعور نصیب ہوتا جو دھنک کے رنگوں کی طرح اس سنگم پہ جنم لیتا ہے جہاں کوئی آبشار کسی چٹان پر گرتا ہے۔!! میرا وہ آبشار مجھ سے دور رہا۔ میدانوں میں بہہ رہا تھا اور میری زندگی کی چٹان پانی کی ایک بوند کو ترس رہی تھی!! لیکن جب مجھ پر زیادہ جنون طاری ہونے لگتا تو میں خود پر لعنت ملامت کر کے ذہن کے دھارے کو کسی سپاٹ راہ کی طرف موڑ دیتا — بھلا مجھے کیا حق تھا کہ میں اس کی معصوم زندگی پر اب اپنا آسیب زدہ سایہ ڈالنے کی سوچتا!! میری زندگی اگر خزاں کی گود میں مرجھا رہی تھی تو اس میں اس کا کیا قصور تھا — اور کیا ضروری تھا کہ میں اس کی شاداب بہار سے خنک سائے مانگ کر اس کے گلشن میں بھی آگ لگانے کی کوشش کرتا!!

اس طرح پانچ سال گزر چکے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے پانچ صدیاں گزر گئی ہوں کہ اچانک ایک سہ پہر کو دفتر میں اس کا فون آیا۔

"مجھے پہچانتے ہیں — ؟" اس نے پوچھا۔ آواز میں بڑی بہت سنجیدگی اور بڑا ٹھہراؤ تھا — وہ شوخ اور شریر لڑکی جسے میں پانچ برس پہلے جانتا تھا آج آواز سے بہت بڑی اور ذمہ دار لگ رہی تھی۔

"ہاں — پہچانتا ہوں —" میں نے جواب دیا۔

"میں شادی کر رہی ہوں —" اس نے بالکل اس انداز سے کہا جس طرح پانچ برس پہلے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں شادی کیوں کر رہا تھا۔

"اچھا —" میں نے بس اتنا کہا اور پھر ایک منٹ تک دونوں طرف سکوت رہا۔ نہ وہ بولی اور نہ مجھ میں آگے کچھ کہنے کی سکت تھی۔

آخر میں نے ہی اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے پوچھا "کون ہے — ؟"

"ہے کوئی — میں ٹھیک سے نہیں جانتی — گھر والوں نے طے کی ہے —" اس نے بالکل غیر جذباتی لہجہ میں جواب دیا۔

"مجھے کیوں بتا رہی ہو؟" — میں نے پوچھا — "اتنے سال میں آج میرا خیال آیا ہے — ؟"

"یوں بتا رہی ہوں کہ آپ کی طرح میں بھی بلائنڈ کھیل رہی ہوں —" اس نے طنزیہ کہا "سوچا آپ سے مشورہ کروں — آپ تجربہ کار ہیں نا۔ مجھے بتا سکیں گے کہ بلائنڈ کھیلنے میں نفع زیادہ ہے یا نقصان —" اس کے لہجے میں تیز نشتر سے چبھ رہے تھے۔

"سنو تم بہت سمجھ دار لڑکی ہو اس لئے کیا ضروری ہے کہ جو غلطی میں نے کی ہے تم بھی اس کا اعادہ کرو —" میں نے اس کے طنز کو محسوس کرتے ہوئے جذباتی ہو کر کہا۔

"ہاں۔ بہت ضروری ہے اس لئے کہ ایک زمانے میں آپ میرا آئیڈیل رہے ہیں" اس نے بہت غیر جذباتی انداز میں کہا۔ اور پھر ایک دم بولی "آپ میری شادی میں آئیں گے نا؟ — میں آپ کو کارڈ بھیجوں گی —" اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے فون بند کر دیا۔

میں اس کی شادی میں نہیں گیا — جانے کی ہمت نہیں پڑی — کس دل سے اسے کسی اور کے ساتھ رخصت ہوتے ہوئے دیکھتا۔ ہاں میں نے اسے شادی پر بہت اچھا سا تحفہ بھیجا اور مبارکباد کا کارڈ بھی، اور جواب میں چند روز بعد اس نے بھی مجھے بہت ہی نارمل طریقے سے شکریہ کا چھوٹا سا کارڈ بھجوا دیا تھا!

اس کی شادی کے بعد میں دانستہ اسے بھلانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ سوچ کر کہ وہ اب کسی اور کی ہو چکی تھی اور موہوم سی امید اور آس کی وہ ڈوری جو برسوں سے اس سے باندھے ہوئے تھا ٹوٹ چکی تھی۔ لیکن میں اپنے ذہن کو کیا کرتا کہ وہ اب اسے اور زیادہ یاد کرنے لگا تھا — جتنا جتنا میں اسے اپنی یادوں سے دور لے جانے کی کوشش کرتا اتنا ہی وہ مجھے اور زیادہ یاد آتی — اور میں سوچنے لگتا کہ ذہن اور ضمیر کی اس جنگ میں ذہن شاید ہمیشہ ہی حاوی رہے گا۔

ہمیشہ ہی جیتتا رہے گا!

اُس کی شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد مجھے اس قسم کی خبریں ملنی شروع ہوئیں کہ وہ اپنے گھر میں مطمئن نہیں تھی اور اس کی ازدواجی زندگی چین اور سکون کے بجائے بے چینی اور اضطراب میں گزر رہی تھی۔ خود اس کی ایک بہت قریبی اور عزیز دوست نے مجھے بتایا تھا کہ شادی اُس نے لڑکے کو دیکھے بغیر نہیں بلکہ اچھی طرح دیکھ بھال کے کی تھی ــــ اور جس دن مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا اُس دن مجھے بہت زیادہ صدمہ ہوا تھا ــــ ایک دھکا سا لگا تھا یہ سوچ کر کہ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا ــــ لیکن آخر اُس نے کیوں جھوٹ بولا تھا مجھ سے؟ کیا مجھے چرکا لگانے کے لئے ــــ یا محض یہ یاد دلانے کے لئے کہ ایک دن میں نے بھی اسی لاپروائی سے اُسے نظر انداز کر کے کسی اور کا ہاتھ تھام لیا تھا؟!

اور پھر ایک دن جب میں نے ایک پارٹی میں اسے اس کے شوہر کے ساتھ دیکھا تو مجھے بہت شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ اس کا شوہر بہت بے ہنگم اور بد وضع تھا۔ نہ اُسے بات کرنے کا سلیقہ تھا نہ محفل میں اُٹھنے بیٹھنے کی تمیز۔ وضع قطع سے بالکل جاہل، اُجڈ اور گنوار نظر آتا تھا ــــ عمر بھی اچھی خاصی تھی۔ اُس سے یقیناً بہت بڑا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ تیر کی طرح میرے پاس آئی ــــ "آیئے ــــ آپ کو اپنے شوہر سے ملواؤں ــــ دیکھئے ایمانداری سے بتایئے گا کہ میں نے جو بلائنڈ کھیلا تھا وہ کیسا رہا ــــ حکم کا بادشاہ نکلا یا چڑیا کا غلام ــــ" وہ بے دلی سے ہنسی ــــ اُس کی ہنسی میں بھی بلا کا طنز تھا اور لہجہ میں گہری گمبھیر تلخی۔

میں اور شرمندہ ہو گیا ــــ وہ اب تک مجھ سے جھوٹ بول رہی تھی ــــ اُس نے اب تک مجھے معاف نہیں کیا تھا ــــ آخر وہ کس سے انتقام لے رہی تھی ــــ مجھ سے یا اپنے آپ سے؟ اور نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ اچانک میں اُس کے شوہر سے ہاتھ ملائے بغیر تیزی سے پارٹی چھوڑ کر آ گیا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے اُس پارٹی میں مجھ سے ایسا آسیب چمٹ گیا ہو جو زندگی بھر مجھے ایک پل کے لئے آرام اور چین سے نہیں جینے دے گا!

اُس کے بعد وقتاً فوقتاً مجھے اُس کی ازدواجی زندگی کی بڑھتی ہوئی تلخیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کے متعلق خبریں ملتی رہیں، اور مجھے، میرے وجود کو ایک ایسی آگ میں جلاتی رہیں جس کا شعلہ کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا جس کی تپش میں، اور صرف میں تنہا میں محسوس کر سکتا تھا! دو ایک سال کے بعد اُس کے ہاں ایک بیٹا بھی پیدا ہو گیا۔ لیکن اولاد نے پیدا ہو کر بھی ازدواجی بندھن کو مضبوط نہیں کیا ــــ اُس کا شوہر جس کے متعلق شروع شروع میں اُڑتی اُڑتی سی خبر سُنی تھی کہ ذہنی مریض تھا، اب تقریباً پورا ہی دیوانہ ہو چکا تھا ــــ اُسے نہ گھر سے غرض تھی نہ بیوی بچے سے مطلب، اور نہ ہی وہ اس قابل رہا تھا کہ کوئی کام دھندا کر سکتا ــــ جو بھی کاروبار تھا وہ سب ٹھپ ہو گیا تھا ــــ پھر اُس نے خود یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ مجھے پتہ چلا کہ گھر بار چلانے کے لئے وہ خود کہیں کسی فرم میں ملازم ہو گئی تھی۔ میں نے ایک آدھ بار کچھ دوستوں کے ذریعہ اُسے امداد کی پیشکش بھی کی لیکن وہ بہت خوبصورتی سے ٹال گئی۔ مجھ سے براہِ راست بات نہیں کی لیکن مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اُسے میری امداد قبول کرنا کسی صورت گوارا نہیں تھا ــــ وہ اتنی خود دار اور غیرت مند تھی کہ کسی کا بھی سہارا لینا اُسے منظور نہیں تھا۔ اپنی، اپنے شوہر اور بچے کی گاڑی وہ خود تن تنہا کھینچ رہی تھی!

جتنے جتنے اُس کے مسائل اور مصائب بڑھ رہے تھے اتنا ہی میرے اندر احساسِ ندامت و جرم بڑھتا جا رہا تھا۔ میں سرتاپا خود کو اُس کا مجرم سمجھنے لگا تھا۔ یہ احساس روز بروز قوی سے قوی تر ہوتا جاتا تھا کہ اُس کی ساری مصیبتیں میری پیدا کردہ تھیں، میری لائی ہوئی تھیں۔ کاش میں نے اُس گھڑی اُس کو اور خود اپنے آپ کو سمجھا ہوتا جب ہم دونوں آزاد تھے ــــ ہر قسم کی ذمہ داریوں اور مجبوریوں سے تہی تھے ــــ آج ہماری زندگی کتنی پُرسکون کتنی مطمئن ہوتی ــــ اور مارے شرم کے میری ہمت نہ پڑتی کہ اُس کا سامنا بھی کر سکوں ۔!

اور پھر ایک دن میں نے سنا کہ وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ اُس کے ذہنی طور پر دیوانے شوہر نے ایک رات جنون کے عالم میں نیند کی ڈھیر ساری گولیاں کھا لی تھیں اور ایسا سویا تھا کہ پھر نہ اُٹھ سکا!

میں نے جب یہ سنا تو مجھے لگا جیسے اُس کے شوہر کا قاتل بھی میں ہوں۔ جیسے اُس کو بیوگی کا منحوس لباس پہنانے والا بھی میں خود تھا۔ اور پھر نہ جانے کیوں دفعتاً ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ بیوگی نے اُس کے پاؤں کی بیڑیاں کاٹ ڈالی تھیں۔ اُس کے ہاتھوں کی زنجیریں کھول دی تھیں اور اُسے آزاد کر دیا تھا۔ میرے لئے آزاد کر دیا تھا ۔۔۔ اور اب باقی کام میرا تھا کہ میں اپنی زنجیروں کو کب کاٹتا ہوں۔ لیکن کیا ضروری تھا کہ میں اپنی زنجیریں کاٹے بغیر اُس تک نہ پہنچ سکوں؟ میں اُن کے باوجود اُسے اپنا سکتا تھا ۔۔۔ مجھے خدا نے اتنا دیا تھا کہ میں دو گھروں کا خرچہ بیک وقت اٹھا سکوں۔ دو بیویوں کو آرام سے رکھ سکوں۔ میں اتنا مجبور تو نہیں تھا جتنا خود کو سمجھتا تھا ۔۔۔ ایسا بیکس، ورلاچار تو نہیں تھا کہ اُس کے حصہ کی خوشیاں اسے نہ دے سکوں!

اور زندگی میں پہلی بار پورے اعتماد اور کامل یقین کے ساتھ میں اُس کے گھر گیا۔ اُسے فتح کرنے کے لئے!

بیوگی نے اُسے کتنا بدل دیا تھا ۔۔۔ وہ جو کبھی میرے گھر میں بہار کے تازہ جھونکے کی طرح مسکراتی لہلہاتی آتی تھی جس کے تبسم میں کلیوں کا سا نکھار اور تازگی ہوا کرتی تھی جس کے قہقہے پہاڑی جھرنوں کی طرح سے اُبلتے اور رس ٹپکاتے تھے، آج مرجھائے ہوئے باسی پھول کی طرح منتشر اور ویران دکھائی دے رہی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس سے کس طرح بات شروع کروں ۔۔۔ وہ بہت ویران اور اداس آنکھوں سے مجھے بغور دیکھ رہی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ میرے اندر رستے ہوئے جوار بھاٹا کو اچھی طرح سے سمجھ رہی تھی ۔۔۔! آخر کار میں نے گلا صاف کرتے ہوئے ہمت کر کے کہا۔ "تم جانتی ہو میں تم سے کیا کہنے آیا ہوں؟"

"ہاں ۔۔۔ شاید جانتی ہوں ۔۔۔" اُس کی آواز میں کسی طرح کی جذباتیت نہیں تھی۔

"تو پھر یہ بھی جانتی ہوگی کہ تمہیں کھو کے میں کب سے پچھتا رہا ہوں ۔۔۔" میں نے رُندھے گلے سے کہا۔

"ہاں ۔۔۔ شاید"

"سنو ۔۔۔" میں نے اپنی ساری خود اعتمادی کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ "آج میں اپنے ہر جرم کا مداوا کرنا چاہتا ہوں۔ ہر اُس کھائی، اُس خندق کو پاٹ دینا چاہتا ہوں جو میرے اور تمہارے درمیان حائل رہی ہے ۔۔۔"

"اب بہت دیر ہو چکی۔ اس کا وقت گزر چکا ۔۔۔" اُس نے اُداسی سے جواب دیا۔

"نہیں ۔۔۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ۔۔۔" میرے لہجے میں التجا تھی۔

"کیسے نہیں بگڑا ۔۔۔" پہلی بار اُس کی آواز بلند ہوئی۔ لہجے میں تلخی تھی، اور آنکھوں میں گہری اداسی ۔۔۔ "جب میں کلی تھی تو آپ کو بہت کمسن اور نادان نظر آتی تھی ۔۔۔ اس وقت آپ مجھے اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ گھر کے گلدان میں سجا سکیں یا کوٹ کے کالر میں جگہ دیں۔ اور آج میرے دامن میں کانٹوں کے سوا اور کچھ نہیں بچا تو آپ اس دامن کو تھامنے کے دعویدار بن بیٹھے ہیں ۔۔۔ کیا بچا ہے اب میرے پاس جو میں آپ کو دے سکوں ۔۔۔ اور کیا بچا ہے آپ کے پاس جو آپ مجھے دے سکیں۔ ! کیا دیں گے آپ مجھے؟ بتایئے ۔۔۔ لٹی ہوئی آرزوئیں؟ نایافت امیدیں؟ پامال حوصلے؟ اور مجھے سوکن بنا کے دے جا کے بٹھا دیں گے اس معصوم عورت کے سینے پر جو اس سارے کھیل میں خاموش تماشائی ہے ۔۔۔ کیا قصور کیا ہے اُس نے جو آپ مجھ جیسے کانٹے کو ساری عمر کے لئے اُس کے پہلو میں چبھنے کو پیوست کر دینا چاہتے ہیں؟ جایئے عورت زندگی میں صرف ایک بار لٹتی ہے اور پھر اُس کے پاس لُٹانے کو کچھ نہیں بچتا ۔۔۔ میرے پاس بھی اب آپ کو دینے کے لئے کچھ نہیں بچا۔ آپ بڑے کھلاڑی تھے۔ آپ نے بلائنڈ کھیلا تھا اور آپ اس میں مات کھا گئے ۔۔۔ میں چھوٹی کھلاڑی تھی اس لئے میں نے پتہ دیکھ کے چال چلی تھی پھر بھی ہار گئی ۔۔۔ اس لئے ہار گئی کہ ہارنا چاہتی تھی۔ میں اپنے آپ سے انتقام لینا چاہتی تھی ۔۔۔ اور آج میرا انتقام پورا ہو گیا! یہی میری جیت ہے ۔۔۔ جایئے مجھے تنہا چھوڑ دیجئے ۔۔۔ اور آج کے بعد کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کیجئے گا ۔۔۔!" اس نے اپنے بچے کو گود میں اُٹھایا اور کمرے میں سے نکل گئی ۔۔۔ اسی طرح جیسے برسوں پہلے میری شادی سے قبل میری زندگی سے نکل گئی تھی!!

گم شدہ پرندوں کی آوازیں

آصف اسلم

جن دنوں میری ڈیوٹی شعبۂ ذہنی امراض میں تھی، ایک عجیب بات ہوئی۔ زنانہ وارڈ کے بستر نمبر ۲ کی مریضہ، جو بولتی نہیں تھی، یکا یک گانے لگی۔ دو ہفتے قبل وہ ہمارے ہسپتال میں داخل ہوئی تھی اور جب اسے لایا گیا تھا تو اس کی یہ حالت تھی کہ نہ وہ خود بولتی تھی نہ کسی دوسرے کی بات سنتی تھی۔ بے خودی کے عالم میں دن رات پڑی رہتی۔ اس کی ماں نے جو کیس ہسٹری ہمیں بتائی اس کے مطابق یہ اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے مقابلے میں شروع ہی سے عجیب تھی۔ گم سم، کھوئی کھوئی سی، تنہائی پسند اور بے ڈھب۔ سات آٹھ ماہ سے اس کو اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ گھر کے کونے کھدروں میں اکیلی کھڑی آپ ہی آپ سرگوشیاں کرتی رہتی۔ کوئی پوچھتا کہ کس سے باتیں کر رہی ہو تو کہہ دیتی کہ کسی سے بھی نہیں اور وہاں سے چلی جاتی۔ پھر اسے شکلیں نظر آنے لگیں۔ ہواؤں میں اور اندھیرے میں آدمی نظر آتے۔ طرح طرح کی چیزیں دکھائی دیتیں۔ آوازیں سنائی دینے لگیں اور جب دوسرے لوگ ٹوکتے کہ کہاں ہیں، کدھر ہیں، تو بگڑ کر جواب دیتی کہ بہرے ہو یا اندھے ہو گئے ہو؟ دکھائی نہیں دے رہا؟ یہ سامنے تو ہے! دوسروں کی بے یقینی پر چڑ کر اس نے بتانا بند کر دیا۔ ہر وقت چپ چاپ رہنے لگی۔ بولنا چھوڑ دیا۔ دن بھر یونہی ایک حالت میں بیٹھی رہتی۔ لٹاؤ تو لیٹ رہتی، اٹھاؤ تو اٹھ جاتی۔ کھانا پینا برائے نام کوئی زبردستی کھلا دیتا تو کھا لیتی ورنہ ایسے ہی خالی بیٹھی رہتی۔ چلنا پھرنا بھی بند کر دیا۔ جب اسے چلنے کی کوشش کی جاتی تو چیخیں مارنے لگتی۔ آخر ماں باپ نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ بستر پر پڑی رہتی اور پڑے پڑے اپنے آپ سے باتیں کیے جاتی۔ کبھی خود ہی ہنسنے لگتی۔ ہنستے ہنستے اُچھو ہو جاتا اور کبھی اتنا روتی کہ روتے روتے ہلکان ہو جاتی۔ کسی نے کہا آسیب ہے۔ کسی نے کہا نظر لگ گئی۔ کسی کو جن چڑھنے کا شبہ ہوا۔ پیروں فقیروں کے پاس لے جایا گیا۔ جھاڑ پھونک کرائے گئے اور جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو آخری ترکیب کے طور پر اسے ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔

ہسپتال میں بھی اس کی یہی حالت رہی، سوائے اس کے، جب اسے بے چینی کا دورہ پڑتا تو وارڈ کے برآمدے میں ایک سرے سے دوسرے تک اور پھر واپس، ٹہلتی رہتی ورنہ بستر کے کنارے گردن جھکائے ٹانگیں اوپر کئے، گھٹنے پیٹ کی طرف سختی سے موڑے، خالی نظروں سے نہ جانے کیا تکے جاتی۔ عموماً ایسے لوگوں کی ذہنی دنیا ونڈر لینڈ کی طرح ہوتی ہے کہ وہ انفرادی زندگی کی کشاکش سے ماورا جا کر ذات کے خلا اور شعور کے وقت میں سفر کرتے ہیں، ذہنی بیماری کا یہ تجربہ بالکل معمولی لوگوں کے لئے بھی ایسی صورت بن جاتا ہے کہ ان کے بند دماغوں میں پڑتی دراڑوں میں سے روشنی اندر اترنے لگتی ہے، مگر اس کے ذہن پر کیا بیت رہی تھی یہ کسی کو پتہ نہ تھا۔ وہ کیا سوچتی تھی، کیا واقعی اسے مافوق الفطرت ہیولے نظر آتے تھے یا وہ انسانیت کے پچھلے کسی دور کی طرف لوٹ گئی تھی۔ جہاں شعور خام اور احساس غیر تربیت یافتہ تھا، اسے کوئی صدمہ پہنچا تھا، جذباتی دھچکا

لگا تھا یا اُس کا ذہن اُتھلے گڑھے میں جمع بارش کے پانی کی طرح گدلا ہو گیا تھا؟ وہ تو بس مجہولیت کے عالم میں گم تھنگ بیٹھی رہتی۔ کوئی پوچھتا کہ کیسی ہو تو منہ سے کچھ نہ بولتی اور ایسی چبھتی نظروں سے گھورتی جیسے وہ کئی سو منزلہ عمارت کے ٹاپ فلور پر کھڑی ہو کر نیچے سے ہاتھ ہلانے والوں کو دیکھ رہی ہو، جہاں سے اُسے لوگ بونوں کے برابر اور ہر چیز مسخ نظر آ رہی ہوگی۔ وہ اونچائی کے سبب سے اس کا سر چکرا رہا ہوگا۔ اس کی عمر کوئی سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ لیکن چہرے پر اس شادابی کی جگہ جو اس عمر کی لڑکیوں پر ہوتی ہے، ایک طرح کا روڈھاپن تھا۔ چوڑا ماتھا، کس کر گندھی ہوئی مینڈھیاں، چپٹی ناک، سامنے کے دو دانتوں میں سے ایک دانت ٹیڑھا، نکیلا ذرا سا باہر کو نکلا ہوا، جذبات سے عاری سپاٹ چہرہ لئے، کچھوے کی طرح گردن اندر کئے، پیٹھ میں کُبھ نکالے بیٹھی رہتی۔ دوسرے مریضوں کے برخلاف وہ بے ضرر تھی، اس لئے اسے گھومنے پھرنے میں خاصی آزادی بھی تھی، اس کی اتنی کڑی نگرانی بھی نہ ہوتی تھی۔ شعبے کا عملہ اور دوسرے مریضوں کے پاس باہر سے آنے والے مہمان اس سے اچھا رویہ رکھتے، چاہے دل میں خوف کھاتے ہوں کہ یہ ذہنی مریض ہے۔

تو وہ ذہنی مریض لڑکی عشرت جہاں گانا گانے لگی۔ ایک رات ضرورت مند مریضوں کو سکون آور گولیاں دے کر اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے، میں ڈیوٹی روم واپس جا رہا تھا کہ دروازے کے پاس سے، جہاں بستر نمبر ۲ لگا ہوا تھا، گانے کی سریلی آواز آنے لگی۔ کوئی پرانا فلمی گیت تھا۔ جس کے بول وہ دہراتے جا رہی تھی "کہیں دیپ جلے کہیں دل"۔ میں نے حیرت سے مُڑ کر دیکھا کہ یہ گُپ چُپ سی لڑکی گا رہی ہے، تو آواز بند ہو گئی۔ اگلی صبح راؤنڈ کے وقت میں اس کے سامنے سے گزرا تو وہ اسی طرح ٹانگیں پیٹ میں دھنسائے، گردن ڈالے، سر جھکائے، بیٹھی فرش کو گھور رہی تھی۔

"بی بی آپ بہت اچھا گاتی ہیں"۔ میں نے اس سے کہا، تو اس نے آنکھیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ خفیف سی مسکراہٹ ہونٹوں کے کونوں پر جھلکی، گالوں میں رنگ کا ایک شائبہ آیا اور گیا۔ وہ کچھ اور سمٹ گئی۔

"آپ گایا کیجئے، اس سے آپ کا دل بہلے گا اور طبیعت بھی بہتر ہو جائے گی"۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ کوئی چیز ایسی ہو جو اسے ہر وقت طاری رہنے والے گمبھیر ڈپریشن سے نکال کر زندگی کی گہما گہمی میں شریک ہونے پر اُکسا سکے۔ اس کے ذہن پر ڈپریشن اس گھنگھور گھٹا کی طرح چھایا ہوا تھا جو نہ کھل کر برستی ہے نہ برس کر کھلتی ہے۔ اسے اس خوابناک دھند کے سے جگا کر نارمل زندگی میں واپس لانے کے لئے خاصی تیز دوائیں دی جا رہی تھیں۔ مگر اس کے رویے میں خاطر خواہ تبدیلیاں نہ پیدا ہو سکی تھیں۔ وہ اسی طرح بستر کے کنارے پر بیٹھی خلاؤں میں کسی غیر مرئی شے کی طرف دیکھ کر غیر حاضر دماغی سے مسکراتی رہتی۔ اب اتنا فرق پڑا تھا کہ وہ بعض چیزوں کے بارے میں اپنا ردِعمل ظاہر کرنے لگی اور کبھی کبھار ایک آدھ جملہ بھی بولنے لگی۔ صبح کا ناشتہ میں ابلا ہوا انڈا جو ملتا تو وہ لے کر تکیے کے نیچے چھپا لیتی اور نرس سے کہتی کہ یہ مور کا انڈا ہے۔ اس میں سے مور کی دُم باہر آئے گی، پھر دیکھنا کتنے رنگ پھیلیں گے۔ تکیے کے نیچے اس نے دس بارہ انڈے جمع کر رکھے تھے، کافی دیر تک بیٹھی ان کو تکتی رہتی کہ اب ان میں سے مور کی دم نکلے گی، اور جب کچھ نہ ہوتا تو روہانسی ہو جاتی، سب کچھ پھینک پھانک کے الگ کھڑی ہوتی اور پیر پٹخنے لگتی۔ نہانے سے خود تو دور بھاگتی تھی گویا اپنے سیکریشنز میں تر بتر رہنا چاہتی ہو، ہر وقت اس کے پاس سے پسینے کے بھبکے اُٹھتے رہتے۔ جیسے کپڑوں میں مچھلیاں سڑ رہی ہوں۔ نرسیں زبردستی لے نہلانے جاتیں تو رو پڑتی، پچھاڑیں کھانے لگتی اور موقع ملتا تو غسل خانے سے ننگی بھاگ آتی اور چھپ جاتی۔ مگر اب اسے دوسری مریضاؤں کی جوئیں دیکھنے کا شوق ہو گیا۔ گھنٹوں بیٹھی ان کے ایک ایک بال میں سے جوئیں دیکھیں چنتی رہتی۔ جوں پکڑ لیتی

تو اس کو ناخن سے کھل کر ہنستی اور کہتی یہ جوں چٹ پٹ ندی لال ہوئی :: خون کا سرخ دھبہ اپنے کپڑوں سے پونچھ کر پھر جوئیں چننے لگتی۔ کبھی وارڈ سے ملحقہ باغ میں جا پہنچتی اور دیر تک بیٹھی کیڑے مکوڑوں کو دیکھتی رہتی۔

یہ ذہنی مریض جو کبھی انسان بھی رہے ہوں گے، ان غلیظ، گھناؤنے تلخ حقائق کی طرح تھے جن کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ صحیح الدماغ لوگوں کے سیانے معاشرے سے مسترد ہو جانے کے بعد ان مریضوں کو ہسپتال کے وارڈ میں چھڑوا دیا گیا تھا کہ ان سے چشم پوشی کی جا سکے۔ باہر سے آنے والے لوگ انہیں احساسِ برتری کے پیدا کردہ تمسخر سے دیکھتے جیسے چڑیا گھر میں بندروں کے پنجرے کے سامنے کھڑے ہوں۔ ہسپتال کا نچلا عملہ ان کے حصے کا کھانا چرانے کے ساتھ ساتھ اُن سے کتوں سے بدتر سلوک کرتا۔ یہ سوچ کر کہ یہ پاگل ہی تو ہیں۔ نرسیں بھی ان سے گھبراتیں جیسے سرکس کے بھوکے شیروں کے پنجرے میں گوشت ڈالنے کے لئے داخل ہو رہی ہوں۔ مگر یہ سرکس نہ تھا۔ سرکاری ہسپتال کا شعبۂ ذہنی امراض تھا۔ وارڈ کے دروازے پر موٹا سا تالا پڑا رہتا اور ایک بندوقچی چوبیس گھنٹے پہرے پر رہتا۔ قریب آنے کی ممانعت کرتی ہوئی عمارت اور عمارت کے اندر اندھیرے کمروں کی بدبودار گھٹن، نامعلوم خوف کا دبا دبا احساس، مریضوں کی وحشت انگیز شکلیں اور برآمدوں میں اچانک بے سبب دیوانہ وار قہقہے یا مسلسل سسکیاں یہاں ذہنی مریض وحشی درندوں سے بدتر حال میں رہتے۔ لیکن جہاں دوسرے مریضوں کے آئے دن لڑائی جھگڑے ہنگامے ہوتے رہتے، عشرت کبھی مصیبت نہ بنی۔ مگر اس کا گانا جلد ہی مصیبت بن گیا۔

رات کو جب سونے کا وقت ہو گیا، مریض لیٹ گئے، وارڈ کی بتیاں بجھ گئیں تو وہ گانے لگی۔ شعبے کی عمارت گہری نیند میں گم ہو رہی تھی، رات کا دریا طغیانی میں آ کر اپنے کناروں سے ابل رہا تھا اور اندھیری رات کا مہیب سناٹا بہنے لگا تھا جس سے زندگی اپنی روزمرہ کی دیکھی بھالی جانی پہچانی حقیقتوں سے کٹ کر ایسا ہیلوسی نیشن بن گئی تھی جو واقعی دیوانے کا خواب معلوم ہوتا تھا۔ اندھیرے کی آغوش میں کچھ سوئے کچھ جاگے مریضوں کے بستروں میں سے، ان کے سانس لینے کی ہلکی ہلکی آواز کے تسلسل میں وہ گا رہی تھی۔ دھیمے لہجے سے شروع ہو کر اس کی لے اتنی اونچی ہو گئی کہ واضح اور صاف سنائی دینے لگی۔ گیت کے بول رہی تھے ——

کہیں دیپ جلے کہیں دل
ذرا دیکھ لے آ کے پروانے
تیری کون سی ہے منزل

آواز نے رات کے ہولناک سکوت کو چھیڑ دیا۔ مریض کروٹیں بدلنے لگے، کسی نے گھر کا یا زور سے اوں ہوں کیا تو آواز تھم جاتی۔ لیکن اگلا ذرا خاموش رہا تو وہ دوبارہ گانے لگتی۔ اندھیرے میں ڈوبا وارڈ اندوہناک مذاق معلوم ہو رہا تھا۔ وارڈ کے اس وحشت خیز ماحول میں پھیلتی ہوئی اس آواز میں عجیب الم انگیز حسن تھا۔ قبرستان کی چاندنی جیسی سوگوار آسیب زدگی جیسے دیکھ کر زندگی خود اپنی ہی تضحیک معلوم ہونے لگتی ہے۔ اچانک اس کی آواز بند ہو گئی۔ بستر نمبر ۳ کی مریضہ نے بچے کی پیدائش کے بعد سے وہم لاحق ہو گیا تھا کہ اس کے پیٹ میں کیچڑ بھر گئی ہے، کندھوں سے پکڑ کر اسے لٹا دیا اور دوپٹے سے اس کا منہ باندھ دیا۔ اس پر وہ چپ ہو گئی۔ تھوڑی دیر لیٹی رہی، پھر دوپٹہ کھول کر پھینک دیا اور سسکیاں لینے لگی۔ سسکیاں بھرتے بھرتے سو گئی۔ لیکن اگلی رات وہ پھر گانے لگی۔ اس کے بعد والی رات بھی اور اس سے اگلی بھی۔ وارڈ کی بتیاں بجھتیں، نائٹ ڈیوٹی والے ڈاکٹر اور نرس آخری راؤنڈ لگا کر چلے جاتے، مریضوں کو دی ہوئی نیند کی گولیاں اثر دکھانے لگتیں اور سارے میں

نیم غنودگی کی کیفیت ہوتی، تو یہ بیٹھے سے اُٹھ بیٹھتی، آنکھیں بند کر لیتی اور گانا شروع کر دیتی "کہیں دیپ جلے کہیں دل" دن بھر وہ بستر کے کنارے سر جھکائے انقباض کی سی حالت میں بیٹھی رہتی۔ رات آتی تو اس کے اندر نغمگی پھوٹنے لگتی، وہ چہکنے لگتی۔ اسے ایک ہی گیت آتا تھا، اس کے علاوہ وہ کچھ اور نہیں گاتی تھی، بس اس کے بول دہرائے جاتی اور اس وقت تک گاتی رہتی جب تک کوئی دوسری مریضہ اسے مار کر چپ نہ کرا دیتی۔ لیکن ادھر وہ چپ ہوئی ادھر اس نے اپنا الاپ شروع کیا۔ کمرے کا سناٹا اندھیرے میں ڈوبے دریا کی طرح رواں ہو جاتا جس پر اس کی غمناک آواز کشتی کی طرح پھسلنے لگتی۔ دوسرے مریضوں کی شکایت پر نرس نے اُسے نیند کی گولی دی کہ یہ سو جائے اور گانا نہ گائے تو اس نے نرس کی آنکھ بچا کر گولی اپنے گریبان میں ڈال لی اور جھوٹ کہہ دیا کہ کھا لی۔

ذہنی مریض اکثر بے خوابی کا شکار ہوتے ہیں، بمشکل انہیں نیند آپاتی اور جہاں وہ اونگھنا شروع کرتے یہ گانے لگتی اور ان کی نیند اُچٹ جاتی۔ اس سے ان کا مزاج اور چڑچڑا ہو گیا۔ بستر نمبر ۹ کی مریضہ پلنگ کے نیچے جا کر لیٹ گئی اور باہر آنے سے انکار کر دیا۔ ۳ نمبر نے ۷ نمبر کی قمیض پھاڑ ڈالی اور ۷ نمبر نے ۳ نمبر کا منہ نوچ لیا، ۱۲ نمبر کو شکایت ہو گئی کہ اس کے خوابوں میں آنے والا راجکمار جو اس سے بیاہ کرنے آرہا تھا، گانا سن کر ناراض ہو گیا اور بارات واپس لے جا رہا ہے۔ ۸ نمبر کے سر کا درد بڑھ گیا اور ۵ نمبر نے ناشتہ کی ٹرے نرس کے سر پر دے ماری جس سے نرس کا کان خون خون ہو گیا۔ سارے وارڈ میں ہنگامہ برپا ہو گیا اور اس ہنگامے کا اصل سبب، یعنی عشرت اسی طرح بستر کی پٹی پر بیٹھی خالی نظروں سے چھت کو گھورتی رہی۔ اس کا گانا کسی کو پسند نہ آیا، سب اس سے جھنجھلانے لگے۔ پہلی دفعہ تو اس کا منہ باندھ دیا گیا تھا، اس کے بعد بستر نمبر ۵ کی مریضہ نے، جس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ ملکۂ مصر قلوپطرہ ہے، اس کے منہ پر تڑاتڑ طمانچے مارنے شروع کر دیے اور اگر نرس آ کر ان کو الگ نہ کراتی تو وہ مار مار کر عشرت کا بُرا حال کر دیتی۔ عشرت گائے کی طرح پٹتی رہتی، مارنے والا بے جان ہو کر ہٹ جاتا تو پھر اسی طرح گانے لگتی، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ مارنے والے کی طرف سرکش نگاہوں سے دیکھتی جاتی اور آنسوؤں سے لرزتی، کپکپاتی آواز وارڈ میں بلند ہونے لگتی: "کہیں دیپ جلے کہیں دل ....."

جب وہ کسی طرح نہیں مانی تو اس کی ماں سے کہا گیا کہ اُسے سمجھائے۔ "بیٹی تو گایا نہ کر" اس کی ماں نے اس سے کہا

"کیوں نہ گاؤں؟" اس پورے عرصے میں وہ پہلی دفعہ ماں سے بولی تھی۔

"تیرے گانے سے ہمسایوں کی نیند خراب ہوتی ہے"

"میرا دل کرے گا تو میں خوب گاؤں گی، سونے والے سویا کریں" اس نے کہا

"رات کو گائے گی تو مار پڑے گی۔ کم بخت، گایا نہ کر"

ماں کی بات سن کر وہ سپاٹ چہرے، جذبات سے عاری آنکھوں سے اسے تکتی رہی، پھر ایک دم سے بستر پر سے اُٹھی، ماں کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی، آنکھیں نکال کر اسے گھورنے لگی، دانت ایک دوسرے کے اوپر مضبوطی سے جما لیے، ہونٹوں پر تھوک کے بلبلے بننے لگے۔ یکایک منہ بھرا، زبان باہر نکالی اور اپنی ماں کے منہ پر تھوک دیا۔ تھوک کر اسی طرح چپ چاپ اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گئی اور دیوار کی طرف تکنے لگی۔ جہاں برساتی کی سیلن کے نشان سے ایک شکل سی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

دوسرے مریضوں کے ساتھ ساتھ وارڈ کی نرسیں بھی اس سے شاکی رہنے لگیں۔ اس کے گانے سے ان کی بھی نیند خراب ہوتی تھی کیونکہ نائٹ ڈیوٹی کے وقت وہ وارڈ کے برابر ایک خالی کمرے میں سویا کرتی تھیں۔ عشرت کے گانے سے ان کی چین

کی نیند غارت ہونے لگی۔ تو ان کے برتاؤ میں بھی شفقت کی جگہ، جھنجلاہٹ آ گئی۔ مگر عشرت نے گانا نہ چھوڑا۔ ہر رات اس کی آواز میں سوز بڑھتا جاتا۔ پتلی آواز کی نغمگی غم کے بوجھ سے تھر تھرانے لگتی۔ "کہیں دیپ جلے کہیں دل۔"

گانے کے ساتھ اس کی بے چینی بھی بڑھنے لگی۔ بیٹھے بیٹھے خود ہی مسکرانے لگتی۔ افسردہ آنکھیں چمک اٹھتیں، چہرے پر رنگ پھیلنے لگتا اور ذرا دیر چہرہ پھر تمام جذبات سے عاری ہو جاتا، وہ گردن جھکا کر سمٹی سکڑی بیٹھی رہتی۔ کبھی بال بنانے میں گنگنانے لگتی۔ پھر فوراً ہی سہم کر چپ ہو جاتی۔ کھانا پینا اور بھی کم دیا، دوا کھانے سے صاف انکار کر دیتی، ہر وقت پیٹ میں درد اور جیبھن کی شکایت کرتی، گھبرائی ہوئی وارڈ کے برآمدوں میں پھرتی رہتی۔ بار بار بالوں میں کنگھی کئے جاتی، پھر بھی شبہ رہتا کہ بال صحیح طرح بنے نہیں، گندھا ہوا سر کھول دیتی اور پھر سے چوٹی گوندھنے لگتی؛ اس طرح دن میں پندرہ سولہ مرتبہ سر گوندھتی، بال بناتی، پھر کھول دیتی۔ اس کی گھبراہٹ اشتعال میں بدلنے لگی۔ ایک رات نرس نے اسے سکون سے سونے اور دوسروں کو سونے دینے کے لئے انجکشن لگانا چاہا تو اس نے نرس کے کاٹ کھایا۔ کسی مریضہ کو دیکھنے اس کی ایک رشتہ دار عورت آئی، کھانے پینے کا سامان لئے، گود میں بچہ، ہاتھوں میں ٹوکریاں، بچے کو دیکھ کر عشرت بستر سے اٹھی، بھاگتی ہوئی اس عورت کے پاس پہنچی، اس کی گود سے بچہ گھسیٹ لیا، اسے اپنے بستر پر لے آئی اور بچے کے منہ پر منہ مل مل کر اس قدر پیار کئے گئی کہ بچہ پریشان ہو کر رونے لگا۔ جتنا وہ روئے یہ اور پیار کئے جائے۔ اس کے منہ سے رال بہہ بہہ کر بچے کے اوپر ٹپک رہی تھی۔ اس عورت نے گھبرا کر چلانا شروع کر دیا۔ "دوڑیو پکڑیو پگلی میرا بچہ چھین کر لے گئی ..... ہائے مارے ڈالتی ہے، ارے گلا گھونٹ دے گی۔ اس کا ہائے میرا بچہ...."

نرسوں نے بچہ واپس لینا چاہا تو اس نے بچے کو اپنی گود میں چھپا لیا، زبردستی کی گئی تو اس بے حال بچے کو اتنی مضبوطی سے دبوچ لیا کہ الگ نہ کیا جا سکے۔ آخر بڑی مشکل سے اس کو قابو میں کیا گیا اور ادھ موا بچہ ماں کو لوٹایا گیا۔ وہ عورت غریب تو اپنا بچہ بغل میں داب فوراً وہاں سے بھاگی، ادھر عشرت دیواروں سے سر پھوڑنے لگی کہ "میرا ببلو منا برقعے والی چوری کر کے لے گئی۔" دورے کی سی کیفیت ہو گئی، جو پاس آئے اسی کو مارنے لگے۔ گالیاں بکتی ہوئی سارے وارڈ میں دوڑنے لگی۔ نرس کے بال پکڑ کر نوچ ڈالے، دانتوں سے پکڑ کر پردے لیر لیر کر ڈالے۔ اپنی ماں کو بھی مارا اور جس مریضہ کے پاس وہ بچے والی عورت آئی تھی اس کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔

اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے شعبے کے رجسٹرار ڈاکٹر قاضی نے فیصلہ کیا کہ اسے بجلی کے شاک لگائے جائیں یعنی الیکٹرو کونسلنٹ تھیریپی (جسے الیکٹروپلیکسی بھی کہتے ہیں) دی جائے۔ سارے مریضوں میں یہ خبر ہراس کی ایک لہر بن کر پھیل گئی کہ عشرت کے بجلی کا ٹیلیفون لگنے والا ہے۔

دو ایک مریض ڈر کے غسل خانے میں جا چھپے اور بعض آنکھیں بند کر کے بستر میں لیٹ گئے، ان کے لئے ای سی ٹی کی وہی دہشت تھی جو قدیم یونانیوں کے لئے دیوتا زیوس کے تھنڈر بولٹ کی۔ اگلی صبح اسے بستر پر زبردستی لٹا دیا گیا اور تین وارڈ بوائیز بلوائے گئے۔ جنہوں نے اس کے ہاتھ پیر پکڑ لئے کہ وہ حرکت نہ کر سکے۔ ای سی ٹی دینے کا قاعدہ یہ ہے کہ بجلی لگانے سے پہلے انستھیزیا دیتے ہیں کہ مریض پر غنودگی طاری رہے اور مسل ریلیکسر کا انجکشن لگاتے ہیں کہ عضلات ڈھیلے پڑ جائیں اور تشنج کی کیفیت نہ پیدا ہو، مگر ہمارے سرکاری ہسپتال میں ان تکلفات کے استعمال کی نوبت کم ہی آتی ہے۔ عشرت کو پکڑ کر لٹا دیا گیا، بجلی کا کرنٹ سورس سے ہوتا ہوا تاروں میں دوڑتا ہوا اس کے دماغ تک پہنچا۔ بجلی کا جھٹکا لگتے ہی اس کا سارا بدن بہت زور سے پھڑکا پھر ایک دفعہ اور تھر تھرایا اور بری طرح جھنجھانے لگا۔ پھر اکڑ کر یک لخت ساکت ہو گیا۔ مگر اتنی خوف ناک حرکت کے بعد یہ سکوت زیادہ بھیانک تھا۔ اس کی پتلیاں چڑھ گئیں، چہرہ بگڑنے لگا، نرس نے اس کے منہ پر کپڑا رکھا ہوا تھا۔ مگر ادھ کھلے ہونٹوں میں سے

سختی کے ساتھ بھنچے دانت نظر آرہے تھے اور حلق سے خرخراہٹ کی آواز نکلنے لگی۔ چہرے کے اعصاب پھڑکنے لگے، پھڑکتے ہوئے عضلات کی لہر نیچے کی طرف جانے لگی، تھیرا ہوا بدن پھر ستر تھرایا، اعصاب کانپنے لگے۔ جسم نے دوبارہ جھٹکا کھایا، دو آدمیوں نے دوڑ کر اس کے پاؤں تھام لیے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ پٹخنیاں کھانے لگے گی اور ذبح کئے جانے والے زخمی جانور کی طرح سارے میں لوٹتی پھرے گی۔ مضبوط گرفت کے نیچے اس کا سارا بدن پھڑک رہا تھا، کانپ رہا تھا۔ ایک بار گی اس کی گردن دوسری طرف ڈھلک گئی، پھڑکن کم ہو کر صرف کہیں کہیں باقی رہ گئی تھی، جیسے گھٹتے ہوئے جزر کے بعد ساحلی چٹانوں میں کہیں کہیں ٹھہرا ہوا سمندر کا پانی، جسم کہیں سے کانپتا ہوا لرزتا ہوا اور کوئی حصہ بالکل پُرسکون۔ پیٹ کے عضلات مردہ ہیں، اور چہرہ اور ہاتھ اینٹھے ہوئے ہیں۔ نرس نے اس کے منہ پر سے کپڑا ہٹا لیا، اس کے ہاتھ پیر چھوڑ دیئے گئے۔ بہت دیر تک وہ بے سدھ پڑی رہی۔

رات کے وقت میں وارڈ کا راؤنڈ لگا رہا تھا کہ میں نے وہی آواز دوبارہ سنی۔ وہ گا رہی تھی :-

نہ میں سپنا ہوں نہ کوئی راز ہوں
ایک درد بھری آواز ہوں

پیا دیر نہ کر آ مل، کہیں دیپ جلے کہیں دل...... اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور چہرے پر گر رہے تھے۔ اس کا چہرہ جو سپاٹ رہا کرتا تھا اس پر وحشت، خوف، درد اور بے بسی کا عجیب انداز تھا۔ میں گذرا تو اس کی نظروں میں التجا تھی۔ میں رک گیا۔

"میرا پیٹ دکھتا ہے۔ یہ سارے لوگ میرے گلے کو اپنے جوتوں سے کیوں کچل رہے ہیں، یہ میری آواز کو کیوں قتل کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب؟" اس کی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں اور اس نے بہت آہستہ سے کہا۔

"بہت درد ہو رہا ہے میرے پیٹ میں ....." پیٹ پکڑ کر وہ تقریباً دوہری ہو گئی۔

"کیا ہو گیا پیٹ میں؟"

"گانے کے لئے منہ کھولا تو سانپ گھس گیا اس میں ——— ہرے رنگ کا سانپ ہے اور مجھے کاٹ رہا ہے۔ پیٹ میں چلتا ہے تو میرے درد ہوتا ہے ....."

"سانپ؟" میں چونک گیا۔ اس کا مشاہدہ کرتے کرتے ہیں، عرفِ عام میں ڈاکٹر خانے کا پاگل، جو شیزوفرینیا سے اتنا مانوس ہو چکا تھا کہ صحیح الدماغ لوگ نارمل نہیں معلوم ہوتے تھے اور یہ فرق گڑبڑاتا جا رہا تھا کہ میں اس کا علاج کر رہا ہوں یا وہ میری سائیکو تھیراپی کر رہی ہے۔

"ایسا گول گول منہ ہے۔ بچے کا جیسا کھونڈا، جس میں مسوڑھے ہی مسوڑھے ہیں، مسوڑھوں میں میرا پیٹ دبا کر کاٹ رہا ہے بہت دکھتا ہے..... ہائے" تکلیف سے اس کا چہرہ بگڑنے لگا۔ پیٹ پکڑ کر زور سے دبانے لگی۔ جیسے اتنا حصہ اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتی ہو۔ انگلیاں کھال میں گڑی جا رہی تھیں۔ قریب تھا کہ وہ اپنے ناخن پیٹ میں اُتار دے کہ اس کی ماں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"سانپ گانا گاتا ہے اور میں نہ گاؤں تو مجھے کاٹتا ہے۔ میری آواز مجھے ڈسنے لگتی ہے، گلا گھٹتا جاتا ہے، حلق پھٹنے لگتا ہے۔ میری آنتوں میں کنڈلی مارے بیٹھا ہے اور اس کی زبان لال ہے..... میرا پیٹ دیکھو نا ڈاکٹر....." وہ اپنا پیٹ کھول کر بیٹھ گئی۔

"اچھا، اچھا ....." اس کی تسلی کے لئے میں نے ٹارچ کی روشنی جلا کر اس کے پیٹ پر پھینکی۔
اس کی ماں برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے ٹارچ جلاتے دیکھ کر بولی "اے لو ڈاکٹر صاحب تو سچ مچ پگلی کی بات کا اعتبار کر بیٹھے"۔ عشرت نے فوراً اپنی قمیض پیٹ پر کھینچ لی اور لیٹ گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"پگلی ہوں ناں میں؟ سب مجھے گندہ کیوں کہتے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب؟ پاگل خراب ہوتے ہیں کیا؟ میں تو شرارت بھی نہیں کرتی، چھوٹا بھائی شرارت کرتا ہے تو سب اسے پیار کرتے ہیں، میں چپکی بیٹھی رہتی ہوں تو مجھے کوئی پیار نہیں کرتا۔ اماں کہتی ہیں اس کی شکل سے نفرت آتی ہے۔ مہمان آتے ہیں تو مجھے کوٹھری میں بند کرکے تالا کیوں لگا دیتے ہیں جی؟ کہتی ہیں کسی کو پتہ نہ چلے اس گھر میں پاگل لڑکی ہے ورنہ بہنوں کے رشتے نہیں آئیں گے۔ میں تو کھانا بھی پکاتی ہوں پانی بھرتی ہوں۔ جھاڑو دیتی ہوں، پھر کون پاگل ہے۔ میں تو نہیں ہوں۔ میرے گھر والے سب پاگل ہو گئے ہیں ــــ خطرناک ــــ یہ مجھے پاگل کیوں کئے دے رہے ہیں؟ کوئی میں پاگل ہوں؟ میں پاگل نہیں ہوں ناں؟ بس میرا جی نہیں اچھا رہتا۔ آپ ہی آپ دل گھبرائے جاتا ہے اور اتنے سارے لوگ باتیں کرتے ہیں سامنے سے گزرتے ہیں، اتنی چیزیں ہیں پھر مجھے رونا آنے لگتا ہے، بے چینی ہوتی ہے، نیند نہیں آتی اور ہر وقت پیٹ میں درد ہوتا ہے اور یہ سانپ کا ہرا رنگ ..... یہ اپنی لال زبان میرے اوپر نہ پھیرتا تو میں روتی بھی نہیں ڈاکٹر صاحب ..... یہ پاگل لوگ مجھے کیوں پاگل بنائے دے رہے ہیں ....." آنسوؤں کے درمیان بولتے بولتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ تکیے پر منہ اوندھائے سسکتی رہی۔ میں نے اسے تسلی دینا چاہی مگر اس نے منہ چھپا لیا اور میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس کو سکون آور انجکشن لگا کر میں آگے بڑھ گیا، دوسرے مریض دیکھنے لگا۔ وارڈ سے باہر آتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ اسی طرح منہ ڈھانپے پڑی ہے۔

صبح اس کا بستر خالی پڑا تھا اور اس کی ماں رو رہی تھی۔ اس نے پلنگ کی چادر گلے میں باندھ لی تھی اور چھت کے پنکھے سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس کی زبان باہر نکل آئی تھی اور مسخ چہرے پر ندامت بکھری ہے بس آنکھیں وحشت سے اُبل آئی تھیں۔ پگلی مر چکی تھی۔ اُس رات اُس کے گھٹنے کی آواز نہیں آئی۔ سارے مریض اور تمام عملہ چین سے سویا۔ کسی کی نیند خراب نہیں ہوئی۔ مگر میں ایک پل نہ سو سکا، ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ رات بھر جیسے کوئی چیز میرے سرہانے بیٹھی گاتی رہی "کہیں دیپ جلے کہیں دل"۔

حقیقت

صغیر ملال

جس درخت کے نیچے یا اندر وہ بیٹھا اور سویا کرتا وہ ایک بوڑھا درخت تھا بلکہ اس درخت کو دیکھ کر لفظ "قدیم" ذہن میں اُبھرتا تھا۔ برگد کی قسم کے اس درخت کی شاخوں اور تنے میں، بوڑھے انسانوں کی ٹانگوں میں اُبھرنے والی رگوں جیسے اُبھار تھے وقت گذرنے کے ساتھ نمو کی قوتیں کمزور پڑنے کے سبب دہقان زادوں کی کلہاڑیوں کی ضربیں بھری نہیں تھیں بلکہ گرد و غبار سے مٹیالی ہوگئی تھیں۔ درخت کی جڑیں زمین میں پیوست ہونے کے علاوہ شاخوں سے سر نکال کر فضا میں بھی معلق ہو چکی تھیں فضا میں معلق جڑیں اس کے بالوں کی طرح لمبی، غلیظ اور اُلجھی ہوئی تھیں۔

جب ذرا تیز ہوا چلتی تو درخت سے پاگل پن کے آثار ٹپکتے۔

درخت کے تنے میں بے شمار چھوٹے اور بڑے سوراخ تھے جن میں لاتعداد چیونٹیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ یہ چیونٹیاں آتے جاتے ہوئے ایک دوسرے کے سامنے آ کر ذرا دیر کو رکتیں۔ کوئی ناقابلِ فہم اشارہ دینے اور وصول کرنے کے بعد اپنے اپنے راستوں پر روانہ ہو جاتیں۔

سخت گرمیوں کی بے رحم دوپہروں میں دھوپ سہتا چھاؤں پھیلاتا یہ درخت راہگیروں کو انتہائی مہربان اور شاندار لگتا تھا۔ جس دن آسمان پر کارے بادل چھا جاتے اور بدن کو جھلسا دینے والی گرم لُو ایک بار پھر نرم و لطیف ہوا کی شکل اختیار کر لیتی تو وہی مہربان اور شاندار درخت بے مصرف اور ناچیز دکھائی دیتا۔ دہقان زادوں کی کلہاڑیوں کی ضربیں شاید انہی دنوں کی نشانیاں تھیں۔

جاڑوں میں اس زمانہ دیدہ درخت کے خوبصورت بھرے بھرے شوخ سبز رنگت والے پتے زرد اور کھوکھلے ہو جاتے اور خوفزدہ کر دینے والی سرد راتوں کی چیختی چلاتی ہواؤں میں یکے بعد دیگرے زمین پر گرتے، اور یا تو نشیب میں بہنے والی پُرپیچ و تاب ندی کے پانی میں شامل ہو کر دور دور تک نکل جاتے یا مخالف سمت کی ہوا چلنے پر خشکی کا سفر اختیار کرتے اور کچھ دنوں میں خاک ہو جاتے۔

سردیوں کے موسم میں درخت کی عریاں شاخیں آسمان کی طرف دستِ احتجاج کی طرح بلند رہتیں لیکن چھوٹے دنوں کے خوف سے مسافر اپنے سفر پر تیزی سے گامزن رہتے اور درخت سے لاتعلقی اختیار کر لیتے۔

لاتعلقی کی صورت میں کوئی چیز عظیم لگتی ہے نہ حقیر۔

بوڑھا درخت زمین سے اچانک سر اٹھا دینے والی ایک ایسی سرسبز و شاداب پہاڑی کے ساتھ ہی زمین سے اُبھرا تھا جس کا بظاہر نزدیک کے بلند و بالا پہاڑوں سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا درخت کے عین درمیان پہاڑی کی نچلی سطح سے ایک بہت بڑا سیاہ پتھر نکلا ہوا تھا جس کا باہر کا حصہ درخت کے تنے کے پہلے دو شاخے سے لٹکا ہوا تھا۔ پتھر کی جسامت اسے ایک چٹان کی شکل میں پیش کرتی تھی۔ اگر پہاڑی کو مداری کا منہ فرض کر لیا جاتا تو وہ کالی چٹان اُس گولے کی طرح لگتی جو مداری کے منہ سے آدھا نکل آیا ہو اور درخت مداری کی اس

انگلی کی جگہ لے لیتا جس سے اس نے لوہے کے گولے کو منہ سے آدھا نکل آنے پر روکا ہوا ہو۔ یوں محسوس ہوتا کہ اگر داری کو پیسے توقع کے مطابق نہ ملے تو وہ گولے کو منہ میں پھر غائب کر دے گا۔ پتھر کے نیچے گھاس کے تنکوں سے اٹی ہوئی بھوری مٹی ہمیشہ گیلی رہتی اور اکثر اس کے چھوٹے چھوٹے ڈھیلے بغیر کسی بیرونی عمل کے از خود ٹوٹ کر لڑھکتے اور درخت سے ٹکرا کر یا نہ ٹکرانے کی صورت میں ذرا سا آگے نکل کر رک جاتے۔

درخت سے چند قدم کے فاصلے پر گھاس سے لدے ہوئے ایک کونے سے پانی کا سوتا پھوٹتا تھا۔ زمین کی تہوں سے پھوٹنے والا یہ پانی ہلکی سی خوش ذائقہ ترشی لیے ہوئے تھا جو اس میں تیرنے والی جڑی بوٹیوں کے اثر سے تھی۔

پانی چونکہ زمین کی کوکھ سے نکلتا تھا اس لیے باہر کے بدلتے ہوئے موسم اس پر اثر انداز نہ ہو پاتے اور وہ اپنا درجۂ حرارت یکساں رکھتا جب زمین کے اوپر برفیلی ہوائیں چلتیں تو پانی میں بے حد لطیف حرارت کا احساس ہوتا اور گرمیوں کے موسم میں یہی پانی فرحت بخش ٹھنڈک لیے ہوتا۔ اس عمل کو گاؤں والے گرمیوں میں پانی کا ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم ہو جانا کہتے تھے۔ یہ ان کے بیان کا حسن تھا۔

انتہائی پیچیدگی یا انتہائی سادگی حسنِ بیان کو جنم دیتی ہے۔

چٹان کتنا عرصہ پہلے پہاڑی سے نکلی تھی؟ درخت عمر کے کس حصے میں داخل ہو چکا تھا؟ چٹان نے درخت کے جوان ہونے کے بعد پہاڑی سے سر نکال کر اس کی کمر خمیدہ کر دی تھی یا درخت چٹان کے زیر سایہ نکلا تھا اور اُسے اپنے پہلو سے لگائے ہوئے اوپر نکل گیا تھا؟

ان سوالوں کے جواب گرد و نواح کے دیہاتوں کے ان بوڑھوں کے پاس بھی نہیں تھے جو اپنی عمر کی صدی مکمل کرنے کی حد میں داخل ہو چکے تھے اور جنہوں نے اپنے بچپن میں جنگل سے گھاس اور جلانے کی خشک لکڑیاں لاتے ہوئے اس چٹان اور درخت کو یوں ہی دیکھا تھا اور اب دن بھر کھاٹ سے لگے اپنے بیٹوں اور بہوؤں کے بعد اپنے پوتوں اور ان کی بیویوں کی جھڑکیاں سنتے رہتے تھے۔

اس درخت کے نیچے یا اندر وہ بیٹھتا یا سوتا تھا۔

درخت اندر سے خاصی بلندی تک کھوکھلا ہو چکا تھا اور میدان کے ساتھ اس کے تنے میں ایک خوفناک حد تک بڑا شگاف پڑ چکا تھا جس میں سے ایک عام چوڑائی رکھنے والا آدم زاد بآسانی گذر سکتا تھا۔ شگاف تنے کے پہاڑی رخ پر واقع تھا۔ تنے کے کھوکھلے حصے کو اس کی خواب گاہ مان لینے کی صورت میں چٹان کو برآمدے کی چھت کی حیثیت حاصل ہو جاتی تھی۔

اس کے شانوں تک دریائی فاصلہ اگر کسی کوتاہ قد کو نصیب ہوتا تو بے ہنگم لگتا لیکن اس کی طویل القامتی پر سجتا تھا۔ اُس کے ناتراشیدہ بال لٹوں کی صورت شانوں پر بکھرے رہتے اور گرد و غبار میں اَٹے ہونے کے باوجود دیکھنے والے کے لیے جاذبِ نظر ثابت ہوتے۔ اس کی پلکیں دھول بھری ہونے کے باوجود یہ بتانا نہ بھولتی تھیں کہ وہ غیر معمولی آنکھوں کی پردہ دار ہیں۔ جب وہ پلکیں جھپکاتا تو یہ بھید کھلتا کہ خانقاہوں میں بیٹھنے والوں نے لفظ "غمزہ" کو آسمانی معنی کیوں پہنائے تھے۔

اس کی جلد کی حقیقی رنگت معلوم کرنا خارج از امکان ہو چکا تھا۔ وہ بظاہر غلط نظر آنے والے اس مفروضے کو صحیح ثابت کرتی دکھائی دیتی تھی کہ سخت کوشی کی زندگی ایک ہی جگہ بیٹھ کر بھی گذاری جا سکتی ہے۔

اس کی آنکھوں میں تمام موسم اپنی تمام ترسفاکیوں اور مہربانیوں کے ساتھ موجود تھے۔ وہ کبھی نمناک ہوتیں، کبھی خشک کبھی روشن ہوتیں اور کبھی ان کے دور دراز گوشوں میں تاریکی کڑی کے جالوں کی طرح لٹکی ہوئی نظر آتی۔ وہ ایسی آنکھیں تھیں جن کے بارے میں بآسانی دو انتہائی آراء قائم کی جا سکتی ہیں۔ یہ کہ انہیں بے حد تیز دماغ کی پشت پناہی حاصل نہ ہے یا کہ ان کے پیچھے ایک ایسا ذہن کارفرما ہے جس میں خلا بکھر چکا ہے۔ ان آنکھوں میں سب سے زیادہ چونکا دینے والی چیز سرخ ڈورے تھے۔ یوں لگتا جیسے کسی شیشے میں دراڑیں

پڑی ہوں۔

اس کی پیشانی پر پڑی ہوئی دائمی شکن کسی چیز سے اس کی مستقل ناراضی کی غماز تھی۔

ہر چند کہ مسلسل کم خوراکی اس کے بدن کی ظاہری دیدہ زیبی کو پامال کر چکی تھی لیکن اس کی ہڈیوں کے پنجر کی ساخت بے حد مضبوط تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر ایسا قلعہ تصور میں ابھرتا ہے جو سن خوردگی کے باعث ڈھہنے والا ہو۔

ظاہری احوال سے اس کی عمر کا تعین کرنا ممکن نہیں تو بعید از قیاس ضرور تھا۔

جب درخت پر آ بیٹھنے والے کسی پرندے کی آواز سن کر وہ سر اٹھا کے مسکراتا تو یوں لگتا جیسے وہ زمین اور آسمان کے درمیان وقوع پذیر ہونے والی ہر بات سمجھتا ہے۔ جیسے وہ موجودات کا احاطہ کئے ہوئے ہے — جیسے وہ حرفِ آخر ہے۔

یہی مسکراہٹ اس وقت بھی اس کے چہرے پر نمودار ہوتی جب درخت کی گلہریاں اس کے کندھوں پر سے ہوتی ہوئی گود میں اتر آتیں۔ وہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ اس جنگلی چیونٹی کو بھی دیکھتا جو درخت پر چڑھتی یا اترتی ہوئی کسی گلہری کے پاؤں سے ٹکرا کر نیچے گرتی، کچھ دائرہ وار گھومتی اور حیرت انگیز طور پر اپنی قطار کو دوبارہ تلاش کر لیتی۔

اس تبسم کے دوران اس کی پیشانی پر پڑی ہوئی دائمی شکن بے حد نمایاں ہو جاتی اور وہ ایسے بادلوں کی طرح دکھائی دیتا جو اپنے دامن میں بہ یک وقت پانی اور بجلی لئے پھرتے ہیں۔

عجیب بات یہ تھی کہ حیوانی سطح پر بود و باش رکھنے کے باوجود اس کی ذات میں کوئی کھنڈر نہیں ابھرا تھا۔ اس کی نشست و برخاست میں کسی طرح کی کجروی کے آثار نہیں پائے جاتے تھے۔ اس کے آس پاس کوئی خالی پن نہیں دکھائی دیتا تھا۔ یوں لگتا اس طرز پر زندگی بسر کرنا اس کی فطرت کے عین مطابق ہو۔

گرد و نواح کے دیہاتوں میں اس کے بارے میں اٹھائے جانے والے سوالوں کے جواب میں تین افواہیں گردش کرتی تھیں۔ پہلی یہ کہ اپنے بھائیوں کی طرف سے وراثت کی تقسیم میں ناانصافی ہونے پر وہ خاموشی سے ہر چیز سے دست بردار ہو گیا تھا۔ دوسری یہ کہ ایک دن وہ اپنے بچوں کی ماں کو ناگفتنی حالت میں دیکھ کر کسی سے کچھ کہے سنے بغیر گھر بار چھوڑ کر یہاں چلا آیا تھا اور تیسری یہ کہ ایک موقع پر بھری محفل میں پرانے دوستوں کی باتیں سنتے سنتے وہ اچانک کبھی نہ لوٹنے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

حقیقت کا علم بہرحال کسی کو نہیں تھا اور یہ تمام باتیں ثبوت کو ترستیں اور قیاس آرائیوں کے زمرے میں آتی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ ایک دن لوگوں کو کائنات کا وہ گوشہ تہس نہس ملا۔ درخت، پتھر اور وہ تینوں ختم ہو چکے تھے۔ درخت نہ صرف گر چکا تھا بلکہ جل کر راکھ بھی ہو گیا تھا۔ ہر شخص اس انہونی کی تاویل اپنی بساط کے مطابق کر رہا تھا۔ مثلاً یہ کہ چٹان کے نیچے کی مٹی اس سال ہونے والی بے پناہ بارشوں کی وجہ سے بیٹھ گئی تھی اور کہنہ درخت چٹان کا مزید بوجھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ حادثے کی دوسری اور تیسری ممکنہ وجوہات بالترتیب یوں بیان کی گئیں۔ درخت کے سوکھے حصے کو اسی کی مشعل سے آگ لگی اور وہ جل کر کمزور ہونے پر وہ چٹان کا وزن سہارنے کے قابل نہ رہ سکا تھا — درخت اپنی کہنگی کے باعث چٹان کو ساتھ لئے ہوئے خود گر گیا تھا اور گرنے کے بعد اس کی مشعل کے شعلے کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

حادثے کی وجہ کچھ بھی رہی ہو مگر یہ بہرحال حقیقت تھی کہ اس کی موت چٹان کے نیچے دب جانے سے واقع ہوئی تھی۔

جوئے شیر

ڈاکٹر زاہد حسین

محنت کر۔ دل لگا کر پڑھ۔ ایمانداری سے کام کر۔۔۔!

اس نے تختۂ سیاہ پر یہ الفاظ لکھے اور بچوں سے نقل کرنے کے لئے کہہ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ایک نظر کلاس روم کا جائزہ لیا۔ بچے لکھنے میں معروف ہوگئے تھے اور وہ ڈائجسٹ پڑھنے لگی۔

ڈائجسٹوں میں چھپنے والی کہانیاں اسے بہت پسند تھیں۔ کتنا گلیمر ہوتا ہے۔ ان کہانیوں میں۔ محل جیسے مکانوں کا ذکر، زندگی کی آسائشوں اور گہما گہمی کے چرچے، خوبصورت سجیلے جوانوں سے معاشقوں کے تذکرے، خوشنما باغوں میں خوابوں کے شہزادے کے ساتھ سیر و تفریح، پڑھتے پڑھتے وہ اس قدر کھو جاتی تھی کہ جیسے خود بھی ان کہانیوں کا کوئی کردار ہو۔

مس شیریں ڈائجسٹ کے مطالعے میں معروف تھیں اور بچوں نے کلاس میں شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ کوئی آپس میں گتھم گتھا ہو رہا تھا۔ کسی نے دوسرے کی کتاب چھین لی۔ کوئی پیمانے سے دوسرے کو مارنے لگا۔ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ ڈائجسٹ کی کہانی کلائمیکس پر تھی۔ مس شیریں بھی اور کلاس روم کا شور بھی۔ لیکن مس کے اپنے وجود کے اندر اتنا شور برپا تھا کہ باہر کی تمام آوازیں مدھم پڑ گئی تھیں۔

خوابوں کے دیس سے ایک شہزادہ آیا۔ سونے کے گہنوں سے لدی چاند سی دلہن کو لمبی ایئر کنڈیشنڈ کار میں بٹھا کر لے گیا اور کہانی ختم ہوئی۔

مس نے ایک گہرا سانس لیا۔ کلاس روم پر نظر ڈالی۔ بچے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس نے تختۂ سیاہ کو صاف کیا اور لکھا۔

چپ رہ۔ غل مت کر۔

جیسے اپنے اندر کا شور دبانے کی کوشش کر رہی ہو۔ بچوں سے دوبارہ نقل کرنے کے لئے کہا اور اپنے آئیڈیل کے سپنوں میں کھو گئی۔ وقفے کی گھنٹی نے اسے بیدار کیا تو اسٹاف روم میں جا بیٹھی۔ آیا نے حسبِ معمول وہی بڑے چاٹ سموسے اور پھلوں کے ساتھ چائے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ اسکول کی سبھی استانیاں وہاں جمع ہو گئیں۔ ان میں اکثریت ایسی نوعمر لڑکیوں کی تھی جو ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد سے کسی مناسب رشتہ ملنے تک انتظار کی مدت گزارنے کے لئے اسکول کی طرف چلی آتی ہیں۔

انتظار کی گھڑیاں سالوں پر محیط ہو گئیں۔ جس آنگن میں بیری ہو۔ وہاں پتھر تو آتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن اماں بی کو تو اس دن کا انتظار تھا۔ جب کوئی پتھر ایسا آئے جو ڈالر یا ریال میں لپٹا ہوا ہو۔ دروازے پر لمبی سی کار کھڑی ہو۔ ایکڑ دو ایکڑ رقبے پر محل جیسا مکان ہو۔ جس کے چاروں طرف باغیچے ہوں۔ فوارے چلتے ہوں۔ دودھ کی نہریں بہتی ہوں۔ پھلوں کے درخت لگے ہوں اور خواہش کرنے پر پھل خود بخود دہن میں آ ٹپکیں۔ چاہے اس انتظار میں بیچاری شیریں پکا بیر بن کے درخت سے ٹپک ہی کیوں نہ جائے۔

انہیں تو حسرت تھی۔ اپنے تصورات کی بہشت کی اور خیالوں ہی خیالوں میں وہ شیریں کو اس بہشت میں پھولوں کی سیج پر بیٹھے دیکھتیں تو جھوم جھوم جاتیں۔

لیکن ایسا رشتہ تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ بڑی کاوشوں کے بعد آخر وہ دن آ ہی گیا اور لمبی سی کار میں بٹھا کر شیریں کو رخصت کر دیا گیا۔

سلیم جو کئی سال سے سعودی عرب کی ایک آئل کمپنی میں ملازمت کرتا تھا صرف ایک ماہ کی چھٹی پر آیا تھا۔ پندرہ دن شادی کے انتظامات میں گزر گئے اور اگلے پندرہ دن بعد وہ واپس چلا گیا۔ اور یہ پندرہ دن شیریں نے سچ مچ بہشت میں گزارے۔ وہ زندگی کی نئی لذتوں سے آشنا ہوئی تھی۔ سلیم چلا گیا اور اب مسز شیریں سلیم ایک بار پھر سراپا انتظار بن کے رہ گئی۔

رہن سہن میں تیزی سے تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ کلر ٹی وی، وی سی آر، واشنگ مشین، باورچی خانے کے بجلی کے آلات، آسائشیں ہی آسائشیں، نوٹ آ رہے تھے۔ ڈالر اور ریال آ رہے تھے۔ گھر بھرتا جا رہا تھا۔ مگر دل خالی خالی تھا اور وہ گوشہ بھی جہاں سلیم صرف پندرہ دن گزار کر چلا گیا تھا۔ مہینے گزرے، سال بیت گیا، خط آیا کہ مصروفیت بہت ہے، چھٹی نہ مل سکے گی۔ آئندہ سالانہ چھٹیوں تک مزید انتظار،

اس آگ میں سلگتے ہوئے سال سے زیادہ گزر گیا۔ ایئر کنڈیشنڈ بیڈ روم کی ٹھنڈک بدن کی آگ کو اور بھڑکاتی تھی۔ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سراپا کو دیکھتی تو نشے سے جھوم جاتی۔ چاہتی تھی کہ یہ سلگتی ہوئی چنگاری بھڑک کے شعلہ بن جائے۔ بند کمرے میں اس کا دم گھٹنے لگتا۔ کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے باہر آتی۔ لیکن ہر جگہ ایک حبس کا عالم ہوتا۔ کہیں سے کوئی تازہ ہوا کا جھونکا۔ ابر کا کوئی ٹکڑا۔ آسمان سے ٹپکی ہوئی پانی کی بوندیں ہی سہی۔ شاید یہ چنگاری سرد پڑ جائے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ خوبصورت امپورٹیڈ ٹائیلوں سے مزین غسل خانے میں داخل ہو جاتی۔ جھرنے کی طرح شاور سے برستی ہوئی پانی کی بوندیں تانبے ایسے تپتے ہوئے بدن پر پڑتیں تو ایک چھناکا سا ہوتا اور جیسے پانی کے قطرے بھاپ بن کے ہوا میں تحلیل ہو جاتے۔ وہ صابن کے جھاگ اُڑاتی۔ مہکتے ہوئے صابن کے اتنے جھاگ کہ اس کا سارا بدن اس میں ڈوب جاتا۔ بالکل اسی طرح جیسے سمندر کی منہ زور لہریں آگے بڑھنے کا راستہ نہ پائیں تو ساحلی چٹانوں سے ٹکرا کر جھاگ بن جاتی ہیں۔ وہ بھی چٹانوں پر جھاگ اُڑاتی۔ لیکن جذبات کی سرکش موجوں کے تھپیڑے تھے کہ رکتے ہی نہ تھے۔ ایک پر ایک لہر آتی ہی چلی جاتی تھی۔ اتنی دیر نہانے کے باوجود وہ تازگی کے بجائے تھکن محسوس کرتی۔

ایک روز اسی طرح وہ باتھ روم سے بیڈ روم میں آ گئی۔ کلر ٹی وی پر خوبصورت گلدان کے ساتھ رکھی ہوئی سلیم کی تصویر کو دیکھتی رہی اسے یوں لگا وہ کہیں صحرا میں کھڑا ہوا کھجور کا درخت ہے کہ بس آسمان کی طرف تکے جاتا ہے۔ نہ دھوپ کی شدت کا گلہ، نہ شبنم کے قطروں کی آس۔

پھر اس نے دیوار پر آویزاں تصویر کی طرف دیکھا۔ مٹی کے دیئے کی روشنی میں ایک ننھا منا سا مسکراتا ہوا چہرہ، دیا تب ہی جلتا ہے کہ اس میں باتی ہو اور تیل بھی۔ وہ تو بن باتی کا دیا ہے۔ روشنی کہاں سے آئے۔ باتی تو تیل کے کنوئیں میں غرق ہے اور جب روشنی نہ ہو تو ننھا منا مسکراتا ہوا چہرہ کہاں دیکھے گا۔ اس کی کوکھ میں درد سا اٹھا اور نس نس میں اُتر گیا۔ نڈھال ہو کر فوم کے گدے پر لیٹ گئی۔ چھت کو تکتی رہی۔ نیند نہ آنا تھی نہ آئی۔ کروٹ بدلی تو کیلنڈر کی تصویر دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ یہ ایک آتش فشاں پہاڑ کی تصویر ہے۔ بادلوں کو چھوتا ہوا۔ آسمان سے باتیں کرتا ہوا۔ دہانے سے بھاپ اٹھتی ہوئی۔ کتنا لاوا کھول رہا ہو گا اس کے اندر۔ اس نے سوچا اور پھر آتش فشاں تو زندہ ہوتے ہیں۔ لاوا اُگلتے ہوئے۔ پوجا کے پتھر کی طرح بے جان نہیں ہوتے۔

کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ شیریں نے ذرا دھیان سے کام لیا تو آس پاس آتش فشاں بکھرے نظر آئے۔ صبح اذان سے

سے پہلے دودھ والے کی دستک سنائی دی۔ اچھا خاصا لمبا تڑنگا جوان ہے۔ ایک بار ملازمہ کی غیر موجودگی میں اسے دودھ لینے کے لئے اُٹھنا پڑا۔ تو دودھ کا برتن لیتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھو گیا تھا۔ گرم گرم ہاتھ جیسے بجلی کا گرم تار چھو لیا ہو۔ اس کے بعد جب بیگم جب باتھ روم سے استعمال شدہ نیپکن کا ڈبہ اٹھا کر پھینکتا ہے تو شرارت ناچتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں۔

مجو سبزی فروش کیسے تلے ہاتھوں سے بینگن اور توری رکھتا جاتا ہے ترازو میں کہ پلڑا کسی طرف بھی جھکا نہ رہے۔ وزن برابر ہو۔

ایک قدر مشترک تھی ان سب میں جو وہ برداشت نہ کر سکتی تھی۔ ان کی کھال سے پسینہ اور میل بہتا رہتا ہے۔ بدبو کے بھبکے اُٹھتے ہیں۔ کتنے بدذوق ہیں۔ اُسے کراہیت آنے لگی۔ اچھے خاصے آتش فشاں تعفن فشاں بن گئے۔

لیکن پڑوسی کے مکان میں رہنے والا جواں سال، کسرتی بدن والا خوش پوش، خوش اطوار، آصف جو کالج کا طالب علم ہے، جس کا لباس یوڈی کلون کی خوشبوؤں سے مہکتا رہتا ہے، جو اس کا والد دوبئی سے بھیجتا ہے، گلی سے گزرتے ہوئے جس کی نظریں در و دیوار پر کچھ تلاش کرتی رہتی ہیں۔ اس کی جستجو کامیاب رہی۔ شیریں نے آتش فشاں دریافت کر لیا۔

نرم ربر کے گدے میں دھنسے ہوئے جب آتش فشاں گرم گرم لاوا اگلتا تو یوں لگتا کہ جیسے وہ اندر سے پگھلی جا رہی ہے۔ پھر وہ اتنا پگھل کر بہنے لگی۔ اتنا بہی کہ بستر کا داغ بن گئی۔ پگھلتی، بہتی، داغ بن جاتی، داغ پھیلتے پھیلتے اس کا سراپا بن جاتا اور پھر پگھلنے لگتا۔ چاند ابھرتا رہا۔ ڈوبتا رہا۔

اور ایک دفعہ کیف و مستی کے عالم میں اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ ایک سمندر ہے۔ جس کی سطح پر ایک سیپ تیر رہی ہے۔ منہ پھیلائے۔ سیپ تو بس، ساون کی رُت پہچانتی ہے۔ یہ نہیں جانتی کہ گھٹا کس اور سے آئی۔ بوند کس بادل سے ٹپکی۔ وہ تو ایک قطرے کی پیاسی ہے۔ سو ساون کی رُت آتے ہی سمندر کی سطح پر رقص کرنے لگتی ہے اور صرف ایک قطرے سے اپنی پیاس بجھا کر تہ میں بیٹھ جاتی ہے۔ موتی رولنے کے لئے۔

سیپ تہ میں بیٹھ گئی۔ بات ہاتھ سے نکل گئی۔ شیریں خوف سے لرز گئی۔ اب کیا ہو گا۔ وہ بہت پریشان تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کرے۔ اسی اُلجھن میں ایک ماہ گزرنے والا تھا کہ سلیم کی آمد نے اس کی مشکل حل کر دی۔ وہ آ گیا۔ بہت سا روپیہ اور نئی نئی چیزیں لے کر جو شیریں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ دو ماہ پلک جھپکتے گزر گئے۔ چھٹیاں ختم ہوئیں۔ جانے کی تیاری شروع ہو گئی نہ چاہتے ہوئے بھی وہ جانے پر مجبور تھا۔ شیریں کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی حسین یادیں اور ایک خوشخبری لے کر پھر صحرا کو سدھار گیا۔

صحرا کی آگ اگلتے سورج کے نیچے تیل کے کنوؤں پر مشینوں کی گھن گرج میں کام کرتے ہوئے ہر لمحہ شیریں کی یاد اس کو ستاتی رہتی۔ اس کا جی چاہتا کہ ملازمت چھوڑ کر بھاگ جائے۔ لیکن ہر آن بڑھتی ہوئی ضرورتوں، عیش و عشرت کی خواہش نے مجبور کر رکھا تھا اب وہ اتنی آسائشوں کے عادی ہو چکے تھے کہ جن کے بغیر زندگی کا تصور بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اور پھر ایک دن یہ خوشخبری بھی آ گئی کہ وہ ایک بچی کا باپ بن گیا ہے۔ جس کا نام اس نے صدف رکھا۔ دوسرے تیسرے روز شیریں کو پیار بھرے خط لکھتا۔ اس کو اپنی اور بچی کی صحت کا خیال رکھنے کی تلقین کرتا۔

اب شیریں بجھی بجھی سی رہتی تھی۔ کتنا پیارا سا معصوم سا شوہر ہے اس کا وہ سوچتی۔ احساسِ جرم سے ہر وقت اس کے دل میں ایک کانٹا سا کھٹکتا رہتا۔ سلیم صدف سے کتنا پیار کرتا ہے۔ کتنے بہت سے کھلونے لانے کا لکھا ہے اس نے جو اس ملک سے

لاکھوں بچوں کو کبھی میسر نہ آ سکیں گے وہ اپنی ہی نظروں میں گر جاتی۔

لیکن اس کے ذہن نے جرم کا جواز بھی تلاش کر لیا تھا۔ آخر وہ بھی تو انسان ہے۔ کوئی ڈیکوریشن پیس تو نہیں جسے خرید کر شوکیس میں سجا دیا اور بس!

اسے زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ دولت کی ہوس نے ان سے کیا کیا چھین لیا ہے۔ حرص و ہوس کے مارے ہوئے انسان نام و نمود کے لئے، غیر ضروری آسائشوں کے لئے اپنی جنت کو چھوڑ کر صحراؤں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

کبھی کبھی اسے اپنا یہ استدلال کمزور سا لگتا۔ صدف کی صورت دیکھ کر کبھی پیار آتا تھا اور کبھی دل چاہتا کہ اس کا گلا گھونٹ دے۔ سلیم صدف کے لئے سامان بھیجتا جاتا تھا۔ ڈالر اور ریال آتے چلے جاتے تھے۔ گھر بھرتا جا رہا تھا۔ مگر اس کا دل خالی تھا اور وہ گوشہ بھی جہاں سلیم چند روز بسیرا کر کے چلا جاتا تھا۔

شیریں کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ جذبات کی شدت سے اس کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ جھولے میں پڑی صدف نہ جانے کب سے رو رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ اٹھ کر اس کا گلا گھونٹ دے۔ لیکن وہ اٹھ نہیں پا رہی تھی۔ ہاتھ پیر شل ہو رہے تھے۔ پسینہ میں شرابور، آنکھوں سے ساون کی جھڑی لگی ہوئی، پورا لباس داغ داغ، پسینے اور آنسوؤں سے،

صدف کے رونے کی آواز سن کر اس کی دادی نے جلدی جلدی مصلے کو سمیٹا۔ "ارے دلہن۔ کتنی دیر سے بچی رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے اور تم ہو کہ نیند ہی نہیں کھلتی"۔ شیریں کی طرف دیکھے بغیر صدف کی دادی نے کہا اور بچی کو اس کی گود میں ڈال دیا۔

شیریں نے آنسو پلکوں میں چھپا لئے اور صدف کو آنچل میں،

اور دودھ کی نہریں بہنے لگیں۔

رُوحی کنجاہی

○

ہر حرف کی ابتدا تری یاد
ہر بات کی انتہا تری یاد
ہر شے سے حسین تری باتیں
ہر چیز سے خوشنما تری یاد
ہر نقش میں عکسِ حُسن تیرا
ہر منظر میں ضیا تری یاد
ہر رنگ میں تیرے رنگ و خوشبو
ہر پھول میں لب کشا تری یاد
ہر شاخِ گُل انگشت تیری
فطرت کی رہنما تری یاد
ہر دن کا منارۂ تجھ سے روشن
ہر شب کے لیے دیا تری یاد
ہر دن کا سفر ہے تیری جانب
ہر شب کی رہنما تری یاد
ہر صفحۂ زندگی پہ تحریر
اک نام ترا ہے یا تری یاد
الفاظ کہاں پہنچ سکیں گے
سب سے اعلیٰ دعا تری یاد
رُوحی ہے عجیب کیفیت میں
گویا ہے غزل سرا تری یاد

○

عجیب رنگ سامنے تھے، سوچتا ہی رہ گیا
جدھر اُٹھی نظر مری میں دیکھتا ہی رہ گیا

عجیب بھاگ دوڑ میں تھی خلقِ شہر مُبتلا
میں دیکھتا ہی رہ گیا میں سوچتا ہی رہ گیا

جُدا ہوا تو پھر مِلا، مِلا تو پھر جُدا ہُوا
عجیب کھیل عمُر بھر وہ کھیلتا ہی رہ گیا

جو کچھ بھی منہ میں آ گیا کہے چلا گیا کوئی
میں روکتا ہی رہ گیا میں ٹوکتا ہی رہ گیا

درونِ قلب جانے کیا قیامتیں بپا رہیں
میں آنکھ آنکھ روزنوں میں جھانکتا ہی رہ گیا

عجب عجب عبارتیں فضا میں لکھ رہے تھے لوگ
سوالیہ نشان سے میں دیکھتا ہی رہ گیا

لباسِ زیست کو رہی ہمیشہ حاجتِ رفو
میں لمحہ لمحہ چیتھڑوں کو ٹانکتا ہی رہ گیا

تھا کاروانِ زندگی بھی تیز کچھ زیادہ ہی
تھکن سے چُور چُور تھا میں دوڑتا ہی رہ گیا

اُترنے والے بحر میں خبر نہیں کدھر گئے
میں ساحلوں پہ سیپیوں کو دیکھتا ہی رہ گیا

خالد احمد

○

یہ ہاتھ ہیں کچھ برتے سے، یہ ساتھ ہیں کچھ دیکھے سے
یہ دن تو نہیں دیکھا سا، حالات ہیں کچھ دیکھے سے

وہ رات بھی تو گذراں تھی، یہ دن بھی تو گذراں ہے
یہ رُت تو اُسی رُت سی ہے، دن رات ہیں کچھ دیکھے سے

یہ گیت یہیں اُترا تھا، یہ رنگ یہیں برسا تھا
صدمے ہیں یہ کچھ جھیلے سے، جذبات ہیں کچھ دیکھے سے

وہ تان یہیں ٹوٹی تھی، یہ سانس یہیں بکھرے تھے
اے سترِ شکستہ پائی! صدمات ہیں کچھ دیکھے سے

تحریر ذرا پہچانو، کس دُھن میں ہو اے دیوانو
دیوار پہ، اس باراں کے رشحات ہیں کچھ دیکھے سے

یہ کچھ زور تو دو ذہنوں پر، وہ ہاتھ ہیں پھر آنکھوں پر
یہ لمس شناسا سا ہے، یہ ہاتھ ہیں کچھ دیکھے سے

وہ چاند جہاں بچھڑا تھا، وہ موڑ تو پھر آ نکلا
وہ صبح یہیں ٹھہری تھی، لمعات ہیں کچھ دیکھے سے

○

کوئی پوچھے تو کہیں غیر تھا یا اپنا تھا
ایک چہرے کے سوا شہر میں کیا اپنا تھا

ناشناسا تھے، سو چُپ چاپ چلے آئے تھے
اس گلی میں فقط آوازۂ پا اپنا تھا

آنکھیں خوشبو کی طرح اُٹھ کے بکھر جاتی تھیں
جانے کس موج میں وہ جانِ صبا اپنا تھا

ایک پیرایۂ اظہار تھا وہ سروِ رواں
ہر قدم راہ برو راہ نما اپنا تھا

دُور رہتے تھے کہ جی بھر کے اُسے دیکھ ہی لیں
ربط کیا اُس سے بھلا اِس کے سوا اپنا تھا

ایک لمحہ تھا جسے آخرِ شب تک دیکھا
رات بھر منتظر اپنا، درِ وا اپنا تھا

دل دھڑکنے پہ بھی آمادہ نہ پایا خالد
ہر نفس گوش بر آواز، خدا اپنا تھا

ایوب خاور

○

صبا کے ہاتھ سے تحریر کرنا
تجھے شرمندۂ تعبیر کرنا

کسی کے ہجر سے مانوس ہو کر
پھر اُس کے وصل کو تقدیر کرنا

کبھی ان رتجگوں کو جمع کر کے
اُسی خوشبو کا گھر تعمیر کرنا

ہمیں ایسا کوئی مشکل نہیں تھا
مگر اِک خواب کو زنجیر کرنا

بچھڑنا اس قدر آساں ہوا ہے
تو پھر ملنے کی بھی تدبیر کرنا

کسی کمزور لمحے کی زباں سے
خود اپنے غم کی کیا تفسیر کرنا

تری آنکھوں سے سیکھا ہم نے خاورؔ
ہوا کو رنگ سے تعبیر کرنا

○

آئینہ و خواب ایک سے ہیں
موسم تہِ آب ایک سے ہیں

شبنم سے زیادہ کون جانے
اندر سے گلاب ایک سے ہیں

ہر شخص کے دُکھ الگ الگ ہیں
پڑھیے تو نصاب ایک سے ہیں

آنکھیں ہوں، ستارہ ہو کہ جگنو
یہ سارے سحاب ایک سے ہیں

یہ ہجر و وصال بھی عجب ہیں
دونوں کے عذاب ایک سے ہیں

اس کو فۂ تشنگی میں خاورؔ
دریا و سراب ایک سے ہیں

نجیب احمد

○

ہاتھ بڑھا کر روک نہ لے دیوار مجھے
راس نہ آجائے پتھر کا پیار مجھے

چھین رہے ہیں تجھ سے ترے معیار تجھے
دُور نہ کر دے مجھ سے مری رفتار مجھے

کیسی بلا کی دھوپ میں چل کر آیا ہوں
کیسی بلا کا سایہ ہے درکار مجھے

میں خود اپنی کٹیا کا شہزادہ ہوں
کیا دے سکتے ہیں شاہی دربار مجھے

پانی کے چلتے چشمے کب رُکتے ہیں
کیوں آوازیں دیتے ہیں اشجار مجھے

لوگ نجیب دلوں میں دکھوں کی طرح اُترے
جیتے جی یہ لوگ نہ جائیں مار مجھے

○

قیدِ قوسِ عذاب سے نکلے
رنگ کیا کیا حباب سے نکلے

ڈھلتی عمروں کی سمت جانے کو
لوگ عہدِ شباب سے نکلے

رنگ پہچان بن کے ساتھ رہے
لاکھ خوشبو گلاب سے نکلے

شہر خاموش ہو گئے کیونکر
لوگ کس اضطراب سے نکلے

اے ہَوا! کھول بادلوں کی گرہ
رخ گرفتِ نقاب سے نکلے

آنسوؤں سے تہی ہے چشمِ زمیں
خاک تعبیرِ خواب سے نکلے

ہم اندھیروں کے سائے سائے نجیب
گھر سے کس آب و تاب سے نکلے

حسن ناصر

○

دیکھنے والو! یہ منظر بھی پل دو پل ہے
اس کے بعد اُٹھنے والی ہر اُنگلی شل ہے

آنے والے سبھی پرندے خوں میں تر ہیں
یوں لگتا ہے پیڑ سے باہر اک کربل ہے

پہلے پہل تو ریت اور دریا بھلے لگے تھے
اب آنکھوں میں پیاسا، خاک اُڑاتا تھل ہے

لوحِ ہوا پر سب تحریریں بے مصرف ہیں
ہر لمحے کا اپنا اپنا آج اور کل ہے

ذرّہ ذرّہ اپنی ہیئت بدل رہا ہے
تیز ہواؤں کے رستے میں ریت محل ہے

○

کوئی شخص بھی اُس سے رابطہ نہیں رکھتا
جو مکان باہر کو راستہ نہیں رکھتا

اُس کا نام بھی اک دن دشمنوں میں آئے گا
پرچمِ صداقت جو قافلہ نہیں رکھتا

چُپ کا زہر میں بھی تو پی رہا ہوں برسوں سے
دشمنی میں بھی لیکن فاصلہ نہیں رکھتا

خون چُوسنا اُس کی عادتوں میں شامل ہے
ورنہ اب لہو میرا ذائقہ نہیں رکھتا

میں بھی اُس قبیلے کا فرد ہوں حسن ناصر
خواہشیں جو رکھتا ہے، حوصلہ نہیں رکھتا

جمیل عالی

○

افق پار سے کوئی دیتا صدائیں تو ہم کب ٹھہرتے
کبھی ساتھ لے کر نکلتیں ہوائیں تو ہم کب ٹھہرتے

گزاری ہیں کتنی ہی طوفان راتیں گھروں میں سمٹ کر
دمکتیں سرِ آسماں کہکشائیں تو ہم کب ٹھہرتے

یہاں آندھیوں نے کہاں کوئی پرواز کی راہ چھوڑی
ذرا بھی کہیں ساتھ دیتیں فضائیں تو ہم کب ٹھہرتے

زمانے کی برفاب رُت سے کہاں کشتیِ شوق رُکتی
اُترتیں نہ اپنے لہو میں خزائیں تو ہم کب ٹھہرتے

یہ پیاسی اَن آشنا موسموں سے ملن ساحلوں پر
نہ دیوار بنتیں ہماری انائیں تو ہم کب ٹھہرتے

یہ دنیا محل خواہشوں کے گھنے جنگلوں میں بکھرتی
نہ زنجیر کرتیں اگر کچھ وفائیں تو ہم کب ٹھہرتے

حسن ناصر

○

لے کے تیرے لمس کی مانوس خوشبو آ گئے
جب کبھی میں تنہا ہُوا، یادوں کے جگنو آ گئے

میں نے چاہا تھا کہ تیرے ہجر میں نوحے لکھوں
یک پل سوچا کہ پھر آنکھوں میں آنسو آ گئے

میرا بچہ روز اپنی ماں کو بتلاتا ہے خواب
میں نے دیکھا ہے کہ واپس میرے ابّو آ گئے

کُھل کے مشکیزہ وہ پانی بہہ گیا ہے ریت پر
پھر مجھے نیچے دکھانے خشک چُلّو آ گئے

وہ سفر تھا یا حسن ناصر بھیانک خواب تھا
شہر میں گھبرا کے صحراؤں کے آہُو آ گئے

(سوئٹزرلینڈ)

جلیل عالی

○

نگاہ و دل میں کیسے وا ہمے دیوار صورت ہیں
ہم اپنے ساتھ بھی اک عمر سے اغیار صورت ہیں

لہو میں گونجتی ہے خامشی کتنے مناظر کی
نظر وادی سے باہر جو ابھی اسرار صورت ہیں

اس آندھی نے تو اندر کا چمن بھی دھول کر ڈالا
اب اپنے شوق احساسات بھی بیگار صورت ہیں

میں آئندہ رُتوں کی سوچ تصویروں سے ڈرتا ہوں
کہ پچھلے موسموں کے وسوسے معیار صورت ہیں

عذاب اب اور کیا اُترے گا اپنے شہر پر عالیؔ
کہ سب رشتے یہاں اک مستقل آزار صورت ہیں

○

اب کی بہاروں جوبن پر تھے شوق شجر کتنے
کس کو خبر تھی آجائیں گے درد ثمر کتنے

کتنی شبوں کی نیند گنوا کر دیکھا اِک سپنا
دیکھ لیا اِک سپنا تو بھر جاگے ڈر کتنے

جانے اک دیوار پہ کیسا نقش بنا بیٹھے
سارے گھر میں جاگ اُٹھے آسیب اثر کتنے

دل کی لوح پہ سچائی کا اسم جو روشن ہو
کھلتے جائیں عالیؔ آپ سے آپ ہنر کتنے

تنویر سپرا

○

قربانی، اخلاص، محبت، خُلق سکھائیں مائیں
سپّراؔ ہم کو آدم سے انسان بنائیں مائیں

سردی، گرمی، بادل، اولے، طوفاں، حبس، اندھیرے
ہر سختی سینے پر سہہ کر بالؔ بچائیں مائیں

اذنِ مسافت اپنے بیٹوں کو دینے سے پہلے
راہ میں آنے والی ہر دیوار گرائیں مائیں

کمسن تو کمسن ہیں، عمر رسیدہ بھی سو جائیں
میٹھے سُر میں لوری کے جب بول سنائیں مائیں

پل بھر میں ہنستے مُسکاتے جنّت جیسے گھر بھی
دوزخ بن جاتے ہیں سپّراؔ گر مر جائیں مائیں

یوسف حسن

○

کتنے پیچ و تاب میں زنجیر ہونا ہے مجھے
گرد میں گُم خواب کی تعبیر ہونا ہے مجھے

جس کی تابندہ تڑپ صدیوں میں بھی سینوں میں بھی
ایک ایسے لمحے کی تفسیر ہونا ہے مجھے

خستہ دم ہوتے ہوئے دیوار و در سے کیا کہوں
کیسے خِشت و خاک سے تعمیر ہونا ہے مجھے

شہر کے معیار سے مَیں جو بھی ہوں، جیسا بھی ہوں
اپنی ہستی سے تری توقیر ہونا ہے مجھے

اک زمانے کے لیے حرفِ غلط ٹھہرا ہوں میں
اِک زمانے کا خطِ تقدیر ہونا ہے مجھے

یوسفؔ اپنے درد کی صوُرت گری کرتے ہوئے
خود بھی لوحِ خاک پر تصویر ہونا ہے مجھے

۱؎ بچّے

مختار جاوید

○

میں سمندر سے تو اک بوند نہ پانی مانگوں
ہاں مگر دشت سے دریا کی روانی مانگوں

اِک طرف جرم سمجھتا ہوں ذخیرہ کرنا
اک طرف باسمتی سال پرانی مانگوں

دیکھ کر رنگِ شفق، خوف زدہ ہو جاؤں
اور پھر رہ نہ سکوں، شام سہانی مانگوں

پھر مرے سامنے حالات ہیں کربل جیسے
پیاس پی جاؤں کہ دریاؤں سے پانی مانگوں

ریگزاروں میں کوئی شخص کہاں ڈوب گیا
پھر سے آئے وہی طوفاں تو نشانی مانگوں

اس قبیلے کے سبھی لوگ ہیں سانپوں جیسے
زہر پینے کو ملے، جس سے بھی پانی مانگوں

محمود علی محمود

○

اور — سائے غرقاب تھے، میلہ چھتناروں پہ لگا تھا
وہ لاٹھی پر ٹھوڑی ٹیکے چرخ کو گھور رہا تھا

پیاس نگر سے باہر آ کر دل مسرور تھا — لیکن
چڑیوں کا اک ابر لپکتا سر پہ سے گذرا تھا

آج بھی برف بسر وادی کرنوں کی چھوٹ کو ترسی
کل نرگس کا چہرہ دیکھ کے دل سیراب ہوا تھا

بجھتی کراہ کے ساتھ چراغ کی لو تھرا جاتی تھی
وہ جھالے میں خیمے کی رسّی تھامے بیٹھا تھا

میں نے کتاب میں بند کیے ہیں تتلیوں سے وہ لمحے
جب تو ساتھ تھا اور میلا کچی کرنوں کا لگا تھا

ہونٹی معصومی کو پھر اک گولی چاٹ گئی تھی
اس ندی کے پار، بس آخری بار ہرن اُچھلا تھا

آج ملا تو دل میں محمودؔ اک کونپل نہیں پھوٹی
جس کے قرب سے دیواروں پر سبزہ اُگ آتا تھا

ستار سیّد

ایک عرصے سے جب آنگنوں میں پرندے چہکنے لگے
یاد آئی تری، مضمحل راکھ چہرے دہکنے لگے

آنکھ میں جذب ہوتی ہوئی دوریاں ختم ہوتی گئیں
دُھند میں غرق ہوتے ہوئے نقش پھر سے چمکنے لگے

عرصۂ ہجر میں میری فرقت سے وہ کتنے دلگیر تھے
مجھ کو دیکھا تو بچپن کے ساتھی مناظر بلکنے لگے

ایک لمحے پہ ٹھہرے ہوئے موسمو! اب بدل بھی چکو
ہم تنوّع کے عادی تمہارے تواتر سے تھکنے لگے

دُور کے اک ستارے میں محسوس کی جب سے آہٹ تری
ہم مقفل گھروں کے دریچوں سے اس سمت تکنے لگے

میری یادوں میں محفوظ ہیں، نام بھی جن کے آتے نہیں
ملنے والوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو بھول پاتے نہیں

گُم شدہ ساعتوں کے تعاقب میں نکلیں تو اُن سے ملیں
وہ جو دلدار چہروں سے خوابوں کے گھونگٹ اُٹھاتے نہیں

ساحلوں کی ہواؤں میں باغوں کے کونوں میں دیکھا اُنھیں
کھلکھلا کے ہنسے، چھب دکھائی مگر پاس آتے نہیں

وہ تھرکتے ہوئے عکس جن کو پکڑنے کی کوشش میں ہوں
قریۂ چشم سے بھی گزرتے ہیں پر ہاتھ آتے نہیں

تم تو میرے دُکھوں کا مداوا ہُوا کرتے تھے دوستو!
اتنے دل گیر کیوں ہو گئے ہو کہ اب مسکراتے نہیں

غلام محمد قاصر

○

بن میں ویراں تھی نظر شہر میں دل روتا ہے
زندگی سے یہ مرا دُوسرا سمجھوتا ہے

لہلہاتے ہوئے خوابوں سے مری آنکھوں تک
رت جگے کاشت نہ کر لے تو وہ کب سوتا ہے

جس کو اس فصل میں ہونا ہے برابر کا شریک
میرے احساس میں تنہائیاں کیوں بوتا ہے

نام لکھ لکھ کے ترا، پھول بناتا ہے کوئی
اور پھر شبنمی آنکھوں سے ورق دھوتا ہے

تیرے بخشے ہوئے اِک غم کا کرشمہ ہے کہ اب
جو بھی غم ہو، مرے معیار سے کم ہوتا ہے

سو گئے شہرِ محبت کے سبھی داغ و چراغ
ایک سایہ پسِ دیوار ابھی روتا ہے

یہ بھی اک رنگ ہے شاید مری محرومی کا
کوئی ہنس دے تو محبت کا گماں ہوتا ہے

○

کہیں لوگ تنہا، کہیں گھر اکیلے
کہاں تک میں دیکھوں یہ منظر اکیلے

گلی میں ہواؤں کی سرگوشیاں ہیں
گھروں میں مگر سب صنوبر اکیلے

نمائش ہزاروں نگاہوں نے دیکھی
مگر پھول پہلے سے بڑھ کر اکیلے

اب اک تیر بھی ہو لیا ساتھ ورنہ
پرندہ چلا تھا سفر پر اکیلے

جو دیکھو تو اک لہر میں جا رہے ہیں
جو سوچو تو سارے شناور اکیلے

تری یاد کی برف باری کا موسم
سُلگتا رہا دل کے اندر اکیلے

ارادہ تھا، جی لُوں گا تجھ سے بچھڑ کر
گزرتا نہیں اِک دسمبر اکیلے

زمانے سے قاصر خفا تو نہیں ہیں؟
کہ دیکھے گئے ہیں وہ اکثر اکیلے

غلام محمد قاصر

○

دریا ساتھ بہا لایا اک نام اور اِک تصویر
ڈوبتے شہر سے کیا پایا اک نام اور اک تصویر

پیار کی ڈھلتی دُھوپ میں جلتی سانسوں کا حاصل
اک دیوارِ بے سایہ، اک نام اور اِک تصویر

دل تو آج اُڑان سے ٹوٹا بھیگی شام کے ساتھ
شہرِ سبا میں چھوڑ آیا اک نام اور اِک تصویر

ناموں اور تصویروں کے بے انت جہانوں میں
اے دل تیرا سرمایہ، اک نام اور اک تصویر

سوچوں سے اُتریں گے ساتوں رنگ اُداسی کے
قاصرؔ آج اُٹھا لایا اک نام اور اِک تصویر

○

سوزِ ہجراں سے خشک پات جلے
تم جو آؤ تو شاخ ساتھ جلے

تھم گئی یوں پھوار جذبوں کی
تیری تصویر چھُو کے ہاتھ جلے

کل مرے ایک خط کی حِدّت سے
کتنے بوسیدہ کاغذات جلے

کوفہ و شام میں ہے امن و اماں
چند خیمے لبِ فرات جلے

سب چراغوں کی لَو لرزنے لگی
اب کہاں جا کے زرد رات جلے

ایک آنچل کی آنچ سے قاصرؔ
ہم جلے اور تا حیات جلے

محمد اظہار الحق

○

(۴۴ ویں سالگرہ پر)

مرے لبوں سے کسی کے خالِ سیاہ تک ہے
چہار جانب جدائی حدِ نگاہ تک ہے

رقم ہے جس کے سفید ماتھے پہ عمر میری
تمام رنجِ سفر اُسی سنگِ راہ تک ہے

یہ ناز برداریاں ہمیشہ نہیں رہیں گی
یہ حسن کا التفات تابِ گناہ تک ہے

خلا میں پر مارتے فرشتے، زمیں پہ زائر
وصال کا جشن عرش سے قتل گاہ تک ہے

کہیں تپش آگ کی، کہیں چاندنی کی ٹھنڈک
زمیں کے نیچے یہ سلسلہ مہر و ماہ تک ہے

سیّد نردوش مغربی

○

جبر کے شہر میں مظلوم کہاں تک رہتا
حرف کی قید میں مفہوم کہاں تک رہتا
بانجھ دھرتی سے میں الفاظ کا پیکر بن کر
چہرۂ وقت پہ مرقوم کہاں تک رہتا
میرے احساس پہ افلاس نے کالک مل دی
زر کی پرچھائیں میں معصوم کہاں تک رہتا
مجھ کو غربت نے حجابوں سے نکلنے نہ دیا
اجنبی! تو مرا مقسوم کہاں تک رہتا
مندمل وقت نے سب زخم کیے ہیں میرے
میں بھی انسان تھا، مغموم کہاں تک رہتا
وہ بھی پہلو میں دھڑکتا ہوا دل رکھتا تھا
دولتِ درد سے محروم کہاں تک رہتا
اُس نے جذبوں کے سمندر پہ حکومت کی تھی
ساحلِ شوق کا محکوم کہاں تک رہتا
جس کی آنکھوں میں ہوس رقص کناں رہتی تھی
شہرِ عشاق میں مخدوم کہاں تک رہتا
اُس میں اب پہلی سی وہ تازگیِ حسن نہیں
سچ ہے تازہ گُلِ مشموم کہاں تک رہتا

جمال احسانی

○

بسر یوں شبِ عمر کر جاؤں گا
کوئی خواب دیکھوں گا، ڈر جاؤں گا

یہی سوچتا گھر سے دُور آ گیا
کوئی روک لے گا، ٹھہر جاؤں گا

اگر بن نہ پائے گی کوئی جگہ
تو خالی جگہ کوئی بھر جاؤں گا

کسی اور دل میں بناؤں گا گھر
جب اُس کی نظر سے اُتر جاؤں گا

بھنک تک پڑے گی نہ اُس کو ذرا
دبے پاؤں یاں سے گزر جاؤں گا

رہے ضد پہ قائم اگر اُس کے اشک
یہی ہو گا، اِک دن سنور جاؤں گا

کہ ہو راستہ واپسی کے لیے
میں دانستہ کچھ بھول کر جاؤں گا

بھروسا نہیں عمرِ فانی کا کچھ
جہاں ریل ٹھہری اُتر جاؤں گا

یونہی مرنے والوں کو روتے ہوئے
جمالؔ ایک دن میں بھی مر جاؤں گا

○

خوشبو گلاب میں خوش، پتا شجر میں خوش ہے
جو بھی ہے اپنے اپنے دیوار و در میں خوش ہے

پیروں پہ جو کھڑا ہے، یہ ہے زمین اُس کی
ہے آسماں اُس کا، جو بال و پر میں خوش ہے

یہ ہجر کون جانے، یہ بات کون سمجھے
میں اپنے گھر میں خوش ہوں، وہ اپنے گھر میں خوش ہے

تو ہی بتا محبت، یہ بھی کوئی خوشی ہے
یہ دِل مرا اکیلا، اس شہر بھر میں خوش ہے

جتنے بھی ہیں مسافر، سب کے اُصول الگ ہیں
کوئی قیام میں اور کوئی سفر میں خوش ہے

سلیم کوثر

○

نشیبِ خاک سے میرا لہو پکارتا ہے
خبر نہ تھی، صفِ اعداء سے تُو پکارتا ہے

طلسم خانۂ اشیاء کی اس گرانی میں
بجائے رونقِ بازار، ہُو پکارتا ہے

عجب جنُوں ہے، عجب ہے دریدہ پیرہنی
کہ زخم چیختا ہے اور رفُو پکارتا ہے

ہم اس قدر ہیں مگر اپنی ہی صدا کے اسیر
وہ ایک ہے جو ہمیں چار سُو پکارتا ہے

پسِ غبارِ رہِ رفتگاں، اک آئینہ
نہ جانے کب سے مجھے روبرُو پکارتا ہے

سلیم جو مرے صحرا سے بے خبر گزرا
مجھے وہ ابرِ سرِ آب جُو پکارتا ہے

○

حیرتِ دید لیے حلقۂ خوشبو سے اُٹھا
میں اُجالے سے اُٹھا یا ترے پہلو سے اُٹھا

صُبح آغاز تری جنبشِ مژگاں سے ہُوئی
لشکرِ شام ترے خیمۂ ابرُو سے اُٹھا

گریۂ نیم شبی دستِ دُعا تک آیا
اور تری یاد کا شعلہ مرے آنسو سے اُٹھا

میں کہ زندانیٔ شب تھا، پہ جگرِ نجتے ہی
کیسا خورشید بکف حلقۂ گیسو سے اُٹھا

میں جو درویش، نہ صوفی، نہ قلندر ہوں سلیم
رقص کرتا ہُوا کیوں مجمعِ یا ہُو سے اُٹھا

ساجد امجد

○

دھوپ بھی، سائبان بھی
خوب ہے آسمان بھی

سایۂ شاخِ گل بھی ہے
نیند بھی ہے تکان بھی

مسئلہ بازوؤں کا ہے
تیر بھی ہے کمان بھی

اب یہ کھلا کہ بام و در
رکھتے ہیں اک زبان بھی

چھاؤں ملی عجب کہ ہم
بھول گئے مکان بھی

دونوں ہوا پہ ہیں سوار
ہم بھی، کسی کا دھیان بھی

آمدِ شب کے ساتھ ساتھ
بجنے لگے ہیں کان بھی

ہم بھی تھے غم طلب ذرا
لوگ تھے مہربان بھی

تشنہ رہیں شجر شجر
ملتی رہے امان بھی

چلتا رہے سوارِ اشک
کٹتی رہے چٹان بھی

سر بھی جھکے کہیں کہیں
کم نہ ہو آن بان بھی

جیت ہے، تو اگر ملے
ہار کے دو جہان بھی

○

مجھ کو اندازہ نہ تھا عرضِ طلب سے پہلے
دن بھی پڑتا ہے ترے وعدۂ شب سے پہلے

اب تو یہ حال ہُوا ہے کہ اگر بھول سکیں
ہم تجھے بھولنے والوں میں ہوں سب سے پہلے

چلو تنہائی سہی، ہو تو گیا دل آباد
کون اس شہر میں آباد تھا اب سے پہلے

کیا تعجب کہ محبت نہ ہو رسوا، ہم ہوں
واقعہ سامنے آتا ہے سبب سے پہلے

آخرِ شب کا تماشہ تو گوارا تھا مگر
کچھ چراغ اب کے بجھے آخرِ شب سے پہلے

ہم سخن سنج بھی کس بزم میں آ نکلے ہیں
دل دھڑکتا ہے یہاں جنبشِ لب سے پہلے

کوئی ماحول ہو، جی ڈرتا ہے باتیں کرتے
کب کسی دل کو یہ آزار تھا اب سے پہلے

کوئی روگ ایسا لگا تھا کہ ہمیشہ ساجد
پلکیں نم ہو گئیں احساسِ طرب سے پہلے

اعتبار ساجد

○

رُت کی بے مہر ہواؤں سے بچے رہ جائیں
کوئی تدبیر کرو، پھول کھلے رہ جائیں

تیرے ہونٹوں پہ کوئی عذرِ جفا رہ جائے
میری آنکھوں میں مرے خواب سجے رہ جائیں

عین ممکن ہے جو اب طوقِ گلو بن کے لپٹ جاؤں
اپنی گردن پہ مرے ہاتھ جمے رہ جائیں

شہرِ جاناں مری رُودادِ سفر پڑھ نہ سکے
ریت پر میرے سب اوراق پڑے رہ جائیں

صبح آئے تو مرا دستِ ہنر شل ہو جائے
ان کہی نظم کے اشعار دھرے رہ جائیں

کیا خبر لوٹ کے آئیں نہ مسافر اب کے
صبح ہو جائے، یہ دروازے کھلے رہ جائیں

رات آئے تو کوئی چاپ نہ اُبھرے ساجد
منتظر، گھر کی منڈیروں پہ دیے رہ جائیں

○

کر گیا رُوح کو شاداب ترا غم اب کے
دل بھی رویا ہے، فقط آنکھ نہیں نم اب کے

شہر کا شہر مرے نوحہ گروں میں تھا شریک
ایسے برسا ہے ترے درد کا موسم اب کے

مرگِ انبوہ کا عالم تھا دیارِ جاں میں
بچھ گئی تھی سرِ ہر دل، صفِ ماتم اب کے

کربِ ہجراں کی صعوبت ہے نہ تسکینِ وصال
دل پہ ہے اور ہی اندوہ کا عالم اب کے

میرے در سے نہیں لوٹے گا سوالی تیرا
جان لے کر ہی سدھارے گا ترا غم اب کے

قرض خواہانِ وفا آخری آنسو چُن لیں
یعنی بچھڑے تو پلٹنے کے نہیں ہم اب کے

[illegible] زندہ دلانِ دہر
اور ہی منزلِ جاں میں تھے مگر ہم اب کے

ریاض حسین چودھری

○

ہو جنوں بندی چمن میں برق لہرانے کے بعد
حبس کی زنجیر بھی ٹوٹے، گھٹا چھانے کے بعد

زرد پتوں کی حکومت ہی چمن میں ہے، صبا!
رنگ کچھ بدلا نہیں تیرے بھی آ جانے کے بعد

پوچھتا پھرتا ہے اب بجھتے چراغوں سے کوئی
کیا اندھیرا ہی رہے گا شب گزر جانے کے بعد

جل بجھی ہے اپنے اشکوں میں تو یہ اچھا ہوا
شمع کیا جلتی سحر تک اپنے پروانے کے بعد

جا چکا ہے وہ نشاں گلیوں میں اپنے چھوڑ کر
تم نے پتھر بھی اٹھائے ہیں تو دیوانے کے بعد

کس کا چہرہ تھا غبارِ درد میں مہکا ہوا
کچھ کہا ہوتا تمہی نے میرے افسانے کے بعد

بارشوں ہی سے ضمانت کیا طلب کرتا کوئی
اپنے گھر کے پتھر در و دیوار گر جانے کے بعد

کون رکھے گا سرابوں میں سفر جاری ریاض
ایک ویرانہ ہی آ جاتا ہے ویرانے کے بعد

○

سورج کی زندگی کی خبر دے سکیں تو دیں
ہم روشنی کا ساتھ اگر دے سکیں تو دیں

انسان جل رہے ہیں قیامت کی دھوپ میں
سڑکوں کو سایہ دار شجر دے سکیں تو دیں

چھوڑیں وراثتوں میں جو ابرِ خلوص کے
بچوں کو جستجو کا گھر دے سکیں تو دیں

خیمہ لگا ہو تشنہ لبی کا سرِ فرات
ریگِ رواں کو خونِ جگر دے سکیں تو دیں

چھائی ہوئی ہے موت کی زردی گلاب پر
اپنے لہو کو اذنِ سفر دے سکیں تو دیں

جو مطمئن ہیں کرمکِ شب کو دبوچ کر
اُن کو اگر شعورِ سحر دے سکیں تو دیں

گردِ انا میں آپ کے چہرے کو کیا ہوا
میلی سی آئنوں کو نظر دے سکیں تو دیں

شب کو بھی روشنی کے مناظر میں گم رہیں
دیوار و در کو ایسا ہنر دے سکیں تو دیں

چہرے پہ جو کتاب سی اک درج ہے ریاض
اندر کے آدمی کو اگر دے سکیں تو دیں

قائم نقوی

○

سُونے آنگن جاگے، روشن بام ہوئے
روشنیوں میں سب چہرے گلفام ہوئے

دن تو خوفِ سفر کی نذر ہوا لیکن
رات آئی تو سپنے بھی الہام ہوئے

سمتے ہیں اب رات نے آ گھیرا تو کیا
گھر سے ہی جب نکلے تھے ہم شام ہوئے

آپس کی سب باتوں کا ابلاغ ہُوا
اپنے فن پارے تو سب ابہام ہوئے

ہر صورت میں اُس کی صورت تھی قائمؔ
سارے نام اُسی کے، ہم بے نام ہوئے

قائمؔ جس کے ہاتھ پہ ہم نے بیعت کی
اُس کے ہاتھوں شہر میں ہم نیلام ہوئے

○

یہ اُس کی امانت ہے، یہ جان بچالینا
اس راہ سے پھر جانا، یہ بوجھ اُٹھا لینا

یہ کوئی نہ دیکھے گا، کس حال میں جاں دی تھی
یہ بات چھپانے کو اِک بات بنا لینا

اِک دُھن میں رواں بہنا بے تاب سمندر میں
اور بیچ بھنور کوئی تم راہ بنا لینا

وہ تخت تھا یا تختہ، بستر تھا کہ خُم خانہ
اِک رات کا افسانہ اِک صُبح سُنا لینا

جب کاگ منڈیروں سے چپ چاپ اُتر آئیں
بکھرے ہوئے پھولوں کو آنگن سے اُٹھا لینا

اِک بات نبھانے کو کیا کچھ نہ گنوایا ہے
اِک دل کے اُجڑنے پر گھر اپنا بسا لینا

○

روز و شب کے جال میں یہ کون دیکھے
کون ہے کس حال میں، یہ کون دیکھے

کون سا در کس مکاں میں کھُل رہا ہے
پھیلتے بھونچال میں یہ کون دیکھے

کیوں دراڑیں پڑ رہی ہیں پھر زمیں پر
کیا ہُوا پاتال میں، یہ کون دیکھے

کون سی شب کس سحر کی نذر ہوگی
زندگی کے تال میں، یہ کون دیکھے

کون جانے کب کھلے خوشبو و چنبیلی
خشک ہوتی ڈال میں، یہ کون دیکھے

سلطان سکون

○

لبوں پہ حرفِ شکایت نہ چشمِ تر رکھنا
مثالِ سنگ ہماری طرح جگر رکھنا

خوشی کا کیا ہے بھروسا کہاں بچھڑ جائے
رہِ حیات میں غم کو بھی ہمسفر رکھنا

نہیں ضرور کہ ہر وار دشمنوں ہی کا ہو
تم اپنے دوستوں پر بھی کڑی نظر رکھنا

زہے نصیب کوئی باوفا نکل آئے
کسی سے ایسی توقع نہ اب مگر رکھنا

مرے خلوص کا بھی اب کے کوئی ٹھیک نہیں
مری طرف سے بھی تھوڑا سا دل میں ڈر رکھنا

یہاں تو ہر کوئی پتھر اُٹھائے پھرتا ہے
سکونؔ شیشۂ دل کو سنبھال کر رکھنا

○

بہت مٹھاس جو اپنی زباں میں رکھتا ہے
وہ ایک تیرِ ستم بھی کماں میں رکھتا ہے

ملے بھی وہ تو کبھی ٹوٹ کر نہیں ملتا
خلش ضرور کوئی درمیاں میں رکھتا ہے

یہی تو اُس کا ہنر ہے کہ اپنی باتوں سے
ہر اک کو حلقۂ حسنِ گماں میں رکھتا ہے

ہوائیں اُس کے لیے آندھیاں اُٹھاتی ہیں
جو پیڑ ایک بھی پتا خزاں میں رکھتا ہے

وہ کس پہ وار کرے، در گزر کرے کس سے
کئی عدو جو صفِ دوستاں میں رکھتا ہے

سکونؔ صبر کا پھل اور کوئی ہو کہ نہ ہو
دکھوں کی دھوپ میں امن و اماں میں رکھتا ہے

یحییٰ خالد

○

نیلی آنکھوں سے اُمڈتی تھیں گھٹائیں کتنی
چھیڑتی جاتی تھیں زلفوں کو ہوائیں کتنی

سوزِ دل، گریۂ شب، سنگِ ملامت، بن باس
اس سے ملنے کی ملیں مجھ کو سزائیں کتنی

پھر اُسی شوخ نے چھینا مری آنکھوں کا سکوں
جس سے ملنے کے لیے کی تھیں دعائیں کتنی

مجھ پہ آزاد فضاؤں کا نہ در کھُل پایا
دے رہا تھا پسِ دیوار صدائیں کتنی

بیٹے پردیس گئے پیٹ کا دوزخ لے کر
راہ چوکھٹ سے لگی تکتی ہیں مائیں کتنی

تیرا در چھوٹا، خرد چھوٹی ہے، گاؤں چھوٹا
تیرے خالد نے نبھائی ہیں وفائیں کتنی

○

نہ جانے پہلے سی تیری نظر بھی ہو کہ نہ ہو
میں گاؤں آؤں تو تم کو خبر بھی ہو کہ نہ ہو

جب آئی ہو تو گھڑی دو گھڑی ٹھہر جاؤ
پھر اس طرف سے تمھارا گزر بھی ہو کہ نہ ہو

سنا ہے بارشیں برسی ہیں پچھلے سال بہت
نہ جانے گاؤں میں اب میرا گھر بھی ہو کہ نہ ہو

اُجاڑ آنکھوں میں کب تک جلیں گے آس کے دیپ
سیاہ رات! تمھاری سحر بھی ہو کہ نہ ہو

ہزار بار اُٹھے ہاتھ گر گئے خالد!
یہ سوچ کر کہ دعا میں اثر بھی ہو کہ نہ ہو

طاہر تونسوی

○

تو طے ہوا نا کہ جب بھی لکھنا رُتوں کے سائے عذاب لکھنا
اُجاڑ موسم میں تپتے صحرا کو آب لکھنا، حباب لکھنا

مجھے یقیں ہے، نصیب میرا نہ ساتھ دے گا کہ تجربہ ہے
سکوں کو اضطراب کہنا، حقیقتوں کو سراب لکھنا

یہ تیری غزلیں بیاں نہیں ہیں وصالِ شب کی نوازشوں کا
جو ہو سکے مثنوی میں سارا وہ عکسِ کیفِ شباب لکھنا

اذیتوں کے سفر میں، میں نے بھرم رکھا پھر بھی حوصلوں کا
منافقت کے جہاں میں مجھ کو صداقتوں کا نصاب لکھنا

یہ دورِ اہلِ قلم پہ بھاری کہ مصلحت کی سبیل جاری
گناہ کو بھی ثواب کہنا، ببول کو بھی گلاب لکھنا

ہوا کے ماتھے پہ درج تحریر موسموں کی تمازتوں سے
جو مٹ گئی ہے تو کیا ہوا ہے، نئے سرے سے وہ باب لکھنا

گلاب رُت میں یہ زردیوں کے نقوش چہرے پہ دیکھ لینا
ہمارے بارے میں کچھ نہ کہنا جو عبرتوں کی کتاب لکھنا

ہری بھری کھیتیاں کہاں ہیں مرے مقدر کے زائچے میں
شہیدِ عشق و وفا کا طاہرؔ ہتھیلیوں پر حساب لکھنا

انجم یوسف زئی

○

مشکلیں اچھی لگیں، سب مرحلے اچھے لگے
ساتھ میں وہ تھا تو سارے راستے اچھے لگے

دُوریاں حائل تھیں لیکن قربتیں آنکھوں میں تھیں
چاہتوں کی منزلوں کے فاصلے اچھے لگے

ایک سے موسم کی بے کیفی کو کیسے جھیلتے
جلتی بجھتی ساعتوں کے سلسلے اچھے لگے

گھر کے تیرہ صحن میں تھی چاندنی آنے کی آس
نیند تھی آنکھوں میں، پھر بھی رتجگے اچھے لگے

چشم کے لب نیم وا تھے اور لہجہ پُر خمار
بے زبانی کی زباں وہ بولتے اچھے لگے

حسن رضوی

O

اس کا چہرہ اُجلا دن ہے، اُس کی آنکھیں شام
رنگ برنگے پھُولوں جیسے ڈھیروں اُس کے نام

یوں تو ہر چہرے کو دیکھوں اُس کے رنگ چنُوں
لیکن جب تصویر میں ڈھالوں، لکھوں ایک ہی نام

وہ بھی دن تھے، دیپک گاتے بانسریا کے سنگ
یہ بھی دن ہیں، راکھ ہوئے ہم جیسے گئے ایام

اُس کی کھوج میں پنچھی بن کر دیس بدیس پھرے
اُس کا رستہ تکتے تکتے ہو گئی عمر تمام

گاؤں کے چوپال بھی سُونے، سُونے سب کھلیان
اِس بستی کے سناٹے میں ہے آواز حرام

حسنؔ بھی بہنر ہے اب تو گھر ہی لوٹ چلیں
بال بکھیرے دروازے پر راہ تکے ہے شام

O

اُس کی آنکھیں ہرے سمندر، اُس کی باتیں برف
پھر بھی نقش ہُوا ہے دل پر اس کا ایک اِک حرف

اپنی اپنی پھلواری سے ہر کوئی پھُول چُنے
اپنا اپنا دامن سب کا اپنا اپنا ظرف

اُس کی چاہ میں رانجھا بن کر بیلا بیلا گھومے
دھوپ کے اس صحرا میں اپنی عمر ہوئی ہے صرف

اِک دُوجے کو دیکھ نہ پائے، برسوں بیت گئے
آنکھوں کی پُتلی میں لکھے ہی رہ گئے کتنے حرف

سُوکھے دریاؤں کی صورت قطرہ قطرہ ترسیں
جانے کب چمکے گا سورج، کب پگھلے گی برف

زمان ملک

○

ہم مر جائیں، کبھی ایسا ہو
کوئی چُھپ کر ہم کو تکتا ہو

کوئی ہم سا پاگل کہاں ملے
جو نیند سے آنکھ چراتا ہو

اور دھوپ چڑھے تا شام ڈھلے
جو ایک ہی سپنا تکتا ہو

اور تجھ سے ملنے کی خاطر
جو خود سے بچھڑا بیٹھا ہو

دُنیا سے تماشا چھپا رہے
اک تنہائی کا پردہ ہو

رات ایسی آواز آتی تھی
جیسے کوئی خواب میں روتا ہو

اک بُت ہو مرمر کا لوگو
مرا نام جو لے کر جیتا ہو

○

(تارا کے نام)

میرے خواب اور میری باتیں تیرے نام
میرے دن اور میری راتیں تیرے نام

تیرے نام ہے رُکنا، چلتے جانا بھی
میری فتحیں، میری ماتیں، تیرے نام

آنکھ اُفق پر قوسِ قزح تیری دید سے ہے
دل میں ٹھہری ہوئی برساتیں تیرے نام

دھیان میں کھلتے سارے پھول ان کی خوشبو
تیری یادوں کی سوغاتیں تیرے نام

رنگِ زمین و زماں قائم تیری خواہش سے
چشمِ فلک کی ساری گھاتیں، تیرے نام

ثمینہ راجہ

○

کچی عمر تھی، آنکھوں میں کچھ خواب بھی تھے
اور رواجوں رسموں کے گرداب بھی تھے

یہ بھی زعم کہ اپنا سکوں بھی دائم ہے
جھکتی پلکوں میں جگمگ سیماب بھی تھے

دُنیا سے دُنیا والوں سے ربط بھی تھا
اور آنکھوں میں کچھ اَن دیکھے خواب بھی تھے

مایوسی کا رنگ اب کالا لگتا ہے
پہلے اس تاریکی میں مہتاب بھی تھے

ڈھلتی رات اور جُگنو کھُلے دریچے میں
اوس میں بھیگے سُرخ اور زرد گلاب بھی تھے

جانے والے وقت کی جھولی میں، اپنے
ایسے کچھ لمحے تھے جو نایاب بھی تھے

پھُول اُچھالے اکثر بیگانوں نے بھی
پتھر مارنے والوں میں احباب بھی تھے

اب افلاک پہ اس کا قصہ درج ہوا
پہلے اس میں چند ہمارے باب بھی تھے

ہم دونوں کی ساری عمر فضول کٹی
دُنیا میں جینے کے کچھ آداب بھی تھے

○

پہنچ کے منزل پہ بھی نہ چھوڑے گا ساتھ میرا
کسی ستارے نے تھام رکھا ہے ہات میرا

مجھے تو بس ایک شکلِ دلدار ہی خوش آئی
زمانے بھر سے جُدا تھا معیارِ ذات میرا

ہزار حملے ہوئے، پہ قائم اَنا ہے میری
کہاں شکست آشنا ہوا سومنات میرا

بس ایک ساعت فراق کی جاں کا روگ ٹھہری
بس ایک "کنکر گزیدہ" ہے ظرف ذات میرا

وہ جیسے شبنم لرز کے رہ جائے پتیوں پر
بہت نہیں تو اسی قدر ہو ثبات میرا

عجیب تشنہ لبی ہے، چھالے ہیں رُوح پر بھی
ترے بدن میں چھُپا ہوا ہے فرات میرا

میں صرف ذرہ ہوں، ذات اس کی ہے ایک صحرا
یہی ہے علمِ حیات اور کائنات میرا

سرور کاشمیری

○

بند گلشن پہ موسم کے سوتے ہوئے
پھول پیاسے ہیں شبنم کے ہوتے ہوئے

میرے چہرے پہ سب نے پڑھی ہے خوشی
مجھ کو دیکھا نہ اندر سے روتے ہوئے

اپنی پلکوں پہ اک شہر چراغاں کیا
اُس نے ہنستے ہوئے، میں نے روتے ہوئے

میں نے انجام پر اک نظر بھی نہ کی
کچے دھاگوں میں پتھر پروتے ہوئے

کتنے دہقان سرورؔ مرے بھوک سے
بیج دھرتی کے سینے میں بوتے ہوئے

○

سفر ہے پاؤں کی زنجیر قافلوں کے لیے
ہزار راستے بدلیں گے منزلوں کے لیے

حصارِ شب میں ستاروں کی آرزو کیسی
کہ اب تو لوگ ترستے ہیں جگنوؤں کے لیے

یہ اور بات کہ دامن میں سنگ بھر لائے
گئے تھے ساحلِ دریا پہ موتیوں کے لیے

تھکن بہت ہے مگر دشتِ درد میں سرورؔ
کوئی شجر ہی نہیں ہے مسافروں کے لیے

محمد اظہار الحق

○

کوئی زاری سنی نہیں جاتی، کوئی جرم معاف نہیں ہوتا
اس دھرتی پر، اس چھت کے تلے کوئی تیرے خلاف نہیں ہوتا

کبھی دیکھیں سونے کے ذرّے، کبھی جھلکے مرغابی کا لہو
کئی پیاسے کب سے کھڑے ہیں مگر پانی شفاف نہیں ہوتا

کوئی زلف اڑے تو بکھر جانا، کوئی لب دیکھیں تو ٹھٹھر جانا
کیا تزکیہ کرتے ہو دل کا، یہ آئنہ صاف نہیں ہوتا

کئی موسم گزر گئے مجھ پر، احرام کے ان دو کپڑوں میں
کبھی پتھر چوم نہیں سکتا، کبھی اذنِ طواف نہیں ہوتا

یہاں تاج اس کے سر پر ہوگا جو تڑکے شہر میں داخل ہو
یہاں سایہ ہما کا نہیں پڑتا، یہاں کوہِ قاف نہیں ہوتا

مسرت ہاشمی

○

بارش کا خوف دھوپ کا ڈر بھی نہیں رہا
اس بار حادثات میں گھر بھی نہیں رہا

کرنیں حصارِ جبر میں تاریک ہوگئیں
سورج کی سمت روزنِ در بھی نہیں رہا

جب سے چمن میں موسمِ مبہم کا راج ہے
پیڑوں پہ سبز رُت کا ثمر بھی نہیں رہا

اس دشتِ بے اماں میں رفاقت بھی لُٹ گئی
زادِ سفر کے ساتھ سفر بھی نہیں رہا

اک سربلند شخص کی دستار گر پڑی
لیکن جو زیبِ جسم تھا سر بھی نہیں رہا

اُس نے پلٹ کے ہاشمی دیکھا نہیں مجھے
شاید مری صدا میں اثر بھی نہیں رہا

یوسف جمالی

○

بے ہُنر کو فنِ تعمیر سکھایا جائے
اب تو مزدور کو معمار بنایا جائے

بھڑ بھڑاتے ہوئے لوگوں کو چُھڑانے کے لیے
اب شکاری کے لیے جال بچھایا جائے

دیوتاؤں کی طرح ہو، نہ فرشتوں جیسا
صرف انسان کو انسان دکھایا جائے

بے گھروں کے لیے اینٹیں ہوں فراہم کتنی
جو ترے شہر کا مینار گرایا جائے

میں تو مُنکر ہوں کھُلا زر کا جہاں میں یوسؔف
حرفِ زر سے نہ سخن میرا لکھایا جائے

(سویڈن)

مخلص وجدانی

○

زباں تک لا نہیں سکتے کچھ ایسے حادثے دیکھے
ہمیں زندہ رہے، کوئی ہمارے حوصلے دیکھے

اندھیرے میں نکلنا اور گئی شب لوٹ کر آنا
کسے فرصت کہ اب بچّوں کو ہنستے کھیلتے دیکھے

کسی نے خواب کے پردے پہ بھی دیکھے نہیں ہوں گے
جو اپنی جاگتی آنکھوں سے ہم نے سانحے دیکھے

تعجب کیا اگر دہلیز پر سویا ہوا پایا
مرا ننھا کہاں تک میرا رستہ بیٹھ کے دیکھے

یہ کیسے لوگ ہیں مخلؔص نہ کچھ دیکھیں نہ کچھ سوچیں
جدھر کوئی چلا، سب اس کے پیچھے بھاگتے دیکھے

مامون ایمن

○

محفلوں میں دیکھتا ہوں ہر طرف چہرے نئے
یا سجائے ہیں مری وحشت نے آئینے نئے

ایک ہی تعبیر نکلی جب مرے ہر خواب کی
خواب امیدوں نے کل شب جانے کیوں دیکھے نئے

پھر سے دیوانوں نے بدلے عشق و مستی کے اصول
مفتیٔ شہرِ جنوں نے پھر دیئے فتوے نئے

میرے دل میں جب سمایا ہے ازل سے تیرا حسن
میری آنکھیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں کیوں جلوے نئے

بیٹھنے دیتا نہیں دل کو کہیں عزمِ سفر
منزلوں کی کوکھ سے پیدا ہوئے رستے نئے

اپنی ہی گلیوں میں آئے لے کے ہم کاسہ نیا
جب سے احکامِ گدائی شہر میں آئے نئے

بے طرح آئی ہے گلشن میں خزاں ایمن، مگر
خار کے پہلو میں کھل اٹھے ہیں کچھ غنچے نئے

(نیویارک)

○

ہر منظرِ حیات منوّر دکھائی دے
ذوقِ نظر کو ہر کوئی ششدر دکھائی دے

جی چاہتا ہے اور بڑھے منظرِ جنوں
ایک ایک ہاتھ میں مجھے پتھر دکھائی دے

ذرہ بھی روشنی میں لگے آفتابِ نور
قطرہ بھی سوچنے میں سمندر دکھائی دے

دھڑکن کا رازِ خلق کو معلوم ہو تو کیوں
اندر جو حال ہے وہ نہ باہر دکھائی دے

ایک اِک گلی کے موڑ پہ لٹکا ہے صلیب
اٹھتا ہوا جو شہر میں اِک سر دکھائی دے

(نیویارک)

صدیق منظر

○

ہم سنبھل کر بھی چلے تو ٹھوکروں میں آ گئے
آپ کیوں پتھر اُٹھا کر راستوں میں آ گئے

یوں ستارے ٹوٹتے ہیں، ناچتی ہے روشنی
جیسے تیرے عہد و پیماں تجربوں میں آ گئے

جو کسی کے کچھ نہیں لگتے ہیں، اُن سے پوچھ لو
کس کی آہٹ پر تڑپ کر کھڑکیوں میں آ گئے

لوگ بھائی بیچ دیتے ہیں ضرورت کے لیے
کیا ہُوا، کچھ دوست اپنے تاجروں میں آ گئے

چاندنی راتیں، سُلگتے پیڑ، اپنی وحشتیں
کیسے کیسے رنگ اپنے رتجگوں میں آ گئے

صبح کی پہلی کرن ہیں ہم چراغِ شب نہیں
کیا ہُوا منظرؔ بکھر کر آندھیوں میں آ گئے

○

کبھی قیام کبھی ہجرتوں میں شام آئی
اُسے بھی میری طرح گردشوں میں شام آئی

نہ ہم سفر ہیں ستارے، نہ چاندنی، نہ چراغ
مرے خدا! مجھے کن جنگلوں میں شام آئی

کوئی دریچہ کھُلا تھا، نہ کوئی دروازہ
کبھی صداؤں، کبھی دستکوں میں شام آئی

سفر کے بعد بھی ہاتھوں میں ہیں اٹھائے ہوئے
وہی چراغ جنھیں آندھیوں میں شام آئی

وہ منتظر نہ تھا میرا تو اور کس کا تھا
کھڑے کھڑے اُسے کیوں کھڑکیوں میں شام آئی

بس اک صدا کا تعاقب تھی زندگی منظرؔ
جہاں جہاں بھی گئے، راستوں میں شام آئی

افتخار بخاری

○

دن بھر ایک سراب کے پیچھے، رات کو اک مہتاب میں گم
عمر کی ریت پہ چلتے رہنا، لا حاصل کے خواب میں گم

دشتِ اُمید کی دھوپ مسافت، دُور کہیں اک سایۂ دل
میں بھی ایک سراب میں گم ہوں، تو بھی ایک سراب میں گم

دُنیا ایک سفر کا موسم، آنکھیں دو اُڑتے پنچھی
کیا کیا نقش بنے اور ہو گئے مٹی کے گرداب میں گم

جی گھبرائے پھر بھی ساحلِ دل پر رُک کر سوچ کبھی
کیسے کیسے چاند نگر ہیں یادوں کے سیلاب میں گم

دھوپ میں جلتی دھول بھری ان سڑکوں سے اب کیا پوچھوں
کہاں کہاں ہیں خواب وہ میرے اس شہرِ بے خواب میں گم

(عمان، اردن)

○

جس میں مرا سفر تھا وہ منظر تھا ریت کا
آنکھوں کی کشتیاں تھیں، سمندر تھا ریت کا

آبِ رواں کی دُور چمک دیکھتا تھا میں
رنگوں میں ایک رنگ یہ بہتر تھا ریت کا

حسرت تھی اور ابر کی دہشت بھی تھی مجھے
شدت کی تشنگی تھی مگر گھر تھا ریت کا

آزاد تھا میں گھومتی وسعت کی قید میں
ہر لمحہ میرے پاؤں میں چکر تھا ریت کا

جانے بخاری کون سے شہروں کا تھا غبار
اک سلسلہ جو شہر سے باہر تھا ریت کا

(عمان، اردن)

افتخار بخاری

○

کیوں آب، خاک، آگ، ہوائیں سفر میں ہیں
کس کھوج میں یہ چار بلائیں سفر میں ہیں

میں چار سمت پھیل گیا ہوں، مجھے نہ ڈھونڈ
اب میں نہیں ہوں، میری صدائیں سفر میں ہیں

ہونا ترا ہے حبس پہ موقوف، کیا کریں
لے کاغذوں کے شہر! ہوائیں سفر میں ہیں

ٹکرا کے کس سے لوٹیں کہ ہے آسماں سراب
مانگی تھیں ہم نے جو، وہ دعائیں سفر میں ہیں

پڑتی ہے اب پھوار کہ گرتی ہیں بجلیاں
پھر میرے گھر کے گرد گھٹائیں سفر میں ہیں

(عمان، اُردن)

○

بے شمار شاموں میں ماہتاب روشن ہے
ہر کسی کی آنکھوں میں ایک خواب روشن ہے

رائگاں خیالوں میں یاد اُس کے چہرے کی
تیرگی کے صحرا میں اک سراب روشن ہے

اشک اشک آنکھوں میں لو سی جھلملاتی ہے
اک چراغ جادو کا زیرِ آب روشن ہے

کچھ عجب تضادوں میں زندگی گزرتی ہے
آنکھ میں اندھیرا ہے دل کتاب روشن ہے

گو دیئے بجھا ڈالے رات کی ہواؤں نے
جس کی خوشبوئیں چکیں وہ گلاب روشن ہے

(عمان، اُردن)

رعنا ناہید رعنا

○

بس ایک بار توجہ سے اس کو دیکھا تھا
پھر اس کے بعد ہر اک چہرہ اس کا چہرہ تھا

رفاقتوں کے بھرم کھل گئے تمازت میں
جو میرے ساتھ رہا، صرف میرا سایا تھا

اندھیرے شکوۂ بلب کیوں نہ ہوں کہ دُنیا نے
وہاں چراغ جلایا جہاں اُجالا تھا

شکستگی درو دیوار کی تھی اپنی جگہ
سکوں نواز بہت تھا کہ گھر تو اپنا تھا

جدائیوں کا بھی موسم ضرور آئے گا
نشاطِ قرب میں لیکن یہ کس نے سوچا تھا

میں چاہتی ہوں مرا عکس مجھ کو لوٹا دے
وہ آئینہ جسے اک بار میں نے دیکھا تھا

کلام مجھ سے کیا جب سکوتِ صحرا نے
کھُلا یہ مجھ پہ کہ میرا سکوت صحرا تھا

وفا کے نام پہ اک حرف آ گیا رعناؔ
چمن میں نکہت و گُل کا عجیب رشتہ تھا

صفدر صدیق رضی

○

آؤ ہم بے سرو سامان بہم ہو جائیں
آج سب چاک گریبان علم ہو جائیں

تُو خُدا ہو بھی چکا اور بہت ممکن ہے
تیری دہلیز کے پتھر بھی صنم ہو جائیں

تیرے زخموں کا یہ سرمایہ نہ چھن جائے کہیں
تُو جو مل جائے تو دُکھ درد نہ کم ہو جائیں

ہم سمندر سے تلاطم کے طلب گار نہیں
بس تری آنکھ کے ساحل کبھی نم ہو جائیں

کہو کچھ اور بھی لکھ جاؤں تمہارے حق میں
اس سے پہلے کہ مرے ہاتھ قلم ہو جائیں

شوکت مہدی

○

دستک پہ کوئی بھی نہ مجھے آن کر ملا
برسوں کے بعد بھی وہ مجھے بند در ملا

قسمت میں حادثات کی لکھی ہوئی تھی دھوپ
رستے میں سایہ دار نہ کوئی شجر ملا

مجبوریوں نے مجھکو بھی رکھا خوشی سے دور
چھٹی کے روز بھی نہ بچوں کو گھر ملا

بیوی سے روز روز کے جھگڑوں سے آخرش
لوگوں کو اُس کا، ریل کی پٹڑی پہ سر ملا

ہاتھوں میں خواہشات کے کاسے لیے ہوئے
مجھکو سکونِ دل سے تہی ہر بشر ملا

خدشات بھی نہ سچ سے مجھے باز رکھ سکے
جھوٹی گواہیوں کا نہ مجھ کو ہنر ملا

اُس کی عنایتوں سے جھکی شاخ شاخ کو
مہدی توقعات سے بڑھ کر ثمر ملا

○

نارسائی کی خلش نے آخرش بہکا دیا
مجھ کو میری خواہشوں کے قتل پر اُکسا دیا

چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کو کھلونا جان کر
جب بھی چاہا، دل کو بچے کی طرح بہلا دیا

ہجرتوں کی غیر رسمی گفتگو کے درمیان
پھول سے چہرے کو ٹھنڈی آہ نے کملا دیا

دشمنوں کی صف میں شامل ہو گئے احباب بھی
مجھ کو میرے نطق کی سچائیوں نے کیا دیا

اطلاعِ جرم کا مہدی کسے الزام دوں
میری اپنی بھول نے قاتل مجھے ٹھہرا دیا

عباس تابش

○

تیری آنکھوں سے اپنی طرف دیکھنا بھی اکارت گیا
یعنی پہچان کا یہ نیا سلسلہ بھی اکارت گیا

یوں حنائی لکیریں اڑیں اجنبی طائروں کی طرح
پر بریدہ سا رنگِ کفِ صدحنا بھی اکارت گیا

اب کھلا ہے کہ میرا ترے رنگ میں تیرے انداز میں
بولنا ہی نہیں، دیکھنا سوچنا بھی اکارت گیا

اک زلیخائی خواہش ہی اپنے سبب سے پشیماں نہ تھی
ساتویں در کے اندر مرا حوصلہ بھی اکارت گیا

سن رہا ہوں ابھی تک میں اپنی ہی آواز کی بازگشت
یعنی اس دشت میں زور سے بولنا بھی اکارت گیا

اس سمندر کی رت یوں مرے سر چڑھی بادلوں کی طرح
اس جزیرے کی آب و ہوا سے گلہ بھی اکارت گیا

کوئی تو تک نہ دی کالے پیڑوں کو اس آتشیں رقص نے
یعنی جنگل میں اس مور کا ناچنا بھی اکارت گیا

○

پیش آتے ہیں کچھ ایسے اپنی حیرانی سے ہم
آئینے کو دیکھتے ہیں خندہ پیشانی سے ہم

کس طرح کانوں تک آتی موجۂ آبِ فرات
داستانِ تشنگی سنتے نہیں پانی سے ہم

موج میں آجائیں تو پھر وقت کی میزان میں
اپنی گدڑی تولتے ہیں تاجِ سلطانی سے ہم

دل میں اک گوشہ ہمارے واسطے رکھ چھوڑنا
کیا خبر کب تنگ آجائیں جہانبانی سے ہم

اب ہمارے خون سے کھنچتے ہیں خود تیرے خطوط
اب تری تصویر بنواتے نہیں مانی سے ہم

رات کو جب یاد آئے تیری خوشبوئے قبا
تیرے قصے چھیڑتے ہیں رات کی رانی سے ہم

کاغذی پھولوں کی ہم میں ایک بھی عادت نہیں
کس طرح نشہ پائیں تابش بوئے سلطانی سے ہم

جان کاشمیری

○

سوچتا ہوں کیوں نہ کر دوں عاق ہی اولاد کو
وہ سنبھالے گی کہاں تک غربتِ اجداد کو

مجھ پہ کچھ ایسے اُٹھی ہیں زندگی کی اُنگلیاں
جس طرح سسرال والے دیکھیں گھر داماد کو

دیکھنا تھا ہم کو یہ دن بھی، خُدا کی شان ہے
چل دیا ہے چاند بھی، خورشید کی امداد کو

○

سیراب ہو کبھی، یہ خلافِ قیاس ہے
اپنی نظر کی پیاس تو صحرا کی پیاس ہے

اس میں ہے ساری حُسن و محبت سے دل کشی
یہ زیست ورنہ موت کا ہی اقتباس ہے

ماتم کناں ہے شدّتِ طوفاں کی موج موج
کشتی مری ڈبو کے سمندر اُداس ہے

عباس تابش

○

یُوں تو ہر شخص عبادت کے عمل سے نکلا
ایک میں تھا کہ نہ محرابِ غزل سے نکلا

آبشاروں کی طرح زور تو مارا میں نے
کوئی رستہ نہ مگر دشت و جبل سے نکلا

آنکھ سے اشک نکلنے پہ پشیماں نہ ہو
یہ تو پانی کا پرندہ تھا جو نخل سے نکلا

جل نہ جائے دھوپ میں زنجیر ہلانے والے
کوئی سایہ نہ مگر شیش محل سے نکلا

جب بھی وہ چاند مرے ذہن میں ڈوبا تابش
ایک سُورج مرے افلاکِ غزل سے نکلا

حبیب فخری

○

پرندہ ہوں کوئی خوشبو کا لیکن خوار و خستہ ہوں
ہوائیں پائے بستہ ہیں کہ خود ہی پرشکستہ ہوں

میں وہ بابِ تمنّا ہوں کہ اب تک بند ہوں خود پر
وہ شہرِ آرزو ہوں جس میں رہنے کو ترستا ہوں

وہ منزل ہوں جو کٹ کر رہ گئی ہے سارے رستوں سے
کسی کھڈ میں سسکنا جس کی قسمت ہے، وہ رستہ ہوں

وہ بستی ہوں جو ریزہ ریزہ صحراؤں میں بکھری ہے
وہ صحرا ہوں کہ چپہ چپہ قند یہ بھر میں بستا ہوں

نکلنا چاہتا ہوں جتنا قیدِ ذات سے فخری
میں اس دلدل کے اندر اور دھنستا اور دھنستا ہوں

○

چارہ گروں کی چارہ گری کچھ کام تو آئی، بارے
درد سفینہ جس سے شتابی پہنچا زیست کنارے

گاؤں کی گلیاں اس کے غم میں اب تک خاک بسر ہیں
جس آوارہ کو اک مدّت گزری شہر سدھارے

پار فصیل کے، غیر علاقے گئی وہ پتنگ تو کٹ کے
کس کو ڈھونڈ رہے ہیں بر جے، باڑے اور گلیارے

شام اک بانک چاند جو ڈوبا پھر نہ سحر تک اُبھرا
شب بھر چمکے، شب بھر جھمکے، کتنے بوڑھے تارے

راہِ وفا میں یوں تو جانیں جتنی بھی جائیں، کم ہے
کتنے سروں کے ایک اکیلے سر نے قرض اُتارے

افتخار قیصر

○

ہم سے اپنے گاؤں کی مٹی کے گھر چھینے گئے
جس طرح شہری پرندوں سے شجر چھینے گئے

تتلیوں نے کاغذی گل پر بسیرا کر لیا
اُڑتے پھرتے جگنوؤں کے بال و پر چھینے گئے

اس قدر بڑھنے لگے ہیں گھر سے گھر کے فاصلے
دوستوں سے شام کے پیدل سفر چھینے گئے

دھوپ یوں نکلی کہ سارا شہر اندھا ہو گیا
خون سے خوشبو اُگانے کے ہُنر چھینے گئے

آنکھ سے آنکھیں زبانوں سے زباں چھینی گئی
داستاں سے داستانوں کے شرر چھینے گئے

○

مری آنکھوں کو آنکھوں کا کنارا کون دے گا
سمندر کو سمندر میں سہارا کون دے گا

مرے چہرے کو چہرہ کب عنایت کر رہے ہو
تمھیں میرے سوا چہرہ تمھارا کون دے گا

مرے دریا نے اپنے ہی کنارے کاٹ کھائے
بپھرتے پانیوں کو اب سہارا کون دے گا

جسے تم بند آنکھوں سے بھی اپنے گھر میں دیکھو
سوائے غم، تمھیں ایسا ستارا کون دے گا

تسلیم فیروز

○

کور ظرف کی آنکھیں پیار میں نہیں ڈھلتیں
دوستو! سرابوں میں کشتیاں نہیں چلتیں

حسن اپنے ہاتھوں سے آگ ڈال دے جتنی
عشق کے فقیروں کی جھولیاں نہیں جلتیں

آنکھ میں نمی بھی ہے، اور لگن بھی ہے دل میں
پھر بھی آرزوؤں کی کھیتیاں نہیں پھلتیں

ہاتھ کے لگانے سے پتیاں جھلستی ہیں
دھوپ کی تمازت سے کس لیے نہیں جلتیں

اِک کرن ہی مل جائے آنکھ کو گوارا ہے
سر سے اب اندھیروں کی بدلیاں نہیں ٹلتیں

یونہی بیٹھ جاتی ہیں ناشتے کی میزوں پر
ہاتھ بھی نہیں دھوتیں، آنکھ بھی نہیں ملتیں

○

"وہ اجنبی تھا مگر آشنا سا لگتا تھا"
نیا لباس بھی پہنا ہوا سا لگتا تھا

تمام عمر کسی انتظار میں گذری
تمام عمر کوئی رتجگا سا لگتا ہے

یہی بہت ہے ہمیں دیکھ تو لیا اُس نے
دگرنہ دل کا دیا تو بجھا سا لگتا تھا

کبھی کبھی تو مری انتہاؤں کا منظر
مری تہوں سے مجھے جھانکتا سا لگتا تھا

ہمارے شہر کے حق میں لکھا ہوا بادل
سمندروں پہ برستا ہوا سا لگتا تھا

عجب طلسم تھا فیروز گنبدِ دل میں
دعا کا حرف بھی مجھے بددعا سا لگتا تھا

ناہید ظفر

○

کرن ہی جب نہ ملی، آفتاب کیا لیتے
ہم ایک سطر کی خاطر کتاب کیا لیتے

وہ ایک اور نئے زخم پر مُصر ہوتا
اسے بتا کے پرانا حساب کیا لیتے

دھنک کے رنگ، کرن، چوڑیاں، حنا، خوشبو
کسی کے واسطے اتنا عذاب کیا لیتے

اس ایک لمحے فقط چاند نے ہمیں دیکھا
بھلا حریف سے دادِ شباب کیا لیتے

ہماری زخم ہتھیلی میں باگ کیا تھمتی
یہ پا بریدہ مسافر، رکاب کیا لیتے

○

زمانہ ساز ہے، ایسی اساس رکھے گا
وہ گھر سے دُور مگر دل کے پاس رکھے گا

وہ داستان کسی اور کو سنائے گا
مرے لیے تو فقط اقتباس رکھے گا

مجھے تو زعم رہے گا کہ ہو گیا سیراب
کسی کے واسطے تھوڑی سی پیاس رکھے گا

اگر بہار کے موسم میں مجھ کو ڈس نہ سکا
تو بارشوں کے زمانے کی آس رکھے گا

یہ اور بات کہ تنہائیوں میں خوں روئے
بچھڑتے وقت تو قائم حواس رکھے گا

سید سجاد جدید

○

پسِ خیال ہے، پیشِ خیال آتا نہیں
دھنک دھنک ہے مگر کوئی چھب دکھاتا نہیں

نظر بھی آتا نہیں ہے کوئی وجود اُس کا
میں اُس کی قید میں ہوں اور رہائی پاتا نہیں

وہ آنگنوں میں اُترتا ہے ہر نئی رُت میں
مگر زمان و مکاں میں وہ گھر بناتا نہیں

وہ خواب خواب ہے پلکوں کی اوٹ میں بیٹھا
نکل کے آئے گا، اک وہم سا ہے، جاتا نہیں

وہ فاصلوں پہ ذرا بھی یقیں نہیں رکھتا
وہ آس پاس ہے لیکن قریب آتا نہیں

اُسے پکاروں تو کس نام سے پکاروں جدیدؔ
وہ حرف حرف میں ہے لفظ میں سماتا نہیں

○

دیکھ کر اُس کو رُکا ہو جیسے
چاند رہ بھول گیا ہو جیسے

میں نے اس طرح اُسے یاد کیا
وہ مجھے بھول گیا ہو جیسے

میرے دل میں تری سو شکلیں ہیں
آئینہ ٹوٹ گیا ہو جیسے

اتنا مانوس ہے اُس کا چہرہ
وہ مرا جسم رہا ہو جیسے

میں تو کچھ بھول رہا ہوں لیکن
وہ بھی کچھ سوچ رہا ہو جیسے

نصیر احمد

○

ڈوبتی سانسوں کی لَے پر کان دھرنا چاہیے
حد سے بڑھ جائے جو سناٹا تو ڈرنا چاہیے

روگ لگ جائے گا ورنہ روز و شب کے حُسن کو
چاند جب ڈوبے تو سُورج کو اُبھرنا چاہیے

تک رہی ہیں ایک مدت سے تری رہ، فصلِ گُل!
منتظر آنکھوں میں کوئی رنگ بھرنا چاہیے

جھُوٹ ہے جو کچھ بھی ہے بستی سے ویرانے تلک
رنج و راحت کی حدوں سے اب گزرنا چاہیے

جو بھی اہلِ فن ملا اُس کی قبا تھی تار تار
شہرِ بے توقیر! تجھ سے کوچ کرنا چاہیے

عامر رضوانی

○

یہ دیکھنا ہے کہ غم معتبر بھی ہے کہ نہیں
طلوعِ اشک نمودِ سحر بھی ہے کہ نہیں

نوازشاتِ ستم ہائے بے حساب کے بعد
مرے کریم! کرم معتبر بھی ہے کہ نہیں

سوادِ شام سے نورِ سحر کی منزل تک
سوائے درد کوئی ہم سفر بھی ہے کہ نہیں

میں ایک لمحۂ کیفِ وصال مانگ تو لوں
نہ جانے عمر مری اس قدر بھی ہے کہ نہیں

تجھے یقین نہ آئے تو میری آنکھ سے دیکھ
ترے جمال میں حُسنِ نظر بھی ہے کہ نہیں

سُلگ رہا ہوں میں جس کے فراق میں عامرؔ
خبر نہیں ہے کہ اس کو خبر بھی ہے کہ نہیں

حکایاتِ ایسپ — نظرِ ثانی اور تجدید کے بعد (۲)

محمد خالد اختر

بہروپیا کوا

ایک کوا چونے کی ایک ڈھیری میں جا اُترا جس سے اس کے پر و بال اور چونچ سفید ہو گئے۔ اس سے اسے بڑی خوشی ہوئی پھر پاس ہی اسے ہنس کے کچھ پر پڑے ہوئے نظر آئے۔ وہ بھی اس نے اپنے جسم پر لگا لئے اور یوں سج سجا کر اور اِترا کر چلتا ہوا ہنسوں کی ایک ٹولی میں جا پہنچا۔ ہنسوں نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا مگر اس نے انھیں بتایا کہ وہ ایک غیر ملکی ہنس ہے اور سات سمندر پار کر کے آیا ہے اسی وجہ سے اس کی وضع قطع اور بولی قدرے مختلف ہے۔ ہنسوں نے اس کی خوب آؤ بھگت کی۔ ایسے جہاں نورد ہنس کو اپنے درمیان پا کر وہ نہایت خوش ہوئے۔ کوا بڑا جگت باز اور باتونی تھا۔ وہ سادہ ہنسوں میں محفل جما کر خوب بڑیں ہانکتا اور اپنی سیاحتوں کے من گھڑت قصے سناتا۔ ہنس اس سے بڑے مرعوب ہوئے اور یہ سمجھ کر کہ وہ بڑھیا نسل کا اور ان سے زیادہ تہذیب یافتہ ہے، ہر بات میں اس کی نقل کرنے لگے۔ کوشش کرنے سے کیا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ چند ہی مہینوں میں اس نووارد کا رنگ ان پر چڑھ گیا اور وہ کوے کی چال چلنے لگے کچھ مدت کے بعد کوے کو اپنے گھر اور قرابت داروں کی یاد ستانے لگی۔ ایک صبح وہ ہنس کے پر جھاڑ جھوڑ کر اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ گیا اور ان کو بتایا کہ اس نے ہنسوں کو کیسے اُلّو بنایا۔

ادھر ہنسوں نے اصلی چال بھلا دی تھی۔ وہ اب تک کوے کی چال چلتے ہیں۔ اپنے رسم و رواج اور طور طریقوں کو دوسروں کی پیروی میں ترک نہیں کرنا چاہیئے، خواہ وہ بے ہودہ اور تکلیف دہ ہی کیوں نہ ہوں۔

شیر اور ہاتھی

جنگل کے بادشاہ شیر نے فرمان جاری کیا کہ ہاتھی ناپسندیدہ جانور ہے، وہ جنگل سے باہر چلا جائے۔ اعلان کے بعد لومڑی کے ہاتھ ہاتھی کو کہلا بھیجا کہ وہ جنگل چھوڑ دے لیکن ہاتھی نہ گیا۔

ایک روز شیر لاؤ لشکر کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ ہاتھی سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ ظاہری علیک سلیک کے بعد شیر نے کہا "آپ ابھی تک یہاں ہیں! کیا آپ کو معلوم نہیں میں نے آپ کو ملک بدر کیا ہوا ہے؟"

"کس بنا پر؟ میرا قصور کیا ہے؟" ہاتھی نے پوچھا۔

"دیکھو بھائی میں جنگل کا بادشاہ ہوں کسی کو شکار میں اپنا شریک بنانا مجھے گوارا نہیں" شیر نے وضاحت کی۔

"مگر مجھے شکار سے کیا تعلق۔ میں تو پھل پھول پر گزر اوقات کرتا ہوں۔"

شیر کو ہاتھی کی اس دلیل کا کوئی جواب بن نہ آیا تو کہنے لگا "دراصل تم ڈیل ڈول میں غیر ضروری حد تک بڑے ہو۔ اس جنگل میں کسی کو

اُسنا بڑا ہونے کا حق نہیں پہنچتا۔ دوسرے جانور اس بات کے شاکی ہیں۔"

"اُن کو میرے ڈیل ڈول پر کیا اعتراض ہے۔" ہاتھی نے پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں جانتا،" شیر نے کہا" لیکن جنگل میں ہر ایک کے لئے قانون کی پابندی لازمی ہے ــــ آپ چلے جائیں تو بہتر ہوگا۔"

"قانون کسی نے بنایا ہے؟"

"میں نے، میں بادشاہ ہوں۔"

"اچھا" ہاتھی نے کہا" میں سوچ کر بتاؤں گا۔ میں نے ابھی ہتھنی اور بچوں سے مشورہ کرنا ہے۔"

اپنے کچھار میں واپس آکر شیر نے اس مسئلے میں کچھ غور و خوض کیا۔ پھر ہاتھی کو باہر بھیجنے کی ایک ترکیب اسے سوجھ گئی۔ اس نے ہاتھی کو" تمغہ ہیبت" کا اعزاز مرحمت فرمایا اور اسے سراندیپ کے جنگل میں سفارت پر جانے کی پیشکش کی۔ ہاتھی نے اسے قبول کر لیا اور ہتھنی اور بچوں کو لے کر سراندیپ کا عازم ہوا۔

تمغہ اور سفارت ملنے سے بڑے بڑے سرکش رام ہو جاتے ہیں۔

حجام اور چیتا

ایک حجام ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں لوگوں کی حجامت کی خاطر جاتا تھا۔ راستے میں ایک جنگل میں سے گذرا تو دیکھا کہ ایک چیتا، بڑی مضطرب حالت میں ایک بڑے سے لوہے کے پنجرے میں چہل قدمی کر رہا ہے اور پنجرے کے ایک کونے میں ایک بکری کا نصف حصہ پڑا ہے (دراصل یہ پنجرہ سرکس والوں نے چیتے کے پکڑنے کے لئے وہاں رکھا تھا۔ اس میں ایک بکری باندھ دی تھی۔ اور کمانیوں والا خود بند ہو جانے والا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا کہ چیتا بکری کو کھانے کے لئے پنجرے کے اندر جست کرے تو ہلنے سے دروازہ بند ہو جائے)

حجام کو دیکھتے ہی چیتا لجاجت سے بولا" چچا میاں، مجھے اس قید سے رہائی دلاؤ تو ساری عمر تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیوں گا۔"

لیکن تم پنجرے کے اندر قید کیونکر ہوئے؟" حجام نے پوچھا۔

"یہ میں باہر آنے پر بتاؤں گا۔" چیتے نے کہا۔

"لیکن میں تمہیں پنجرے سے باہر کیوں نکالوں، تم مجھے کھا جاؤ گے۔"

"قسم لے لو" چیتے نے کہا" جو اس کا خیال بھی میرے دل میں آیا ہو۔ اتنا ناشکرا کون ہو سکتا ہے۔"

حجام متامل تھا مگر چیتے نے اسے اس کی جوانی کا واسطہ دیا اور حجام جو پچاس پچپن کے پیٹے میں تھا اس بات پر کھل اٹھا اور چیتے کے بارے میں مشفقانہ خیالات اپنے دل میں لایا۔ چیتے نے دیکھ کر حجام نرم پڑ رہا ہے تو اپنی آہ و زاری کو زیادہ پُر رقت کیا۔

"دیکھو۔ چچا۔ ابھی میری مسیں بھی نہیں بھیگیں۔ میرے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ ابا میاں تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ایک ماں ہے۔ وہ کھانا رکھے میری راہ دیکھتی ہوگی۔"

چیتے نے اس قسم کی دردناک باتیں کیں تو حجام کا دل بھر آیا۔ اس نے زور لگا کر پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ چیتا فوراً جست کر کے باہر نکل آیا۔

"میں تمہیں کھاؤں گا۔" چیتے نے غرا کر حجام سے کہا۔

"کیا تم کو اپنے قول کا مطلقاً پاس نہیں۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ باہر آنے پر تم مجھے نہیں کھاؤ گے۔"

"وہ وعدہ میں نے پنجرے کے اندر سے کیا تھا۔ اب میں پنجرے سے باہر ہوں۔"

"مجھ کو اپنی راہ جانے دو، ورنہ خواہ مخواہ نہ کھاؤ۔ میں نے آگے گاؤں میں پانچ حجامتیں کرنی ہیں۔"

"میں تمہیں کھاؤں گا ضرور" چیتا بولا۔

حجام جان گیا کہ اب چیتا اسے جیتا نہ چھوڑے گا۔ اس نے اوسان قائم رکھتے ہوئے جان بچانے کے لئے آخری حربہ کیا "چیتے جی مجھے شوق سے کھاؤ، لگ کھانے جانے سے پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم سا تُرت سیانا، چاق و چوبند حیوان اس پنجرے میں بند کیونکر ہو گیا۔ عملی طور پر کرکے دکھاؤ تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

چیتے نے کہا "تمہاری چالاکی میں خوب سمجھتا ہوں۔ میں دودھ پیتا بچہ نہیں۔ پنجرے کے اندر میں ہرگز دوبارہ نہیں جاؤں گا تم پنجرے کے اندر داخل ہو جاؤ۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کیسے اندر بند ہوا۔"

حجام نے چیتے کے تیور دیکھے تو پنجرے کے اندر جست کی۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی کمانیوں والا دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا۔ اب حجام اندر تھا اور چیتا باہر۔

"اب باہر آجاؤ" چیتے نے کہا۔

"میں باہر کیسے آؤں۔ تم دروازہ باہر سے کھولو۔"

چیتے نے بہتیرا زور مارا مگر دروازہ اس سے نہ کھلا۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ چیتے دروازے نہیں کھول سکتے اور حجام کو یہ بات معلوم تھی۔

"تم نے اندر جا کر مجھ سے دھوکا کیا ہے" چیتے نے شکایت کی۔

"مجھے باہر نکالو" حجام پکارا۔

چیتا کچھ دیر تو وہاں منڈلاتا رہا۔ پھر بددل سا ہو کر وہاں سے ٹل گیا۔ اس کے جانے کے بعد سرکس والے اپنی بیل گاڑی لے کر وہاں آپہنچے۔ وہ پنجرے میں چیتے کی بجائے ایک آدمی کو پاکر بڑے حیران ہوتے ــــ ایک ایسے آدمی کو جس نے نصف بکری کچی چبا ڈالی تھی۔ کچھ سوچ کر انھوں نے حجام سمیت پنجرے کو بیل گاڑی میں رکھا اور شہر لے گئے۔

کسی پر احسان کرنے سے پہلے یہ سوچ لو کہ وہ بدلے میں تم پر کیا احسان کرے گا۔

سونے کا انڈا دینے والی مرغی

ایک محکمہ پرسٹ کے اہلکار کے پاس ایک مرغی تھی جو ہر صبح ایک سونے کا انڈا دیا کرتی تھی۔ بہت سے لوگوں کے پاس ایسی مرغیاں ہوتی ہیں۔

اس آدمی نے سوچا کہ اس مرغی کے پیٹ کے اندر خدا جانے کتنے ڈھیر سارے سونے کے انڈے ہوں گے۔ کیوں نہ اس کا پیٹ چاک کرکے ایک ہی دم سارے سونے کے انڈے حاصل کرلئے جائیں۔ چنانچہ اس نے مرغی کو پکڑ کر اس کے گلے پر چھری پھیر دی۔ اس کا پیٹ چیرا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بڑا پشیمان ہوا کہ زیادہ کے لالچ میں روز کے سونے کے انڈے سے بھی ہاتھ دھوئے۔ مرغی پر بھی بڑا غصہ آیا اور اسے بھون کر تکا کباب بنائے۔ کباب کھانے کے بعد وہ اپنے پڑوسی کے پاس گیا۔ پڑوسی افیون اور حشیش کا سوداگر تھا۔ پہلے شخص نے دوسرے شخص سے کہا کہ اگر اس کے پاس کوئی سونے کے انڈے دینے والی فالتو مرغی ہو تو اسے دے دے۔ دوسرے شخص کے پاس چھ ایسی مرغیاں

تھیں۔ اس نے ان میں سے ایک اسے دے دی۔ پھر اسے ہر صبح سونے کا انڈا ملنے لگا اور وہ بہت خوش و خرم ہو گیا۔

خلاصہ یہ کہ بیشتر لوگوں پر اللہ کا فضل ہوتا ہے اور ان کے پاس سونے کے انڈے دینے والی مرغیاں ہوتی ہیں۔ گو وہ یہ بات کسی کو نہیں بتاتے۔

بھیڑیں اور بارہ سنگھے

بھیڑوں کا ایک ریوڑ ایک کسان کے کھیت میں رہتا تھا۔ اس کھیت کے گرد اونچی باڑ تھی۔ کھیت میں خوشبودار ہری گھاس اور بوٹیوں کی بہتات تھی جسے کھا کر بھیڑیں خوب موٹی تازی، اور بانکی سجیلی ہو گئی تھیں۔ ان کی پشم چکنی اور شاندار تھی۔ باڑ سے باہر جھاڑیوں سے پٹے ٹیلے تھے جن میں بارہ سنگھے رہتے تھے۔ بارہ سنگھوں نے دیکھا کہ انھیں تو کھانے کے لئے خشک جھاڑیوں کے علاوہ کچھ نہیں ملتا اور بھیڑیں موج اڑا رہی ہیں۔ سوچا کوئی ترکیب ایسی ہونی چاہیئے کہ باڑ کے اندر کے کھیت میں چرنے اور منہ مارنے کا موقع ہاتھ آ جائے۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ ایک پیر سال بارہ سنگھے نے انھیں ایک ترکیب سجھائی جس سے وہ اپنے مقصد میں کامران ہو سکتے تھے ـــــ ایک بارہ سنگھا کھیت کی باڑ سے کچھ فاصلے پر ایک ٹیلے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا اور بھیڑیئے کی آواز میں رونے لگا 'ہو اہو، ہو ہو'۔ بھیڑوں نے جو بھیڑیئے کی آواز سنی تو سہم کر اکٹھی ہو گئیں اور تھر تھر کانپنے لگیں۔ اب بارہ سنگھوں کا مکھیا اپنے چند ساتھیوں کو لئے باڑ کے چکردار دروازے پر بھیڑوں سے بات چیت کرنے کے لئے آیا۔ اس نے کہا۔

"بہنو، بھائیو، بزرگو، تم یہ آواز جو سن رہے ہو، بھیڑیئے کی ہے۔ اور وہ تمہیں کھانا چاہتا ہے۔ ہم اس بھیڑیئے کو جانتے ہیں۔ نہایت بدطینت حیوان ہے لیکن اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہم تمہاری حفاظت کریں گے اور اس نابکار کو اپنے سینگوں سے مار کر بھگا دیں گے ـــــ آخر تم اور ہم میں کیا فرق ہے۔ ایک ہی ہماری برادری، ایک ہی تہذیب، ایک ہی مذہب۔ صرف ہمارے نوکدار پھاڑنے والے سینگ ہیں اور تمہارے نہیں"۔

بھیڑیں ڈری ہوئی تو تھیں۔ بارہ سنگھے کے مکھیا کی تقریر سن کر اور اپنے خطرے احساس کر کے اور زیادہ ڈر گئیں۔ بھیڑیئے سے بچنے کے لئے وہ ان جیالے اور دوست بارہ سنگھوں کو کھیت کے پہرے دار اور محافظ بنانے پر تیار تھیں۔ یہی بارہ سنگھے چاہتے تھے۔ وہ چکردار دروازے میں سے کھیت میں جوق در جوق گھس آئے اور بھیڑیئے سے بھیڑوں کی حفاظت کرنے لگے۔ بھیڑوں کو یہ خیال نہ تھا کہ وہ اتنے سارے ہوں گے۔ وہ کھیت میں ہر جگہ چاہا رہے کبھی کبھار چاندنی راتوں میں دور سے بھیڑیئے کے رونے کی آواز سنائی دیتی جس سے بھیڑیں سمجھتیں کہ بھیڑیا ابھی تک موجود ہے۔ بارہ سنگھے بھی انھیں بھیڑیئے کی سفاکی اور بھیڑ دشمنی سے ڈراتے رہتے اور کہتے کہ وہ نہ ہوں تو بھیڑیا باڑ پھلانگ کر ان کو کھا جائے۔ "تم کو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیئے"۔ وہ کہتے "ہم تمہاری حفاظت کر رہے ہیں"۔

بارہ سنگھے مزے سے کھیت میں چرتے پھرتے اور منہ مارتے۔ جلد ہی وہ خوب فربہ اور چربیلے ہو گئے پھر رفتہ رفتہ کھیت کے ان ٹکڑوں کو جہاں گھاس اور روئیدگی زیادہ گھنی تھی انھوں نے اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ اب بھیڑوں کو ان ٹکڑوں میں چرنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ بھیڑوں پر حکم چلاتے۔ "ادھر مت جاؤ، یہ نہ کرو۔ زیادہ نہ اچھلو کودو"۔ وہ کھیت میں یوں گھومتے پھرتے جیسے کھیت انہیں کا ہو۔ کھیت میں گھاس کی وہ زرخیزی اور فراوانی نہ رہی۔ بھیڑیں خوراک کی کمی اور محافظوں کی فوجداری کے ڈر سے دبلی اور کمزور ہونے لگیں ـــــ پھر ایک دن بارہ سنگھے نے سینگ مار مار کر ایک معزز بھیڑ کو ہلاک کر دیا جو بھٹک کر ایک مخصوص ٹکڑے میں آ نکلی تھی۔ اس قسم کے واقعات ہر دوسرے تیسرے روز ہونے لگے۔

آخر بھیڑیں بے حد دق ہوگئیں گو بھیڑیئے کی آواز اب بھی مہینے میں ایک آدھ بار سنائی دے جاتی تھی مگر بھیڑوں نے دیکھا کہ یہ حفاظت ان کو بڑی مہنگی پڑ رہی ہے اور ان کا کھیت ان کا اپنا نہیں رہا معتبرین نے ایک کانفرنس کی اور طے کیا کہ بارہ سنگھوں کو کہا جائے کہ بھیڑوں کو ان کی حفاظت کی ضرورت نہیں رہی اور وہ بخوشی اپنے ٹیلوں کو واپس چلے جائیں۔

چنانچہ ایک سردارنی بھیڑ بارہ سنگھوں کے مکھی سے ملی اور اس سے کہا "ہماری حفاظت کرنے کا شکریہ۔ اب ہم حفاظت کرانا نہیں چاہتے آپ کھیت سے چلے جائیں جو ہمارا ہے۔"

"کیا بات کرتی ہو بڑھیا!" مکھی بارہ سنگھا بولا "ہم تمہاری حفاظت سے کبھی دست بردار نہیں ہوں گے۔ ہم ہرگز نہیں چاہتے کہ بھیڑیا تم سب کو کھا جائے ــــ اس کی آواز نہیں سنی تم نے کیا؟"

"ہم بھیڑیئے کا لقمہ بننے سے نہیں ڈرتیں"۔ بھیڑ نے کہا۔

"پگلی ہوئی ہے۔ ہم تمہاری حفاظت ضرور کریں گے۔ یہ ہمارا فرض ہے۔" سردار بارہ سنگھا گرجا ــــ تھوڑے توقف سے اس نے کہا "تم حفاظت کرانا نہیں چاہتیں تو اس کھیت کو چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤ۔"

"مگر یہ کھیت ہمارا ہے۔ ہم نے تمہیں صرف حفاظت کرنے کے لئے بلایا تھا جس کی اب ہم کو ضرورت نہیں۔"

"اب یہ ہمارا کھیت ہے۔ ہا ہا!" سردار بارہ سنگھا ہنسا۔

اس طرح بارہ سنگھے بھیڑوں کا کھیت چرتے اور ان کی حفاظت کرتے رہے۔

خلاصہ یہ کہ حفاظت کرنے میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔

آدمی اور شکاری کتا

کہتے ہیں ایک آدمی کے پاس ایک شکاری کتا تھا جیسا کہ بہت سے لوگوں کے پاس ہوتا ہے۔ اس کتے نے کئی برس اپنے مالک کی ہوشیاری سے خدمت کی اور ہزاروں خرگوش، ہرن اور بارہ سنگھے شکار کئے۔ آخر وہ بوڑھا اور ناتوان ہوگیا۔ اس کے بدن میں وہ پہلے سی پھرتی اور چستی نہ رہی (آدمیوں کا بھی یہی حال ہوجاتا ہے) ایک دن بارہ سنگھے کا شکار کرتے ہوئے یہ کتا سب کتوں سے پہلے شکار پر پہنچا اور بارہ سنگھے کی ٹانگ اپنے منہ میں لے لی لیکن اس کی بوڑھی ڈاڑھیں بوسیدہ ہوچکی تھیں اور ٹانگ کو مضبوطی سے نہ دبوچ سکا۔ بارہ سنگھے نے اپنی ٹانگ چھڑالی اور ہوا ہوگیا۔ اس پر کتے کا مالک طیش میں آکر اسے لاٹھی سے پیٹنے لگا۔ کتا کچھ دیر تو خوف سے دبک کر پٹتا رہا پھر بولا "دیکھ مالک مجھ غریب کو نہ مار۔ میں تیرا دیرینہ نمک حلال خادم ہوں۔ اتنا عرصہ تیری خدمت دن رات کی۔ مجھ میں طاقت رہتی تو اب بھی جان لڑاتا۔ اب میں عمر رسیدہ ہوچکا ہوں۔ اگر اب تیرے کام کا نہیں رہا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تو مجھ کو پیٹے۔ میری پہلی خدمات کا کچھ تو لحاظ کر۔"

"وہ تو تو ٹھیک کہتا ہے،" مالک نے اقرار کیا "لیکن اب کی بات کر۔ اب تیرا کیا فائدہ" اور اس ظالم آدمی نے گھبرا کر خدمتگار کتے کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔

کسی کو اپنی پہلی خدمات یاد نہ دلاؤ۔ بیشتر لوگوں کو یہ یاد دہانی ناگوار گذرتی ہے۔

شکار کی بانٹ

ایک دن ترائی کے جنگل کا بادشاہ اپنے چیلے چانٹوں گرگ اور لومڑی کو ساتھ لے کر شکار کو گیا۔ شیر نے تین جانور شکار کر ڈالے۔

ایک نیل گائے، ایک ہرن اور ایک خرگوش۔ جب طعام کا وقت آیا تو شیر نے گرگ سے کہا "گرگ یار ذرا اس شکار کے حصے کر دو"۔ یہ شیر بعض وقت اپنے وزیروں سے بے تکلفی سے بات کر لیتا تھا

گرگ نے عرض کی کہ حضرت حصے کیے کرائے موجود ہیں۔ نیل گائے جو سب سے بڑا جانور ہے، وہ حضرت عالم پناہ کا حصہ ہے۔ ہرن جو اس سے چھوٹا اور ہلکا ہے سو وہ میرا حصہ ہے کیونکہ آپ کے بعد منصب میں پہلے میں آتا ہوں ـــــ اور خرگوش جو سب سے چھوٹا ہے اس پر لومڑی کا حق ہے"۔

شیر یہ سن کر بڑا بگڑا۔ ایک دھول گرگ کو ایسی جمائی کہ وہ تمام ہو گیا۔

اس کے بعد شیر نے لومڑی سے فرمایا کہ "گرگ تو گستاخ اور احمق تھا تو شکار کے حصے کر"۔

لومڑی بولی "ظل الٰہی حصے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ حضور کے خاصے کا وقت ہو چلا ہے اور تھکے ہوئے بھی ہیں۔ سردست نیل گائے کو شرف تناول بخش کر اس سایہ دار درخت کے تلے استراحت فرمائیں۔ جب آنکھ کھلے اس وقت ہرن کا ناشتہ کریں کس واسطے کہ بعد بیداری بہت بھوک لگتی ہے اور ہرن کا گوشت لذیذ اور زود ہضم ہوتا ہے اس کے بعد خرگوش کو بطور نقل ڈاڑھ میں رکھ کر سیر تماشے کی طرف متوجہ ہو جائیں"۔

شیر یہ سن کر بہت خوش ہوا۔

"یہ حصے کرنا تم کو کس نے سکھایا؟" شیر نے لومڑی سے دریافت کیا۔

"قصور معاف" لومڑی نے عرض کی "گرگ نے جو اب اس جہان میں نہیں ہے"۔

"خیر" شیر بولا "یہ تو سب میرے حصے ہوئے۔ تم کیا کھاؤ گی، بھوکی رہو گی"؟

لومڑی نے جواب دیا "حضور بھوکی کیوں رہوں گی۔ آپ کے کھانے کے بعد دستر خوان پر جو بچ رہے گا میرے لئے بہت ہے۔ میں ڈاکٹر کی ہدایت پر ویسے ہی بہت کم کھاتی ہوں"۔

"ہونہہ!" شیر بولا اور نیل گائے پر پل پڑا۔

بادشاہوں سے حصے کرنا حماقت ہے۔ وہ اسے پسند نہیں کرتے۔

شیر اور جمہوریت

ترائی کے جنگل کے جانوروں نے فیصلہ کیا کہ وہاں بادشاہت کی بجائے جمہوریت ہونی چاہیئے۔ انھوں نے بندروں سے اس نظام کی بہت ساری خوبیاں سن رکھی تھیں۔ ان کا ایک وفد کچھار میں شیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سے درخواست کی کہ وہ جنگل میں جمہوریت کے نفاذ کا اعلان کرے اور خود دستوری بادشاہ بن جائے۔ وفد نے شیر کو جمہوریت کے فوائد بتائے۔ شیر نے ان کی باتیں غور اور دلچسپی سے سنیں۔

"جمہوریت کیا ہوتی ہے؟" وفد کی گذارشات سننے کے بعد شیر نے پوچھا۔

"یہ جانوروں کی حکومت ہوتی ہے جسے جانور سب جانوروں کے فائدے کے لئے چلاتے ہیں"۔ بندر نے جواب دیا۔ بندر بڑا سیانا، قانونی جانور تھا اور اس نے امریکی کنسٹی ٹیوشن الف سے یے تک پڑھی تھی۔

"اور یہ دستوری بادشاہ کیا ہوتا ہے؟ اصل اور جمہوری بادشاہ میں کیا فرق ہے؟" شیر نے مزید سوال کیا۔

"جمہوری بادشاہ" بندر نے وضاحت کی "عوام کی رائے کا پابند ہوتا ہے وہ اپنی طرف سے کوئی فرمان جاری کر سکتا ہے نہ کوئی قانون

بنا سکتا ہے۔ عوام پارلیمنٹ میں ایک قانون یا ایکٹ وضع کرتے ہیں جمہوری بادشاہ اس ایکٹ پر دستخط کر کے اسے منظوری دیتا ہے۔"
"خوب۔ تو تم کیا چاہتے ہو۔ اب میں کیا کروں؟" شیر نے پوچھا۔
"آپ سب سے پہلے جنگل میں جمہوریت کے نفاذ کا اعلان کریں۔ اس کے بعد بالغ رائے دہی کی بنا پر الیکشن کی تاریخ مقرر فرمائیں"۔ بندر کو اپنی کتابیں اچھی طرح یاد تھیں۔
شیر نے تھوڑی دیر سوچ کر کہا "یہ تو میں ہرگز نہیں کروں گا۔ جمہوری بادشاہ ہو کر مجھے کیا حاصل ہوگا۔ آپ تشریف لے جائیں"۔
وفد کے ارکان اپنا سا منہ لے کر کچھار سے باہر آ گئے۔
خلاصہ یہ کہ جس کام کے کرنے سے آدمی کا اپنا نقصان ہوتا ہو وہ اسے کسی کے کہنے پر ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔

بھیڑیا اور میمنا

ایک گرم دن ایک بھیڑیا اور ایک میمنا ایک ہی وقت ایک پہاڑی ندی پر اپنی پیاس بجھانے کے لئے آئے۔ بھیڑیا پہاڑی پر میمنے سے اوپر کھڑا تھا مگر جھگڑا مول لینے کی خاطر اس نے میمنے سے کہا "ابے میمنے تم پانی کو گدلا اور گندہ کر رہے ہو کہ میں اسے پی نہیں سکتا"۔
میمنے نے جواب دیا "یہ کیسے ہو سکتا ہے پانی تو تمہاری طرف سے میری طرف آ رہا ہے میں تمہارے پانی کو کیونکر گندہ کر رہا ہوں"۔
"خیر اس کو چھوڑو"۔ بات یہ ہے کہ تم نے بعض بے ہودہ حرکتیں کی ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ایک سال ہوا تم بیٹھ پیچھے میری برائیاں کرتے رہے ہو"
میمنے نے کہا "یہ تو ناممکن ہے کیونکہ سال پہلے تو میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا"۔
اس پر بھیڑیئے کا غصہ اور زیادہ بھڑکا اور وہ چیخ کر بولا "اگر وہ تم نہیں تھے تو تمہارا باپ ہوگا جس نے بیٹھ پیچھے مجھے گالیاں دیں"۔
اور بھیڑیا میمنے کو دبوچنے کے لئے لپکا مگر غصے کی دیوانگی میں اس کا پاؤں اٹک پڑا اور وہ ندی میں جا گرا۔
جب وہ ندی میں ڈبکیاں کھاتا ہوا ہاتھ پاؤں مارتا اس جگہ سے گذرا جہاں میمنا کھڑا تھا تو میمنے نے ایک معصوم سی مسکراہٹ چہرے پر لا کر اسے "ہیلو" کہا۔
دشمن سے ہمیشہ خوش اخلاقی برتو۔

قانونی بندر

ایک ہی وضع قطع کی دو بلیاں ایک گھر میں رہتی تھیں۔ ایک دن دونوں کو ایک پنیر کا ٹکڑا ہاتھ لگا۔ وہ دونوں معقولیت پسند، ایماندار قسم کی بلیاں تھیں اور وہ چاہتی تھیں کہ کوئی انہیں پنیر کے دو برابر برابر حصے کر دے تاکہ کسی بلی کو اپنے حق سے کم یا زیادہ پنیر نہ ملے۔ پڑوس میں ایک مہاجن کے کوٹھے پر ایک بندر رہتا تھا جس کی قانون دانی کی بڑی دھوم تھی اور جس کو رومن لا رحفظ تھا۔ وہ پنیر کو بندر کے پاس لے گئیں اور اس سے درخواست کی کہ اس کے دو بالکل برابر حصے بنا کر ان میں بانٹ دے۔
"لاؤ پنیر مجھے دو۔ میں ایک منٹ میں اس کے دو بالکل برابر حصے کئے دیتا ہوں فکر نہ کرو۔ بالکل انصاف ہوگا"۔ بندر جھٹ انصاف کرنے پر تیار ہو گیا کیونکہ قانون پڑھا ہوا تھا۔
بندر مہاجن کی کوٹھری سے ایک ترازو لے آیا۔ اور دونوں کونوں پر بیٹھی ہوئی بلیوں کے بیچ میں ایک چوکی پر آن بیٹھا۔ اس نے

پنیر کو توڑ کر اس کے دو ٹکڑے کئے۔ ایک کو ترازو کے ایک پلڑے میں ڈالا دوسرے کو دوسرے پلڑے میں۔
بلیوں نے دیکھا کہ بندر کے دائیں طرف کا پلڑا جھک گیا ہے۔
"دیکھتی ہو بلیو؟" بندر نے بتایا۔ "دائیں پلڑے کے ٹکڑے کا وزن کچھ زیادہ ہے اس لئے اس کا وزن تھوڑا کم کرنا پڑے گا تاکہ دونو پلڑے برابر برابر آجائیں کوئی بات نہیں ابھی کئے دیتا ہوں۔"
بلیوں کو وزن وغیرہ کا کیا پتہ مگر وہ بندر کی عقل اور سوجھ بوجھ کی قائل ہو گئیں۔
بندر نے دونو پلڑوں کا وزن برابر کرنے کے لئے دائیں پلڑے کے پنیر کا کچھ حصہ توڑا اور منہ میں ڈال لیا لیکن اب یہ ہوا کہ بایاں پلڑا جھک گیا سو بندر نے وزن برابر کرنے کے لئے اس پلڑے سے پنیر کا بھورا توڑا اور کھا گیا۔
بلیاں ابھی تک کافی متاثر تھیں۔
اب جھکاؤ دائیں پلڑے کا ہوا اور بندر نے اس پلڑے کے پنیر سے ایک بھورا توڑا اور منہ میں ڈالا۔
اسی طرح کبھی ایک کبھی دوسرے جھکاؤ والے پلڑے میں سے کھاتے کھاتے بندر سارا پنیر ختم کر گیا۔
پنیر ختم ہونے کے بعد وہ خالی ترازو تولے بیٹھا رہا جس کے دونو پلڑے برابر تھے۔
"ہمارا پنیر کا ٹکڑا کدھر ہے"، بلیوں نے پریشان ہو کے پوچھا۔
"میرا کام انصاف کرنا تھا"، بندر بولا۔ "پنیر سے میرا کیا واسطہ، دیکھو ترازو کے دونو پلڑے برابر ہیں۔ ایک دوسرے سے زیادہ جھکا ہوا نہیں۔"
خلاصہ یہ کہ انصاف کرانے سے متنازعہ شے غائب ہو جاتی ہے اور صرف انصاف کرنے والے کا بھلا ہوتا ہے۔

شکرا اور کبوتر

ایک چھوٹا سا گورا چٹا کبوتر اپنے اہل خاندان اور ہمجولیوں کے ساتھ ایک مزار کے گنبد پر رہتا تھا۔ ایک شکرے کا فضا میں اُڑتے اُڑتے وہاں سے گزر ہوا تو اس کبوتر کو دیکھ کر اس کا جی مچلا اور منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے اسے لقمہ بنانے کا قصد کیا (شکرے کا دل اس خاص کبوتر پر ہی کیوں آیا، یہ شکرا ہی بتا سکتا ہے)، شکرا روزانہ ہی گنبد کے ایک دو چکر کاٹتا اور اس کبوتر پر جھپٹنے کی سوچتا مگر وہ طبعاً کاہل اور ناستقل مزاج تھا۔ اپنے آپ سے روز کہتا "آج میں اسے ضرور کھاؤں گا" پھر کہتا "چلو چھوڑو کل سہی۔ یہ بھلا کہاں جائے گا۔" اسی طرح کرتے کرتے دو مہینے گذر گئے اور چھوٹا کبوتر (اب اتنا چھوٹا نہیں رہا تھا اور کافی سڈول اور رسیلا ہو چکا تھا)، اس طرح مزے سے سینہ پھلائے غٹرغوں غٹرغوں کرتا رہا۔ ایک دن وہ اپنے ہمجولیوں سے الگ مزار کے حوض پر دانہ چگتا تھا کہ شکرا اوپر سے گذرا۔ شکرا پہلے تو اس پر جھپٹنے کو ہوا پھر پلٹا کہ چلو اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ آج میرا پیٹ بھرا ہے کل اسے اُچک لوں گا۔ پھر خدا جانے کیا خیال آیا۔ ارادہ بدلا۔ اور زقند بھر کر کبوتر کو جا دبوچا جو بڑا حیران ہوا۔ اسے شکرے کے ارادوں کا علم نہیں تھا۔ اپنی اقامت گاہ پر پہنچ کر شکرے نے کبوتر کو ذبح کر مار ڈالا اور راسے سالم کھا لیا۔ (حالانکہ اس نے اس روز الم غلم بہت کچھ کھایا ہوا تھا اور اس کے پیٹ میں قطعاً گنجائش نہ تھی) کھانے کو تو شکرے نے کبوتر کھا لیا مگر پھر بدہضمی کی وجہ سے پیٹ میں شدید درد اُٹھا۔ وہ تڑپنے لگا پچھتایا کہ اس پر کل ہی جھپٹتا۔ چند لمحوں میں اس کی حالت غیر ہو گئی۔ دیدے چڑھ گئے اور ٹھنڈا ہو گیا۔
نتیجہ یہ کہ جو کام کل پر ٹالا جا سکتا ہو اسے آج مطلقاً نہ کرو۔

"پدرم سلطان بُود"

مسز منور شاہ

"محترمہ منور شاہ لاہور کالج فار ویمن میں انگریزی ادب کی استاد ہیں۔ انہوں نے اپنے والد محترم پر یہ مضمون لکھا۔ جس کی نوعیت سراسر ذاتی ہے۔ مگر جس والہیت سے انہوں نے اپنے والدین اور دیگر اقرباء کا ذکر کیا ہے اس میں کتنے ہی قارئین کو محسوس ہوگا کہ ان کے اپنے جذبات کو زبان مل رہی ہے۔ ادارے نے مصنفہ سے عرض کیا تھا کہ عنوان جس مفہوم میں اردو میں مستعمل ہے، وہ کچھ اچھا نہیں ہے، مگر وہ بضد رہیں کہ انہوں نے "پدرم سلطان بود" کے الفاظ ان کے لغوی معنوں میں استعمال کئے ہیں کہ ان کے والد مزاجاً اور عملاً واقعی سلطان تھے۔" ادارہ

بروز جمعہ بتاریخ ۲۰ اپریل ۱۹۸۲ء، اچھے صاحب اپنی مرضی کے مطابق نہائے دھوئے امی جان کی پرانی سفید چادروں میں لپٹے جانے کو تیار تھے۔ میرا دل ان سے خفا تھا کیونکہ میری محبت کا حق ان کی جانب سے ادا نہ ہوا تھا۔ میں وہ چاہنے والی تھی جس کا مقدر سوزِ غم ہائے نہانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک عمر مشقِ ضبط میں صرف کرنے کے بعد اب اثر دیکھنا چاہتی تھی۔ خود میرا رواں رواں اپنی محبت کا قرض دار تھا۔ اچھے صاحب کے معشوق میرے رقیب نہیں تھے۔ دراصل میں نے سب کو اس درجہ کمتر جانا کہ مدِمقابل ہونا پسند نہ کیا۔ ان کی صف میں شمار تو ممکن نہ تھا، میری خودداری نے روبرو ہونے میں بھی حقارت محسوس کی۔ غرور یہ تھا کہ بہرحال رشتوں کے خالی خانے پدرِ مہربان کی ذات سے پُر ہیں۔ وہ کسی کو کچھ بھی جانیں ہیں تو ہمارے ہی۔ انتظار پھر بھی اپنی باری کا تھا۔ دل کو یقین تھا کہ آخری فیصلہ اپنے حق میں ہی ہونا ہے۔ جب وقت تمام ہوا اور فسانۂ حیات انجام کو پہونچا تو معاملہ میرے ساتھ استوار کیا گیا۔ لطف و کرم کی وہ بارش والد صاحب کی جانب سے ہوئی کہ میرے دل کی سوکھی کھیتی لہلہا اٹھی۔ وعدہ وفا کیا اور یہ چال چل گئے کہ عمر ہی کو پائیداری نہیں تو میں کیا کروں؟ اب موت ہی بتائے کہ میں کیا کروں؟ یکجائی کیوں کر ہو؟ عمرِ دگر کہاں سے لاؤں؟ اچھے صاحب سکون سے لیٹے ہیں، چہرہ چمک رہا ہے اور میں اندھیرے میں کھڑی ہوں، یکلخت چراغ گل ہوگئے، شعلۂ شوق دھواں ہوگیا اور میری زندگی کا آتشکدہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ نہ پیام ہیں نہ کلام ہے، نہ نامے رہے نہ نامہ بر۔ سب کچھ غبار بن کر ہوا میں تحلیل ہوگیا۔ میرا زعم کہ وقت میرے لئے رُک جائے گا، کفر ثابت ہوا۔ میں نے کچھ نہ کہا، وہ منصب جس کی میں اپنی جانب سے دعویدار تھی اس کے فرائض کی فہرست تو جوں کی توں پڑی ہے۔ میں نے اپنی طرف سے تو ابھی عہدے کے اختیارات بھی نہ لیئے تھے کارروائی شروع ہونا تو دور کی بات تھی۔

چٹیل میدان، ویران ریگستان اور میں درمیان میں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتی ہوں۔ کون ہے جو اچھے صاحب کی دستوں کا حامل ہو؟ محبت کا سمندر جو ان کے دل میں موجزن تھا اس کی ایک لہر ہی کسی جانب سے آجائے۔ ذہن کی وہ قوت جو ان کا

حصہ تھی کسی طرح تو سہارا ہو سکے! ان کا وجود سب کے لئے سکون بخش تھا مگر میرے لئے تو وہ ڈھال تھے۔ تقدیر کیسی ہی ضرب کاری کیوں نہ لگائے وہ ضرب کو روک لیتے تھے۔ اب کون سامنے آئیگا؟ کون پشت پناہ ہوگا؟ زندگی ہم پر حاوی ہے وہ زندگی پر حاوی تھے۔ زماں و مکاں کی حدود سے نکل کر بھی صاحبِ اختیار وہ ہیں اور ہم باوجود زندگی کے مجبور و بے بس ہیں۔ عظمتِ انسانی کا انحصار جن صفات پر ہے وہ اچھے صاحب میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ باذوق، باسلیقہ، ذی فہم، ذی شعور، ہمدرد اور نیک ان کا جیسا مجھ کو دوسرا نظر نہ آیا۔ مکمل بااختیار اور قطعی خودکفیل۔ حسِ جمالیات اور حسِ مزاح نے ان کے وجود کو بڑی دلفریبی عطا کی تھی۔ خوشی ان کی فطرت کا سب سے نمایاں عنصر تھی۔ وہ قہقہہ زن پیدا ہوئے ہوں گے، مسکراتے ہوئے میں نے ان کو جاتے دیکھا۔ فکر اور غم سے تو نجات ممکن نہیں مگر افسردگی ان پر مسلط کبھی نہ ہو سکی۔ زندگی اور زندہ دلی بڑھاپے میں ایسی تھی کہ جوان ان کے آگے گرد تھے۔ دنیا کے تمام معاملات میں دلچسپی لیتے۔ بین الاقوامی مسائل کو سمجھتے اور واقعات کا ذہنی اور جذباتی جائزہ لیتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ پل پل کی خبر رکھتے۔ اچانک وقوع پذیر ہونے والے حالات سے فوراً مجھ کو آگاہ کرتے۔ اب سوچتی ہوں کہ اہم خبریں سب ان کے ٹیلی فون سے مجھ کو ملتی تھیں۔ سنجے گاندھی کے حادثے کی خبر مجھ کو انہوں نے دی۔ نرگس کا انتقال ہوا تو اچھے صاحب کا فون آیا کہ ہندوستان کی ایک باعزت اور قابلِ قدر ایکٹریس گزر گئی۔ سادات پر گولی چلنا اور ان کا ختم ہونا مجھ کو ان کے فون ہی سے معلوم ہوا۔ ہاکی ہو کہ کرکٹ باقاعدہ کمنٹری سنتے اور تفصیل اپنی ڈائری میں نوٹ کرتے۔ دنیا کے کسی ملک میں انتخابات ہوں کوئی کامیاب ہو اچھے صاحب کی دلچسپی برقرار رہتی۔ سیاسی شعور حیران کُن حد تک تھا۔ میرے ساتھ نظریاتی اختلاف کی وجہ سے اکثر بحث رہتی۔ وہ پالیسی کے قائل تھے، میں اعتقادات کے معاملے میں مصلحت کو گناہ سمجھتی تھی۔ غرضیکہ بات سیاست، فلسفے اور مذہب پر میرے ساتھ آخر دم تک جاری رہی۔ مرنے کو تیار اور باتیں کر رہے ہیں شعر و ادب کی، جائزہ لے رہے ہیں انسان کی فطرت کا اور رشتوں کی اہمیت کا۔ نقاہت کا یہ عالم ہے کہ آنکھ نہیں کھول سکتے اور یاد کر رہے ہیں حسینوں کو اور ان کی جامہ زیبی کو۔ آخری علالت کے دوران ایسی تھی کہ عقل کے ہوش اڑا دیئے۔ چار دن ہسپتال میں رہے، ایسی پیاری پیاری باتیں کیں کہ دل پر نقش ہوگئیں۔ ۲۸ مارچ کو ہم ان کو ہسپتال لائے۔ قریب قریب بے ہوش تھے مگر ڈائری میں چند بول اس دن بھی لکھ ہی لئے۔ کمرہ اور کمرے کی ہر چیز باترتیب اور صاف ستھری ہو اس کا دھیان علالت میں بھی رکھا۔ اچھے صاحب کے توسط سے دنیا مجھ پر روشن تھی۔ ان کے جانے سے میرے ذہن و قلب پر ایک پردہ سا پڑ گیا، دھند سی چھا گئی۔

محبت کو انہوں نے مذہب کا درجہ دیا تھا۔ اسی طرح جس طرح شاعر اور فلسفی دیتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ صاحبِ فن اظہارِ جذبِ محبت کے لئے تصور اور خیال کے لطیف سانچے بنا کر ان میں نئے پیکر ڈھالتا ہے، نئی زمین نئے آسمان تراشتا ہے۔ اچھے صاحب نے جذبِ عشق کو دنیا سے آب و گِل سے مربوط رکھا، اعمال، افعال اور اقوال میں سجایا اور مرئی طور پر مجسّم کر دکھایا۔ وہ ایسے فنکار تھے جس کا اپنا وجود ہی اس کا فن تھا۔ کمال حسن پرستی اور حق پرستی کا یہ تھا کہ حسن و حق لاکھ پردوں میں کیوں نہ چھپا ہو ان کی نظر اس کو عریاں دیکھتی تھی۔ خوئے آدم کو نہ صرف سمجھتے تھے بلکہ اس کے تقاضوں کے قائل تھے۔ ان کا فلسفۂ حیات فطرتِ انسانی کے تابع تھا۔ میری زندگی کے سب سے تاریک دور میں اچھے صاحب چراغِ راہ ثابت ہوئے۔ میرے فیصلوں کا احترام کر کے انہوں نے مجھ کو وہ قوت بخشی جس کے زور پر میں نے دنیا اور دنیا والوں کو سرنگوں کر دیا۔ یہ اعتماد کہ دنیا کی کوئی طاقت سچ کے مقابل نہیں آ سکتی، مجھ کو اپنے مرحوم باپ سے ملا۔ میرے انتخاب کو انہوں نے سونے کا رتبہ دیا۔ ان کی قبولیت نے مجھے سیتاؤں اور ساوتریوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ بلاشبہ وہ بادشاہ تھے اور میں بادشاہ زادی، وہ کیا مرے کہ میں فقیر ہوگئی۔

فقیری کی معراج کو والد صاحب خوب سمجھتے تھے مگر فقیری کبھی اختیار نہیں کی۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا جوگ بھی ان کو بھایا نہیں تھا۔ اللہ جانے وہ مجھے کس روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ میرے بارے میں ان کو یقین تھا کہ دنیا کا ہر رنگ مجھ پر چوکھا آئے گا اور ان کو افسوس تھا کہ میں نے بے رنگی سے زندگی ضائع کر دی۔ اچھے صاحب نے خود اولادِ آدم پر جو دنیا داری کا حق ہے اس کو کما حقہٗ ادا کیا۔ کام کاج، لین دین، روپیہ پیسہ سارے شعبے ان کی گرفت میں تھے۔ علم و فضل، شعر و سخن آخر دم تک ان کا شغل تھا۔ آخر دنوں میں کبیرؔ کا دوہا،

پتہ ٹوٹا ڈال سے لے گئی پون اُڑائے اب کے بچھڑے کب ملیں دور پڑیں ہیں جائے

بڑی حسرت سے پڑھا کرتے۔ اکثر مجھ سے فرمائش کرتے کہ کبیرؔ کے کلام میں سے کچھ سناؤں۔ مرتے مرتے میرؔ کو دہراتے رہے جو بات کی اس میں فلسفیانہ سوچ کا بھرم قائم رہا۔ امی جان کے انتقال کے بعد سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے، نہ کھانا نہ پینا مگر آنکھ کا آپریشن کروایا۔ اتنی سختی اس سبب سے جھیلی کہ زندگی پر بوجھ نہ بنے۔ غرض کہ ہم سب ان کے دست نگر تھے اور وہ ہر معاملے میں قطعی خود کفیل۔ جسم ختم ہو گیا مگر اپنا تمام کام نہایت خوش اسلوبی سے کرتے۔ خطوط لکھتے، ڈائری کا کبھی ناغہ نہ ہوتا، وغیرہ۔ تحریریں، یادداشتیں، ذکر اذکار، بڑی مضمون آفرینی کے ساتھ قلم بند کرتے۔ فلاں سیر و تفریح کی غرض سے کہیں جاتے تو خط اچھے صاحب ان کو اسی حساب سے لکھ کر روانہ کرتے کہ جب وہ اپنی منزل پر پہنچتی تو خط ان کا منتظر ہوتا۔ ایک بار یوں ہوا کہ فلاں نے سفر کی تیاری کرتے ہوئے تفریحاً اچھے صاحب سے پوچھا کہ خط آپ نے مجھے لکھا کہ نہیں۔ ہنس کر بولے وہ تو پوسٹ بھی ہو گیا۔ سوائے دادی مرحومہ کے کہ وہ ماں تھیں، انہوں نے پیدا کیا اور پرورش کیا، باقی سب کی خدمت اچھے صاحب نے کی۔ شاید اسی سبب سے اسی سال کی عمر میں بھی کوئی تکلیف ہوتی تو ماں کا نام لیتے۔ قرینہ، سلیقہ اور خوش انتظامی ان کو مرحوم دلوی صاحب سے ملا۔ سادگی اور صفائی ان کا اپنا طرۂ امتیاز تھی۔

آخیر عمر میں اس قدر نحیف ہو گئے تھے کہ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے، والا حال تھا، مگر کوتاہی کسی قسم کی ان کی جانب سے نہ ہوئی۔ امی جان مفلوج ہو کر سات سال جئیں۔ اچھے صاحب نے کسی کو خبر نہ ہونے دی کہ گھر میں کوئی ہاتھ پاؤں سے لاچار ہے۔ بیمار ہوئے، بخار آیا، حال سے بے حال ہو گئے مگر مجال ہے امی جان کی خدمت میں شمہ برابر بھی فرق پڑا ہو۔ جو کچھ انہوں نے امی جان کے لئے کیا میرے قلم میں اتنا زور نہیں کہ لکھ سکے۔ ان کی ضعیف ہڈیوں کا دم خم دیکھئے کہ انہوں نے کر کے دکھایا۔ دراصل ہر قوت کا مخزن ان کی اپنی ہستی تھی۔ وہ باہر سے کچھ نہ لیتے تھے، جو درکار ہوا اپنے خونِ جگر سے پیدا کیا۔ محبت، مسرت، قوت، آگہی سارے سوتے ان کے اندر سے پھوٹتے تھے۔ گرد و پیش کا مطالعہ کرتے، پھول پتے چرند پرند دیکھتے اور سکون حاصل کرتے۔ باغ میں گلہری کو بڑے شوق سے مصروف دیکھ کر ایک بار مجھ سے کہا "دیکھو دنیا کا ہر جاندار اپنے بچوں کے سکھ کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ ننھا سا جانور ہے مگر گھونسلے میں بچوں کے لئے روئی کا نرم گدا بنایا ہے ایسی پھرتی سے خدمت کرتا رہتا ہے"۔ ان مشاہدوں سے انسان کی فطرت کا جائزہ لیتے اور خوش ہوتے۔ انسان کی حیثیت سے جو کچھ انہوں نے کیا اس پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے اس نتیجے پر پہنچے کہ کوئی بہت بڑی بات نہیں۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں فطری تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ والد صاحب کی سوچ اتنی پیاری تھی کہ دماغ ان کا مکمل پُر سکون رہا اور رنگِ بہار آخری دم تک ان کے ارد گرد قائم رہا۔ گلہائے لطافت ہزار خوبیوں سے کھلتے رہے اور ان کے دل کا بلبل چہکتا رہا۔

کم عمری میں تعلیم ختم کی۔ انٹرکیمن میں ملازمت شروع کی۔ کمائی اس شان سے کی کہ ماں کو مالا مال کر دیا۔ دادی کا قیام ہمارے آبائی گاؤں ٹھمن میں تھا۔ پہلی جنگِ عظیم خاتمے پر تھی۔ اچھے صاحب فوج میں بھرتی ہو کر محاذ پر تھے۔ ۱۰۰ روپیہ مہینہ منی آرڈر والدہ کو بھیجتے۔ عزیز و اقارب جو ارد گرد رہتے تھے اتنی بڑی رقم کو ناقابلِ یقین جانتے۔ دادی نے ایک بار ہنس کر مجھے بتایا کہ رشتے والوں نے پوسٹ مین سے کہا کہ منی آرڈر جب آئے تو ہم کو دکھاؤ کیونکہ اتنی بڑی رقم کا سُن کر یقین کرنا ممکن نہیں! دادا فطرتاً گرہست

نہ تھے۔ سیر و سیاحت کا شوق رکھتے تھے، علاوہ اخبار بینی و کتب بینی سفر کو بھی ذریعۂ علم سمجھتے۔ چنانچہ دادا کو دو مرتبہ حج اچھے صاحب نے کروایا، اس شان سے کہ رمضان شروع ہونے سے پہلے ان کے قیام کا انتظام مدینے میں ہوتا۔ وہ وہاں روزے رکھتے، عید کرتے اور پھر فریضۂ حج ادا ہوتا۔ بہنوں کی شادیاں والد صاحب کی کمائی سے ہوئیں۔ چھوٹی بہن کو جہیز کثیر اور زیور طلائی، پاؤ سیر کے حساب سے دیا گیا۔ خاندان کے غریب لوگوں کی باقاعدہ پنشن مقرر کی۔ مکان بنوایا تو بطرز محلسرا جس کے ایک مکمل حصے میں اپنے چچا کو از راہ محبت و نوازش بسایا۔ لائق طالب علم دیکھا تو اس کی تعلیم کا خرچہ برداشت کیا، مستحق دیکھا تو لڑکیوں کی شادی بیاہ کے سلسلے میں مدد فرمائی۔ گرتے ہوئے مکان مرمت کروائے، بیماروں کو علاج کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ تحفے تحائف دیئے، خاطریں کیں، خلوص بانٹا۔ غرضیکہ جس کے قریب ہوئے اس کو سنوار دیا۔ اپنی شادی کا سارا اہتمام خود کیا، جو کچھ بیان اس سلسلے میں اِدھر اُدھر سے میرے پیے پڑا ہے اس سے جو تصویر آنکھوں کے سامنے آتی ہے وہ ایسی حرارت اور شرارت سے بھرپور ہے جیسے بھولا ناتھ بھگوان شنکر جوش و خروش سے برات لے کر چڑھا دا سجا کر پاربتی جی کو بیاہنے گئے تھے۔ دنیا دنگ رہ گئی تھی۔ پاربتی کی ماں ڈر گئی تھیں۔ اچھے صاحب نے اس خروش سے اپنی ازدواجی زندگی کی ابتدا کی کہ متعلقین سہم گئے۔ امی جان کو مدارج دیئے، سنگھاسن پر بٹھایا، خود پوجا اور دوسروں سے پجوایا۔ آرتیاں اتریں، چڑھاوے چڑھے، ایمان تو ایمان بیچارا کفر بھی منہ تکتا رہ گیا۔

اپنی بڑی پھوپھی کی زبانی کبھی میں نے والد صاحب کے لڑکپن اور جوانی کی باتیں سنیں جو آج تک دل نشین ہیں۔ جو کچھ مجھے بتایا گیا اس سے میں نے یہ سمجھا کہ افتادِ طبع عاشقانہ تھی مگر انداز المیہ نہ تھا۔ ان کے لئے محبوب مرے اور جدا ہوئے کہ ایک عمران کے ماتم کو کم ہوتی، شائد مرے کی تنگی کے باعث اظہارِ غم کو ملتوی کیا۔ علاوہ ازیں بڑی چابکدستی سے معشوق گری کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ایک پیوند خاک ہوا تو انتخاب کسی اور بے جان پیکر کا کیا، روحِ محبت پھونکی اور باقاعدہ پرستش کے قابل بنا دیا۔ بموجب میری پھوپھی مرحومہ کے تو دا ہل دل میں شمار ہوتی تھیں۔ پہلی محبت والد صاحب نے اپنے بڑے بھائی کی زوجہ اور بچے سے کی۔ بچہ جس کا نام اقبال تھا ان کو اس طرح عزیز تھا کہ آیا اور اتا کی مانند دن رات رکھتے۔ بھاوج علیل تھیں اور اچھے صاحب نے بچے کی پرورش اپنے ذمے لی، قلیل مدت میں بیٹا اور ماں دونوں خاک ہو گئے۔ مرحومہ بھاوج کے بھائی جو رشتے میں والد صاحب کے ماموں لگتے تھے۔ ان کے بارے میں خود مجھ کو بتایا کہ ان کی صورت سے نفرت کرتا ہوں۔ بیان کیا کہ جب جنازہ اس جواں مرگ کا تیار ہوا تو اچانک بارش شروع ہو گئی۔ والد صاحب کے پاس برساتی ساختۂ انگلستان نہایت قیمتی تھی۔ وہ انہوں نے عزیزہ کے جسدِ خاکی پر ڈال دی کہ کفن نہ بھیگے۔ مرحومہ کے بھائی نے دیکھا تو ایک طرف والد صاحب کو لے گئے اور آہستہ سے کہا "یہ برساتی بعد دفن مجھ کو دے دینا، نہایت خوب ہے، مجھے پسند آ گئی ہے۔" برساتی تو دے دی مگر اس دن کے بعد ان کی صورت دیکھنا پسند نہ کی۔

پھوپھی اماں نے والد صاحب کی منگیتروں اور ان سے اچھے صاحب کی وابستگی کا بھی ذکر کیا۔ ہمارے گھر میں ایک نہایت اعلیٰ درجے کا ہارمونیم اپنی قسمت کو خاموش روتا تھا۔ راز بعد موت کے مجھ پہ کھلا کہ یہ ان کی منگیتر کے لئے خریدا گیا تھا جن کے متعلق خبر تھی کہ خوش گلو ہیں اور موسیقی سے شوق رکھتی ہیں، ضمناً عرض ہے کہ خاندان ہمارا سادات اور عقیدہ وہابی۔ کہاں کا گانا کہاں کا بجانا، مگر والد صاحب مرضیٔ محبوب کے آگے ایمان و عقیدہ، روائت و نظریہ سب کو یک قلم موقوف کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ امی جان کی فراخدلی کہ ہارمونیم برسوں بڑی احتیاط سے گھر میں رکھا رہا۔ ایک عمر گذر گئی، پاکستان بنا، حرماں نصیب اِدھر اُدھر ہوئے۔ بیچارا ہارمونیم بھی ہمارے گھر آنے کے منتقل ہونے کے سلسلے میں خرد برد ہو گیا۔ پہلے ساکت تھا اب کیسی فغاں کرتا ہو گا۔

میں نے جو محبتیں دیکھیں ان میں قابلِ ذکر ماموں صاحب، ماموں جان، رؤف بھیا، چچا صاحب، ابراہیم چچا اور حسینہ پھوپھی ہیں،

BIG GOHN ، GOHN اور LITTLE GOHN امی جان کے بھائیوں کے نام بہ لحاظ عمر رکھے تھے۔ یہ نام ڈائری میں جب ان کا ذکر کچھ پوشیدہ طور پر کرنا ہو استعمال کرتے۔ بڑے ماموں BIG GOHN عجیب و غریب و لفریب شخصیت کے حامل تھے اور اچھے صاحب کی محبت کا مرکز تھے۔ چھوٹے ماموں جان LITTLE GOHN بھی والد صاحب کو بہت پیارے تھے۔ ماموں جان بھی بچوں کی طرح اچھے صاحب سے حسب مرضی گستاخ ہو جاتے، مگر بہنوئی جو چاہتا ان کو ستاتا تو ہنس کر برداشت کرتے۔ بڑے ماموں صاحب نے بھی اچھے صاحب سے بے حد محبت کی، بڑی قدر و منزلت دی اور تا عمر شکر گزار رہے۔ کانپور کا ذکر ہے کہ میں شدید دل برداشتہ امی جان کی تیز مزاجی کا اچھے صاحب سے شکوہ کر رہی تھی۔ اچھے صاحب نے از راہ محبت مجھ کو بتایا کہ جب نکاح ان کا امی جان سے ہو چکا، ماموں صاحب دولہا بنے ہوئے بہنوئی کو اٹھا کر ایک طرف لے گئے اور گزارش کی کہ میاں ابرار میری بہن جو میں تم کو دے رہا ہوں احد درجہ حسین اور سلیقہ شعار ہے۔ قابلیت میں کوئی لڑکی مشکل سے اس کی برابری کر سکے مگر بدمزاجی میں بھی اپنا ثانی دنیا کے پردے پر نہیں رکھتی، خدا کے لئے نباہ دینا۔ اچھے صاحب نے ماموں صاحب سے وعدہ کیا کہ کبھی اس ذیل سے آپ کچھ نہ سنیں گے۔ اچھے صاحب نے تو اپنے عقد کے وقت کیا ہوا وعدہ نبھایا مگر جبر ہم پہ بھی تھا کہ مکمل خاموشی سے تابع رہو۔ میں کہتی تھی اچھے صاحب کو کوئی سمجھائے کہ ہمارا نکاح امی جان سے نہیں ہوا۔ ہم تو ان سے پیدا ہوئے ہیں اور مزاج شاہانہ کا آتش فشاں ہمارے اندر بھی سلگ رہا ہے۔

حاصل زندگی فلاور اور راحت جان دادی تھیں۔ فلاور اچھے صاحب کی آنے والی نسلوں کے واحد امین ہونے کے ناطے غائت درجہ عزیز اور بہ کمال حد قیمتی تھے۔ والد صاحب کے ہندو دوستوں نے کنور صاحب نام دیا تھا۔ ہم سب گواہ ہیں کہ پرورش فلاور کی شاہزادوں کی طرح ہوئی اور کبھی کسی قسم کی کوئی حد ان کی ناز برداری کے لئے مقرر نہ کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اچھے صاحب نے فلاور کو کبھی اپنے وجود سے دیگر نہ دیکھا۔ عطا و خطا جو فلاور کی ہو وہ گویا خود ان کی جانب سے ہوتی تھی۔ مرتے دم تک فلاور اور ان کے بال بچوں پہ فدا رہے اور خوش رہے۔ فلاور کی لیاقت سے مطمئن تھے اور ان کے فعل و عمل کو احسن جانتے تھے۔ اس کے باوجود اپنی اولاد میں سے سب سے زیادہ محبت چھوٹی صاحب سے تھی۔ ایک بار خود مجھ سے کہا کہ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھ کو چھوٹی صاحب سے فلاور سے بھی زیادہ محبت تھی۔ تھی اس سبب سے کہ والدہ صاحبہ کا حکم تھا کہ بیٹوں سے محبت نہ کرو، والدہ صاحبہ قبلہ اول تھیں، باقی سب معبد اور معبود ان پہ سے صدقے تھے۔ بہر حال جبراً جو بھی ہو بات یہاں آکر ختم ہوتی کہ چھوٹی صاحب والد صاحب کا اپنا بچہ تھیں۔ باقی امی جان کے ساتھ مشترک تھے، مرتے دم جو چھوٹی صاحب کے لئے لکھ گئے وہ میرے بیان کی تصدیق کے لئے ضرورت سے زیادہ ہے۔ دنیا میں واحد شخص جس میں کوئی بات اچھے صاحب کو بری نظر نہ آئی وہ چھوٹی صاحب تھیں۔ ان کی ہر ادا اچھے صاحب کے دل کو بھاتی تھی۔ یہ نکتہ میں نے یوں سمجھا کہ میں اور چھوٹی صاحب قطعی ساتھ پلے بڑھے۔ ہر موقع پہ یکساں حالات سے دوچار ہوتے۔ اچھی بری جو ہوئی شامل ہوئی مگر اچھے صاحب کی نگاہ میں ہم دونوں کا مقام کبھی ایک نہ ہوا۔ جو موہنی چھوٹی صاحب میں باپ کے لئے تھی وہ کسی میں نہ تھی۔ مجھے وہ قابل جانتے تھے مجھ پہ فخر کرتے تھے۔ مگر میرا درجہ بلحاظ دلبری چھوٹی صاحب کے برابر نہ تھا۔ عمر آخر ہوئی تو ساری اولاد سے بڑھ کر میرے قریب ہو گئے۔

بڑی بی کے ساتھ جو تعلق والد صاحب کو تھا وہ راز سربستہ ہے۔ بی بی ان کی پہلی اولاد تھیں حسین، طرحدار، راج ہٹ اور تریا ہٹ ایسی کہ سلطنتیں تہ و بالا ہو جائیں ان کی ضد کے سامنے مگر وہ نہ بلتیں۔ امی جان اپنے تمام زعم کے باوجود بی بی کو نہ جھکا سکیں۔ میں نے امی جان کو بڑی بے چارگی سے بی بی کے آگے شکست کھاتے دیکھا۔ ہماری والدہ بیٹیوں کو مارنے پیٹنے میں چنگیز خانی انداز

رکھتی تھیں۔ اگر ایک گھنٹے بھی وہ مشقِ ستم جاری رکھتیں تو بی بی ایک گھنٹے بغیر جنبش بغیر چوں و چرا جس جگہ ہوتیں منجمد ہو جاتیں۔ اچی جان کے ہاتھ شل ہو جاتے پسینے چھوٹ جاتے، تھک ہار کر بیٹھ جاتیں اور بی بی مجسم شوکت اسی طرح قائم رہتیں۔ اچھے صاحب سا نکتہ داں اور کسی بات سے ناواقف ہو، کسی فطرت سے انجان ہو، ناممکن۔ انہوں نے بی بی کے بارے میں کیا سوچا، کیا سمجھا، کیا جانا میں نہیں جانتی، کوئی نہیں جانتا۔ بی بی کی گہرائی کے آگے سمندر اتھلے ہیں۔ اچھے صاحب بھی ہار مان گئے۔ مرنے سے چند دن قبل ہم بہنوں کے لئے بیحد مختصر بیان لکھے، بی بی کا نام لکھا خط کھینچا اور صرف جگہ چھوڑ دی۔

برادرِ خورد سید محمد نسیم عرف مُنّے میاں نے پونے دو سال کی عمر میں بچوں کی دِق میں مبتلا ہو کر بمقام رانی کھیت وفات پائی۔ اچھے صاحب نے پاکستان آنے تک مُنّے کی قبر کی تصویر اپنی میز پر رکھی۔ ماں بھول گئی ہم بہنیں کئی سال روئے، پھر غم آیا گیا ہو گیا مگر اچھے صاحب نہ بھولے۔ میں جب تک ہندوستان میں رہی ان کے کاغذات میں اکثر رسیدیں منی آرڈر وصول پانے کی رانی کھیت قبرستان کے مجاور کے نام دیکھیں۔ پاکستان آنے کے بعد تصویر نہ نکالی گئی، شاید اس سبب سے کہ خاکِ فرزند سرحد پار رہ گئی اور اب تصویر وجہ تسلی نہ ہو سکتی تھی۔

راقم حقیر پُر تقصیر، شکست خوردہ والد بزرگوار کے ساتھ اپنے رشتے کے بارے میں کیا کہے! دنیائے آب و گِل میں سوائے عشق کچھ نہیں۔ ذوقِ طلب، ذوقِ جمال، عقل و فہم لاکھ شکلیں بنائے روح جذبِ محبت ہی سے پڑتی ہے۔ مگر روح کو پیکر درکار ہے، میری بدقسمتی کہ میرے حصے میں علاوہ روحِ رواں کچھ نہ آیا، کوئی صورت نہیں، کوئی سراپا نہیں، کوئی قد نہیں، کوئی قامت نہیں جس کو میں اپنا کہہ سکوں۔ دراصل قسمت میری یوں ترتیب دی گئی کہ میرے حصے میں کوئی جائز حیثیت نہ آئی۔ ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ جو قدم دشتِ امکاں میں پڑتا ہے ناجائز ہے۔ جو منزل صحرائے ہستی میں سر ہوتی ہے حرام ہے۔ وہ مقام جو میرا ہے وہ جذبہ جو دل کی گہرائی سے پھوٹتا ہے، وہ محبت جو لازماً میری جانب رُخ کرتی ہے یکسر غیر قانونی ہے۔ عدالت خواہ کوئی ہو حق میرا کسی تعلق پر ثابت نہیں ہو سکتا۔ عزیب سے سب کچھ چھین کر ہم اس کی مقام انسانیت اور عزتِ نفس سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔ حق پرست کو دار پر چڑھا دیتے ہیں۔ جو ذاتی مفاد کے کفر کا پول کھول دے اس کو معاشرے کے تمام مفادات سے محروم کر دیتے ہیں۔ میں نے زبان کھولی تو سارے در مجھ پر بند ہو گئے۔ بہرکیف کوشش شرط تھی۔ میں نے بغرضِ حق پرستی بت بنائے، بتوں نے بندگی قبول کرنے سے انکار کیا۔ میں نے بتکدے ہی پھونک ڈالے، بظاہر سارے ناطے توڑ دیئے۔ خانۂ دل میں سجے ہوئے صنم تو ٹھہرے متاعِ حیات مگر بے خبر۔ غضب یہ ہوا کہ اچھے صاحب کے ساتھ آخر عمر میں عین چوراہے پر بھانڈا پھوٹ گیا۔ کاش وہ اتنا کھل کر مجھے نہ چاہتے۔ میں تو وہ مغرور تھی کہ کبھی ان کی طرف نہ ہوتی۔ مگر وہ تانتا بندھا پیام کا، سلام کا، قاصدوں کا، خطوط کا کہ میں بوکھلا گئی۔ محبت کی ایسی بوچھار ہوئی کہ مجھے سر اٹھانے کی مہلت نہ ملی۔ اچھے صاحب نے کرم و نوازش میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور میں نے جواب میں کچھ نہ کیا!

جب میری باری آئی تو میدان چھوڑ گئے! اب میں خط لکھتی ہوں اور مرقدِ پُر انوار پر رکھ آتی ہوں۔ عاجز آ کر ایک خط میں نے اس مضمون کا لکھا کہ جواب آپ کی جانب سے نہیں آتا، مجھے صدمہ اور مایوسی کمال ہوتی ہے۔ سہ پہر کو آنکھ لگی تو ملازمہ کی آواز کان میں آئی کہ ڈاک ہے۔ میں نے تصور میں سربمہر لفافے دیکھے۔ مگر جب ہاتھ بڑھا کر خط لیا تو کھلا کاغذ اچھے صاحب کا تھا۔ صاف تحریر، واضح انداز، مخصوص القاب اور دعائیں۔ آگے پڑھنے کو ذہن پر زور ڈالا تو آنکھ کھل گئی۔ چار جون ۸۲ء کو عجب اتفاق ہوا۔ صبح صبح میں نے دخترِ عزیزہ زینب سے کہا "میں روتی ہوں کہ اب اچھے صاحب کا خط کبھی نہیں آئے گا" وہ معصوم مجھے تسلی دیتی رہی اور آنسو پونچھتی رہی۔ میں اٹھ کر کام کاج میں لگ گئی۔ باورچی خانے میں مدت سے ایک ڈبہ پڑا تھا جس میں انڈے کے چھلکے رکھے تھے۔ میں نے سوچا چھلکے مہینوں پرانے ہوئے، ان کا کیمیائی اثر زائل ہو چکا ہوگا۔ مناسب ہے کہ پھینک دیئے جائیں۔ ڈبہ خالی کیا

تو نیچے کچھ کاغذات ملے۔ ایک تحریر میرے نام والد صاحب کی تھی۔ تاریخ ۸۱-۶-۴ میرے رونگٹے حیرت سے کھڑے ہو گئے۔ آج ایک سال بعد خط عین اسی تاریخ کو میں نے دوبارہ وصول پایا۔ سچ ہے طالب کو کیا نہیں ملتا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے

رام بھجو تو رام ملے گا   صبح نہیں تو شام ملے گا

بہرحال ملے گا ضرور۔ خط والد صاحب کا حسب ذیل ہے۔

۸۱-۶-۴ از لاہور

منی صاحب، تم دونوں کو بہت بہت پیار اور دعائیں۔ دور ضرور ہو مگر یقین کرو کہ دل میں ہمہ وقت موجود ہو۔ دعا ہے کہ تم دونوں بعافیت اپنی زندگی گزارو۔ بس یہ دو سکے یہی مدعائے زندگی ہے۔ جس طرح تمہاری ماں اپنی پھلواری کو سدا بہار ہی میں چھوڑ کر رخصت ہوئیں۔ مجھے بھی خدا یہ وقت نصیب فرمائے۔ منور میاں کی ترقی ہوئی ہے۔ اب وہ اپنی فرم میں جنرل مینجر ہو گئے ہیں۔ میں نے مبارکباد دی تھی۔ رات کو مٹھائی لے کر آئے تھے۔ اس میں سے تمہارا اور اپنی زینب کا حصہ روانہ کر رہا ہوں خدا کرے پسند آئے۔ ستار کو فوراً واپس کرنا، ڈیوٹی پہ جانا ہے۔ رسید کرایہ کل روانہ کر دوں گا۔ بالٹی بھیج رہا ہوں۔

دعاگو، اچھے صاحب

ان کے انتقال کے بعد پہلی بار زینب کو اکیلے چھوڑ کر باہر جانے لگی تو اچانک دراز سے ایک خط ان کا برآمد ہوا۔ جن سطور پہ نظر پڑی وہ حسب ذیل تھیں۔

I AM GRIENED TO NOTE THAT ZEINAB IS LEFT ALONE IN THE HOME ON HOLIDAYS WHEN YOU ARE AWAY TO THE COLLEGE-KINDLY MAKE SOME OTHER AREANGEMENT-

یہ وہ دراز تھی جس کو ہزار بار کھنگال چکی تھی کہ کوئی تحریر والد صاحب کی ہو تو جان سے لگا کر رکھ لوں۔ اللہ اللہ مرنے کے بعد تعلق کا اتنا خیال تو زندگی میں کتنا ہوگا! گو کہ اچھے صاحب کے وجود کی شمع میرے دل میں جل رہی ہے مگر جدائی کی تاریکی نے دنیا اندھیری کر دی ہے۔ بسبب گریہ آنکھ دھندلا گئی ہے اور نظر کچھ نہیں آتا۔

ہمارے جد امجد سید نظیر حسین نے اپنے منجھلے بیٹے سید شریف الحسن کے گھر جب وفات پائی تو میری عمر کوئی ۱۲ سال ہوگی۔ میری یاد میں دادا اکثر ہمارے پاس رہے۔ مگر میرے ذہن میں دادا اور والد صاحب کی باہم صحبتیں ہیں۔ صرف ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ دادا کو روانہ ہونا تھا۔ وہ تیار بیٹھے تھے اور اچھے صاحب ازراہ مذاق کہہ رہے تھے "چچا بس اب آپ اسٹیشن چلے جائیں۔ گاڑی کا کیا بھروسہ کب چل پڑے"۔ دراصل دادا کے لئے مشہور تھا کہ سفر کرنا ہو تو ایک دن پہلے سے تیار ہو جاتے اور ٹرین کی روانگی سے بہت پہلے اسٹیشن جانا پسند فرماتے۔ والد صاحب دادا کو باپ نہیں بلکہ چچا کہتے تھے۔ ہمارے خاندان میں یہ رسم عام تھی۔ اسباب اس کے بیشتر تھے۔ چھوٹی عمر میں شادی ہوتی، لڑکے باپ بن جاتے۔ اپنے والدین کے سامنے مارے لحاظ خود کو باپ نہ کہلواتے کبھی یوں ہوتا کہ مشترک خاندان میں بڑے بھائیوں کی اولاد چھوٹے بھائیوں کو چچا کہتی۔ جب ان چچاؤں کے بچے ہوتے تو دیکھا دیکھی دوسرے بچوں کی وہ بھی باپ کو چچا کہنے لگتے۔ اس واقعے کے علاوہ میرے ذہن میں کوئی ایسی تصویر نہیں جس میں اچھے صاحب اپنے والد سے ہمکلام ہوں۔ اللہ جانے ایسا کیوں ہے۔ دادا کا حقہ، ان کا اخبار، کتابیں، حدیثیں، قرآن، ان کا مخصوص رومال اور زنجیر سے لٹکی گھڑی، حتیٰ کہ افیون کی ڈبیہ بھی مجھے یاد ہے۔ میں آنکھ بند کروں تو آج بھی خود کو دادا کی گود میں دیکھ سکتی ہوں۔ ان کے پلنگ پہ ان کے پہلو میں اور وہ مجھے نظمیں یاد کراتے تھے۔ ایک نظم "میری بندریا" مجھے مدت تک یاد رہی۔ اب ذہن سے فراموش ہو گئی۔ میں دادا کی بندریا تھی اور وہ مجھے اسی پیار سے دیکھتے تھے۔

جس پیار سے میں نظم کی بندریا کو دیکھتی تھی۔ دادا ہر وقت پڑھتے رہتے تھے۔ وسیع النّظری اور نیکی چہرے سے عیاں تھی۔ قصہ کوتاہ دادا اچھے صاحب سے بھی زیادہ پیارے تھے۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتی۔ اچھے صاحب اور دادا کا رشتہ ایک خزانہ ہے جو زمین میں دفن ہو گیا۔

اب ذکر اس پری وش کا جس کے ڈر سے میرا قلم کیا خود قوتِ بیان گھبرا جائے۔ کسی کی کہی ہوئی پرانی بات یاد آتی ہے کہ اگر تمام سمندر روشنائی بن جائیں اور ساتوں آسمان کاغذ، تو ذکر اچھے صاحب کے عشق کا امی جان کے ساتھ پھر بھی نامکمل رہ جائے، روشنائی کم پڑ جائے، کاغذ ختم ہو جائے اور کہانی کی پہلی منزل بھی پوری نہ ہو۔ اچھے صاحب کے انتقال سے چند ماہ قبل فلاور اور ریحانہ ہندوستان گئے۔ میں اور بی بی اچھے صاحب کے ساتھ تھے۔ اسی قیام کے دوران ایک روز بی بی سے میں نے استفسار کیا کہ سبب اس شدید عشق کا کیا تھا۔ بی بی نے کہا "حسن"۔ میں نے کہا مگر "اچھے صاحب نے امی جان کے حسن کا کبھی چرچہ نہ کیا"۔ کہنے لگیں "امی جان کا حسن چرچے کا محتاج نہ تھا۔ جو خوبیاں ان میں موجود نہ تھیں ان کو دیکھتے تھے اور ان کا ذکر کرتے تھے۔"

میں قلم بند کرنے سے قاصر ہوں اس بندگی کو، اس پرستش کو، اس محبت کو جو میرے باپ نے میری ماں کے ساتھ کی۔ امی جان مرکزِ کائنات تھیں۔ دادا دادی مختارہ دلہن کہتے تھے۔ اچھے صاحب نے شاہانِ جرمنی کے توسط سے قیصر خطاب دیا تھا۔ فلاور کے نام میں بجائے اپنا نام جوڑنے کے قیصر لگاتے تھے۔ فلاور سنِ بلوغ کو پہونچے تو قیصر کا اضافہ ختم کیا۔ خود والد صاحب کو شکار سے دلچسپی نہ تھی مگر امی جان کے شوق کو دیکھتے ہوئے بندوق چلانے کی تربیت دلوائی۔ لائسنس جاری کروایا، بندوقیں امی جان کے لیے خریدی گئیں۔ امی جان خاصی نشانچی تھیں۔ شیر کے شکار کو بھی چلی جاتی تھیں۔ زندگی میں جو کچھ ہوا وہ میرے بس کا نہیں۔ مرنے کے بعد جو سامان اور تحریریں والد صاحب کی نکلیں صرف اس کا ذکر کرتی ہوں۔ والدہ صاحبہ کی پانچ پرانی چادریں برائے کفن، ان کا گھسا ہوا صابون برائے غسل میت، استعمالی تولیہ برائے بدن قبر میں اتارے جانے کے بعد۔ فلاور کو تاکید تحریری کہ غسال میری میت کو ہاتھ نہ لگائیں، فلاور خود غسل دیں اور قدیم جاں نثار خادم یوسف پانی ڈالے۔ مزید براں امی جان کی تیمم کی مٹی جو سنبھال کر کپڑے کی تھیلی میں رکھی تھی۔ اس کے لیے حکم کہ سفوف کر کے بعد غسل بدن پر مل دی جائے، جو بچ جائے قبر میں ڈال دی جائے۔ تحریریں جو ملیں ان میں ایک مختصر مگر جامع مسودہ تھا بعنوان "ابرارِ غمزدہ کی سرگزشتِ خواب و خیال" امی جان کے انتقال کے بعد جتنی بار ان کو خواب میں دیکھا وہ احوال قلمبند کیا۔ خوشگوار انداز، منظر کشی اور باقاعدہ مکالمے کا لطف۔ طرز ایسا کہ بار بار پڑھو مگر جی نہ بھرے۔ ہم سب کے نام ہدایات اور نصیحتیں۔ پتے ان اصحاب کے جن کو ہندوستان میں انتقال کی خبر دی جائے۔ نام ان احباب کے جن کو پاکستان میں مطلع کیا جائے۔ فلاور کے لیے بطور تحفہ ایک ٹوپی جس کے اندر کشیدے سے فلاور کا نام اور اپنا نام لکھا ہوا۔ امی جان کے برابر دفن کیے جانے کی تاکید۔ امی جان ہمارے خلاف شکوے شکایت کرتیں، ہم بہنیں دم بخود سنا کرتے۔ اچھے صاحب اکثر یہ کہہ کر جان چھڑاتے "اللہ اللہ ایسی ماں کی ایسی اولاد"۔ چھوٹی صاحب کہتیں کہ ٹھیک کہتے ہیں ہم اتنے اچھے ہیں کہ ہمارے باپ کو حیرت ہوتی ہے کہ ایسی ماں کے پیٹ سے ہم کیسے پیدا ہو گئے! آج یہ جملہ میرا رواں رواں دہراتا ہے۔ کہاں امی جان کے نصیب کہاں ہمارا بختِ خفتہ۔ واقعی مقامِ حیرت ہے۔ ایسی ماں کے پیٹ سے ایسی اولاد! قبر امی جان کے پہلو میں بنی۔ مقام اچھے صاحب کو بلند ملا۔ جہاں آپ کا پائتانہ ہے وہاں امی جان کا سرہانہ۔

امی جان نے جانے سے پہلے جو کر دکھایا اس کی شہادت دیئے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں ہو سکتا۔ انتقال سے قبل صرف ایک شب والدہ محترمہ اسپتال میں رہیں۔ وہ شب میں نے اور فلاور نے ان کے ساتھ کاٹی۔ قبلہ والد صاحب کو فلاور نے جبراً گھر واپس کر دیا۔ دل کا دورہ پڑا تھا، یہ کیسا دورہ تھا؟ رات بھر دبنگ آواز میں امی جان نے باقاعدہ نام لے کر والد صاحب کو پکارا "ابرار، ابرار"

ایک رات تھی کہ کسی طرح ختم نہ ہوتی تھی۔ آنکھیں بند، نہ کوئی طلب نہ مطلب۔ ہمارے منع کرنے پر کلمہ پڑھتیں۔ قرآن شریف جو کچھ زبانی یاد تھا وہ دہرائیں اور پھر "ابرار، ابرار" کا نعرہ بلند ہوتا۔ فلاورہ، عزیزہ جان فرزند، میں پیٹ کی پیدا اولاد ہم دونوں کو انہوں نے ایک بار بھی نام لے کر مخاطب نہ کیا۔ میں نے بار بار پوچھا امی جان کوئی تکلیف ہے۔ سختی سے نفی میں جواب دیا اور "اچھے صاحب اچھے صاحب" کہہ کر بات ختم کی۔ آخر شب میں پانی مانگا کہا کہ برف منہ میں ڈالو مگر خطاب باقاعدہ ہم سے نہ کیا۔ میری ناقص عقل کے مطابق میری ماں مر چکی تھی۔ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ چکے تھے۔ خدائے حقیقی اور خدائے مجازی کے علاوہ ہر ایک سے بے نیاز تھیں۔ مگر ہم گناہگار ان کے انتظار کو نہ سمجھ سکے۔ اسی شب امی جان نے وہ حساب چکایا اچھے صاحب کا کہ میرا ایسا ناقد بھی دنگ رہ گیا۔ عشق کا اصل مقام کیا ہے؟ دلِ عاشق کہ قلبِ معشوق؟

مر گئیں مگر زندہ رہیں یہاں تک کہ دن چڑھ گیا۔ معالج گشت پر آگئے، اچھے صاحب بڑی دیر سے آئے۔ میں نے امی جان سے قریب ہو کر کہا "امی جان، امی جان، اچھے صاحب آگئے۔ قریب بیس گھنٹے سے جو آنکھیں بند تھیں ایسی غیر انسانی قوت سے کھولیں کہ میرا کلیجہ شق ہو گیا۔ اچھے صاحب کو دیکھا، اتنی سختی سے ان کا ہاتھ کلائی پر پکڑا کہ گرفت کی سختی کو میں نے محسوس کیا۔ اچھے صاحب نے پیار کیا، کہا کہ میں آگیا ہوں اور سفر ختم ہو گیا۔ ہستی سے عدم تک تو نفس چند کی راہ تھی۔ اچھے صاحب سے ملنے کی تڑپ نے رات بھر تڑپایا۔ آنکھوں کے راستے جان نکل گئی، کسی کو خبر نہ ہوئی۔ میں اور فلاورہ باہر آگئے اور روانہ ہو گئے، اچھے صاحب نے پیچھے سے یوسف کو دوڑایا مگر گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ چنانچہ والد صاحب نے تنہا اپنی جانِ ناتواں پر قیامت کا بوجھ برداشت کیا۔ یوسف کو روانہ کیا کہ ہم کو اطلاع دے۔ ایک اعتبار سے ٹھیک تھا، کائنات تحلیل ہو چکی تھی۔ اچھے صاحب تھے اور امی جان کی مٹی کی آخری ذمے داریاں جو وہ ادا کر رہے تھے۔ جب میں اپنے گھر سے منقلب ہو کر پہونچی تو امی جان آچکی تھیں۔ فلاورہ کے کمرے میں جیسے خوابیدہ ہوں۔ حسن زندگی بن کر چہرے پر چمک رہا تھا۔ اچھے صاحب مستقل اشکبار تھے مگر جسدِ خاکی سے دور۔

اچھے صاحب امی جان کی جدائی کے بعد تین سال اور آٹھ مہینے جیئے۔ میں نے ان کے وجود میں ہمیشہ امی جان کو بھی دیکھا۔ وہ گئے تو یتیمی اور اسیری ایک ساتھ خود پر طاری پائی۔ زندگی کا وہ میلہ جو ہمارے لئے بپا ہوا تھا ختم ہو گیا، یادیں رہ گئیں۔ جب تک جیوں گی، عالمِ خیال میں ماں باپ ہی کے ساتھ گھوموں پھروں گی کہ ان کے گھر کے علاوہ میرا دوسرا گھر نہ بن سکا۔ امی جان کی شان اور سختیاں، اچھے صاحب کی بلندی اور ان کی نرمیاں، امی جان پر ہمارا زعم اور کسی بات کو خاطر میں نہ لانے کی جرأت، اچھے صاحب پر ہمارا ناز اور ایک عالم سے بے نیاز ہونے کی ہمت۔ میرا تیہا، میرا غرور ماں باپ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ ایسے بزرگ کسے نصیب ہوتے ہیں! تنگ نظر نہ میری ماں تھیں نہ باپ، نہ دادی نہ دادا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ دادی نماز کے بعد دعا بہ آوازِ بلند مانگتی تھیں "یا اللہ ہر ہندو مسلمان کا بھلا" کہہ کر دعا ختم کرتیں۔ ہندو مسلمان سے مراد کل خدائی ہوتی تھی۔

اچھے صاحب کا ایک خط زینب کے نام آج تک محفوظ ہے جس میں انہوں نے زینب کو تاکید کی کہ ماں سے محبت کرنا اور عزت کرنا مگر خط ختم اس جملے پر کیا کہ یہ محبت اور عزت ماں کے بعد ساری خلقِ خدا کو دینا۔ کبھی کسی قوم، کسی مذہب کے لئے ایک حرفِ ناگوار ان کے منہ سے نہ نکلا۔ اچھے صاحب کی آخری پوسٹنگ انڈسٹری میں تھی۔ مالکان، مینیجر اور مزدور دیوالی پر لکشمی کی پوجا کرتے۔ اچھے صاحب بحیثیت افسرِ اعلیٰ کھڑے ہوتے۔ سیف کے آگے رسوماتِ عبادت ادا ہوتیں۔ سرسوتی کی پوجا قلم دوات کے آگے ہوتی۔ والد صاحب مجھ کو تفصیل سے سب کچھ بتاتے کیونکہ میں شوق رکھتی تھی فلسفۂ ہند کو سمجھنے کا۔ ہولی آتی تو رنگ میں بالکل ڈوبے ہوتے۔ امی جان ناراض ہوتیں۔ پاکستان آئے تو غریبوں میں عیسائی برادری ملی۔ ان کے ساتھ

بھی محبت کی اور ان کے تہواروں پر بین دین کیا، غرضیکہ حلقۂ احباب میں سب شامل تھے۔ امی جان کا شغل بھی لکھنا پڑھنا تھا۔ والد صاحب بھی آخر دن تک علم و دستی نبھاتے رہے۔ مجھے یاد ہے میرے دادا بھی دن دن بھر بس پڑھتے رہتے تھے۔ شاید مجھے بھی پناہ اب کتابوں ہی میں ملے۔ اچھے صاحب نے امی جان کے فراق میں لیل و نہار کیوں کر کاٹے، کون جانے۔ دیکھنے میں یہ آیا کہ رفیقِ حیات کے خالی پلنگ پر تصویر رکھ لی، کبھی تصویر اٹھا کر سینے پر رکھ لیتے پھر واپس پلنگ پر سجا دیتے۔ جانے دل میں کتنا درد ہوتا ہوگا۔ چلتے پھرتے عظیم شاہکار مونا لیزا دیکھا کرتے۔ فنِ مصوری سے علمی تعلق نہ تھا مگر ذوق کی بلندی نے وہ پرکھ دی تھی کہ اس تصویر میں بے پناہ کشش پاتے۔ کہتے تھے کہ اس تصویر میں کیا بات ہے اس کو دیکھنے سے سکون ملتا ہے اور قرار آتا ہے۔ لاکھوں سلام مصورِ اعظم کو کہ اس کے فن پارے نے اچھے صاحب کے ٹوٹتے ہوئے دل کو دھڑکنے کی قوت دی۔

۲۸ مارچ ۱۹۸۲ء بی بی، میں اور فلاور اچھے صاحب کو لے کر ریلوے ہسپتال پہونچے۔ کمرہ وہ ملا جس میں امی جان نے زندگی کی آخری شب کاٹی تھی، دل میرا دھک سے ہو گیا۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ کوئی شگون بد مان کر نہیں رکوں گی۔ بی بی نے روتے روتے کہا تھا "اب اچھے صاحب بچیں گے نہیں" میں نے ماننے سے انکار کیا۔ ابھی ان کو میرے ساتھ رہنے کا وعدہ پورا کرنا ہے۔ بیماری کوئی نہیں صرف نقاہت ہے۔ والد صاحب مرتے مر گئے مگر عناصر کی ترتیب درہم برہم نہ ہوئی۔ ڈاکٹر حیران تھے خرابی اندرونی کوئی نہ تھی۔ چار دن اور چار راتیں اچھے صاحب ہسپتال میں رہے۔ یہ چار دن اور چار راتیں میرے لئے حاصلِ حیات ٹھہریں۔ وہ فہم وہ ادراک جو اچھے صاحب کا خاصہ تھا۔ بڑے شعور سے میرے قلب میں منتقل ہوا اور کرب بن کر سما گیا۔ کیا مرنے والے اسی طرح مرتے ہیں اور درسِ محبت دیتے، پیغامِ حسن و عشق پہونچاتے، صحبتوں کو یاد کیا، کہا کہ اب محفلیں برخاست ہوتی ہیں۔ مرتے دم تک معراجِ انسانیت پر رہے، عقل و ہوش، انداز و ادا، پیار اور لگاوٹ ہر جنبش جسم و جاں میں قائم رہی۔ میرے باپ نے اس عرصے میں جو ہسپتال میں گزارا، جو باتیں مجھ سے کہیں اُن پر سے دنیا کی تمام حکایتیں قربان، تمام فسانے صدقے۔ ۳۰ تاریخ تھی، میں نے حال پوچھا، کہنے لگے "پیاری پیاری صورتیں دیکھ رہا ہوں" پھر ذرا وقفے سے بولے "زینب کپڑے بہت اچھے پہنتی ہے" مجھے گویا بتایا کہ پیاری صورتوں میں زینب بھی شامل ہے۔ میں نے کہا "اچھے صاحب ذہنی طور پر آزاد تو بس میں ہوں، یہ زینب بڑی دقیانوس ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ کے خیال میں کون بہتر ہے۔" کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ کوئی ایک منٹ بعد بولے "زینب!" ایک تیر سے ماں اور بیٹی دونوں کو شکار کر گئے۔ بی بی نے چھوٹی صاحب کی طرف سے سو روپے کا نوٹ دیا تھا۔ گھنٹوں بعد کہنے لگے میرا نوٹ کدھر گیا، پھر ہنس کر بولے "دیکھو ہوسِ دنیا! جا رہا ہوں مگر فکرِ دنیا کے ساز و سامان کی نہیں جاتی۔" میں نے پوچھا "اچھے صاحب آپ مجھ سے خوش ہیں؟" کہنے لگے "میں تم سے بہت خوش ہوں۔" "بہت" پر زور دیا گویا میرا جملہ درست کیا۔ ۳۰ تاریخ کی صبح کو یہ بھی کہا کہ اولاد بڑی چیز ہے۔ بچا لیا تم لوگوں نے، طبیعت بحال تھی۔ میں نے کہا اچھے صاحب یوسف نے بھی بڑی خدمت کی آپ کی۔ کہنے لگے یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے۔ خدمت نہ کرتا تو اب تک میں قبر میں اُتر گیا ہوتا۔ اسما کو غنودگی زیادہ تھی، میں نے حال پوچھا کہنے لگے "ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے۔" مجھ سے یہ بھی کہا تمہارے ساتھ بڑے مباحثے رہے۔ آپا جان اور نجم کو یاد کیا، منور بھائی کا نام لیا، خوش تھے مگر زندگی سے مایوس۔ عالی صاحب کو بڑے اصرار سے بلوایا، ان کا ہاتھ پکڑا، دیکھا اور خاموش ہو گئے، دل کو سکون ہو گیا، موت آتی ہے تو کیا! عالی صاحب میں ان کو نسل در نسل اپنا وجود نظر آیا اور مطمئن ہو گئے۔ لیکن بہرحال زندگی کب ہے۔ رات کو مجھ سے کہا "MANA! TONIGHT IS THE BEST NIGHT." مگر کسی تکلیف کی شکایت نہ کی۔ رات بھر بولتے رہے۔ ساری زندگی دہرائی، کہا کہ کل پہلی تاریخ

ہے۔ پنشن کا فارم نکالو، اسٹیمپ لگاؤ، مجھ کو دے دو میں دستخط کر دوں، عمران صاحب کو میں ان کا ماہانہ ۲۶ تاریخ کو بھیجتا ہوں بہت دیر ہو گئی ہے، منی آرڈر روانہ کرو۔ ستاری کو جوڑا دینا اور کسی کو ضرورت نہیں۔

افضل چچا کیوں آتے ہیں؟ ان کے ساتھ یہ داڑھی والے صاحب کون بیٹھے ہیں۔ پھر شروع سے شروع ہو گئے، اپنی ملازمت، شادی، رفاقتیں، محبتیں اور رشتے دہراتے سب ہے۔ اپنا نام بار بار بتاتے تھے۔ میں نے پوچھا اچھے صاحب آپ کا تاریخی نام کیا ہے۔ فوراً بتایا "ریاض رحمان" صبح ہوئی مہینہ بند ہوا اپریل کی پہلی تاریخ آئی اور اچھے صاحب بخار میں مبتلا خاموش ہو گئے، پھر نہ بولے۔ دوپہر کو میں زینب کے ساتھ گھر آئی، کھانا کھایا، نہائی دھوئی اور لیٹ گئی۔ پروگرام میرا رات ایک ہسپتال جانے کا تھا۔ اچانک دل کو بے قراری ہوئی اور میں بلند آواز سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ زینب نے وجہ دریافت کی۔ میں نے کہا اچھے صاحب ختم ہو رہے ہیں۔ بچی کا ہاتھ پکڑا، دیوانہ وار ہسپتال پہونچی۔ بی بی، منور بھائی اور نجم بیٹھے تھے۔ یوسف سرہانے کھڑا تھا۔ ہسپتال پہنچ کر میرا دل ٹھہر گیا۔ تھوڑی دیر ہم دونوں بہنیں بڑے اطمینان سے باتیں کرتے رہے۔ منور بھائی جانے لگے تو اچھے صاحب کو چھو کر کہا بخار اتر گیا ہے۔ مجھ سے تاکیداً کہا، آپ دیکھیں بخار بالکل اتر گیا ہے۔ میں نے خوش ہونا چاہا مگر دل اچھل کر حلق میں آگیا، وہ لوگ چلے گئے میں اور بی بی رہ گئے۔ کچھ دیر بعد شام پڑ گئی۔ ڈاکٹر راؤنڈ پر آئیں۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب میرے والد کی سانس ٹھیک نہیں ہے۔ کہنے لگیں، ٹھیک ہے آپ ان کو کروٹ دے دیں۔ میں نے کروٹ دی۔ کان کے پاس منہ لیجا کر کہا "اچھے صاحب سانس ٹھیک سے لیں"۔ سنی میرے کہنے پر کچھ کی، میری عقل نے بتایا کہ وقت آخر آگیا ہے۔ بی بی سے کہا "بی بی اچھے صاحب جا رہے ہیں"۔ بی بی جس وقت سے اسپتال آئیں باوجود سب کے اصرار کے ایک لمحے کو باپ کی پٹی سے الگ نہ ہوئیں، مگر نہ گئیں۔ اس وقت ہٹ کر قدموں کے پاس ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں۔ میں نے خود کو رخصت ہوتے باپ کے پاس تنہا دیکھا، آہستہ سے سید ھا اٹھایا پیشانی پر بوسہ دیا کہا کہ آپ کے پاس ہوں، الحمد شریف پڑھی، تین بار کلمہ دہرایا، دم واپسیں کو آنکھوں کے راستے دل میں اتارا۔ بس ایک لمحے کی بات تھی۔ میں نے سر واپس تکیے پر رکھا، بی بی سامنے تھیں، ان سے کہا بی بی اچھے صاحب ختم ہو گئے، مکمل سناٹا تھا اور دل پکار رہا تھا:

ہری بن جگ اندھیارا
پریتم بن جگ اندھیارا
پیا بن جگ اندھیرا

اختلافات

محمد ارشاد - احمد لطیف - آصف ثاقب
صدیق منظر - صوفی عبد الرشید

روایت اور جدیدیت

پروفیسر مشکور حسین یاد کے کہنے پر عسکری مرحوم کی 'جدیدیت' کا میں نے دوبارہ مطالعہ کیا۔ میری رائے اب بھی وہی ہے جس کا اظہار کر چکا ہوں۔ پروفیسر موصوف نے شکایت کی ہے کہ میں نے "عسکری مرحوم یا رینے گینوں مرحوم کے بنیادی خیالات ہی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی"۔ انھیں "اس پر تعجب بھی ہے اور افسوس بھی" کہ میں" رینے گینوں کے تصورِ روایت کو کیوں نہیں سمجھا اور عسکری یا گینوں کے دوسرے مخالفین کی طرح روایت کے عام مفہوم ہی پر کیوں قائم ہو کر رہ گیا"۔ پروفیسر موصوف یہی خیال کرتے ہیں تو میں اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ:

گفتہ بودی ہمہ زرقند فربند وفسوس سعدی آں نیست ولیکن چو تو فرمائی ہست

اس کے بعد عسکری یا گینوں کے تصورِ روایت کے مفہومِ خاص اور ان کے بنیادی خیالات کی جو وضاحت انھوں نے کی ہے، ایک موقع پر خود ان کے لئے الجھن کا سبب بن سکتی ہے، اگرچہ انھوں نے اس امر پر غور نہیں کیا۔ رینے گینوں کے موجودہ عقیدتمندوں میں وہی ایک آدمی ایسے ہیں جس نے رینے گینوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے لیکن اس کے باوصف ان پر یہ بات کبھی واضح نہ ہو سکی کہ رینے گینوں نے 'روایت' کا وہ تصور کبھی پیش ہی نہیں کیا جو عسکری مرحوم نے ان سے منسوب کر رکھا ہے۔ عسکری صاحب نے رینے گینوں کو جتنا زیادہ پڑھا ہے اتنا ہی کم سمجھا بھی ہے تفصیل پھر سہی۔

پروفیسر مشکور آگے چل کر لکھتے ہیں "اگر ارشاد صاحب رینے گینوں کے تصورِ روایت کو سمجھ گئے رہتے تو وہ قرآن کو لکھی ہوئی کتاب نہ کہتے۔ قرآن خدا کے گھر سے لکھی لکھائی کب اتری۔ یہ بھی تو آنحضرتؐ کی روایت کردہ ہی ہے"۔

اگر 'روایت' سے رینے گینوں اور عسکری مرحوم کی مراد وہی ہے جو پروفیسر موصوف بیان کر رہے ہیں تو میں 'روایت' کا یہ مفہوم برائے بحث تسلیم کر لیتا ہوں لیکن اس صورت میں اس سوال کو معرضِ التوا میں ڈالنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اگر قرآن 'روایت' ہے تو جدیدیت پسند مسلمان قرآن (روایت) سے سند طلب کرنے پر عسکری صاحب کے نزدیک گمراہ کیوں ٹھہرتے ہیں جبکہ اس صورت میں وہ "روایت" ہی کو بطور سند طلب کر رہے ہوتے ہیں اور محمد حسن عسکری کے نزدیک بھی "روایت" ہی سند ہے اور امام اس سند کا حامل ہے اور جدیدیت پسند امام ہی کی طرف رجوع کرتے ہوئے "روایت" ہی کی سند طلب کرتے ہیں لیکن عسکری صاحب امام سے قرآن کی سند طلب کرنا گمراہی خیال کرتے ہیں۔

رینے گینوں اور عسکری صاحب کے تصورِ "روایت" کی مزید وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر مشکور لکھتے ہیں "اور پھر ارشاد صاحب کو روایت کے ایک ہونے پر یقین تو کیا ہوتا کاش انھوں نے اس پر ادھر ادھر کی بحث شروع کر دی۔ التوحید واحد میں ایک مسلمان کو کیا شک ہو سکتا ہے"۔

"التوحید واحد" نہ تو قرآن کی آیت ہے اور نہ قول رسولؐ بلکہ محض ایک جملہ ہے عربی زبان میں اور عربی زبان کا کوئی VAGUE جملہ محض اس وجہ سے PRECISE نہیں ہو جاتا کہ وہ عربی زبان میں ہے اور اس میں توحید کا لفظ آیا ہے۔ میں اس جملے کو VAGUE اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس سے وہ مفہوم نہیں ہوتا جو آگے چل کر انھوں نے بیان کیا ہے۔ میں اس موقعے پر اس امر کو معرضِ بحث میں لانا نہیں چاہتا تاہم اس جملے کی نحوی ساخت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسی طرح کے دو چار جملوں ــــ التوضیح واضح، التنزیل نازل، التنقید ناقد، التخلیق خالق، التکمیل کامل ــــ کی طرف عسکری صاحب کے دیگر نیاز مندوں کی توجہ مبذول کراتے ہوئے یہ امید ضرور رکھوں گا کہ وہ ان کا اور ان کے حوالے سے "التوحید واحد" کا مفہوم متعین اور مطلب واضح کریں گے کہ میرا روئے سخن پروفیسر مشکور ہی کی طرف نہیں ان کی طرف بھی ہے۔ میں ان کی ذہانت اور علم کو آزمائش میں ڈال رہا ہوں۔

"التوحید واحد" کا جو مطلب پروفیسر صاحب نے بیان کیا ہے انہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ "حقیقتِ عظمیٰ ایک ہے۔ عام آدمی کی زبان میں یوں کہہ لیجیے کہ اس کائنات کا خالق ایک ہے تو عسکری یا گینوں کے مفہوم میں روایت ایک کیسے نہ ہوئی۔ خدا کے لئے رنگ و نسل یا ملک و قوم کا امتیاز کیا معنی؟ وہ تو سب کا خدا ہے۔ لہٰذا روایت بھی بنیادی طور پر سب کی ایک ہے البتہ ظاہر کا فرق ہو سکتا ہے۔"

پروفیسر مشکور پوری سنجیدگی، خلوص اور تہہ دل سے یہ خیال کرتے ہیں کہ عسکری اور رینے گینوں کے تصورِ روایت" کو وہ اپنا مفہوم نہیں پہنا رہے بلکہ وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو عسکری اور رینے گینوں کا منشا ہو سکتا ہے۔ پروفیسر موصوف سے یہ پوچھنا بے محل نہ ہوگا کہ جب خدا سب (کیتھولک، پروٹسٹنٹ، جدیدئین، انسیین، عقلیت پسندوں، صوفیا، علما، سرسید اور حالی) کا خدا ہے لہٰذا روایت بھی بنیادی طور پر سب (کیتھولک، پروٹسٹنٹ، جدیدئین، انسیین، عقلیت پسندوں، صوفیا، علما، سرسید اور حالی) کی ایک ہے البتہ ظاہر کا فرق ہو سکتا ہے تو عسکری صاحب کو مسیحیوں میں پروٹسٹنٹ، جدیدئین، انسیین کو اور مسلمانوں میں جدیدیت زدہ، عقلیت پسند سرسید اور حالی کو منحرفینِ روایت شمار کرنے کا جواز کس طرح فراہم کیا جا سکتا ہے۔ وقتی طور پر یہ نتیجہ نکالنا کیا درست نہ ہوگا کہ 'روایت' کے خاص مفہوم کے بارے میں عسکری صاحب اور پروفیسر مشکور میں سے کوئی ایک یقیناً غلطی پر ہے۔ اس لئے کہ پروفیسر مشکور کی بیان کردہ وضاحت کی روشنی میں یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ عسکری صاحب کو نہ صرف حالی کی شاعری پر بلکہ ان کی نعت تک پر یہ اعتراض کیوں ہے کہ "بظاہر تو حالی روایت کے شاعر نظر آتے ہیں مگر ان کی نعت تک کو دیکھ لیجیے الفاظ تو وہ روایتی ہی استعمال کر رہے ہیں مگر مابعد الطبیعات کو چھوڑ کر اخلاقیات ڈال رہے ہیں"۔ کیا حالی نے اپنی شاعری بالخصوص نعت میں خدا اور قرآن کا کہیں بھی انکار کیا ہے۔ حالی تو بڑے سیدھے سادے اور سچے مسلمان تھے، پھر انھیں 'روایت' سے منحرف کیوں ٹھہرایا گیا ہے؟ اور اگر حالی کے بارے میں عسکری صاحب کی شکایت بجا ہے تو پھر 'روایت' کا جو مفہوم پروفیسر موصوف نے بیان کیا ہے اس میں انھیں ترمیم کی ضرورت محسوس کرنی چاہیے۔

پروفیسر موصوف نے کیتھولک مذہب کی مخالفت میں رینے گینوں کے مضامین کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر رینے گینوں کو کیتھولک مذہب سے اتنی ہی ہمدردی تھی تو انھوں نے اسلام قبول کیوں کیا ــــ کیتھولک مذہب تو محمد حسن عسکری نے بھی قبول نہیں کیا تھا اور وہ مسلمان ہی تھے اور ایک اچھے اور سچے مسلمان (قطع نظر اس سے کہ ان کے ایک ذہین شاگرد) یا نیاز مند نے اپنی ایک تحریر "محمد حسن عسکری بنام محمد ارشاد" میں مرحوم کو عالمِ بالا میں آنجہانی بودلیئر اور آنجہانی سارتر جیسے روایت دشمنوں اور ملحدوں کا صدرِ محفل دکھایا ہے) لیکن اس کے باوصف وہ کیتھولک مذہب کے مداح ہیں۔ رینے گینوں نے جس کیتھولک مذہب کی مخالفت کی

ہے نشاۃِ ثانیہ کے بعد کا کیتھولک مذہب ہے۔ یہی رویہ عسکری صاحب کا بھی ہے۔

انفرادیت کا جو مطلب میں نے بیان کیا ہے کیتھولک کلیسا کو اسی پر اعتراض ہے۔ یہاں انفرادیت سے مراد یہ نہیں کہ ہر آدمی بجائے خود صدق و کذب کا معیار ہے بلکہ انفرادیت کی اصطلاح یہاں کلیسائیت کے متقابل کے طور پر آئی ہے۔ کیتھولک کلیسا اس عقیدے کو مسیحیت کے بنیادی عقائد میں شمار کرتا ہے کہ کیتھولک کلیسا بحیثیت ایک ادارے کے، نیز اس ادارے کے جملہ عہدیداروں پر ایمان نہ لانے والا، دائرۂ دین سے خارج ہے۔ بندے کا خدا سے اور خدا کا بندے سے تعلق براہِ راست نہیں بلکہ پوپ اور پادریوں کے وسیلے سے ہے۔ کتبِ مقدسہ کی تفسیر کا حق ان کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو نہیں خواہ کتنا ہی عالم و فاضل کیوں نہ ہوں۔ پروٹسٹنٹ ازم کیتھولک مذہب سے صرف اسی ایک بات پر اختلاف رکھتا ہے، دیگر عقائد میں دونوں متفق ہیں۔

پروفیسر موصوف کو تعجب ہوگا کہ مارٹن لوتھر کو اس اختلافی عقیدے کی ترغیب "تصوف" پر ایک کتاب پڑھنے سے ہوئی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ پروفیسر صاحب کا یہ کہنا بجا ہے کہ ہم ایٹم کے اسرار و رموز تو ایک عام آدمی تو کیا پڑھے لکھوں کو بھی نہیں سمجھا سکتے علمِ توحید اور الٰہیات کے اسرار و رموز کیسے سمجھا سکتے ہیں۔ اگر کوئی عام آدمی ان کی بات کرتا ہے تو ہم کہہ اٹھتے ہیں کہ کیوں دخل در معقولات کرتے ہو۔" پروفیسر صاحب کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے تھی کہ لوتھر عام آدمی نہیں تھا، پادری تھا اور اس حیثیت میں اسے کتبِ مقدسہ کی تفسیر اور تشریح کا حق تھا لیکن چونکہ پوپ بلحاظ عہدہ خدا کا نمائندہ اور مبرا عن الخطا سمجھا جاتا ہے اس لئے ہر مذہبی معاملے میں اس کی توثیق ضروری ہے پس کیتھولک مذہب میں کتبِ مقدسہ کی تفسیر و تشریح کی صحت کا انحصار مفسر اور شارح کے علم و فضل پر نہیں بلکہ اس کے عہدے پر ہوتا ہے۔

پروفیسر صاحب کا یہی بیان اس سوال کو بھی راہ دیتا ہے کہ برونو، کوپرنیکس اور گلیلیو کے نظریات پر کیتھولک کلیسا کی رد و قدح دخل در معقولات نہیں تھی تو اور کیا تھا۔ اسی طرح کوانٹم نظریے پر جس کا حوالہ پروفیسر صاحب نے دیا ہے محمد حسن عسکری کی جرح کس ذیل میں شمار کی جا سکتی ہے؟ سڑک پر جاتی ہوئی موٹر کی جو مثال عسکری صاحب نے دی ہے، انہی کی ہے، کسی بھی بڑے سائنسداں کی نہیں۔ ان میں کوئی شک نہیں کہ کوانٹم نظریے کی وضاحت موٹر ہی کی مثال سے عصرِ حاضر کے ایک بڑے سائنسداں اور صفِ اول کے فلسفی اے۔ این۔ وائٹ ہیڈ نے بھی کی ہے اور شاید انہی کو بطور اقتباس اقبال کی تشکیلِ الٰہیاتِ اسلامیہ کے تیسرے خطبے میں عسکری صاحب نے دیکھا ہوگا۔ لیکن موٹر کی مثال جس طرح عسکری صاحب نے دی ہے اسی سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے ایک ایسے کام میں ہاتھ ڈالا جو ان کے بس اور بساط سے باہر تھا، نیز انگریزی زبان سے۔ بخوبی واقفیت اس زبان میں ہر تحریر (خواہ اس کا موضوع فلسفہ ہو یا سائنس) کی باریکیوں سے واقفیت پر دلیل نہیں اور یہ کہ اپنے موضوع کے بارے میں عسکری صاحب کی معلومات سطحی، سرسری اور خام ہیں۔ میرے پاس "تشکیلِ الٰہیات" کا انگریزی نسخہ یا اردو ترجمہ موجود نہیں البتہ پشتو ترجمہ موجود ہے لیکن اس کے صفحے کا حوالہ پروفیسر موصوف کے لئے بیکار ہوگا۔ اگر وہ وائٹ ہیڈ کی "سائنس اینڈ دی ماڈرن ورلڈ" دیکھنا چاہیں تو مذکورہ مثال صفحات ۳۶ اور ۳۷ پر یوں درج ہے:

....ONE OF THE MOST HOPEFUL LINES OF EXPLANATION IS TO ASSUME THAT AN ELECTRON DOES NOT CONTENUOUSLY TRAVERSE ITS PATH IN SPACE. THE ALTERNATIVE NOTION AS TO ITS MODE OF EXISTENCE IS THAT IT APPEARS AT A SUCCESSIVE DURATIONS OF TIME. IT IS AS THOUGH AN AUTOMOBILE, MOVING AT THE AVERAGE RATE OF THIRTY MILES

AN HOUR ALONG A ROAD, DID NOT TRAVERSE THE ROAD CONTINUOUSLY;

BUT APPEARED SUCCESSIVELY AT THE SUCCESSIVE MILESTONES REMAINING

FOR TWO MINUTES AT EACH MILESTONE.

پروفیسر وائٹ ہیڈ، بیان بالکل: اتنے ہے اگر عسکری صاحب کوانٹم نظریے کے بارے میں معمولی شدبد بھی رکھتے تو یہ مثال بآسانی سمجھ لیتے اور اگر اس مثال ہی کو سمجھ لیتے تو کوانٹم نظریے سے انھیں کچھ نہ کچھ آگاہی حاصل ہو جاتی۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ کی مثال میں موٹر (الیکٹران) تیس میل فی گھنٹہ کی اوسط رفتار سے سفر کر رہی ہے لیکن اس کا یہ سفر ایک عجیب PARADOX ہے۔ یہ موٹر ایک گھنٹے میں تیس میل کی مسافت بھی طے کرتی ہے اور یہی ایک گھنٹہ دو منٹ فی سنگ میل کے حساب سے تیسویں سنگ میل تک اس کے قیام میں بھی گزرتا ہے۔ گھنٹے کے پہلے دو منٹ اس کا قیام پہلے سنگ میل پر ہوتا ہے اور اس کے فوراً بعد بغیر کسی وقفے کے دوسرے دو منٹ دوسرے سنگ میل پر رک کر گزارتی ہے علیٰ ہذا القیاس گھنٹے کے آخری دو منٹ تیسویں سنگ میل پر ٹھہر کر اگلے سنگ میل پر نمودار ہو جاتی ہے۔ پس یہ موٹر پہلے سنگ میل سے تیسویں سنگ میل تک دو دو منٹ کے لئے کسی نہ کسی سنگ میل پر برابر موجود دکھائی دیتی ہے لیکن ایک سنگ میل سے دوسرے (اور دوسرے سے تیسرے سنگ میل (علیٰ ہذا القیاس) کے درمیان کہیں موجود نظر نہیں آتی یعنی موٹر کار کا وجود زمان میں مسلسل اور مکان میں غیر مسلسل ہے۔ دوسرے لفظوں میں موٹر کار کا غیاب زمانی نہیں ہے کیونکہ موٹر زمان کے کسی بھی حصے میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتی ہے۔

لیکن محمد حسن عسکری مذکورہ عبارت سے جو مطلب سمجھے ہیں، یہ ہے کہ "سڑک پر موٹر جا رہی ہے۔ دو منٹ تک تو نظر آتی ہے پھر غائب ہو جاتی ہے۔ پھر نظر آنے لگتی ہے پھر غائب ہو جاتی ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جتنی دیر موٹر نظر سے غائب رہی کہاں چلی گئی تھی؟"

محمد حسن عسکری نے موٹر کا غیاب زمانی خیال کر لیا حالانکہ وائٹ ہیڈ کی مثال میں موٹر کسی بھی "دیر" نظر سے غائب نہیں رہی۔ اس لئے جو سوال انھوں نے "پیدا" کیا ہے اس کی "پیدائش" کی تصدیق وائٹ ہیڈ کے بیان سے نہیں ہوتی۔ وائٹ ہیڈ نے SUCCESSIVE DURATIONS OF TIME کو اور DISCRETE POSITIONS IN SPACE کو واضح طور پر لکھا ہے۔

اگر وائٹ ہیڈ اور محمد حسن عسکری کی پیش کردہ مثالوں کا فرق پروفیسر موصوف پر پوری طرح واضح ہو گیا ہے تو انھیں اپنے اس بیان پر کہ "سڑک پر جاتی ہوئی موٹر کی جو مثال عسکری صاحب نے دی ہے وہ مثال بھی عسکری صاحب کی نہیں کسی بڑے سائنسدان کی ہے" نظر ثانی کرنی چاہیئے۔ نیون سائن کی مثال میں نے اسی لئے دی تھی کہ جو بات (غیابِ زمانی) عسکری صاحب واضح کرنا چاہتے تھے پوری طرح واضح ہو جائے۔

پروفیسر مشکور کا خیال ہے کہ میں نے اپنی طرف سے یہ فرض کر لیا ہے کہ عسکری صاحب سائنس کو رد کر رہے ہیں۔ اگر میں اپنی طرف سے یہ فرض بھی کر لیتا کہ عسکری صاحب سائنس کو رد کر رہے ہیں تو بھی یہ قرینِ حقیقت ہی ہوتا لیکن مجھے ایسا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ عسکری صاحب نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ "نیا سائنس نیا مذہب پیدا کر رہا ہے۔ نیا سائنس پرانے سائنس سے زیادہ خطرناک ہے"

پروفیسر مشکور نے میرے لب و لہجے کی طرف بھی میری توجہ مبذول کرائی ہے۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ میرا لہجہ دلآزاری کی حد تک تلخ رہا ہے۔ میں اسے اپنی ناتجربہ کاری پر محمول کر سکتا ہوں مثلاً جب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فلسفے، سائنس اور تصوف کے بارے میں عسکری صاحب کی معلومات سطحی، سرسری اور خام ہیں، تو یہی بات، علاوہ اس کے کہ جس طرح میں نے کہی ہے، اور کس طرح کہی جا سکتی ہے، میں نہیں جانتا۔ بہر حال میں عسکری صاحب کے تمام عقیدت مندوں سے معذرت خواہ ہوں۔ میرا مقصود ان میں سے کسی کی دلآزاری نہ تھا۔ اشارتاً

میں نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ کتاب اور صاحبِ کتاب کے بارے میں مجموعی تاثرات ایسے نہیں جنہیں خوش آیند پیرائے میں بیان کیا جا سکے۔ علم و ادب میں اختلاف شخصیتوں سے نہیں ان کے افکار سے کیا جاتا ہے۔ اگر یہ دروازہ بند ہو جائے تو پورا معاشرہ منجمد ہو جائے۔ علم و ادب پر جمود کی حالت اسی وقت طاری ہوتی ہے جب اختلاف کا اظہار خواہ تنقید کی صورت میں یا عدم پیروی کی صورت میں، نہیں ہو پاتا۔ اختلاف کرنا آسان کام نہیں ہے بشرطیکہ سطحی نہ ہو۔ اس کے لئے اختلاف کرنے والے کو بھی اپنا نام، ننگ بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ دوسری سمت سے لعن طعن کی صورت میں تمام قرض مع سود واپس مل جاتا ہے۔ یہ کبھی نہیں دیکھا جاتا کہ کسی بھی اہم ادبی و علمی شخصیت کے افکار سے اتفاق ہی نہیں اختلاف بھی اسے ایک طرح کا خراجِ تحسین ہے۔ مارٹن وائٹ نے کیا ہی سچ کہا ہے کہ ہیگل کے لئے اس سے بڑا خراجِ تحسین اور کیا ہو سکتا ہے کہ آج ایک بھی مکتبِ فلسفہ ایسا نہیں جس کی بنیاد ہیگل کے کسی نہ کسی فکری پہلو کی تردید پر نہ رکھی گئی ہو:

فیضی احسنت ازیں قصہ کہ دوراں امروز گرم دارد ز تو ہنگامۂ رسوائی را

پس اگر "فنون" میں کچھ ایسا ہی سلسلہ عسکری صاحب کے بارے میں بھی چل نکلا ہے تو عسکری مرحوم کے عقیدت مندوں کے لئے یہی بات باعثِ اضطراب ہونے کے ساتھ باعثِ فخر بھی ہو سکتی تھی کہ اردو ادب میں اور کون شخصیت ایسی گزری ہے جو مرنے کے بعد بھی بدستور علمی و ادبی بحث و گفتگو کا مرکز و محور ہے اور جس سے موت بھی یہ مقام چھیننے میں ناکام رہی ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عسکری صاحب کے عقیدت مند مدیرِ "فنون" سے محض اس وجہ سے بدگمان ہیں کہ انھوں نے 'فنون' میں اس علمی بحث کو جگہ کیوں دی ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ یہ بات خود انہیں بھی تسلیم ہے کہ "یہ بحث ہماری اجتماعی زندگی کا ایک بہت حقیقی اور بہت اہم عملی سوال ہے اور مستقبل میں ہماری زندگی اور موت کا سوال بھی اسی مسئلہ کے حل سے وابستہ ہے"۔ اور "یہ مسئلہ ہمارے ہاں کے سوچنے والوں کے ہر طبقے میں صاحبانِ فکر و نظر کی طرف سے جس سطح کے ردِ عمل کا متقاضی ہے اس کی کمی بہر حال محسوس ہوتی ہے"۔ ان لوگوں نے اس موضوع پر ایک سنجیدہ مکالمے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ ان خیالات کا اظہار 'فنون' ہی کے صفحات میں اس موقع پر کیا گیا جب "فنون" میں اس موضوع پر یکے بعد دیگرے تین مضامین شائع ہو چکے تھے لیکن افسوس کہ میرے مضمون کی اشاعت کے ساتھ ہی یہ صاحبان نہ صرف مجھ سے نالاں ہیں بلکہ مدیرِ 'فنون' سے بھی گلہ مند ہیں کہ انھوں نے میرے مضمون کو 'فنون' میں جگہ دے کر حسنِ ظن کا موقع گنوا لیا ہے۔ جو بصورتِ دیگر ان سے رکھا جا سکتا تھا:

خرقہ پوشاں ہمہ سرمست گزشتند و گزشت قصۂ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند

میں نہیں کہہ سکتا کہ میرا مضمون مطلوبہ سطح پر ردِ عمل کی کمی اور سنجیدہ مکالمے کی ضرورت پوری کرتا ہے یا نہیں لیکن مجھے جو خیال رہ رہ کر آتا ہے، یہ ہے کہ مستقبل میں ہماری زندگی اور موت کا سوال جس مسئلے سے وابستہ ہے، کیا اس کا جو حل ہمارے بزرگ تجویز کرتے ہیں، اس سے اختلاف جرم تھا جو مجھ سے سرزد ہو گیا ہے؟ کیا مجھ ایسے لوگوں کے لئے جن کی بے شرتی اپنے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیوں کا جواز فراہم کرتی ہے کسی بھی رسالے کے صفحات میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیئے؟ کیا کسی رسالے کا مدیر اس طرح کی بحثوں کے لئے اپنے رسالے کے صفحات مختص کر کے ادبی تقصِ امن کا مرتکب ہوتا ہے؟ کیا مکارمِ اخلاق کی یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ ہم خود اپنے بارے میں اپنے بزرگوں کے فیصلوں سے اختلاف کے لئے اُن کی اور اُن کے ہم خیالوں کی موت کا انتظار کریں اور اگر انتظار طویل ہو جائے تو ان کی موت کی دعائیں مانگنے لگیں،

ترسم کہ دہد نالہ جگر را بدریدن قطع نظر از جیب بدوزید لبم را

مدیرِ فنون" کا قصور علاوہ اس کے اور کیا ہے کہ انھوں نے بزرگ نسل سے تعلق رکھنے کے باوصف نئی نسلوں کو بزرگ نسل سے اختلاف کا حوصلہ، اعتماد، موقع اور سہولت فراہم کی ہے۔ ہمارے بزرگوں کے لئے مدیرِ فنون کا یہ مقام باعثِ رشک تو ہو سکتا ہے جائے طعن نہیں۔ میں بزرگ نسل سے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ نئی نسلیں انسانی دماغ کو قدرت کی غلط بخشی نہیں سمجھتیں، عطیۂ الٰہی خیال کرتی ہیں اور اس سے کام لینا چاہتی ہیں۔ نھیں اپنا مستقبل اتنا ہی عزیز ہے جتنا آپ کو اپنا مستقبل عزیز تھا۔ آپ کا مستقبل جو اب آپ کے حال میں تبدیل ہو چکا ہے، اگر واقعی قابلِ فخر اور طمانیت کا باعث ہے تو مبارک باشد۔ نئی نسل کو اتنا موقع تو دیجئے کہ وہ اپنے مستقبل پر غور کرنے کی عادت ڈالیں کہ ان کے لئے اپنی جو نشانیاں آپ چھوڑے جا رہے ہیں چند جذباتی نعروں سے سوا نہیں۔ اس سیاہ آگ سے حرارت تو مل سکتی ہے روشنی نہیں مل سکتی۔ گستاخی کر رہا ہوں۔ گناہ کا مرتکب ہوں اور سزا کا منتظر:

تیغت زفرق تا بہ گلویم رسیدہ باد	شوخی زحد گزشت زبانم بریدہ باد

روایت اور جدیدیت کے سلسلے میں جو اعتراضات آغا ناصر صاحب نے وارد کئے ہیں۔ ان کی بنیاد موصوف نے اپنے اس مفروضے پر کھڑی کی ہے کہ "محمد ارشاد صاحب نے خود یہ تحریر کیا ہے کہ عسکری صاحب نے اس کتاب کے ذریعے مغرب کے الحاد، دہریت، سیکولرازم اور غیر روحانی سفر کی نشاندہی کی ہے اور اسی بنیاد پر مغرب کو مسترد کرنے کی کوشش کی ہے"۔ موصوف نے جو گناہ مجھ سے منسوب کیا ہے مجھ سے قطعاً سرزد نہیں ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے جو نتائج بھی اخذ کیے ہیں اسی مفروضے سے اخذ کئے ہیں۔ آگے چل کر انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ سیکولرازم کو سیکولم سے ملا کر جو نکتہ میں نے پیدا کیا ہے 'فریبِ نظر' کے سوا کچھ نہیں ہے کیونکہ دنیا سیکولرازم کے وہی معنی سمجھتی ہے جس کی طرف عسکری صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ موصوف نے 'دنیا' کی طرف سے جو دعویٰ قائم کیا ہے اس پر دلیل پیش نہیں کی۔ 'دنیا' تو گئے کو بھی خدا سمجھتی ہے حالانکہ گائے نے کبھی خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ میں نے سیکولرازم کے سلسلے میں غزالی کو حوالہ بناتے ہوئے 'دنیا' کو فریبِ نظر سے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ موصوف نے میری دلیل اور حوالے سے قطع نظر کر لیا اور الفارابی، ابن سینا، خیام اور ابنِ رشد کے بارے میں اشاعت یافتہ تعصبات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میری بات کی تردید کی کوشش کی۔ پھر الفارابی، بوعلی سینا، خیام، البیرونی اور ابنِ رشد کو موصوف کیا سمجھتے ہیں۔ کیا یہ لوگ مسلمان نہیں تھے۔ اہلِ مغرب نے مسلمانوں سے اگر کچھ سیکھا ہے تو انہی فتویٰ گزیدہ مسلمانوں سے سیکھا ہے۔ اگر میں مغربی تہذیب کے سلسلے میں انھیں حوالہ نہ بناتا تو کیا حافظ سخاوی اور ابن حجر عسقلانی کو حوالہ بناتا جن سے اہلِ مغرب نے کچھ نہیں سیکھا اور جو ابن خلدون کے مقدمۂ تاریخ کے بے مثال اور لازوال کارنامے سے انصاف تک نہ کر سکے تھے۔

معلوم نہیں 'دنیا' سے موصوف کی مراد کیا ہے۔ اگر اس میں اہلِ مغرب بھی شامل ہیں تو واضح ہو کہ اہلِ مغرب سیکولرازم کی اصطلاح کا مطلب وہ نہیں سمجھتے جو ہمارے نام نہاد مغرب شناس ہمیں باور کرانے پر مصر ہیں۔ یورپ میں یہ اصطلاح سب سے پہلے مذہبی حلقوں میں استعمال ہوئی۔ مذہبی پیشواؤں کا جو طبقہ رہبانیت سے تعلق رکھتا تھا MONASTIC CLERGY کہلواتا تھا۔ مونک، ایبٹ، ڈیکن اور آرچ ڈیکن کی اصطلاحیں انہی لوگوں کی حیثیت اور مقام ظاہر کرتی ہیں۔ یہ لوگ دنیا اور کارِ دنیا سے علاقہ نہ رکھتے تھے۔ مذہبی پیشواؤں کا دوسرا طبقہ جو پیرش پریسٹ، پریسٹ، بشپ اور آرچ بشپ پر مشتمل تھا SECULAR CLERGY کہلاتا تھا۔ یہ لوگ دنیاوی امور سرانجام دیتے تھے۔ پوپ ہر دو اقسام کی CLERGY کا سربراہ تھا۔ غزالی نے فقہا اور متکلمین کو علمائے دنیا محسوب کیا اور اہلِ خانقاہ کو علمائے دین شمار کیا۔ غزالی کے نزدیک دین امورِ آخرت پر مشتمل ہے۔ موصوف اگر غور کریں تو ان پر یہ بات واضح ہو جائے گی

کہ اہلِ مغرب جب غزالی کی تعلیمات سے آشنا ہوئے تو غزالی کے قائم کردہ مقولات یعنی دینی اور دنیاوی کا اطلاق اپنے حالات و معاملات پر اس طرح کیا جس کا ذکر اوپر گزرا ہے۔ موصوف نے 'دنیاوی' کہنے میں آ کر سیکولرازم کے مفہوم میں الحاد اور دہریت کا مفہوم بھی شامل کر لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں سیکولرازم کے اس مفہوم کو سرے سے درست ماننے کے لئے ہی تیار نہیں بلکہ لاعلمی اور کم فہمی کا نتیجہ خیال کرتا ہوں اس لئے موصوف کا یہ کہنا کہ "عسکری صاحب نے جو تجزیہ کیا ہے ارشاد صاحب کی تعلیمات عین اس کے مطابق نکلتی ہیں یعنی وہ اسلام کو دہریت، الحاد اور سیکولرازم کی اگلی منزل پر پہنچا دیتے ہیں"۔ ایک ایسا اعتراض ہے جس کی بنیاد میرے مضمون سے فراہم نہیں ہوئی۔ اس لئے میرا موقف اس کا مورد نہیں بنتا۔

میرا یہ مکتوب سیکولرازم کے بارے میں طویل گفتگو کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے سیکولرازم کے مفہوم کی وضاحت ایک تاریخی لطیفے سے پیش کرنے پر اکتفا کروں گا کہ:

نیست رخصتِ گفتار، جز بقدرِ عقول

برٹرینڈ رسل نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ازمنہ تاریک میں ایک مرتبہ مذہبی پیشواؤں کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا کہ گھوڑے کے منہ میں کل کتنے دانت ہوتے ہیں۔ مذہبی پیشواؤں نے اس سوال کے جواب کے لئے ایک کونسل منعقد کی جس میں دور دور سے عالم و فاضل پادری بلوائے گئے جو اپنے ساتھ حوالوں کی غرض سے الہامی اور غیر الہامی مذہبی کتابیں بھی لائے تھے۔ کئی دن کے بحث و مباحثے اور ورق گردانی کے باوصف جب یہ سوال جواب طلب ہی رہا تو شومیٔ قسمت سے مجلس میں موجود ایک منطقی یہ کہہ بیٹھا کہ گھوڑے کے دانتوں کی تعداد کے بارے میں سب سے زیادہ مستند حوالہ خود گھوڑے کا منہ ہے۔ کتابیں کھول کر دیکھنے کی بجائے کیوں نہ گھوڑے کا منہ کھول کر اس کے دانت گن لئے جائیں۔ یہ سن کر تمام حاضرین منطقی پر ٹوٹ پڑے کہ اس نے دین کی کاملیت سے انکار کیا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ جس خدا نے گھوڑا پیدا کیا ہے اس کے دانتوں کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر ہو۔

سیکولرازم علاوہ اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ جب آپ گھوڑے کے دانت گننا چاہیں تو مذہبی کتابیں کھولنے اور ان کے اوراق شمار کرنے کی بجائے گھوڑے کا منہ کھول کر اس کے دانت شمار کر لیا کریں۔ ایسا کرنا نہ الحاد ہے، نہ دہریت چاہے مسیحی پادری اسے الحاد اور دہریت ہی کیوں نہ سمجھیں۔ گھوڑے کا منہ کھول کر دانت گننے سے اسلام کی روحانیت اور حقانیت پر کوئی آنچ نہیں آتی ـــــ یا آتی ہے؟

موصوف نے اپنے مراسلے کے آخر میں اپنے اُستاد صاحب کے حوالے سے "وقت کی راگنی" کو عسکری صاحب کی فکری ذمہ داری کا سب سے بڑا مظہر گردانتے ہوئے مجھ پر ایک اور بے بنیاد الزام لگایا ہے کہ میں اس کتاب کو بالکل نظر انداز کر گیا۔ میرے مضمون میں 'وقت کی راگنی' میں شامل محمد حسن عسکری کے ایک مضمون 'روایت کیا ہے' سے حوالہ موجود ہے۔ فکری ذمہ داری کے سب سے بڑے مظہر کو کس نے نظر انداز کیا ہے اس کا فیصلہ خود انہی پر چھوڑتے ہوئے میں ان سے یہ پوچھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کیا 'وقت کی راگنی' میں روایت اور جدیدیت کے بارے میں عسکری صاحب کا موقف اس مقدمے کے مطابق ہے جو موصوف کی دانست میں اور ان کے بقول میں نے قائم کیا ہے اور جس کے بنیادی خطوط سے موصوف نے اتفاق کا اعلان بھی فرمایا ہے۔ اگر نہیں (اور یقیناً نہیں) تو مراسلہ لکھنے سے پہلے انہیں اس مضحکہ خیزی کا پورا اندازہ کر لینا چاہیئے تھا کہ موصوف میری تحریر کی نہیں خود اپنی تحریر کی تردید کر رہے ہیں:

گرہ کیسی لگی تھی، کھل پڑے کس راہ میں فتنے
نظر آتا ہے خالی مجھکو گوشہ تیرے داماں کا

میرے مضمون کی اشاعت کے بعد عسکری مرحوم کے عقیدت مندوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ عسکری صاحب کی 'جدیدیت'

دینی مدرسوں کے مولوی صاحبان کے لیے لکھی گئی ہے تاکہ وہ مغربی فکر کی بنیادی خامیوں سے آگاہ ہو جائیں اور جب مغرب کے خلاف بات کریں تو ان کی بات میں کچھ وزن بھی پیدا ہو جائے لیکن :

آشنا را حال این است وائے بر بیگانہ

یہ قطع نظر وہی ، وضاحت کریں کہ مولوی صاحبان مغربی فکر کے بارے میں عسکری صاحب کے چند چلتے پھرتے جملے پڑھ کر اپنی بات میں کس طرح وزن پیدا کر سکتے تھے جبکہ صورت حال یہ ہے کہ خود عسکری صاحب کے بہت پڑھے لکھے عقیدت مند بھی اس ابتدائی خاکے" اور "آسان ہدف" کے فہم و عبور سے قاصر ہیں۔ کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ عسکری صاحب کے اس جملے — "لفظ 'اصول' کا دینی مطلب نہ سمجھنا اور ہر اچھے یا برے نظریے کو اصول کا نام دینا (گمراہی) — میں 'اصول' کے دینی مطلب سے رینے گینوں یا عسکری مرحوم کی مراد کیا ہے۔ عسکری مرحوم کے عقیدت مندوں میں کون ایسا ہے جو 'اصول' کے اس مفہوم سے واقف ہے جو رینے گینوں نے بیان کیا ہے۔

فکری ذمہ داری کے سب سے بڑے مظہر میں عسکری صاحب سے جو لغزشیں صوفیائے کرام بالخصوص ابن عربی کے معاملے میں ہوئی ہیں، میں ان کا ذکر کسی دوسرے موقع پر اٹھا رکھتا ہوں :

قصۂ درد جدائیہا جدا خواہم نوشت

اس موقعے پر میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آج کا مغرب گمراہ نہ ہوتا اور مغرب بدستور کیتھولک مسیحیت کے پردے پڑے رہتے تو آج قرون تاریک کے 'اہل حق' کی 'گمراہ' اولاد کے لاتعداد افراد مسیحیت ترک کر کے اسلام کے حلقہ بگوش کبھی نہ ہوتے۔ آج مغرب کا کوئی اہم شہر ایسا نہیں جہاں مسلمان موجود نہ ہوں۔ فرانس جیسے کیتھولک مذہب کے گڑھ ملک میں اسلام بڑا دوسرا مذہب ہے۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد پروٹسٹنٹ عیسائیوں سے زیادہ ہے۔ قرون وسطیٰ کا 'حق پرست' مغرب کسی مسلمان کا وجود تک برداشت کرنے کا روادار نہ تھا۔ موجودہ صورت حال کا سارا کریڈٹ جدیدیین، انسیین اور عقلیت پسندوں کو جاتا ہے۔ عسکری صاحب کہتے ہیں کہ جدیدیین، انسیین اور عقلیت پسندوں نے مغرب کو گمراہی کے راستے پر ڈال دیا ہے :

ببیں کرامت بت خانۂ مرا اے شیخ
کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

محمد ارشاد (ہری پور ہزارہ)

ادب ہی کیا زندگی کے کسی بھی شعبہ میں اختلاف کی اہمیت سے مفر ممکن نہیں اور اختلاف کو دشمنی سمجھنا تو سراسر کج فہمی ہے لیکن کوئٹہ کے آغا محمد ناصر صاحب کے جناب ارشاد کے بارے میں ارشادات محل نظر ہیں کہ :

(i) اتنا جانتا ہوں کہ محمد ارشاد صاحب کی یہ تحریر بڑی مایوس کن ہے اور اُنھوں نے جو نقش بنایا تھا اُس کو بگاڑنے میں عسکری دشمنی نے ان کو اتنی جلدی ایکسپوز کرا دیا۔

(ii) ایک دینی مدرسے کے لیے مغربی فکر کے ایک ابتدائی خاکے کو ایک آسان ہدف سمجھ لیتے ہیں لیکن وہ آسان ہدف ایسا تھا کہ محمد ارشاد صاحب کو ایکسپوز کر گیا۔

جناب ارشاد صاحب کا مذکورہ مضمون کتنا مایوس کن تھا اور انھیں کتنا ایکسپوز کر گیا یہ تو بھی احباب جانتے ہیں لیکن زیر نظر مراسلہ ناصر صاحب کو ضرور ایکسپوز کر گیا۔ موصوف کی مذکورہ تحریر کے بطون میں "کمپلکس" لہریئے لے رہا ہے۔ اس کے علاوہ آغا صاحب اپنے استادِ محترم کے حوالے سے کہتے ہیں کہ — "جدیدیت والی کتاب نہ تو چھپنے کے لیے لکھی گئی اور نہ اُس کو عسکری کی فکر کا نکتہ قرار دیا جا سکتا

ہے"۔۔۔۔۔ محترم مدیر! جب ایک کتاب چھپ چکی (غیر مطبوعہ بھی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں) تو اس پر لکھنے میں حرج؟ ۔۔۔ یہ کیا ہوا کہ فلاں کتاب پر لکھا جائے اور فلاں پر نہیں ۔۔۔۔۔۔ یہ حد بندی کیوں؟

آپ نے "فنون" کی کسی گزشتہ اشاعت میں غیر سنجیدہ روش اختیار کرنے والوں کو سرزنش کی تھی تو ہم مطمئن تھے کہ یہ حضرات ذرا سنجیدہ ہو جائیں گے لیکن جمعہ ۵ اکتوبر ۱۹۸۲ء کا "سخن در سخن" پڑھ کر انتہائی دکھ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ بعض جملہ باز حضرات! ادب پر رحم نہیں کر سکتے؟ اور اس گئے گزرے دور میں بھی کچھ لوگ علم و ادب کی بات کرتے ہیں، انہیں معاف نہیں کر سکتے۔ بہتر تو یہی ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے لیکن کہاں تک! میں کچھ تازہ ترین شوشے نقل کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

(i) امجد کے کلام کا جو مزاج ہے اُس کے پیش نظر اشتہار میں کتابت کی غلطی کا احساس ہوتا ہے کہیں ایسا تو نہیں کاتب نے "خلفشار" کو فشار لکھ دیا ہو ۔۔۔؟

(ii) حسب معمول اس شمارے میں وہ مشہور اشتہار بھی شامل ہے جس میں اختر حسین جعفری کو مسلّمہ طور پر دورِ حاضر کا سب سے بڑا نظم گو بتایا گیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اگر آئندہ یہ اشتہار اس طرح شائع کیا جائے "مبینہ طور پر دورِ حاضر کا سب سے بڑا نظم گو"

(iii) "فنون" میں دو مقالے بڑے معرکے کے ہیں۔ ایک مقالہ تو انہیں محمد ارشاد کا ہے جن سے کسی پسندیدہ موضوع پر لکھوایا جاتا ہے۔

محترم مدیر کیا ہمارے پاس کہنے کے لئے یہی کچھ رہ گیا ہے ۔۔۔! اگر ایسا ہی ہے تو فکر کا یہ بنجر پن ہمیں کہاں لے جائے گا ۔۔۔۔ مندرجہ صورتِ حال اور "ادبی مفتیوں" کے رویوں کے پیش نظر اب تو یہ ڈر ہے کہ کہیں ہمارے ہاں بھی کوئی مارٹن لوتھر جنم نہ لے لے، پھر کوئی باقاعدہ INDEX نہ شائع ہونے لگے۔ پھر "قرطبہ" اور "غرناطہ" میں جا کر علم حاصل کرنا کفر نہ ٹھہرے ۔۔۔ خدا ہمارے حال پر رحم کرے

"موتیین، انشائیہ اور انشائیہ نگار" میں جناب محمد ارشاد نے ESSAY کے بارے میں جو کنفیوژن (ہمارے نقادوں کی وجہ سے) ایک عرصہ سے چلا آتا تھا خوش اسلوبی سے دور کرنے کے ساتھ پرسنل ایسے اور ہمارے ہاں "مروجہ" ایسے کی پوزیشن کو انصاف اور سلیقے سے واضح کیا ہے۔

احمد لطیف (جہلم)

خالد احمد نے بین السطور میں "زمین کا اولین مکتوب" ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ اس کی تراش خراش سے وہ اتنا متاثر ہے کہ اس نے اختر حسین جعفری کی "استدلالی" شاعرانہ و ناقدانہ صلاحیتوں کے "اوراق" کو بڑے شیریں انداز بیان سے سچائیوں کی کسی متوقع سریع الابلاغ کتاب کا حصہ بتایا ہے۔ وہ کتاب! جس سے دماغی آفاق کی اجتماعی وسعتوں میں لامحدود ذاتی امکانات درجہ بند ہوں۔ بیان کی یہ شیرینی اور رموز و نیت متحد الاصل طبعی میلانات اور فکری اسباب کا نتیجہ ہیں۔ مطلق سچائیوں سے ثانوی کی طرف "آمد و رفت" دائرے کا سفر نہیں اصل میں یہ مبہم پیرائے میں سلیقے سے مسائل نمٹانے کا ذہنی اور تحریکی رجحان ہے جہاں میرے ایسے حاملین عجز تصور کی رسائی آسانی سے نہیں ہو سکتی۔ مطلق سچائی اور پھر قوتِ نامیہ کے "لامحدود ذاتی امکان" کا تصور چرائے چھپائے چاند سے بدن کی "خوش اوقاتی" کی معدوم جھلک کی طرح ہے۔ اس تناظر میری "سخن فہم کم نظری" کے مواقع کی تعداد کسرات سے آگے نہیں بڑھتی۔ اختر حسین جعفری کا شعر، شعری نثر پارہ اسی "اعزاز حکم" کا مستحق ہے۔ جو خالد احمد نے بین السطور میں لفظوں کے موتیوں کی جھالروں سے ترتیب دیا ہے۔

"ذہنی توفیق" کے اسی تناظر میں محمد ارشاد کا مضمون "روایت اور جدیدیت" بھی کئی اختلافی اور اعتباری ابعاد رکھتا ہے۔ اب کے اختلافات میں اس مضمون پر بہت کچھ کہا سنا گیا ہے میں کسی ہواؤں میں نہیں مجھے اپنی معلوماتی بے یقینی کا "کھلے بندوں" اعتراف ہے۔

میں شاید بڑے بڑے ثقیل حوالوں سے اپنا یہ نقص چھپانے میں ناکام ہی رہوں۔ زبان کو یارائے تکلم نہ سہی تاہم عرض کرتا ہوں کہ محمد ارشاد کا مضمون پایۂ اعتبار کے بھرپور تقاضوں کا حامل ہے۔ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے اور پھر اس سے جتنا اختلاف کیا جائے کم ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ لہجے میں تذبذب فی الرائے قطعی نہیں۔ سید علی عباس جلالپوری کا سا محکم لہجہ ہے یہاں۔ یہ ادائی ایک عمیق مطالعے کے بعد سوچ کی درست سمتوں سے ہاتھ آتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس مضمون نے محمد حسن عسکری کی ادبی حیثیت کی ان دو دو قعتوں کی نشاندہی کی ہے جو "حمایت" کے بجائے اختلاف کے راستے سے سامنے آتی ہیں۔ عسکری کی اختراعی جرائت اور جدت سے انکار کیسے؟ اس کی تحریریں من حیث الفن اسے اختصاصی حیثیت کا تمول دیتی ہیں۔ اردو ادب کی خوش نصیبی ہے کہ اسے عسکری کا سا باتھ کا سچا اہل قلم میسر آیا جس نے اپنے تبحر علمی کو جدت اور روایت کے من پسند مفروضوں سے تنقید کی گودھری کہنے کے لئے استعمال نہیں کیا بلکہ وقعت نظر سے تنقیدی زاویوں کو مختلف النوع کیا ہے۔ میں اس بحث میں اتنا نہیں پڑوں گا کہ کسی کو بے ساختہ یہ محاورہ یاد آ جائے "کبھو آم سنے املی"۔ یار دو قبول کے سلسلے چڑیا کا دودھ مہیا کرنے کے مصداق خالی خولی نظر آنے لگیں۔ بہر صورت میرے دل میں ایک سوال کسک بن کر مزور سر اٹھاتا ہے کہ کیا ہماری تنقید ماننے اور نہ ماننے کے دور از فہم بہروپ ہی میں رہے گی یا پرکھ کے اثباتی روپ میں بھی دیکھی جائے گی۔ تنقید کو ACCEPT اور REJECT کے امکانات اور خدشات کا "حوالہ جاتی" پیٹرن اختیار کرنا چاہیے۔ اسے تنقید کی ثبت اور صحت مند قدروں کے فروغ کا ذریعہ بننا چاہیے۔ اسے تلقینی تحکم کا "فرمان" نہیں ہونا چاہیے کہ دیکھو تو خوف آئے۔ اسے تو مشفق تدریسِ ذوق کا دستور ہونا چاہیے۔ نقد محض ترجیحی یا غیر ترجیحی تعصبات کا آئینہ نہ ہو بلکہ اس میں تربیتی پیرائے بھی تہذیب کئے جائیں۔ اعلیٰ درجے کی تنقید تعلیم کرنے کی مساعی کی شدید کمی محسوس ہوتی ہے اگرچہ چند کوششیں موجود بھی ہوں تو ان میں پیٹرن چغلی کھاتا معلوم ہوتا ہے کہ قاری کو تلطف کے بجائے ذہنی پستی اور جہالت کا بندہ سمجھ کر ROUGH TREATMENT کا سزاوار گردانا جا رہا ہے۔ تنقید کے معیارات میں کہنے اور سننے والے کے باہمی رشتے کا استحکام بھی باقاعدہ شامل ہے۔ یہاں فلسفے کی گہرائی کی بالواسطہ موشگافیوں کے ساتھ ساتھ انشائی سطحوں کی بلاواسطہ گفتگوؤں کا عمل بھی ہوتا کہ دیدہ و دل "فرش راہ" ہوں۔ حال یہ ہے کہ جسے دیکھو فلسفی ہو رہا ہے۔ یہ ہانڈی ایسی چڑھی ہے کہ بگھار پر بگھار آتے جاتے ہیں اترتی ہی نہیں۔ ہر تحریر، ہر تقریر بشمول اس کے گہرائیوں میں غوطے کھا رہی ہے۔ اور تو اور ٹی وی ڈراموں میں بھی چھوٹا بڑا ہر کردار سقراطیاں بقراطیاں بولے چلا جاتا ہے۔ غرض ساری قوم کو فلسفہ لاحق ہے۔

اختلافات مزے کے تھے۔ صوفی عبدالرشید کا خط خاصا دلچسپ ہے۔ خاص طور پر وہ حصہ جب وہ رت جگے کے بعد صبح کی سیر کو نکلتے ہیں۔ ظاہر ہے سماں سہانا ہی ہو گا۔ اور مناظر کا ذکر تو مقصود نہیں۔ ہاں ٹریکٹر چلنے کی خبر پر چونکا ضرور ہوں۔ حادثوں کا زمانہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ صوفی صاحب کسی ٹریکٹر کی زد میں نہیں آ گئے جلدی میں۔ ورنہ اتنا خوبصورت اختلافاتی خط پڑھنے کو کہاں ملتا۔ جابر علی سید اور صوفی عبدالرشید چھری کٹاری ہو رہے ہیں۔ دونوں بڑے ادیب ہیں۔ یہ ٹکراؤ ٹھیک نہیں۔ دراصل عروض کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ جہاں کہیں سے "سیدھا" دیکھو "ٹیڑھا" نکل ہی آتی ہے۔ بہر طور صوفی صاحب اور سید صاحب کا دم ہمارے لئے غنیمت ہے۔

محمد ارشاد کا مضمون "مونتین، انشائیہ اور انشائیہ نگار" دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ اس ضمن میں اپنی بساط کے مطابق میں بھی کچھ لکھ ڈالوں۔ انشائیہ وہ صنف نثر ہے جو موضوع اور سٹائل کے ذاتی فکری تعینات میں اظہار کی اجتماعی لطافت بھی رکھتی ہے۔ سالت یہ مضمون کی حد بندیوں سے خارج نہ سہی مگر یہ صنف سٹائل کے زبردست "وقوع" کی طلب گار بھی ہے۔ مونتین کے ایسے یا پرسنل ایسے سے بحث سے فکر کی گرہیں تو کھلتی ہیں مگر یہ خیال کہ اردو انشائیہ چند استثنائی حیثیات کے ساتھ ساتھ کچھ تہذیبی اور روایتی

افتاد بھی رکھتا ہے، ور خور اعتنا ہے۔ اصطلاحِ انشائیہ کے پسِ منظر میں جو جذباتی لوازم موجود ہیں ہماری تاریخ ادب کے مروجات سے قطع نظر نہیں کرتے۔ میں تو کہوں گا ان کے باہمی روابط پائدار ہیں۔ محمد ارشاد کا مقالہ فکری اعتقادات کی ترویج کا ذریعہ تو بنتا ہے لیکن معاف کیجئے انشائیہ کا مسئلہ پہلے سے زیادہ غور طلب ہوا جاتا ہے۔ ابوالکلام آزاد کی کتاب "غبار خاطر" کے "اظہارات" کو انشائیے کہنے میں کوئی مضائقہ نہ ہوتا اگر پہلے ان کے سٹائل پر بات ہو جاتی۔ ہو سکتا ہے کچھ اہل نقدان تحریروں کے "قرینوں" کو انشائیے کے "محسوساتی" سٹائل سے الگ سمجھتے ہوں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقیدی دانائیاں "شاعری کا ابتدائی سبق" کی وساطت سے بہت متاثر کرتی ہیں۔ فکر و دانش کا یہ مضمون پہلے نہیں دیکھا۔ "فنون" کے اس "تازہ کار" نے غنچۂ خاطر شگفتہ کیا ہے۔ واقعی اس میں صحت مند اور مثبت بحث کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ ..... اور کچھ ظاہر بھی۔ "ابہام توضیح سے بہتر ہے" کا مطلب میرے نزدیک یہ ہے کہ ایمائیت کا جوہر STATEMENT سے بہتر ہے۔ ان دو رنگوں میں فراق واضح ہے سٹیٹ منٹ سے شعر اس حد تک سائنٹیفک ہو جاتا ہے کہ علامتوں کے ارتباط اور رعایات کا فارمولا دکھائی دینے لگتا ہے۔ ابہام کی تشریحات کچھ اس نہج پر ہوتی آئی ہیں کہ یہ لفظ شجر ممنوعہ ہو کر رہ گیا ہے اور مردود بھی۔ ورنہ اس میں بھی کتنے ہی پوشیدہ امکانات موجود ہیں جو مثبت بحث کے دروازے کھول سکتے ہیں۔

تازہ "فنون" بہت پسند آیا بحسب سابق !! بہت سے دوسرے دوستوں کے ساتھ صیغۂ شعر میں ریاض ساغر، ارشد شاکر یحییٰ خالد کو اور "اختلافات" میں صوفی عبدالرشید اور صدیق منظر کو دیکھ کر بے پایاں مسرت ہوئی۔ خدا آپ کو بے حد خوش رکھے۔

آصف ثاقب (بوئی۔ ہزارہ)

آپ نے ہزارہ کے شعراء اور ادبا کو "فنون" میں جگہ دی۔ یہاں لوگ بہت خوش ہوئے ہیں۔ محمد ارشاد "فنون" کی دریافت ہے۔ بڑا زبردست آدمی ہے یہ شخص۔ اتنی کتابیں اس نے اپنے اندر انڈیل رکھی ہیں کہ اس کالے کنوئیں میں کتنی ہی روشنائی بھر گئی ہے شکر ہے کہ کچھ کچھ روشنائی اس کے قلم سے پھوٹنے لگی ہے۔ محمد ارشاد سے بہتوں کو الرجی ہو گئی ہے۔ اصل میں یہ لوگ برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی "دیہاتی" یا "کوہستانی" اتنا نام کمائے۔ اتنی عقل کی باتیں کرے۔ عقل کے نام پر حماقتیں کرنا بھی تو ایک فن ہے۔ سو وہ انہیں مبارک جن کو محمد ارشاد منصور کے پردے میں خدا نظر آتا ہے۔ چلئے کسی بہانے سے خدا تو یاد آیا۔

آصف ثاقب (ایبٹ آباد)

محمد ارشاد

'فنون' ایک ادبی مجلہ ہے۔ اب اس میں ہم مشتری ہوشیار باش کے اشتہار یا نوٹس تو چھپوانے سے رہے۔ لیکن اب یہ کہنے میں حق بجانب تو ہیں محمد ارشاد نے ادبی برہمنیت کے نام نہاد بتوں کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا ہے۔ یہاں لفظ بھی احتیاط سے لکھے جا رہے ہیں وہاں صداقتیں بھی جھٹلائی جا رہی ہیں۔

اس سے پہلے شمارے میں جو خط میں نے لکھا تھا کم از کم اس کی تصدیق تو ہو گئی کہ محمد ارشاد واقعی گورنمنٹ کالج ہری پور میں شعبۂ فلسفہ کے لیکچرار ہیں۔ میرے زیر نظر ۲۲ نومبر ۱۹۸۲ء کے روزنامہ "نوائے وقت" کے ادبی صفحہ کی وہ خبر ہے جس میں اس بات کی تردید کی گئی ہے کہ محمد ارشاد نام کی کوئی چیز ہری پور میں نہیں ہے۔

ہم اس کی آنکھ میں ذرے سے بھی حقیر سہی — پر اس کے دل میں کھٹکتے ہیں آسمان کی طرح

میری رائے میں پاکستان کا ادیب و دانشور تو کیا عام باشعور پاکستانی بھی انتہائی پسماندہ علاقے میں شعر و ادب کے حوالے سے

کم از "فنون" ضرور پڑھتا ہے اور خصوصاً لاہور اور کراچی میں تو ادبی مناظرہ بازی عروج پر رہتی ہے۔ "فنون" کے گذشتہ شمارے میں محمد ارشاد کا تعارف اسی لئے کروایا تھا۔ مگر شاید انھیں یہ بات نہ بھائی ہو کہ وہاں ذکر جناب سید علی عباس جلالپوری کے حوالے سے ہوا تھا یہ بات اگر کہنا چاہتے تو جناب سید علی عباس جلالپوری کہتے کہ میں ایک گمنام اور غیر معروف آدمی کے مضمون کے حوالے سے ایک انتہائی اہم موضوع پر لکھنا نہیں چاہتا۔ مگر کیونکہ وہ علی عباس تھے۔ عالم تھے، علم پرست تھے شخصیت پرست اور نام نہاد ادبی برہمن نہ تھے۔ انھوں نے خندہ پیشانی سے اپنے اوپر اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب دیا۔ لیکن یہ نہیں کہا کہ شناختی کارڈ دکھاؤ۔ اپنی ڈگری لاؤ۔ کالج کا نام بتاؤ اور یہ بھی بتاؤ کہ کون کون سی کلاس میں کتنی دفعہ فیل ہوئے۔ دلیل کا جواب بہ دلیل دیا گیا اور یہی وتیرہ عالموں کو زیب دیتا ہے اخباروں میں گالیاں دینا اور کسی کی ذاتی حیثیت سے منکر ہونا ہی تو بے ادب اور بے رہرو ہونے کی علامت ہے۔

دراصل قاسمی صاحب کو یہ چاہیئے تھا کہ وہ پہلے اخبار میں اشتہار دیتے کہ ایک شخص محمد ارشاد نام بتاتا ہے۔ فلسفے پر بات کرنا چاہتا ہے۔ کسی کا ہے تو آ کر لے جائیں۔ یا اگر کسی کو اعتراض نہ ہو تو اس کا مضمون چھاپ دوں۔ کسی کی ذات کو جھٹلایا جا سکتا ہے مگر جو بات کہی جاتی ہے یا جو بھی نکتہ اٹھایا جاتا ہے، چاہے وہ کسی طرف سے بھی ہو اُس کا جواب دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ کسی کی بات کا جواب دینے کے بجائے یہ کہا جائے کہ پہلے شہرت کا سرٹیفکیٹ لاؤ یا کسی بھی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا لائسنس پیش کرو۔

کیا میں محمد ارشاد کے بارے میں اس طرح کی باتیں لکھنے والوں سے پوچھ سکتا ہوں کہ جب وہ تشریف لائے تو کیا اس دارِ فانی میں سندِ تشہیر لے کر پیدا ہوئے تھے۔ یا اس دنیا کے رہنے والوں نے انھیں پہچانا۔ اور پہچان کے بھی تو کئی پیمانے ہوتے ہیں کیا ہر پیدا ہونے والا بچہ منہ میں ادیب، دانشور، سیاسی لیڈر یا شاعری کا پرمٹ لئے ہوتا ہے کہ لو جی میں آگیا ہوں، اور میں پاکستان کا مشہور شاعر ہوں، میں ممتاز صحافی بھی ہوں۔ جب بڑا ہو چکوں گا تو کسی دوسرے کو مشہور نہیں ہونے دوں گا۔ میرے بعد جہالت ہی جہالت ہو گی۔ میرے بعد ارسطو یا افلاطون نام کی کوئی شے نہ ہو گی۔ لاکھ علی عباس پیدا ہوں گے۔ لاکھوں محمد ارشاد آئیں گے۔ مگر لوگو، سن لو کہ محمد ارشاد، محمد ارشاد نہ ہو گا اور علی عباس، علی عباس نہ ہو گا بلکہ علم و ادب کے خلاف پس پردہ کوئی سازش ہو گی۔

علم ڈگریوں اور گالیوں کا نام نہیں۔ یہ نسل انسانی پر گذرنے والے واقعات و مشاہدات کی مسلسل ترسیل کا نام ہے کسی کی جاگیر و میراث نہیں بلکہ انسان کے آباؤ اجداد کی مقدس امانت ہے۔ جو تاریخ کی طرح آگے بڑھتی ہے۔ حسین وجمیل ہستیوں کی وجہ سے علم ایک عام اور جاہل آدمی تک پہنچتا ہے۔ نکھرتا ہے اور انسانی رشتوں کو اٹوٹ کرتا ہے۔ علم محبت کا نام ہے اور جہالت کے خلاف ایک مقدس جنگ ہے۔ علم کے وسیلوں اور واسطوں کو مطعون کرنا ایسا ہی ہے جیسا کوئی جاہل اپنے ہمراہیوں کو لے کر نفرت اور شر کے گہرے غاروں کی طرف جا رہا ہو۔

ابھی تو محمد ارشاد صاحب کا تعارف کرایا جا رہا ہے مگر ہمیں یقین ہے کہ کل یہ بھی کہا جائے گا کہ صدیق منظر کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ "فنون" رسالے کا لاہور میں کوئی وجود ہی نہیں۔ اگر ہے تو اُسے کوئی پڑھتا ہی نہیں۔ اور اگر پڑھتا بھی ہے تو کان ہی نہیں دھرتا۔ اور اگر کان دھرتا بھی ہے تو کچھ پلے پڑتا ہی نہیں۔ اور یہ ہے بھی ٹھیک کہ پلہ ہی نہیں تو وہ بھاری کیا ہو گا اور اُس میں پڑے گا کیا۔

پھر یوں ہو گا کہ ندیم قاسمی کون ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ ندیم قاسمی شاعر ہے نہیں ہم نے پتا کیا ہے کہ لاہور میں شعر ہوتے ہی نہیں۔ احمد فراز کے بارے میں ہم نے مکمل معلومات حاصل کر لی ہیں۔ احمد فراز تو ہے ہی نہیں۔ پشاور میں احمد فراز ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہاں تو پشتو زبان بولی جاتی ہے فیض کیا ہے۔ فیض کا ہم نے پتہ کیا ہے۔ وہ تو پاکستان میں ہوتا ہی نہیں۔ یہ تو فیض کے نام سے کوئی سازش کی جا رہی ہے۔ امجد اسلام امجد کسی شے کا نام نہیں۔ امجد نام کا آدمی افسانہ نگار ہو سکتا ہے نہ شاعر۔ یہ ہے ہی غلط، ہم نہیں مانتے۔ کل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص نقشے سے صوبہ سرحد کو مٹا دے گا یا پھر ہری پور کو مٹا دے اور کہے کہ بھائی ہری پور نام کا کوئی شہر پاکستان میں ہے ہی نہیں۔ محمد ارشاد ہری پور، فلسفہ شعر

علی عباس کہیں بھی نہیں۔ یہ یقیناً احمد ندیم قاسمی کی سازشیں ہیں۔

مصیبت یہ ہے کہ کہاں ندیم قاسمی کہاں ہری پور۔ اصل دکھ تو یہ بھی لوگوں کو ہوگا۔ واقعی احمد ندیم قاسمی کا حلقۂ ارادت ہری پور میں بھی ہے۔ ہاں یہ سچ ہے "فنون" اور قاسمی کی ہری پور سے قدیم وابستگی ہے۔ قاسمی نے ہری پور کے مشاعرے اور مجلسیں دیکھی ہیں۔ اس لئے انھوں نے بغیر کسی تامل کے جو پیش کیا گیا وہ چھاپ دیا۔

ابھی تو شاعری کا خانہ بھی ہے۔ اب تو ریاض ساغر بھی آوارد ہوئے ہیں۔ کل ریاض ساغر پر بھی یہ الزام عاید ہوں گے۔ اسی ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ بھی یاد آگیا کہ دنیا میں کیسے کیسے لوگ دل پر پتھر رکھ کر جی رہے ہیں۔ آج سے دو سال قبل پشاور کے ایک شاعر نے ریاض ساغر کو یہ جانتے ہوئے کہ شاید مر کھپ گیا ہو اُن کی غزل کا مقطع اپنے مجموعۂ کلام میں اپنے نام سے شامل کر لیا، ور کتاب کا نام بھی "قلب ونظر" رکھ لیا اور وہ شعر تھا:

تلاشِ قلب ونظر تھک کے رہ گئی ساغر
میں ساری عمر کوئی نازدواں بنا نہ سکا

ساغر کی جگہ مشتاق لگا کر جناب نے کتاب مارکیٹ میں دے ماری۔ اور یہ غزل طبع شدہ تھی۔ ہم نے ریاض ساغر سے ذکر کیا تو اُس کی آنکھیں کچھ بجھ گئیں کہ چھوڑو یار اب میں کسی کا کیا کر سکتا ہوں۔ بہرحال ہم نے وکیل کے ذریعہ نوٹس بھجوا دیا اور حیرت اس بات پر تھی کہ کتاب کی تقریظیں لکھنے والے لوگوں میں ملک کی اہم اور نامور ادبی شخصیات کو بے وقوف بنایا گیا تھا۔ حالانکہ بات اتنی تھی کہ ریاض ساغر بھی ارشاد اعوان کی طرح شہرت پسند نہ تھا وہ ایک فقیر منش سمارٹ اور نوجوان شاعر ہے۔

شہرت اچھی چیز ہے۔ مگر مبنی برصداقت ہونی چاہیئے۔ دنیا بھر کے انقلابات کے پس پردہ گمنام شہیدوں اور سپاہیوں کی قربانیاں ہوتی ہیں مگر نام بڑوں کا ہوتا ہے۔ اگر ان ہستیوں کی جدوجہد سے ان گمنام شہیدوں کو نکال لیا جائے تو شہرت واستقامت کی بلند و بالا عمارتیں دھڑام سے نیچے گر جائیں۔ تمام ادبی اور علمی عمارات کے پس منظر میں کچھ حصہ غیر معروف لوگوں کا بھی ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب تو غلطیاں کرتے رہتے ہیں۔ وہ جہاں تک ہاتھ پہنچتا ہے کوئی نہ کوئی شمع اٹھا لیتے ہیں۔ ورنہ اور بھی کتنے ارشاد ہوں گے جو ابھی چپ ہیں۔ خود آگہی ہر حال میں گردن زدنی ہے۔ منصور حلاج سے غلطی ہوئی کہ چپ نہ رہ سکا۔ سقراط سے غلطی ہو گئی کہ بول پڑا:

مشکل ہے تو ایک ہماری، دار کا خطرہ رہتا ہے
ورنہ کائنات کا ذرہ ذرہ انا الحق کہتا ہے

صدیق منظر (ہری پور۔ ہزارہ)

محترم پروفیسر محمد ارشاد کے "وجود وعدم" پر ہمارے بعض دانشور ابھی تک اس فکر میں گم ہیں:

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

راولپنڈی کے ایک مؤقر روزنامے کے ادبی صفحے میں اس مسئلے کو از سرِ نو چھیڑا گیا ہے، بلکہ اب کے تو ارشاد صاحب ہی کی ذات سے نہیں، گورنمنٹ کالج ہری پور میں "شعبۂ فلسفہ" کے وجود سے بھی انکار کر دیا گیا ہے۔ اس باب میں تفصیل سے کچھ عرض کرنا محض تضیعِ اوقات ہے، البتہ خود پروفیسر ارشاد صاحب کی ایک فارسی رباعی ان کے تعارف کے لئے کافی ہوگی:

اے منکرِ من یزدانت خیر دہاد — دیر است کہ ہوشِ تو زدستت افتاد
از بود و نبودِ من فتادی در شک — آرے ہستم، منم محمد ارشاد

شاید اس کے بعد ہمارے "سکہ بند" دانشور مطمئن ہو جائیں اور باور کر لیں کہ ارشاد صاحب فی الواقع "ہیں" اور گورنمنٹ کالج ہری پور میں فلسفہ پڑھاتے ہیں۔

صوفی عبدالرشید (ہری پور۔ ہزارہ)

تبصرے

منظور حسین شور ۔ عتیق احمد ۔ نظیر صدیقی
ڈاکٹر حمید یزدانی ۔ ایم ۔ بی اشرف ۔ سلطان رشک
طاہر تونسوی ۔ جمیل عالی ۔ احمد ندیم قاسمی

پیاسے ہاتھ (شاعری) — قیمت :- ۱۸ روپے

مصنف :- فارغ بخاری — ناشر :- آئینہ ادب چوک مینار انارکلی، لاہور

"پیاسے ہاتھ" فارغ بخاری کا پانچواں مجموعۂ شاعری ہے۔ فارغ بخاری کے متعلق یہ بات اُن کے دو ایک ہم عصروں سمیت متفقہ طور پر مانی جا چکی ہے کہ اتنے طویل عرصے تک شاعری کے میدان میں رہنے کے باوجود اس نے نت نئے تجربوں اور اسالیب میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا ہے۔ فارغ کے یہاں تازگی، زبان و بیان میں بھی ہے اور مشاہدات اور اخذ و تاثر میں بھی ــــ چنانچہ اس کا نیا مجموعہ "پیاسے ہاتھ" اپنے پیش رو چار مجموعوں سے بالکل مختلف انداز کا ہے۔

اس مجموعۂ کلام کا کینوس اپنی مادی اساس اور بنیادوں میں جتنا پاکستانی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ غیر پاکستانی یعنی یورپ کی سرزمین اور اس سرزمین کے حوالے گویا فارغ بخاری کے جذباتی اور مادی تجربات اور تاثرات ۔ مثلاً پیرائیہ آغاز کے طور پر "پاکستان" کے زیر عنوان اُن کے دو اشعار ؎

لندن میں بھی سب رنگ ترے دل میں بسے ہیں
ہر ایک حسیں پر ہمیں مرنا نہیں آتا

اور پھر "شہر ہزار شیوہ" یعنی لندن ہی سے متاثر ہونے کا اقرار،

علم و ہنر کی جان ہے
خوشبو کی کان ہے

یہ سرزمین
کہ آبروئے فن کہیں جسے

ہر ایک گام پہ ہے یہاں جنتِ نگاہ
شہر ہزار شیوہ
کہ لندن کہیں جسے

اور ان دونوں کے علی الرغم وہ "ظالم حسین بہت" سرزمین کہ جہاں :

"ہم اپنے جسموں کے مقتلوں میں
شہید ہوتے رہے ہیں برسوں
دھنک بچھے راستوں پہ چلنے کے

خواب ایسے سراب تھے جو
ہمارے اعصاب پر ہمیشہ
عذاب بن کر رہے مسلط"

ہمیں فارغ بخاری کی اندرونِ ملک اور بیرونی ممالک کی فضا میں تقابلی تاثریت کی ایسی تصویریں دکھاتے ہیں۔ جن میں اس کے حساس قلب و ذہن کے سارے کرب، تپش اور وطن سے والہانہ محبت کی اتھاہ گہرائیوں کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا۔

"پیاسے ہاتھ" کی ساری شاعری ان ہی احساسات اور جذبات کی امین ہے جن کی طرف اُوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کے بارے میں، میں اپنی مختصر سی رائے کا اظہار کرتے ہوئے عرض کر چکا ہوں کہ "ان اوراق کی شاعری کا سیاق و سباق اس کی دوسری شاعری سے مختلف اور نئی وسعتیں لئے ہوئے ہے۔ اس کی DIMENSION میں افقی اور عمودی بیکرانیوں کا احساس ہوتا ہے۔ ان نظموں اور غزلوں میں بیرونی فضا کی لہروں نے معنوی طور پر ایک طویل نظم اور منظوم سفرنامے کے سارے رنگ عجیب زاویوں سے جلوہ گر کر دیئے ہیں۔" (بحوالہ فلیپ)

چنانچہ یہ منظوم سفرنامے کی کیفیت اور کیت رکھنے والی مختصر سی کتاب ہمیں عالمی سطح پر مزاحمتی شاعری کا ذائقہ بھی دیتی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ فارغ بخاری نے باضابطہ اور باقاعدہ طور پر نام بنام عالمی مزاحمتی رویوں کی نشاندہی کی شاعری کی ہے۔ بلکہ اس کتاب کے مندرجات میں ہمیں جو زیر سطح ایک احتجاجی رب و لہجہ ملتا ہے اس میں ان عالمی ناانصافیوں اور استحصال پسندانہ پینترے بازیوں کی بازگشت واضح سنائی دیتی ہے۔ جو "سطح اوّل" (FIRST RATE) اور درجہ سوئم کی دنیا کے درمیان کشاکش کی بنیاد ہیں۔ "پیاسے ہاتھ" کی شاعری ان ہی معنی میں فارغ کے باقی چار مجموعوں کی شاعری سے مختلف اور منفرد ہے۔

یہ بات شاید اب فارغ بخاری کے تخلیقی مرتبے میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتی کہ اس شعری مجموعہ میں بھی اُن کی فنی پختگی، تخلیقی اُپج اور تجربے اور شعور کی گہرائی اور گیرائی اور نظریاتی اصابت "حسب سابق" جزو لاینفک ہیں۔ فارغ بخاری کی ادبی حیثیت ایسے روایتی اعترافات کے مدار سے نکل کر کبھی کی ایسے محسوسات اور ایسی تاثرانگیزی کی فضا میں داخل ہو چکی ہے۔ جہاں جذب و کشش کی فراوانی بھی ہے اور تعمیر و تشکیل معاشرہ کے لئے استحصالی کرداروں کی سرکوبی کا وافر اہتمام بھی۔

عتیق احمد

دوسرا البم (اسکیچ) — قیمت: ۱۸ روپے

مصنف: فارغ بخاری — ناشر: آئینہ ادب، چوک مینار، انار کلی لاہور

خاکہ نگاری بھی دوسرے فنونِ لطیفہ بشمول شعر و افسانہ ــــ آدمی اور انسان فہمی ہی کا ایک اور ذریعہ ہے۔ مجسموں، پورٹریٹس اور فکشن کے کرداروں کے مقابلے میں خاکہ نگاری ایک ایسے کینوس کی بشرفہمی ہے جس کے کینوس کی افقی اور عمودی وسعتوں کے مطابق زیر مطالعہ کردار کی چوتھی ڈائمینشن کے امکانات بھی فہم و ادراک کی کمان کی زد میں آجاتے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خاکے میں زیر مطالعہ شخصیت صرف اتنی ہی نہیں ہوتی جتنی کہ تھی اور جتنی کہ وہ ہے بلکہ اس کے اندر "جتنی کہ وہ ہو بھی سکتی ہے" کے امکانات واضح ہوتے ہیں۔ اس بات کو صرف توصیفی پہلو ہی سے نہیں دیکھا جانا چاہیئے بلکہ

بننے کے ساتھ ساتھ آئندہ بگڑنے کے امکانات کی طرف اشارہ سے بھی ممکن ہیں۔ اردو میں اس قبیل کی خاکہ نگاری منٹو کے بعد فارغ بخاری کے یہاں کہیں کہیں جھلک دکھا جاتی ہے۔

"دوسرا البم" فارغ بخاری کے مزید ۱۹ خاکوں پر مشتمل ہے۔ پہلے "البم" کی طرح اس مجموعہ میں بھی فارغ کے ادیب، شاعر، اور فنکار دوستوں کے خاکے ہیں۔ خاکہ نگاری کا اصل مزا اس میں ہے کہ سیدھے سادے بیانیہ انداز کا ہوتے ہوئے بھی پڑھنے والا زیر مطالعہ شخصیت کے آرپار گزر رہا ہے۔ ابھی اس کے خارجی وجود اور سراپا پہ نظریں لگی ہوں کہ یکایک کوئی چبھتا ہوا سا فقرہ یا کوئی ایک لفظ ہمیں اس شخصیت کے بطون کی گہرائیوں میں اتار دے۔ صرف ایک مثال کی نشاندہی صادقین کے خاکے سے کی جاتی ہے۔ صادقین سے جو حضرات مل چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ صادقین کتنا منکسر المزاج، نرم رُو اور نرم خو انسان ہے۔ فارغ نے اس پہلو کی نشاندہی کرتے ہوئے صادقین کے اندر کے منتقم المزاج آدمی کی طرف اشارہ کیا ہے: "صادقین امروہہ کا رہنے والا ہے۔ امروہہ پٹھانوں کا گڑھ ہے۔ صادقین سید ہے پٹھان نہیں۔ لیکن اینٹ کا جواب پتھر سے دینے میں اس کی خو بو پٹھانوں کی سی ہے"۔۔۔ صادقین سے ملنے اس کے قریب بیٹھنے والے اور مصور فنکار کی رعایت سے اس کی نرم خوئی کے معترف کے بھی فارغ کے اس جملے سے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ صادقین کے اندر کے اس پٹھان صفت آدمی کی تلاش میں تا نک جھانک میں لگ جاتے ہیں۔ (فارغ نے آگے صادقین کی رباعیوں کے پس منظر کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس کے منتقمانہ رویہ کی وضاحت کی ہے۔) اسی طرح سے عدم کے خاکے میں اختر شیرانی کی شراب کے نشے میں اپنے دوستوں (ضیا جعفری، بزل رضا ہمدانی اور فارغ) کی جس طرح بے عزتی کی ہے نشہ اتر جانے کے بعد پھر جس طرح سے فارغ سے معافی اور اظہار ندامت کا بیان آیا ہے، وہ اختر شیرانی کے اندر کے انتہائی شریف اور رحم دل انسان کی طرف ہمارے خیالوں کی باگ دور موڑ دیتا ہے۔ عام زندگی میں اختر شیرانی کی شرافت، رحم دلی اور دوسروں کے لئے ایثار کی عادتیں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ دوسرا البم کے انیس خاکوں میں فارغ بخاری کی تحریر اور مشاہدہ کی یہ نوعیت ہر خاکہ میں ابھرتی ہے۔

فارغ نے "دوسرا البم" کے ابتدائیہ میں "اعتراف جرم" کے طور پہ خاکہ نگاری کے وصف کے سلسلے میں بڑے کام کی بات کہی ہے۔ یعنی یہ کہ "جس شخصیت کی قلمی تصویر کشی کی جائے، اس کے اپنے اندر بھی کچھ بھڑکتے، دھڑکتے، پاگل کرنے والے رنگ ہوں، لڑکھڑا دینے والے نشے ہوں، وارفتہ کرنے والی خوشبوئیں ہوں۔ قلم کو بے لگام کرنے والی لغزشیں ہوں۔ خیال و فکر کو بہکانے والا سحر ہو۔ جب کہیں جا کر اس تصویر کے تیکھے خطوط، گھائل کرنے والے زاویے اور وہ مدہوش کن لفظی کلر سکیم بنتی ہے۔ جو مدتوں اپنا جادو جگانے کی کاٹ رکھتی ہو"۔۔۔۔۔۔ اور ایک دوسری شرط "تخلیق کار (خاکہ نگار سے مراد ہے) بھی برہنہ حقیقت نگاری کی جگر داری رکھتا ہو۔ قارئین میں اسے ہضم کرنے کا حوصلہ ہو"۔

اس امر سے قطع نظر کہ پہلے اقتباس کو پڑھ کر کسی شخص کے خاکے کی جگہ کسی انتہائی "قاتل" قسم کے معشوق کا سراپا آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ یہ بنیادی بات اہم ہے کہ جس شخص میں اپنی شخصیت کا کوئی ایک پہلو بھی جذب و کشش نہ رکھتا ہو تو اسکے خاکے اور بوڑھی بھینس یا قصائی کے کھونٹے سے بندھنے والے بیل کے سراپا میں کوئی فرق نہیں رہ سکے گا۔ چنانچہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ فارغ نے بھی "ممدوح" ہستیوں میں ڈھکا چھپا کوئی کج کلاہ، کوئی قاتل معشوق پایا تب ہی اسے نوک قلم پہ دھرا اور سراپا اس کا صفحۂ کاغذ پر اتارا۔ فارغ کے اپنے متعینہ معیار خاکہ نگاری میں میری طرف سے اتنا اضافہ اور کر لیجئے کہ وہ شخصیتوں کے انتخاب کو ان کی خصائص طبع ہی سے نہیں بلکہ ان کی شخصیت کے فعال پہلو اور کچھ کرنے اور کچھ نہ کر

سکنے کے ٹکراؤ کی صورت حال سے اُبھارتا ہے۔ خاکہ نگاری دو بانسوں پر تنے ہوئے رسے پر بغیر سہارا چلنے کے فن کے مترادف ہے جسے فارغ نے برہنہ حقیقت نگاری کہا ہے۔ پہلے البم کی ستائیس اور دوسرے البم کی اُنیس تصویروں میں سے نہ جانے کتنی نے کسی "برہنہ حقیقت" کی وجہ سے کتنی ہی تصویریں خود بھی میاں نوشہ اسد اللہ غالب کا "قیس عریاں" بننے کے لئے بے تاب ہوں گی۔ اس لئے فارغ کی خاکہ نگاری سے کسی مثال کی پیش کش "خوفِ فسادِ خلق" کے سبب التوا کیجئے۔ یوں آپ کا جی چاہے تو کسی بھی خاکہ کو اُٹھا کر دیکھ لیجئے۔ عمل کے ارادوں اور نفیٔ عمل کے پختہ عزائم کا بازار گرم ملتا ہے۔ مقصد میرے کہنے کا یہ بھی نہیں ہے کہ فارغ کے خاکہ نگاری کے کھونٹے سے جو بھی بندھا وہ قصاب بردہ گاؤ ہی ہے۔ فارغ نے تو اتنی محبت اور سگِ گاؤ سے یہ خاکے لکھے ہیں کہ ناکام عاشقوں کو نہایت کامیاب معشوقوں اور محبوبوں کی پوری پلٹن چند میں روپوں کے اندر ہی اندر مرصعت نظر کے مصداق میسر آ جاتی ہے۔ خاکہ نگاری کی ایسی کامیاب مثالیں جس مصنف کے قلم سے میسر ہوں قارئین اس کا جتنا شکر گزار ہوں کم ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ دنیائے ادب کی وہ قابلِ احترام ہستیاں بھی لائق مبارکباد ہیں جن کی جیتی جاگتی، ہنستی مسکراتی اور بارہ زندگی کہیں کہیں جھلملاتی ہوئی ایسی تصویریں اس البم میں محفوظ ہوں گی جو اپنی پُرکشش شخصیت کے سبب ہم سب کی محبتوں اور عقیدتوں کا مرکز بنی رہیں گی۔ (عتیق احمد)

آتش فشاں پر کھلے گلاب

مصنف: آصف اسلم فرخی

قیمت: ۲۵ روپے

ناشر: طارق پبلی کیشنز۔ ۱۶ اے بی الہلال سوسائٹی کراچی

"آتش فشاں پہ کھلے گلاب" آصف فرخی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جو ۱۶ افسانوں اور ایک اختتامیہ پر مشتمل ہے۔ جس کا افسانہ نما عنوان ہے ساتواں دن۔ ایک مذہبی روایت کے مطابق خدا نے چھ دن میں کائنات تخلیق کی اور ساتویں دن آرام کیا۔ آصف فرخی نے بھی غالباً چھ دن افسانے لکھے اور ساتویں دن اپنے افسانوں کا افسانہ لکھا۔ یہ کام انہوں نے اپنے ممدوح حسن عسکری کی تقلید میں کیا ہے۔ جنہوں نے اپنے افسانوں کے مجموعے "جزیرے" کا دیباچہ لکھنے کی بجائے "اختتامیہ" لکھا تھا جسے پڑھتے وقت غالب کا مصرع یاد آتا ہے۔

ع ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

یعنی ذکر اردو افسانے کا اور بیان حسن عسکری کا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس بیان میں بصیرت کی کتنی جگمگاہٹیں ہوں گی جدت اور خیال انگیزی تو آصف فرخی کے "ساتواں دن" میں بھی بہت ہے۔ لیکن جب خیال عسکری کی طرف جاتا ہے تو مصرع حسرت موہانی کا یاد آتا ہے کہ ع

میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

میرا مقصد کسی قسم کا موازنہ نہیں بلکہ اردو کے دو افسانوی مجموعوں کے درمیان ایک مماثلت کی طرف اشارہ کرنا تھا۔ وبس۔

آصف فرخی مختلف النوع صلاحیتوں کے آدمی ہیں۔ ابھی وہ اپنی میڈیکل کی تعلیم سے فارغ نہیں ہوئے۔ لیکن اردو اور انگریزی میں اتنا کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھتے رہتے ہیں کہ ملک کا پڑھا لکھا طبقہ ان کے نام سے ناآشنا نہیں رہ سکتا۔ اردو میں انہوں نے تخلیقی کام کیا ہے یعنی افسانے لکھے ہیں۔ جن کا پہلا مجموعہ اس وقت میرے تبصرے کا موضوع ہے۔ انگریزی میں وہ

تنقید اور تبصرے لکھتے رہے ہیں۔ میڈیکل طالب علم ہونے کے باوجود اردو ادب اور مغربی ادب کے معاملے میں ان کا مطالعہ حیرت انگیز حد تک وسیع ہے۔ مظفر علی سید نے "آتش فشاں پہ کھلے گلاب" کے فلیپ پر جو رائے لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے آصف فرخی کو خطرناک حد تک بڑھا ہوا جن کہا ہے۔ یہ دراصل عمر کے اعتبار سے اردو ادب کے ایک چھوٹے جن کے بارے میں ایک بڑے جن کی رائے ہے۔ میں نے بڑوں میں مظفر علی سید اور چھوٹوں میں آصف فرخی سے زیادہ وسیع المطالعہ اور باخبر لوگ نہیں دیکھے۔ بیس بائیس سال کی عمر میں ایک کتاب کا مصنف بن جانا اپنے خاندان کے لئے باعثِ مسرت اور باعثِ فخر ہوتا ہے۔ آصف فرخی کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اس عمر میں خود اردو ادب کے لئے مسرت کا باعث اور امیدوں کا مرکز بن گئے ہیں۔ غلام عباس جیسے افسانہ نگار نے ان کے بارے میں لکھا "آصف فرخی کی افسانہ نگاری کی عمر ابھی چھوٹی ہے، یہی کوئی چار یا پانچ سال۔ مگر اس کم عمری کے باوجود انہوں نے نئے افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں اپنی جگہ بنالی ہے۔"

آصف فرخی نے "ساتواں در" کے عنوان سے اپنے افسانوں کا جو افسانہ یا اپنی کہانیوں کی جو کہانی بیان کی ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی کہانیوں کے بارے میں بہت سے بیانات دیئے ہیں جن میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اُن کی مدد کے بغیر سمجھے نہیں جا سکتے۔ پھر بھی ان کی کہانیوں پر ایک نظر ڈالنے سے پہلے اُن کے بعض بیانات کو پیشِ نظر رکھنا کسی نہ کسی حد تک مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

مظفر علی سید نے آصف فرخی کو خطرناک حد تک بڑھا ہوا جن ہی نہیں خطرناک حد تک تازہ کار بھی قرار دیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان کے افسانوں میں کئی طرح کی تازہ کاری نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود اپنے افسانوں کے بارے میں آصف فرخی کا ایک بیان یہ ہے کہ انہوں نے آج کل عام طور سے لکھے جانے والے تجریدی افسانوں کا انداز اختیار نہیں کیا ہے۔

اپنے افسانوں کے بارے میں آصف فرخی کا ایک دوسرا بیان یہ ہے،

"ان کہانیوں کو لکھ کر میں اپنے خوابوں کو یوں آزاد کرتا ہوں جیسے کوئی پنجرے سے کبوتر اُڑا دے۔"

تیسرا بیان یہ ہے ــــ "ادب میں نقطۂ نظر کا مسئلہ میرے لئے دین کی سی حیثیت رکھتا ہے۔"

چوتھا بیان یہ ہے ــــ "یہاں یہ کہانیاں اپنی موضوعی وحدت کے اعتبار سے رکھی گئی ہیں۔ یہاں یہ ایک بڑے کل کی جزو ہیں۔ اپنی جگہ قائم بالذات بھی اور باہم دیگر مل کر ایک برتر وجود کی تعمیر کنندہ بھی۔ یہ تمام کی تمام مل کر ایک تقسیم، ایک موضوع سے منسلک ہوتی ہیں۔"

پانچواں بیان ــــ "میرا موضوع ایک طویل و بسیط کتاب کا متقاضی ضرور ہے۔ ایک میجر کتاب، کتاب کبیر۔ لیکن میرا قلم لیرک شاعر کا ہے، ایپک شاعر کا نہیں . . . ."

چھٹا بیان ــــ "آپ اس کتاب کو مرثیے کی طرح پڑھنا چاہیں تو اس کو یوں مرتب کر سکتے ہیں کہ پہلے دو افسانے تمہید، اس کے بعد سراپا۔ تیسرے جز کے چار افسانے رجز اور آخری چار ماتم، یا اگر اس کو نسخۂ تشخیص سمجھیں تو چار سلسلے یوں بنیں گے کہ ہر جز ایک پروسس ہے۔ پہلے INSPECTION، پھر PALPATION، پھر PERCUSSION اور پھر AUSCULATION یعنی پہلے دو افسانوں میں معائنہ ہے۔ اگلی آٹھ کہانیاں ٹٹولتی ہیں۔ اس کے بعد والی PERCUSS کرتی ہیں اور آخری کہانیاں استماع۔"

مجھے یقین ہے کہ آصف فرخی نے اپنے افسانوں کے بارے میں یہ سارے بیانات اس لئے دیئے ہیں کہ قاری ان کے

افسانوں کو صحیح طور پہ پڑھ سکے اور بہتر طور پہ سمجھ سکے۔ لیکن مجھے اندیشہ یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قاری اِن امدادی بیانات سے وحشت زدہ ہو کر اس کتاب کو ایک بھاری پتھر سمجھ لے اور اس کتاب کے ساتھ وہی سلوک کرے جو بھاری پتھر کے ساتھ کیا جاتا ہے یعنی بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑ دیا۔

آصف فرخی نے "ساتواں در" لکھ کر قاری کو اپنے اعتماد میں لینے سے زیادہ اُسے اپنی کتاب سے خوف زدہ کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ قاری کے خوف زدہ ہونے کا ایک اہم سبب یہ بھی ہوگا کہ قاری اُن کی انگریزی اور اُردو دونوں اصطلاحوں کو سمجھنے میں یکساں طور پہ ناکام رہے گا۔ مثلاً وہ نہ AUSCULATION کی اصطلاح سمجھ پائے گا نہ استماع کی اصطلاح۔

بہرحال مجھے اس بات کا یقین ہے کہ جو لوگ "ساتواں در" پڑھے بغیر اس کتاب کا مطالعہ کریں گے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اس کتاب سے خوف زدہ نہ ہوں گے بلکہ اس سے کسی نہ کسی حد تک محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ممکن ہے وہ اس کتاب کے بعض افسانوں کو افسانہ تسلیم نہ کر سکیں۔ کیونکہ آصف فرخی اپنے قاری کو افسانہ سنانے سے اتنی دلچسپی نہیں رکھتے، جتنا کہ اسے اپنے ویژن میں شریک کرنے سے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آصف فرخی کے افسانے فکشن سے زیادہ CRITICTION کی حیثیت رکھتے ہیں جو کرٹسزم + فکشن کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار آصف پر مضمون نگار آصف کی پرچھائیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔ ویسے آصف فرخی نہ کہانی کہنے کی صلاحیت سے محروم ہیں نہ کردار نگاری کے فن سے ناآشنا۔ "چیل گاڑی" کی اکبری خانم ایک ناقابلِ فراموش کردار ہیں۔ کامیابی کے ساتھ کہانی کہنے کے لئے زبان و بیان پہ جو غیر معمولی قدرت ہونی چاہیئے وہ حیرت انگیز حد تک آصف کے یہاں موجود ہے۔ زبان تو ان کی اپنی ہے ہی بیان کے طریقے اور سلیقے انہوں نے اردو کے ادب العالیہ بالخصوص داستانوں کے مطالعے سے سیکھے ہیں۔ انتظار حسین کے بعد آصف فرخی اردو کے دوسرے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے داستانوں سے گہرے اثرات قبول کیے ہیں۔ "ساتواں در" میں ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ ان کہانیوں کی تصنیف کے دوران حسن عسکری کا ایک جملہ میرے کانوں میں رہ رہ کر گونجتا رہا کہ کہانی کا نیریشن کلچر سے آتا ہے۔ نیریشن میں زبان کا مزاج رچا بسا ہوتا ہے۔

حسن عسکری کا یہ جملہ مجھے امریکہ کے عظیم افسانہ نگار اور ناول نگار ہنری جیمز کا یہ قول یاد دلاتا رہا ہے کہ

"فن کا پھول وہیں کھلتا ہے جہاں زمین گہری ہوتی ہے۔ تھوڑا سا ادب پیدا کرنے کے لئے بہت سی تاریخ چاہیئے۔ ایک ادیب کو حرکت میں لانے کے لئے ایک پیچیدہ سماجی مشینری ضروری ہے۔"

آصف فرخی کے افسانوں کا مرکزی موضوع گم شدہ شہروں اور تہذیبوں کی بازآفرینی ہے۔ کھوئے ہوئے شہر اور مٹتی ہوئی تہذیب سے انتظار حسین کے افسانوں اور ناولوں کا تعلق ہے۔ لیکن انتظار حسین اور آصف فرخی کے درمیان ایک فرق ہے۔ انتظار حسین اپنے گم شدہ شہر کی طرف بار بار جاتے نظر آتے ہیں جبکہ آصف فرخی اس شہر سے نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک طرح کا جنریشن گیپ ہے۔

نظیر صدیقی

ہدف (شاعری) قیمت ا-

مصنف :- صمد انصاری ناشر :- التحریر، اردو بازار، لاہور

صمد انصاری کی غزلیات کے مجموعے "ہدف" پر کسی اظہارِ خیال سے پہلے بے محل نہیں اگر صمد انصاری کے اندازِ فکر

سے متعلق چند نفسیاتی نکات کی وضاحت کر دی جائے۔ صمد انصاری اگرچہ بالطبع غزل کے شاعر ہیں لیکن صنفی اور روایتی نقطہ نظر کے برعکس صمد صاحب کی غزل صرف حدیثِ دلبراں تک محدود نہیں، بلکہ مرزا غالب کے بقول،

دجلہ قطرے میں دکھائی نہ دے اور جزو میں کل   کھیل بچوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

صمد انصاری کی غزل دل اور دماغ کے باہمی عمل اور ردِ عمل کا ایک ایسا دامن دار امتزاج ہے جس کو EMOTIONALIZED INTELLECT - جذباتی تفکر یا متفکرانہ جذبات INTELLECTUALIZED EMOTION کہہ سکتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد یہ سوال کہ صمد انصاری کے غزل کے متیزات کیا ہیں۔ اس کا جواب صرف شاعر کی فکر کا تجزیہ ہی دے سکتا ہے۔

کب سے جیتے آ رہے ہیں عادتاً   ہم نے اپنے آپ کو سوچا نہیں

صمد انصاری کے نزدیک انسان حواس کا مجموعہ ضرور ہے لیکن خود اپنے وجود کا عرفان اس کے لئے اس وقت تک ممکن نہیں جب تک محسوسات کو مدرکات کی میزان پر تول نہ لیا جائے۔ ورڈز ورتھ کے نزدیک ہر علم اس وقت تک ناقص ہوا کرتا ہے جب تک وہ ادراک میں تحلیل نہ ہو جائے۔ اُسی کے اپنے الفاظ میں:-

MAN KNOWS MUCH MORE THAN HE UNDERSTANDS

صمد انصاری کی شاعری میں خود شناسی کا یہی وہ شعور ہے جس کو انسانی تفکر کا نقطۂ آغاز کہنا چاہیئے اور جو خالق اور مخلوق کے درمیان ایک غیر شعوری رابطہ استوار کر دیتا ہے۔ صمد انصاری کے جذبات پر اگرچہ ان کی فکر غالب معلوم ہوتی ہے، لیکن ان کی فکر کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فکر کا نقطۂ ارتکاز صرف ان کی ذات ہی تک محدود نہیں بلکہ اس کی گہرائی میں خدا، انسان، کائنات اور ماورائے کائنات کے وہ تمام تصورات آ جاتے ہیں، جن کی ہمہ جہتی سے صمد انصاری کے سوچ کی ہمہ جہتی کا پتہ چلتا ہے۔ صمد انصاری کے یہاں زندگی کے عرفان کا کوئی منظم فلسفہ نہیں، لیکن ان کے سوچ پر فلسفہ، سائنس، رموزِ قرآنی اور مابعد الطبیعاتی اسرار کے بڑے گہرے نقوش مرتسم نظر آتے ہیں۔ کائنات اپنی ناپیدا کنار وسعتوں کے باوجود ہر شخص کے لئے صرف اتنی ہی بڑی ہوتی ہے جتنا اس کے شعور کا دائرہ ہوتا ہے۔ صمد انصاری کی غزل اپنے محسوسات اور مدرکات کی رنگارنگی کی بناء پر اس قدر دامن دار ہوتی ہے کہ اس کی گہرائی پر تنگنائے کا اطلاق نہیں ہوتا۔

جھنے لگا تھا کس کی انا سے بُمِ حیات   کس کے لہو کا زہر زمان و مکاں میں تھا

بچھا گیا فرقِ ابد پر ایک لمحے کا جمال   کارواں صدیوں کے راہوں میں بھٹکتے رہ گئے

ابھروں گا نور دیدہ کو چہروں کے اُفق سے   میں شیشۂ ایام کے جوہر کو گلا دوں

مہکے وہ مرے شعر میں احساس کی صورت   تنزیہہ کے پردوں کو ذرا اور اُٹھا دوں

دراصل صمد انصاری کے اندازِ فکر میں جس حقیقت کو مرکزیت حاصل ہے وہ براہ راست اسی زندگی اور اسی دنیا کا تصور ہے جس میں انسانیتِ عظمیٰ کے ارتقاء اور انسان کی بلندی سے آسمان کی رفعتوں کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

ہے رفعتوں کا تصور اسی کی پستی سے   ہر آسماں کو بلندی اسی زمیں سے ملی

اس اندازِ فکر کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صمد انصاری کے نزدیک خود انسان اپنی عظمت کا اندازہ اس وقت تک نہیں لگا سکتا۔ جب تک اپنی ذات کے خول سے باہر نکل کر کائنات کی ہمہ جہتی اور انسانیت کی ہمہ گیری کو سمجھنے کی کوشش نہ کرے۔ انسانی ذہن کی وہ قیود جن کو عرفِ عام میں رنگ و نسل کے تصورات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اجتماعیات کی رُو سے فکر اور نظر کی آفاقیت کو بڑی حد تک محدود کر دیا کرتے ہیں۔ صمد انصاری کی زبان میں انسان کی اس ذہنی تنگ نظری کا دوسرا نام حلقۂ گرداب ہے۔

ہے کائنات میں کیا زیست کا محل دیکھوں — کبھی تو حلقۂ گرداب سے نکل دیکھوں

مثالِ عمرِ رواں ہوں مدارِ فطرت پر — میں دست و پائے مشیت تمام شل دیکھوں

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا گیا، صمد انصاری کی شاعری کے عناصرِ ترکیبی میں جو عنصر اُن کے فن پر نسبتاً زیادہ غالب ہے وہ ان کا ہمہ جہتی اور گہرا سوچ ہے۔ وہ جو کسی کا قول ہے کہ "از دل خیزد، بر دل ریزد"، اس نوعیت کی کوئی جذباتی کیفیت آپ کو صمد صاحب کے یہاں کہیں مشکل ہی سے ملے گی۔ اس بناء پر صمد صاحب کے اُفتادِ مزاج پر غور کرنے سے پہلے بے محل نہیں اگر یہاں ہنری برگساں کے اس خیال کا اظہار کر دیا جائے کہ برگساں کے نزدیک انسانی تفکر کی ترقی یافتہ شکل ہی کا دوسرا نام وجدان ہے۔ صمد صاحب کی شاعری پر چونکہ رندانہ، عاشقانہ یا صرف لب و لہجے کی شاعری کا لیبل نہیں لگایا جا سکتا، اس لئے ان کے کلام میں داغ و امیر یا حسرت اور جگر کے کلام کی جذب و مستی، سپردگی اور والہانہ پن کی تلاش کرنا صمد صاحب کے ساتھ سخت ناانصافی ہو گی۔ صمد انصاری کی شاعری ملٹن کی زبان میں چوں کہ HGH SERIOUSNESS یا متانتِ عالیہ کے ذیل میں آتی ہے۔ اس لئے اس کی سطح کا جنسی یا خالص جذباتی شاعری کی سطح سے بلند تر ہونا ایک ایسی نفسیاتی سچائی ہے جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ جنسی اور جذباتی نوعیت کے فن کی زود اثری تو یوں مسلم ہے کہ بقول داغ:

محشر میں لوگ اپنی مصیبت میں مبتلا — ہم کو یہ جستجو کہ کوئی خوبرو ملے

ایسی شاعری اور اس کی مقبولیت کا راز خود انسان کی جبلت میں پوشیدہ ہے۔ لیکن صمد انصاری کے تغزل کا انداز چوں کہ اُن کے اُفتادِ مزاج کی بناء پر غیر جذباتی ہے اس لئے صمد انصاری کو سوچنے اور سمجھنے کے لئے بھی اس کی سخت ضرورت ہے کہ اُن کا قاری ایک پڑھا لکھا انسان ضرور ہو۔ (یہاں پڑھے لکھے ہونے سے میرا مطلب ڈگری یافتہ ہونا ہرگز نہیں۔) خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ لیکن میں ضرور عرض کروں گا کہ جیسے ایک قد آور شاعر ہونے کے لئے شاعر کے مطالعات، مشاہدات، اور تجربات کے ساتھ ساتھ سب سے بڑا لازمہ فطرت کی وہ ودیعت ہے جس کو شاعری کی داخلی صلاحیت کہا جا سکتا ہے۔ اسی طور پر ایک بلند پایہ بالغ النظر اور گہری فکر کے شاعر کو سمجھنے کے لئے خود قاری کا ذی شعور ہونا لازمی ہے۔ صمد انصاری کی تخلیقات چوں کہ عام جذباتی سطح کی شاعری سے بہت بلند ہیں۔ اس لئے میرے نزدیک وہ عوام کے شاعر نہیں بلکہ ان کو صرف دانشوروں اور مفکروں کا طبقہ ہی سمجھنے کی طرح سمجھ کر ان کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے۔

صمد انصاری کے فنی شعور کی پہلو داری، اُن کے تفکر کی گہرائی اپنے مطالب کے اظہار کا تخلیقی اسلوب اُن کو اُن کے معاصرین کی صف سے باہر نکال کر ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دیتے ہیں۔ جہاں صمد صاحب اپنی جگہ تنہا نظر آتے ہیں۔ میرے نزدیک یہی صمد صاحب کی پہلو دار اور کشیدہ قامت شخصیت کا سب سے زیادہ نمایاں رُخ ہے۔ آخر میں اس نکتے کا اظہار بھی بے محل نہیں معلوم ہوتا کہ صمد صاحب چوں کہ اپنی شاعری میں کسی فکریاتی منصوبے کے پابند نہیں تھے اس لئے

ان کی شاعری میں اقبال کی شاعری کی طرح کوئی قومی آدرش ڈھونڈنا بھی غلط بات ہے۔ اس معنی میں، میں صمد صاحب کو اسرار و معارف اور درک و بصیرت کا شاعر کہوں گا، جو سورج کی طرح اپنی کرنوں کو کسی خاص سمت و جہت میں پھیلانے کا قائل نہیں، بلکہ اجالے کے آفاقی پھیلاؤ کا قائل ہے کیوں کہ:

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدا ماست

پروفیسر منظور حسین شور

ہائیکو (شاعری) — قیمت: ۱۰ روپے

مصنف: محمد امین — ناشر: مکتبۂ اہل قلم پوسٹ بکس ۷۵/۴ ملتان

"ہائیکو" — کے شاعر پروفیسر محمد امین ایک صاحب الرائے فلسفی، ایک باشعور معلم، ایک عارف انسان اور خوش گو شاعر ہیں۔ اُن کی تازہ تصنیف "ہائیکو" — اردو شاعری میں ایک لطیف اضافہ ہے۔ محمد امین ایک عرصہ جاپان میں گزار چکے ہیں۔ انہوں نے جاپانی زبان کو اپنے رگ و ریشے میں سمو لیا ہے۔ انہوں نے جاپانی ہائیکو کی صنف کو اُردو میں متعارف کرایا ہے لیکن ان کی ہائیکو جاپانی سے ترجمہ نہیں ہے بلکہ خود ان کی فکر طبع کا نتیجہ ہے۔

محمد امین کا شعری وژن خلاقی اور مشاقی دونوں کا حامل ہے اور اس وژن کا بھرپور تاثر ان ہائیکو میں موجود ہے۔ ہائیکو کی صنف کو تتلی کے استعارے سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہائیکو میں اس لطافت، رنگ اور اُڑان کا حوالہ ملتا ہے جو تتلی میں ہے کہ ننھی سی جان لیکن استعاراتی دنیا کا ایک وسیع حوالہ اپنے وجود میں سموئے تاثر، خیال اور جذبے کی بوقلمونیاں دکھاتی ہے۔ ہائیکو کی تتلی موسموں سے، پھول سے، خوشبو، ملمس، رنگ اور جمال کشید کرتی ہے۔ جاڑے کا مہینہ آتا ہے، آڑو پر شگوفے کھلتے ہیں یا ٹہنیوں پر نغمہ بکھیرنے والے طیور جب سردیوں کی سنہری دھوپ کو ہدیہ داد پیش کرتے ہیں یا آنگن میں نرگس کے پھول کھل کر کسی کا انتظار کرتے ہیں یا انار کی خوشبو اور سیبوں کے ذائقے فضا میں تحلیل ہوتے ہیں تو سارے کے حروف پر تتلی اپنی ہستی کی سوچ میں گم دکھائی دیتی ہے۔ ہستی کی یہی سوچ ہائیکو کی تتلی کو اختصار کے باوصف گہرائی اور گیرائی سے ہمکنار کرتی ہے۔

ہائیکو کے مختصر وجود میں محمد امین کا شعری تجربہ اپنی پوری وسعتوں اور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ تین مصرعوں میں مختلف اور متلون جذبوں اور احساساتی سطح کی دنیاؤں میں پہنچا دینا محمد امین کی خلاقی کا اعجاز ہے، مثلاً یہ ہائیکو دیکھئے:

آم کے بُور سے مہکتی شام
اور چائے میں ذائقہ دُکھ کا
جس میں یادوں کی ڈوبتی ناؤ

مہکتی شام، دُکھ کا ذائقہ اور یادوں کی ڈوبتی ناؤ — تین استعارے، تین مختلف کیفیتیں — تین مختلف تجربے لیکن تینوں میں معنوی ربط بھی ہے۔ تجرباتی سطح پر ان تینوں جہتوں کا ایک جہت ہونا تخلیقی احساس کی معراج ہے۔ یہ مثالیں قدم قدم پر ملتی ہیں، مثلاً

مارچ کی نیم گرم دوپہر میں
یہ قطاریں اُداس پھولوں کی
جذبۂ خود نمائی کی کرنیں

ہر طرف ہے ہجوم لوگوں کا
اور میں تیری سوچ میں تنہا
اپنا راستہ بھی بھولتا جاؤں

یہ ہجوم میں تنہائی کا احساس اور تنہائی میں ہجوم کا خوف سے تحیر، مشاہدوں اور تجربوں کی دھوپ چھاؤں کی بدولت اُبھرتا ہے۔ محمد امین کے شعری تجربے کا جھروکہ کھول کر جھانکئے تو یہ سادہ دل انسان دُکھی بھی دکھائی دیتا ہے، اُداس بھی، متحیر بھی اور تنہا بھی۔

جب بھی سرما کی پہلی بارش ہو
سنگتروں سے اُداسیوں کی پھوار
دل کی تنہائیوں میں اُترتی ہے

شام، مہکی انار کی خوشبو
صبح سیبوں کے ذائقے میں بسی
اس معطر فضا میں تنہا ہوں

شاعر کی تنہائی اور اُداسی کا یہ دُکھ اس کے شعروں میں ڈھل کر ایک عجیب سی کیفیت پڑھنے والے پر طاری کر دیتا ہے، شعر پڑھ کر کسی کیفیت کا غلبہ نہ ہو تو شاعری، شاعری نہیں کچھ اور ہو جاتی ہے۔ محمد امین کی ہائیکو احساساتی سطح پر متاثر کرتی ہے، کیفیت طاری کرتی ہے اور نئے ذائقے سے روشناس کراتی ہے۔

محمد امین نے اس شعری صنف کو کوشش سے نہیں اپنایا بلکہ ان کا شعری تجربہ خود بخود اس ہیئت میں ڈھلتا چلا گیا ہے۔ ان کے فلسفیانہ ذہن نے اس میں سوچ کا تانا بانا بُنا ہے۔ شعری وژن نے حُسن کا رنگ بکھیرا ہے اور مشاہدے اور تجربے نے اس کو وسعت اور تازگی بخشی ہے۔ ایک اچھے شاعر میں اور کیا خوبیاں چاہئیں؟

اے۔ بی۔ اشرف

فن اور شخصیت (قتیل شفائی نمبر)
قیمت: ۶۰/- روپے
مدیر اعلیٰ: صابر دت
ناشر: نرگس پبلیکیشنز۔ ۳۸ پولیس کورٹ روڈ
ہینڈلوم ہاؤس انیکس پوسٹ بکس ۱۳۹۱ فورٹ بمبئی ۴۰۰۰۰۱ (بھارت)

بمبئی (بھارت) سے صابر دت ایک رسالہ "فن اور شخصیت" ایک عرصے سے نکال رہے ہیں۔ اس رسالے کے زیر اہتمام ادب و فن کی کسی ایک شخصیت کو منتخب کر کے اس کے فن اور شخصیت پر ایک ضخیم مجموعہ نہایت سلیقے سے مرتب کیا جاتا ہے۔ صابر دت اب تک کملیشور نمبر، جاں نثار اختر نمبر، فیض احمد فیض نمبر اور مہندر ناتھ نمبر نکال چکے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے پاکستان کے ایک بڑے شاعر قتیل شفائی کے فن اور شخصیت پر ایک نمبر مرتب کیا ہے اور اسے اتنے حُسنِ ذوق سے چھاپا ہے کہ ترتیب و طباعت کے اس غیر معمولی اہتمام پہ حیرت بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی۔ قتیل شفائی یقیناً اس اعترافِ کمال کے مستحق ہیں اور "فن اور شخصیت" نے "قتیل شفائی نمبر" شائع کر کے شعر و ادب کے اربابِ نقد کو بڑے اعتماد سے بتایا ہے کہ ایک شاعر آپ لوگوں کی بھرپور توجہ کے بغیر بھی بڑا شاعر ہو سکتا ہے۔

"قتیل شفائی نمبر" کی ترتیب میں معروف نقاد ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے صابر دت کا ہاتھ بٹایا ہے اور یوں اس نمبر کی اہمیت و افادیت دوچند ہو گئی ہے۔ معاون مدیرہ حمیدہ قمر ہیں، قتیل کی غزلوں کا انتخاب عزیز قیسی نے کیا ہے۔ ان کے گیت راجندر کرشن نے منتخب کئے ہیں اور ہر صفحے کی تزئین کاری مشہور آرٹسٹ "امروز" نے کی ہے۔ سرورق پر قتیل کی دو ہری پورٹریٹس کے علاوہ اندر کے صفحات پر قتیل کے اعزہ و احباب اور ان کی ادبی اور فلمی سرگرمیوں کی متعدد تصاویر درج ہیں۔

اس یادگار اشاعت میں قتیل شفائی کے فن اور شخصیت پر پاکستان و ہندوستان کے بڑے بڑے لکھنے والوں نے مضامین لکھے ہیں یا اپنے مختصر تاثرات کا اظہار کیا ہے یا منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ چند ناموں کو بغیر کسی ترتیب کے درج کیا جا رہا ہے تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اس خوبصورت اور بھرپور نمبر کی اشاعت میں کن اہم شخصیات نے حصہ لیا ہے۔ مالک رام، پروفیسر محمد حسن، ڈاکٹر خلیق انجم، سنیل دت، فیض، ضمیر جعفری، احمد فراز، اشفاق احمد، جگن ناتھ آزاد، محمد طفیل، فارغ، ملکہ جلیس، رام لعل، سردار جعفری، ڈاکٹر سلیم اختر، ظفر ادیب، محشر بدایونی، شہزاد احمد، شبنم رومانی، ڈاکٹر قمر رئیس، پروفیسر عتیق احمد، ڈاکٹر حامدی کشمیری، جمیل ملک، حسن طاہر، سید عابد علی عابد، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، محمد علی صدیقی، انتظار حسین، عزیز اثری، سحر انصاری، شان الحق حقی، اسرار زیدی، قدرت اللہ شہاب، میرزا ادیب، راجندر کرشن، راقم الحروف اور متعدد دیگر حضرات۔

قتیل شفائی نمبر چھ سو صفحات پر محیط ہے۔ قیمت ساٹھ روپے ہے جو اس کے حسن و خوبی کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ یہ تاریخی ادبی دستاویز نرگس پبلیکیشنز بمبئی سے طلب کی جا سکتی ہے۔

ندیم

کھڑکی بھر آسمان (نظمیں اور کہانیاں)

مصنف:۔ اسد محمد خاں

قیمت:۔ ۲۰ روپے

ناشر:۔ سیفور ٹیمن سی ۱۴ شہر بانو پلازا فیڈرل بی ایریا کراچی

اسد محمد خاں آج کے سبھی قابلِ ذکر اردو افسانہ نگاروں اور شاعروں سے سراسر مختلف اور منفرد شاعر اور افسانہ نگار ہے۔ اس کے اندر کا ایکٹ اور تخلیقی انا کی اتنی بہت سی خوبیاں جمع ہو گئی ہیں کہ پہلی نظر میں وہ اہلِ قلم کی قطار سے کٹا اور ہٹا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر در اصل ایسا نہیں ہے۔ وہ اسی برادری کا ایک خود شناس اور خود آگاہ فرد ہے اور اپنی شاعری اور افسانہ نگاری کے توسط سے قارئینِ ادب کے اس گروہ تک پہنچنا چاہتا ہے جو ادب کے معیار کی کسوٹی ہوتے ہیں۔ وہ تعداد میں کم ہوتے ہیں مگر ان کی تحسین سے صدیوں کے ایوان گونج اٹھتے ہیں۔

اسد محمد خاں نے اپنی شخصیت کے دلآویز "عجُب" کا اظہار یوں بھی کیا ہے کہ موزوں نظموں، نثری نظموں اور کہانیوں کو یک جا چھاپ دیا ہے۔ اردو میں اس طرح کی شاید یہ پہلی کوشش ہے۔ ان تیرہ کہانیوں میں سے بیشتر "فنون" میں شائع ہو چکی ہیں۔ قارئین کو "باسودے کی مریم"، "یوم کپور"، "فورک لفٹ ۲۵۲"، "ایک ذلیل سائنس فکشن" وغیرہ کیسے بھول سکتے ہیں۔ یہ کہانیاں بیشتر علامتی ہیں مگر یہ علامتیں کلیاں سی ہیں جو چٹکتی ہیں، کھلتی ہیں اور آخر تک پہنچتے پہنچتے ایک شگفتہ پھول بن چکی ہوتی ہیں۔ مسائل وہی گھسے پٹے ہیں مگر اسلوبِ اظہار اس قدر ذاتی اور منفرد ہے کہ یہ اسلوب اسد محمد خاں کی پہچان بن گیا ہے۔ بعینہٖ ان کی نظموں کی ایک ایک لائن پر "اسد محمد خانی چھاپ" ہے۔ یہ ایسی نظمیں ہیں جنہوں نے اردو کے شعری سرمائے کو مزید باثروت بنا

دیا ہے۔
کتابت و طباعت مثالی ہے اور ناشر خود اسد محمد خاں ہے۔ اس کتاب کو ہر معیاری قاری کے شیلف کی زینت ہونا چاہیئے۔
(ن۔ سلیم)

پیرس ۲۰۵ کلومیٹر (سفرنامہ) — قیمت: ۵۰ روپے
مصنف: محمد اختر ممونکا — تقسیم کار: سنگ میل پبلیکیشنز چوک اردو بازار، لاہور

آج سے کئی برس پہلے کا ذکر ہے۔ میں روزنامہ "امروز" میں ہر ہفتے "تہذیب و فن" کے زیر عنوان ادبی اور ثقافتی موضوعات پر مختصر تاثراتی مضامین لکھتا تھا۔ ایک مضمون کا عنوان تھا۔ "ہم سفرنامے کیوں نہیں لکھتے؟" اس میں اہلِ ادب سے گزارش کی گئی تھی کہ اگر انہیں سفر کرنے کے مواقع میسر آتے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے سفر کے تجربات و مشاہدات کو قلم بند بھی کریں تاکہ ان کے قارئین کے ذہنی افق بھی پھیلیں اور اردو میں سچے، کھرے اور دلچسپ سفرناموں کی کمی بھی پوری ہوتی رہے۔ اُن دنوں ہمیں صرف دو نمایاں سفرنامہ نگار میسر تھے ــــ محمد خالد اختر اور بیگم اختر ریاض الدین ــــ "امروز" میں شائع ہونے والے میرے اس مختصر سے مضمون کی تائید میں بے شمار خطوط موصول ہوئے اور پھر کچھ عرصہ کے بعد سفرنامے بھی "موصول" ہونے لگے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ گزشتہ دس پندرہ برسوں میں جو دلآویز سفرنامے لکھے گئے ہیں وہ میرے اس مضمون کا نتیجہ ہیں۔ مقصد محض یہ عرض کرنا ہے کہ اردو میں جدید سفرنامے نگاری کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے بہرحال یہ جدید سفرنامے مستنصر حسین تارڑ اور عطاالحق قاسمی اور محمد کاظم کے تھے۔ ان سفرنامہ نگاروں کی آمد سے سفرنامہ ایک ادبی تخلیق کے طور پر جانا پہچانا جانے لگا۔ اس کے بعد ابن انشاء اور جمیل الدین عالی نے سفرنامے لکھے۔ اشفاق احمد اور کرنل محمد خاں نے لکھے، حسین شاہد اور ذوالفقار تابش نے لکھے اور یہ سفرنامے اپنے اپنے اسلوب میں اتنے خوبصورت تھے کہ بعض عناصر کی طرف سے انہیں افسوسناک تنگ دلی کا ہدف بھی بنایا گیا۔ اور کہا گیا کہ بیشتر سفرنامے جھوٹ کے پلندے ہیں اور جو واقعات ان میں بیان ہوئے ہیں وہ ان کے لکھنے والوں پر گزرے نہیں ہیں بلکہ ان کے سُنے ہوئے ہیں یا پڑھے ہوئے ہیں یا گھڑے ہوئے ہیں۔ یہ بالکل اس طرح کا تنگ ظرفی کا ردِ عمل ہے جیسے شروع شروع میں خواتین اہلِ قلم کے سلسلے میں بعض حلقوں کا تھا کہ وہ خود بے چاریاں کہاں لکھ سکتی ہوں گی، بلکہ حجاب امتیاز علی کو تو ان کے میاں امتیاز علی تاج لکھ کر دیتے ہیں اور عصمت چغتائی کے افسانے دراصل ان کے بھائی عظیم بیگ چغتائی کی تخلیق ہوتے ہیں۔ سفرناموں کے خلاف اس بے معنی لعن طعن کے باوجود آج سفرنامہ ایک صنفِ ادب کی حیثیت سے بے حد ہردلعزیز ہے اور مسلسل ترقی پذیر ہے اور محمد اختر ممونکا اردو سفرنامہ نگاروں کی اس صف میں ایک تازہ دم اور توانائیوں سے بھرپور اضافہ ہے۔ البتہ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں ممونکا بھی سفرناموں کے خلاف بعض عناصر کے پروپیگنڈے سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر تو نہیں۔ وہ "پیرس ۲۰۵ کلومیٹر" کے ابتدائیے میں لکھتا ہے کہ وہ "سفرناموں کی بھیڑ میں ایک اور سفرنامے کا اضافہ نہیں کر رہا ہے بلکہ اس نے تو سفرنامے کی بجائے سیاحت نامہ لکھا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تقریب کے دعوت نامے میں "پیرس ۲۰۵ کلومیٹر" کو سفرنامہ ہی قرار دیا گیا ہے۔

ممونکا کو یہ حق تو یقیناً حاصل ہے کہ سفرنامے کے مقابلے میں سیاحت نامے کی امتیازی انفرادیت کو تسلیم کرانے کی

کوشش کرے اور ثابت کرے کہ وہ مسافر نہیں ہے، سیاح ہے، مگر "سفرناموں کی بھیڑ" کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کے خیال کے مطابق اردو میں سفرنامے ضرورت سے زیادہ لکھے جا رہے ہیں۔ اس نے اپنی پہلی کتاب کو سفرنامے کی بجائے سیاحت نامہ کہیں اس لئے تو نہیں کہا! مگر کتاب کے آخری صفحے پر اس نے اپنی دو زیر طبع کتابوں کی نوید سنائی ہے جن میں سے ایک کو سیاحت نامہ قرار دیا ہے اور ایک کو سفرنامہ۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کے ذہن میں سفر اور سیاحت کا فرق اور امتیاز یقیناً واضح ہوگا۔ مگر میں مونگا کو یقین دلاتا ہوں کہ ابھی اردو میں سفرناموں کی بھیڑ نہیں لگی۔ ابھی تو محض اِکا دُکا سفرنامے لکھے جا رہے ہیں اور کتابی صورت میں جدید معیاری سفرناموں کی شاید ایک درجن کتابیں بھی نہیں ہوں گی۔

اس کتاب میں محمد اختر مونگا لاہور سے چلا ہے تو یورپ کے مغربی ساحلوں تک بڑھا چلا گیا ہے۔ راستے میں جو بھی ملک پڑا ہے۔ اس کی سیاحت مونگا نے بظاہر اتنے کھلنڈرے پن مگر دراصل اتنی لگن سے کی ہے کہ جب وہ یہ عجیب و غریب لہجہ اختیار کرتا ہے کہ "میں آئندہ لکھنے کا "پنگا" کبھی نہیں لوں گا" تو حیرت ہوتی ہے کہ کیا واقعی اسے اپنی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں ہے اور کیا وہ اپنے جوہر کے بارے میں اس حد تک بے خبر ہے!

ہمارے دوسرے سفرنامہ نگاروں نے بھی افغانستان، ایران، ترکی، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، اٹلی، سوئٹزرلینڈ، فرانس وغیرہ کے سفر کئے ہیں۔ سب کے مشاہدات، تجربات اور تاثرات ان کے اپنے ہیں اور مونگا نے بھی ان ممالک کی سیاحت میں اپنی انفرادیت کے رنگ بکھیرے ہیں۔ ہر ملک اور وہاں کے مقامات ایک سے ہوتے ہیں مگر انہیں دیکھنے اور انہیں برتنے کا اسلوب اپنا اپنا ہوتا ہے اور مونگا کا اپنا اسلوب اس سیاحت نامے میں نمایاں ہے۔ یہ بے تکلفی اور شگفتگی کا اسلوب ہے۔ انتہائی مشکلات میں سے بھی وہ ہنستا ہنستا گزر جاتا ہے۔ بعض مقامات پر آنسوؤں کی نمی بھی ہے مگر یہ حقیقت اور صداقت کی مجبوری ہے۔

ہمارے نئے سفرنامہ نگار بیشتر جوان لوگ ہیں اس لئے اگر ان کے ہاں صنفِ نازک کی جھلکیاں زیادہ تعداد میں موجود ہوتی ہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے مگر محمد اختر مونگا کے ہاں ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ جب اس سیاحت نامے کے دو چار صفحات میں سے کوئی ایک بھی "الھڑ مٹیار" نہ جھانکے تو تشویش ہونے لگتی ہے کہ کہیں نصیبِ دشمناں ہمارے سیاح کے مزاج علیل تو نہیں ہو گئے ہیں یا کہیں مطالعے کے دوران ہم سے کوئی سطر چھوٹ تو نہیں گئی ہے۔ مونگا کے نزدیک تو لاہور بھی اس لئے اہم ہے کہ وہ "کالجوں اور گڑیوں کا شہر" ہے اور پھر اس نے لاہور کی "گڑیوں" کو "فراخ دل" بھی قرار دے ڈالا ہے۔ اپنا اپنا نقطۂ نظر ہے مگر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے چائے میں چینی ایک ڈیڑھ چمچ کی بجائے پانچ چھ چمچ ڈال دی گئی ہے۔

مونگا نے مشرق سے مغرب تک کے ان ممالک کے سفر میں متعدد صعوبتیں بھی اٹھائی ہیں اور اسے بے شمار آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ اپنے قارئین کے لئے وہ خدا کی خدائی کے اتنے مناظر، اتنے حسن اور اتنے معلوماتی خزانے سمیٹ لایا ہے کہ ہم سب کو مونگا کی اس فراخ دلانہ پیش کش کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ پھر اس نے ہزارہا کلومیٹر کا یہ سفر چاہے کتنی ہی مصیبتوں سے مکمل کیا ہو، اس کا قاری کہیں بھی نہیں اکتاتا۔ بلکہ جب مونگا مفت لفٹ لینے کے لئے کاروں، بسوں اور ٹرکوں کو بے بسی اور عاجزی سے انگوٹھا دکھاتا ہے تو قاری محظوظ ہوتا ہے کیونکہ اسے اندازہ

ہو چکا ہے کہ موزنکا ان سب کو ٹھینگا دکھا رہا ہے کہ اگر مجھے لفٹ دینے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتے ہو تو کارکردگی دکھاؤ ورنہ جاؤ جہنم میں!

کتاب کے معنوی حسن و خوبی کا تو کوئی حساب نہیں مگر صوری لحاظ سے بھی موزنکا نے کتاب اتنے سلیقے اور حسنِ ذوق سے لکھوائی اور چھپوائی ہے کہ نثر کی بہت کم کتابیں اس کے مقابل رکھی جا سکتی ہیں۔ میں کھلی باہوں کے ساتھ افق تا افق امکانات سے چھلکتے ہوئے محمد اختر موزنکا کو ادب کی دنیا میں خوش آمدید کہتا ہوں۔

احمد ندیم قاسمی

گردشِ کوزہ (مجموعہ غزلیات) — قیمت:۔ ۳۰ روپے

مصنف:۔ محشر بدایونی — ناشر:۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

گردشِ کوزہ محشر بدایونی کا تیسرا مجموعہ کلام ہے۔ اس سے پہلے اس کے دو مجموعے "شہرِ نوا" اور "غزل دریا" شائع ہو چکے ہیں۔

محشر بدایونی آج کے غزل گو شعراء میں ایک نہایت معتبر نام ہے۔ ہمارے ہاں محشر کے سوا کوئی ایک بھی ایسی مثال شاید ہی موجود ہو کہ نصف صدی سے زیادہ عمر کے ایک غزل گو نے جدید حسیت، جدید طرزِ احساس اور جدید غزل کا چیلنج اتنی حوصلہ مندی سے نہ صرف قبول کیا ہو بلکہ پوری خود اعتمادی کے ساتھ اسے نہایت رکھ رکھاؤ سے برتا بھی ہو۔ محشر کی غزل پڑھئے تو دیر تک یقین نہیں آتا کہ اس شاعر کی عمر پچپن سال کے قریب ہے اور وہ شعراء کے ایک ایسے ہجوم میں زندگی بسر کرتا ہے جو اپنی اپنی جگہ سب ٹھیک ٹھاک شاعر ہیں مگر اتنے روایت پسند اور غزل کی لفظیات اور تشبیہہ و استعارہ اور علامات و تراکیب سے متعلق اتنے وضعدار ہیں کہ اگر کوئی شاعر اپنے شعر میں دریچے کی بجائے کھڑکی کھول دیتا ہے تو ان کا دم گھٹنے لگتا ہے اور ایک محشر بدایونی ہے کہ نہ قدیم سے چمٹے رہنے میں اپنی نجات دیکھتا ہے اور نہ جدید کو اپنے اوپر مسلط کر لینے کا قائل ہے۔ وہ قدیم و جدید کی منتخب خوبصورتیوں، رعنائیوں اور ندرتوں کا شاعر ہے اور اس کی غزل کے ہر شعر میں انسان کے کسی نہ کسی نازک جذبے کا نفوذ اتنا بے ساختہ ہوتا ہے جیسے پھول کی پتی پر شبنم اترتی ہے۔ وہ غزل کی روایت کے لحاظ و احترام میں اپنی انفرادیت کو دفن نہیں کرتا بلکہ قدیم روایت کے حسن کو سمیٹتا اور نئی حسین روایت قائم کرتا ہوا گزرتا چلا جاتا ہے۔

پھر ہم سب جانتے ہیں کہ وہ جو غزل کا ہمیشہ زندہ و قائم رہنے والا حسن ہے۔ وہ دراصل غزل کے باطن میں ہوتا ہے۔ غزل کے باطن کے اس حسن تک ہمیں الفاظ پہنچاتے ہیں اور شاعر کا کام ایسے مناسب الفاظ کا انتخاب اور ان کی ایسی فنکارانہ ترتیب ہوتی ہے کہ بظاہر دیکھئے تو شعر بہت سادہ اور بے ساختہ معلوم ہو، مگر دراصل شعر کی تخلیق پر شاعر کی تمام تر تمام صلاحیتیں صرف ہوئی ہیں۔ میں محشر کی غزل ایک عام قاری کی حیثیت سے پڑھتا ہوں تو میرا پہلا تاثر سادگی اور بے ساختگی ہی کا ہوتا ہے۔ مگر ذرا سا رک جائیے تو شعر کی پرکاری آپ کے دل و دماغ میں آپ کے وجدان و عرفان میں حلول کرنے لگتی ہے۔ تجربتہً یہ شعر پڑھیئے۔

سرِ مژگاں بھی ہے بے قطرۂ آب　　　پسِ جاں، بارشیں بھی ہو رہی ہیں

یا پھر یہ شعر:

کلام کرتے ہیں در، بولتی ہیں دیواریں　　عجیب صورتیں ہوتی ہیں انتظار میں بھی

محشر کے سادہ و پُر کار اشعار میں معنویتوں کی پرتوں پر پرتیں ہوتی ہیں جب ہر شعر میں ایک رمز ہو، ایک علامت ہو، ایک استعارہ ہو اور شعر کہنے والا محشر بدایونی ہو تو ایسے شعر کی بلاغت اور تاثیر میں کسے کلام ہوسکتا ہے۔ "غزل دریا" کا ایک شعر ہے،

ڈرو ان سے کہ ان خستہ تنوں میں　　لہو کم ہے، حرارت کم نہیں ہے

"غزل دریا" میں ایک مصرع ہے،

ع　　ہوا بھی کہتی ہے یہ لوگ مرنے والے نہیں

یہ خیال اور یہ لہجہ "گردشِ کوزہ" تک پہنچتے پہنچتے ان مصرعوں اور شعروں میں ڈھلا ہے۔

ہم بھی انسان ہیں، اک اندازِ انا رکھتے ہیں

نمو کے سلسلے ہوتے ہیں ریگ زار میں بھی

مسیحائی کا در کھولا ہوں، دھیان ایسا تو میرا ہے　　کہاں میں نے بھی دستک دی یہ دروازہ تو میرا ہے

اجازت ہے سب اسبابِ سفر تم چھین لو مجھ سے　　یہ سورج، یہ شجر، یہ دھوپ یہ سایہ تو میرا ہے

ہم درِ عادل پہ منت کو گئے جتنی بار　　اپنے ماں باپ کی قبروں پہ بھی اتنے نہ گئے

مثالیں متعدد ہیں مگر صرف انہی شعروں اور مصرعوں سے ثابت ہو جاتا ہے کہ محشر کے ہاں خارجیت کے تیور بھی تخلیقی ہوتے ہیں۔ چلیے دو شعر اور بھی سن لیجئے۔

روشن کسی اور افق پہ ہوگا　　سورج کبھی ڈوبتا نہیں ہے

بارش ہے تو ایسی کہ لرز جائے زمیں بھی　　پانی ہے کہ مٹی کو بھی تلوار بنا جائے

محشر بدایونی نے اپنی غزل میں اپنے وطن کی گزشتہ ۳۵ سال کی ذہنی اور وجدانی تاریخ مرتب کر دی ہے۔ بہت ہی کم غزل گو ایسے ہیں جو محشر کی طرح اپنے تہذیبی منصب کو پہچانتے ہیں اور پھر اس منصب کے ساتھ انصاف بھی کرتے ہیں۔ پھر ذاتی واردات کو عالمگیر واردات ـــــ سبھی انسانوں کی واردات میں بدلنا بھی کوئی محشر سے سیکھے۔

محشر نے اس دور کی اردو غزل کو بے شمار توانائیاں بخشی ہیں۔ وہ درد کا اظہار بھی کرتا ہے تو درد کے خاتمے کے عزم کے ساتھ کرتا ہے۔ پھر اس کے اخلاقی معیاروں میں بھی عجیب طلسماتی کیفیت ہے۔

مرے بارے میں لہریں کچھ بھی سوچیں　　میں کہتا ہوں بھرم دریا کا رہ جائے

اتنا بھی نہ ہو محسن کہ ذرہ تک میں پہنچ کر — دَر کھولوں تو درویش دُعا گو ہی چلا جائے

اور آخر میں محبت کے دو چار مزید نشتر قسم کے اشعار

بخشش بندہ پروراں ہے کوئی بھولنے کی بات — کچھ نے تو زخم یوں دیئے جیسے کوئی خزانہ دے

یوں بھی ہوتا ہے کہ دل خوں ہو جائے — اور آنسو نہ رواں ہو کوئی

اندھیرے چھٹے تو پہنچے اس روشنی کی حد پر — جہاں کسی کو کسی کا چہرہ نظر نہ آئے
خدائے شام و سحر! میں انسان ہوں کہ پتھر — تھکن بھی دن بھر ہو، نیند بھی رات بھر نہ آئے

فن کے پیمانے تنگ، حرف کے کوزے نازک — کیسے سمجھاؤں کہ کچھ دکھ ہیں سمندر میرے

احمد ندیم قاسمی

ماڈرن اردو سٹوریز فرام پاکستان

مترجم : انیس ناگی

قیمت : درج نہیں — ناشر : سواد نون پبلی کیشنز پوسٹ بکس ۱۴۲۹ - لاہور

لاکھوں میں ایک کو خدا ایسی ہمت اور قوت بخشتا ہے کہ وہ ایک فرد، ایک پورے ادارے کا کام اپنے ذمے لے لیتا ہے اور اس میں کامیاب رہتا ہے۔ اداروں میں سے کبھی رائٹرز گلڈ نے اس طرح کا پروگرام بنایا، کبھی آر سی ڈی کی کلچرل کمیٹی نے اور آج کل کل پاکستان اکاڈمی آف لیٹرز اس انداز کے منصوبے مرتب کر رہی ہے۔ مگر جنہیں کام کرنا ہوتا ہے وہ کام کر کے دکھا دیتے ہیں۔ انیس ناگی ایک بھرپور ادارے کا کام کر رہا ہے۔ جس زمانے میں پطرس بخاری لاہور میں تھے، اس عزم کا اظہار کرتے رہتے تھے کہ وہ اردو کی ایک درجن منتخب کہانیوں کو انگریزی میں منتقل کریں گے اور اس مجموعے کو لندن یا نیویارک سے چھپوائیں گے۔ مقصد کسی ترقی یافتہ زبان کے مختصر افسانے سے مقابلہ نہیں تھا بلکہ اردو کے ترقی یافتہ افسانے کو اہل مغرب سے متعارف کرانا مقصود تھا۔ راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کی کہانیوں کا ترجمہ انھوں نے شروع بھی کر دیا تھا مگر پھر انہیں اقوام متحدہ بھجوا دیا گیا اور انہوں نے باقی زندگی تحریر کی بجائے تقریر میں صرف کر دی۔ سنا ہے پطرس بخاری بہت بے داغ انگریزی لکھتے اور بولتے تھے۔ اگر وہ ترجمے کا کام مکمل کر لیتے تو یہ اردو افسانے کی خوش قسمتی ہوتی۔ مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ پطرس بخاری کا منصوبہ مکمل نہ ہو سکا مگر ان کی آرزو پوری ہو گئی اور وہ یوں کہ انیس ناگی نے پندرہ منتخب جدید اردو افسانوں کو انگریزی میں منتقل کر کے انہیں ایک خوبصورت کتاب کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ جہاں تک مجھے انگریزی آتی ہے میرا اندازہ ہے کہ اس سے بہتر انگریزی میں ترجمہ ممکن نہیں ہے۔ میرا ایک افسانہ بھی اس مجموعے میں شامل ہے اور اپنے افسانے کا ترجمہ پڑھ کر صحیح صحیح اندازہ ہو جاتا ہے کہ مترجم کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ پھر میں نے ان افسانوں کے تراجم پڑھے جنہیں اردو میں پڑھ رکھا تھا۔ انہیں بھی میں نے سچے، کھرے اور دیانت دارانہ تراجم پایا۔

دراصل کامیاب مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس زبان پر بھی حاوی ہو جس میں سے اسے ترجمہ کرنا ہے اور اس زبان پر بھی ایسے ماہرانہ دسترس حاصل ہو جس میں اسے کسی ادب پارے کو منتقل کرنا ہے۔ انیس ناگی کو اردو اور انگریزی ـــــ دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تراجم میں کسی ایک مقام پر بھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ مترجم الجھن کی وجہ سے تشنج میں مبتلا ہو گیا ہے یا وہ کسی مشکل مرحلے سے کترا کر گزر گیا ہے۔ انیس ناگی نے اپنی محنت اور قدرت سے ثابت کر دیا ہے کہ تخلیقی ادب کا ترجمہ بھی تخلیقی ہوتا ہے۔

رہا افسانوں کا انتخاب تو وہ مترجم کا سراسر ذاتی مسئلہ ہے۔ ممکن ہے ہمارے ہاں کے بعض لوگ اس کتاب میں کسی افسانہ نگار یا کسی افسانے کی موجودگی یا عدم موجودگی کو پسند نہ کریں، مگر اس طرح کا جھگڑا تو ادب کے ہر انتخاب کے بارے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں نے تو صرف یہ دیکھا ہے اور میرے خیال میں یہی دیکھنا چاہیئے کہ انیس ناگی نے جدید اردو افسانے کے سبھی ادوار کو نمائندگی دی ہے اور نمائندہ افسانوں کا انتخاب کیا ہے۔

اردو افسانے کے تراجم کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی مثالیں تو شاید موجود ہوں مگر یہ مختلف اصحاب کے تراجم ہیں۔ "ماڈرن اردو سٹوریز فرام پاکستان" کا مترجم ایک ہی ہے اور اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ انیس ناگی نے ایک فرد ہو کر ایک ادارے کا کام کیا ہے۔ اس سے پہلے وہ ہمیں "ماڈرن اردو پوئمز فرام پاکستان" دے چکا ہے اور یہ سب منصوبے ایک فرد کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہو رہے ہیں جو اپنے فرائض منصبی بھی ادا کرتا ہے اور تخلیقِ فن میں بھی مصروف ہے۔ ایسے کام خلوص، لگن اور عشق کے بغیر ممکن نہیں اور انیس ناگی ان تینوں صفات سے آراستہ ہے۔ ادارے سالہا سال تک بیٹھے پروگرام ہی مرتب کرتے رہیں، انیس ناگی کا سا فرد ایک پروگرام طے بھی کر لیتا ہے اور اسے مکمل بھی کر لیتا ہے۔ اگر ادب میں کارنامے کا کوئی وجود ہوتا ہے تو یہ انیس ناگی کا بڑا کارنامہ ہے۔

احمد ندیم قاسمی

میڈی دھرتی میڈے لوک قیمت :- ۱۰ روپے

مصنف :- جی شیشندر شرما (ترجمہ : ممتاز حیدر ڈاہر) ناشر :- سوجھلا اشاعتی ادارہ بھٹہ واہن (رحیم یار خان)

"ناولیشمو نا پیر جلو" تیلگو زبان کی ایک طویل رزمیہ نظم ہے جو جی شیشندر شرما کی تخلیق ہے۔ اس نظم کے کئی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں اختر حسن نے اسے اردو کے قالب میں ڈھالا تھا۔ اب سرائیکی کے معروف شاعر ممتاز حیدر ڈاہر نے اس کا منظوم سرائیکی ترجمہ کیا ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے ثابت ہوتا ہے کہ ممتاز حیدر ڈاہر نے یہ ترجمہ بھی تخلیقی سطح پر کیا ہے۔

ترجمے کا فن بہت مشکل ہے اس کے لئے شوق اور صلاحیت کے علاوہ مشق کے ساتھ ساتھ اصولی واقفیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ بھی ہے کہ مترجم کو دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہو۔ بنیادی طور پر ترجمے کے تین امکانی مقاصد ہو سکتے ہیں۔ پہلا معلوماتی، دوسرا ثقافتی یا کلچرل اور تیسرا جمالیاتی۔ ثقافتی اور جمالیاتی کتابوں کا ترجمہ اس لئے بھی مشکل ہوتا ہے کہ ان میں تصورات و خیالات کے ساتھ ساتھ ایک خاص فضا کو بھی برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ میرے نزدیک یہ عظیم نظم جمالیاتی اور ثقافتی دونوں اقدار کی حامل ہے۔

ممتاز حیدر ڈاہر نے اس کا ترجمہ اردو ترجمے ہی سے کیا ہے لیکن اس خوبصورتی حُسن اور فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ کر یہ نظم سرائیکی وسیب اور سرائیکی ثقافت اور کلچر کی نمائندہ دکھائی دینے لگتی ہے۔ اس کی صورتِ حال، اس کی فضا، اس کا ماحول، اور اس کا کینوس سرائیکی کی کیفیات سے ملتا جلتا ہے۔

آٹھ ابواب پر مشتمل یہ رزمیہ ایک طویل داستان ہے۔ ایک ایسی داستان جو اپنے اندر ڈرامائی انداز رکھتی ہے۔ یہ حریت و آزادی کا ایک مصر گیت بھی ہے اور ایک نوحہ بھی۔ اس میں لمحۂ تخلیق سے لے کر لمحۂ موجود تک کی کائنات اپنے وسیع تر پس منظر میں جلوہ گر ہے۔ سماج اور اس کی بدلتی ہوئی اقدار، انسانی زندگی کے منفی رویے، استحصالی قوتوں کی کہانی، دھرتی اور اس میں بسنے والوں کے دُکھ درد اور وہ سب کچھ جو انسانوں سے وابستہ ہے، مزدوروں کی محنت اور خون پسینے کا ذکر، کھیت اور کھلیانوں کی بہار، انسان کی خود اپنے ہاتھوں تباہی اور بربادی کے سامان اور زندگی کی تمام تر شیرینوں اور آتش فشانیوں کا تذکرہ اس نظم کا موضوع ہے۔

ممتاز حیدر ڈاہر نے اس نظم کا ترجمہ کر کے جہاں سرائیکی ادب پر احسان کیا ہے وہاں لمحۂ موجود کے انسانوں کو آئینہ بھی دکھایا ہے۔

نظم کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ نظم کا بنیادی مزاج فلسفیانہ ہے اور اصل شاعر کا اپنا اصلی مزاج بھی ایک فلسفی کا ہے۔ فلسفہ بظاہر ایک ادق مضمون ہے مگر اصل تخلیق کار کے برعکس ممتاز حیدر ڈاہر نے سادگی مگر پُرکاری اور عصری بصیرت سے اسے سرائیکی کا ملبوس عطا کیا ہے اور نظم کی اصلی روح واضح شکل میں سامنے آگئی ہے۔ اصل نظم میں جو نغمگی، موسیقی اور بلند آہنگی ہے ممتاز حیدر نے اپنے ترجمے میں وہی رب ولہجہ برقرار رکھا ہے۔ ترجمے کی سطح دیکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ تیلگو اور سرائیکی کی لسانی تشکیلات ایک دوسرے سے خاصی مماثلت رکھتی ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کا ترجمہ کرتے ہوئے ممتاز حیدر کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی ہوگی، مگر ترجمے کی خصوصیت اور اس کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے۔ ممتاز حیدر ڈاہر نے یہ ترجمہ قومی اور ملی جذبے سے ہم آہنگ ہو کر کیا ہے۔ اس کی طرف دیباچہ نگار محمد علی صدیقی نے بھی اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے "اپنی قوم کی خیر خواہی کا جذبہ یقینی طور پر نغمہ آور جذبہ ہے اور ممتاز حیدر ڈاہر قابلِ صد مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اس ترجمہ بلکہ تخلیق کے ذریعے اپنی زبان اور اپنی قوم کی قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔"

یوں یہ ترجمہ ایک طرف تخلیقی ہے تو دوسری طرف ملی جذبے سے بھی سرشار ہے اور سرائیکی شعر و ادب میں بے مثل اضافہ ہے۔

(طاہر تونسوی)

کشکول وِچ سمندر (شعری مجموعہ)

مصنف : ممتاز حیدر ڈاہر

قیمت : ۱۲ روپے ناشر : سوجھلا اشاعتی ادارہ بھیڑ واہن (رحیم یارخان)

ممتاز حیدر ڈاہر کا شعری مجموعہ "کشکول وِچ سمندر" سرائیکی شاعری میں ایک خوشگوار جھونکے کی طرح خوشبو سے سدا بہار موسموں کا سندیس لے کر آیا ہے۔ اس مجموعہ میں ۵۲ غزل دیا سوچ و فکر کی جولانیاں ملتے ہوتے ہیں۔

ممتاز حیدر کے تخلیقی اظہار کے حوالے سے اس کا صحرا کی وسعتیں اور سمندر کی گہرائیاں رکھنے والا ذہن فکر کے کئی نئے در وا کرتا ہے اور لفظ و معنی کے نئے دریچے کھولتا ہے۔ "کشکول وِچ سمندر" ایک بلیغ استعارہ ہے جس میں کشکول — طلب، عزتِ نفس کے جنازے، انا کی لاش، منفی اقدار، زندگی اور اس کی حقیقتوں۔

سے فرار کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ سمندر ــــ زندگی کی ہمہ قسم حقیقتوں اور صداقتوں کے امتزاج، حرکت اور دوڑ دھوپ، سوچ اور فکر کی روانی، سفر اور تلاش و جستجو کی علامت ٹھہرتا ہے۔ ممتاز حیدر ڈاہر اپنے عہد کے تقاضوں کے ساتھ چلنے والا فنکار ہے۔ اس کی غزل اپنے عہد کے محور کے گرد گھومتی ہے۔ آج کے دور کے انسان کا المیہ یہ ہے کہ وہ خود اپنی پہچان بھی کھو چکا ہے۔ اپنے وجود کی پہچان اور اپنی ذات کی تلاش ہی ممتاز حیدر ڈاہر کی غزل کا بنیادی رویہ ٹھہرتا ہے۔

توں اپنڑی گول دے وچ ہوا دی گالھ نہ من　　　ابہہ دریدہے ابہہ در در تے دستکاں ڈیسی

جسم دی قید وچ رہیے تے اساں　　　زندگی بھوگ اے سزا وانگے
اپنڑی گول وچ ہیں رات ڈینہہ حیدر　　　در بدر پھردا ہاں گدا وانگے

وستی وستی اپنڑا آپ گولیندا ہاں　　　میکوں اپنڑے ہوون دے ڈکھ دل دتے

کہیں وجود کیتے سکرا دے گھر ساڈا　　　چھپڑا دیوار ہن تے کاغذیاں مرتاں ہوسن

ممتاز حیدر کے ہاں اظہار و بیان کا یہ رویہ اگرچہ المیہ کیفیات پیدا کرتا ہے مگر کہیں بھی فرار کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ وہ بے باکانہ انداز میں احتجاج کرتا دکھائی دیتا ہے۔

سچ دی سولی تے چڑھ کرائیں حیدر　　　توڑ ڈے جال بندشیں دا اج

زہر پیالہ چاڑھ تے ہونٹیں اُتے　　　زندگی دا لطف چھکنا پئے گیا

لکھن دی عادت اساڈیاں انگلیں قلم کریسی　　　لہو لکھیے ایں دور وچ سچ دا باب کوئی

یوں تو ممتاز حیدر کی غزل میں ان گنت موضوعات ہیں، استعارے اور علامتیں ہیں مگر سفر کا استعارہ بھرپور طریقے سے آیا ہے۔ سفر کے حوالے سے ممتاز حیدر معرفتِ ذات اور انکشافِ ذات کے تناظر میں اپنے عہد کی منفی قدروں کی پہچان کراتا ہے۔ وہ انسان کی منافقت، ناانصافی، محرومی، بے بسی اور بے کسی کا ذمہ دار خود اسے ہی قرار دیتا ہے۔ اس کے لب و لہجہ میں کہیں بھی یاسیت نہیں۔ روشنی اور امید کی کرن اس کے ہاں ابھرتی ہے اور وہ مہاتما بدھ کی طرح گیان حاصل کرنے کے سلسلے میں کافی پُرامید ہے۔ اے بی اشرف نے اس کے بارے میں صحیح لکھا ہے کہ "شاعری کا مقصد محض وقتی خوشی کا احساس پیدا کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ فکر اور سوچ کی نئی راہیں بھی سجھانا ہوتا ہے۔ ممتاز حیدر نے دونوں تقاضے پورے کر کے بڑی شاعری کی بنیاد رکھی ہے۔ سرائیکی شاعری میں یہ لب و لہجہ نیا بھی ہے اور معیاری بھی۔"

یوں اسلوب و معنی کے اعتبار سے ممتاز حیدر کی غزل سرائیکی شاعری کو ایک نئی راہ دکھاتی ہے۔ اپنی علاقائی علامتوں، ثقافتی پس منظر، موضوع کی جدت اور جذبے کی فراوانی کے علاوہ سوچ کے نئے رنگوں کی آئینہ دار بھی ہے۔ اس تناظر میں ممتاز حیدر کی آواز خاصی توانا، لہجہ بلند آہنگ اور وسیع تر امکانات سے پُر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "کنکرل وچ سمندر" سرائیکی شاعری میں نئے امکانات کا شعور پیدا کرتا ہے اور یقینی طور پر سرائیکی غزل اب ممتاز حیدر کی دکھائی ہوئی راہوں پر چلے گی۔

طاہر تونسوی

اختلاف (شعری مجموعہ)
مصنف: صغیر ملال

قیمت: ۳۵ روپے
ناشر: نروان پبلشرز ۱۳۶ سی، بلاک ۲ پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹

ادب میں کومٹ منٹ کے نام پر ایک مخصوص اجتماعی اندازِ نظر کا انتہا پسندانہ مطالبہ ادب کے معنوی افق کو محدود کر دینے کا باعث بنا۔ اس سے شاعری کو اور بھی زیادہ نقصان پہنچا کہ شاعری کا منصب تو لطیف ترین احساسات و حقائق کو گرفت میں لینا اور انہیں خوبصورت ترین پیرایۂ اظہار عطا کرنا ہوتا ہے۔ اگر ہم کومٹ منٹ سے شاعر کی اپنی تخلیقی ذات سے پرخلوص وابستگی مراد لیں تو شاید ادب میں تخلیقی تجربے کی ماہیت، وسعت اور تنوع سے بہتر طور پر انصاف کر سکیں۔ ضروری نہیں کہ ہر شاعر کا تخلیقی تجربہ زندگی کے کسی مخصوص اجتماعی اور سماجی دائرے ہی کا پابند ہو۔ بڑے تخلیقی تجربے کی آبیاری تو فطرت اور کائنات کے وسیع تر سرچشمے سے ہوتی ہے۔ فطرت اور کائنات کا جو پہلو بھی کسی فنکار کی توجہ کا مرکز بنتا ہے اس کی دریافت کا پرخلوص عمل ہی اس کی تخلیقی کومٹ منٹ کا حقیقی ثبوت مہیا کرتا ہے۔

انتہا پسندانہ تنقیدی مطالبوں اور ادبی حلقوں کی بحثوں کے مقبول معیاروں کے منفی اثرات کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی ادبی پرچہ اٹھا کر دیکھ لیں اس میں شامل تمام نظموں اور غزلوں میں اتنی یکسانیت ملتی ہے کہ چند ایک کو چھوڑ کر باقی کی تمام شعری تخلیقات کسی ایک ہی شاعر کی کاوش دکھائی دیتی ہیں۔ اس متجانس ادبی بھیڑ میں صغیر ملال کا شمار یقیناً "مختلف" شاعروں کی صف میں کیا جا سکتا ہے کہ اس کی شاعری عام روش سے ہٹ کر اپنی پہچان کرانے کا جتن کرتی ہے۔

صغیر ملال ایک ایسا شاعر ہے جو کائنات کی اسراریت سے متاثر ہوتا ہے اور کائنات کے ساتھ اپنی ذات کے رابطوں کی مختلف سطحوں کا احساس کر کے قدم قدم پر ایک تحیر کی کیفیت سے گزرتا ہے۔ ذات اور کائنات کے رابطوں کی دریافت کے عمل میں کہیں کہیں وہ عرفان و یقین کی رفعتوں کو بھی چھونے لگتا ہے مگر صداقت کے اضافی پہلوؤں کا شعور اسے پھر تشکیک سے دوچار کر دیتا ہے اور وہ ہونے اور نہ ہونے کی سرحد پر پھیلے ہوئے مناظر کی اسراریت میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ یوں اس کا ماورائی رویہ کائنات کی مجرد مابعد الطبیعات کے دائرے سے نکل کر کسی نتیجہ خیز صوفیانہ تجربے کے دائرے میں داخل نہیں ہو پاتا۔

ہماری صوفیانہ شعری روایت میں کائنات کے اسرار کے بارے میں گہرے غور و فکر کا رویہ خصوصی اہمیت رکھتا ہے

مگر سچا صوفی زندگی اور کائنات کے پیچھے ایک ازلی و ابدی ارادے کی کارفرمائیوں کے احساس کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور خود کو اس ازلی و ابدی ارادے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی کوشش اسے زندگی کے مختلف دائروں کی اپنی اپنی اہمیت اور ترجیحات سے روشناس کراتی ہے اور انسانی زندگی میں اس کے فکر و عمل کو بامعنی اور نتیجہ خیز بناتی ہے۔ زندگی اور کائنات کے اندر موجود ان گنت اضافی معنوی منطقوں کا شعور ہی ایک فنکار کے بڑا تخلیقی فنکار بننے کے امکانات کو روشن کرتا ہے۔ ایسا تخلیقی فنکار اگر وسیع تر تناظر کے ماتحت کسی مربوط فکری نظام کی تشکیل میں کامیاب ہو جائے تو وہ نہ صرف کثیر الجہات حقیقت کی بہتر تفہیم کا فریضہ ادا کرنے لگتا ہے۔ بلکہ اپنی ادبی روایت کی فکری و جمالیاتی توسیع کا باعث بھی بنتا ہے۔

یہ توفیق تو خیر کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ البتہ عظمت و رفعت کی اس سمت میں ذرا سا قدم بھی درست ہو جائے تو قابلِ قدر تخلیقات جنم لیتی ہے۔ اس حوالے سے جہاں تک 'اختلاف' کی غزلوں کا تعلق ہے صغیر ملال کی شاعری سچے تخلیقی تجربات کی ترجمانی کرتی ہے۔ وہ غزل کا ایسا شاعر ہے جو قافیے اور ردیف کی جبریت میں شعر نہیں کہتا بلکہ یہ قوافی و ردائف اس کے اصلی تخلیقی تجربے کے اظہار میں مناسب شعری وسیلے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

یوں تو کائنات کے کسی بھی پہلو کی فکری دریافت کا عمل بذاتِ خود ایک خوشگوار حیرت کو جنم دیتا ہے مگر شاعرانہ انداز نظر اور تخلیقی اظہار کے کچھ اپنے جمالیاتی تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان کی شاعری میں شعری اور غیر شعری اظہار کا امتیاز بہر طور موجود رہتا ہے۔ اگرچہ صغیر ملال کی شاعری میں اس کے علمی و فکری رویے کا بھرپور تاثر ملتا ہے مگر اس کے باوجود اسے نہ صرف فکری سطح پر ابھی ایک ایسے وسیع تر تناظر تک رسائی حاصل کرنا ہے کہ اس کا کائناتی شعور باہمی انسانی تعلقات کی کسی خوبصورت اور بامعنی تشکیل کا فریضہ انجام دے سکے بلکہ اپنے تہذیبی جینئس سے ہم رشتہ ہو کر اپنی شعری جمالیات کے بہترین پیکر کی تکمیل بھی کرنا ہے جس کے بعض خد و خال اس کے پہلے مجموعے کے ایسے خوبصورت اشعار میں بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔

جس کو احساس ہو افلاک کی تنہائی کا ۔۔۔ دیر تک اس کو اکیلا نہیں رہنے دیتے

شہر والوں کو کیا خبر کہ کوئی ۔۔۔ کون سے موسموں میں زندہ ہے

جہانِ کہنہ ازل سے تھا یوں ہی گرد آلود ۔۔۔ کہ ہم نے خاک اڑا کر یہاں غبار کیا

جو دیکھتے ہیں مہ و مہر کی نگاہوں سے ۔۔۔ نہ جانے کتنے یہاں انقلاب دیکھتے ہیں

سمندر ہو اگر منزل تمہاری ۔۔۔ تو دریا سب سے سیدھا راستا ہے

تیرے محتاج نہیں ہیں یہ بدلتے موسم ۔۔۔ مان لیتا ہوں مگر دل بھی بُرا ہوتا ہے

اک اعتبار سے ہیں قدم سارے سود مند — اک زاویے سے ساری مسافت ہے رائیگاں

جو دیکھ لیتے ہیں چیزوں کے آر پار ملالؔ — کسی بھی چیز کو اتنا بُرا نہیں کہتے

اس نے محدود کر دیا ہم کو — کوئی ہم سے یہاں زیادہ ہے۔

جلیل عالی

حیاتِ اقبالؒ کی گمشدہ کڑیاں

قیمت: ۴۰ روپے

مصنف: محمد عبداللہ قریشی — ناشر: بزمِ اقبال کلب روڈ لاہور

جناب عبداللہ قریشی کا شمار ملک کے چند بڑے اقبال شناسوں میں ہوتا ہے۔ ان کی زیادہ تر کتب و مقالات حضرت علامہ ہی کی زندگی و پیغام سے متعلق ہیں اور اپنی ہر تصنیف و تالیف میں انہوں نے خوب دادِ تحقیق و تنقید دی ہے۔ "حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں" ان کی تازہ تالیف اور سلسلۂ اقبالیات کی ایک اہم کڑی ہے جسے بلاشبہ عشاقِ اقبال کے لئے ایک بیش بہا تحفہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

کوئی تیس برس قبل قریشی صاحب نے ان کڑیوں کو مختلف مضامین کی صورت میں سمیٹا تھا جو ملک کے موقر مجلات میں شائع ہوتے رہے۔ ان بکھری کڑیوں کو ایک سلسلے میں پرونے کی اشد ضرورت تھی جسے بزمِ اقبال، لاہور نے پورا کر کے اقبالیات میں ایک مفید، اہم اور دلچسپ ماخذ کا اضافہ کیا ہے۔

جناب قریشی کی محنت و تحقیق کی داد پر مشتمل جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے خط کے علاوہ کتاب کا آغاز احمد ندیم قاسمی صاحب (اعزازی سیکرٹری بزمِ اقبال) کے "پیش کلام" سے ہوتا ہے جو خود خاصے کی چیز ہے۔ اس میں انہوں نے یہ دلخراش حقیقت بیان کی ہے کہ ملک کے معروف اور اہم مجلات میں شائع ہونے والے ان مضامین کے مندرجات سے علامہ کے سوانح نگار بڑی حد تک بے نیاز یا بے خبر رہے اور انہوں نے اس دور کے ایک نامور مورخ اور محقق کی جمع کی ہوئی قیمتی معلومات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور اگر کسی نے استفادہ کیا بھی ہے تو اس کا ذکر نہیں کیا۔ جناب قاسمی نے کتاب میں شامل مقالات کی اہمیت و افادیت اور ان سے پیدا ہونے والے تاثر کا بھی مختصر ذکر کیا ہے۔ "احوالِ واقعی" میں فاضل مصنف نے مذکورہ گمشدہ کڑیوں کی تلاش و جستجو اور انہیں سمیٹنے کے بارے میں بتایا ہے۔

کتاب آٹھ مقالات یا ابواب پر مشتمل ہے، جن میں طویل تر "لاہور کے مشاعرے" ہے۔ دیگر مقالات "جذبۂ مَن پیرے محرمِ اسرار کجاست"، "انجمن کشمیری مسلمانان"، "اقبال کا تعلیمی سفر"، "اقبال اور فوق"، "اقبال اور طریقت"، "اقبال اور کشمیر" اور "عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں" ہیں۔ قریشی صاحب نے ہر مقالے کے آغاز میں علامہ کا کوئی شعر یا قطعہ دے کر اپنی اپج کا بھی مظاہرہ کیا ہے اور قاری کی دلچسپی کا سامان بھی۔ اس پر مستزاد ان کی تحریر کی شگفتگی جس نے کتاب کے آخر تک دلچسپی برقرار رکھی ہے اور قاری کسی قسم کی ذہنی خستگی محسوس نہیں کرتا۔

"لاہور کے مشاعرے" میں علامہ مرحوم سے متعلق جو مواد ہے اس میں بقولِ جناب قاسمی "ابتدا ہی میں ایک بڑی شخصیت کی ذہانت و فطانت کی چمک صاف دکھائی دیتی ہے، ساتھ ہی قارئین کو اس شخصیت کے بتدریج فنی ارتقاء کا بھی اندازہ ہو

جاتا ہے: "اس طویل مقالے میں اس وقت کے لاہور کی معاشرتی و ادبی زندگی کی بھی دلچسپ جھلکیاں آگئی ہیں۔ بعض ادبا کی باہمی شکر رنجیوں (ص ۴۹) کا تذکرہ ہے۔ کئی ایک گمنام شخصیتوں کو سامنے لایا گیا ہے جو اپنے وقت میں اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے شہرت کی مالک تھیں۔ اس طرح انہیں اور ان کے کچھ کلام کو مرنے اور مٹنے سے بچا لیا گیا ہے۔ اس میں خاص طور پر تارا چند تارا کا ذکر حامل اہمیت ہے۔ یہ شخص ایک حلوہ فروش ہندو تھا لیکن شاعری کا لپکا ہونے کے سبب وہ نہ صرف مشاعروں میں شرکت کرتا بلکہ اس کے بڑے بڑے ادبا و شعرا سے مخلصانہ تعلقات تھے۔ وہ مسلمان مشاہیر کو تحفے کے طور پر اپنا سوہن حلوہ بھیجتا۔ حضرت علامہ بھی اپنے خطوط میں اس کا اور اس کے حلوے کا ذکر کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس تارا نے نعتیں بھی کہیں اور اس زمانے کے مطابق زوردار نعتیں کہیں۔ اس مقالے میں بعض ادبی انجمنوں کا تذکرہ بھی آگیا ہے۔ یوں تو پوری کتاب حوالے کی چیز ہے لیکن یہ مقالہ خاص طور پر کوئی پون صدی قبل کے لاہور کی ادبی و معاشرتی تاریخ کے لئے ایک زبردست سند ہے۔ پھر اس سے اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ پنجاب نے اردو زبان کی بہت خدمت کی ہے۔ اس کے آخر میں علامہ مغفور کی شاعری کے ارتقا پر بڑا جاندار تبصرہ ہے۔

"جز برہمن پسرے ۔ ۔ ۔ ۔" میں حضرت علامہ کے کشمیری الاصل ہونے کا ذکر ہے۔ اس میں علامہ کے اشعار، خطوط اور بعض کتب تاریخ سے حوالے پیش کئے گئے ہیں، نیز کچھ اور بھی مفید اور کام کی باتیں آگئی ہیں۔ "انجمن کشمیری مسلماناں" بظاہر ایک محدود حلقے سے متعلق ہے لیکن اس کی بدولت کشمیری مسلمانوں کے اتحاد و تنظیم (جس کا مقصود دوسروں کو نقصان نہ پہنچانا تھا) کے سلسلے میں علامہ اقبال کی عملی جد و جہد کا بھی پتہ چلتا ہے اور اس بات کا بھی کہ کس طرح اقبال ایک محدود تنظیم اور اصلاحی کاموں میں دلچسپی لیتے ہوئے آخر ایک سچے مسلمان اور محب نوع انسان کی مانند عالمگیر اخوت کی طرف مائل ہوئے۔ اس مقالے میں حضرت علامہ کی فارسی نثر کا بھی ایک ٹکڑا آگیا ہے جو نواب خواجہ محمد سلیم اللہ خاں آف ڈھاکہ کی خدمت میں سپاسنامہ کی صورت میں ہے اور واقعی یہ علامہ کی ایک یادگار بھی ہے اور تبرک بھی۔ حیران کن بات اس مقالے میں یہ نظر آئی کہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ (والی کشمیر) مسلمانوں کے بارے میں اپنے خبث باطن کے باوصف فارسی ادب کا ذوق رکھتا تھا۔

"اقبال کا تعلیمی سفر" میں موضوع سے متعلق اہم معلومات کے علاوہ علامہ کے بعض یورپی فاضل اساتذہ کی ذات کے بارے میں بھی معلومات اور علامہ سے متعلق ان اساتذہ کی آرا آگئی ہیں۔ "اقبال اور فوق" میں دونوں کی دوستی و یگانگت کے واقعات، علامہ کے بعض اشعار کا پس منظر اور زمانہ، فوق مرحوم کے نام علامہ کے بعض خطوط، فوق کے رسالہ "پنجۂ فولاد" کا علامہ کی طرف سے طویل منظوم تعارف، علامہ کی بعض مکمل غزلیں جو "بانگ درا" میں بصورتِ انتخاب ہیں، ایسی نادر و دلچسپ باتیں مندرج ہیں۔ ایک جگہ (ص ۲۴۷) حضرت علامہ سے یہ بات منسوب ہے کہ "بار الہا! اگر دوزخ سے نجات دینی ہے تو بے شک اس تکلیف (دردِ گردہ) میں مبتلا رکھ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ" "مرشدِ اقبال رومی نے مثنوی میں ایک جگہ یہ واقعہ بیان کیا ہے: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی بیمار صحابیؓ کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ صحابیؓ نے حضورؐ کو بتلایا کہ میں ہر وقت یہی دعا کیا کرتا تھا کہ الٰہی مجھے جو بھی عذاب دینا ہے اسی دنیا میں دے لے اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔ سرور کونینؐ نے انہیں اس قسم کی دعا کرنے سے سخت منع فرمایا تھا اور انہیں یہ دعا یاد فرمائی "ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃً وفی الاٰخرۃ حسنۃً" اس وقت تک غالباً علامہ کی نظر سے مثنوی کا یہ حصہ نہیں گزرا تھا ورنہ وہ ایسی دعا نہ کرتے۔

علامہ سے متعلق فوق کی تحریروں کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مصنف نے ایک قابل توجہ بات کہی ہے۔ "اگر آج کوئی آپ

(فوق) کی تحریروں کو جمع کرنے بیٹھے تو اقبال کی طالب علمی کے زمانے سے لے کر وفات تک کے حالات کا بالکل ایک نیا مرقع تیار ہو سکتا ہے" (۲۵۱) "اقبال اکادمی" اور "بزم اقبال" ایسے اداروں کو اس طرف بھرپور توجہ دینی چاہیئے اور اس ضمن میں سب سے پہلے سرگذشتِ فوق ایسی اہم کتاب کی اشاعت کا اہتمام کرنا چاہیئے کہ یہ کتاب واقعی بعض نادر معلومات کا خزانہ ہے۔

فوق مرحوم نے حضرت علامہ کے ایماء پر ایک رسالہ "طریقت" جاری کیا تھا جس کا مقصد دکاندار قسم کے پیروں اور صوفیوں کی اصلاح تھا۔" اقبال اور طریقت"، میں اسی کے بارے میں دلچسپ معلومات ہیں۔ فوق مرحوم نے "طریقت" کے اجراء سے قبل صوفیائے کرام، تصوف، مراسم عرس، ضرورتِ مرشد اور زیارتِ قبور وغیرہ مسائل سے متعلق علامہ کے خیالات معلوم کئے تھے۔ اس مقالے میں یہ باتیں سوال جواب کی صورت میں ہیں اور جیسا کہ فاضل مصنف نے لکھا ہے، علامہ نے ان میں حقائق و معارف کے دریا بہا دئیے ہیں اور ہر چند یہ شراب پرانی ہو چکی ہے لیکن علامہ کے یہ زرّیں خیالات آج بھی ہر تعلیم یافتہ نوجوان کے لئے قابل غور و فکر ہیں۔

"اقبال اور کشمیر" میں بھی کشمیر سے متعلق علامہ کے اشعار کے علاوہ ان کی زندگی کے بارے میں بعض لائق استناد اطلاعات ہیں۔ اس کے آخر میں جناب قریشی نے کشمیر سے متعلق علامہ کی محبت کا بالکل صحیح تجزیہ کیا ہے۔ (ص ۳۴۵ بعد) "عید پر شعر لکھنے کی فرمائش ....."، مختصر سا مقالہ ہے جس میں اس نظم کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔

غرض "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں" ہر لحاظ سے ایک اہم اور مفید و مستند حوالے کی کتاب ہے جسے مصنف کی شگفتگی تحریر نے دلچسپ و پُر تاثیر بھی بنا دیا ہے۔ "بزم اقبال" سے یہ گذارش بیجا نہ ہوگی کہ اس قسم کی کتابوں کا اشاریہ آج کی بڑی ضرورت ہے جسے پورا کرنا عین مناسب ہوگا۔ ۳۶۴ صفحات کی اس کتاب میں طباعت کی محض چند اغلاط ہیں جن میں صرف اشعار کی اغلاط کھٹکتی ہیں۔ توقع کرنی چاہیئے کہ آئندہ ایڈیشن میں ان اغلاط اور اشاریہ کی طرف ضرور توجہ ہوگی۔

ص	۱۴۵	دوسرا مصرع وزن سے خارج		
"	۱۴۶	این دعا از ما	صحیح	از من و
"	۲۴۲	... بہار بیار	"	بہار بیا
"	۲۷۶، ۲۸۱	بیا بمجلس اقبال یک	"	اقبال و یک

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

چاندنی رات کا اُجلا دریا قیمت: ۱۵ روپے

مصنف: ضمیر اظہر ناشر: مکتبۂ نور ۲۹ کشمیر روڈ راولپنڈی

ضمیر اظہر سے نہ اپنا یارانہ ہے نہ نیازمندی۔ صرف ایک تعلق ہے، شعر کا تعلق، ادب کا حوالہ۔ یہ تعلق یہ حوالہ اتنا سچا اور کھرا ہے کہ اسے نہ تو شناسائی کی گہرائی درکار ہوتی ہے اور نہ ہی اُسے دنیاداری کے پیمانوں سے ناپا تولا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اِسی حوالے سے ضمیر اظہر کی کتاب "چاندنی رات کا اُجلا دریا" پڑھی اور جب انہوں نے کچھ لکھنے کی فرمائش کی تو انکار نہ کر سکا۔

ضمیر اظہر کی شاعری کی ابتدا اُردو ادب کے بہت ہی قدآور زعماء کے زیرِ سایہ ہوئی یعنی انہیں تاثیر اور عیش جیسے اُستاد میسر آئے۔ چنانچہ ان کے ہاں جو قدرتِ بیان اور قدرتِ کلام ہے وہ جمال ہم نشیں کا کرشمہ بھی ہے اور ان کی چار دہائیوں کی ریاضت کا ثمر بھی۔ ضمیر اظہر کو ایک حساس ترین دل اور ترقی پسند ذہن عطا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی ناانصافیوں

بے اصولیوں، منافقتوں اور ناہمواریوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ زندگی اور تضاداتِ زندگی ان کے فکر و فن کا محور ہیں۔ وہ صرف منفی حسیت، جذبات اور روشوں کی آئینہ داری نہیں کرتے بلکہ صداقت کے روپ میں منافقت کی بے نقابی بھی کرتے ہیں۔ ایسے لمحوں کو اپنے فن کی گرفت میں لیتے وقت وہ اپنے عہد کے ادبی شعور اور ترقی سے قطع تعلق نہیں کرتے یعنی ماضی پرست نہیں ہیں، بلکہ حال کے احوال کو پیش نظر رکھتے ہوئے مستقبل کے روشن امکانات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

غزل تری ہے کہ آئینہ بہار و خزاں ... اظہرؔ ... تمام نوع کے نیرنگ اس میں ہیں

جیسے اپنے واسطے مشکل سے باہر کچھ نہیں ... مشکلوں نے گھیر رکھا ہے ہمیں کچھ اس طرح

میں ہوں صبحِ خزاں کا نجمِ غریب ... تُو شبِ نو بہار کا مہتاب

آدمیت کا آدمی ہے رقیب ... اظہرؔ ... مجھ کو معلوم ہی نہ تھا

بارہا مجھ سے بھی پنہاں رہی صورت میری ... یوں ہُوا ماضی و فردا کے خیالوں میں اسیر

شاعری میری نظر میں جذبوں کے پھول کھلاتا ہے، لفظوں کو روح بخشتا ہے۔ شاعر کی طبیعت بہار ایجاد ہوتی ہے۔ جذبے کی شدت اور احساس کی حدت ضمیرِ اظہر کا سرمایہ ہے۔ وہ اپنے ذاتی دُکھ اور غم کو پیش نہیں کرتے بلکہ عالمگیر المیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ضمیرِ اظہر نہ تو مشاعرہ باز ہیں نہ پبلک ریلیشننگ کے قائل۔ وہ تو شاید اس عہد کے مصنوعی آدابِ حیات سے بھی واقف نہیں۔ پھر انہوں نے یہ شعری مجموعہ کیوں چھپوایا؟ جب میں نے یہ سوچا تو مجھے احساس ہوا کہ ضمیرِ اظہر کو اپنے توانا فکر و فن اور بھرپور شعری شخصیت پر کامل اعتماد اور یقین تھا۔ اسی یقین اور قوت کی جھلک ان کے لہجے اور اسلوب میں مہک بن گئی ہے۔ ان کے شعروں کی اندرونی فضا میں ان کی شخصیت کا دھیما پن نمایاں ہے اور یہ سب ان ناآسودگیوں کا شاخسانہ ہے۔ جہاں جبر اور تلخ ترین طنز کی حکمرانی ہے۔ اس کے باوجود ضمیرِ اظہر کے ہاں زندگی سے پیار کرنے، زندگی کو حسین تر بنانے اور زندگی کے کام آنے کی سچی تڑپ اور اعتماد موجود ہے اور سچائی کسی فارمولے کی پابند نہیں۔

ضمیرِ اظہر برصغیر میں ہونے والی ادبی تحریکوں سے اگرچہ براہِ راست منسلک نہیں رہے لیکن وہ ادب کے جدید ترین تقاضوں سے پوری طرح آشنا ہیں۔ ان کا فن ہماری کلاسیکی شعری روایت کو آگے بڑھاتا ہے مگر ہرگز ہرگز بوجھل یا فرسودہ نہیں۔ میری رائے میں انہوں نے کلاسیکی روایت کو نیا اعتبار، اعتماد اور تیقن عطا کیا ہے۔

سلطان رُشک

احمد ندیم قاسمی ایڈیٹر پبلشر نے محمد شریف کے اہتمام سے طفیل آرٹ پرنٹرز، ۸۱ سرکلر روڈ میں چھپوا کر دفتر "فنون" ۴ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا

فنون

کا آئندہ شمارہ

اُردو کی بے مثال افسانہ نگار اور نامور ناول نویس

خدیجہ مستور

کے لیے وقف ہوگا

خدیجہ مستور کی یادوں اور فن کے نمونوں اور تجزیوں کا ایک ہمہ گیر مرقع

مینجر فنون، ۴ میکلوڈ روڈ، لاہور